صحرائی سرابوں سے ایک دیدہ ور دل فگار نوجوان کی داستان دل نواز
انا گیر
امجد جاوید

جاسوسی ناول

امجد جاوید

Writer's Whatsapp number+923336347166

سنا ہے

وقت کی طنابیں جب ہاتھ میں نہ ہوں

دیار یار میں جب بھی فقط یادیں ہی ملتی ہوں

ریگ زاروں میں پیاس اگتی ہو

سرابوں کو بدلنا ہو جب حقیقت میں

تب کوئی اٹھتا ہے۔۔۔۔۔انا گیر

ریشمی سرابوں سے لڑتا ہے

پیاس سے الجھتا ہے

اٹھا لاتا ہے زندگی کو ان ویرانوں میں

انا گیر جو ہوا

زندگی کو زندگی کے ساتھ رکھتا ہے

محبت بانٹ دیتا ہے

انا گیر جو ہوا

☆......☆......☆

صحرائے چولستان میں شام ڈھل چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے مغربی اُفق خوں رنگ تھا۔ سارے منظر اُترتی ہوئی رات کے اندھیرے میں ڈوبتے چلے جا رہے تھے۔ ٹیلوں کے درمیان میں سے دور تک جاتی ہوئی سیاہ تارکول کی پتلی سڑک بھی اندھیرے میں گم ہوگئی تھی۔ اب بھوری ریت کو دیکھا نہیں، صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ میں اسی سڑک کے کنارے پر کھڑا تھا۔ میرے سامنے وہ کچا راستہ بھی دھندلا گیا تھا جو بستی چراغ شاہ تک جاتا تھا۔ کچے راستے کے بائیں جانب ایک اونٹ ریڑھا موجود تھا۔ جس کے ارد گرد چند لوگ مجسموں کی مانند خاموش کھڑے منتظر تھے۔ اُن کا سامان اونٹ ریڑھے پر دھرا ہوا تھا۔ میری طرح وہ بھی اس انتظار میں تھے۔ کب اونٹ ریڑھا چلے تو ہمارا سفر کٹے۔ پکی سڑک سے بستی چراغ تک کا فاصلہ کوئی تین کلو میٹر سے زیادہ تھا۔ یہ سفر اسی اونٹ ریڑھے پر کرنا تھا۔ ریڑھے والا کسی سواری کا منتظر تھا۔ چونکہ اندھیرا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس لئے وہاں سبھی لوگ اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے بے تاب تھے۔

صحرا کی شام جادو اثر ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ شام کے وقت دن بھر چلنے والی ہوا بھی رُک جاتی ہے۔ ان دنوں چونکہ موسم بدل رہا تھا۔ گرمی کا زور ٹوٹ گیا تھا اور سردیوں کی آمد آمد تھی۔ اس لئے فضا میں نہ حبس تھا اور نہ ہی گرمی تھی۔ وہاں موجود لوگوں میں مختلف عمر کی تین عورتیں تھیں، جبکہ مرد کوئی آٹھ تھے۔ وہ سب اپنے لباس سے صحرائی دکھائی دے رہے تھے۔

سبھی مردوں نے دھوتی باندھی ہوئی تھی، لیکن اس کے ساتھ کسی کی قمیص تھی اور کسی نے کرتا پہنا ہوا تھا۔ ہر مرد نے مختلف رنگ کی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ ایک بوڑھی عورت نے گہرے نیلے رنگ کا گھما گھرا اور کرتی پہنی ہوئی تھی۔ جبکہ دو جوان عورتوں نے شلوار اور قمیص پہن رکھی تھی۔ میں ان سب میں الگ دکھائی دے رہا تھا۔ یوں جیسے کوئی اجنبی ان کے درمیان میں آ گیا ہو۔ میں نے نیلی جین کے ساتھ سفید شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا، جس میں ضروری کاغذات تھے۔ کچھ دیر پہلے جب ڈھلتی ہوئی شام کی روشنی تھی، تب میں نے محسوس کیا کہ سبھی حیرت اور اجنبیت سے میری جانب دیکھ رہے ہیں۔ ایسا فطری طور پر تھا۔ اس علاقے میں پہنچ کر یہی لگ رہا تھا کہ جدید دنیا کی ترقی نے ابھی تک اس طرف کا رخ ہی نہیں کیا تھا۔ وہ لوگ جس طرح سو برس پہلے جی رہے تھے آج بھی ویسے ہی زندگی گزار رہے ہیں۔ ایسا کیوں تھا، یہ سوال اپنی جگہ جواب طلب ضرور تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ اس سوال کی سمجھ نہ آ سکے۔

مجھے بستی چراغ شاہ پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس لیے بڑے اطمینان سے ایک جانب کھڑا ریڑھا چلنے کا منتظر تھا۔ ریڑھے بان نے لالٹین جلائی تھی۔ پیلی سی روشنی ایک محدود سے دائرے میں پھیل گئی تھی۔ وہاں موجود لوگ جو ہیولوں کی صورت میں لگ رہے تھے، اب کافی حد تک صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ گزرتے وقت کے ساتھ لوگوں میں بے چینی بھی بڑھنے لگی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے ریڑھے بان سے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کب چلنا ہے بھائی، مزید کتنی دیر ہے؟''

''بس ایک بندے کا انتظار ہے، بس تھوڑی دیر انتظار کر لیں پھر چلتے ہیں۔'' اس نے دلاسا دینے والے انداز میں کہا تو وہ عورت بے مطمئن ہو گئی۔ میرا من چاہ رہا تھا کہ اس ایک

سواری کے جو پیسے بنتے ہیں میں اسے دے دوں اور اسے چلنے کا کہوں لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ نجانے وہ سواری اس ریہڑے بان کے لئے کتنی اہم ہوگی، جس کا وہ انتظار کر رہا تھا۔ میرے یوں کہنے سے وہ کہیں ناراض ہی نہ ہو جائے۔ اس وقت وہی ایک ریہڑا تھا، جس پر بستی چراغ شاہ جایا جا سکتا تھا۔ ورنہ پھر پیدل جانا پڑتا۔ دن ہوتا تو شاید کوئی ساربان، کوئی گدھے والا مجھے لفٹ دے دیتا۔ اس وقت تو ایسی کوئی سواری ملنا ہی محال تھا۔ سو میں خاموشی سے ایک جانب ہی کھڑا رہا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا ایک ہانپتا ہوا نوجوان ہمارے پاس آن پہنچا۔ وہ اندھیرے میں سے برآمد ہوا تھا۔ یوں جیسے ایک دم سے ہمارے درمیان آ گیا ہو۔ اسے دیکھتے ہی ریہڑے بان نے، ریہڑے پر بیٹھ جانے کی صدا لگائی تو اس آواز کے ساتھ جیسے ان سب میں زندگی آ گئی ہو۔ سب سے پہلے عورتوں کو سوار کرایا گیا، پھر سارے مرد اپنے اپنے سامان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پھر وہ نوجوان بیٹھا۔ میں سب سے آخر میں بیٹھا تو ریہڑا چل پڑا۔ وہ نوجوان میرے سامنے ہی ایک جانب ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اندھیرے میں وہی ایک لالٹین ہی ہمارے ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔ صحرا کا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ صرف ریہڑے کی چوں چاں سنائی دے رہی تھی یا پھر کبھی کبھار اونٹ بول پڑتا تھا۔ ریہڑے پر سوار بھی لوگ خاموش تھے۔ یوں جیسے وہ بولنا بھول گئے ہوں۔ میرے خیال میں انہیں گھر پہنچنے کی فکر نے ستایا ہوا ہوگا۔ ممکن ہے انہیں میری طرح بھوک بھی لگی ہوئی ہو۔ سارے دن کے تھکے ہوئے ہوں گے۔ وہ جو قریبی قصبے سے خریداری کر کے لوٹے تھے۔ ان کے لئے یہ بھی کوئی آسان نہیں تھا۔ تارکول والی اس سڑک سے قصبے تک کا فاصلہ کافی تھا۔ سفری سہولتیں نہ ہونے کے باعث یہ بھی ان کے لئے مصیبت ہی تھا۔

ایسے ہی ایک سفر کا دھندلا سا منظر میری یادوں میں لہرا گیا تھا۔ اس دن سورج چڑھتے ہی بستی میں ڈھول کی تھاپ گونجنے لگی تھی۔ ایک اونٹ ریہڑھا تیار تھا۔ جس کے ارد گرد رنگ برنگے کپڑے پہنے بچے کھڑے دلچسپی سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ اونٹ کو مختلف رنگوں کے کپڑوں سے سجایا ہوا تھا۔ بستی کے لوگ اپنے اپنے گھروں سے صاف ستھرے کپڑے پہنے نکل کر ڈھول والے کے پاس جمع ہو رہے تھے۔ کھانے پینے کے سامان کے ساتھ دو بکرے اور مینڈھے بھی وہاں لے آئے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد مردوں کے علاوہ چند عورتیں اور بچیاں بھی وہاں آ گئی تھیں۔ ان بچیوں میں ساوری بھی تھی۔ اس نے سرخ اور پیلے رنگ کی گوٹا لگی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ سر پر سبز رنگ کا بھوچھن تھا، جس کے کناروں پر سنہرا گوٹا چمک رہا تھا۔ اس نے اپنے سفید گالوں پر سرخ رنگ کے دائرے بنائے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک تھی، آنکھوں میں گہرا کاجل لگایا ہوا تھا۔ مجھے اسی سے دلچسپی تھی۔ عورتوں نے بڑے رنگین کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ بھوری ریت کے بھدے پن کو انہی عورتوں نے رنگین اور خوشنما کر دیا تھا۔

صحرا میں سفر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جب کسی میلے پر جانا ہوتا یا پھر کہیں کسی بارات کے ساتھ سفر کرنا ہوتا، صحرائی باشندے اسے بڑا پر لطف بنا دیتے ہیں۔ کسی بھی سواری پر عورتیں اکٹھی ہو کر بیٹھ جاتی، اسی طرح مرد ایک جانب ہو کر بیٹھ جاتے۔ ڈھول والا ساتھ میں ضرور ہوتا۔ ڈھول کی تھاپ پر گیت گاتے، ہنسی مذاق کرتے ہوئے سفر کرتے۔ صحرائی باشندوں کا سب سے اہم سفر چنن پیر کے میلے کا ہوتا۔ یہ میلہ سات جمعرات تک چلتا رہتا۔ پورے چولستان سے لوگ سفر اس میلے میں شامل ہوتے۔

وہ سفر بھی چنن پیر کے میلے ہی کے لئے تھا۔ سبھی خوش اور پر جوش تھے۔ ایک جانب کھڑی

عورتیں چھن پیر سے منسوب گیت الاپنے لگی تھیں۔ ایک ایک کرکے سارے لوگ بیٹھ گئے۔ میں اور ساوری ایک جانب بیٹھ گئے تھے۔ اونٹ ریڑھا چلا تو اس کے ساتھ کئی دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے اونٹوں پر سوار ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ٹیلوں کے درمیان بنے کچے راستوں پر سفر جاری تھا۔ ڈھول کی تھاپ پر گیت گائے جا رہے تھے۔ لوگ خوش تھے۔ ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں سفر کے ساتھ جاری تھیں۔ یہ منظر میرے سامنے تھا کہ ساوری نے مجھے ٹہوکا دیا۔ اس نے اپنے بھوچھن کے پلو میں بتاشے اور کھانے باندھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بتاشہ اٹھانا چاہا تو اس نے تیزی سے مجھے روک دیا۔

"نہ، ابھی نہیں کھانے؟" اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیوں اب کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جھوٹے ہو جائیں گے، وہاں چھن پیر کے پاس جا کر کھانے ہیں۔" اس نے معصومیت سے کہا تو میں ہنس دیا۔ میں نے اسے بڑا سمجھانا چاہا کہ کچھ نہیں ہوتا مگر وہ مانی ہی نہیں تھی۔ ایک بتاشہ تو کیا کھانا تک نہ دیا۔

اچانک مجھے لگا اونٹ ریڑھا رک گیا ہے۔ میں اپنے خیالوں سے باہر آ گیا۔ یہ میرا احساس نہیں حقیقت میں اونٹ ریڑھا رک چکا تھا۔ ہم تیز سفید روشنی کی زد میں تھے۔ سامنے اندھیرے میں تھوڑے سے فاصلے پر تیز روشنی والی دو ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ اس روشنی میں ہم سب نہا چکے تھے۔ ریڑھے پر موجود عورتوں اور مردوں کے چہرے پر خوف پھیل گیا تھا۔ وہ تیز روشنی جس قدر ہمارے قریب ہوتی چلی جا رہی تھی، ریڑھے میں جتا ہوا اونٹ اسی طرح بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ تیز روشنی ہم سے چند میٹر کے فاصلے پر آ کر رک گئی۔ میری ساری توجہ اس طرف تھی۔ مگر اسی دوران میں نے محسوس کیا کہ سب سے آخر میں آنے والا نوجوان ریڑھے

پر لیٹ گیا ہے۔ سارے سہمے ہوئے لوگ روشنی کی جانب متوجہ تھے لیکن میرے ساتھ بیٹھے نوجوان نے تیزی سے کروٹ لی اور ریپٹر ے کے آخر میں چلا گیا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ میری نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ وہ کہاں گیا؟ اسے دیکھنے کی شدید خواہش اس وقت غائب ہو گئی جب ہمارے بالکل قریب دو فائر ہو گئے۔ وہ گن سے کیے گئے فائر تھے۔ اس کے ساتھ ہی مقامی زبان میں للکارتے ہوئے کہا گیا۔

"خبردار اگر کوئی ہلا تو، ورنہ جان سے ماردیں گے۔"

وہاں موجود سب لوگ سہم گئے۔ میں بھی اس اچانک افتاد سے پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے تھوڑا سا اطمینان اس لیے بھی تھا کہ میرے ساتھ بیٹھا ہوا وہ نوجوان جس طرح صحرائی سانپ کی مانند آنکھوں کے سامنے ہی غائب ہو گیا تھا، اس کا اور ان حملہ آوروں کا آپس میں کوئی تعلق ضرور ہے۔ ٹارچ روشن ہو گئی۔ ایک حملہ آور آگے بڑھا، اس نے وہاں موجود ہر بندے کے چہرے کو ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ ہم سب خاموش تھے۔ بھی سہمے ہوئے اور خوف زدہ تھے۔ میں نے حملہ آوروں کی جانب دیکھا۔ وہ چھ لوگ تھے۔ چار کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ ایک ٹارچ لیے ہوئے تھا اور خالی ہاتھ سب کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ ملا کہ نہیں؟" ایک آواز ابھری۔

"ان میں تو نہیں ہے۔" خالی ہاتھ حملہ آور نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

"ایسا ہو نہیں سکتا۔ وہ اسی ریپٹرے پر سوار ہوا ہے۔" اندھیرے میں سے آواز ابھری تو خالی ہاتھ حملہ آور نے ریپٹرے بان کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

"اوئے، جو سب سے آخر میں سوار ہوا ہے وہ کون ہے؟"

"یہ بندہ آخر میں سوار ہوا ہے۔" اس نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو ایک لمحہ کو

میں سناٹے میں آگیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا۔ دو ہاتھ میری جانب بڑھے اور مجھے گھسیٹ کر نیچے اتار لیا گیا۔ میں سید حا ریت پر جا گرا۔ مجھے چوٹ تو نہیں آئی لیکن میں نے اپنے وزن کی وجہ سے پورے بدن میں تھرتھراہٹ ضرور محسوس کی تھی۔ میں نے لاشعوری طور پر ہر طرف دیکھا۔ وہ نوجوان کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اسے نیچے گرتے ہوئے دیکھا تھا، اس کے بعد وہ اتنی سرعت سے کہاں غائب ہو سکتا ہے؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ حملہ آور اسی نوجوان کو تلاش کر رہے تھے۔ اس نے اپنی جان بچانے کی ممکن حد تک کوشش کر لی تھی۔ وہ مجرم تھا یا معصوم تھا، وہ لمحات یہ فیصلہ کرنے کے لئے نہیں تھے۔ اس سے پہلے کہ حملہ آور مجھے اٹھانے کو جھکتے میں خود ہی اٹھ کھڑا ہو گیا۔

"اوئے سجان اوئے، دیکھ یہی ہے؟" ایک بندے نے مجھے گریبان سے پکڑتے ہوئے کسی سے پوچھا۔

"لے آ اسے ادھر۔" اندھیرے میں یہ آواز ابھری تو میں نے اپنے قریب کھڑے بندے سے سخت لہجے میں کہا۔

"کوئی وجہ تو بتاؤ، اس طرح مجھے کیوں پکڑا ہوا ہے، کون ہو تم لوگ؟"

"اوئے تم ہمارے ساتھ زبان چلاتے ہو، چل ادھر۔" یہ کہتے ہی اس نے مجھے دھکا دیا، اس کے ساتھ ہی اس نے میری پشت پر گھونسہ مارتے ہوئے دھکیلا۔ میں اس وقت تک خود پر قابو پا رہا تھا۔

میرے سامنے دو آدمی گنیں لئے کھڑے تھے۔ میں ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا تو ایک نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

"کیا یہی بھاگ کر ریچھڑے پر سوار ہوا تھا؟"

"مجھے تو یہی لگتا ہے۔" انہی میں سے ایک نے جواب دیا۔

"تم لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے تیزی سے کہا تو اچانک میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ ایک زوردار گھونسہ میری گردن پر پڑا تھا۔ میرے پیچھے کھڑے بندے نے یہ وار کیا تھا۔ میں ایک دم سے بھنا گیا۔ میں نے لاشعوری طور پر پلٹ کر اس کے منہ پر مکہ دے مارا۔ شاید وہ اس طرح کی حرکت کی امید نہیں کر رہا تھا اس لئے اوغ کی آواز کے ساتھ ریت پر جا پڑا۔ مجھ سے غلطی ہو چکی تھی اور میں اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے بھی تیار ہو چکا تھا۔ بلاشبہ میری یہ مزاحمت ان کے لئے حیران کن تھی۔ اس لئے میرے سامنے کھڑے ہوئے شخص نے مجھ پر گن تانتے ہوئے گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

"اوئے کون ہو تم؟"

"میں میرن شاہ کا مہمان ہوں، اس کی بستی چراغ شاہ میں جا رہا ہوں۔" میں نے تیزی سے کہا تو ساتھ کھڑے شخص نے حیرت اور غصے ملے لہجے میں کہا۔

"بکواس کرتا ہے، میرن شاہ کا مہمان ہو اور ہمیں پتہ نہ ہو۔"

"یہ مشکوک بندہ ہے، پکڑ لو اسے۔" سامنے کھڑے بندے نے دھاڑتے ہوئے کہا تو وہ سارے میری جانب بڑھے۔ مجھے پیچھے سے قابو کر لیا تو سامنے والے نے قریب آ کر گن کا بٹ میرے بازو پر مارا۔ درد کی شدید لہر میرے بدن میں تھرتھرا گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مجھے بڑے زور کی چوٹ لگی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا بازو سُن ہو گیا ہو۔ وہ درد قابل برداشت تھا لیکن میں یہی ظاہر کرنا چاہتا کہ میرا بازو جیسے ٹوٹ گیا ہے۔ میں بے حال سا ہو کر ایک جانب لڑھک گیا۔ انہوں نے مجھے چھوڑا نہیں بلکہ مجھے تھام کر کھڑا رکھنے کے لئے زور لگانے لگے۔ میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی تو انہوں نے مزید مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"بول اوئے کون ہو تم؟ تجھے ضرور اس بندے کے بارے میں پتہ ہوگا، ورنہ پھر تم بھی ہو۔"
سامنے کھڑے بندے نے اپنے پنجے سے میری گردن دبوچتے ہوئے کہا۔ میرا سانس رکنے لگا۔ وہ بالکل میرے سامنے تھا۔ اس کا چہرہ ذرا سے فاصلے پر تھا۔ اس کی سفید چھوٹی چھوٹی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھیں خضاب زدہ تھیں، موٹے نین نقش اور وحشت زدہ آنکھوں والا وہ شخص مجھے کافی خطرناک لگا تھا۔ میں نے مشکل سے اپنی گردن چھڑاتے ہوئے کہا۔

"میں کہہ رہا ہوں میں میرن شاہ کا مہمان ہوں۔"

"جھوٹ بول رہے ہو تم۔" اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

"مجھے لے چلو اس کے پاس، اگر جھوٹ ہوا تو کیا اکیلا بھاگ جاؤں گا؟" میں نے بھی اعتماد سے کہا تو تذبذب کا شکار ہو گئے۔

"لے تو ہم تجھے ویسے بھی جائیں گے۔" اس نے میری گردن چھوڑتے ہوئے کہا۔

"تو پھر دیر کس بات کی ہے، چل تیرے میرن شاہ کے پاس چلتے ہیں۔" میں نے جان بوجھ کر 'تیرے' پر زور دیتے ہوئے کہا تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے کہ وہ اسی کے بندے ہیں۔ ممکن ہے وہ کسی دوسرے سردار کے آدمی ہوں اور میں انجانے میں وہاں جا پہنچوں۔

"اگر یہ میرن شاہ کا مہمان ہے تو پھر وہ کدھر گیا؟" ایک ساتھی نے ریڑھے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہیڈ لائیٹ کی روشنی میں ویسے ہی ساکت کھڑے تھے۔

"انہیں جانے دے، ہم اسے لے چلتے ہیں۔" سامنے کھڑے شخص نے کہا تو دوسرا تیزی بولا۔

"اگر وہ مشکوک تھا تو یہ بھی مشکوک ہی ہے۔ وہ بندہ یہیں ہے یا اسے پتہ ہوگا، پوچھو اس سے۔"

"یار وہ ہماری نظروں کے سامنے کہاں نکل کر جا سکتا ہے۔" ایک بندے نے اکتاہٹ سے کہا۔

"اسے ڈیرے پر لے چلو۔ وہاں جا کر یہ سب کچھ بک دے گا۔" سامنے کھڑے شخص نے نفرت سے کہا۔

"ڈیرے پر کیوں یہیں اس......" ایک بندے نے جوش سے کہا تو سامنے کھڑا شخص بولا

"اب یہ کہہ رہا ہے کہ یہ سائیں کا مہمان ہے تو؟" اس نے پوچھا

"پھر تو وہیں لے جا کر سارا سچ جھوٹ نکالو۔" اس بندے نے پھر اسی اکتاہٹ سے کہا تو سامنے کھڑے شخص نے ریپٹر ے والوں کو اونچی آواز میں جانے کا کہا۔ وہ تو اسی انتظار میں تھے۔ اسی ایک آواز پر ریپٹر جا چل پڑا، کچھ آگے جا کر وہ بھاگنے لگا۔

"دیکھ تو اپنے بارے میں سچ سچ ابھی بتا دے، اگر ڈیرے پر جا کر تیرا جھوٹ پکڑا گیا تو بڑی اذیت سے ماروں گا۔" اس نے سرد لہجے میں کہا

"تم مجھے ڈیرے پر ہی لے جاؤ، میں تو پہلے ہی ادھر جا رہا تھا۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ میں انہیں یہ باور کرا رہا تھا کہ مجھے بہت زیادہ ہی چوٹ لگ گئی ہے۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نے انہیں اپنے بارے میں بتا کر اچھا کیا تھا یا کسی دشمن کے نرغے میں آ گیا تھا۔ وہ مجھے دھکے مارتے ہوئے جیپ تک لے گئے۔ تبھی ان میں سے کسی نے کہا۔

"اس کے ہاتھ باندھ لو، کہیں رستے میں گڑبڑ ہی نہ کرے۔"

کچھ دیر بعد میں بندھے ہاتھوں کے ساتھ اس جیپ میں تھا جس کا انجن چاہے مضبوط تھا لیکن اندر سے وہ بالکل کھٹارا تھی۔

جیپ چل پڑی تھی۔ ہیڈ لائیٹ میں وہی کچا راستہ دکھائی دے رہا تھا، جس پر ریشمہ گیا تھا۔ لیکن مجھے وہ دکھائی نہیں دیا۔ یا تو انہوں نے راستہ بدل لیا تھا یا پھر ریشمے والے نے کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ میں بازو پر لگی ہوئی چوٹ کو سہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں ان پر یہی ظاہر کر رہا تھا جیسے میری ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ وہ میری طرف سے بے پرواہ انجن کی پر شور آواز میں اپنی باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔

ان کی باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ انہیں کسی شخص کے آنے کی اطلاع تھی، جو ان کا دشمن تھا۔ یہ اسے مارنا چاہتے تھے۔ ان کی دشمنی کیا تھی مجھے اس بارے تو پتہ نہ چل سکا لیکن ان کی نفرت سے لگتا تھا کہ معاملہ کوئی گھمبیر ہی ہے۔ اس بندے کی وہی نشانیاں تھیں۔ اس نے شہر کی طرف سے آنا تھا اور اسی ریشمے پر جانا تھا۔ انہیں اطلاع مل چکی تھی۔ میرے خیال میں وہ بالکل درست اور وقت پر پہنچے تھے۔ انہوں نے گھیرا بھی ٹھیک تھا۔ یہ اس نوجوان کی پھرتی تھی کہ وہ خود کو بچا گیا۔ تاہم اس کی حیرت مجھے بھی تھی کہ وہ میرے پاس لیٹا تھا اور پھر ریشمے سے خود کو گرا کر کدھر گیا تھا؟ وہ کوئی سانپ تھا جو صحرا میں غائب ہو گیا۔ آخر وہ اتنی جلدی گیا کہاں؟ یہ میرے لئے بھی حیران کن بات تھی۔

☆......☆......☆

ہم بستی چراغ شاہ جا پہنچے تھے۔ وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی کچے راستے، اندھیرے میں ڈوبی ہوئی بستی اور وہی ہو کا عالم تھا۔ بستی سے باہر بنے ڈیرے کا لکڑی والا پھاٹک بند تھا۔ جیپ رکتے ہی پھاٹک کھل گیا۔ ایک بوڑھا پھاٹک کے پار کھڑا تھا۔ رات کے سناٹے میں جیپ کی آواز اس نے سن لی ہو گی اور اس نے آ کر پھاٹک کھول دیا۔ جیپ ڈیرے کے صحن میں جا رکی جہاں پہلے ہی سے ایک جیپ اور کار کھڑی تھی۔ ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ مجھے نیچے

اتار لیا گیا۔

وہ ڈیرہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ وہی مشرقی جانب بنے کچے کمرے، جن کے آگے ایک طویل برآمدہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک لمبی دیوار تھی جس کے پار سائیں میرن شاہ کا گھر تھا۔ وہ گھر بھی چند کچے کمروں پر مشتمل تھا۔ جس کے آگے بڑا سارا صحن تھا، جس کا پھاٹک مخالف سمت میں تھا۔ ڈیرے کے شمال کی جانب دیوار کے پار باڑہ تھا۔ جس میں مویشی رکھے جاتے تھے۔

ان صحرائی علاقوں میں کسی کی امارت کا معیار اس کے پاس جانوروں کی تعداد سے ہوتا ہے۔ جس کے پاس زیادہ مویشی، وہ زیادہ امیر مانا جاتا ہے۔ میرن شاہ چونکہ اس علاقے کا سب سے معتبر بندہ تھا اس لئے اس کے پاس مویشی سب سے زیادہ ہونا لازمی تھا۔ صحرا کے ان باشندوں میں بڑی شدت پائی جاتی تھی۔ علاقے پر اپنی حاکمیت قائم رکھنے کے لئے لوگوں پر ظلم کرنا ان کا وطیرہ تھا۔

ایک کمرے میں دیے کی روشنی تھی۔ باقی سب بند تھے۔ کسی بھی کمرے میں کوئی روشنی نہیں تھی۔ ہیڈ لائیٹس بند ہوتے ہی اندھیرا چھا گیا تبھی ایک آواز ابھری۔

”پتہ کرو سائیں جاگ رہے ہیں تو اس کا بتاؤ.....“

”پوچھو اس سے یہ کون ہے؟“ دوسری آواز ابھری

”اب تو اس کا سائیں ہی فیصلہ کریں گے۔ اگر اس کا جھوٹ ہوا تو سسکا کر ماردیں گے۔“ پہلی آواز میں کہا گیا

”چل میں پتہ کرتا ہوں، اسے بٹھا ادھر۔“ دوسری آواز نے کہا تو اس کے ساتھ ہی ٹارچ روشن ہوگئی۔ وہ ٹارچ لئے ایک دیوار کی جانب بڑھ گیا جس میں ایک چھوٹا سا دروازہ میرن شاہ کے گھر میں کھلتا تھا۔ ایک شخص مجھے کالر سے پکڑ کر ادھر لے جانے لگے جہاں چار پائیاں

پڑی ہوئی تھیں۔ تاروں کی روشنی میں ہیولے واضح ہونے لگے تھے۔ ہیڈ لائٹس کی وجہ سے آنکھیں ابھی اندھیرے کی عادی نہیں ہوئی تھیں۔ وہ سب ایک چارپائی پر جا کر بیٹھ گئے۔ ایک نے مجھے نیچے بیٹھنے کو کہا تو نجانے کیا خیال آیا پھر مجھے چارپائی پر بیٹھ جانے کو کہا۔ میں اطمینان سے بیٹھ گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد دیوار کے پار ٹارچ کی روشنی ہوئی۔ وہی شخص دوبارہ نمودار ہوا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

”سائیں تو سو گئے ہیں۔“

”چل پھینک اسے ادھر کسی کمرے میں، صبح دیکھ لیں گے۔“

”اب ساری رات اس کی رکھوالی کرنی پڑے گی۔“

ان کی باتیں سن کر میں نے کہا۔ ”او، مجھے یہیں اس چارپائی پر رہنے دو۔ میں یہیں سو جاؤں گا۔ تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”تم بھاگ کر جانے کی ذرا ہمت تو دکھاؤ۔“ ایک نے غراتے ہوئے کہا تو میں کراہتا ہوا وہیں چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔

وہ بھی ارد گرد پھیل گئے۔ مجھے بڑے زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی مگر اب مجھے صبر ہی کرنا تھا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ مجھ سے ذرا فاصلے پر ایک صراحی پڑی تھی۔ جس سے وہ پانی پی رہے تھے۔ مجھے بھی پیاس لگی تھی میں نے پانی مانگا۔

”اٹھ کر پی لو۔“

”میرے ہاتھ کھولو گے تو پیوں گا۔“ میں نے کہا تو چند لمحے وہ سوچتے رہے پھر ایک نے میرے ہاتھ کھول دیئے۔ میں نے صراحی کے پاس پڑے پیالے میں پانی ڈالا۔ پھر پانی پی

گیا۔وہ ذرا سا نمکین تھا لیکن غنیمت تھا۔میں پانی پی کر لیٹ گیا۔

میں بہت تھک گیا تھا لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرے بازو میں درد مچل کر اپنے ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔

چاروں جانب سناٹا تھا۔آدھی رات ہونے کو آ گئی تھی۔رکی ہوئی ہوا دھیرے دھیرے چلنا شروع ہو گئی تھی۔تاروں کی روشنی میں اندھیرا کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔

انسان جہاں رہتا ہے، وہاں اپنے نشان ضرور ثبت کرتا ہے۔اس کے وہاں ہونے کا احساس رہتا ہے۔وہ چاہے کچھ وقت کے لئے یا تا دیر نشانیاں چھوڑ جائے۔یہی تاریخ ہوتی ہے۔یہ ڈیرہ بھی اپنے اندر بڑی تلخ یادوں کو سموئے ہوئے تھا۔اس چار دیواری کے اندر کتنے انسانوں کی چیخیں گونجی تھیں۔یہ خاموش در و دیوار گواہ تھے کہ کس کے ساتھ ظلم ہوا اور کسے سزا دی گئی تھی۔

میرے سامنے جیسے منظر آ کر پڑا تھا۔وہ گرم موسم کی سہ پہر تھی جب بستی کے دو لوگوں کو یہاں ڈیرے پر لایا گیا تھا۔ان کا قصور یہی تھا کہ انہوں نے میرن شاہ کے باپ سیدن شاہ کی حکم عدولی کی تھی۔اس نے اپنا ریوڑ چرانے کے لئے حکم دیا تھا۔ان دو لوگوں نے سیدن شاہ کا حکم نہیں مانا تھا۔یہ بہت بڑا جرم کیا تھا انہوں نے۔جب وہ دونوں ڈیرے میں لائے گئے تو وہ لہولہان تھے۔سیدن شاہ کے کارندے انہیں ان کے گھروں سے مار پیٹ کر یہاں لائے تھے۔ ان کی آہیں اور سسکیاں گونجنے لگی تھیں۔سب جانتے تھے کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔ کیونکہ ان دونوں کے بارے میں کہا یہ جاتا تھا کہ وہ سیدن شاہ کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

جہاں میں چارپائی پر پڑا تھا،اس سے تھوڑے فاصلے پر سیدن شاہ ایک چارپائی پر بیٹھا تھا۔وہ دونوں اس کے سامنے لا کر کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ان کے ہاتھ انہی کے پرنوں

سے باندھے ہوئے تھے۔ ایک کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ دوسرے کی سینے کے پاس خون سے قمیص بھیگی ہوئی تھی۔ دونوں ہی تکلیف کی شدت سے کراہ رہے تھے۔ سیدن شاہ نے انتہائی نفرت اور غصے میں انکی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تم دونوں کی ہمت کیسے ہوئی میرا ریوڑ نہ لے جانے کی؟"

"سائیں، میری ماں بیمار ہے، میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔" ایک نے احتجاج بھرے لہجے میں کہا تو سیدن شاہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ اس کی ماں کس قدر بیمار ہے، وہ کیوں نہیں جا سکتا، اس نے اپنے بندوں کو حکم دیا کہ اسے لٹا کر کے چھتر ماریں جائیں۔ اگلے ہی لمحے اس کے بندوں نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اسے زمین پر الٹا لٹا دیا۔ پھر زور زور سے جوتے مارے گئے۔ پیچھے پڑے ہوئے اس بندے کی چیخیں نکلنے لگیں۔ در و در حیرت سے خاموش تھے۔ صرف اتنی سی بات پر اسے ذلیل کرتے ہوئے اذیت دی جا رہی تھی۔ سیدن شاہ نے دوسرے سے کچھ نہیں پوچھا، بلکہ اسے بھی ویسا ہی کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بندوں نے پہلے والے کو چھوڑ کر اسے بھی لٹا کر مارنے لگے۔ اس کی چیخیں بھی بلند ہوئی تھیں۔ کچھ دیر تک یہ ظلم چلتا رہا۔ وہ مارنے سے زیادہ انہیں ذلیل کر رہے تھے۔ ایسی ایسی گالیاں دی جا رہی تھی کہ عام حالات میں کسی کو دی جائیں تو وہ بھی مرنے مارنے پر اتر آئے۔ وہ دونوں مار کھاتے رہے، چیختے رہے یہاں تک کہ وہ معافی پر اتر آئے۔ ریوڑ نہ چرانا تو بہانہ تھا اصل بات یہی رہی ہوگی کہ وہ سیدن شاہ کو اچھا نہیں لگتے تھے۔ کوئی بھی ظالم حاکم اپنی رعیت میں کسی باغی کو پسند نہیں کرتا۔ یہی تاریخ ہے۔

شاید وہ بھی کوئی ایسا ہی باغی تھا۔ وہ بھی اسی ڈیرے کے صحن میں رسیوں میں بندھا ہوا پڑا تھا، وہ لہولہان تھا۔ وہ بستی کا نہیں تھا۔ کہاں کا تھا یہ بھی معلوم نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑا گھبرو جوان تھا۔

وہ بندھا ہوا ابھی سیدن شاہ کے بندوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ پتہ نہیں اس کا جرم کیا تھا۔ سیدن شاہ کے ساتھ اس کی بڑی تیز تلخ کلامی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ سیدن شاہ نے اپنی کلہاڑی کا وار کیا تو اس کے سینے سے خون کا فوارا ابل پڑا تھا۔ یہ منظر بڑا خوف ناک تھا۔ پتہ نہیں وہ بندہ مر گیا تھا یا زندہ تھا، کیا ہوا تھا اس کے ساتھ۔

تاروں کی روشنی میں ملجگا اندھیرا بھر میرے اردگرد چھا گیا تھا۔ باقی سب سو گئے تھے۔ مجھ سے فاصلے پر بیٹھا ایک بندہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ بوڑھا جس نے پھاٹک کھولا تھا، اب اس کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ میں سو جانا چاہتا تھا۔ لیکن نیند میری آنکھوں سے بچھڑ گئی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اسی ڈیرے پر ہونے والے کئی منظر لہرائے تھے۔ کچھ ادھورے، کچھ نامکمل سے، کسی میں کوئی چہرہ شناسا تھا، کوئی اجنبی تھا، کوئی بات ادھوری تھی، کوئی جملہ کانوں میں گونجا تھا۔ پھر منظر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگے۔

☆......☆......☆

صبح کی نیلگوں روشنی ہر جانب پھیل چکی تھی۔ میں نے کروٹ لی تو میرے بازو میں درد کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ میں ڈیرے کی ایک کھری چارپائی پر پڑا تھا۔ صحن میں کسی دوسری چارپائی پر کوئی بھی نہیں تھا۔ جیپیں اور کار ویسے ہی کھڑی تھیں۔ میں ابھی کسلمندی سے پڑا تھا کہ دیوار کے چھوٹے دروازے سے ایک لمبا تڑنگا ادھیڑ عمر شخص نکلتا ہوا ڈیرے میں آگیا۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی دھوتی اور قمیص پہنی ہوئی تھی۔ سر پر سفید رنگ کی پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ اس کے بھاری چہرے پر خضاب زدہ سیاہ مونچھیں اور ہلکی ہلکی سفید داڑھی تھی۔ وہ میری جانب شک بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے صحن میں آتے ہی تین چار بندے کسی کونے کھدرے سے نکل کر وہاں آگئے۔ اس کے پیچھے بھی دو آدمی تھے جن کے

ہاتھوں میں گنیں پکڑی ہوئی تھیں۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ میرن شاہ ہو سکتا ہے۔ میں اسے دیکھتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ بالکل میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تو ایک بندے نے کہا۔

"سائیں یہ بندو رات ہمارے ہاتھ لگا تھا، کہہ رہا ہے کہ یہ آپ کا مہمان ہے۔"

مجھے یقین ہو گیا کہ یہی میرن شاہ ہے۔ اس نے ماتھے پر تیوریاں چڑھاتے ہوئے مجھ سے بڑے تحقیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

"کون ہو تم؟ میرے مہمان کیسے ہو؟"

مجھے اس کا لہجہ برا لگا تھا۔ اس کے اس جواب سے میں سمجھ گیا کہ اُسے اب تک پتہ ہی نہیں ہے اور اگر پتہ ہے تو یہ انتہائی بیہودہ انسان ہے۔ اس لئے میں نے بھی کوئی لحاظ کئے بنا کہا۔

"میں سرکاری اہلکار ہوں اور لاہور سے یہاں آیا ہوں۔ اس علاقے کے ایم پی اے نے مجھے منتیں کر کے یہاں بھیجا ہے، کیا تم جانتے نہیں ہو۔" نا چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں اکتاہٹ اور غصہ چھلک پڑا تھا۔ اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا، شاید اسے گمان بھی نہیں تھا کہ میں اس سے اس طرح بدتمیزی سے بولوں گا۔

"اس نے بتایا تو تھا کہ کوئی سروے کے لئے آنے والا ہے لیکن یہ تو دو مہینے پہلے کی بات تھی اور تم اب آئے ہو؟" اس نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"یہ پوچھو اپنے ایم پی اے سے، کس کس کی منت نہیں کی اس نے یہاں آنے کے لئے۔ مجھے بھی نہیں آنا چاہئے تھا۔ ہمارا تو کام ہے ہی ویرانوں میں جانے کا لیکن یہاں جیسے اجڈ اور بدتمیز لوگ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔" میں نے غصے میں کہا تو اس نے تحمل سے میری جانب دیکھا پھر میرے سامنے پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"یہ دراصل ایک بندے کے پیچھے......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"او شاہ جی، یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا، میں نے انہیں بتایا بھی کہ میں کون ہوں، مگر یہ اپنی ناکامی کا غصہ مجھ پر اتارنے لگے۔"

"کیا کیا انہوں نے؟" اس نے دھیمے سے پوچھا۔

"میں انہیں بتا رہا تھا کہ میں میرن شاہ کا مہمان ہوں لیکن ان میں سے کسی نے گن کا بٹ مار دیا میرے، مجھے ذلیل کرنے کے لئے باندھ کر یہاں لایا گیا۔ جب میں یہاں خود آنا چاہ رہا ہوں تو یوں قیدی بنا کر لانے کا کیا مطلب ہے؟ اتنے ڈرپوک اور بزدل بندے رکھے ہوئے ہیں تم نے۔ ایک بندہ بھی باندھ کر لائے ہیں یہ۔" میں نے جان بوجھ کر ہتک آمیز لہجے میں کہا۔

"خیر یہ اچھا نہیں ہوا۔" اس نے اپنی مونچھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا پھر لمحہ بھر بعد بولا،

"اب تمہارے ماتھے پر تھوڑا لکھا ہوا ہے کہ تم نے یہاں آنا ہے یا تم سرکاری ملازم ہو۔"

"میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میرے بارے اگر تصدیق کرنی ہے تو اپنے ایم پی اے پوچھ لو۔ دوسرا میرے سارے کاغذ اس بیگ میں تھے، جو ریڑھے پر رہ گئے ہیں۔ ورنہ میں اپنی شناخت ابھی دکھا دیتا۔" میرے کہنے پر میرن شاہ کے چہرے پر سختی کم ہو گئی اس نے اپنے ایک بندے سے کہا۔

"وہ کون تھا ریڑھے والا؟"

"وہ تو تھا خیرو والے ٹوبے کا۔" اس بندے نے فوراً جواب دیا۔

"جاؤ، اس سے بیگ لے کر آؤ۔" اس نے حکمیہ لہجے میں کہا تو وہ فوراً وہاں سے چلا گیا،

جیسے وہاں ٹھہرا تو اس پر افتاد پڑ جائے گی۔ میرن شاہ نے کچھ دیر میری طرف دیکھا اور بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کچھ دیر بعد تمہارا بیگ آجائے گا۔ فکر نہیں کرو۔ تم اٹھ کر نہالو، میں تمہارے لئے نئے کپڑے بھیجتا ہوں، وہ پہن لینا۔ مجھے پتہ ہے تم نے رات سے کچھ نہیں کھایا وہ بھی......"

"نہیں، میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ میرا بیگ آجائے تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اپنے ایم پی اے سے کہتا، وہ میری جگہ کوئی دوسرا بندہ یہاں بھیج دے گا۔" میں نے جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر اسے ایسا کہا تھا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر بڑے سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"تم پڑھے لکھے ہو، بات کو سمجھ سکتے ہو، یہ واقعی ہی اجڈ ہیں، انہیں کون سمجھائے۔ میرا خیال ہے یہ غلطی نظر انداز کر دو۔ آئندہ یہ خیال رکھیں گے۔"

"مجھے یہاں سروے کرنا ہے، اس علاقے میں مجھے پھرنا ہے، دیکھنا ہے یہ علاقہ، یوں تو کوئی بھی مجھے پکڑ کر اپنا قیدی بنا لے گا۔ لگتا ہے شاہ جی تمہارا رعب نہیں اس علاقے پر۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ بے اختیار ہنس دیا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"او نہیں، میرے حکم کے بغیر یہاں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ تم آزاد ہو کر اپنا کام کرنا، کوئی انگلی کا اشارہ بھی نہیں کرے گا۔"

"مجھے بتاؤ، اتنی ذلت کے بعد بھی کوئی یہاں ٹھہرے گا؟" میں پھر سے اڑ گیا۔ میرے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

"او نہیں اب کچھ نہیں ہوتا، ویسے نام کیا ہے تمہارا؟" اس نے پرسکون سے لہجے میں پوچھا تو میں نے دھیمے سے کہا۔

"علی زین نام ہے میرا۔"

"ٹھیک ہے علی، تم تازہ دم ہو جاؤ۔ ناشتہ کرو۔ اتنے میں بیگ آ جائے گا، پھر جو فیصلہ کرنا ہو کر لینا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس پر میں خاموش رہا تو وہ بولا، "ایک بات تو بتاؤ"

"پوچھو......" میں نے ہنکارہ بھرنے والے انداز میں کہا۔

"تم لاہور سے یوں خالی ہاتھ نکل آئے تھے۔ صرف بیگ تھا تمہارے پاس؟" اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ اس نے بالکل درست سوال کیا تھا اور اس سوال کی مجھے پوری طرح توقع تھی۔ اس لئے میرے پاس اس کا جواب بھی تھا، سو میں نے کہا۔

"میں اپنی سرکاری جیپ پر آیا تھا۔ لیکن یہاں قریب جو قصبہ ہے ماناوالا، وہاں پر خراب ہو گئی۔ میں نے وہیں سے ایک مستری کو دکھائی۔ اس نے بتایا کہ اب تو نہیں یہ صبح تک ٹھیک ہو گی۔ جیپ میں نے اس کے پاس چھوڑ دی کہ صبح لے لوں گا، میں نے اسے بھی یہی بتایا تھا کہ میں میرن شاہ کا مہمان ہوں۔ مستری شاید اسی وجہ سے مجھے ایک موٹر سائیکل پر وہاں چھوڑ گیا، جہاں سے رینجر ملے والا ملا تھا۔ آگے جو ہوا......"

"کوئی بات نہیں وہ جیپ بھی آ جائے گی" اس نے پوچھا۔

"ہاں میرا سامان اسی میں ہے۔" میں نے بتایا

"خیر کوئی بات نہیں، اب تم ہمارے مہمان ہو۔" اس نے بڑے سکون سے نرم لہجے میں کہا

"مہمان......" میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا

"یہ سامنے والا کمرہ لے لو، اس میں رہو، یہ بابا خیر دین یہیں رہتا ہے ڈیرے پر۔ یہ تمہارا خیال رکھے گا۔ کسی شے کی ضرورت ہو تو اسے کہہ دینا۔ یہ حاضر کر دے گا۔"

"ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں ایک دو دن۔" میں نے اپنی نیم رضامندی ظاہر کر دی تو اس

نے میری جانب سے رُخ پھیر کر سامنے کھڑے اپنے بندوں سے کہا

''اوئے بے غیرتو، وہ بندہ کدھر گیا جسے تم پکڑنے گئے تھے؟''

سامنے کھڑے سبھی لوگ خاموش تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ تبھی میں سمجھا کہ وہ پہلے والا بندہ اتنی تیزی سے کیوں یہاں سے نکلا تھا۔ چند لمحوں بعد ایک بندے نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا

''سائیں، یقین جانیں، ہم موقع پر پہنچ گئے تھے۔ ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ وہ ریہڑے پر سوار ہے۔ ہم نے گھوم کر آگے سے اسے گھیرا تھا۔ وہ......''

''کہانی مت سنا بے غیرت۔'' اس نے غصے میں کہا

''وہ ہمیں دکھائی ہی نہیں دیا۔ ریہڑے پر بھی ملا تو ہم اسے پکڑ کر لے آئے۔ وہ......''

''وہ اب تک اسی علاقے میں ہوگا، اگر وہ نکل گیا تو سمجھو تم سب کی خیر نہیں، ابھی نکلو اور پتہ کرو، وہ کدھر گیا، کس کے پاس ہے؟ ڈھونڈو اسے۔'' اس نے دھاڑتے ہوئے حکم دیا پھر اٹھ کر واپس اسی دیوار کی جانب بڑھ گیا جس میں چھوٹا دروازہ تھا۔

میں چارپائی پر بیٹھا رہا۔ وہ سب لوگ وہاں سے جیپ میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں اکیلا وہاں رہ گیا۔ رات کے قیدی ہونے اور اب مہمان بن جانے میں بڑا فرق تھا۔ بھوک سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ رات کی کپڑوں سمیت جسم پر لگی ریت سے الجھن ہو رہی تھی۔ بازو میں ہلکا ہلکا درد بے چین کر رہا تھا۔ یہ سب اپنی جگہ ایک حقیقت تھی لیکن میں کچھ اور ہی سوچتے ہوئے لاشعوری طور پر ان باتوں کو ثانوی حیثیت دے رہا تھا۔

''یہ لو کپڑے۔'' بوڑھا خیر دین میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا نام بڑا جانا پہچانا تھا۔ تب سے تجسس تھا کہ اسے غور سے دیکھوں۔ میں نے دیکھا، وقت نے اس کے چہرے پر بڑے

گہرے نقش چھوڑے تھے۔ لیکن وہی نقش اس کی پوری شناخت رکھتے تھے۔ میں صرف بوڑھے خیر دین ہی کو نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس کے ساتھ جڑی اس سادوری کو بھی محسوس کر رہا تھا جو اپنے پلو میں کھانے کی چیزیں باندھا کرتی تھی۔

''او بھائی یہ لو کپڑے۔'' اس نے دوبارہ کہا تو میں اپنے خیالوں سے باہر آ گیا۔ میں نے وہ کپڑے لے لئے۔ وہ ایک نئی دھوتی تھی اور اسی رنگ کی ایک قمیص تھی۔

''میں نہاؤں گا کہاں؟'' میں نے پوچھا

''وہ سامنے۔'' اس نے ایک نکڑ کی طرف اشارہ کیا جہاں چھوٹی چھوٹی دیواریں کر کے اوٹ بنا دی گئی تھی۔ ''میں پانی رکھ دیتا ہوں۔''

ایک بار تو میرا دل کیا کہ اس سے یہ خدمت نہ لوں مگر پھر میں نے دل پکا کر لیا۔ کپڑے ایک طرف رکھ کر میں پھر لیٹ گیا تاکہ وہ پانی بھر لے تو میں نہاؤں۔

میں نہا کر پلٹا تو سورج نکل آیا تھا۔ برآمدے میں پڑی چارپائی پر ناشتے سے بھری ٹرے دھری ہوئی تھی۔ پراٹھے، مکھن اور لسی کی مہک نے میری اشتہا بڑھا دی تھی۔ میں نے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور وہیں چارپائی پر لیٹ گیا۔ میں جی بھر کے سونا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

سہ پہر ہونے کو تھی جب میری آنکھ کھلی۔ پہلی نگاہ اس سرکاری جیپ پر پڑی، جس پر میں مانا والا تک آ گیا تھا۔ میراں شاہ نے وہ جیپ منگوالی تھی یا مستری وہاں چھوڑ گیا تھا۔ میں اٹھا اور جیپ تک گیا۔ اس میں سے اپنا سوٹ کیس اور بیگ نکالا اور کمرے تک لے آیا۔ مجھے دھوتی میں الجھن ہو رہی تھی۔ میں نے شلوار سوٹ پہن کر خود کو پرسکون کیا۔ پھر پین کلر لیں تاکہ میرے بازو کا درد کم ہو جائے۔

گرمی اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن کمرے میں حبس تھا۔ میں برآمدے میں آ کر لیٹ گیا۔
مجھے ساوری یاد آنے لگی۔ گوری چٹی، تیکھے نین نقش والی۔ بھورے سے بال، جو تیل میں چپڑے رہتے تھے۔ اس سے اپنا بھولپن نہیں سنبھالا جاتا تھا۔ ہمیشہ دائیں ہاتھ سے کندھے پر لٹکائی رہتی تھی۔ بچپن سے جوانی تک اگرچہ چہرے کے نقوش وہی رہتے ہیں لیکن اتنی تبدیلی آ جاتی ہے کہ بندہ پہچانا ہی نہیں جاتا۔ اس کا تجربہ مجھے ہو گیا تھا۔ اب ساوری نجانے کیسی ہو گی؟ وہ پرانا بچپن تو نجانے کب سے پیچھے چھوڑ چکی ہو گی۔ اگر وہ اچانک سامنے آ گئی تو کیا وہ پہچانی جا سکے گی؟ یہ سوچتے ہی دل اتنا تیز تیز دھڑکنے لگا جیسے ابھی بے قابو ہو جائے گا۔
"بیٹا کوئی شے چاہئے؟" بابا خیر الدین کی آواز پر وہ چونک گیا۔ وہ میری چارپائی کی پائینتی کی جانب کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے فوراً اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا
"نہیں، مجھے کچھ نہیں چاہئے؟"
"بھوک تو لگی ہو گی؟" اس نے پوچھا
"ہاں تھوڑی بہت۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا
"تم سو رہے تھے، اس لئے میں نے تمہیں جگایا نہیں، دوپہر کی روٹی تو تیار تھی۔ ویسے دوپہر کو لوگ ادھر کھاتے نہیں ہیں۔" اس نے مجھے وہاں کے معمول کے بارے میں بتایا۔
"کوئی بات نہیں، میں شام کو کھا لوں گا، بابا تم پریشان نہ ہو۔ کم از کم میری وجہ سے پریشان نہ ہونا۔"
"نہیں جی، میں نے کیا پریشان ہونا، اب سائیں نے خدمت پر لگا دیا ہے تو مہمان کی خدمت تو کرنی ہے نا۔" اس نے بڑی بے چارگی سے کہا تو میرا دل بھر آیا۔ میں اسے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اپنے لفظوں کو ہونٹوں تلے دبا لیا۔ تبھی میں نے اسے کہا

"آؤ بابا، ادھر میرے پاس بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔"

میرے کہنے پر وہ سامنے پڑی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا

"ہاں پوچھو۔"

"تم اسی بستی کے ہی ہو نا، مطلب یہیں رہتے ہو؟" یہ ایک فضول سا سوال تھا لیکن یہ پوچھے بنا چارہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے جھریوں بھرے چہرے سے میری طرف دیکھا اور دھیمے سے بولا۔

"ہاں میں یہیں پیدا ہوا، تب سے یہیں اسی بستی میں رہتا ہوں۔"

"مطلب شادی بھی یہیں ہوئی اور بچے بھی......" میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں، میری بیوی تو اب نہیں رہی، ایک بیٹا ہے اور ایک بیٹی۔ بیٹے کی شادی ہو گئی ہے لیکن بیٹی کی ابھی نہیں ہوئی۔" اس نے بتایا تو نجانے مجھے کیوں خوشی محسوس ہوئی، ساودری کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کہاں تھی، یہ میں پوچھ نہیں سکتا تھا، اس لئے جان بوجھ کر موضوع بدل دیا۔

"اگر میں یہ پوچھوں کہ اتنی زندگی میں تمہارے نزدیک یہاں سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟"

میرے پوچھنے پر اس نے ایک بار میرے چہرے پر دیکھا، جیسے بہت کچھ کہنا چاہتا ہو، مگر جیسے اس کے چہرے پر ٹھہراؤ آ گیا ہو۔ وہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

"ظلم، یہاں سب سے بڑا مسئلہ ظلم ہے۔"

"کیسا ظلم بابا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"یہی ظلم کہ یہاں انسان اور جانور ایک ہی ٹوبے سے پانی پیتے ہیں۔ایک جانب انسان پانی بھر رہا ہوتا ہے تو دوسری جانب کتا اپنی پیاس بجھا رہا ہوتا ہے۔کیا یہ ظلم نہیں ہے؟"

اس نے بڑی خوبصورتی سے بات کو موڑ دیا تھا۔میں نے تو ایک لمحہ یہی سمجھا تھا کہ وہ میرن شاہ یا اس کے باپ سیدن شاہ کے مظالم گنوائے گا۔وہ بتائے گا کہ یہاں خون کس قدر ارزاں ہے۔

"ہاں، پانی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے یہاں۔یہاں ٹوبے بھی میرا خیال ابھی کچے ہیں؟"میں نے یونہی پوچھ لیا

"ہاں، کچے ہیں۔"اس نے سکون سے کہا

"اچھا بابا، کوئی تو جوان لڑکا یہاں مل جائے گا جو اس سارے علاقے سے اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو، میں نے اس سارے علاقے میں پھرنا ہے۔"میں نے اس سے پوچھا

"یہ بات تم سائیں میرن شاہ سے کہنا، وہ تمہارے ساتھ کوئی بندہ بھیج دے گا۔اب بتاؤ اگر کچھ کھانا پینا ہے تو؟"یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔

"نہیں۔"میں نے کہا تو مجھے یاد آ گیا، تب میں نے جلدی سے پوچھا،"بابا وہ میرا بیگ جو رینجرز سے پرے رہ گیا تھا؟"

"وہ ابھی نہیں آیا۔"اس نے کہا اور میرن شاہ کی رہائش کی جانب بڑھ گیا۔میں پھر سے لیٹ گیا۔میرے ذہن میں اک اور تصویر ابھرنے لگی تھی

بستی میں ایک چھوٹی سی کچی مسجد تھی۔صبح کی نیلگوں روشنی میں سب بچے مسجد میں جاتے تھے۔نماز ہو جاتی تو وہ پارے لیکر بیٹھ جاتے۔کچھ دیر بعد بچیاں بھی آنا شروع ہو جاتی۔ساوری کے ساتھ ایک اور لڑکی ہوتی تھی۔وہ ساوری کی طرح چہکتی نہیں تھی۔بڑی خاموش

رہتی تھی۔ پتہ نہیں وہ کون تھی، اس کا چہرہ ہیولے کی مانند نگاہوں میں تھا۔ گول سا چہرہ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، سرخ جیسے لہو چھلکتے ننھے منے ہونٹ۔ بس اتنا وہ ذہن میں آ رہی تھی، کون تھی یہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

اک ساتول بھی تھا، بڑے غصے والا۔ رنگ تو اس کا سانولا تھا ہی لیکن نین نقش بڑے تیکھے تھے۔ بڑا تیز تھا، سب کو ہرا دیا کرتا تھا۔ کہیں ڈیرے سے ذرا فاصلے پر ایک کیکر ہوتا تھا، اس کے پاس بڑا کھیلتے تھے۔ وہ کیکر پتہ نہیں وہاں تھا کہ نہیں۔ میں ایک دم سے اٹھ گیا۔ میں پاؤں میں ہلکے پھلکے جوتے تھے۔ میں اٹھا اور لکڑی کے پھاٹک کی جانب بڑھ گیا۔ میں ڈیرے سے باہر آ گیا۔ جنوب مغرب سے چلنے والی ہوا اب کافی حد تک تھم چکی تھی۔ میں اس جانب بڑھ گیا جدھر وہ کیکر ہو سکتا تھا۔

وہ کیکر دور ہی سے دکھائی دے گیا۔ بہت بڑا ہو چکا تھا۔ بڑی عجیب بات ہے، برگد جتنا پرانا ہوتا ہے، وہ اتنی زیادہ اور گھنی چھاؤں دینے لگتا ہے لیکن یہ کیکر پرانا ہو کر بھی اتنی زیادہ چھاؤں نہیں دے سکتا۔ ہاں اس کے کانٹے زیادہ ہو جاتے ہیں۔ میں اس جانب بڑھتا گیا۔ کیکر کے نیچے کافی ساری بکریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کچھ ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں۔ ایک نوجوان نیلی قمیص اور سفید دھوتی باندھے سفید رنگ کی پگڑی باندھے وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ میں نے اس کے نقوش میں بچپن کا سانول تلاش کرنے کی کوشش کی۔ یوں لگا کہ شاید وہی ہو۔ وہ ایک اجنبی کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر علیک سلیک کی اور بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

"اسی بستی کے ہو نا؟"

"ہاں، میں ادھر ہی رہتا ہوں۔" اس نے مقامی زبان میں کہا۔

”یہ ریوڑ تمہارا ہے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے خود تیز لہجے میں شک بھرا سوال کر دیا

”میرا ہے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”ایسے ہی، بس میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے اسی تیز لہجے میں پھر سے سوال کر دیا

”نہ کیوں باتیں کرنا چاہتے ہو، تم خود بتاؤ تم کون ہو؟“

”تم تو لڑنے لگے ہو یار، میرا نام علی ہے اور میں یہاں میرن شاہ کا مہمان ہوں، اب بتاؤ تمہارا نام کیا ہے۔“ میں نے جان بوجھ کر میرن شاہ کا نام لیا تھا، جس کا میں نے واضح اثر دیکھا۔ وہ تھوڑا ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے میری جانب غور سے دیکھا پھر بولا

”ساون ہے میرا نام، یہ ریوڑ میرا اپنا ہے۔ اب بولو۔“

”کچھ نہیں۔“ میں نے اپنے اندر کی خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ وہ بالکل بچپن جیسا تھا۔ لڑاکا، تیز اور شک کرنے والا۔

”تو پھر پوچھ کیوں رہے تھے؟“ اس نے شک بھرے لہجے میں سوال کیا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا

”بس یار یہاں کے لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ ان سے باتیں کرنا چاہتا تھا تمہیں برا لگا تو کوئی بات نہیں میں کسی دوسرے سے بات کر لوں گا۔“

”تو ٹھیک ہے، جاؤ کر لو۔“ اس نے اکھڑ لہجے میں کہا تو میں ہنس دیا۔ اس پر ساون نے مجھے غور سے دیکھا، اس کا چہرہ تن گیا تھا۔ بلاشبہ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اس کا مذاق اڑا رہا ہوں۔ اس نے چند لمحے میری طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر کر اپنے ریوڑ کو ہانکنے لگا۔ اس کا واضح

مطلب تھا کہ اب وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ بالکل انہی لمحوں میں مجھے وہ چہرہ یاد آنے لگا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی کا ہیولا، نیلی شلوار، سنہری قمیص، سرخ آنچل، ماتھے پر جھومر، سفید گالوں پر سرخ غازہ لگائے، وہ بھی ماتھے پر تیوریاں ڈال کر بات کرتی تھی، وہ کون تھی، اس کا نام کیا تھا، وہ ذہن پر زور دینے کے باوجود بھی یاد نہیں آ رہا تھا، اس کی بھی کسی سے نہیں بنتی تھی۔ میں اس ہیولے کے خیال میں کھو گیا تو سانول اپنا ریوڑ لے جا چکا تھا۔ میں وہیں خیالوں میں الجھا کھڑا رہا تھا۔

میں واپس ڈیرے پر آ گیا تھا۔ وہاں سوائے بوڑھے خیر الدین کے دوسرا کوئی نہیں تھا۔ وہ چارپائیاں بچھا رہا تھا۔ میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا

"بیٹا، تم یہاں کس لیے آئے ہو؟"

"بابا، میں یہاں یہ دیکھنے آیا ہوں کہ تم لوگوں کی زندگی میں کیا سہولت دی جا سکتی ہے، اور یہ سہولت کیسے مل سکتی ہے؟" میں نے بہت آسان کر کے اسے بتانا چاہا تو وہ ایک لمحے کو ساکت ہو گیا، پھر سوچتے ہوئے بولا۔

"تم کوئی قسمت بدلنے والے ہو یا تقدیر بنانے والے؟"

بوڑھے خیر الدین کے لہجے میں جو تلخی، احتجاج اور طنز تھا، میں اس سے بخوبی واقف تھا۔ یہ ایسی سچائی تھی جس نے زندگیوں کو نگل لیا ہوا تھا۔ صدیوں سے وہاں رہنے والے لوگوں کی وہی زندگی تھی، وہی قسمت، وہی تقدیر، وہ وہاں سے نکل کر جاتے بھی کہاں؟ یہ تلخ حقیقت تھی کہ وہاں انسان بھی جانور کے جیسے زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ صبح ہوتے ہی گائیں چھوڑ دی جاتی تھیں، وہ سارا دن چر کر واپس اسی جگہ آ جاتی تھیں۔ انسان بھی وہیں رہنے پر مجبور تھے۔ پانی کے ٹوبے، جن پر اکثر لڑائی بھی ہو جاتی تھی، وہیں سے انسان اور جانور پانی پینے پر مجبور تھے۔

”نہیں بابا، میں انسان ہوں، نہ قسمت بدل سکتا ہوں اور نہ تقدیر میرے ہاتھ میں ہے، لیکن شاید تقدیر بنانے والے نے قسمت لکھنے والے نے مجھے یہاں بھیج دیا۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”تم کیا کرلو گے؟“ اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا

”جو میں ہنر جانتا ہوں، اس کی وجہ سے یہاں سہولیات مل جائیں تو شاید آپ سب اپنی قسمت بدلتی ہوئے محسوس کریں۔شاید آپ لوگوں کی تقدیر بدل جائے۔“

”ایسا ہونا ہوتا تو کب کا ہو چکا ہوتا، خیر تم بھی دیکھ لو۔“ اس نے کہا ہی تھا کہ میرن شاہ کے گھر کی طرف سے ایک نسوانی آواز ابھری۔

”بابا، یہ کھانا لے جا۔“

لاشعوری طور پر میں نے اس طرف دیکھا۔وہ چھوٹے سے دروازے کی اوٹ میں تھی۔ میرون رنگ کا زنانہ لباس ذرا سا دکھائی دے رہا تھا۔بابے خیر الدین نے ایک بار ادھر دیکھا، پھر بولا۔

”لے آؤ۔“

اس کی آواز کی بازگشت میں ایک میانے سے قد کی سخت مند لڑکی میرے سامنے نمودار ہوئی۔اس نے میرون رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا، اسی رنگ کا آنچل یوں سر پہ لیا ہوا تھا کہ اس میں سے اس کا گول چہرہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔تیکھے تیکھے نین نقش، وہی ستواں نخرے بھرا ناک، وہی شرارتی گہری نیلی آنکھیں۔وہی سرخ گال، ذرا سی خمیدہ تھوڑی، وہ چوڑا ماتھا اور دائیں جانب ہلکا سا زخم کا نشان، وہ ساودری تھی۔وہی ساودری جو بچپن میں بتاشے، کھانے اور مٹھائی اپنے بھوچھن میں چھپا کر رکھتی تھی۔

"یہ میری بیٹی ہے ساوری۔" بابا خیر الدین نے کہا تو میں ہڑبڑا گیا۔ میں نے بس ایک لمحہ اسے دیکھا تھا اور پھر نگاہیں جھکالی تھیں۔ وہ دونوں میری کیفیت سے واقف نہیں تھے اور نہ ہی میں انہیں اپنے اندر کی کیفیات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ دکھ اور خوشی کی ملی جلی کیفیات، جسے میں بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ میں نے اس طرف دیکھا، اس کے پاؤں دکھائی دیئے جس میں ہلکی سی پائل تھی اور پھٹا ہوا پرانے چمڑے کا جوتا۔

"بابا میں تجھے بھی کھانا لا دوں؟" ساوری نے پوچھا

"ہاں مجھے بھی یہیں لا دو۔" اس نے کہا

ساوری پلٹ گئی تھی۔ بابا خیر الدین وہیں میرے ساتھ والی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے کھانا اس کی جانب کرتے ہوئے کہا

"آؤ بابا مل کر کھاتے ہیں۔"

"نا پتر، تم کھاؤ، ساوری لے آتی ہے میرے لئے۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا

"پھر کیا ہوا، اکٹھے......"

"حرج تو نہیں ہے لیکن اگر سائیں نے دیکھ لیا تو...... تم اس کے مہمان ہو نا، تم کھاؤ۔"

اس نے کہا تو میں سمجھ گیا۔ میں کھانے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ساوری اپنے بابا کے لئے بھی کھانا لے آئی۔ اس بار ساوری کے بدن میں تناؤ نہیں تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے ہمارے قریب آئی تھی۔ اس نے اپنے باپ کے سامنے کھانا رکھا، لمحہ بھر کو کھڑی رہی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے دیکھ رہی ہو۔ میں نے اس کی جانب نہیں دیکھا۔ مگر میرے اندر اسے بڑے غور سے دیکھنے کی شدید خواہش تھی۔ بچپن کا وہ بھولا بھالا چہرہ، اس وقت کس قدر آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ وہ دلوں پر راج کر سکتا تھا۔ شاید تیکھے نین نقش والا چہرہ کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا تھا، بلکہ

میری ہی کیفیات مجھے ورغلا رہی تھیں۔ ساوری کھانا رکھ کر جا چکی تھی۔

میں کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ میرے ذہن میں وہی ساتول، ساوری اور کیکر آ بسے۔ وقت نجانے کتنی تیزی سے پیچھے چلا گیا۔ کیکر کے اردگرد کتنے ہی سارے لڑکے تھے۔ ذرا فاصلے پر کچھ لڑکیاں بھی یہ کھیل دیکھ رہی تھیں۔ ان میں ساوری بھی تھی۔ ایک اور لڑکی بھی تھی، جس کا چہرہ ہیولے کی طرح میرے دماغ میں تو آ رہا تھا لیکن وہ چہرہ واضح نہیں تھا۔ وہ کون تھی یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ساتول کے ذمے باری آ گئی تھی۔ تنے کے اردگرد ایک گول دائرہ بنایا گیا تھا۔ جس کے اندر کچھ زمین پر جوتے رکھے ہوئے تھے۔ تنے کے ساتھ ایک چھوٹی سی رسی تھی۔ جسے ساتول نے پکڑا ہوا تھا۔ لڑکے دائرے میں سے جوتے اٹھا رہے تھے۔ ساتول رسی پکڑے انہیں ہاتھ لگانے کی کوشش میں تھا۔ لیکن کوئی بھی ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ جوتے کم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اگر سارے جوتے اس دائرے میں سے اٹھا لئے جاتے تو ساتول کو بھاگنا پڑتا۔ اسے تھوڑے سے فاصلے پر موجود ڈیرے کے گیٹ کو ہاتھ لگانا تھا۔ اس دوران اس پر جوتوں کی بارش ہو جانے والی تھی۔ یہی اس کھیل کا سب سے اہم، دلچسپ اور مزیدار حصہ ہوتا تھا۔ جوتے کم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ساتول کی جھنجھناہٹ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ لڑکے پرجوش ہو کر جوتے اٹھانے کی کوشش میں تھے۔ چند جوتے رہ گئے تھے۔ ساتول رسی پکڑے تیزی سے گھوم رہا تھا۔ سب کو یقین ہو گیا کہ ساتول کو بھاگنا پڑے گا۔ لڑکیاں بھی شور کر رہی تھیں۔ اور پھر مجھے نجانے کب نیند آ گئی۔ میں سو گیا تھا۔

☆......☆......☆

صبح کا نور پھیلا ہوا تھا۔ میں بیدار ہو گیا تھا۔ صحرا کی شام کا جادو تو ہوتا ہی ہے لیکن اُگتے ہوئے سورج سے پہلے کا سماں بھی سحر انگیز ہوتا ہے۔ میں بہت دور تک نکل گیا تھا۔ دور تک

کھیت بن گئے تھے۔ ان میں پانی نہ ہونے کے باعث اجاڑ پن کا تاثر بکھرا ہوا تھا۔ سامنے اونچے ٹیلوں کی قطار تھی۔ جس کے دوسری جانب راستہ تھا۔ میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اونچی جگہ سے بستی کی طرف دیکھا تو لگا بستی بھی اتنی ہی تھی، شاید چند گھر بڑھے تھے یا کچھ جھونپڑوں کا اضافہ ہوا تھا۔ اس منظر میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں تھی۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا، پھر پلٹ کر واپس ڈیرے تک چلا آیا۔

ڈیرے پر کافی سارے لوگوں کے درمیان میرن شاہ ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں ڈیرے میں داخل ہوا تو سبھی کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ ایک لمحہ کو وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے ان کے قریب جا کر سلام کیا تو میرن شاہ نے اپنے قریب کھڑے منشی مہر خان سے پوچھا

''اوئے اس کا بیگ لانا تھا، وہ لائے ہو؟''

''وہ تیرا بیگ تو محفوظ ہے لیکن اسے لانے کے لئے تجھے خود جانا پڑے گا۔'' مہر خان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا

''میں خود چلا جاؤں گا۔ وہ اسی رہٹ والے کے پاس ہے نا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''اسی کے پاس ہے اور وہ چاہتا ہے کہ تمہارا بیگ، تمہیں ہی واپس کرے۔'' منشی نے تلخی سے کہا۔

''ایسا کہتا ہے وہ؟'' میرن شاہ نے غصے بھرے لہجے میں کہا پھر لمحہ بھر بعد ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا ''چل ٹھیک ہے، خود ہی لے آئے یہ جا کر، اسے راستہ سمجھا دینا بلکہ خیر الدین کو بھیج دینا ساتھ۔''

''ٹھیک ہے۔'' مہر خان نے میری جانب دیکھتے ہوئے یوں کہا جیسے میرے متعلق بات

ختم ہوگئی ہو۔ مجھے اس کا لہجہ اور انداز بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کا انداز یوں تھا جیسے وہ کسی ملازم یا اپنے کسی کمی کمین سے بات کررہا ہو۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

جب تک میں نہا دھو کر تیار ہوا، وہ سب وہاں سے جا چکے تھے۔ میرے پاس خیر الدین رہ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سے میرے دل میں گدی گدی ہونے لگی تھی۔ ابھی ساوری ناشتہ لے کر آئے گی۔ ایک عجیب سی مدہ بھری کیفیت مجھ پر طاری ہونے لگی تھی۔ نجانے کیوں مجھے خواجہ غلام فرید کی کافی کے بول یاد آنے لگے تھے۔۔

وچ روہی دے رہندیاں، نازک نازو جٹیاں

راتیں کرن شکار دلیں دے، ڈیہدہ تاں ولوڑن شیاں

گھرے تیر چلاون کاری، مینے ہنے دلڑیاں پھٹیاں

(روہی میں ایسی نازک اور ناز والڑکیاں رہتی ہیں جو رات کو دلوں کا شکار کھیلتی ہیں اور دن کے وقت چھاچھ کے مٹکے بلوتی ہیں…… یہ نازنین اس طرح چھپ کر نینوں کے تیروں سے وار کرتی ہیں کہ جن سے سینکڑوں دل گھائل ہو جاتے ہیں۔)

ہوا کا جھونکا بھی آواز پیدا کرتا تو میں اس دیوار کی جانب دیکھتا، جہاں سے ساوری نے آنا تھا۔ کافی وقت گزر گیا۔ خیر الدین خود ہی ادھر گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد ناشتہ لے آیا۔ مجھ پر اوس پڑ گئی۔ میرا دل جو اسے دیکھنے کو ہمک رہا تھا، ایک دم سے بجھ گیا۔ میں نے بے دلی سے ناشتہ کیا اور اٹھ گیا۔

خیر الدین میرے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بستی سے نکلتے ہی مجھے راستہ سمجھایا۔ اس کے ساتھ ہی بولا۔

”ابھی وہ گھر میں مل جائے، یا پھر ممکن ہے وہ اپنا ریوڑ ہانکے کر نکل گیا ہو، دن خاصا چڑھ

آیا ہے نا۔"

"مل گیا تو ٹھیک ورنہ، ہم سیر تو کر لیں گے۔ علاقہ ہی دیکھ لیں گے۔" میں نے لاپرواہی سے کہا تو وہ کافی دیر خاموش رہا پھر بولا۔

"تم یہاں کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں علاقہ دیکھنے کے بعد اپنے افسروں کو یہ بتا سکتا ہوں کہ یہاں کون کون سی سہولت دی جا سکتی ہے۔ جیسے کہ تم نے پانی کی سہولت کہا تھا، تو یہ دیکھنا ہوگا کہ بارش کا پانی ہی اکٹھا کیا جائے اور اسے صاف کیا جائے، کسی نہر کا پانی مل جانے کی امید ہو، یا کوئی کنواں، یا جیسے بھی۔" میں نے اسے اپنی طرف سے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے کوئی بات نہیں کی۔ بس جہاں ضرورت پڑتی، مجھے راستہ بتا دیتا۔ میں کچے راستے میں سے جیپ لے جاتا ہوا بڑھ رہا تھا۔

ہم ایک بستی کے سامنے آرکے۔ وہاں چند کچے گھر تھے۔ روہی میں گھروں کی چار دیواریاں بنانے کا رواج ہی نہیں ہوتا۔ بس گھروں سے ذرا فاصلے پر چھپر ڈال کر ان کے نیچے بیٹھے رہتے۔ جتنا لیپ پوت کر بنا لیا جاتا، اتنا ہی ان کا صحن ہوتا ہے۔ بڑی بڑی گلیوں کے درمیان بھربھری ریت بکھری ہوئی تھی۔ میں نے خیر الدین کی جانب دیکھا تو وہ بولا۔

"یہیں آگے، اس کا گھر ہے۔"

"جیپ سمیت چلیں؟" میں نے پوچھا

"جیسے مرضی، جیپ بھی چلے جائے گی۔" اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو میں نے جیپ بڑھا دی۔ دو گلیاں پار کرنے کے بعد مجھے وہ رینجر عادکھائی دے گیا۔ اس کے ساتھ اونٹ بندھا ہوا تھا۔ میں نے جیپ وہیں روک دی۔ وہ لوگ سامنے ہی چھپر تلے بیٹھے تھے۔ مجھ پہ

نگاہ پڑتے ہی وہ ریسٹرنٹ والا اٹھ کر آ گیا۔ اس نے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور خیر الدین کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ جس پر مجھے کافی حیرت ہوئی۔ تبھی میں نے کہا۔

"یار وہ میرا بیگ ...."

"ہاں ہاں میرے پاس پڑا ہے، لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔ مجھے اس کے رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اندر کمرے میں گیا، کچھ لمحے بعد واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں میرا بیگ تھا۔ میرے قریب آ کر اس نے بیگ میری جانب بڑھایا تو میں نے مروت میں کہا

"بہت شکریہ یار"

"دیکھ لو کوئی چیز گم تو نہیں ہے، میں بعد میں ذمہ دار نہیں ہوں گا۔" اس نے کھردرے سے لہجے میں کہا۔ میں جانتا تھا کہ اس بیگ میں اس کے کام کوئی چیز نہیں تھی۔ سو میں نے پلٹتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں، پھر بھی شکریہ تمہارا۔" یہ کہتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں سوال در آیا۔ وہ نوجوان میرے قریب بیٹھا تھا اچانک کہاں غائب ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس بارے میں وہ ریسٹرنٹ والا ضرور جانتا ہو گا لیکن میں چاہتے ہوئے بھی اس سے یہ سوال نہیں پوچھ سکا۔ اس کی وجہ صرف اس کا کھردرا رویہ تھا۔

ہم واپس پلٹ کر جیپ میں آ بیٹھے تو میں نے خیر الدین سے یہ پوچھا۔

"کتنا بدتہذیب بندہ تھا، تم سے سلام بھی نہیں لیا؟"

"اس کا قصور نہیں ہے، اس نے ایسا کرنا ہی تھا، ان بستی والوں کی ہم سے دشمنی چل رہی ہے۔ یہ ہمارے تین بندے مار چکے ہیں اور ہم نے اب تک دو مارے ہیں۔ تیسرا مارنا......"

"مطلب اس رات جس بندے کی تلاش میں یہ میرن شاہ کے لوگ گئے تھے وہ ان کا بندہ

تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، وہ ہی تھا جس نے ہمارے دو بندے مارے ہوئے ہیں، اس کے بارے میں پتہ چلا تھا کہ آ رہا ہے۔" خیر الدین نے بتایا

"اوہ، مطلب وہ بندہ ان کے ہتھے نہیں چڑھا اب تک؟" میں نے عجیب سے لہجے میں پوچھا

"نہیں، اب وہ کہاں ہاتھ آتا ہے، وہ تو غائب ہو گیا، پتہ نہیں اب ادھر ہے، واپس پلٹ گیا ہے یا پھر بارڈر ہی پار کر گیا ہو۔" خیر الدین نے اپنی رَو میں کہہ دیا

"بارڈر یہاں سے کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا

"نقشے تیرے پاس ہیں، پوچھ مجھ سے رہا ہے۔" خیر الدین نے طنزیہ انداز میں کہا تو مجھے کافی سبکی محسوس ہوئی۔ بات تو وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ تبھی میں نے اپنی خجالت دور کرتے ہوئے کہا

"یہی میرا خیال ہے دو تین کلو میٹر تک ہو گا؟"

"اس سے بھی کم ہیں، سدھائے ہوئے اونٹوں سے تو مزید کم۔" اس نے دور ریتلے راستے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے کہا۔ میرے دماغ میں یہ سوال آیا کہ خیر الدین سے پوچھوں، کبھی بارڈر پار گیا ہے؟ لیکن مصلحت کے تحت میں نے وہ سوال دبا دیا۔ شاید اس نے میری سوچ پڑھ لی تھی یا پھر اسے یقین تھا کہ میں ایسا ہی کوئی سوال کروں گا۔ اس لئے خود ہی بولا

"میں کئی بار گیا ہوں بارڈر کے پار، وہاں بھی ہمارے جیسا ہی حال ہے۔ ایسی ہی غربت، وہ بھی پیاسے اور حاکموں کے تابع ہیں۔"

اس کے لہجے میں انجانا درد تھا، نامعلوم دکھ تھا اور اجنبی غم سے نڈھال آواز میں کئی حسرتیں اس کے لہجے میں دم توڑتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ بوڑھا تھا۔ اپنی عمر ہی نہیں، ایک دور

بھی گزار چکا تھا۔ زندگی کتنی بے وفا ہے، اس کا احساس مجھے شدت سے ہونے لگا تھا۔

واپسی پر خیرالدین پھر خاموش تھا۔ میں اب خود اس سے باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں ابھی ان لوگوں کو سمجھنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے میری کوئی بات انہیں بری لگ جائے۔ واپسی پر وہی صحرا کا سناٹا اور جیپ کی مخصوص آواز تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ساری دنیا ہی خاموش ہو گئی ہو۔ صرف میں خود اپنے ہونے کے احساس کے لئے گاڑی کا شور کر رہا ہوں۔ یوں فطری طور پر رفتار تیز تھی۔ جلد ہی ہم بستی کے پاس پہنچ گئے۔

میرے سامنے بستی تھی۔ میرا دل ہمک رہا تھا کہ میں اندر جاؤں، دیکھوں لیکن ایک انجانی قوت میرے دماغ سے اس خیال کو نوچ رہی تھی۔ وہ خیال کو پھیل کر میرے جذبات میں ہلچل مچانے لگا تھا، وہی قوت اسے سمیٹ کر میرے دماغ سے نکال باہر کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں اسی کشمکش میں بستی کے پاس پہنچا۔ میں رکنا چاہتا تھا نہیں رُکا اور پھر سیدھا ڈیرے پر جا رُکا۔ مجھے لگا میرا بستی کے قریب سے گزر کر آنا مجھے بے بس کر رہا تھا۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ میں بیگ لے کر کمرے میں چلا گیا۔ صحرا میں بنے ان کچے کمروں کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ گرمیوں میں ٹھنڈے اور ہوا دار ہوتے ہیں۔ دیواروں میں چھوٹے چھوٹے جھروکے بنے ہوتے ہیں۔ ان سے ہوا ایک طرف سے آتی اور دوسری جانب نکل جاتی تھی۔ یہی جھروکے جب سردیوں میں بند کر دیئے جاتے تو رات کے وقت بھی کمرہ گرم ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنا بیگ چارپائی پر رکھا اور اسے کھول لیا۔ ساری چیزیں ویسی ہی تھیں۔ میں نے اپنے مطلب کی چیزیں اور کاغذات نکال لئے۔ میرے سامنے اس علاقے کا نقشہ پھیل گیا تھا۔ یہ نقشہ تھوڑا پرانا تھا لیکن میری ضرورت کے لئے بہت تھا۔

☆......☆......☆

شام ڈھلنے کو تھی لیکن خیر الدین کا کہیں نام ونشان تک نہیں تھا۔ مجھے ایک طرح سے خوشی ہو رہی تھی۔ میرا من چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی نہ آئے۔ بھوک سے زیادہ مجھے ساوری کی آمد کا انتظار تھا۔ وہ کسی بھی وقت آسکتی تھی یا شاید خیر الدین کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی نہ آتی۔ میں اس ہونے اور نہ ہونے کے درمیان اُلجھ رہا تھا۔ انہیں لمحات میں دیوار میں موجود دروازہ بجا۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ دروازہ پھر بجا، چند لمحوں کے بعد ساوری نے سر نکال کر دیکھا۔ اس کا آنچل اور گیسو گڈمڈ ہو کر اس کا چہرہ چھپا رہے تھے۔ ذرا سا آنچل اس نے اپنے دانتوں میں دبایا ہوا تھا۔ اسے جب خیر الدین نظر نہیں آیا تو اس نے مجھے آواز دی۔

"اے بھائی، یہ کھانا لے لو۔"

میں نے اس کی آواز سن لی تھی لیکن جان بوجھ کر اس کی طرف سے انجان بن گیا۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں میری چارپائی تک آجائے۔ تبھی پائل کی آواز میرے قریب آنے لگی۔ بالکل قریب آکر پائل تھم گئی تو اس کے ساتھ ہی وہ غصے میں بولی۔

"تجھے سنتا نہیں، بہرا ہے؟"

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بڑے سکون سے کہا

"مجھے اچھی طرح سنتا ہے۔"

"پھر یہ کھانا لینے کیوں نہیں آئے۔" اس نے مزید گرمی دکھاتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ گالوں سے تو لگتا تھا ابھی خون پھوٹے گا۔

"میں کوئی فقیر نہیں ہوں کہ خود جا کر کھانا لے کر آؤں۔" میں نے اسی اطمینان سے جواب دیا تو وہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی

"یہاں ڈیرے پر پڑے لوگ تو خود کھانا مانگتے ہیں۔"

"میں لوگ نہیں ہوں۔ مجھے کھانا دینا ہے تو یہاں لا کر دیا کرو۔" میں نے بڑے سکون سے کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بوکھلائی نہیں بلکہ بڑے اعتماد سے بولی

"بابا نے اگر مجھے یہاں آنے کا کہا نہ ہوتا نا، تم یونہی بھوکے رہتے۔ میں یہاں نہ آتی۔"

"چلو اب آ گئی ہو تو کھانا یہاں لا کر رکھا کرو۔ اور ہاں میرے ہاتھ بھی دھلوایا کرو۔" میں نے قدرے رعب سے کہا تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولی

"دیکھ، تو میرے ساتھ زیادہ باتیں نہ کر، زیادہ باتیں کرے گا، تو تیری خیر نہیں ہو گی۔" اس نے اپنے لہجے کو سخت کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہو گا؟" میں نے سکون سے پوچھا۔

"یہاں کی عورتوں کی طرف ذرا سی بھی میلی آنکھ سے دیکھا نا تو آنکھیں نکال لیتے ہیں، مار دیتے ہیں بندے کو۔" اس نے ڈرا دینے والے انداز میں کہا تو میں ہنستے ہوئے بولا

"میری آنکھوں میں دیکھو، کیا ہے ان آنکھوں میں۔"

میرے یوں کہنے پر وہ پہلے حیرت زدہ ہوئی، پھر اس کی آنکھوں میں شوخی چمکی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن بات اپنے لبوں میں دبا کر تیزی سے واپس پلٹ گئی۔

مجھے یوں لگا جیسے وہ بہار بھی اپنے ساتھ ہی لے گئی ہے۔ میں اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ عجیب بات میرے ساتھ ہو رہی تھی کہ میں جب بھی ساوری کے بارے میں سوچتا، ایک اور چہرہ میرے دماغ میں اپنا احساس ضرور منواتا۔ نہ تو مجھے اس چہرے کے خدوخال یاد تھے اور نہ ہی یہ پتہ کہ وہ کس کا چہرہ ہے، بس ایک ہیولا سا میرے دماغ میں اٹھتا اور مجھے قابو میں کر لیتا۔ میں ساوری کی بجائے اسے سوچنے لگتا۔ یہ کیا تھا، پہلی بار مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ یہ کیوں ہوتا ہے؟

میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ بابا خیر الدین گیٹ کی طرف سے آہستہ آہستہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

☆......☆......☆

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ ڈیرے کے بالکل سامنے دور کہیں مجھے ایک الاؤ دکھائی دیا۔ یہ روہی کی ایک پرانی روایت تھی۔ چند یار لوگ بستی سے نکل کر دور کسی ٹیلے پر جا بیٹھتے تھے۔ وہاں جا کر الاؤ روشن کرتے اور اس کے گرد بیٹھ کر باتیں کرتے گیت گاتے وقت گزار کر واپس آجاتے۔ یہ ایک عام سی تفریح تھی۔ میں چارپائی پر پڑا تھا، مجھ سے تھوڑے سے فاصلے پر بابا خیر الدین لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اسے دھیمے سے آواز دی۔ اس نے میری آواز کا جواب نہیں دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سویا ہوا ہے۔ میں اٹھا اور جوتے پہن کر باہر کی جانب چل دیا۔

میں کوئی آدھا کلو میٹر چل کر ان کے قریب پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ انہوں نے الاؤ کے گرد چادریں بچھائی ہوئی تھیں۔ قریب کی روہی میں موجود جھاڑی 'لانا' کی لکڑیاں رکھی ہوئیں تھیں۔ ہر ایک نے سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر باہر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ان کے پاس جا کر علیک سلیک کی تو ایک بندے نے مجھے پہچان کر سب کو بتا دیا۔ تبھی مجھے وہاں بیٹھنے کی دعوت دی گئی تو میں ایک جانب چادر پہ خالی جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھ کر میں نے دیکھا بستی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہمارے درمیان یونہی باتیں چل نکلیں۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ میں ان کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ میری کوشش تھی کہ میں ان میں سے کوئی ایسا بندہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں جو میرے کام آسکتا تھا۔ وہ مجھے علاقے کے بارے میں بتاتے رہے۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا

"یار معذرت چاہتا ہوں، میں تم لوگوں کی محفل میں مخل ہوا۔ میں یہاں دو دنوں میں ہی گھبرا کر رہ گیا ہوں۔"

"نہ نہ سائیں ہم بھی تو یونہی باتیں کرتے ہیں، بجھیں گپ شپ لگاتے ہیں یہی ہماری تفریح ہے۔" ایک نوجوان نے بڑے ملائم لہجے میں کہا۔ وہ تیکھے نین نقش کا لمبے بالوں والا نوجوان تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور اس پر بھاری مونچھیں تھیں۔ پھر اس نے اپنے سامنے موجود ایک بندے سے اونچی آواز میں کہا۔ "اوئے بخشو، سنا کچھ......"

بخشو نے اپنے پیچھے پڑی بڑی ساری ڈف اٹھالی۔ کچھ ہی دیر اس نے الاپ چھیڑا اور بڑی درد بھری آواز میں گیت کا ٹکڑا کہا

چناں تیڈے وعدے کوڑے..... کوڑا تیڈا پیار وے...... پکھی پردیسیاں دا کیہڑا اعتبار وے۔

(اے میرے چاند، تیرے سارے وعدوں کی مانند تیرا پیار بھی جھوٹا ہے۔ پرندوں کی مانند اڑ جانے والوں کا کیا اعتبار کیا جائے۔)

اس کی آواز میں درد تھا۔ رات کے سناٹے میں ساز و آواز دور تک پھیل گئے تھے۔ وہ سب دم بخود ہو کے گیت سن رہے تھے۔ جیسے ہی اس نے یہ مصرعے کہے

ہجراں دی اگ ساڑے...... ساڈے نے نصیب ماڑے...... یاد کر تیکوں ماہیا رواں زارو زار وے

(میں ہجر کی آگ میں جل گئی ہوں۔ میرے نصیب اچھے نہیں میں تجھے یاد کر کے زار و زار روتی ہوں۔)

اس پر اسی تیکھے نین نقش والے نوجوان نے اونچی آواز میں ایک نعرہ مستانہ لگایا۔ جیسے یہ

لفظ اس کے دل پر اثر کر گئے ہو۔ ایک بار میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ آنکھیں بند کیے زور زور سے سر ہلا رہا تھا۔ نجانے درد میں ڈوبے ہوئے وہ لفظ مجھ پر بھی اثر کرنے لگے تھے۔ میں نے ایک بار گھوم کر بستی کی جانب دیکھا۔ وہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میرے سامنے الاؤ روشن تھا۔ ماحول ایسا بن گیا تھا کہ میں کھو گیا۔ میرے سامنے آگ روشن تھی۔ ہماری جھونپڑی جل رہی تھی۔ میں ہونق بنا اپنے باپ کی آوازیں سن رہا تھا۔ کبھی میں اپنے لہولہان باپ کی جانب دیکھتا اور کبھی اس کے کہے لفظوں پر غور کر رہا تھا۔ وہ بار بار یہی کہے چلے جا رہا تھا

''بھاگ جا...... تجھے بھی مار دیں گے...... یہاں سے بھاگ جا...... جا جلدی کر بھاگ جا......''

اندھیری رات میں جلتا ہوا گھر، باپ کی بے بسی میں چلاتی ہوئی درد بھری آواز، موت کا خوف، چیخنے چلانے کی صدائیں، ماؤف دماغ کے ساتھ میں نے جلتی ہوئی جھونپڑی کو دیکھا پھر اندھیرے کی جانب نظر کی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے صرف اپنے باپ پر اعتماد تھا۔ اس نے کہا تھا بھاگ جا تو میں بھاگ گیا تھا۔ مجھے اندھیرے سے بھی خوف نہیں رہا تھا۔ بس باپ کا حکم تھا اور میں بھاگ رہا تھا۔

''سائیں کیا ہو گیا، اتنے خاموش کیوں ہو؟'' ایک آواز نے مجھے حال میں پہنچا دیا۔ میں نے دیکھا، ان سب کی نگاہوں مجھ پر تھیں۔ میں کچھ بھی نہیں بول سکا تھا۔ تبھی ایک دوسرے نوجوان نے کہا۔

''گیت میں کھو گئے، کوئی اپنی یاد آ گئی ہو گی۔''

''ہاں ہم یہاں اپنی یادوں کے لئے ہی تو بیٹھتے ہیں۔'' اسی نوجوان نے کہا تو مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔ میں اٹھ گیا تو اسی لمبے بالوں والے جوان نے پوچھا

"سائیں کوئی غلطی ہوگئی، یوں جارہے ہو؟"

"نہیں بس، اتنا ہی کافی ہے، سوتا ہوں اب جا کر۔" میں نے کہا

"میرا نام محمد زمان موہل ہے۔ کبھی کبھی ادھر آ کر بیٹھتے ہیں۔ آ جایا کریں اگر یہاں ہو تو۔"

اس نے آگے بڑھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو مجھے وہ مضبوط بندہ دکھائی دیا۔

میں انہیں وہیں چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ میں لکڑی والا پھاٹک پار کر جیسے ہی چارپائی پر لیٹا تو بابا خیر الدین بولا

"دو چار گیت مزید سن لیتے۔"

"بس دل بھر گیا تو اٹھ کر واپس آ گیا۔" میں نے لیٹتے ہوئے کہا

"چل ٹھیک ہے سو جا۔" اس نے کہا تو میں نے پہلو بدل لیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے مجھے جس خیال نے ڈسٹرب کر دیا تھا، وہی خیال پھر سے میرے دماغ میں بھونچال مچانے لگا تھا۔ میں نے ذہن بدلا تو مجھے وہ ہیولا دکھائی دینے لگا۔ جس کے نین نقش تو واضح طور پر مجھے یاد آ رہے تھے مگر وہ کون تھی، یہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا، اس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن میں اس اُلجھن کو دور کرنے کے لئے کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں کچھ دیر تک اسے سوچنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر میں نے اپنا خیال ساوری کی جانب موڑ دیا۔ کیا بھرپور جوان لگی تھی وہ۔ صحرا میں چلتی ہوئی ہرنی کی طرح۔ ہرن جب صحرا میں بھاگتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ تیر رہا ہو۔ وہ بھی ہوا کے جھونکے کی مانند آئی تھی اور پھر دکھائی ہی نہیں دی تھی۔

اگلی صبح میری آنکھ انجانے شور سے کھلی۔ میں نے دیکھا میرن شاہ کے کارندے ایک آدمی کو پکڑ کر لا رہے تھے۔ وہ لہولہان ہونے کے باعث بے سدھ ہو رہا تھا۔ کارندے اسے

مارتے، غلیظ گالیاں دیتے ہوئے لا رہے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے میری چار پائی سے ذرا فاصلے پر اُسے لا پھینکا۔ وہ کارندے مجھے یوں نظر انداز کر رہے تھے جیسے میرا وہاں ہونا اور نہ ہونا ایک برابر ہے۔ وہ زخمی کچے فرش پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں شاید چوٹیں سہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کارندے چھ سے زیادہ ہی تھے۔ انہوں نے اس زخمی کو گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ جس کا دل چاہتا اسے غلیظ گالی دے کر ٹھوکر مار دیتا۔ یہاں تک کہ وہ زخمی بے سدھ ہو گیا۔

"سائیں کو بلا لیں۔" ایک کارندے نے سبحان سے پوچھا۔ میں نے تین دنوں میں سمجھ لیا تھا کہ یہی ان کارندوں کا بڑا ہے۔ اسی نے گن کا بٹ میرے کاندھے پر مارا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بلا لو۔"

اسی لمحے ایک بندہ رہائش گاہ کی جانب چل پڑا۔ اس نے چھوٹے دروازے کو بجایا۔ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ شاید کسی کو پیغام دے کر لوٹ آیا۔ مجھے ان سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں اٹھا اور منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔

میں واپس آیا تو میرن شاہ آچکا تھا۔ وہ چار پائی پر بیٹھا ہوا اسی بے ہوش شخص کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بندہ اس کے منہ پر پانی ڈال کر اسے ہوش میں لا رہا تھا۔ میں نے ایک نگاہ اس منظر کو دیکھا اور اندر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں انہیں یہی باور کرانا چاہتا تھا کہ مجھے ان کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کمرے میں حبس تھا لیکن میں کمرے میں بیٹھا باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ زخمی ہوش میں آچکا تھا۔ اس نے مدہوشی میں ارد گرد دیکھا تو سامنے میرن شاہ کو پا کر ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑ گڑا کر بولا۔

"سائیں، مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔ میں انہیں بتا چکا ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے وہ رات تیرے پاس رہا تھا۔" میرن شاہ نے کہا

"رات رہا تھا، یہ تو میں مانتا ہوں، پر صبح ہوتے ہی وہ چلا گیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اسے آپ سائیں تلاش کر رہے ہیں۔" اس نے صفائی دیتے ہوئے کہا

"تجھے پتہ نہیں ہے کہ وہ ہمارا دشمن ہے؟" میرن شاہ نے پوچھا

"سائیں، مجھے مرشد کی قسم، ایسا مجھے پتہ ہی نہیں تھا، مجھے پتہ ہوتا تو میں خود اسے آپ کے پاس لے آتا۔ کچھ نہ ہوتا تو آپ کو بتا ہی دیتا۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے دہائی دینے والے انداز میں کہا

"دیکھ، بتا دے اگر تجھے پتہ ہے تو، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" میرن شاہ نے پھر کوشش کی۔

"سائیں، مرشد کی قسم ہے سائیں، مجھے نہیں معلوم، میری ہمت نہیں ہے کہ میں آپ کے دشمن کو پناہ دوں۔" اس نے پھر اسی طرح گڑگڑاتے ہوئے کہا تو میرن شاہ نے چند لمحے سوچا اور پھر سرد سے لہجے میں کہا۔

"دیکھ لے، سوچ سمجھ کر بول۔"

"میں سوچ سمجھ کر بول رہا ہوں۔"

اس نے تیزی سے کہا تو میرن شاہ نے سبحان کو اشارہ کیا، وہ ذرا سا آگے بڑھ کر بولا۔

"سائیں یہ جھوٹ بولتا ہے۔ رات یہ خود بختاور کو اپنے اونٹ پر سوار کر کے باڈر پر چھوڑ کر آیا ہے، بختاور باڈر پار کر گیا ہے۔ اپنے آدمیوں نے دیکھا ہے تو انہوں نے بتایا۔"

سبحان نے اتنا کہا ہی تھا کہ زخمی کا چہرہ سفید پڑنے لگا۔ وہ یوں ہو گیا جیسے موت دکھائی

دینے لگی ہو۔ میرن شاہ غضب ناک انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر بولا۔

”اب کہو، یہ غلط کہہ رہا ہے؟“

”سائیں میں بارڈر پر گیا تھا مال لے کر، لیکن میرے ساتھ بختاور نہیں تھا۔“ اس نے رو دینے والے انداز میں کہا

”تو پھر کون تھا؟“ میرن شاہ نے پوچھا تو وہ خاموش رہا۔ چند لمحے اسی خاموشی میں گزر گئے تو میرن شاہ نے ہاتھ بڑھایا اور سبحان سے گن لے لی۔ اس کا میگزین چیک کیا پھر نیچے فرش پر پڑے ہوئے زخمی کی طرف نال کر کے دھاڑتے ہوئے بولا، ”سچ بتا دے۔“

”سائیں وہ بارڈر پار کر گیا ہے۔“ زخمی نے تیزی سے کہا تو اس کے ساتھ ہی ایک فائر ہوا۔ وہ زخمی نیچے فرش پر تڑپنے لگا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ خون کا فوارا ابل پڑا تھا۔ میرن شاہ نے اپنی شکست کا بدلہ اس سے لے لیا تھا۔ اس نے گن سبحان کو واپس کی اور چند لمحے ساکت سا بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اسے وہاں سے اٹھانے کا اشارہ کیا۔ کارندوں نے اس تڑپتے ہوئے نوجوان کو اٹھایا اور باہر کی جانب چل دیئے۔ چارپائی پر اکیلا میرن شاہ بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کمرے کی طرف دیکھ کر آواز لگائی

”اوئے علی بھائی، باہر آجا، اب کوئی نہیں ہے۔“

میں اٹھا اور باہر آ گیا۔ میرے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے میری طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا۔

”اوئے تم تو بہت زیادہ ہی ڈر گئے ہو یار۔“

”میں نے ایسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

میں نے پوری کوشش کر کے اپنی آواز میں خوف پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''ایسے ہوتا ہی رہتا ہے یہاں پر۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے رکا اور پھر بولا،'' جس رات تم یہاں آئے تھے، جس کی جگہ میرے آدمی تجھے پکڑ لائے تھے، وہی بختاور تھا۔ وہ میرے ہاتھوں سے نکل کر بارڈر پار کر گیا ہے۔ اس بے غیرت نے اسے بھگایا ہے۔ سزا تو بنتی ہے نا''

''سائیں تم جانو اور تمہارا کام۔'' میں نے خوف زدہ انداز میں کہا تو اس نے پوچھا

''یہاں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے نا، ابھی کام کب شروع کرنا ہے؟''

''میں نے سائیں تم سے کہا تھا کہ اس علاقے کو جاننے والا کوئی بندہ دے دیں۔ میں نے لوگوں سے ملنا ہے۔ علاقے کو دیکھنا ہے۔''

''اچھا، دیتے ہیں تمہیں کوئی بندہ۔'' اس نے کہا اور اٹھ گیا پھر یوں رک گیا جیسے کوئی خیال آ گیا ہو۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولا،'' آج خرگوش کے شکار پر جانا ہے، چل ہمارے ساتھ، علاقہ بھی دیکھ لینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے فوراً ہی ہاں کر دی۔

''چل پھر تیار ہو جا، اپنی جیپ لے لینا ساتھ، کچھ دیر بعد چلتے ہیں۔'' اس نے کہا اور اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ میں اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

☆......☆......☆

میں ڈیرے سے باہر آیا تو وہاں تین جیپیں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک کھلی جیپ میں چند لوگ شکاری کتوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پچکے منہ اور پتلی کمر والے شکاری کتے بڑے مہنگے اور قیمتی تھے۔ دوسری جیپ میں دو لوگ تھے۔ ایک جیپ ابھی خالی تھی، اس میں میرن شاہ نے آ کر بیٹھنا تھا۔ میں نے ان کے پیچھے اپنی جیپ لگائی، کچھ ہی دیر بعد میرن شاہ باہر آ گیا۔ اس

کے ساتھ چند گارڈ نما لوگ تھے۔ وہ آ کر جیپوں میں بیٹھ گئے۔ انہیں لمحات میں دو نوجوان موٹر سائیکل پر آئے تو پیچھے بیٹھا ہوا نوجوان اتر آیا۔ میرن شاہ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔ وہ میری جیپ کی جانب بڑھ آیا۔ مجھے بھی وہ جانا پہچانا لگا تھا۔ جیسے ہی وہ میرے ساتھ بیٹھا، میں اسے پہچان گیا۔ یہ وہی لمبے بالوں والا نوجوان تھا، جس سے رات ہی ٹیلے پر ملاقات ہوئی تھی۔ وہ زمان موہل تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا لگا تم بھی ساتھ جا رہے ہو۔"

"تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اتنے میں گاڑیاں چل پڑیں۔ جیسے ہی کچے راستے پر آئے تو میں نے اس سے پوچھا، "کہاں تک جانا ہے؟"

"باڈر کے پاس......ادھر کافی شکار ملتا ہے۔"

"ویسے یار یہ خرگوش بڑا بے ضرر سا جانور ہے۔ اس کا شکار کیا کرنا؟" میں نے یونہی بات بڑھائی۔

"سائیں شکار ہوتا ہی اس کا ہے جو کمزور ہو۔" اس نے کہا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"دلچسپ بات کہی تم نے۔" میں نے اس کی تعریف کی تو وہ بولا۔

"یہ جو شکاری ہوتا ہے نا، اس کی سوچ بڑی عجیب سی ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنے شکار سے ڈر جائے تو اس کا شکار ہی نہ کرے۔"

"لیکن ایک بات بھی تو ہے نا زمان، شکار کی نوعیت دیکھ کر شکاری کی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہاں خرگوش کا شکار اور کہاں شیر کا شکار۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کمزور جانور پر کتے چھوڑے جاتے ہیں، جیسے کسی کمزور انسان پر کتوں جیسے لوگ بھونکتے ہیں، انہیں کاٹتے ہیں۔ جتنا طاقت ور شکار ہوگا، اس پر محنت بھی اتنی ہی کرنا پڑتی ہے۔“ زمان موہل نے کہا۔

”جیسے کہ......“ میں نے اس کی بات کو بڑھاوا دیا۔

”دیکھو، ایک کمزور انسان پر ایک کتے کی خصلت جیسا بندہ بھی جا کر بھونک سکتا ہے، دو لوگ جا کر اسے کاٹ سکتے ہیں، لیکن جتنا بڑا بندہ ہوگا، اتنے ہی لوگ مل کر محنت کریں گے اسے گرانے کی۔ مقابلہ اور سازش میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مقابلہ مرد کرتے ہیں اور سازش بے غیرت۔“ وہ کہتے ہوئے کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔

”تم بھی میرن شاہ کے آدمی ہو، مطلب اس کے لئے کام کرتے ہو۔“ میں نے اس کی بات سن کر کہا تو وہ ہنس دیا پھر بولا۔

”تم ایسا سمجھ سکتے ہو، اب میں خود کو اس کا حصے دار تو نہیں کہہ سکتا، ہاں مگر کام ایک ہی کرتے ہیں، بلکہ مل کر کرتے ہیں۔“

”پھر کوئی قانونی دھندہ تو نہیں ہوگا نا۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ چند لمحے پر سکون رہنے کے بعد بولا۔

”یہاں کون قانونی دھندہ کرتا ہے۔ کوئی قانون کے مطابق اور کوئی قانون کے بغیر، بہر حال دھندہ ضرور کرتا ہے۔“

میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ ہم کچی سڑک پر چلتے چلے جا رہے تھے۔ دھول اتنی زیادہ نہیں اڑ رہی تھی۔ زمان موہل خاموش تھا۔ ایک جگہ ذرا کھنڈہ آیا تو وہ ایک دم سے محتاط ہو گیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

”ذرا سنبھل کے.......“

”کچھ پڑھے لکھے ہو؟“ میں نے پوچھا

”میں نے ایم اے کیا ہے وہ بھی سیاسیات میں۔ ...“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم بھی وہی کہانی سناؤ گے، نوکری نہیں ملی، دردر ٹھوکریں کھاتا رہا ہوں، میرٹ نہیں ہے اور......“ میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میری بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ پھر اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

”نہیں، ایسا نہیں ہے، میں نے نوکری تلاش ہی نہیں کی، بلکہ میں یونیورسٹی پڑھنے جاتا ہی نہیں تھا، بس یونہی......“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”پھر تو امتحان بھی خود نہیں دیا ہوگا، کسی دوسرے نے پیپر دیئے ہوں، ویسے پاس کرلیا تھا سیاسیات“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، ایسا ہی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ برس تک خوب انجوائے کیا۔ بس آخری دنوں مجھ سے ایک قتل ہوگیا تھا۔ پھر نہیں گیا یونیورسٹی۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

”کوئی مقدمہ کوئی ایف آئی آر......؟“ میں نے پوچھا

”ایسے ہی شور شرابے میں، نامعلوم بندے پر پرچہ ہوا تھا۔ سیاسی بغل بچہ تنظیمیں ایسے واقعات کو کیش کرتی ہیں۔ کوئی پکڑا جائے پھر تو بات ہی ختم ہوگئی نا۔“ اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہاں، ممکن ہے ایسا ہی ہو، مجھے ایسا کوئی تجربہ نہیں۔“ میں نے صاف جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

”واپس ادھر گھر آ گیا تو میرن شاہ کے ساتھ لگ گیا، بس دھندہ یہی ہے، آر پار جانا آنا۔“

اس نے کہا۔

"تو اب سمجھا، یہ خرگوش کا شکار نہیں مقصد کوئی اور ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں، ویسے تو ہمیشہ خطرہ رہتا ہے لیکن آج کل کچھ زیادہ ہی ٹینشن چل رہی ہے۔" اس نے کہا پھر میری طرف دیکھ کر بولا، "تم کوئی پسٹل وسٹل چلا لیتے ہو، مطلب کوئی ہتھیار چلانا؟"

"تم سکھا دو۔" میں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔

پکی سڑک کے دونوں اطراف میں صحرا میں ایسی کچی زمین تھی جس پر ریت نہیں ہوتی اسے مقامی زبان میں 'پٹ' کہا جاتا تھا۔ یہاں گاڑیاں تیز چل رہی تھیں۔ میں زمان موہل کو سمجھانے لگا کہ میں یہاں سیر کرنے کے لئے آیا ہوں۔ ہم کچھ دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک جھونپڑی کے پاس آ رکے۔ مقامی زبان میں اسے 'گوپا' کہتے ہیں۔

ایک اونچے ٹیلے پر کافی ساری زمین کو لیپ پوت کر صحن سا بنایا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چاردیواری تھی۔ اس کے بالکل درمیان میں مٹی اور گھاس پھونس سے گول گول بنایا ہوا وہ گوپا تھا۔ ایک آدمی وہاں پر موجود تھا۔ ہم اندر چلے گئے۔ وہ کافی ہوادار اور ٹھنڈا تھا۔

وہاں کچھ دیر آرام کے بعد ہم صحرا کی طرف پیدل نکل پڑے۔ چند آدمی کتے لئے ہمارے آگے آگے تھے۔ ہمارے پیچھے ایک گاڑی بھی آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ چلتے چلتے ہم ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گئے۔ بظاہر کہیں بھی کوئی خرگوش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کتے کبھی ادھر منہ اٹھاتے اور کبھی دوسری جانب منہ دیکھنے لگتے تھے۔ ان کے کان کسی ایریل کی طرح حرکت میں تھے۔ میرے ساتھ زمان موہل کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں دور کچھ دیکھنے میں مصروف تھیں۔

میرے خیال کے مطابق ہم بارڈر کے بالکل سامنے نہیں بلکہ بارڈر ہماری بائیں جانب تھا۔

اچانک ایک طرف منہ کر کے کتے بھونکنے لگے۔ وہ زور لگا کر خود کو چھڑوا رہے تھے۔ میرن شاہ نے اشارہ کیا تو کتوں کو چھوڑ دیا گیا۔ وہ گولی کی طرح نکلے اور بھاگنے لگے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے، چھوٹی جھاڑیوں کو پھلانگتے ہوئے نظروں کے سامنے ہی غائب ہو گئے۔ میرن شاہ نے فوراً دوربین نکالی اور انہیں دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو کتے اپنی منہ میں دو خرگوش پکڑے ہوئے آ گئے۔ وہ خرگوش لہو لہان تھے۔ ایک ان میں مر گیا تھا۔ دو کتے ابھی تک واپس نہیں لوٹے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی سامنے آ گئے۔

سہ پہر تک یہی کھیل چلتا رہا۔ کوئی آٹھ دس خرگوش آ گئے تھے۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ زمان سوہل غائب ہو گیا تھا۔ میں نے ایک بندے سے اس کے بارے میں پوچھا بھی تو اس نے یہی جواب دیا کہ گوپے پر گیا ہوا۔ شاید روٹی پانی کا بندوبست کر رہا ہو۔ دن تھوڑا سا رہ گیا تھا جب ہم واپس گوپے پر آ گئے۔ زمان سوہل وہیں تھا۔ چارپائیوں پر بیٹھتے ہی میرن شاہ نے کہا۔

"ہاں بھئی کیا پکایا ہے؟"

"بکرا، اب یہاں ہرن تو ملنے سے رہا۔" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"چل ٹھیک ہے، پکوا پھر۔"

وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا تو اس نے کہا

"کچھ اچھا لگا، لطف آیا شکار کا؟"

"بالکل نہیں، میں تو ٹھیک کیا ہوں۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا

"ہاں تم نے کہاں ایسا ماحول دیکھا ہوگا۔ خیر ہم تو رات رہیں گے یہاں۔ تم کھانا پینا انجوائے کرو۔" اس نے لیٹتے ہوئے کہا

"یہ بھی دیکھ لیں گے۔" میں نے کہا اور چار پائی پر لیٹ گیا۔

رات کا پہلا پہر ختم ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں کہاں پر جنریٹر لگا ہوا تھا، اس کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ اس سے کوپے کے صحن کو ایک بڑی سی لائیٹ نے روشن کیا ہوا تھا۔ سب چار پائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سبھی کو وہیں کھانا سرو کر دیا گیا تھا۔ بھنا ہوا بکرے کا گوشت اور تھوری گرم روٹی کے ساتھ ٹھنڈا پانی۔ وہ خرگوش بھی پکائے گئے تھے لیکن وہ ان لوگوں نے ہی کھائے جنہوں نے کتوں کو سنبھالا ہوا تھا۔ زمان مغل میرے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ خوب سیر ہو کر اس نے کہا۔

"لے بھئی جی، رج گیا میں، تم جاہو تو......"

"نہیں بس میں بھی۔" میں نے کلی کرتے ہوئے کہا تو ایک بندے نے برتن سمیٹ لئے۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ کوپے کے صحن سے باہر کچھ لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ پھر اس کے بعد چند لوگ آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں مختلف قسم کے ساز تھے۔ سب سے آخر میں ایک کانچ سی لڑکی دکھائی دی۔ وہ ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ انہوں نے میرن شاہ کو سلام کیا اور ایک طرف ہو کر بیٹھنے لگی۔ میں سمجھ گیا، وہ ناچنے گانے والے لوگ تھے۔ چار پائیوں کے بیچوں بیچ ترپال بچھا دی گئی۔ سازندے وہاں بیٹھ گئے۔ ان کے پاس دف، چمٹا، گھڑا، ڈھولک اور چمٹی تھی۔ ادھیڑ عمر عورت انہی سازندوں کے پاس بیٹھ گئی۔ کوپے کے اندر سے ایک قالین کا ٹکڑا لایا گیا۔ وہ لا کر درمیان میں بچھایا گیا

تو اس کامنی سی لڑکی نے اوڑھی ہوئی چادر ہٹا دیا۔ ایک دم بجلی کا لپکا ہوا۔ سیاہ چولی اور گھاگھرا میں لڑکی کی کمر اوپر تک دکھائی دے رہی تھی۔ کسی ہوئی چولی کا گریبان کھلا تھا۔ اس نے گیسو کھلے چھوڑے ہوئے تھے جن کے ساتھ اس کا ہلکا سا آنچل بندھا ہوا تھا۔ اس سیاہ لباس میں اس کا سفید رنگ گویا دمک رہا تھا۔ اس نے دونوں بازوؤں پر کہنیوں تک سفید روایتی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ تیکھے سے نین نقش والی اس لڑکی نے اتنا تیز میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔ اس نے پاؤں میں سیاہ کھسہ پہنا ہوا تھا، جس پر پتیل کے گھنگھرو تھے۔ وہ چھن چھن کرتی ہوئی قالین کے درمیان میں آ کھڑی ہوئی۔ اس نے میرن شاہ کو جھک کر سلام کیا تو سازندوں نے ساز چھیڑ دیا۔

وہ تھرکنے لگی تو یوں لگا جیسے ہوا تھم گئی ہو۔ لمحہ بہ لمحہ ساز تیز ہونے لگا۔ ایک بار تو یوں ایسا لگا کہ سازندے پیچھے رہ گئے ہیں، اس کے تھرکنے کا انداز تیز تھا۔ اس کے بدن کی لچک کمال کی تھی۔ وہ مچلتی، تھرکتی ناچ رہی تھی۔ ایک سماں بندھا ہوا تھا۔ سبھی اس کی طرف پوری طرح متوجہ تھے۔ انہیں لمحات میں کوٹھے کے صحن سے باہر کسی کی آمد کا احساس ہوا۔ چند لوگ آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میرن شاہ نے ہاتھ سے ناچ روک دینے کا اشارہ کیا۔ لڑکی رک کر ایک جانب ہٹ گئی۔ وہ گنتی کے تین لوگ تھے۔ ان میں دو میانے قد کے تھے اور ایک لمبے قد والا تھا۔ انہوں نے کھلے گھیر کی شلواریں اور کھلی کھلی قمیص پہن رکھی تھی۔ ان کی مونچھیں بڑی بڑی اور سر پر بڑے پگڑ تھے۔ ان کے کاندھے پر سیاہ چادریں تھیں۔ ممکن ہے اندھیرے میں کچھ مزید لوگ بھی ہوں۔ انہوں نے آتے ہی میرن شاہ سے مصافحہ کیا۔

''آؤ بیٹھو......'' میرن شاہ نے بڑے خلوص سے کہا تو ایک لمبے سے شخص نے بڑے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"نہ...... نہ میرن ساہ، ہم نا ہیں بیٹھاں گے۔ بس تیرے سے دو ہر چ بھی بات کرنی اے۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے، تم اتنی دور سے آئے ہو، کھانا کھاؤ، بیٹھو، یہ ناچ دیکھو، پھر بات بھی ہو جائے گی۔" میرن شاہ نے حیرت سے کہا۔

"نہ نہ، تم کام ہی ایسا کرو ہو، ہمیں ئیٹھن جوگا چھوڑا ای نہیں۔" لمبے قد والے نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"ہوا کیا ہے؟" میرن شاہ نے پوچھا

"تیرے علاقے میں ہمارے دو بندے قتل ہو گئے، اور تم یہاں ناچ گانا دیکھ رہے ہو۔" اس نے شکوہ بھرے انداز میں اکھڑے سے لہجے میں کہا۔

"کب، کب ہوا ایسا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"جس بندے کو اپنے علاقے کی خبر نہیں، وہ ہمارا دوست کیسے ہو سکتا ہے، دشمن ہوتا ہے وہ۔" اس نے آخری لفظ دبے دبے غصے میں کہے تھے۔ تبھی اس کے ساتھ والا ایک بندہ بولا۔

"میرن ساہ اگر تمہیں نہیں پتہ تو پھر تیرے جیسا نااہل بندہ کوئی نہیں، یا فیر تم جھوٹ بول رہے ہو، بولو، کیا جواب ہے تیرے پاس؟"

میرن شاہ حیرت اور خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ہماری طرف دیکھا پھر سامنے کھڑے ان تینوں سے پوچھا۔

"مجھے پوری بات بتاؤ، ہوا کیا ہے؟"

"بتا تو رہے ہیں، مارے دو بندے قتل ہو گئے ہیں تمہارے علاقے میں۔" لمبے قد والے نے غصے میں کہا۔

"اب تم بیٹھ بھی نہیں رہے، بات بھی نہیں سن رہے، اب میں کیا کہوں، یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم

اپنا فیصلہ سناؤ جو مجھے کہنے آئے ہو۔" اس بار میرن شاہ بھی غصے سے اکھڑ گیا۔

"دیکھ میرن ساہ، ہم سے دشمنی کا مطلب کیا ہے تم اچھی طرح جانتے ہو۔ ہم مر جاویں ہیں پر غلط بات نا کہیں بولیں ایں۔ تم ہمارے ساتھ غلط کر رہے ہو، آیو بتانے کے لئے یہاں تک آیا ہوں۔" لمبے قد والے نے کہا۔

"جب مجھے پوری بات کا نہیں پتہ تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میرن شاہ نے کہا۔

"تو پھر سن لے، تو اس علاقے میں اب تیری ساکھ نہیں بچی پھر۔ مارا ایک بندہ مرے گا تو ہم دو ماریں گے۔ کل سام تلک ہمتے قاتل دے دو، یا پھر ہماری دشمنی کے لئے تیار ہو جا۔"

"دیکھ تو ادھر بیٹھ، میں ساری بات کا پتہ کرتا ہوں، پھر بتاتا ہوں۔" میرن شاہ نے حتمی انداز میں کہا تو لمبے قد والا بولا۔

"میں جا رہا ہوں، شام تلک کا وقت ہے۔ دشمنی یا دوستی......" اس نے کہا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میرن شاہ چند لمحے تذبذب میں سوچتا رہا پھر اس نے ہاتھ ملا لیا۔ وہ لوگ جیسے آئے تھے، ویسے ہی واپس چلے گئے۔ وہ کوٹھے سے اترے اور اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

ماحول میں ایک دم سے تناؤ آ گیا تھا۔ میرن شاہ نے ناچنے والی اس لڑکی کو بھی جانے کا اشارہ کیا تو وہ سبھی چل دیئے۔ جس وقت وہ جا رہے تھے، اس نے زمان سوہل کی جانب دیکھ کر کہا۔

"مجھے سمجھ نہیں آئی ان لوگوں کی۔"

"لیکن مجھے تھوڑی آ گئی ہے۔" اس نے کہا

"کیا......؟" اس نے تیزی سے پوچھا

"لگتا ہے بختاور اپنا کام دکھا گیا ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا

"جب تک کوئی پکی بات سامنے نہیں آجاتی میں نہیں مانتا۔ معاملہ کچھ اور لگتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا،" اچھا فون کرو، بندے یہاں منگواؤ۔ شاید ضرورت پڑے۔"

"میں ابھی کہتا ہوں۔" اس نے جیب سے فون نکالتے ہوئے کہا پھر میری طرف دیکھ کر بولا،" یار جلی، تم یہاں کیا کر رہے ہو، جاؤ ادھر ڈیرے پر جا کر آرام کرو۔ اگر کسی کو گاڑی کی ضرورت ہوئی تو اسے دے دینا۔"

"ہاں ہاں جاؤ۔" اس نے کہا۔

میرے ساتھ ایک بندہ کر دیا گیا۔ میں نے اپنی جیپ کچے راستے پر ڈالی اور چل دیا۔ اگرچہ میرا بڑا دل چاہ رہا تھا کہ میں وہیں رہوں۔ ایک تجسس تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہو گئی، جس سے وہ لوگ مرنے مارنے پر تل گئے تھے۔ میرن شاہ کے چہرے پر فکرمندی آ گئی تھی۔ وہ اُن تین لوگوں کے سامنے بولا نہیں۔ وہ کون لوگ تھے؟ یہی سوال میں نے گھما پھرا کر ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے کیا تو اس نے جواب دیا۔

"یہ بارڈر پار سے آئے تھے۔ اب انہوں نے واپس بھی چلے جانا ہے۔" اس نے کہا تو ایک بار مجھے حیرت ہوئی، اتنی سی بات کہنے کے لئے وہ تین بندے یہاں تک آ گئے تھے۔ اس کا مطلب ہے معاملہ خاصا گمبھیر ہے۔ ایسا کیا ہونے والا ہے، یہ سمجھ میں آجائے گا۔

رات کا دوسرا پہر تھا جب ہم ڈیرے پر آ گئے۔ وہاں کچھ لوگ پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے جیپ بند ہی نہیں کرنے دی۔ میری گاڑی لی اور چند منٹ بعد ہی ڈیرے پر سکوت چھا گیا۔ میں اکیلا ہی وہیں رہ گیا، مجھے بابا خیر الدین بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی چارپائی بھی خالی تھی۔ ڈیرے کا بڑا سارا صحن خالی تھا۔ میرن شاہ کی رہائش

گاہ کی جانب بھی خاموشی تھی۔ ہر جانب سناٹا چھا گیا ہوا تھا۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔

میں اسی الجھن میں پھنسا ہوا تھا کہ بارڈر پار سے آئے لوگ میران شاہ سے کس طرح بات کر رہے تھے؟ کیا میران شاہ کا کوئی قصور تھا؟ کیا واقعی ہی اس نے بندے قتل کروا دیے تھے یا پھر وہ کسی سازش کا شکار ہو گیا تھا؟ اچانک میرے ذہن میں بختاور کا خیال آیا۔ وہی بختاور جو ریڑھے پر سے غائب ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں بھی زمان مومل بتا چکا تھا کہ وہ بارڈر پار کر گیا تھا۔ کیا یہ اس نے قتل کیے؟ میران شاہ نے بھی تو آج صبح میرے سامنے ہی ایک بندے کو قتل کیا تھا۔ جس نے بختاور کو ایک رات کے لئے اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی اور پھر اسے بارڈر پر چھوڑ کر آیا تھا۔ مجھے ان واقعات کے پیچھے طوفان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ طوفان کیا ہو سکتا تھا؟ میں اس کے بارے میں نہ کچھ کہہ سکتا تھا اور نہ ہی کوئی اندازہ لگا سکتا تھا۔ یہی اندازے لگاتے لگاتے میری آنکھ لگ گئی۔

نجانے رات کو وہ کون سا پہر تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں روشنی کے کسی سمندر میں ڈوب گیا ہوں۔ اتنی تیز روشنی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کے اٹھا تھا۔ میرے سامنے اتنی تیز روشنی تھی کہ میں برداشت نہ کر سکا۔ میری آنکھیں چندھیا جانے سے بند ہو گئیں۔ لیکن مجھے یہ احساس ضرور ہو گیا کہ کوئی میرے نزدیک کھڑا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہا تو مجھے سوائے گھمبیر اندھیرے کے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ سفید دودھیا روشنی میں کچھ بھی نہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے روشنی ختم ہو گئی۔ میری آنکھیں کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ اندھیرے میں مجھے احساس ضرور تھا کہ کوئی بھاگتا ہوا مجھ سے دور جا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے اپنے اردگرد کوئی ذی

روح دکھائی نہیں دیا۔ میں روشنی کی الجھن کو دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ کیسی روشنی تھی؟ فوری طور پر مجھے اس کی ذرا بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔

میں تیزی سے اٹھا اور اندر کمرے میں اپنے سامان میں سے ٹارچ نکال کر لے آیا۔ ٹارچ روشن کر کے دیکھا تو مجھے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں نے روشنی کی لکیر کو چاروں طرف گھمایا۔ تبھی میری نگاہ ایک جوتے پر پڑی جو رہائش گاہ کی دیوار پر لگے دروازے کی جانب کچھ فاصلے پر پڑا تھا۔ میں نے جا کر وہ جوتا اٹھایا اور اپنی چارپائی تک آ گیا۔ جوتے کو دیکھتے ہوئے ٹارچ کی روشنی میری آنکھوں میں پڑی تو میری آنکھیں ایک بار پھر سے چندھیا گئیں۔ تب مجھے پتہ چلا کہ میری آنکھوں میں پڑنے والی روشنی کسی ٹارچ ہی کی تھی۔ کوئی یہاں تک ضرور آیا تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں مجھے دیکھا۔ میری آنکھیں کھلنے پر واپس بھاگ گیا۔ یہ سوال ذہن میں آتے ہی میں نے جوتے کو غور سے دیکھا۔ وہ ایک مہنگا زنانہ نازک سا سلیپر تھا۔ جوتے کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں یہ خیال کوندا۔ کیا ساوری یہاں تک آ کر واپس بھاگ گئی تھی؟ کیا اسے میرے بارے میں پتہ چل گیا؟ کیا وہ مجھے جان گئی؟ اگر ایسا نہیں تو وہ میرے پاس یہاں کیوں آئی تھی؟ کیا وہ اتنا مہنگا نازک جوتا پہن سکتی تھی۔ ایسا مہنگا جوتا جس پر ذرا سی بھی دھول مٹی نہ ہوئی ہو۔ یہاں پر کام کرنے والی عورتیں تو ایسا جوتا نہیں پہنتی تھیں۔ میں کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر جوتا اندر کمرے میں چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔ میں واپس آ کر لیٹ گیا میری آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ میں نے اتنا سمجھ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ ساوری آئی تھی اس نے کسی ٹارچ سے میرا چہرہ دیکھا پھر میرے اچانک جاگ جانے سے وہ بھاگ گئی۔ اسے ایک طرح سے شرارتی سمجھ سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی کئی سارے سوال میرے ذہن میں ابھر آئے تھے۔ ان سوالوں کے جواب نہ میرے

پاس تھے۔ یہ محض دماغی کسرت ہو سکتی تھی۔ اس کا حاصل کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے سب کچھ ذہن سے نکالا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو دن اچھا خاصہ چڑھ آیا تھا۔ دھوپ کی شدت سے میری آنکھ کھلی تھی۔

میں نہا کر فریش ہوا اور کمرے میں آ گیا۔ وہاں پڑا ناشتہ دیکھ کر مجھے عجیب سا لگا، جس کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دوبارہ بابا خیر دین کو دیکھا لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں نے ناشتہ کیا اور برتن سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیے۔ کچھ دیر بعد ایک خاتون نے باہر سے آواز دی پھر سامنے آ گئی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر خاتون تھی، اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جس میں ایک چائے کا مگ رکھا ہوا تھا۔ اس نے وہ پلیٹ ایک جانب رکھ دی اور برتن اٹھا کر جانے لگی تب میں نے پوچھا۔

”بابا خیر دین کہاں ہے؟“

”پتر وہ تو کل شام سے یہاں پر نہیں ہے۔“ اس نے مجھے بتایا

”کہاں گیا وہ؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا

”پتر وہ ساتھ والی بستی میں گیا ہے۔ وہاں اس کے کسی رشتے داری کی شادی تھی۔ اس لئے وہ اپنی بیٹی کے ساتھ چلا گیا، شاید آج شام تک آ جائے یا پھر کل صبح آ جائے گا۔“ اس خاتون نے کہا اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اگر وہ سادوری نہیں تھی تو پھر کون تھی؟

میں نے ابھی تک کوئی کام شروع نہیں کیا تھا۔ سچی بات تو یہی تھی کہ میں خود ہی کوئی کام کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ میرا من ہی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے علم تھا کہ میں جو کچھ بھی لکھ کر حکومت کو دے دوں گا، اس رپورٹ کو سرد خانے میں ہی ڈال دیا جانا تھا۔ میں یہ سب کچھ اپنے دفتر کی

میز پر بیٹھ کر بھی لکھ سکتا تھا لیکن مجھے یہاں آنا تھا۔اس کے لئے میں نے طویل انتظار کیا تھا۔
میں کمرے کے باہر چھپر تلے آ کر بیٹھ گیا۔میرے سامنے نقشہ کھلے ہوئے تھے۔یہی میرا دفتر تھا۔اپنے طریقہ کار کے مطابق میں نے چند جگہوں کی نشاندہی کر لی تھی تاکہ روزانہ کے اعتبار سے اس کا سروے کر سکوں۔
وہیں بیٹھے مجھے دوپہر ہو گئی۔ڈیرے میں کوئی نہیں آیا تھا۔دوپہر کے بعد کچھ لوگ میری گاڑی لے کر آ گئے۔میں نے ان سے بات کرنا چاہی لیکن کسی نے مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔شاید انہوں نے مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کیا تھا۔انہوں نے گاڑی چھوڑی اور واپس چلے گئے۔کچھ ہی دیر بعد پتہ چلا کہ میرن شاہ آ گیا تھا۔اس کے ساتھ کچھ لوگ بھی آئے تھے۔وہ سب پلٹ کر چلے گئے۔مجھے اس وقت تھوڑی خوشی محسوس ہوئی جب میرے پاس زمان سومل آ کر بیٹھ گیا۔میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"خیریت تو ہے نا، بڑے تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔"
میرے کہنے پر اس نے پہلے تو میری طرف دیکھا۔وہ بالکل بھی تھکا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔
میں نے تو ایسے ہی بات بڑھانے کے لئے کہا تھا۔
وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔
"شکار پر جانے سے تھکن تو ہو ہی جاتی ہے۔"
"زیادہ ہی بھاگ دوڑ ہو گئی تم لوگوں کی؟" میں نے پھر بات بڑھاتے ہوئے پوچھا تو وہ سوچتے ہوئے بولا۔
"نہیں شکار کا پروگرام تو سمجھو کل تک ہی ختم ہو گیا تھا۔رات بھر اور پھر آج سارا دن، ہم ان قاتلوں کی ٹوہ میں لگے رہے۔شاید کہیں سے کوئی سراغ مل جائے۔"

”پھر ملا کوئی سراغ؟“ میں نے اپنا تجسس پوری طرح دباتے ہوئے پوچھا

”نہیں سراغ تو نہیں ملا مگر میرن شاہ پر لگا الزام کافی حد تک کم ہو گیا۔ کچھ باتیں ایسی سامنے آئی ہیں۔ اس پر الزام محض اس لئے لگایا جا رہا ہے کہ یہ علاقہ میرن شاہ کا ہے۔ خیر پتہ چل جائے گا۔“

”ایک بندے کو یہاں ڈیرے پر مارا گیا تھا کہیں وہ تو نہیں تھا؟“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”نہیں وہ معاملہ دوسرا ہے۔ وہ سائیں کی خاندانی دشمنی میں مارا گیا تھا۔ اس بختاور کو پناہ دی تھی۔ یہاں یہی طریقہ ہے۔ پناہ دینے والا بھی اتنا ہی مجرم سمجھا جاتا ہے۔“ زمان مونل نے بتایا

”ویسے مجھے تو یہاں عجیب سا لگ رہا ہے۔ جب سے آیا ہوں یہی مرنے مارنے کی باتیں چل رہی ہیں۔ میرن شاہ سے ایک بندے کے لئے کہا تھا، وہ بھی نہیں دے رہا۔“ میں نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

”او ہاں، سائیں نے مجھے کہا تھا۔ میں تیرے ساتھ رہوں گا۔ ویسے تم اکیلے نکل جایا کرو، کیا ضرورت ہے بندے کی؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں ہنستے ہوئے بولا

”کسی نے مجھے میرن شاہ کا بندہ سمجھ کر مار دیا تو؟“

”ہاں یہ تو ہے۔ خیر، میں صبح سویرے آ جایا کروں گا پھر نکل جایا کریں گے۔ اب میں چلتا ہوں۔“ اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ میں اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ میرے کام کا بندہ نہیں تھا۔ میں نے سارے کاغذات اندر کمرے میں رکھے اور ڈیرے سے باہر نکل گیا۔ میری نگاہ دور کیکر کے درخت پر پڑی۔ اس کے ارد گرد کافی ساری بھیڑ بکریاں چر رہی تھی۔

بلاشبہ سانول بھی وہیں ہوگا۔ میں یہی سوچ کر آگے بڑھ گیا۔ میں درخت کے پاس پہنچا۔ وہ تنے سے ٹیک لگائے نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ میری آہٹ پاکر اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ہم کچھ دیر خاموش رہے پھر میں بولا۔

"میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن تم بات کرنے کی بجائے ناراض ہو گئے ہو۔ یہ اچھی بات تو نہیں ہے نا۔"

"کیوں بات کروں میں تم سے؟" اس نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

"یار میں یہاں تیری بستی میں اجنبی ہوں۔ یہاں میرا کوئی نہیں ہے۔ تم اچھے لگے ہو تو بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اسی روکھے پن سے بولا

"لیکن میں تم سے بات کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

"یار کوئی وجہ تو ہوگی نا؟" میں نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا

اس نے ایک طویل سانس لی اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا

"میں ایک غریب آدمی ہوں۔ سائیں سے میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم اس کے مہمان ہو۔ میں تم سے کیا بات چیت کروں گا۔ مجھے معاف کرو اور چلے جاؤ یہاں سے۔" اس نے کمزور سے لہجے میں کہا تو مجھے انتہائی دکھ ہوا۔

مجھے سانول سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ مجھے اس وجہ سے دکھ ہوا جس وجہ سے وہ مجھ سے بات نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ وجہ میرن شاہ کا خوف تھا، اس کا جبر تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ کوئی بات کہنے سے بھی ڈرتا تھا۔ میں ڈیرے کی جانب چل دیا۔ میں جانتا تھا کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے۔ جب یہی سانول مجھ پر اپنا دل کھول دے گا۔

شام ڈھل رہی تھی۔ میں ڈیرے پر واپس آ گیا۔ کچھ دیر بعد جھٹ پٹا سا ہو گیا۔ وہی ادھیڑ عمر خاتون کھانا لے کر آ گئی۔ اس نے کھانا اور پانی چارپائی پر رکھا اور واپس چلی گئی۔ میں نے گرم گرم کھانا کھایا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ میرے پاس سوچنے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ سانول کا خوف دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا تھا۔ میں اس پر جتنا سوچتا، اتنا یہ دکھ بڑھ رہا تھا، اتنا ہی میرے اندر میرن شاہ کے بارے میں نفرت اور غصہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یہ وہ چھوٹے چھوٹے فرعون ہیں جنہوں نے خلق خدا پر جبر مسلط کیا ہوا تھا۔ ایسا جبر، ایسا خوف کہ کوئی بندہ بات کرتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ یہ خاندان پشت در پشت لوگوں پر جبر مسلط کیے ہوئے تھا۔ ایسے لوگ اس وقت اپنا جبر مسلط کر رہتے ہیں جب جبر سہنے والے لوگ موجود ہوں۔

یہی ایک خیال پھیلتا چلا گیا۔ میرے اندر درد کا دھواں پھیلنے لگا۔ میں رونا چاہتا تھا لیکن میرے آنسو نہ جانے کب سے خشک ہو گئے تھے۔ شاید میرے اندر آگ ہی اتنی ہو گئی تھی، جس نے میرے خوابوں کو نہ صرف جلا دیا تھا بلکہ میرے آنسو بھی خشک کر دیے تھے۔ میں نے اپنا سر جھٹک دیا۔ میں ایسی سوچ کو خود پر تسلط جمانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ یہی وقت کا تقاضا تھا۔ میں نے پھر سے ساوری کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس کی دھیمی دھیمی مسکراتی ہوئی آنکھیں زور سے بھینچے ہوئے لبوں کی مسکان، تھوڑی پر ذرا سا خم، سڈول بدن پر بھاری سینہ، میلے اور پرانے کپڑوں میں اس کا چھلکتا حسن مجھے یاد کر رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کب مجھ سے بات کرے گی۔ وہ کب مجھ پر اپنی میٹھی میٹھی باتوں کا سحر طاری کرے گی۔ وہ سمجھدار ہو چکی تھی یا ویسے ہی پر خلوص اور دوسروں کا دکھ اور درد سمجھنے والی ہو گئی تھی۔ میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ساوری کا چہرہ میرے ذہن سے معدوم ہوتا چلا گیا۔ اس کی جگہ وہی چہرہ ابھرتا چلا آیا، جسے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مجھے میٹھے سے درد اور انجانی

پریشانی میں مبتلا کر دیتا تھا۔ وہ معصوم سے چہرہ میرے نگاہ میں ابھرتا تو میں سب کچھ بھول جاتا۔ میرا تجسس انتہا کو پہنچ جاتا۔ ایک میٹھی سی کسک مجھے بے چین کر دیتی تھی کہ وہ کون تھی؟ اب بستی میں کہاں تھی؟ بستی میں تھی بھی یا اس کی شادی ہو چکی تھی؟ اس کا سراغ اگر مجھے ملتا تو وہ ساوری یا سانول بتا سکتے تھے۔ دونوں سے ابھی میری بات نہیں ہوئی تھی۔ میں اُن سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ سوچوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ میں یاس، امید اور خواہش میں گھرا افسردگی کے عالم میں تھا۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ میں ڈیرے پر اکیلا تھا۔ بابا خیر دین بھی نہیں لوٹا تھا۔ میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اچانک میرے بائیں جانب کچھ فاصلے پر آہٹ ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی دیوار سے کود کر اندر آ گیا ہو۔ میں نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ تاروں کی ملگجی روشنی میں دو ہیولے مجھے دکھائی دیے جو بڑے محتاط انداز میں چلتے ہوئے صحن کے درمیان کھڑی جیپ کی آڑ میں ہو گئے۔ وہ چند لمحے وہیں چھپے رہے پھر آگے بڑھ گئے۔ سامنے کا منظر دیکھ کر میرے اندر سنسنی پھیل گئی۔ میں پوری طرح محتاط ہو چکا تھا۔ میں آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی احتیاط سے میرن شاہ کی رہائش گاہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ تبھی دائیں جانب دیوار کی طرف پھر آہٹ ہوئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مزید لوگ بھی دیوار پھلانگ کر اندر آ گئے ہیں۔ وہ ایک ہی شخص تھا۔ وہ بھی آ کر جیپ کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں گنیں پکڑی ہوئی تھیں۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ تربیت یافتہ نہیں ہیں۔ لیکن چلتی ہوئی گن یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کس کے ہاتھ میں ہے۔ ایسی خطرناک صورت حال میں بھی حسین بیدار ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ یہ ایک لاشعوری عمل تھا۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر بائیں دیوار پھاند کر آئے تھے۔ رہائش گاہ کے سامنے بندے موجود رہتے تھے۔ پچھلی جانب مویشیوں کا

باڑہ تھا۔ جہاں پہرے داروں کے علاوہ کتے بھی موجود ہوتے تھے۔ اگرچہ یہاں ڈیرے پر لوگ موجود رہتے تھے لیکن آج اتفاق سے میں اکیلا ہی تھا۔ وہ لوگ ڈیرے میں سے گزر کر باآسانی رہائش گاہ کی طرف جا سکتے تھے۔ اس وقت ایک آدمی رہائش گاہ کی دیوار میں موجود چھوٹے دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔ دوسرا اس کے پیچھے تھا۔ جبکہ تیسرا ابھی تک جیپ کی آڑ میں موجود تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے مجھ پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ میری معمولی سی حرکت پر انہوں نے مجھے ہی قابو کرنا تھا۔ وہیں ساکت پڑے رہنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ ان کی مشکوک انداز سے یہ طے تھا کہ وہ اچھی نیت سے یہاں نہیں آئے تھے۔ وہ کیا چاہتے تھے؟ اس بارے قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہاں مگر موجودہ حالات کے تناظر میں یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ میرن شاہ کو مارنے کے لیے اس کے گھر میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ یہاں آتے ہیں میرے سامان کی تلاشی ضرور لی جائے گی۔ اگر میرے سامان میں سے کسی بھی قسم کا کوئی اسلحہ نکل آیا تو میں اسی وقت مشکوک سمجھ لیا جاتا۔ میں انتہائی محتاط تھا۔ میرے سامنے کی صورتحال پر میں تیزی سے سوچ رہا تھا۔ پہلی صورت تو یہی تھی کہ میں خاموشی سے لیٹا رہا ہوں اور آنے والے جو مرضی کرتے رہے ہیں اور میں دیکھتا رہوں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں ان کا سامنا کروں۔ مجھے دیوار کے ساتھ کھڑے لوگوں سے اتنا خطرہ نہیں تھا جتنا جیپ کی آڑ میں موجود بندے سے تھا۔ میری ذرا سی حرکت کرنے پر وہ مجھ پہ فائر کر سکتا تھا۔ میں اٹھ کر کمرے میں بھی چھپ سکتا تھا۔ میرے اور کمرے کے دروازے کا درمیانی فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن میں کسی بھی طرح کی حرکت کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

میں ان تینوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ یوں ہی گزر گئے۔ میری طرف سے کسی بھی قسم کی کوئی حرکت نہ پا کر وہ تیسرا جیپ کی آڑ سے نکلا اور دھیرے دھیرے میری جانب بڑھنے لگا۔ خطرہ میری جانب بڑھنے لگا تھا۔ میرا دورانِ خون ایک دم سے تیز ہو گیا۔ میں نے پوری طرح چوکنا ہو کر مزاحمت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ میرے ساتھ کیا کرتا میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن میں اس کے گن پکڑنے کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ پر فائر نہیں کرنا چاہتا بلکہ مجھے بے ہوش کرنا چاہتا تھا۔ میں دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میں اس کے قریب آ جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ میرے پائینتی آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چند لمحے میری جانب دیکھتا رہا پھر میرے بائیں جانب آ کر اس نے مجھے دیکھا پھر گن کو نال سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے سر پر گن کا بٹ مارے گا۔ میں اگلے ہی لمحے اسپرنگ کی مانند اچھلا اور اسے لیتے ہوئے کچے فرش پر آ رہا۔ میری گرفت اس کی گن پر تھی جس کا بٹ میں نے اپنی بغل میں دبا لیا اور ایک جھٹکے سے میرے ہاتھوں میں تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا میں نے اس کی ٹانگوں پر فائر کر دیا۔ اس کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ فائر کرتے ہی میں نے وہ جگہ چھوڑی اور جیپ کی طرف بھاگا۔ انہی لمحات میں مجھ پر دو فائر ہو گئے۔ تب تک میں جیپ کی آڑ میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے وہیں سے دیوار کے پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ میرے سامنے سے بھی ویسا ہی فائر ہوا۔ ڈیرے میں انسانی چیخیں گونج رہی تھیں۔ اچانک سامنے والوں میں کسی ایک نے پورا برسٹ ہی مجھ پر جھونک دیا۔ وہ میری بجائے جیپ میں لگا۔ بلاشبہ کوئی ایک گولی جیپ کی فیول ٹینکی میں لگی تھی۔ ایک دم سے شعلہ اٹھا اور پھر ہلکا سا دھماکہ ہو گیا۔ دھماکے کے ساتھ ہی آگ بھڑکنے لگی۔ اب میں وہاں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ میں پیچھے

ہٹا اور ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔

جلتی ہوئی جیپ کی روشنی جتنی مجھ پہ پڑ رہی تھی، اتنی ہی دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے لوگوں پر بھی پڑ رہی تھی۔ وہ مجھے دکھائی دے رہے تھے۔ بلاشبہ وہ بھی کسی آڑ میں ہونا چاہئے تھے مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ادھر ادھر ہوں۔ میں نے دائیں جانب کھڑے ہوئے شخص پہ فائر کر دیا۔ اسی لمحے سامنے والے نے بھی فائر کر دیا۔ ایک شخص پورا برسٹ جھونک چکا تھا۔ شاید اس کے پاس نیا میگزین نہیں تھا یا اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ فائر نہیں کر رہا تھا۔ میں نے پوری توجہ سے اس بندے پر فائر کر دیا جو مجھ پر فائر کر رہا تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے کئی فائر کر دیئے تھے۔ سامنے کھڑے بندوں میں سے کسی کی چیخ بلند ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے فائر لگ گیا تھا۔ وہ بالکل میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں مزید فائر کرتا، اچانک میرے پیچھے دیوار سے فائر ہونے لگا۔ میں الجھ گیا۔ باہر سے آنے والا کوئی بھی فائر مجھے لگ سکتا تھا۔ اچانک سامنے کی دیوار سے چھوٹا دروازہ کھلا اور کسی نے پکارتے ہوئے پوچھا۔

”اوئے علی تم کہاں ہو؟“

”میں یہاں ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں ایک دم سے نیچے بیٹھ گیا لیکن کوئی فائر نہیں ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ میں زمین پر بیٹھا ہوا تھا میرے سامنے کی دیوار پر موجود شخص رینگ کر گیٹ کی جانب بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ جیسے ہی اس نے قدم بڑھایا میں نے فائر کر دیا۔ یہاں تک فائر کرتا رہا کہ ایک فائر اس کی ٹانگ میں لگا۔ وہ گیٹ کی طرف بھاگتے ہوئے آدھے راستے میں تھا۔ وہ وہیں لمحہ بھر کے لئے ساکت کھڑا ہو گیا۔ اس نے پھر بھاگنے کی کوشش کی تو گر پڑا۔ اس کے ہاتھ سے گن نکل کر دور جا پڑی تھی۔ وہ پھر سے اٹھ کر بھاگنے لگا تو میں نے پھر فائر کر دیا۔ ایسے میں دیواروں سے کئی ٹارچ روشن ہو گئے۔ چند لمحوں میں انہوں

نے اندازہ لگالیا کہ اندر کی صورتحال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کئی لوگ بھاگتے ہوئے ڈیرے کے صحن میں آگئے۔ اتنے میں ایک گاڑی بھی پھاٹک کے پار آرکی تھی۔

خوش قسمتی سے میں پوری طرح محفوظ تھا۔ اگلے چند منٹوں میں تینوں حملہ آور ایک جگہ اکٹھے کر دیے گئے تھے۔ وہ پہلا شخص جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا اس میں اب زندگی کی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ وہ یہ جہاں چھوڑ چکا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگیں بیکار کرنا چاہی تھی لیکن بدحواسی میں بداحتیاطی ہوئی، گولیاں اس کے سینے اور پیٹ پر لگی تھیں۔ دوسرے کی ٹانگیں بے کار ہو گئی تھیں۔ ان سے خون بہہ رہا تھا۔ تیسرا بھی ایسی ہی صورتحال میں تھا۔ جلتی ہوئی جیپ کے شعلے مدھم پڑ چکے تھے۔ اب شعلے بجھانا بیکار تھا۔ ساری جیپ جل چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں میرن شاہ وہاں آگیا۔ اس نے پھولی سانس میں مجھ سے پوچھا۔

"تم ٹھیک ہو ناعلی......؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اختصار سے سب کچھ بتا دیا۔ میری روداد سن کر وہ زخمیوں کی جانب بڑھا۔ وہ تینوں ٹارچ کی روشنی میں پڑے تھے۔ اس نے جاتے ہی ایک زخمی کے سینے پر پاؤں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو؟ کس نے بھیجا ہے؟"

تبھی وہ شخص کراہتے ہوئے نفرت میں بولا۔

"تمہارے کو مارنا تھا۔"

"باڈر پار سے ہو کیا؟" میرن شاہ نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں، اب ادھر سے تمہاری موت ہی آئے گی۔" وہ پھر اسی نفرت سے بولا تو میرن شاہ

نے سر اٹھا کر اپنے آدمیوں سے کہا۔

"یہ دونوں زخمی ہیں۔ انہیں مرنا نہیں چاہیے۔ ان کا فوری علاج کرو، اٹھاؤ انہیں یہاں سے جلدی۔"

اس کے حکم پر کئی لوگ آگے بڑھے۔ انہوں نے دونوں کو اٹھایا اور وہاں آئی گاڑی میں ڈال کر تیزی سے چلے گئے۔ ان لوگوں کے جاتے ہی میرن شاہ ذرا دیر تک وہاں رہا، پھر پھاٹک سے نکل کر باہر چلا گیا۔ بلاشبہ فائرنگ کی آواز دور دور تک گئی تھی۔ بہت سارے لوگوں نے وہ آواز ضرور سنی ہوگی۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے جیپ اب تک جل رہی تھی۔ لیکن اب شعلے بہت کم رہ گئے تھے۔

☆......☆......☆

اگلی صبح میں بیدار ہوا تو دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میری نگاہ صحن میں کھڑی جلی ہوئی جیپ پر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی رات ہونے والا ہنگامہ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ ایک ایک کر کے منظر میرے سامنے آئے تو میں سوچنے لگا۔ اگر میں سو گیا ہوتا تو نجانے اب تک کیا ہو گیا ہوتا۔ میرا دماغ مجھے کئی تصویر دکھانے لگا۔ لمحوں ہی میں کئی تصویریں میری نگاہوں کے سامنے آ کر گزر گئیں۔ میں کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر میں نے سارے خیال اپنے دماغ سے نکال باہر کیے اور فریش ہونے کے لئے اٹھ گیا۔

اس وقت میں کپڑے تبدیل کر کے بیٹھا ہی تھا کہ بابا خیر دین آ گیا۔ وہ میری طرف بڑی حسرت سے تک رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بابا خیر تو ہے نا یوں مجھے دیکھ رہے ہو؟"

بس ایویں ہی پتر......" یہ کہہ کر اس نے طویل سانس لیا۔ اس نے پہلی بار مجھے "پتر" کہا

تھا۔ اس کے لہجے میں اتنا کچھ تھا جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے اتنا جذباتی ہونے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی۔ میرے اندر ایک دم سے تجسس ابھرا لیکن میں نے خود پر قابو پا لیا۔ میں اگر اس وقت کچھ پوچھتا تو شک کا پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ میں نے اس کی کیفیت کو نظر انداز کر دیا۔ تبھی وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہیں سائیں نے اپنے گھر میں بلایا ہے۔''

''مجھے...... مگر...... کیوں......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا

''مجھے تو صرف اتنا کہا کہ تمہیں گھر بلا لاؤں۔'' بابا خیر دین نے دھیمے سے کہا اور واپس پلٹ کر کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ میں نے سوچا تو تھا کہ ایک دن ایسا ہو جائے گا لیکن اتنی جلدی ایسا ہو جائے گا، یہ امید نہیں تھی۔ میں مسکرا دیا۔ میں کمرے سے باہر آیا تو بابا خیر دین میرے انتظار میں ہی کھڑا تھا۔ مجھے آتا ہوا دیکھ کر وہ بھی چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

رہائشگاہ والی دیوار کے چھوٹے دروازے سے پہلے بابا خیر دین گزرا اور اس کے بعد میں نے پار کیا۔ میرے سامنے ایسے ہی بڑا سا گھر تھا جیسے عام طور پر روہی میں ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک طرف کے پختہ کمرے بنے ہوئے تھے، جن کے آگے برآمدہ تھا۔ اس میں میرن شاہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ایک گورے رنگ والی بوڑھی عورت کرسی پر براجمان تھیں۔ اس نے سیاہ رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ نیلے رنگ کی دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ سر پہ چادر تھی جس سے برف کی مانند بال دکھائی دے رہے تھے۔ وہ میری جانب بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا، بابا خیر دین کے پیچھے چلتے ہوئے ان کے پاس جا پہنچا۔ میرے سلام کے جواب میں میرن شاہ نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔ تبھی میرن شاہ نے میری طرف دیکھتے

ہوئے بڑے نرم لہجے میں اس بوڑھی خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ میری ماں ہیں اور تم سے ملنا چاہتی ہیں۔“

لفظ اس کے لبوں میں ہی تھے کہ بوڑھی عورت نے اپنے دونوں ہاتھ یوں میری طرف بڑھائے جیسے وہ میرے سر پہ پیار دینے کے لئے ہاتھ بڑھا رہی ہو۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے سر پر پھیر دیئے۔ میں واپس کرسی پر آ بیٹھا تو وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہتی چلی گئی۔

”میں نے تمہیں یہاں اس لیے بلایا ہے کہ تم نے رات ہمیں بڑی تباہی سے بچا لیا۔ تیرا بڑا شکریہ پتر۔ تم نہ ہوتے ڈیرے میں تو نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔ وہ دشمن آئے تو میرن کو مارنے کے لئے تھے مگر ممکن ہے کوئی اور نقصان بھی کر دیتے۔ رب سائیں نے تیرے وسیلے سے ہمیں بڑی تباہی سے بچا لیا ہے۔“

وہ خاموش ہوئی تو میرن شاہ نے دھیمے لہجے میں مجھ سے کہا۔

”تیری جیپ کا نقصان ہوا، وہ میں تجھے نئی جیپ لے دوں گا۔“

”وہ میری جیپ نہیں، سرکاری تھی۔ اب محکمے کو بتانا پڑے گا۔“

میں نے جان بوجھ کر ایسا کہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری بات وہ فوراً سمجھ جائے گا۔ اس لئے وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”ہم اس پر پھر بات کرتے ہیں۔“

وہ سمجھ گیا تھا۔ اسی لئے مجھے بات کرنے سے روک دیا تھا۔ اسی دوران اماں نے پوچھا۔

”تم کہاں سے ہو پتر؟“

اس سوال پر میرا دل دھک اٹھا۔ ایک آندھی میرے دماغ میں چلی، میرے اندر شعلے

بھڑک اٹھے، میرے من کی کیفیات سے مجھے یوں لگا جیسے میں پھٹ جاؤں گا۔ لیکن اگلے ہی لمحے میں نے خود پر قابو پایا اور بڑے سکون سے بتایا۔

"لاہور سے ہوں، قریب ہی ایک گاؤں ہے۔"

"اچھا، تم پنجاب سے ہو۔ یہاں رہتے ہوئے مشکل تو ہوتی ہوگی؟" اس نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"اماں، پردیس میں مشکل تو ہوتی ہے۔ اب نوکری بھی کرنی ہے تو پردیس کاٹنا پڑتا ہے۔" میں نے کہا تو میرن شاہ نے بڑے غور سے مجھے دیکھا۔ ممکن ہے مجھ سے مزید کوئی بات کرتا لیکن انہی لمحات میں ساوری آتے ہوئے دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ میں ٹرے پکڑا ہوا تھا۔ ساوری کو دیکھ کر یوں لگا جیسے ایک دم سے موسم بدل گیا ہو۔ چھائے ہوئے بادلوں کے درمیان سے جیسے اچانک سورج کی کرنیں زمین پر نچھاور ہو جائیں۔ اس نے انتہائی سنجیدگی سے ہمارے درمیان پڑے ہوئے میز پر ٹرے رکھا اور پیچھے ہٹ گئی۔ اماں نے ٹرے پر سے کپڑا ہٹایا تو سامنے گرم گرم پراٹھے، بھنا ہوا گوشت اور مکھن دھرا ہوا تھا۔

میں ناشتہ کر چکا تو ساوری چائے لے آئی۔ اس دوران اماں ہمارے پاس خاموش بیٹھی رہی۔ چائے کا ایک ہی مگ تھا۔ میں نے اٹھا کر لبوں سے لگایا تو اماں بولیں۔

"پتر جب بھی اپنے وطن کو واپس جاؤ نا تو مجھے ضرور بتا کر جانا، مجھے ملے بغیر نہیں جانا تم نے۔"

"جی ٹھیک ہے۔" میں نے سعادت مندی سے کہا تو وہ اٹھ کر چل دی۔ اس عمر میں بھی اس کی صحت قابل رشک تھی۔

تنہائی پاتے ہی میرن شاہ نے پوچھا۔ "وہ جیپ کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟"

میں نے سمجھایا کہ مجھے کو وجہ بتانے کا مقصد ہی یہی ہے کہ جیپ جلنے کی وجہ بتانی پڑے گی۔ اگر سچائی بیان کی جاتی ہے تو سب سے پہلے ایف آئی آر درج ہو گی۔ پولیس اس میں دخل انداز ہو جائے گی اور ایک نیا سلسلہ دراز ہو جائے گا۔"

"کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے؟" اس نے وہ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"یہی ہو سکتا ہے کہ اسی کو یوں ٹھیک کروا دیا جائے کہ پتہ ہی نہ چلے۔ بڑے بڑے کاریگر پڑے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ایسا ہی کرتے ہیں، آج ہی مستری بلواتا ہوں۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا پھر ایک دم سے پوچھا، "ایک بات تو بتاؤ؟"

"پوچھو؟" میں نے کہا۔

"تمہیں گن بردار لوگ اور تم نہتے...... ایک عام آدمی تو حوصلہ ہی چھوڑ دیتا ہے۔ تم نے کیسے یہ سب......" وہ کہتے ہوئے رک گیا تو میں نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"جب موت سر پر سوار ہوتا تو ایسے ہوتا ہے۔"

"تمہیں گن چلانا آتی ہے...... اتنا حوصلہ بھی ہے کہ تم اتنے لوگوں کا سامنا بھی کر سکتے ہو...... میں نے تمہیں ایک عام آدمی سمجھا تھا۔" اس نے بے یقینی کے سے انداز میں کہا۔

"میرن شاہ جی، تم یہ کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ میرا کام ہی ان اجاڑ، ویران، بیابانوں اور جنگلوں میں ہے۔ یہ پسٹل گن چلانا سیکھا نہ ہوتا تو ہمیں جانور ہی چیر پھاڑ کر کھا جاتے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا،

"کوئی ہتھیار ہے تمہارے پاس؟"

"میرا لائسنس والا پسٹل ہے لیکن وہ اُدھر گھر میں پڑا ہوا ہے۔ یہاں لانے کی میں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔" میں نے لاپرواہی سے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں... ؟"

"میں انسانوں کی بستی میں آیا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ایسے لمحات میں گھر کے ایک بوڑھے ملازم نے ہمارے قریب آ کے بتایا کہ منشی مہر خان آیا ہے۔ اس کا نام سنتے ہی میرن شاہ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے اسے بلانے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اس نے غصے میں منشی سے پوچھا۔

"تم ایک دن کا کہہ کر گئے تھے، آج چار دن ہو گئے ہیں۔"

"سائیں معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو تو پتہ ہے رشتے داری معاملات بڑے الجھے ہوئے تھے۔ کوئی بات سرے چڑھ ہی نہیں رہی تھی۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"پھر کوئی مسئلہ طے ہوا کہ ایسے ہی آ گئے ہو؟" میرن شاہ نے پوچھا۔

"نہیں سائیں، مسئلہ تو حل ہو گیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے سانس لیا پھر حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "وہ رات......"

"اس کہانی کو چھوڑو۔ ڈیرے پر علی کی جیپ دیکھی ہے کیا تم نے؟" اس نے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

"ہاں سائیں، وہ تو ساری جل گئی ہے۔"

"بس اسے ٹرالی میں ڈالو اور شہر لے جاؤ۔ باقی میں اس مستری کو ساری بات سمجھا دوں گا۔" میرن شاہ نے کہا تو وہ فوراً اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"سائیں اب اجازت دیں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا تو میں اور قشی ڈیرے میں آ گئے۔ اگلے دو گھنٹوں میں جیپ وہاں سے اٹھا لی گئی۔

☆......☆......☆

میرن شاہ نے میرے بارے میں جس شک کا اظہار کیا تھا، وہ درست تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میں جانتا تھا کہ ایسی باتیں ہوں گی۔ مجھ پر سوال بھی اٹھائیں جائیں گے۔ سو میں نے ان سوالوں کا جواب قبل از وقت ہی سوچ رکھا تھا۔ میں نے اس کا شک دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ مطمئن ہوا تھا یا نہیں، میں یہ نہیں جانتا تھا۔ اس وقت میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ ایسی سورتحال کو اپنے فائدے کے لئے کس طرح استعمال کر سکتا ہوں۔ میں انہی سوچوں میں تھا کہ ڈیرے کے گیٹ سے ایک جیپ آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ صحن کے درمیان میں رک گئی۔ چند لمحوں بعد اس میں سے زمان سوہل نکل کر میری طرف آ گیا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے چابیوں کا ایک گچھا میرے جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری جیپ تو اب پتہ نہیں کب تک واپس آئے گی۔ سائیں نے تیرے لئے جیپ کا بندوبست کر دیا ہے۔ یہ لو چابیاں۔"

"کیا تم نہیں جایا کرو گے میرے ساتھ؟" میں نے چابیاں لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"اسی لئے تو آیا ہوں، تیرے ساتھ ہی تو جانا ہے۔" وہ یہ کہتا ہوا چار پائی پر بیٹھ گیا۔

"پھر بیٹھو نہیں، چلو نکلتے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ یار کر لیں گے کام بھی۔ تم مجھے کوئی سرکاری نہیں پرائیویٹ کمپنی کے ملازم لگتے ہو۔"

"میں جتنی جلدی کام ختم کروں گا نا، اتنی جلدی واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے کام کرنا ہے۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے اٹھتے ہوئے بولا

"اچھا چل، کوپے پر چلتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر گپ لگاتے ہیں، کام بھی ہوتا رہے گا۔"

"ہاں، ڈیرے پر رہتے ہوئے میں بھی اکتا گیا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ڈیرے سے نکل گئے تھے۔

علاقے سے متعلق باتیں کرتے ہوئے ہم کوپے تک جا پہنچے۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اور زمان باتیں کرتے ہوئے کچھ دیر تک کوپے سے باہر کھڑے رہے پھر پچھلی جانب چلے گئے۔ عقب میں خاصا نشیب تھا۔ کوئی فوری طور پر پیچھے سے نہیں آ سکتا تھا۔ اگر کوئی آنے کی کوشش بھی کرتا تو اسے چڑھنے کے لئے تھوڑا وقت لگتا۔ پچھلی بار جب میں آیا تھا، تب میں سامنے کا حصہ میں چارپائی پر بیٹھا رہا تھا۔ یہاں عقبی حصے میں آیا ہی نہیں تھا۔ روشن دن کی دھوپ میں پھیلا ہوا صحرا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس چولستان میں روہی کا صحرا سر سبز تھا۔ جھاڑیاں، پودے اور درخت کافی تعداد میں پائے جاتے تھے۔ تھر کی مانند بالکل ویران اور بے آب و گیاہ نہیں۔ روہی میں کئی جگہیں ایسی بھی ہیں جہاں چراگاہوں کا سماں ہے۔ ہرن اور دوسرے چوپائے وہاں چرتے رہتے ہیں۔ اب تو ہرن اتنا نہیں ملتا، لیکن کبھی بہت ہوتا تھا۔ میرے سامنے کا منظر ایسا ہی تھا۔ دور تک آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ صحرا میں اپنا ہی خاص سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

"کتنی ویرانی ہے یار۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کچھ انسان اس ویرانی سے بھی بڑا فائدہ اٹھا رہے ہیں بلکہ یوں کہہ لو یہی ویرانی ان کے فائدے کا باعث بن رہی ہے۔" زمان نے لاپرواہانہ انداز میں کہا۔

"یہ انسان ہے نا، چاہے تو زمین پر بیٹھ کر ستاروں پر کمند ڈال لے یا پھر اسی زمین کا بوجھ بن جائے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ٹھیک کہا تم نے، یہ انسان بھی بڑی عجیب چیز ہے، نہ سمجھ میں آنے والی مخلوق۔ چاہے تو انسانیت کو بڑا فائدہ دے دے اور چاہے تو اسی انسانیت کو ختم کرنے کے درپے ہو جائے۔" زمان نے بھی سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے اندازہ تو ہے، ان ویرانوں میں کیا کچھ ممکن ہوتا ہے۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی ابھی تک۔" میں نے الجھتے ہوئے کہا

"کون سی بات سمجھ میں نہیں آئی تمہارے؟" زمان نے تجسس سے پوچھا۔

"پرسوں رات جب ہم یہاں تھے، بارڈر پار سے آئے لوگ یہاں آئے تھے۔ تم نے بتایا کہ وہ آج ہی واپس چلے جائیں گے۔ رات بھی تین حملہ آور ڈیرے پر آ دھمکے۔ کیا بارڈر پار کرنا اتنا ہی آسان ہے، جس کا دل چاہے پار کر کے آ جائے؟" میں نے الجھن بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں یار بارڈر پار کرنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ مہینے دو مہینے میں جب موقع ملتا ہے تو ادھر ادھر آتے جاتے ہیں یہ لوگ۔ یہاں آ کر چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہتے ہیں۔ رات جو لوگ آئے تھے وہ پہلے ہی یہاں پر تھے۔" اس نے بتایا۔

"کیا دھندہ کرتے ہیں، منشیات وغیرہ؟" میں نے پوچھا

"بہت کچھ ہوتا ہے یہاں پر، منشیات تو بہت چھوٹی سی چیز ہے۔" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"خیر وہ جانیں اور ان کا کام، مگر یہ قتل و غارت گری کیوں ہو رہی ہے؟ اصل سوال تو یہی ہے۔" میں نے پھر پوچھا تو وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ تب میں نے گوپے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ وہ میرے ساتھ چلتا ہوا گوپے کے اندر آ گیا۔ اندر کا ماحول کافی خوشگوار تھا۔ شاید ہوا

کی آمد و رفت کے باعث ماحول اچھا تھا۔

”علی، جیسا کام ہوتا ہے نا ویسے ہی فائدہ اور نقصان ہونے کا اندیشہ بھی موجود رہتا ہے۔ میرن شاہ کا مسئلہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اس دھندے میں ملوث ہے بلکہ اس علاقے پر اس کی حاکمیت بھی ہے۔ ایک تو اس کے دھندے کی وجہ سے کافی دشمنیاں ہو چکی ہیں۔ جب تک وہ اس دھندے میں رہے گا، یہ دشمنیاں چلتی رہیں گی۔ کبھی یہ ان کے بندے مار دیتے ہیں اور کبھی وہ اس کے بندے قتل کر دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ نہ جانے کب سے چل رہا ہے۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں مجھے بتایا تو میں نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

”بختاور بھی اسی دھندے میں ملوث ہے۔“

”نہیں، اس بستی کا کوئی بندہ بھی اس دھندے میں نہیں ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ان سے میرن شاہ کی خاندانی دشمنی چل رہی ہے۔ یہ دشمنی تین پشتوں سے چلی آ رہی ہے۔ جس کا داؤ لگتا ہے وہ کسی نہ کسی کا بندہ مار دیتا ہے۔“ اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”چلو یہ تو ایک الگ بات ہے۔ میں موجودہ حالات کی بات کر رہا ہوں۔ میرن شاہ کہہ رہا ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں اور......“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”ہاں یہ الجھن ہے۔ کبھی کبھی مجھے بھی لگتا ہے کہ یہ سائیں کے خلاف سازش ہے اور کبھی گمان ہوتا ہے کہ میرن شاہ جھوٹ بول رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ بندے قتل ہوئے ہیں۔“ اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

”پھر تو بارڈر پار والے بندوں کا یہ دعویٰ بھی بالکل درست ہے اس علاقے پر حاکمیت میرن شاہ کی ہے تو اسے کیوں نہیں معلوم؟ کیا میرن شاہ نے ان قاتلوں کو تلاش نہیں کیا یا اسے پتہ ہے اور وہ بتا نہیں رہا؟“ میں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا میں تمہیں شروع سے بات بتاتا ہوں، ممکن ہے کوئی نئی بات سامنے آ جائے۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو میں خاموش رہا وہ چند لمحے یوں ہی ساکت سا بیٹھا سوچتا رہا پھر بولا۔ "تقریباً دو برس پہلے کی بات ہے۔ میں ان دنوں نیا نیا یونیورسٹی سے یہاں آیا تھا۔ میرا گھر یہاں سے کچھ فاصلے پر موجود ایک بستی میں ہے۔ میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں میرن شاہ کے پاس آ گیا۔"

"نوکری کے لئے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں کوئی باقاعدہ تنخواہ والی بات نہیں، بس کام دھندا تھا جس میں کچھ مل جاتا۔" اس نے کہا۔

"اچھا پھر......" میں نے ہنکارہ بھرتے ہوئے کہا۔

"میرا کام یہ طے ہوا کہ میں بارڈر پار سے آنے والے لوگوں کو لے کر چند دن اپنے ہاں رکھوں۔ ان کے کھانے پینے اور رہنے کا بندوبست کروں اور پھر جب تک حالات سازگار نہ ہو جائیں، انہیں اپنے پاس رکھوں۔ حالات سازگار سے مراد یہ ہے کہ انہیں یہاں سے کسی بھی شہر میں چھوڑنا ہوتا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کر آنا تھا۔ اس کے بعد مجھے ایک بڑی رقم ملنا تھی۔ میں نے اس کام کی حامی بھر لی۔ چند دن بعد مجھے بتایا گیا کہ بارڈر سے کچھ لوگ لینے ہیں۔ میں وہاں چلا گیا۔ میں نے رات کے اندھیرے میں تین لوگوں کو لیا۔ ان میں جوان مرد تھا، ایک ادھیڑ عمر عورت اور ایک بالکل نوجوان لڑکی تھی، بڑی ہلکی عمر کی۔ میں نے انہیں جیپ میں بٹھایا اور اپنے گھر لے آ گیا۔ وہ راجستھان کے ایک علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک جھونپڑا ان کے لیے مختص کر دیا اور وہ وہاں رہنے لگے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ سانس لینے کے لیے رکا تو میں نے پوچھا۔

”کیا وہ سب ایک ہی خاندان سے تھے؟“

”نہیں وہ جوان اور ادھیڑ عمر عورت ماں بیٹا تھے۔ لڑکی اس جوان کی بیوی تھی جو اس کے ساتھ بھاگ کے آئی تھی۔ اس نوجوان کے ہمارے جیسے لوگوں سے تعلقات تھے۔ سو اس نے اپنے علاقے میں رہنے کی بجائے وہاں سے بھاگ جانے کو ترجیح دی۔ انہوں نے سمجھا ہوگا کہ یہاں ان کے لیے بہتر ماحول تھا، وہ یہاں آ گئے۔ وہ میرے پاس چند دن رہے۔ تھوڑے دنوں بعد میرن شاہ نے کہا کہ میں انھیں ملتان کے قریب ایک جگہ تک پہنچا دوں۔ اگلی ہی صبح میں نے انہیں اٹھایا اور بتائی گئی جگہ پر پہنچا دیا۔ مجھے اچھی خاصی رقم مل گئی اور میں بھول بھال گیا۔“

”وہ یہاں غیر قانونی طور پر بس گئے تھے۔“ میں نے تصدیق کی۔

”ظاہر ہے وہ یہاں غیر قانونی تھے لیکن چند ماہ بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ تینوں ہی قتل ہو گئے تھے۔“ اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”وہ کیسے......“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”بارڈر پار سے لڑکی والے آئے تھے۔ انہوں نے صلح کر کے لڑکی کو واپس لے جانا چاہا تھا۔ لیکن ان میں کچھ بھی طے نہ ہو سکا۔ یہاں پر جو ضامن تھا اس نے یہی فیصلہ کیا کہ جب لڑکی واپس نہیں جانا چاہتی پھر کیوں لے کر جانا چاہتے ہو۔ خیر اس وقت وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مگر وہ رہے ادھر ہی۔ دو دن نہیں گزرے تھی کہ وہ تینوں قتل ہو گئے۔ بارڈر سے پار آئے ہوئے لوگ دوبارہ نہیں ملے۔“

”اب یہ جو دو قتل ہوئے تھے، کیا ان کا بھی انہی لوگوں سے کوئی تعلق تھا؟“ میں نے پوچھا

”میرے خیال میں تھا۔ یہ دونوں اسی طرف سے آئے تھے۔ ان کے درمیان کیا تنازعہ

تھا، اس بارے گمان یہی ہے کہ ان کا تعلق ان تین قتل سے ضرور تھا۔" زمان سومل نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے بقول چھ قتل ہوئے۔ تین پہلے اور دو اب ہوئے۔ وہ چھٹا کون تھا؟"

میں نے پوچھا۔

"وہی عثمانی جس نے لڑکی واپس جانے نہیں دی تھی۔" زمان نے بتایا لیکن پھر لمحے بھر میں تیزی سے بولا، "یہ پوری تصدیق ہے کہ یہ دونوں بارڈر پار سے آئے تھے۔ یہاں انہیں کس نے قتل کیا؟ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ پتہ چلے تو معاملہ سامنے آئے گا۔ اب وہ تو سارا مدعا میرن شاہ پر ڈال رہے ہیں نا۔"

"یار! یوں کون کسی پر یوں مدعا ڈال سکتا ہے؟ وہ بھی قتل کا۔ آخر ان بارڈر پار والے کوئی نہ کوئی موقف تو رکھتے ہوں گے۔" میں نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"بارڈر پار والوں کا موقف تم نے بھی سنا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ سائیں اس علاقے میں حاکمیت رکھتا ہے اسے ضرور پتہ ہونا چاہئے۔ یار پھر واردات کا پتہ نہیں بھی چلتا۔" اس نے بتانا چاہا تو میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"جب تک کوئی فیصلہ کن بات نہیں ہو جاتی تب تک کوئی قتل کرنے کے لئے نہیں چڑھ دوڑتا۔ وہ تو سیدھے گھر پہ حملہ کرنے آ پہنچے تھے۔ یہاں سے کسی نے بارڈر کے پار کوئی بندہ قتل کیا ہے۔ یہ حملہ آور اس کا انتقام لینے آئے تھے، مجھے یوں لگتا ہے۔"

میں نے کہا تو اس نے سنجیدگی سے بولا۔

"تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے، دل بھی مانتا ہے۔"

"خیر، مجھے کیا یہ ان کی دشمنی ہے، وہ لڑتے رہیں۔ میں نے چار دن رہنا ہے اور واپس

چلے جاتا ہے۔" میں نے لاپرواہی سے کہا تو زمان کے چہرے پر ایک سوالیہ نشان جیسا تاثر ابھرا۔ میں بھانپ گیا۔ یہ فطری سی بات تھی۔ اسے تجسس ہوا تھا کہ میں اتنی دلچسپی سے کیوں پوچھ رہا ہوں۔ تبھی میں نے خود ہی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اصل میں جب میں یہاں آیا تو مجھ پر بڑا ہی غلط تاثر ہوا۔ سبحان اور اس کے ساتھیوں نے مجھے بختاور سمجھ کر نہ صرف مارا پیٹا بلکہ وہ مجھے باندھ کر یہاں لے کے آئے تھے۔ یہاں آتے ہی قتل و غارتگری کی باتیں ہونا شروع ہو گئی اور اب ایسا حملہ ہوا ہے کہ میرا تو دل دہل کر رہ گیا ہے۔ ان حملہ آوروں کو گولیاں بھی میں نے ہی ماری ہیں۔ اب پتا نہیں کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں ہوتا یار، ان بارڈر پار والوں کا ہم نے بندوبست کر لیا ہے بلکہ آج شام ان کا سدباب ہو جائے گا۔" اس نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"کیسا سدباب" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"یہی کہ وہ لوگ یہ ثبوت دیں کہ یہ قتل جمیرن شاہ کی ایماء پر ہوا ہے۔ پھر تو ہم مانتے ہیں۔ اگر نہیں ہوا تو جرمانہ کے طور پر بختاور کو واپس کریں۔ ورنہ یہ دشمنی بہت بڑھ جائے گی۔" اس نے بتایا۔

"مطلب بختاور ان کے پاس ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل، وہ انہی کے پاس ہے۔" زمان نے کہا تو میں ساری کہانی سمجھ گیا۔ زمان یونہی مجھ سے باتیں کیے چلا جا رہا تھا۔

"دھندے کا کیا بنے گا؟" میں نے پوچھا۔

"جب تک یہ جنگ ختم نہیں ہوگی بارڈر پار والوں کو بھی تو دھندے میں نقصان ہی ہوگا۔ کوئی تو فیصلہ کن بات ہوگی۔" اس نے کہا۔

"یار یہ جنگ ختم ہونی چاہیے ورنہ ہر طرف نقصان ہے۔" میں نے اپنی رائے دی
"ہونی چاہیے، آج یا کل یہ الجھن دور ہو جائے گی۔" اس نے پرخیال انداز میں کہا۔
ہمیں باتیں کرتے ہوئے دوپہر ڈھل ہو چکی تھی۔ کوپے کے اندر کا ماحول بھی حبس
زدہ ہو گیا تھا۔ ہم باہر آ گئے۔ کچھ دیر وہیں کھڑے باتیں کرتے رہے پھر ہم ڈیرے کی
طرف چل دیئے۔

☆......☆......☆

سہ پہر ہو چکی تھی۔ میں ڈیرے پر تھا۔ میں نے کمرے سے باہر چارپائی پر نقشے پھیلائے
ہوئے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک نقشے پر کچھ نشان لگائے سوچ رہا تھا کہ یہاں لوگوں کی تقدیر خود
ان سے روٹھی ہوئی ہے۔ اصل میں وہ خود نہیں بدلنا چاہ رہے تھے۔ وہ وقت اور حالات کو اپنی
قسمت سمجھ کر قبول کر چکے تھے۔ میں ایک اکیلا ان کی کیا قسمت تبدیل کر سکتا تھا۔ جب تک وہ
خود اپنے آپ کو بدلنے کا نہ سوچ لیں۔
کچھ دیر پہلے بابا خیر دین میرے پاس تھا۔ وہ بھی نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ ایسے میں رہائش
گاہ کی دیوار والا چھوٹا دروازہ کھلا۔ میں نے چونک کر اس جانب دیکھا۔ ساوری دروازہ پار کر
کے میری جانب آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی، جس پر چائے کا مگ رکھا ہوا تھا۔
وہ میرے سامنے احتیاط سے چائے رکھتے ہوئے بولی۔
"یہ چائے پی لیں، سنا ہے شہریوں کو چائے بہت پسند ہوتی ہے۔"
"تم نے کس سے سن لیا کہ مجھے چائے پسند ہے؟" میں نے جان بوجھ کر نرم سے لہجے
میں پوچھا۔
"بس سنا ہے۔" اس نے اپنا آنچل ہونٹوں میں دباتے ہوئے کہا۔

''نہیں مجھے چائے نہیں پسند، مجھے دودھ پسند ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

''اب پی لیں، آج کے بعد دودھ ہی ملا کرے گا۔'' اس نے کہا۔

''ویسے یہ چائے آج ہی کیوں؟'' میں نے یونہی بات بڑھائی۔

''بڑی بی بی سمن نے کہا ہے کہ تمہارا کمرہ صاف کرا آؤں۔ میں نے سوچا چائے بھی لیتی جاؤں۔'' اس نے کہا اور کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

دوسرے کمرے میں جھاڑو پڑا تھا۔ اس نے وہ وہاں سے جھاڑو لیا اور کمرے کے اندر چلی گئی۔ وہ اندر صفائی کرنے لگی اور میں چائے پیتے ہوئے ساوری کے بارے میں سوچنے لگا۔ جس وقت اسے پتہ چلا کہ میں کون ہوں تب اس کی حیرت کی انتہا کیا ہوگی؟ یہ سوچ کر ہی میرے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ ممکن ہے وہ بھی سوچ چکی ہو کہ میں مر چکا ہوں گا۔ ایسا بندہ جس کے بارے میں یہ گمان ہو چکا ہو کہ وہ زندہ نہیں رہا ہوگا، اچانک وہ سامنے آ جائے تو کیا حالت ہوتی ہوگی۔ یہ صرف ایک ساوری ہی نہیں، ممکن ہے بہت سارے لوگ ایسی ہی کسی حیرت زدہ کر دینے والی کیفیت سے گزریں۔

''علی یہ کیا ہے؟'' اچانک کمرے میں سے ساوری کی آواز آئی۔ میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ساوری اپنے ہاتھوں میں وہی زنانہ جوتا پکڑے حیرت زدہ کھڑی تھی۔ اس کا رنگ فق تھا۔ وہ یوں ہولے ہولے کانپ رہی تھی، جیسے اس نے کوئی جن یا بھوت دیکھ لیا ہو۔ میں اس کی حالت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ ساوری کا چہرہ کسی بہت بڑے خوف کا عندیہ دے رہا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ایسی حالت کیوں ہو گئی ہے۔ تبھی میں نے بڑے نرم سے انداز میں کہا۔

''تم بھی دیکھ رہی ہو، یہ ایک زنانہ جوتا ہے؟''

"یہ یہاں کیسے آ گیا؟" اس نے پھنسی پھنسی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ساوری تم ٹھیک تو ہو، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" میں نے جواب دینے کی بجائے اس سے پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، تم مجھے بتاؤ، یہ یہاں کیسے آیا؟"

"یہ کوئی خوفناک بات ہے کیا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"میں پوچھ رہی ہوں، مجھے بتاؤ، یہ یہاں کیسے آیا؟" اس بار اس کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔ مجھے لگا کوئی بہت ہی اہم بات ہے۔ اس لئے میں نے اپنے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے نرم انداز میں کہا۔

"تم ایسے کرو، اس جوتے کو وہیں رکھ دو۔ پھر میرے پاس ادھر آؤ، میں تجھے ساری بات بتا دوں گا۔"

"علی، خدا کے لئے مجھے بتاؤ، یہ تیرے لئے خطرے والی بات ہے۔" اس بار اس نے رو دینے والے انداز میں کہا تو میں چونک گیا۔ تبھی میں نے کہا۔

"میں پرسوں رات یہاں تھا، تیز روشنی سے میری آنکھیں کھل گئی۔ کوئی میرے پاس تھا۔ جب تک مجھے کچھ دکھائی دیتا، وہ بھاگ گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ یہ جوتا یہاں پڑا ہے۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا، اور لا کر یہاں چارپائی کے نیچے پھینک دیا۔ اتنی سی بات ہے۔"

"وہ......دوبارہ تو نہیں......مطلب وہ دکھائی تو نہیں دی۔" اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا

"نہیں تو۔" میں نے سکون سے کہا تو اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"یہ میرن شاہ کی بڑی بہن پیر وزاں کا جوتا ہے۔ اس سے بچ جانا، وہ بڑی بندے مار قسم کی عورت ہے۔"

"بندے مار......؟"

"ہاں، وہ ایسی ہی ایک چڑیل ہے۔" اس نے جوتا یوں پھینکا جیسے وہ کوئی بہت ہی خطرناک شے ہو، اس کے ساتھ ہی اس نے جھاڑو وہیں رکھا اور جانے لگی۔

"مجھے بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟"

"بچ جانا اس ڈائن سے......"

یہ کہتے ہوئے وہ میری سنی ان سنی کرتے ہوئے تیزی سے رہائش گاہ کی جانب بڑھ گئی۔ وہ دیوار میں لگے چھوٹے دروازے میں نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ میں نے کمرے میں پڑے جوتے کو دیکھا، مجھے لگا جیسے وہ بہت ہی خطرناک قسم کی چیز ہو۔ میرن شاہ کی بڑی بہن، بندے مار، چڑیل، ڈائن......سماوری کی حالت، یہ سب کیا تھا، جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا؟

(قسط نمبر: 2)

ساوری کی باتیں سن کر میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ میرن شاہ کی بہن پیروزاں کو ایسا کیوں کہہ رہی تھی؟ کیا وہ اتنی ہی خطرناک عورت تھی؟ جو ساوری اس قدر بے حال ہو کر مجھے بتا رہی تھی؟ ساوری تو ان کی ملازمہ تھی اور میں ابھی اس کے لئے بالکل اجنبی؟ اس طرح مجھے ڈرانے کا مقصد کیا ہو سکتا تھا؟ اگر وہ خطرناک عورت تھی بھی تو کیسے؟ کیا کرتی ہے وہ؟ کہیں کوئی یہ سازش تو نہیں تھی؟ اگر سازش نہیں تو مجھے آزمایا تو نہیں جا رہا تھا؟ ایسے ہی سوال میرے دماغ میں گردش کرتے چلے گئے۔ ایک دم سے میرا دھیان پرسوں رات کے اس واقعہ کی طرف چلا گیا، جو کوئی بھی تھا، ایک بار وہ میرے قریب ضرور آیا تھا اور پھر جوتے کی صورت میں اپنا احساس چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اس پر مزید نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ اگر پیروزاں کوئی خطرناک عورت تھی بھی تو مجھے اس سے کیا؟ جب وہ سامنے آئے گی اور میرے لئے خطرہ بنے گی تو دیکھا جائے گا۔ میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا۔

شام ڈھلنے کو تھی جب بابا خیر دین واپس آ گیا۔ اس نے آتے ہی چار پائیاں بچھا دیں۔ میرا من چاہ رہا تھا کہ اس سے بہت ساری باتیں کروں لیکن میں اس سے ایسی کوئی بات نہیں کر سکتا تھا، جس کے لئے میرا من تھا۔ میں خاموشی سے چار پائی پر پڑا بابا خیر دین کو دیکھتا رہا۔ وہ اپنا کام کر کے رہائش گاہ کی جانب چل دیا۔ کچھ دیر بعد وہ کھانا لے کر آ گیا۔ میں کھا پی کر پھر چار پائی پر لیٹ گیا۔ میں کافی بے چین تھا۔ لیکن اس بے چینی کی وجہ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"پتر کیا بات ہے، کوئی پریشانی ہے؟" بابا خیر دین نے پوچھا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری جانب بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ میری بے چینی بھانپ گیا تھا۔

"کچھ نہیں بابا، یہاں نہ کام شروع ہو سکا اور نہ ہی کوئی امن سکون ہے، عجیب سی جگہ ہے، جہاں کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا۔" میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"شاید تمہیں شہر کے شور شرابے کی عادت ہے اس لئے یہاں پرسکون علاقے میں بے چینی ہو رہی ہے؟" اس نے دھیمے سے لہجے میں تبصرہ کیا۔

"ہو سکتا ہے ایسا ہو لیکن میں تو اس سے بھی ویران علاقوں میں رہا ہوں۔ وہ علاقے خطرناک بھی تھے۔ لیکن اس طرح......" میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا تو بابا چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

"جہاں ظلم ہوتا ہے نا، وہاں بے برکتی ہو جاتی ہے۔ تم ان باتوں کو نہ سوچو، اپنا کام کرو۔"

"ٹھیک ہے بابا۔" میں نے اس کی بات مانتے ہوئے کہا۔

"وہ زمان موہل کو بلا لو، یا پھر اس کے پاس چلے جاؤ۔ باتیں کر کے اپنا دل بہلا لو۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی گانے والے بھی ساتھ لے آئے، ہے تو شوقین بندہ۔" بابا خیر دین نے کہا۔

"کوئی نہیں بابا، اب میں سوتا ہوں، اب کون اسے بلا کر لائے۔" میں نے سستی سے کہا تو بابا نے کہا۔

"میں نے جانا ہے ابھی پار کی بستی، سائیں کا ایک کام ہے۔ زمان کا گھر رستے میں پڑتا ہے، کہو تو میں اسے بھیج دوں۔"

"نہیں، وہ تنگ ہو گا۔ ویسے بھی وہ سارا دن میرے ساتھ ہی رہا ہے۔ کل پھر وہ میرے ساتھ جائے گا۔" میں نے کہا تو بابا خیر دین اٹھ گیا۔ میں خود بھی زمان موہل سے زیادہ ملنے

میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔اب کچھ دن اسی کے ساتھ وقت گزارنا تھا۔کل کا دن بھی ہم نے طے کیا ہوا تھا۔بلکہ اسی نے کہا تھا کہ ہم صبح سے دوپہر تک بستی کے جنوبی علاقے میں پھریں گے۔ یہ علاقہ تقریباً چار کلو میٹر بنتا تھا۔اس کے بعد دوپہر کا وقت گوپے میں گزاریں گے۔سہ پہر کے بعد ہی وہاں سے واپس ڈیرے پر آنا تھا۔اس وقت میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔سو میں چارپائی پر کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

میرے ذہن میں ساوری تھی۔اس کا بچپن کا معصومانہ چہرہ اور اب قیامت خیز حسن، جوانی کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔میں اسے سوچ رہا تھا کہ مجھے لگا اس کی اوٹ سے ایک اور چہرہ ابھرنے لگا ہے، بے چین سا، قدرے غصے بھرا، سنہری بال، سفید رنگ مگر خدوخال واضح نہیں تھے، وہ کون تھی، یہی یاد نہیں آ رہا تھا۔شاید میری آنکھ لگ گئی تھی۔ہلکے سے کھٹکے پر میری آنکھ کھل گئی۔میرے سامنے چارپائی کے پاس کوئی کھڑا ہوا تھا۔میں ایک دم سے چونک گیا۔غور کیا تو مجھے لگا وہ کوئی عورت تھی۔میں ویسے ہی پڑا رہا تو اس نے ہولے سے کہا۔

”او جلی اٹھ، یہ دودھ پی لے۔“ ساوری نے ہولے سے کہا۔

”اس وقت دودھ؟“ میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے کوئی شوق نہیں، اماں نے کہا تو لے آئی۔“ اس نے نخرے بھرے لہجے میں کہا۔

”اچھا چل لا۔“ میں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے پیتل کا بڑا گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے گلاس پکڑا تو وہ کافی گرم تھا، اس لئے تیزی سے بولا، ”بڑا گرم دودھ ہے، چولہے سے اتار کر سیدھا لے آئی ہو۔“

”جان بوجھ کر اتنا گرم لائی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پلٹ کر تیزی سے دیکھا اور میرے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔تبھی میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ایسا کیوں کیا؟"

"میں نے تم سے باتیں کرنی ہیں۔" اس نے ہولے سے کہا۔

"کیسی باتیں؟" میں نے بھی ہولے سے پوچھا۔

"مجھے تم سے پیروزاں کے بارے میں بات کرنا تھی۔" اس نے اپنی آواز دھیمی رکھتے ہوئے تیزی سے کہا تو میں نے گرم دودھ کا سپ لے لیا۔

"کیا بات کرنا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ پیروزاں سے بچ کر رہنا۔ وہ بڑی ظالم عورت ہے۔ جب سے تم نے اسے دیکھا ہے، اس کے دماغ میں پتہ نہیں کیا سما گیا ہے۔ تم ہی اس کے دماغ پر چھا گئے ہو۔" اس نے ہولے سے کہا۔

"بڑی بات ہے، کوئی تو ہے جسے میں نے متاثر کیا، ورنہ میری طرف تو کوئی دیکھتی بھی نہیں ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور دودھ کا سپ لے لیا۔

"اس وقت بھی وہ دیوار کے پار کھڑی ہے۔ مجھے یہ دودھ دے کر اسی نے بھیجا ہے۔ تم سے یہ پوچھنے کے لئے کہ جوتے والی بات کس کس کو بتائی ہے؟" ساوری نے کہا تو مجھے عجیب سا لگا۔ کیا یہ دونوں عورتیں مجھے پاگل بنانا چاہ رہی ہیں؟ میں اس کیفیت کو چھپاتے ہوئے سکون سے پوچھا۔

"تم نے اسے بتایا نہیں، جب تم یہاں مجھ سے......"

"نہیں نہیں، میں نے یہاں کچھ بھی نہیں دیکھا، میں کسی جوتے کے بارے میں جانتی ہی نہیں ہوں۔ یہ تو مجھے ابھی پتہ چلا ہے پیروزاں سے، اس نے مجھے کہا ہے کہ میں یہاں آکر تم سے پوچھوں۔ بس میں تو اتنا جانتی ہوں، اس سے زیادہ کچھ۔" اس نے لرزتے ہوئے لہجے

میں تیز تیز کہا تو میں نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

"اصل میں تم چاہتی کیا ہو؟"

"دیکھو، دوپہر کے وقت جب میں نے وہ جوتا دیکھا تو جو میرے دماغ میں آیا میں نے کہہ دیا۔ جو میرے دل میں آیا وہ میں نے بول دیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے پیروزاں نے مجھے ساری بات بتا کر یہ پوچھنے کے لئے بھیجا ہے کہ کہیں تم نے کسی کو اس جوتے کے بارے میں تو نہیں بتا دیا؟" اس نے ہولے ہولے مجھے تفصیل بتائی تو میں نے تحمل سے کہا۔

"اب مجھے اس کا جواب کیا دینا چاہئے یہ بھی بتا دو۔"

"نہیں، کہنا تو یہی ہے کہ تم نے کسی کو نہیں بتایا، مجھے بھی نہیں۔ مگر میں بھی یہ اطمینان کر لینا چاہتی ہوں کہ کہیں تم نے......" اس نے کہتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تو میں نے سکون سے کہا۔

"نہیں، میں نے کسی کو نہیں بتایا، میرے لئے یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں تھی۔ تم نے بھی خود ہی دیکھا ورنہ میں اس بات کو اہمیت ہی نہ دیتا۔"

"لیکن اب اہمیت دو۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"مجھ سے گھما پھرا کر بات نہ کرو، صرف اتنا بتا دو کہ تم کیا چاہتی ہو؟" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا تو وہ سرگوشی میں بولی۔

"دیکھو، میں تمہیں پیروزاں سے بچانا چاہتی ہوں۔ لیکن میں پیروزاں کی بات ماننے کے لئے بھی مجبور ہوں، بس یہی کہنا ہے۔"

"اچھا، اب تم نے اس پیروزاں سے جا کر یہی کہنا ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں جوتا کون چھوڑ گیا۔ تم وہ جوتا بھی اٹھا کر لے جاؤ۔"

میں نے کہا اور گلاس منہ سے لگا لیا۔ دودھ ابھی تک گرم تھا۔

”نہیں، وہ خود آئے گی ابھی تھوڑی دیر بعد، وہ خود ہی آ کر لے جائے گی۔ مجھے صرف اتنا کہا ہے کہ تم سے گھما پھرا کر بھی پوچھ لوں کہ اس جوتے کے بارے میں کیسے پتہ ہے۔“ اس نے ہولے سے کہا۔

”ٹھیک ہے، تم اطمینان سے جاؤ اور اسے کہہ دو جو کہنا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھ گئی۔ تبھی اچانک میرے دماغ میں آیا تو میں نے ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

”میرن شاہ کی بیوی کو ان سارے معاملے کا پتہ ہے؟“

”نہیں، وہ یہاں نہیں رہتی۔“ اس نے دھیمے سے کہا۔

”نہیں رہتی مطلب......؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”وہ شہر میں رہتی ہے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑوایا، گلاس بھی نہیں لیا اور رہائش گاہ کی جانب بڑھ گئی۔ گلاس میرے ہاتھ میں تھا۔ لیکن میری سوچ بڑی عجیب ہونے لگی تھی۔ میرے ذہن میں نجانے یہ خیال کیوں آنے لگا کہ ممکن ہے سادری سے کوئی کام لیا جا رہا ہو؟ یہ کام کون لے رہا ہوگا، میں اس بارے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں جیسے جیسے سوچتا گیا میرا یہ خیال پختہ ہوتا چلا گیا۔

کچھ دیر بعد دودھ ختم ہو گیا لیکن گلاس میرے ہاتھ ہی میں تھا۔ ایسے میں رہائش گاہ کی طرف سے پائل کی چھنکار سنائی دی جو لمحہ بہ لمحہ میرے نزدیک آتی چلی گئی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ اندھیرے میں ایک ہیولہ واضح ہونے لگا۔ چھنکار زیادہ ہوتی چلی گئی۔ مجھے یہ بڑا عجیب سا لگا۔ یوں اندھیرے میں ایک اجنبی سے ملنے آنا ہو تو خاموشی اور رازداری سے آیا جاتا ہے لیکن وہ تو پائل کی چھنکار کے ساتھ آ رہی تھی۔ کیا وہ نڈر تھی یا کوئی اسے پوچھنے

والا نہیں تھا؟ میرے ذہن میں یہ خیال پہلے ہی سے تھا کہ وہ مجھے نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ کیونکہ ساوری نے اس کے بارے مجھے یہی کہا تھا کہ وہ بندے مار قسم کی عورت ہے۔ اب یہ اس نے کس تناظر میں کہا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا۔ وہ بالکل میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ ملگجی روشنی میں اس کے خدوخال تو مجھ پر واضح نہیں ہو رہے تھے لیکن اس کا بدن میرے سامنے تھا۔ وہ اونچے قد کی قدرے فربہ مائل عورت تھی۔ وہ میرے قریب آ کر رک گئی۔ اس کا مجھ سے کوئی دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ پائل کی چھنکار رک گئی تھی۔ ایک سکوت طاری ہو گیا تھا تبھی اس نے ہولے سے کہا۔

"اوئے جلی، اٹھ، اندر چل۔"

"اندر کیوں اور تم کون ہو؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"اندر چل وہاں سب بتاتی ہوں، یہاں پر ہمیں کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔" اس نے اسی طرح ہولے سے کہا تو میں سکون سے بولا۔

"ایسی کیا خاص بات ہے جو اندر ہی ہو سکتی ہے، یہاں بیٹھ کر بات کرو، جو بھی کہنا ہے یہیں بیٹھ کر کہو۔"

"اوئے تجھے کہا ہے نا، اٹھ...... چل اندر" اس نے ویسی ہی آواز میں دبے دبے غصے میں کہا اور میرا دایاں بازو یوں پکڑ لیا جیسے مجھے خود اٹھانا چاہ رہی ہو۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ کر اپنا بازو چھڑاتے ہوئے ہوئے رعب دار لہجے میں کہا۔

"نہیں، میں نہیں جاؤں گا، یہیں بیٹھ کے بات کروں گا۔"

"دیکھ تو سہی......" اس نے ہولے سے کہا،

"تو جاؤ پھر، مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔ اتنا ڈرتی ہو تو پھر یہاں تک آئی ہی کیوں

تھی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ سامنے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے سرسراتے ہوئے انداز میں بولی۔

"اوئے، مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔۔۔ مجھے خوف ہے تیرا، تم کہیں اپنی جان سے نہ جاؤ۔"

"میری جان کی فکر مت کرو، اپنی کہو جو کہنے آئی ہو۔" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

"دیکھ علی، تم مجھے اچھے لگے ہو، اور پھر تم نے مجھ پر ایک احسان بھی کر دیا ہے، اس لئے تم سے دوستی چاہتی ہوں۔ کرو گے دوستی مجھ سے؟"

"دیکھو پیروزاں، میں نے تجھے دیکھا تک نہیں، حالانکہ تم میرے سامنے بیٹھی ہو، اور نہ مجھے یہ پتہ ہے کہ میں نے تم پر کیا احسان کیا ہے۔ اس لئے تمہاری یہ دوستی والی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ پتہ نہیں تم میرے ساتھ کیا کھیل کھیلنا چاہتی ہو؟" میں نے پھر اکتائے ہوئے لہجے ہی میں اسی کے انداز میں کہا تو وہ اس کی ہنسی کی آواز مجھے سنائی دی۔ پھر لمحہ بھر بعد بولی۔

"اوئے میرا دوست تو بن، پھر دیکھ کیسا کھیل کھیلتی ہوں میں۔"

"مجھے تیرے کھیل سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

میں نے اس کی آفر کو رد کرتے ہوئے کہا تو وہ میرے سامنے تن کر بیٹھ گئی۔ اندھیرے میں اس کے خدوخال مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"چل ایسے کر، میری باتیں سن لے، پھر چاہے دوستی کرنا یا نہ کرنا، یہ تمہاری مرضی ہوگی۔" اس نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

"میں کیوں سنوں؟" میں نے دبے دبے غصے میں یوں کہا جیسے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو لیکن میرے اندر ہلچل سی ہو گئی تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ میں

نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ مجھے مزید کہے گی تو میں اس کی بات فوراً مان لوں گا۔ اگلے چند لمحوں بعد اس نے میری توقع کے مطابق کہہ دیا۔

"تم سوچ بھی نہیں سکتے تمہیں کتنا فائدہ پہنچے گا۔ اب یہ مت کہنا کہ تجھے کوئی فائدہ نہیں چاہئے۔ بہت ساری دولت تیرے قدموں میں ڈھیر ہو جائے گی۔ یہ جو چند ٹکوں کی تنخواہ کے پیچھے جنگلوں بیابانوں اور ویرانوں میں پھر رہے ہو نا، سب ختم ہو جائے گا، عیش کرو گے عیش ......" اس نے مجھے لالچ دیتے ہوئے کہا تو میں نے وہی کہا جو اس کی توقع تھی۔

"ہاں بول، بات کیا ہے؟"

"ہاں، اب ہوئی نا بات، چل اندر، وہیں بتاتی ہوں۔" اس نے فوراً وہی کہا جو اس نے آتے ہی مجھ سے منوانا چاہا تھا۔

"چل ٹھیک ہے تو چل اندر میں آتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر اٹھی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ چند لمحے بعد میں اٹھا اور بہت ہی محتاط انداز میں اندر چلا گیا۔ اندر ٹارچ کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میری پہلی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔ اس کا رنگ تو گورا تھا لیکن اس کے نقش نین بہت موٹے تھے۔ اگر اس کا رنگ سیاہ ہوتا تو شاید وہ پہلی نگاہ میں نیگرو ہی دکھائی دیتی۔ میں اسی وقت سمجھ گیا کہ اس کی شادی کیوں نہیں ہو رہی تھی۔ 'مرد مار عورت' کی پہلی نشانی مجھے مل گئی تھی۔ اس کے سیاہ گھنیرے بال آنچل سے جھانک رہے تھے۔ موٹے موٹے سرخ ہونٹ بالکل بھی اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ اس کی گردن سے باقی بدن بڑے سارے آنچل میں چھپا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا تو میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ تم نے مجھ پر جو احسان کیا، اس بارے سن۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو

خاموش رہی پھر کہتی چلی گئی، ”اس رات وہ تینوں راجستانی مجھے مارنے کے لئے آئے تھے۔ ان کی دشمنی میرن شاہ سے نہیں مجھ سے ہے۔ وہ مجھے مارنا چاہتے ہیں، کیونکہ میں نے ان کے دو بندے مارے ہیں۔“

اس نے یہ بات یوں کہی جیسے بندے قتل کرنے کی نہیں کوئی جانور مارنے کی بات کی ہو۔ میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ جو قتل ہونے کی بات چل رہی ہے یہ تم نے کئے......؟“

”ہاں میں نے کئے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی ہوں کہ کوئی مجھے دھوکا دے۔ مجھے دھوکا بھی دے اور زندہ بچ کر چلا جائے، ایسا ہو نہیں سکتا۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ میں نے پوچھا

”وہی جو تم نے انجانے میں کر دیا۔ جب تک یہاں پر ہو، میرے لئے کام کرو۔ باقی سب تمہیں آہستہ آہستہ سمجھ میں آ جائے گا۔“ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”اس کے عوض مجھے کیا ملے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت کچھ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ۔“ اس نے لاپرواہانہ انداز میں کہا۔

”پھر بھی مجھے کرنا کیا ہوگا؟“ میں نے اصرار بھرے لہجے میں پوچھا۔

”جو کہوں، وہ کر دینا۔ یہ بات صرف تمہارے اور میرے درمیان میں ہوگی، کسی کو خبر بھی نہ ہو۔ اپنے کام کرتے رہو۔ جیسا کام کرو گے، ویسا پیسہ دیتی رہوں گی۔“

اس نے خالص کاروباری لہجے میں کہا تو مجھے ذاتی طور پر بہت برا لگا۔ کوئی دوسرا موقعہ ہوتا تو میں اسے اٹھا کر چلتا کر دیتا لیکن میں اس وقت انہی کے گھر، ان کی زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔

نجانے کس وقت وہ کیا کر دے، یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اتنی تھوڑی سی دیر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیسی عورت ہے۔ وہ کوئی اپنا ہی کھیل کھیل رہی تھی اور مجھے اب اس کے کھیل ہی میں اپنا کھیل کھیلنا تھا۔ اس لئے میں نے سکون سے پوچھا۔

"ساوری تو جانتی ہے ہمارے بارے میں؟"

"اس کی اوقات کہ وہ اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نکالے۔ اسے چھوڑو، وہ سمجھو گونگی بہری اور اندھی ہے۔ وہ تیرے اور میرے درمیان رابطہ رکھے گی۔"

اگرچہ اس کی بات سن کر مجھے انتہائی دکھ ہوا تھا کہ وہ یہاں کے لوگوں کو انسان نہیں جانور خیال کرتے ہیں۔ یہ لفظ چیخ چیخ کر گواہی دے رہے تھے کہ اس کی ذہنیت کیا ہے؟ تاہم مجھے خوشی اس بات کی بھی ہو رہی تھی کہ اب ساوری سے بات کرنا اتنا مشکل نہیں رہے گا۔

"ٹھیک ہے جیسے تم کہو۔ صرف ایک بات کا خیال رکھنا۔" میں نے کہا۔

"کون سی بات؟" اس نے ہنکارہ بھرنے والے انداز میں پوچھا۔

"اگر تم دھوکا برداشت نہیں کر سکتی تو میں بھی دھوکا دینے والے کو چھوڑتا نہیں، زمین میں دفن بھی ہو جائے تو اس کی ہڈیاں نکال لوں گا۔" میں نے انتہائی سرد لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ شاید میرے لہجے میں اتنی وحشت تھی کہ پیروزاں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ چند لمحے میرے چہرے پر دیکھتی رہی پھر پھیکی سی مسکان کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھا کر بولی۔

"تو میں سمجھوں کہ تم میرے ساتھ ہو؟"

"ہاں، یہی سمجھو" میں نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے کی بجائے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے اپنے نرم ہاتھ سے میرا ہاتھ گرم جوشی سے دباتے ہوئے خمار آلود لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ چلتی ہوں اب۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

اس نے ٹارچ بند کر دی پھر اٹھ کر میرے برابر کھڑی ہو گئی۔ اس کی سانسیں میری گردن کو چھونے لگی تھیں۔ اس قدر تنہائی میں اتنی قربت میں خود پر قابو رکھنا بہت مشکل تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک دم سے مجھے تسخیر کر لینا چاہتی تھی لیکن میں اسے ترسانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے چھوتی میں باہر کی جانب لپک گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی باہر آ گئی۔ وہ پائل چھنکاتی چل دی۔ شاید وہ پائل پہن کر مجھے کچھ سمجھانا چاہتی تھی، وہ جو بھی چاہتی تھی لیکن میں بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ اس بار اس کی پائل کی چھنکار میں شکست بول رہی تھی۔

☆......☆......☆

میں ناشتے سے فارغ ہو کر تیار ہوا ہی تھا کہ زمان موہل آ گیا۔ اس نے ڈیرے کے باہر ہی سے ہارن دیا تھا۔ میں نے بیگ اٹھایا اور اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس نے جیپ بڑھا دی۔ تھوڑا سا سفر کیا تو وہ یونہی باتیں کرنے کے لئے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یار، تم یہاں سروے کرو گے، اس کی رپورٹ بناؤ گے، پھر اس پر نجانے کب عمل درآمد ہوگا، یہاں پر تبدیلی میں بہت عرصہ لگے گا۔"

"یار بات پتہ کیا ہے، جب تک یہ حاکمانہ ذہن والے لوگ موجود ہیں نا، اور پھر اس سے بھی بڑھ کر محکوم رہنے والے لوگ خود کو بدلنا نہیں چاہیں گے، تب تک کسی بھی تبدیلی کا سوچنا وقت کا ضیاع ہے۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا تو وہ مایوسانہ لہجے میں بولا۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ کسی ایک کو تو بدلنا ہوگا۔ ورنہ یہ ماحول تو ویسے ہی رہے گا۔ حکومتیں کیا کر لیں گی۔"

"اصل بات ہے...... فائدہ۔ کوئی گینگ ہو، مافیا ہو یا لوگوں کا گروہ، یا کوئی تنظیم وہ کسی نہ

کسی فائدے کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ بحث یہ نہیں کہ وہ فائدہ کیا ہے۔ جیسے تم لوگ میرن شاہ کے گرد اس لیے جمع ہو کہ تمہیں فائدہ ہے۔ اگر تمہیں فائدہ دکھائی نہ دے تو تم کبھی یہاں کا رخ نہ کرو۔ جب تک کسی کو ان علاقوں میں فائدہ دکھائی نہیں دے گا، تب تک کچھ بھی نہیں ہونے والا۔" میں نے بھی مایوسانہ لہجے میں کہا تو ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا سوچ رہا ہوگا لیکن میرے ذہن میں پیرو زاں کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ کیا کرنا چاہتی تھی، اس کا فائدہ کس میں تھا؟ میں اس بارے کچھ بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔

ہم ایک ایسی جگہ جا پہنچے جہاں سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک بستی تھی۔ زمان موہل نے گاڑی ایک طرف لگائی اور چادر لے کر میرے ساتھ آ گیا۔ میں نے ایک اونچے ٹیلے پر جا کر اپنا بیگ کھولا اور علاقہ دیکھنے لگا۔ وہ چادر بچھا کر ایک طرف جھاڑی کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی مصروفیت شاید سیل فون میں تلاش کر لی تھی۔ وہ سیل فون پر نگاہیں گاڑھ کر بیٹھ گیا۔ میں دور تک دیکھنے لگا، وہی لق و دق صحرا، روہی کے مخصوص پودے اور جھاڑیاں، اس کے علاوہ وہی ویرانی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ وقت گزار کر بستی میں جاؤں گا، وہاں لوگوں سے گپ شپ کروں گا۔ ان کے مسائل پر بات ہوگی۔ میں نے ابھی اپنا بیگ کھول کر اس میں سے نقشہ نہیں نکالا تھا۔ میں وہیں کھڑا ابھی سوچ رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک جیپ پر پڑی۔ وہ اسی راستے سے آ رہی تھی جدھر سے ہم آئے تھے۔ زمان موہل نے اس گاڑی کو نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ جیپ اس کی پشت پر سے آ رہی تھی۔ وہ جھاڑی کے سائے میں بیٹھا ہوا سیل فون کی طرف متوجہ تھا۔ مجھے دلچسپی ہونے لگی کہ وہ گاڑی کہاں سے آئی ہے اور کدھر جانا چاہتی ہے۔ کیا بستی میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ایسی گاڑی رکھتے ہیں؟

میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہ ہمارے والی گاڑی سے تھوڑا فاصلے پر رک گئی۔ جس کی

آواز سن زمان موئل بھی اسی جانب دیکھنے لگا۔ جیسے ہی نو وارد گاڑی سے لوگ نکلنے لگے، زمان موئل ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا یہ اٹھنا بالکل لاشعوری تھا۔ ایک دم سے میں نے خطرہ محسوس کیا۔ یہ تو طے تھا کہ نو وارد لوگ دوست نہیں ہو سکتے تھے ورنہ زمان موئل یوں بدک کر کھڑا نہ ہوتا۔ نو وارد تعداد میں تین بندے تھے۔ شلوار قمیص پہنے وہ اپنے حلیے سے مقامی معلوم ہو رہے تھے۔ وہ دوڑنے والے انداز میں ہماری جانب آ رہے تھے اور آتے ہی پھیل کر کھڑے ہو گئے۔

"زمان بات کیا ہے؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"یہ لوگ......" وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ جیسے اس کے منہ سے مزید کوئی لفظ نہ نکل رہا ہو۔ لمحہ بھر بعد وہ میری طرف دیکھ کر دہشت زدہ لہجے میں بولا، "یہ لوگ...... ہمارے...... دشمن ہیں"

"اوہ......!" میرے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔ وہ لوگ ہم سے تھوڑے فاصلے پر آ کر رک کر ہمیں گھور رہے تھے۔ ان میں سے ایک فربہ مائل شخص نے ہماری جانب دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا۔

"او زمان...... کب تک ہم سے بچو گے، فکر نہ کرو ہم تمہیں ماریں گے نہیں، بس یونہی تمہاری ٹانگیں توڑیں گے۔ یا ایک آدھ ہاتھ بھی...... بس اس سے زیادہ نہیں، چپ چاپ ہمارے ساتھ چلو۔"

"بڑے دنوں بعد ہاتھ لگے ہو تم۔" ساتھ کھڑے ایک گٹھے جسم والے نے غراتے ہوئے کہا تو زمان موئل خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"جب میرن شاہ نے طے کر دیا تھا کہ......"

"بھونکو نہیں، کچھ طے نہیں ہوا تھا، ہم نے بدلہ لینا ہے بس......" فربہ مائل نے دھاڑتے

ہوئے کہا تو میں سمجھ گیا کہ دشمنی جیسی بھی ہوگی، اس وقت جو بندے اس کے پیچھے یہاں تک آئے ہیں، وہ اب اسے چھوڑیں گے نہیں۔ تبھی میں بڑے تحمل سے بولا۔

”تم جو کوئی بھی ہو، تمہاری دشمنی کیا ہے، میں اس......“

”اوئے زبان بند رکھ...... بات کرے گا نا تو ہم تیرے بھی ہاتھ پیر توڑ دیں گے...... درمیان میں مت آنا۔“ فربہ مائل نے حقارت سے کہتے ہوئے مجھے ایک طرف ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔

”اوئے سیانے، پہلے بات پوری سنتے ہیں، پھر بات کرتے ہیں، یہ تجھے کسی نے سمجھایا نہیں۔“ میں نے اس سے بھی زیادہ حقارت بھرے لہجے میں کہا تو ان سب کے چہروں پر ایک بار حیرت ابھری، وہ خاموش رہے تو میں نے کہا، ”میں کہہ رہا تھا، تمہاری جو بھی دشمنی ہو، سو ہو، لیکن اس وقت یہ میرے ساتھ ہے۔ تم لوگ اگر مرد ہو، تو اسے ہاتھ لگا کر دیکھو۔“

میری توقع کے مطابق گھٹے بدن والے نے بھنا کر پسٹل نکالتے ہوئے دھاڑتے ہوئے کہا۔

”چل پھر پہلے تیرا بندوبست کرتا ہوں۔“

”ایسے کھلونوں سے تو کوئی بچہ بھی کھیل سکتا ہے۔“ میں نے اک پرانا حربہ آزماتے ہوئے کہا، ”مرد ہو تو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اپنی مردانگی ثابت کرو، ورنہ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ میں نے ان کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے رعب دار لہجے میں کہا۔

میں اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ میں نے ایک رسک لیا تھا۔ اسی لمحے پتہ چل جانا تھا کہ میرے سامنے کھڑا شخص کیسی فطرت رکھتا ہے۔ وہ میرے حربے میں نہیں آیا تھا، اس نے گولی چلانے کو ترجیح دی۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، میں اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا اور جب تک فائر ہوا، میں وہاں پر نہیں تھا۔ گولی کہیں ریت میں جا پڑی تھی۔ یہی لمحہ میرے لئے سب سے قیمتی تھا

اور میں اس کا بھرپور استعمال کر چکا تھا۔ میں اس پسٹل پکڑے ہوئے فربہ مائل کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا ہاتھ سیدھا کر کے مجھے نشانہ بناتا، میں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور اپنا سر اس کے سر پر دے مارا۔ وہ ایک بار لڑکھڑا گیا۔ اسی دوران اس کے ہاتھ سے پسٹل دور جا گرا۔ میں پسٹل کی جانب نہیں لپکا بلکہ اس کی پشت پر جا پہنچا۔ اس کی گردن میری کلائی کے گھیرے میں تھی۔

"چاہوں تو ابھی تیری گردن توڑ دوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اسے ایک جھٹکا دیا تو اس کے منہ سے اُوغ کی آواز ابھری۔

"چھوڑ دو اسے۔" گھٹے ہوئے بدن والے نے چلاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں یہ نہیں کہوں گا کہ اسے جانے دو، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ میں بہت برا حال کروں گا۔" میں نے غراتے ہوئے کہا تو وہ لپک کر آگے بڑھا اور اس نے زمان موہل کا بازو پکڑ لیا۔ زمان نے ذرا سی بھی مزاحمت نہیں کی تھی۔ یہی میرے لئے سب سے بڑی الجھن تھی، جو مجھے بھی کمزور کر رہا تھا۔ گھٹے ہوئے بدن والے نے میری طرف طنزیہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب بول کیا کرے گا؟"

یہ کہتے ہوئے اس کا دھیان میری طرف تھا، بالکل اسی لمحے زمان موہل نے اپنا بازو چھڑا لیا اور اس کے منہ پر گھونسہ مار دیا۔ میرے اندر ایک دم توانائی کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے اب زمان موہل کی فکر نہیں رہی تھی۔ میں نے فربہ مائل شخص کی گردن کو ایک جھٹکا دیا اور اور ریت پر پھینک دیا۔ باقی دونوں مری جانب نہیں بڑھے، بلکہ وہ زمان پر پل پڑے تھے۔ میں نے لپک کر ایک کو پکڑا اور اس کی پسلی میں گھونسہ مارا، وہ تڑپ کر رہ گیا۔ میں نے دوسرے کو بالوں سے پکڑ کر

اسے ہٹایا تو اس نے گھوم کر میرے گھونسہ مارا جو میرے سینے پر لگا۔ میں لڑکھڑایا تو اس نے میرا بازو پکڑ کر جھٹکا دیا تا کہ ریت پر گر جاؤں۔ تبھی میں نے اسی کا سہارا لیا اور گھوم کر اپنا پاؤں اس کے منہ پر مارا۔ وہ پیچھے کی جانب گرنے لگا تو میں اس پر چڑھ گیا۔ اس کی کنپٹی پر ایک گھونسہ مارا تو وہ بے دم سا ہو گیا۔ میں نے اسے چھوڑ کر زمان سومل کو دیکھا۔ وہ دونوں اس کو پکڑے ہوئے تھے۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور اسے پکڑنے والوں میں سے ایک کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور اسے کھینچ لیا۔ میں نے اس کی پیچھے سے اس کے گھٹنے پر پیر مارا تو وہ گر گیا۔ میں نے وہی پاؤں اس کے سینے پر مارا تو ایک چیخ اس کے منہ سے بلند ہوئی۔ تب تک میں اچھل کر اس کے سینے پر دونوں پاؤں مار چکا تھا۔

وہ سخت جان تھے، جذباتی بھی تھے اور طاقتور بھی لیکن انہیں لڑنے کے فن سے بالکل بھی آشنائی نہیں تھی۔ میں اگر ایک کو پکڑتا تو دو زمان سومل کو پکڑ لیتے۔ میں نے دیکھا وہ اس کی درگت بنا چکے تھے۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ کئی جگہ سے چہرہ سوج چکا تھا۔ وہ چکرایا اور ریت پر گر گیا۔ وہ اب تینوں مجھے پکڑ سکتے تھے۔ ممکن ہے وہ یہی سوچ رہے ہوں کہ مجھے بے بس کر کے پھینک دیں گے اور پھر زمان کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ زمان کا ریت پر گر کر بے حس و حرکت ہو جانا کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے فیصلہ کر لیا۔

میں نے دیکھا کچھ فاصلے پر پسٹل پڑا ہوا تھا۔ میں انتہائی تیزی سے پسٹل کی جانب لپکا۔ میں نے وہ پسٹل اٹھائی اور ہوائی فائر کر دیا۔ صحرا میں فائر کی آواز گونج کر رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کہا۔

”رک جاؤ......“ وہ ایک دم سے ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ تینوں ہی غور سے میری جانب

دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان تینوں کا نشانہ لیتے ہوئے بولا، "میری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں، میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا۔ لیکن اب......"

"مرد ہو، ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بات کرو۔" گھٹے ہوئے بدن والے نے طنزیہ لہجے میں میرے ہی لفظ مجھ پر الٹ دیئے۔

"اس نے تو فائر کر دیا تھا لیکن میں نہیں کروں گا، آؤ، ہاتھ میں ہاتھ ڈال لیتے ہیں۔" میں نے کہا اور پسٹل نیفے میں اڑس کر ان کا سامنے کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا اور وہ میرے جانب دیکھتے ہوئے ایک ساتھ آگے بڑھے۔ میں ان کے پینترے کا اندازہ کر چکا تھا، اس لئے اپنے قدموں پر اٹھا اور انہیں ذرا سی جھکائی دے کر دائیں جانب بڑھنے والے لمبے قد کے جوان کا بازو پکڑا، اس کی بغل کو اپنے کاندھے پر لیا اور ایک جھٹکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی چیخ بلند ہو گئی۔ اس کا بازو نکل چکا تھا یا پھر جھٹکے سے اٹھنے والا درد برداشت سے باہر تھا۔ میں نے اسے ایک جانب پھینکا اور گھٹے ہوئے بدن والے کو پیچھے سے پکڑ لیا۔ مجھے اندازہ تھا فربہ مائل بھی مجھے پکڑے گا۔ میں اس کی تاک میں تھا۔ جونہی وہ گھوم کر میری جانب بڑھا، میں نے گھٹے ہوئے بدن والے کا سہارا لیا اور اپنا پاؤں گھما کر اس کے سینے پر مارا۔ وہ اپنی جھونک میں پوری قوت سے بڑھا تھا اسی طرح گھوم کر ریت پر جا پڑا۔ میرے لئے اب گھٹے ہوئے بدن والا اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا، میں نے اس کی ریڑھ کی ہڈی پر کہنی ماری تو وہ گھٹنوں کے بل ریت پر جا پڑا۔

وہ تینوں گر چکے تھے۔ میں نے پسٹل نکالتے ہوئے کہا۔

"میں نے پہلے بھی کہا تھا...... لیکن اب جسے زندگی چاہئے وہ بھاگ جائے اور جس نے موت کو گلے لگانا ہے، وہ آ جائے میرے سامنے...... تین تک گنوں گا...... ایک......"

"ایک......"

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے تھے۔ پھر اچانک جیسے ان میں زندگی کی رمق آ گئی تھی۔

"دو......" میں نے غراتے ہوئے کہا۔

وہ اُٹھے اور ایک جانب بھاگنے لگے۔ میں نے اونچی آواز میں کہا۔

"تین......"

یہ کہتے ہوئے میں نے ان کی جانب فائر کر دیا۔ وہ فائر کسی کے بھی نہیں لگنا تھا۔ وہ اپنی گاڑی تک پہنچ گئے تھے۔ میں نے اگلا فائر نہیں کیا۔ وہ بھاگ چکے تھے۔ میں نے پسٹل میں گولیاں دیکھیں، ان میں صرف دو پڑی ہوئیں تھیں۔ میں نے اسے بند کیا اور نیفے میں اڑس لیا۔ پھر زمان کی جانب متوجہ ہوا تو وہ تڑپ رہا تھا۔ میں تیزی سے اس کے پاس گیا۔ وہ حواس کھو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں مجھ پر مرکوز کر دیں۔ جو ساکت سی ہو رہی تھیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، میں نے اس کا سر اونچا کرتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

"کیا ہوا تمہیں......؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ ہولے سے سر ہلا دیا۔ مجھے اپنے تئیں یہی سمجھ میں آیا کہ وہ نہیں بچے گا۔ اس لئے میں تیزی سے فیصلہ کیا اور پوری قوت سے اسے اٹھایا۔ وہ کافی وزنی تھا لیکن میں اسے لیتا ہوا گاڑی تک جا پہنچا۔ اسے بہ مشکل پسنجر سیٹ پر لٹایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا کر گاڑی بھگا دی۔

میں کافی حد تک راستہ سمجھ رہا تھا۔ لیکن مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب جانا کہاں ہے؟ ظاہر ہے مجھے ڈیرے ہی کی جانب جانا تھا لیکن وہاں کوئی ایسی سہولت نہیں تھی۔ اسے کسی ڈاکٹر

کی ضرورت تھی، ہسپتال کا راستہ مجھے نہیں آتا تھا۔ ڈیرے سے کوئی آدمی لیتا تو ہسپتال تک جا سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اچانک مجھے سیل فون کا خیال آیا۔ وہ زمان موہل کے پاس تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا، وہ تکلیف کی شدت سے گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

”زمان، کیا تم ہوش میں ہو؟“ میں نے ہولے سے پوچھا۔ اس نے میری بات سنی اور ہلکے سے سر ہلا دیا تبھی میں نے سراسیمگی میں کہا، ”مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تجھے کہاں لے کر جاؤں؟“

میرے یوں کہنے پر اس نے آگے ہی آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

”مجھے اپنا سیل فون دو، میں بات کروں کسی سے، نمبر......“ میں نے رفتار تیز کرتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی جیب میں سے فون نکالا اور نمبر نکال کر کال ملا دی۔ پھر میری جانب بڑھانے کا اشارہ کیا تو میں نے فون پکڑ لیا۔ دوسری جانب کسی نے فون پک کر لیا۔

”میں زمان موہل کے فون سے بات کر رہا ہوں، وہ شدید زخمی ہے، مجھے اسے ہسپتال لے کر جانا ہے۔ مجھے بتاؤ میں......“ میں نے تیزی سے کہا اور تفصیل بتاتے ہوئے گاڑی بھگاتا رہا۔

☆......☆......☆

وہ ایک چھوٹا سا دیہاتی ہسپتال تھا۔ سرکاری عمارت بھی بنی ہوئی تھی۔ لوگ باہر لان میں بھی چارپائیاں ڈال کر مریضوں کو لٹائے ہوئے تھے۔ میں نے جیسے ہی گاڑی روکی، وہاں موجود بندے متوجہ ہو گئے۔ ان میں سے کئی لوگوں سے میری چہرہ شناسی تھی۔ وہ بستی چراغ شاہ ہی کے لوگ تھے جو دوڑ کر آگے آ گئے۔ انہوں نے زمان موہل کو نکالا اور ہسپتال کی عمارت

میں لے گئے۔ وہاں موجود ڈاکٹر اسے دیکھنے لگا۔ تقریباً دس منٹ دیکھتے رہنے کے بعد اس نے دوائیں تجویز کر دیں۔ تب میں نے پوچھا

"ڈاکٹر صاحب، خطرے کی کوئی بات......؟"

"کوئی ہڈی تو بظاہر نہیں ٹوٹی لیکن زخم آئے ہیں، سر پر زیادہ چوٹیں ہیں۔ کچھ دیر بعد پھر دیکھتے ہیں۔" ڈاکٹر نے بتایا تو مجھے کافی حد تک سکون ہوا۔

وہاں موجود لوگ زمان مونل کو ایک الگ کمرے میں لے گئے۔ بستر پر لٹاتے ہی ڈرپ لگا دی گئیں۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ بستی چراغ شاہ سے آئے لوگ بھی ارد گرد بیٹھ گئے۔ انہیں پہلے ہی ہسپتال بھیج دیا گیا تھا۔ ہمیں وہاں بیٹھے دوپہر سے شام ہو گئی لیکن میرن شاہ وہاں نہیں آیا۔ زمان مونل کی حالت بہت حد تک سنبھل گئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ ماحول کو سمجھ چکا تھا، اس لئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"یار میں تو ادھر پتہ نہیں کب تک پڑا رہوں، تم جاؤ ڈیرے پہ۔"

"نہیں، تمہیں ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔ میرے خیال میں اب تم ٹھیک ہو۔ ڈاکٹر نے تمہیں ویسے ہی رکھا ہوا تا کہ پوری تسلی ہو جائے۔" میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"میں بھی جانتا ہوں۔" اس نے کہا

"کون لوگ تھے جنہوں نے تم پر حملہ کیا تھا؟" میں نے پوچھا تو اس کا چہرہ ایک بار دھواں دھواں سا ہو گیا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے، بعد میں سناؤں گا۔" اس نے ہولے سے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ کوئی انتہائی تکلیف دہ تجربہ رہا ہوگا۔ میں نے مزید نہ پوچھا تو وہ سامنے کمرے میں دیکھتے ہوئے اشارہ کرتے ہوئے بولا

"وہ سامنے کمرے میں دیکھا، کون ہے؟"

"نہیں، کون ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا تو وہ میرے قریب ہو کر دھیمے سے لہجے میں بولا۔

"وہی راجستانی، جسے تم نے گولی ماری تھی۔ اس رات جو میرن شاہ کے گھر پر حملہ کرنے آئے تھے۔"

ایک دم سے میرے اندر سنسنی پھیل گئی۔ وہ میرے قریب آدھا دن رہا اور مجھے پتہ نہیں تھا۔ تبھی میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ ابھی تک یہیں پڑا ہے؟"

"اور کہاں جائے، اس کے لوگ اسے لے کر نہیں جاتے اور میرن شاہ اس پر کوئی سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے، بس اسی لئے پڑا ہے۔" اس نے دھیمے سے بتایا تو مجھے نجانے کیوں اس بے چارے سے ہمدردی ہونے لگی۔ کتنے ظالم ہیں لوگ، جب تک وہ کام کا تھا، سو اس سے کام لیا جاتا رہا اب اسے یونہی لاوارث چھوڑ دیا، اور اب اس پر سودے بازی، کیا ہے یار یہ زندگی بھی۔ میں یونہی اوٹ پٹانگ سوچنے لگا تھا۔ میں اس کمرے میں دیکھ رہا تھا۔ اچانک میں اٹھا اور اس کمرے میں چلا گیا۔

وہاں بستی چراغ شاہ ہی کے دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ میرن شاہ کے بندے تھے۔ وہ اس کی دیکھ بھال کے لئے نہیں بلکہ اس کا پہرہ دے رہے تھے۔ ان سب نے میری طرف دیکھا۔ وہ راجستانی بھی آنکھیں کھولے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیت تھی۔ جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اسے میری پہچان نہیں تھی۔ میں قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ میرے چہرے پر دیکھنے لگا۔

میں نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا پھر اس سے پوچھا۔

"مجھے پہچانتے ہو؟"

"کون اوتم؟" اس نے ماتھے پر تیوریاں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"وہی جس کی گولی سے تم زخمی ہو کر یہاں پڑے ہو۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ہو تو ہمارے دشمن...... پر ہو جی دار...... اک اکیلا بندہ اور تین بندوں کو گرا دیا۔"

میں نے اس کے پاس بیٹھے لوگوں سے کہا۔

"جاؤ یار، زمان اور مل کے پاس بیٹھو، اس کا دھیان کرو۔ میں یہاں بیٹھا ہوں کچھ دیر۔ ڈاکٹر آئے تو مجھے بتانا۔"

وہ اٹھ کر چلے گئے تو میں نے اس راجھستانی سے پوچھا۔

"سنا ہے تیرے لوگ تجھے لینے ہی نہیں آئے؟"

"آویں گے بھی نا، میں نے تو اب ادھر ہی مرنا ہے جی۔" اس نے کہا تو میں مسکرا دیا۔ پھر اس کے پاس بیٹھ کر بولا۔

"مرنا تو ہے سب کو...... تم نے کون سا انوکھا کام کرنا ہے۔ پر ایسے تو نہیں کرنا چاہیے نا۔ تم ان کے ساتھی تھے۔ ان......"

"چھوڑو بھائیا...... میں اب کے کام کا نہیں رہا۔ زخم لگ گیا، گھر بیٹھوں گا، کوئی کام تو کر نہ سکوں گا اب۔ انہیں کیا۔" اس نے مایوسی سے کہا۔

"میرن شاہ بھی تمہیں جانے دیتا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، اس نے میں نہیں روکا۔ کھوت ہے جب چاہوں چلا جاؤں، اب ٹھیک تو ہو

لوں۔" اس نے کہا اور ایک ٹھنڈی آہ بھر لی۔

"یار بات یہ ہے، مجھے بھی تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں تھی، یہ تو اچانک تم لوگوں نے حملہ کیا تو میں......"

"تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایسیوں ای کرتا۔بس ہو گیا اب، میں جانوں، مٹے پتہ چل گیا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"پر مجھے ہی کیا میرن شاہ کو بھی نہیں پتہ کہ تمہاری اور اس کی دشمنی کیا ہے۔وہ بھی حیران ہے کہ بندے اس نے نہیں مارے۔" میں نے کہا تو اس نے میری بات سن کر تحمل سے کہا۔

"تئے پھر اصل بات کو جوں کوئی نہی۔او بھائی، میرن شاہ نے نہیں، اس کی بہان نے مارے ہیں بندے۔"

یہ میرے لئے اب حیرت کی بات نہیں تھی۔میں بہت حد تک سمجھ گیا تھا کہ پروژان کیا "شے" ہے۔اب تو صرف یہ اندازہ کرنا تھا کہ وہ کس حد تک شے ہے۔لیکن میں خود سے کوئی بھی اظہار نہیں کرنا چاہتا۔مجھے صرف دیکھنا تھا کہ حالات کیا رنگ دکھاتے ہیں۔

"واقعی، اس نے کیوں مارے......؟" میں نے انتہائی حیرت سے یوں ظاہر کیا جیسے یہ میرے لئے بہت حیرتناک خبر ہو۔میری اس رنگ بازی کا اس راجستانی پر اثر ہوا، اس نے بھی حیرت سے میری جانب دیکھتے ہوئے ہولے سے بولا۔

"تئے جوں کوئی نہی......؟"

"یار، تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں میرن شاہ کا ساتھی ہوں۔" میں نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ اسی حیرت سے بولا۔

"تو پھر کون اے تُو......؟"

"یار میں گورنمنٹ ملازم ہوں، یہاں سروے کے لئے چند دن پہلے آیا ہوں۔ میرے تو گاڑی بھی تم لوگوں نے تباہ کر دی۔ میں تو کہیں کا نہیں رہا۔"

میں نے اپنی کتھا دردناک انداز میں سنائی تو اس نے یوں سر ہلایا جیسے میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔ وہ اپنے تئیں سوچتا رہا پھر بولا۔

"تبھی کہوں، ہمیں پتہ کیوں نہیں چلا۔ ہمارے حساب سے تو ڈیرے پر کوئی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ پر تُو تھا۔ یہیں سے مار کھا گئے۔"

"اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ میں نے تو خود کو بچایا، لیکن میری گاڑی تباہ ہو گئی، اس کا بھی مجھے کو حساب دینا ہے۔ خیر بھائی، میری طرف سے اپنا دل صاف کر لے۔ سب کچھ غلط فہمی اور انجانے میں ہوا۔" میں نے بے چارگی سے کہا تو اس نے میری طرف دیکھا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہاں ہے تو ایسا ہی، خیر..... اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"مجھے بتا میں تیرے لئے کیا کر سکتا ہوں، اسے چاہے جرمانہ سمجھو، ہمدردی سمجھو، یا جو بھی، میں جو انجانے میں......" میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں، مجھے کوئی گلہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے میں پھر چلتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ میں نے جو اس راجستھانی کے دماغ میں ڈالنا چاہا تھا، پتہ نہیں وہ اس کے دماغ میں گھسا بھی تھا یا اس کا الٹ اثر ہوا تھا۔ میں اگر اسے غلط بیانی کر سکتا تھا تو وہ بھی ایسا کر سکتا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میں زمان مونگل کے پاس آیا تو ڈاکٹر اس کے پاس کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

”اب آپ اسے گھر لے جا سکتے ہیں۔بس یہ دوائیں دیں اور اسے آرام کرنے دیں۔“
گویا اس نے ڈسچارج کر دیا تھا۔میں نے زمان سوہل کو لیا اور اس کے گھر تک چھوڑ دیا۔ ہمارے ساتھ بستی کے دو لوگ بھی آئے تھے۔رات گہری ہو رہی تھی جب میں اکیلا ڈیرے پر واپس آیا۔میں بہت تھک چکا تھا۔اس لئے چارپائی پر لیٹا تو مجھے اردگرد کی خبر ہی نہیں رہی۔
میری آنکھ کھلی تو ابھی اندھیرا تھا۔میں اپنی آنکھ کھلنے کی وجہ جاننے کی کوشش میں تھا۔تب مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھ بھوک کی وجہ سے کھلی ہے۔بھوک کے باعث پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔مجھے اب صبح ہو جانے تک صبر ہی کرنا تھا۔میں ڈیرے کے صحن میں اکیلا ہی پڑا ہوا تھا۔میرے اردگرد خالی چارپائیاں دھری ہوئی تھیں۔میں نے سوچا،اٹھ کر پانی پی لوں، شاید اس سے بھوک کا مداوا ہو جائے۔
میں چارپائی سے اٹھا اور کمرے تک گیا۔باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔میں نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ پھلوں کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔میں ٹھٹک گیا۔میں نے ٹارچ روشن کی تو سامنے چارپائی پر ایک ٹرے میں پھل رکھے ہوئے تھے۔
ٹرے میں دھرے ہوئے پھلوں کو دیکھ کر یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ کوئی تو ہے جسے میری بھوک کا خیال تھا۔میں رات دیر سے آیا، بنا کچھ کھائے پیے سو گیا۔اب میرا مہربان یا تو ساوری ہو سکتی تھی یا پھر پیر روڑاں،ان کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔ان پھلوں کو دیکھ کر یہ بھی یقین تھا کہ وہ میری آمد کے بارے میں جانتی تھیں،وہ یہاں آئی بھی اور یہ ٹرے رکھ کر چلی گئی اور میں غافل پڑا تھا۔اس دوران اگر کچھ ہو جاتا؟ ایک گولی میری زندگی چاٹ سکتی تھی؟ کیا مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہاں میرا اب کوئی دشمن نہیں؟ میں خود پر لعنت ملامت کرنے لگا۔مجھے سمجھ آنے لگا کہ اگر مجھے کچھ ہوا تو میری غفلت کی وجہ سے ہوگا ورنہ دشمن کا مقابلہ کرنے کی سکت تو

مجھ میں تھی۔ یہی سوچ کر مجھے لگا جیسے میری بھوک ہی اڑ گئی ہو۔ میں نے ٹرے کی جانب دیکھا بھی نہیں اور پلٹ کر باہر جانے لگا تو دروازے میں ایک ہیولا نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اندر آ گئی۔ میرے سامنے ساوری کھڑی تھی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا، جسے قابو میں رکھنے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چند لمحوں بعد اس نے ٹارچ بند کر دینے کا اشارہ کیا۔ میں نے ٹارچ بند کر دی۔ تبھی وہ تھرتھراتے ہوئے لہجے میں آہستہ سے بولی۔

"ساری رات...... تیری...... رکھوالی...... کرتی...... رہی ہوں۔"

"خیر تھی، کیا ہوا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نہیں چاہتی...... کہ وہ ڈائن...... تیرے پاس آئے۔" اس نے پھولی ہوئی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اچھا سکون کر اور پھر مجھے بتا۔" میں نے آہستہ سے کہا تو وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ چند منٹ بعد اس نے کہا۔

"جب تم آئے تو وہ تیرے پاس آنا چاہ رہی تھی۔ مگر میں نے بہانے سے روک دیا۔ کہاں کھانا دے آؤں پھر چلی جانا۔ مگر تم سو رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر انتظار کرتی رہی پھر سو گئی اور میں جاگتی رہی۔ اب تمہیں دیکھا تو آ گئی۔" اس نے تیزی سے اپنی بات ختم کی۔

"وہ کیوں ملنا چاہتی تھی اور......"

"ڈائن کیوں ملنا چاہتی ہوتی ہے۔" اس نے نفرت سے کہا پھر اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر جب باہر نکالا تو اس میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی جو وہ میری جانب بڑھا کر بولی۔ "یہ لو اسی بہانے آنا تھا اس نے۔"

"اس کا کیا کروں؟" میں نے پوچھا۔

"اسے اپنے پاس رکھو، جتنی جلدی ہو سکتا ہے یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ تم اسی دلدل میں پھنسو گے کہ پھر موت ہی تمہارا مقدر ہو گی۔"

اس نے کچھ ایسے کہا کہ مجھے ایک دم سے اس پر پیار آ گیا۔ میں نے اس دونوں کاندھوں سے پکڑا اور اپنے قریب کر کے کان کے قریب سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا۔

"ساوری، سچ بتا، کیا تم بھی ایسا ہی چاہتی ہو؟"

اس کا بدن ایک دم سے ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ یوں جیسے کوئی سخت شے موم ہو گئی ہو۔ میں نے جان بوجھ کر ایک ہلکا سا فاصلہ رکھا تھا، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ یہ فاصلہ خود ختم کرتی ہے یا نہیں؟ مجھے زعم تھا کہ میرے ہاتھوں کا لمس اگر اسے موم کر سکتا ہے تو فاصلہ مٹانے پر بھی مجبور کر دے گا۔ اگلے چند لمحوں میں وہی ہوا۔ وہ میرے سینے سے لگ گئی تھی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ اس کی گرم سانسیں میری گردن پہ پھسل رہی تھیں۔ وہ میرے ساتھ لپٹی ہوئی ہولے ہولے کانپ رہی تھی پھر ایک دم سے جدا ہو کر کانپتی ہوئی آواز میں دھیرے سے بولی۔

"میں نہیں چاہتی کہ تم جاؤ، پر یہ لوگ تمہیں چھوڑیں گے نہیں؟"

"کیوں، ایسا کیوں ساوری؟" میں نے اپنا حصار مضبوط کرتے ہوئے پوچھا تو ہولے سے بولی۔

"پیرو ذاں تمہیں اپنے دشمنوں کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ وہ خود تم سے جی بھرے گی اور پھر دشمنوں کے آگے ڈال دے گی، بس تم بچ جاؤ۔"

"لیکن میں نہیں جاؤں گا۔" میں نے ہولے سے کہا۔

”کیوں؟“ وہ تڑپ کر بولی، اس کا بدن ایک بار پھر تن گیا تھا۔

”اس لئے کہ تم ہو یہاں، جب تک تم ہو، مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔“ میں نے کہا تو وہ ڈھیلی پڑتے ہوئے بولی۔

”یہ تو میں بھی چاہتی ہوں، پر......“

”کچھ مت کہو، بس حالات دیکھو۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ اس کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ میں نے اپنے لبوں سے خاموشی کی مہر ثبت کر دی۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ اچانک وہ مچھلی کی مانند تڑپی اور میرے حصار سے نکل گئی۔ مجھے پتہ اس وقت چلا جب وہ دروازے میں تھی۔

”اے ساوری بات سن......“ میں نے کہا۔

”نہیں، تم وہ نوٹ اٹھا لو، جو وڈاں نے دیئے ہیں۔ کچھ کھا لینا۔ میں جاتی ہوں۔“ یہ کہتے ہی وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا وہ اندھیرے میں تحلیل ہو گئی تھی۔ میں واپس چارپائی پر بیٹھ گیا۔

میری بھوک اُڑ گئی تھی۔ ساوری کا لمس ابھی تک میرے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔ مگر نجانے یہ کیوں اک اجنبی احساس بھی میرے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔ وہ چہرہ جس میں بس محسوس کر سکتا تھا، جس کے خدوخال میرے ذہن کی سطح پر ابھرتے لیکن مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون تھی؟ میں انہیں کیفیات میں لپٹا ہوا اکیلا صحن میں بیٹھا رہا۔

☆......☆......☆

دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ روشن دھوپ میں ہر شے نکھری ہوئی تھی۔ میرے سامنے کی چارپائی پر میرن شاہ بیٹھا ہوا کسی گہری سوچ میں تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے آیا تھا اور علیک سلیک

کے بعد یونہی خاموش بیٹھ گیا تھا۔ میں بھی اس کے سامنے خاموش بیٹھا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود ہی کہے جو کہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ پتا مطلب کے وہ یہاں آ کر بیٹھنے والا نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد کھنکارتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا۔

"تم کل اس راجستانی سے ملے تھے۔ کوئی مشورہ دو کیا کریں اس کا؟"

"یہ تو سائیں تم جانو اور وہ راجستانی جانے، میرا کیا لینا دینا اس سے۔" میں نے صاف جواب دیتے ہوئے کہا۔

"یار کچھ تو کہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ میں کیا کروں اس کا۔" وہ الجھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"سائیں میں پھر کہوں گا تم جانو اور وہ، مجھے تو اب اجازت دیں، میں اب یہاں نہیں رہنے والا۔" میں نے اپنے لہجے کو خوف زدہ بناتے ہوئے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر حیرت سے بولا۔

"ارے کہاں جانا ہے تم نے، ادھر رہو، اپنا کام کرو اور......"

"او نہ سائیں، یہاں تو ایسے ہی قتل و غارت شروع ہے۔ کل اگر وہ لوگ زیادہ ہوتے یا ایسی کوئی چوٹ لگ جاتی تو مجھے کسی نے پوچھنا بھی نہیں تھا۔ زمان موہل کی اپنی لڑائی اور مارا میں جاتا۔ اسی طرح تم لوگوں کی اپنی لڑائی ہے اور مارا میں جاؤں۔ میں ایک معمولی سا سرکاری ملازم......"

"یار تم اتنے بزدل ہو، یا پھر یہاں سے بھاگنے کا بہانہ بنا رہے ہو؟" اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم کچھ بھی سمجھ لو، میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے، اور نہ ہی اس لڑائی کا مجھے کوئی مفاد

ہے۔ میں بس رپورٹ بنا کر دے دوں گا۔ پھر تمہارا ایم پی اے جانے اور محکمہ جانے۔"

میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا تو چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر سرد سے لہجے میں بولا۔

"اب تم چاہو بھی تو یہاں سے نہیں جا سکتے ہو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" میں نے دانستہ خوف زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو، تم اب یہاں کے معاملات جان چکے ہو۔ یہ بات تمہیں اب سمجھ آ جانی چاہئے۔ میں جانتا ہوں، تم بہادر ہو، دلیر ہو لڑنا جانتے ہو۔ اس لئے میرے ساتھ رہو۔ کھاؤ، کماؤ، عیش کرو۔ باقی میں جانوں اور تمہارا محکمہ جانے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔"

"اگر اپنی حفاظت کو آپ لڑنا جھگڑنا کہتے ہو تو......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"چھوڑو یار اس قصے کو، اس راجستانی کے بارے میں بتاؤ۔ کیا اسے چھوڑ دیں یا رکھیں یا پھر مار دیں؟"

یہ بات اس نے یوں پوچھی تھی جیسے کسی فضول اور بے کار شے کے بارے میں بات کی جاتی ہے۔ وہ راجستانی اس کے لئے جیسے کوئی بے کار اور فضول شے تھی۔ میں نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔

"اسے جانے دو۔ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ وہ اب لڑنے کے کام کا تو نہیں رہا لیکن تمہارے اچھے رویے کا احسان مند ضرور ہو جائے گا۔"

"نہیں یہ ناممکن ہے وہ، وہ اسے بزدلی سمجھیں گے۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا تو میں ہنس دیا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"یہ تمہاری بھول ہے سائیں میرن شاہ، ہر فیصلہ تلوار سے نہیں ہوتا۔"

"میں تو اسے چھوڑ دوں لیکن اسے قبول کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ نہ اسے کوئی لینے آتا ہے اور نہ ہی اب اس کا کوئی دعویدار ہے، جس سے بات کی جا سکے۔ ہسپتال سے لا کر اسے رکھیں کہاں، یہ بھی مسئلہ ہے۔ اس پر اعتبار بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔" میرن شاہ نے یوں کہا جیسے وہ اس راجستھانی کی وجہ سے بہت پریشان ہو۔

"اور تم اسے مار دیتے ہو تو وہ قتل بھی تمہارے کھاتے میں پڑ جائیں گے جو تم نے نہیں کیے، ایسے ہی ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل ایسے ہے۔" اس نے میری بات کی تائید کی۔

"مجھے شام تک کا وقت دو، میں کرتا ہوں کچھ۔" میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا جیسے اس کے سر سے بوجھ اتر گیا ہو۔ پھر خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"جو بھی کرو، یہ مسئلہ ختم کر دو۔"

"ہو جائے گا۔" میں نے کہا تو اس نے اپنے کرتے کو تھوڑا اوپر اٹھایا اور جدید ماڈل کا پسٹل میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اب یہ مت کہنا کہ یہ ہتھیار تمہیں چلانا نہیں آتا۔ اسے اپنے پاس رکھو، حفاظت کے لئے اچھا ہوتا ہے۔"

میں نے وہ پسٹل پکڑ لیا، پھر اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہوتی ہے شام کو بات۔"

میری بات سن کر وہ چند لمحے بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر چل دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میرن شاہ کیوں الجھن کا شکار تھا۔ اسے دشمنوں کی نہیں، گھر کے اندر سے پریشانی تھی۔ لیکن میں خوش تھا، میں

چاہتا تھا کہ وہ مزید پریشان ہوں۔ میں اپنی کامیابی پر خوش تھا۔

بابا خیر دین مجھے ناشتہ کروا چکا تو میں گاڑی لے کر نکل پڑا۔ میں سید حاذ مان سوہل کے گھر جا پہنچا۔ وہ اپنے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک کوپے میں موجود تھا۔ وہ ایک رنگین پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے پاس پیڑھوں پر چند لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شاید وہ مقامی تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ گئے۔ میں ایک پیڑھے پر بیٹھتے ہوئے اس کا حال احوال پوچھا، پھر کچھ دیر باتیں کرتے رہنے کے بعد وہی سوال کر دیا، جو تھوڑی دیر پہلے میرن شاہ نے مجھ سے کیا تھا کہ اس راجھستانی کا کیا کرنا ہے؟

"یار وہ لنگڑا گھوڑا ہے، میرن شاہ کو چاہیے تھا کہ اب تک مار کر پرے کرتا، لیکن وہ اسے نہیں مار سکتا۔" زمان سوہل نے خود ہی فیصلہ دیا اور خود ہی انکار کر دیا تو میں نے تحمل سے پوچھا

"تم اس کے ساتھی لوگوں کو جانتے ہو، ان تک کوئی رسائی رکھتے ہو؟"

"ہاں، میں جانتا ہوں ان سے بات بھی ہو سکتی ہے لیکن یہ دشمنی ہے ہر دو اس کی، ایک بار اس سے ضرور پوچھنا ہوگا، ورنہ وہ دشمن بن جائے گی۔" زمان سوہل کے لہجے میں خوف جھلک رہا تھا۔

"کیا ہے دشمنی، کچھ تو پتہ چلے؟" میں نے اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا تو وہ میری طرف دیکھتا رہا پھر ہولے سے بولا۔

"دیکھ، یہ جو صحرا ہے نا، یہ بڑا ظالم ہے، اس میں رہنے والے بھی ویسے ہی ظالم ہیں، یہ انسانوں کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ جس طرح یہاں کا سانپ بڑا زہریلا ہے، ایسے ہی ہم بھی بڑے زہریلے ہیں۔ وقت نے ہمیں مزید ظالم ہی نہیں بھیانک کر دیا ہوا ہے۔ نشے سے لیکر انسان تک اسمگل کیے جاتے ہیں۔ یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک حاکمیت نہ ہو۔ میرن

شاہ کی اپنی حاکمیت ہے اور پیروزاں کی اپنی۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ میرن شاہ کو نہیں مانتی۔ لیکن جب مفاد ہوگا، کاروبار ہوگا، کسی سے دشمنی ہوگی تو بہن بھائی بن جاتے ہیں۔ اسی لئے اب تک بچے ہوئے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں تم مجھے وہ بات بتا ہی نہیں سکو گے تو اصل بات ہے۔ خیر، کوشش نہ کرو، تم مجھے اس راجستھانی کے وارثوں سے ملوا دو، آگے میں جانوں میرا کام۔" میں اس کی مجبوری سمجھتے ہوئے وہ بات کی جو میں چاہ رہا تھا۔

"تو پھر پیروزاں......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے تیزی سے کہا۔

"وہ جانے اور میں۔"

"اوکے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے سرہانے پڑے ہوئے سیل فون کو اٹھایا اور نمبر تلاش کرتے ہوئے بولا، "میں تمہاری بات کروا دیتا ہوں۔ تم جانوں اور تمہارا کام۔"

کچھ دیر بعد کال مل گئی تو اس نے کہا۔

"او بھائیا، میرا ایک دوست تم سے بات کرنا چاہتا ہے، غور سے بات سننا، بڑا اڈے دار بندہ ہے۔" یہ کہا اور فون میری جانب بڑھا دیا۔

"ہاں بھائیا، کیا کہوت ہے؟" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"تمہارا جو بھائی بندہ ہسپتال میں پڑا ہے، اسے واپس کیوں نہیں لے جاتے تم لوگ؟" میں نے کہا تو جیسے وہ پھٹ پڑا۔ اس نے میرن شاہ کے خاندان کو گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

"وہ ہی نہیں آن دیتے۔ اب تک بھی کہوت ہیں کہ اپنے لوگاں کا کھون ماف کر دیویں ان کو...... تو بھیج دیں گے۔ ہمارا بندہ مرجائے کوئی بات، پہلاں ہی دو مر گئے، ہم سمجھیں گے تیجا بھی مر گیا۔ پر اس خاندان کو بخشیں گے نائیں اب کے۔"

”دیکھ تجھے مجھ پر یقین ہو یا نہ ہو، لیکن میں تمہیں پورے یقین سے کہتا ہوں، تم لوگ اپنا بندہ لے جاؤ۔“ میں نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

”پاگل سمجھا ہے کیا؟ ایک بندے کی خاطر اور بندے مروا لیں۔ پھر کچھ لئے دیئے بغیر، کسی بات کے بغیر یوں کیسن چھوڑ دیں گے وہ؟“ دوسری طرف سے کہا گیا تو میں نے کہا۔

”چل بتا، جہاں کہو میں وہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ جہاں کہو، وہاں لے آتا ہوں اسے۔ کیوں چھوڑ رہا ہوں، یہ وہیں آ کر بتا دوں گا۔“ میں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا تو دوسری جانب سناٹا چھا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔

”بتاتا ہوں ابھی۔“

یہ کہتے ہی اس نے لائن کاٹ دی۔ میں نے فون زمان موہل کی جانب بڑھایا تو وہ ہونق بنا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر سر سراتے ہوئے بولا۔

”تم پاگل ہو، تم نے ان کے بندے مارے ہیں۔ وہ تمہیں واپس آنے دیں گے، میرا خیال تم خودکشی کرنے جاؤ گے۔ میں تمہیں جانے دوں گا نہیں۔“ اس نے آخری لفظ بہت شدت سے کہے تھے۔

زمان موہل کا خوف بے جا نہیں تھا۔ میں نہ صرف سمجھتا تھا بلکہ اچھی طرح جانتا بھی تھا۔ میں وہاں اگر جاتا ہوں تو موت کا سامنا کرنے جانے والا ہوں۔ میں جو سوچ کر یہاں آیا تھا کہ حالات کو اپنی دسترس میں کرنے کے لئے مجھے کچھ وقت لگے گا۔ میں اس کے لئے ذہنی طور پر تیار تھا لیکن میری سوچیں اپنی جگہ دھری رہ گئیں تھیں۔ حالات اس قدر تبدیل ہونے لگے تھے کہ مجھے ان حالات کے ساتھ چلنا نہیں دوڑنا تھا۔ میں اپنی سوچوں سے نکلا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”دیکھ وہ لوگ خوف زدہ ہیں۔اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جو خوف زدہ ہوتا ہے، وہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔لیکن......! جس طرح ہم ان پر اعتبار نہیں کر رہے ہیں، اسی طرح انہیں بھی ہم پر یقین نہیں ہوگا۔وہ کوئی راستہ نکالیں گے۔“

”کیسا راستہ؟“ اس نے سرسراتے ہوئے پوچھا۔

”فون آنے دے، پھر بات کرتے ہیں۔“ میں نے سکون سے کہا تو وہ میرے چہرے کی جانب دیکھنے لگا۔اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں تھیں۔جسے میں مسلسل نظرانداز کر رہا تھا۔کچھ دیر بعد سیل فون بج اٹھا۔اس نے اسپیکر کھول کر فون میرے سامنے کر دیا۔تبھی دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

”او بھائیا زمان، یہ بتا، وہ بندہ کون ہے جس نے ابھی بات کی تھی؟“

”تجھے کیا کہنا ہے، تجھے اپنے مقصد......“ اس نے کہنا چاہا تو دوسری جانب سے بات کاٹتے ہوئے پوچھا گیا۔

”بندہ بتا، پھر بات کرتے ہیں نا۔“

تبھی میں نے فون اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”میں وہی ہوں جس کے ہاتھوں تمہارے دونوں بندے قتل ہو گئے ہیں۔اور تیسرا زخمی ہے جس کو لے جانے کی بات کر رہا ہوں۔“

”تم وہ ہو......“ یہ کہہ کر دوسری جانب چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ دبے دبے غصے میں بولا۔”تو پاگل ہے، تیری کیا حیثیت ہے کہ تو......“

”دیکھ، میں زخمی اور بے بس پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔میں اسے کیوں واپس بھیجنا چاہتا ہوں، وہیں آ رہا ہوں نا، مجھ سے پوچھ لینا۔“

"اتنا جگرا ہے تم میں؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"جگہ بتا آ رہا ہوں۔ تم لوگوں میں ہمت نہیں ہے تو میں دکھا دیتا ہوں جگرا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو دوسری جانب سے وہ بولا۔

"چل پھر، تمیں ڈیرے پر آ جا۔ ہم تیرا وہیں انتظار کرتے ہیں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے زمان کو فون واپس کیا تو وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"علی، یار وہ تجھے مار دیں گے۔ کیوں پاگل پن کر رہے ہو۔ تم نے ان کے دو بندے مارے ہیں یار، یہ بات کیوں نہیں سمجھتے ہو تم؟"

"میں قتل ہو جاؤں گا نا، کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا اور اٹھ گیا تو اس نے پوچھا۔

"رُتّو بھو بڑ کا ڈیرہ کدھر ہے، اس بارے تجھے پتہ ہے؟"

"نہیں، لیکن میں پہنچ جاؤں گا۔" میں نے کہا اور چل دیا۔

میں سیدھا ہسپتال گیا، جہاں وہ راحت علی اسی بیڈ پر پڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا تو اس نے بھی پھیکی سی مسکان کے ساتھ میرا ہاتھ تھام لیا۔

"چل آ، تجھے چھوڑ دوں۔"

"تم، وہ میرن شاہ...... وہ پیروزاں......؟" اس نے انتہائی حیرت سے پوچھا تو میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"اگر جانا ہے تو وقت ضائع نہ کرو، خاموشی سے میرے ساتھ چل دو۔ راستے میں ساری بات بتا دوں گا۔"

"جانا تو ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

"تو چل پھر، اٹھ اور خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ جا۔" میں نے جان بوجھ کر ہولے سے کہا تو وہ بیڈ سے اتر گیا۔ اس نے جوتے پہنے اور ہولے ہولے چلتا ہوا گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا، پھر گاڑی بڑھا کر پوچھا۔

"یہ رُتّو بھوہڑ کا ڈیرہ کدھر ہے؟"

یہ سنتے ہی اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ایک جانب انگلی سے اشارہ کر دیا۔

دوپہر ہو رہی تھی جب میں رُتّو بھوہڑ کے ڈیرے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ہم راستے بھر باتیں کرتے آئے تھے۔ میں پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں جو چاہتا تھا اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ نہیں۔

"وہ سامنے ہے رُتّو بھوہڑ کا ڈیرہ۔" اس نے دبے دبے جوش سے کہا۔ سامنے ایک بڑا سارا تالاب تھا۔ جس کے ایک جانب کھجوروں کے درخت کا جھنڈ تھا۔ اس کے عقب میں کچی دیوار دکھائی دے رہی تھی جو کافی اونچی تھی۔ درمیان میں کچے کمروں میں منڈیریں دکھائی دے رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ بتاؤ، یہیں چھوڑ دوں یا آگے......" میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"نہیں ڈیرے تک چلو۔"

میں نے کچے راستے پر گاڑی کی رفتار کچھ تیز کر دی۔ کچھ ہی دیر میں ایک بڑے سارے لکڑی کے سیاہ پھاٹک کے سامنے گاڑی روک دی۔ سامنے برآمدے میں کافی سارے لوگ چارپائیوں، پیڑھوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں شاید تین ایسے لوگ تھے جو اپنے حلیے سے راجستانی لگ رہے تھے۔ اس کے علاوہ دو چار ایسے تھے جو شاید مقامی تھے۔ میں نے گاڑی

صحن میں گھڑی کی اور اسے اتر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اتر کر آگے بڑھ گیا۔ تب میں بھی اترا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔

جیسے ہی ہم برآمدے کے پاس پہنچے تو ایک جوشیلا راجھستانی آگے بڑھا تو دوسرے نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ میں اس کے جذبات دیکھ رہا تھا۔ میں نے لمحوں میں ساری صورت حال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ تبھی ایک ادھیڑ عمر شخص اٹھا جس نے سفید دھوتی اور کرتا پہنا ہوا تھا۔ اس کے لمبے لمبے کھچڑی بال تھے۔ چہرے پر ہلکی ہلکی گھنی داڑھی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آؤ جوان، میں ہوں رڑو بھوہڑ۔“

میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ”مجھے خوشی ہوئی تم سے مل کر۔“

”آؤ بیٹھو۔“ اس نے ایک طرف پڑی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں جا کر بیٹھ گیا تو وہ سنجیدگی سے بولا، ”داد دیتا ہوں میں تمہارے حوصلے کی، لیکن تم کیا سمجھ کر یہاں آگئے ہو؟ میں اسے دلیری سمجھوں یا تمہارا پاگل پن؟“

”رڑو بھوہڑ، ایسا کچھ نہیں ہے۔ میرن شاہ میرا سگا نہیں ہے اور نہ یہ راجھستانی میرے دشمن ہیں۔ انجانے میں ہی سہی لیکن انہوں نے مجھے مارنا چاہا اور میں نے اپنی جان بچائی۔ میں خود چل کر یہاں آگیا ہوں۔ آگے تم لوگوں کا فیصلہ، جو چاہو کرو۔“ میں نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات کہہ دی۔ تب رڑو بھوہڑ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ تو میں جانتا ہوں، تم شہر سے یہاں آئے ہو اور سرکاری ملازم ہو۔ تم یہاں تک آگئے، یہی تمہاری معافی کے لئے کافی ہے۔“

”نہیں رڑو بھوہڑ جی، میں معافی مانگنے نہیں آیا اور نہ ہی یہ احسان لینے آیا ہوں کہ تم مجھے معاف کر دو۔ جو حقیقت تھی وہ میں نے کہہ دی۔ اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہے۔ غلطی ہو،

قصور ہو، جرم ہو تو معافی ہوتی ہے۔" میں نے بڑے تحمل سے زٹو بھوہڑ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تو پھر ایسا کرو، کھاؤ پیو اور واپس چلے جاؤ۔ ہم ابھی تمہیں نہیں ماریں گے۔ تمہیں میرن شاہ کے ہی علاقے میں ماریں گے۔ یہاں سے چلے بھی جاؤ تو جہاں ہو گے وہیں تلاش کر کے ماریں گے۔ یہ زٹو بھوہڑ کا وعدہ ہے۔" اس نے دبے دبے غصے میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"زٹو بھوہڑ جی مجھے دشمنی قبول ہے۔" میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

"نہیں، مارو اس کو۔" وہی جوشیلا نوجوان اٹھ کر چیخا۔

"نہیں بکا، ابھی نہیں میں نے کہہ دیا، یہاں نہیں ماریں گے۔" زٹو بھوہڑ نے تحمل سے کہا

"نہیں ماروں گا یہاں، یہاں سے لے جا کر بارڈر پار ماروں گا۔" اس نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

"میں نے زبان دے دی ہے۔ اگر تیرا خون اتنا ہی گرم ہے، تو اس کے علاقے میں جا کر مار آؤ۔ میں تیرے ساتھ ہوں گا۔" زٹو بھوہڑ نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں انتظار کروں گا۔" میں نے کہا اور گاڑی کی جانب چل دیا۔ میں حد درجے چوکنا تھا۔ اپنے پیچھے ہونے والی ذرا سی آہٹ پر بھی میرے کان لگے ہوئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میرے پیچھے سے وار ہو سکتا ہے لیکن یقین نہیں تھا۔ میں بڑے محتاط انداز میں چلتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ میں گاڑی سٹارٹ کی اور ڈیرے سے نکلتا چلا گیا۔ کچے راستے پر رفتار تیز کرتے ہوئے میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ میں حالات کے ساتھ دوڑتا ہوا تھوڑا آگے نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

میں گاڑی سمیت ڈیرے میں داخل ہوا تو بابا خیر دین مجھے دیکھ کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے میرا یوں آنا کوئی انہونی ہو۔ میں نے گاڑی بند کی اور اتر کر اس کے پاس آ گیا۔ وہ مجھے مسلسل دیکھ رہا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو بابا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بس یہی...... کہ شام ہونے کو ہے...... کھانا کھا لو...... ابھی گرم گرم مل جائے گا۔" وہ اٹکتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا۔

"ہاں لے آؤ، سورج بھی ڈھلنے والا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں، لیکن تم ذرا دھیان سے رہا کرو۔ اکیلے ہوتے ہو یہاں۔ مجھے آج کل جانا پڑتا ہے بی بی سکینہ کے کہنے پر۔ ورنہ میں جاگتا رہتا ہوں۔" اس نے اپنا خدشہ ظاہر کیا تو میں نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"خیر ہے بابا، بس کھانا لے آؤ۔ پھر باتیں کریں گے۔"

اس نے ایک بار میری جانب دیکھا اور پھر رہائش کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ بابا خیر دین خود کبھی نہیں جاتا، پیرزادہ جان بوجھ کر اسے بھیجتی تھی۔ اب جو بابا نے جانے کا عندیہ دیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ آج بھی وہ ضرور آئے گی اس کا مجھے یقین تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ ساوری میرے پاس آئے۔ میں اس کے ساتھ بہت سارا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ میں اس کے ساتھ بہت ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ بابا خیر دین کھانا لے آیا۔ میں نے سیر ہو کر کھایا اور چارپائی پر لیٹتے ہوئے بولا۔

"بابا، تجھے جہاں جانا ہے میں تمہیں وہاں چھوڑ دوں گا، مجھے زمان مونگل کی طرف جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے پتر، میں برتن دے کر آتا ہوں۔" اس نے کہا اور برتن سمیٹنے لگا۔ میرے دماغ میں کئی ساری سوچوں نے اپنا بسیرا کر لیا تھا۔

کچھ دیر بعد میں زمان موہل کے پاس تھا۔ وہ اسی رنگین پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ کوپے میں بیٹری ٹیوب کی سفید روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ حیرت سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ پھر اسی حیرت میں بولا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ انہوں نے تمہیں واپس آنے دیا۔"

"تم سمجھو گے نہیں، یہ سارا حوصلے کا کھیل ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں ان کے پاس چلا جاؤں گا، انہوں نے مجھے دھمکی دی ہے کہ وہ مجھے یہاں آ کر ماریں گے۔ خیر......" میں سکون سے کہتے ہوئے رُک گیا، پھر لمحہ بھر بعد بولا "مجھے یہ بتاؤ، تمہارے دشمن کون تھے؟"

"کہا نا، پھر بتاؤں گا، تم مجھے یہ بتاؤ، میرن شاہ نے تو کوئی بات نہیں کی، اس کا کیا ردعمل تھا؟" اس نے تجسس سے اپنی بات کو پس پشت ڈال دیا۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

"وہ شاید ناراض ہو۔" اس نے کہا تو میں نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی۔ اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ میرن شاہ کی مرضی سے ہوا تھا۔ اسی لمحے میں نے سوچا کہ زمان موہل میرے لئے بے فائدہ بندہ ہے۔ میں اٹھ گیا۔

"لے بھئی، نکلتا ہوں۔"

"ارے کہاں چل دیئے، ابھی تو آئے ہو، بیٹھو، میں......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں بابا خیر دین کے ساتھ آیا تھا، صبح ملتے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے میں مڑا اور کوپے سے نکلتا چلا گیا۔ وہ مجھے آوازیں دیتا رہا لیکن میں نے سنی ان سنی کر دیں۔

میں واپس ڈیرے پر آ کر لیٹ گیا۔ میرے دماغ میں بہت کچھ چل رہا تھا۔ اچانک بدل جانے والے حالات نے مجھے بالکل نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مجھے اس کا بالکل بھی خوف نہیں تھا کہ کون، کب، کہاں مجھے مار دے۔ پھر تو کوئی جھنجھٹ ہی نہیں تھا۔ میرے بعد جو ہوتا رہے مجھے اس سے کیا۔ لیکن جتنی دیر تک میری زندگی تھی، تب تک میں اپنی مرضی سے جینا چاہتا تھا۔ میں نے بہت کچھ سوچا ہوا تھا، ان میں کیا کچھ میں دیکھ سکتا تھا اور کیا نہیں، میں اس بارے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

مجھے ڈیرے سے وحشت ہو رہی تھی۔ لاشعوری طور پر میں پروزاں کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں ذہنی طور پر اسے قبول نہیں کر پایا تھا۔ جیسے جیسے رات گہری ہوتی جا رہی تھی، میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے انتظار تھا۔ رہائش گاہ کی جانب آہٹ ہوئی اور بڑے ڈیل ڈول والی پروزاں کا ہیولا آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں چارپائی پر سست کر بیٹھ گیا۔ وہ میرے قریب آئی تو میں اٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے اندر جانے کو کہتی۔ میں بحث نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ کوئی بات کئے بنا چارپائی پر بیٹھتے ہی لیٹ گئی، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر ہولے سے بولی۔ "آؤ میرے ساتھ ادھر لیٹ جاؤ۔"

"نہیں میں ادھر لیٹ جاتا ہوں۔" میں دوسری چارپائی پر لیٹ گیا تو اس نے میری جانب کروٹ لے لی۔ پھر دھیمے سے پوچھا۔

"اس راجستھانی کو چھوڑ آئے، اچھا کیا، میرن شاہ کو سکون ہو جائے گا۔"

”لیکن میری دشمنی ہو گئی ہے ان سے۔“ یہ کہہ کر میں نے اختصار سے ساری روداد سنا دی۔ وہ سکون سے سنتی رہی پھر سنجیدہ سے لہجے میں بولی۔

”اوئے کچھ نہیں ہوتا۔ میں ہوں نا تیرے ساتھ۔“

”تم ہر وقت تو میرے ساتھ نہیں رہ سکتی ہو نا، خیر، میں نے میرن شاہ سے کہا تھا، اب میں واپس جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے جان بوجھ کر ایسا کہا تو وہ ناراض لہجے میں تیزی سے بولی۔

”پھر وہی فضول بات...... میں کل شہر جا رہی ہوں، تجھے بھی ساتھ لے چلوں گی۔ ایک دو دن صحرا سے نکل کر سانس لے لینا، اب خوش۔“

اس نے بچوں کو دلاسا دینے والے انداز میں کہا تھا۔ جس پر میں نے اپنا کوئی ردعمل نہیں دیا۔ چند منٹ یونہی گزر گئے تبھی میں نے پوچھا۔

”مجھے اپنی حفاظت کے لئے کچھ اسلحہ چاہئے، مل جائے گا؟“

”جو چاہئے مجھے بتا دو، یا پھر آؤ میرے ساتھ، جو بھی پسند ہو لے لینا۔“ اس نے تیزی سے یوں کہا جیسے وہ یہی سننا چاہتی تھی، تبھی میں نے جان بوجھ کر حیرت سے پوچھا۔

”کہاں جانا ہے؟“

”میرے ساتھ، ادھر گھر میں، میرے کمرے میں۔“ اس نے سکون سے کہا پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر میری گالوں پر پھیرتے ہوئے بولی۔ ”کچھ دیر میرے ساتھ بھی سکون سے ٹھہر جانا۔“

”پیروزاں، میری ایک بات سن لو، تم مجھ پر مہربان ہو، میری احسان مند ہو، اور اس احسان کا بدلہ دینا چاہتی ہو تو اس کا یہ مطلب ہے کہ میں تمہارے بدن کی ضرورت بھی پوری کروں؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ سخت ہو گیا، بات بھی سخت تھی۔ ایک طرح سے یہ اس کی تذلیل بھی تھی لیکن میں اس سے معاملہ صاف کر لینا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے

کوئی عام مرد سمجھے، جسے وہ جب چاہے، جیسے چاہے اپنی دسترس میں لے لے۔ اس کا میری گال پر پھرتا ہوا ہاتھ ایک دم سے رک گیا۔ چند لمحے وہ ہاتھ میری گال پر رہا پھر اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ پھر وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں سمجھی نہیں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"وہی جو تمہیں سمجھ لینا چاہیے۔" میں نے سکون سے کہا۔

"میں اب بھی نہیں سمجھی ہوں۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"تو پھر یوں سمجھ لو، کیا تم مجھے اپنے ساتھ دھندے کے لئے رکھنا چاہتی ہو یا پھر اپنے بدن کی ضرورت پوری کرنے کے لئے؟ مجھے جس مال و دولت کا تم لالچ دے رہی ہو، وہ کس کام کے عوض مجھے ملے گا؟" میں نے دھیمی آواز میں لیکن تیزی سے پوچھا۔

"دیکھو جلی، دھندہ اپنی جگہ، اس کا مال تجھے ملے گا، جتنا چاہو گے لو، میری ضرورت پوری کرو گے تو میری دوستی تجھے نصیب ہوگی، جو تجھے بے خوف کر دے گی۔" اس نے بڑے سکون سے کہا

"اگر میں ان دونوں میں سے صرف ایک قبول کروں تو؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا تو فوراً بولی۔

"مطلب تم میری دوستی نہیں چاہتے ہو تو کوئی بات نہیں، میں تم سے ویسے ہی دوستی کر لوں گی۔"

"اوکے، اب دھندے کی بات کرو، کیا کرنا ہے وہ بتاؤ۔" میں نے پوچھا۔

"وہ میں شہر سے واپس آ کر بتاؤں گی۔ اور ہاں میرے شہر جانے کے بارے میں صرف تمہیں پتہ ہے، کوئی دوسرا نہیں جانتا۔"

"ساوری بھی نہیں؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

”ہاں ابھی وہ بھی نہیں جانتی۔ تیار رہنا صبح۔“ اس نے کہا اور ایک دم سے اٹھ کر چل دی۔
اس وقت میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری تھی کہ میں اسے کہوں کہ کچھ دیر کے لئے ہی سہی ساوری کو بھیج دے۔ مگر میں نے اس خواہش کو اسی شدت سے دبا دیا۔ میں جانتا تھا کہ ان لمحات میں میری اس خواہش کا اثر کس قدر برا ہو سکتا تھا۔

☆......☆......☆

نیلگوں روشنی کا احساس آسمان پر چھا رہا تھا جب مجھے جگایا گیا۔ میرے سامنے ساوری کھڑی تھی۔ وہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر جگا رہی تھی۔
”اٹھو علی، پیروزاں بلا رہی ہے۔“
”کیوں، وہ کیوں......“ یہ کہتے ہوئے اچانک مجھے یاد آ گیا۔
”اس کے ساتھ شہر جانا ہے۔ جلدی منہ ہاتھ دھو لے، وہ جانے کے لئے تیار کھڑی ہے۔“ اس نے کہا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ پیروزاں بڑی گھاگ عورت ہے۔ اس نے یہاں سے نکلنے کے لئے بڑا مناسب وقت چنا تھا۔ اس نے مجھے رات نہیں بتایا، بلکہ بالکل وقت پر بتایا۔ اس کا ایک ہی مطلب لیا جا سکتا تھا کہ ابھی اسے مجھ پر پوری طرح بھروسہ نہیں تھا۔
”ٹھیک ہے میں تیار ہوتا ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
”نہیں، تیار ہونے کا وقت نہیں، بس اپنے ساتھ کپڑے وغیرہ لے لو اور بس چلو، وہ نکلنے کے لئے تیار کھڑی ہے۔“ ساوری تیزی سے بولی۔
”چل اسے کہو، گاڑی لے کر پھاٹک پر آ جائے، میں وہیں آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں اٹھ اور اندر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے اپنے بیگ سے دو جوڑے کپڑے نکالے، اس کے

ساتھ بڑی نوٹوں کی گڈی نکالی جو مجھے پیروزاں نے دی تھی اور پلٹ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

میں نے منہ بھی نہیں دھویا اور کمرے کی کنڈی چڑھا کر پھاٹک کی جانب چل دیا۔

جیسے ہی میں پھاٹک پر پہنچا، پیروزاں کی فور وہیل آ گئی۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ساوری تھی۔ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا تو فور وہیل چل دی۔ ہمارے درمیان چھائی خاموشی کو پیروزاں ہی نے توڑا۔ وہ دھیمے سے بولی۔

"ڈیش بورڈ میں پسٹل پڑا ہے۔ اس کے ساتھ میگزین بھی ہیں۔"

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ڈیش بورڈ کھولا، اس میں پڑا پسٹل اٹھا کر دیکھا۔ یہ بالکل اسی ساخت کا تھا، جو میرن شاہ نے مجھے دیا تھا۔ وہ میرے نیفے میں موجود تھا۔ میں نے اسے واپس رکھتے ہوئے میگزین کو دیکھا اور ڈیش بورڈ بند کر کے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

میں سامنے دیکھ رہا تھا۔ میٹھی سفید روشنی میں فور وہیل کی پیلی روشنی مدہم تھی۔ صحرائی راستے میں جھاڑیاں اور پودے پیچھے کی جانب بھاگ رہے تھے۔ مجھے ایک ہی احساس مدہوش کر دینے کے لیے کافی تھا کہ میری پشت پر ساوری بیٹھی ہوئی ہے۔ پتہ نہیں وہ میرا امتحان تھی یا پھر انعام بننے والی تھی۔

☆......☆......☆

بہاول پور شہر پہنچنے میں ہمیں تین گھنٹے لگ گئے تھے۔ ماڈل ٹاؤن کی ایک شاندار کوٹھی میں فور وہیل داخل ہوئی تو مجھے پتہ چلا کہ یہ پیروزاں کی ملکیت ہے۔ وہاں کا ماحول دیکھ کر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کوٹھی کی دیکھ بھال بڑے اچھے طریقے سے ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے وہاں کچھ ملازم رکھ چھوڑے ہوں گے۔ لیکن اندر پہنچتے ہی پتہ چلا کہ میرن شاہ کی بیوی اور

بچے وہیں اس کوٹھی میں رہتے تھے۔ وہاں پر رہتے ہوئے وہ اپنے بچوں کو ایک اعلیٰ سکول میں پڑھا رہی تھی۔ دکھ کی ایک لہر میرے اندر سرائیت کر گئی۔ ان لوگوں کے پاس پیسہ ہے تو ان کے بچے تعلیم لے سکتے ہیں اور روہی کے باسی، جن سے تعلیم کوسوں دور تھی۔ میں نے اگلے چند منٹوں میں اپنے دماغ سے یہ خیال نکال دیا۔ میں جذباتی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مجھے جاتے ہی ایک کمرہ دے دیا گیا کہ میں یہاں آرام کروں۔ کچھ ہی دیر بعد ناشتہ آ گیا۔ اس کے بعد جو میں لمبی تان کر سویا تو دوپہر کے بعد دروازے پر دستک سے میری آنکھ کھلی۔ دروازہ کھولنے پر میرے سامنے ساوری کھڑی تھی۔ اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''پیروزاں سیمن بلا رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم چلو، میں آتا ہوں۔'' میں نے اس کے تنتے ہوئے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو مجھے لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا تو وہ بولی۔

''ہٹو تو سہی، مجھے برتن لینے ہیں۔'' میں ایک جانب ہٹ گیا۔ وہ کمرے میں آ گئی اور پھر میری جانب دیکھے بنا بولی۔ ''یہاں بڑی احتیاط سے رہنا، بچو پیروزاں کی ہر وقت نظر ہے۔ خاص طور پر مجھ سے......'' یہ کہتے ہوئے وہ ساتھ میں برتن بھی اٹھاتی رہی۔ پھر ٹرے اٹھا کر باہر چل دی۔ میں چند لمحے سوچتا رہا پھر فریش ہونے چل دیا۔

لاؤنج میں پیروزاں صوفے پر پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا پھول دار سوٹ پہنا ہوا تھا، اس کے ساتھ ایک بڑا سا آنچل اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے پر سختی کے ساتھ ہلکا سا تناؤ بھی تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی بولی۔

''یہاں بیٹھو، ابھی کچھ دیر میں یہاں مہمان آنے والے ہیں۔''

''وہ دوست ہیں یا......'' میں نے ایک خیال کے تحت کہا تو وہ اکتائے ہوئے انداز

میں بولی۔ ”یہاں کوئی کسی کا دوست نہیں ہے۔ جتنا زیادہ مفاد ہوتا ہے، اتنا ہی وہ قریب ہو جاتا ہے۔“

”بات تو تم نے ٹھیک کہی ہے۔“ میں نے کہا اور اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ بے خیالی کے سے انداز میں میری جانب دیکھتی رہی۔ وہ شاید کسی گہری سوچ میں تھی۔ میں بھی اس کے پاس خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ پورچ میں کار رکنے کی آواز آئی۔ اس کے کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ ایک نوجوان سی لڑکی اندر آ گئے۔ ادھیڑ عمر نے سفید شلوار قمیص پر گہرے نیلے رنگ کا ویسٹ کوٹ پہنا ہوا تھا، اس کے بال کھچڑی تھے اور بھاری مونچھوں میں تھوڑے سیاہ بال تھے۔ لڑکی نے سیاہ پتلون کے ساتھ گلابی فراک نما شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ ان کے چہروں پر جو مسکراہٹ تھی وہ بڑی مصنوعی سی لگی۔ وہ دونوں پروزاں سے ہاتھ ملا کر ایک طرف صوفے پر بیٹھ گئے۔ یونہی رسمی سی باتوں میں ایک دو بار انہوں نے میری موجودگی کا نوٹس کیا تو پروزاں نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے خوشگوار سے انداز میں کہا۔

”یہ علی ہے، میرا دوست ہے، میرے معاملات ابھی یہی دیکھے گا۔“

”اوہ اچھا۔“ ادھیڑ عمر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ پروزاں نے اسے میری اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ اب مجھے تجسس یہی تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا تھا۔ ظاہر ہے یہ جھوٹ بولنے کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ تو تھی۔

”اور علی یہ ہیں یہاں کے ایک بڑے بزنس مین، چوہدری آصف حمید ان کا بزنس کہاں کہاں پھیلا ہوا ہے، اس کی تفصیل تو بہت لمبی چوڑی ہے لیکن ہمارے مطلب کی صرف اتنی سی باتیں ہیں کہ روحی میں جو یہ ہمارا بزنس ہے اس کے یہ سب سے بڑے گاہک ہیں۔ یہ ان کے

جتنے سیاست دان ہیں یہ ان کے سپانسر ہیں۔ کسی سیاست دان کے زیادہ اور کسی کے کم۔ اس لئے جس سے، اس کا مطلب ہے یہ ہر کسی سے کام لے سکتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اس لڑکی کی جانب دیکھا، پھر خاموش ہو گئی۔

"یہ میری سیکریٹری ہے۔" آصف حمید نے مختصر سا کہا تو پرورزاں بولی۔

"چوہدری صاحب، مجھے اس لئے اچانک یہاں آنا پڑا کہ اب فیصلہ ہو جانا چاہیے، آپ کس کے ساتھ ہیں؟"

یہ سنتے ہی اس نے غور سے پرورزاں کی جانب دیکھا اور پھر بڑے سے ٹھنڈے انداز سے تحمل سے بولا۔

"دیکھیں پرورزاں بی بی، ہم وہاں پر اکیلے کام نہیں کر رہے ہیں، آپ کو پتہ ہے دو پارٹیاں مزید ہیں۔ ان کی اپنی دلچسپیاں ہیں۔ ہم کسی کو روک تو نہیں سکتے اور......"

"یہیں پر گڑبڑ ہے چوہدری صاحب۔ جب ہم کسی کو کھلی چھٹی دیں گے تو ان کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ وہ ہمارے کام میں ٹانگ اڑاتے ہیں جس سے کوئی نہ کوئی جھگڑا ہو جاتا ہے۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔

"معاف کرنا بی بی، ہم تو اسی کے ساتھ بزنس کرتے ہیں، جو وہاں زیادہ طاقتور ہے۔ جو اپنے زور بازو سے اپنی حاکمیت بنا کر رکھتا ہے۔ اگر آپ کا یہ مطلب ہے کہ میں کسی کو روکوں اور آپ لوگوں کو کھلی چھٹی دوں تو یہ میرا کام ہے ہی نہیں۔ آپ وہاں من مانی کرتے ہو، آج تک کسی نے پوچھا؟ نہیں نا؟" چوہدری نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پرورزاں کو بتا دیا کہ وہ جو بات کر رہی ہے، وہ اتنی اہم نہیں ہے۔ تبھی وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں یہ میں مانتی ہوں، میں امید کرتی ہوں کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔"

"بالکل، ایسا ہی ہوگا۔ لیکن ایک بات ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”وہ کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”میرا مشورہ ہے، آپ اپنے بھائی میرن شاہ کے ساتھ چلیں گی تو زیادہ بہتر رہے گا، یہ جو آپ لوگوں کو سر اٹھاتے ہوئے دیکھ رہی ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ دونوں کی طاقت بٹ گئی ہے۔“
”یہی بات میں آپ کو سمجھانے آئی ہوں کہ طاقت بٹی نہیں، میں اپنا کام کر رہی ہوں، وہ اپنا کام کر رہا ہے۔ میرن شاہ میرا مسئلہ نہیں، وہ لوگ میرا مسئلہ ہیں جو اس وقت روہی میں ہیں۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
”ٹھیک ہے، ان کے لئے میں آپ کے ساتھ ہوں، آپ کو کوئی نہیں پوچھتا، یہ میری گارنٹی ہے۔“ اس نے حتمی انداز میں کہا۔
”بس یہی بات ہے۔“ اس نے یوں کہا جیسے یہی بات منوانے وہ یہاں تک آئی ہو۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ”ایک بات اور......“
”ہاں بولیں۔“ وہ تحمل سے بولا۔
”دھندے میں کچھ باہر سے آئے لوگ دخل اندازی کرتے ہیں۔ کیا وہ بھی آپ کے لوگ ہیں یا......“ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔
”باہر سے آئے مطلب؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔
”کیا رتو بوہڑ آپ کے ساتھ کام کر رہا ہے؟“ پیروزاں نے پوچھا۔
”نہیں، کبھی کرتا تھا لیکن آج کل تو وہ کچھ بھی نہیں کر رہا۔“ چوہدری نے سنجیدگی سے کہا۔
”لیکن اس وقت وہی ان سب کا باپ بنا ہوا ہے۔ وہی انہیں پناہ دیتا ہے، وہی ان کا دھندہ دیکھ رہا ہے، وہ کون ہے؟“ پیروزاں نے پوچھا تو چوہدری نے حیرت سے دیکھتے

ہوئے کہا۔ ”یہ میرے لئے نئی اطلاع ہے۔“

”ویسے حیرت ہے چوہدری جی، آپ کے لئے یہ نئی اطلاع ہے۔ جب آپ کو وہاں کی خبر ہی نہیں تو آپ دھندہ کیسے دیکھتے ہیں۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی تو وہ خاموش رہا۔

چند لمحوں بعد پیروزاں نے سرد سے لہجے میں پوچھا، ”تو پھر کیا خیال ہے؟“

”اسے ختم کرنا ہوگا، ورنہ وہ سب چوپٹ کر دے گا۔“ چوہدری نے وحشت ناک انداز میں کہا۔

”روہی میں آپ کی جو آنکھیں ہیں نا وہ دھندلی ہوگئی ہیں اور جو کان ہیں اب انہیں سنائی نہیں دیتا۔ اسی لئے ساری گڑبڑ ہو رہی ہے۔ میں کل تک ادھر ہوں، اچھی طرح پتہ کریں، پھر مجھ سے بات کریں۔“ پیروزاں نے کہا تو وہ خاموش رہا پھر کچھ دیر بعد بولا۔

”نہیں مجھے آپ پر بھروسہ ہے۔ ان کے بارے جو بھی فیصلہ ہوگا، وہ آپ ہی کریں۔ مجھے اب دوبارہ سب دیکھنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے، پھر بھی میں پتہ کر لوں گی۔“ اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا تو پیروزاں نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آئیں چائے پیتے ہیں۔“

ہم سب اٹھ کر اس جانب چل دیئے۔ چائے کے دوران ان دونوں میں بہت ساری باتیں ہوئیں۔ ان باتوں سے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ روہی کو کس طرح اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے تھے۔

شام ڈھلے وہ لوگ چلے گئے لیکن میرے لئے نجانے کتنی سوچیں چھوڑ گئے۔ کیا پیروزاں نے مجھ پر اتنا اعتبار کر لیا تھا کہ سب کچھ میرے سامنے کہہ دیا؟ کیا ایسا ہو رہا تھا جو میرے

سامنے بیان ہوا؟ اگر ایسا سب ہو رہا تھا تو یہ وہاں بسنے والے انسانوں کے لئے ایک شکنجہ تھا، جس میں ان کی طاقت، خون اور مفاد سب کچھ یہ تاجر لوگ استعمال کر رہے تھے۔ دوسرا یہ ملک کے لئے انتہائی خوف ناک تھا۔ ایک طرح سے یہ سینڈھ لگائی جا رہی تھی جہاں سے کوئی بھی دشمن اندر آسکتا تھا۔ اس کے بعد وہ کیا کرتا ہے یہ اس کی مرضی تھی۔ اگرچہ یہ میرے لئے اتنی حیرت ناک بات نہیں تھی مجھے اس کا کافی حد تک ادراک تھا لیکن تھوڑا دکھ ضرور ہوا تھا۔ نجانے کتنے برسوں سے یہ لوگ اسی طرح شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ نہ وہ خود نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ کوئی انہیں ان شکنجوں سے نکالتا ہے۔ شاید اسی طرح جکڑے رہنا ان کی عادت بن گئی تھی۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ میں انہی سوچوں میں الجھا ہوا جاگ رہا تھا۔ میرے اندر کا انسان مجھے جھنجوڑ رہا تھا کہ میں روہی کے ان باسیوں کی مدد کروں۔ جتنی ان کی ثقافت رنگین تھی اتنی ان میں ضعیف الاعتقادی بھی موجود تھی۔ جتنا ان میں سخت کوشی تھی، اتنی ان میں تعلیم کی بھی کمی تھی۔ جتنے وہ جفاکش تھے، اتنی ہی غربت ان میں موجود تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ سوائے ان مفاد پرستوں اور جرائم پیشہ کے علاوہ کون ذمے دار ہو سکتا تھا۔ آہٹ ہونے سے میرا دھیان بٹ گیا۔ دروازے میں پیروزاں کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بیڈ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ چلتی ہوئی آئی اور بیڈ کی دوسری جانب بیٹھ گئی۔ وہ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا چکی تو میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

”یہی کہ تم روہی والے کتنے ظالم ہو، پیسہ بنانے کی خاطر......“

”نہیں جمال، صرف پیسہ بنانا مقصد نہیں ہے، تم نے دیکھا ہوگا اور دیکھو گے بھی، صرف پیسہ مقصد نہیں ہے، جنگل کا تو پھر قانون ہوتا ہے ہم انسان تو جنگل کے قانون سے بھی بدتر سطح پر اتر

آتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنا تحفظ ہوتا ہے اور پھر باقی باتیں بعد میں دیکھی جاتی ہیں۔'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں ایسا کیا عدم تحفظ آ گیا جو میرن شاہ کے ساتھ اپنا الگ سے سب کچھ کر رہی ہو۔ اپنی طاقت......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میں بھی ایک انسان ہوں، میرے اندر بھی جذبات ہیں، مجھے اگر کوئی کچلے گا تو کیوں نا میں اپنا بچاؤ کروں۔'' اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔

''میرن شاہ نے تمہیں کچلا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا تو اس کا چہرہ تن گیا، پھر وہ نفرت بھرے لہجے میں کہتی چلی گئی۔

''میں جانتی ہوں اپنے بارے میں، روز آئینہ دیکھتی ہوں۔ میرے سامنے ساوری ہزار درجہ خوبصورت ہے۔ لیکن مجھے یہ بتاؤ، میرے اندر کی پیاس مر جائے گی۔ میں اگر خوبصورت نہیں تو کیا میرے جذبات بھی مر جائیں گے۔ میں بھی شادی کرنا چاہتی تھی، مجھے بھی ایک مرد کی ضرورت تھی۔ میری شادی اگر نہیں ہو رہی تھی تو میرن شاہ میری شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کسی کا 'سالا' بنے یہ اسے گوارا نہیں۔ میرن شاہ کے چاہنے سے کیا میری جو مرد کی ضرورت ہے وہ ختم ہو جاتی؟''

''نہیں...... یہ تو غلط بات ہے، مگر کیا تمہارا رشتہ آیا تھا جسے میرن شاہ نے انکار کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک دو آئے لیکن وہ ذات برادری کے نہیں تھے۔ دوسرا اماں بہت مانگ رہے تھے۔ پھر میں نے ایک لڑکے کو خود پسند کیا، اسے اپنی راہ پر لائی لیکن اسے بھی میرن شاہ نے دشمن کا بندہ کہہ کر مروا دیا۔ بس پھر اس دن کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا، میں دشمن کے کسی لڑکے کو اپنے

قریب کرتی ہوں، جب تک وہ استعمال ہو سکتا ہے کرتی ہوں پھر مار دیتی ہوں۔"

اس نے یوں کہا جیسے کسی ٹشو پیپر کے استعمال کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔ میں اس پر سوال کر سکتا تھا کہ کیا وہ مجھے بھی اپنا دشمن سمجھتی ہے لیکن میں خاموش رہا۔ اسکی طرف دیکھتا رہا تبھی وہ بولی، "کیا تم جانتے ہو میرن شاہ اسی شہر کی یونیورسٹی میں پڑھا اور مجھے سرے سے اجڈ اور گنوار رکھا گیا، کیوں کیا ایسا؟"

"تو کیا تم جو کچھ کر رہی ہو اپنے بھائی کے خلاف کر رہی ہو؟" میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی۔

"نہیں، وہ ابھی تک میری راہ میں نہیں آیا۔ جس طرح دوسرے لوگ کام کر رہے ہیں، میں بھی کر رہی ہوں، مجھے بھی حق ہے کہ میں اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزاروں۔ میرن شاہ اگر عیاشیاں کر سکتا ہے تو میں کیوں نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنا دھندہ خود شروع کیا اور میرے ساتھ بہت سارے لوگ ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے تم میرن شاہ سے بھی زیادہ خطرناک عورت ہو۔" میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

"صرف ان کے لئے جو مجھے دھوکہ دیتے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے تکیہ ایک طرف رکھا اور بیڈ پر لیٹ گئی۔ میں اسی لمحے ایک جانب سمٹ گیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہمارے درمیان کیا معاہدہ ہو چکا ہے۔ اس لئے کوئی لفظ نہ کہہ سکی۔ وہ کافی دیر تک خاموشی سے بیٹھی رہی۔ تب میں نے کہا۔

"اگر چوہدری تمہیں دھوکہ دے دے تو......؟"

"اوئے، یہ لوگ صرف یہاں بیٹھ کر دھندہ کر سکتے ہیں، ان میں لڑنے کی سکت نہیں......

ہاں سازش یہ خوب کرتے ہیں۔ اس لئے اپنے مطلب کے لئے ہمیں لڑاتے رہتے ہیں۔"
اس نے حقارت سے کہا۔

"تو پھر تمہاری اس سے ملاقات کا مقصد..." میں نے پوچھا۔

"میں نے اسے یہ باور کرا دیا ہے کہ اب وہ میرے بغیر رہ ہی نہیں چل سکتا اور علی ......
میں نے بھی سوچ لیا ہے، اب میری راہ میں جو بھی آئے گا اسے ختم کر دوں گی۔ چاہے وہ کوئی
بھی ہو، کل تک اسے اپنی اوقات کا پتہ چل جائے گا۔" اس نے حقارت اور طنز کے ملے جلے
لہجے میں کہا۔

"خیر تم جانو اور تمہارا کام۔" میں نے بات ختم کرنے کے لئے کہا کیونکہ میں بہت کچھ سمجھ
گیا تھا۔ آئندہ آنے والے جو حالات تھے ان کا بھی اندازہ مجھے ہو گیا تھا اب ان حالات کو
اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا تھا۔

"نہیں تمہارا کام بھی ہے اب، ہمارے درمیان اب وعدہ ہے۔" اس نے خود مجھے یاد
کرا دیا تو میں دھیمے سے مسکرا دیا، میری جانب سے آمادگی دیکھ کر وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔"
میں تو تجھے پسند نہیں آئی، اس لئے تم میرے قریب نہیں ہوتے ہو، ہاں اگر کوئی لڑکی تمہیں پسند
آ جاتی ہے تو بلا جھجک مانگ لینا، دے دوں گی۔

"چاہے کسی دشمن کی ہو؟" میں نے جان بوجھ کر کہا۔

"ہاں، چاہے دشمن کی بھی ہو اٹھا لینا۔" اس نے سرد سے لہجے میں کہا پھر ایک دم سے اٹھ
کر چل دی۔ وہ مایوس ہو گئی تھی یا اپنا مطلب نکال چکی تھی، اس کا مجھے اندازہ نہیں ہوا۔ وہ
دروازہ پار کر گئی تھی۔

☆......☆......☆

دن کافی نکل آیا تھا جب میں کمرے سے باہر آیا۔ میں لاؤنج میں صوفے پر آ کر بیٹھا تو کوٹھی کا ملازم مجھ سے ناشتے کا پوچھنے آ گیا۔ اسی سے پتہ چلا کہ کچھ دیر پہلے پیروزاں ڈرائیور کے ساتھ نکل گئی تھی۔ میں وہیں پھیل کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ساوری ٹرے اٹھائے آتے ہوئے دکھائی دی۔ وہ میز پر ٹرے رکھنے کے لئے جھکی تو اس کا آنچل کافی ڈھلک گیا، اس کے ساتھ ہی ادھر اُدھر دیکھے بغیر منمناتے ہوئے بولی۔

''مجھ سے بات بھی نہ کرنا، سمجھو میں اجنبی ہوں۔''

میں نے اس کی بات کا جواب بھی نہیں دیا۔ یوں ٹرے کی طرف دیکھتا رہا جیسے کوئی ندیدہ بھوک کے باعث کھانے کو دیکھتا ہے۔ وہ ٹرے رکھ کر چلی گئی۔ میں اب یہ جان گیا تھا کہ ساوری کہیں زیادہ پیروزاں کو جانتی ہی نہیں سمجھتی بھی تھی۔ یہ سب کیوں ہو رہا تھا، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اب ساوری مجھے کہیں اکیلے میں ملتی تو میں اس کے بارے میں پوچھتا۔ میں یہی سوچتا رہا اور وہ ٹرے رکھ کر چلی گئی۔ میں نے خوب جی بھر کر ناشتہ کیا اور لاؤنج سے باہر نکل آیا۔ کھلی فضا میں سانس لینا اچھا لگا تو لان میں ہری گھاس پر ایک پودے کے سائے میں آ بیٹھا۔ میرے پاس سوچنے کے لئے بہت کچھ تھا لیکن میں کسی موضوع پر بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے اتنا وقت نہیں ہوا تھا کہ گیٹ کھلا اور اس میں سے پیروزاں کی فور وہیل اندر داخل ہوئی۔ میں یونہی بیٹھا رہا۔ وہ میری جانب دیکھتی رہی یہاں تک کہ فور وہیل پورچ میں رُک گئی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ پسنجر سیٹ سے نیچے اتری تو مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

میں اٹھ کر اس کی جانب چل دیا۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے پوچھا۔

"ایسے کیوں بیٹھے ہو؟"

"ایویں ہی بس کھلی فضا میں آ گیا تھا۔" میں خوشگوار لہجے میں کہا۔

"چل تیاری کر چلیں واپس۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا اور اندر کی جانب چل دی۔ مجھے کیا تیاری کرنا تھی، میں بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ مجھے اپنے کمرے سے اپنا بیگ اٹھانا تھا، وہ لے کر نیچے آیا تو لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں باہر پورچ میں آ گیا جہاں ڈرائیور کھڑا تھا۔ میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اپنا بیگ میں نے پچھلی نشست پر رکھا اور ایک جانب کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ پروزاں کے ساتھ ساوری آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھیں تو میں پسنجر سیٹ پر جا بیٹھا۔ اگلے چند لمحوں میں ہم کوٹھی سے نکل چکے تھے۔ ہم نے جتنا وقت بھی اس کوٹھی میں گزارا تھا، میرن شاہ کی بیوی اور بچے سامنے نہیں آئے تھے۔ وہ وہاں رہتے ہوئے بھی ان سے الگ تھلگ تھی۔ کیا اس کے پروزاں کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں تھے؟ وہ اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی؟ یا پھر وہ تھی ہی ایسی کہ الگ تھلگ رہے۔ جو بھی تھا، مجھے اس سے کیا لینا دینا تھا۔ میں نے اسے اپنے دماغ سے نکال باہر کیا۔

بہاول پور سے نکلے ہی تھے کہ پیچھے بیٹھی پروزاں کی آواز ابھری۔

"یہ لے میں نے تیرے لئے ایک سیل فون لیا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی جدید ماڈل کے سیل فون کا ڈبہ میرے سامنے کر دیا۔ میں نے اسے پکڑتے ہوئے کہا۔

"میں نے آج تک سیل فون استعمال نہیں کیا، اس لئے مجھے اس کے بارے میں اتنا پتہ نہیں ہے۔"

"یہ تو آج کل عام ہو گیا ہوا ہے۔ تم نے کیوں نہیں استعمال کیا اب تک۔" اس نے طنزیہ

لہجے میں پوچھا۔

”ضرورت ہی نہیں پڑی۔“ میں نے سکون سے جواب دیا

”تم اس طرح بیابانوں میں رہتے ہو، پھر بھی کسی کو فون ...... مطلب کبھی اپنے محکمے سے بھی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی؟“ اس نے کافی حد تک حیرت بھرے انداز میں پوچھا تو میں نے اسی سکون سے کہا۔

”محکمے سے رابطہ کرنے کا مطلب کوئی مزید حکم لینا، جب مرضی واپس جاؤ بس اپنی رپورٹ دو تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ میرا کوئی ہے نہیں، جس سے میں رابطہ رکھوں۔ اس لئے......“

”مطلب روہی سے باہر اب تک تمہارا کوئی رابطہ نہیں ہے۔“ میری پشت سے پروزاں کی حیرت بھری آواز ابھری تو میں سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے اسی سکون سے جواب دیا۔

”تمہارے سامنے ہے، میرے پاس فون ہی نہیں تو رابطہ کیسے ہوگا۔“

”حیرت ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوئی اور پھر بولی، ”تم کسی سے بھی سیکھ لینا۔“

”نہیں جب مجھے ضرورت ہوگی میں خود خرید لوں گا۔“ میں نے کہا اور وہ ڈبہ واپس کر دیا۔ اس نے واپس نہیں پکڑا بلکہ بولی۔

”نہیں رکھو اپنے پاس۔“

”بی بی جی اس فون کے لئے نیا سم کارڈ لیا ہے، جس سے یہ چلے گا؟“ ڈرائیور نے کہا تو پروزاں نے تیزی سے کہا۔

”نہیں وہ تو نہیں لیا؟ چلو موڑ گاڑی، وہ سم کارڈ لے لیں۔“

اس نے کہا ہی تھا کہ ڈرائیور نے گاڑی موڑی اور شہر کی جانب گامزن ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ایک دوکان سے سم کارڈ لیا اور واپس چل دیئے۔

سہ پہر ہو رہی تھی جب ہم واپس بستی چراغ شاہ کے قریب پہنچے تھے۔ تبھی پیروزاں نے کہا۔ "ہم اتنی جلدی واپس پتہ کیوں آ گئے ہیں؟ حالانکہ ہم نے دو چار دن رہنا تھا ابھی شہر میں......"

"تم نے بتایا ہی نہیں؟" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"مجھے پتہ چلا ہے، ان راجستانیوں نے رنّو بوہڑ کے ساتھ مل کر چالیس گائیوں کو پکڑ کر قبضہ کر لیا ہے۔ انہوں نے میرن شاہ کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ اگر ہمت ہے تو لے جاؤ۔" اس نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

"تو میرن شاہ نے کیا جواب بھیجا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا تو ابھی پتہ نہیں، یہ تو وہیں جا کر معلوم ہوگا۔ میرا خیال ہے انہوں نے اب سیدھے سیدھے ہمیں للکار دیا ہے۔" وہ دبے دبے لہجے میں بولی تو میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"پیروزاں مائی، یہ کون سا یہاں نئی بات ہے، ایسا تو ہوتا رہتا ہے۔ جو کوئی بھی خود کو طاقتور ثابت کرنا چاہتا ہے، وہ ایسا ہی کرتا ہے۔"

"میرے خیال میں یہ انہوں نے اس مقصد کے لئے نہیں کیا۔" وہ سوچتے ہوئے انداز میں بولی تو میں نے پوچھا۔

"پھر اور کس لئے ایسا کیا انہوں نے؟"

"میں میرن شاہ سے بات کر لوں، پھر اصل بات کا پتہ چلے گا۔" اس نے کہا اور پھر

ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔

فوزیہ مجھے ڈیرے کے پھاٹک پر اتار کر آگے بڑھ گئی۔ ڈیرے میں ایک جانب چھپر کے نیچے میری جیپ کھڑی تھی۔ میں اندر گیا تو اکیلا بابا خیر دین ہی ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر مصافحہ کرتے ہوئے بڑے اشتیاق سے بولا۔

"ہو آئے ہو شہر سے.......؟"

"ہاں بابا، پر کہیں ادھر اُدھر نہیں جا سکا، بس گئے اور واپس آ گئے۔" میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"پانی لاؤں تمہارے لئے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، ابھی مجھے پیاس نہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے بابا خیر دین کے چہرے پر دیکھا اور پھر تجسس سے پوچھا۔ "کیا پیروزاں مائی کی گائیں چوری ہو گئی ہیں؟"

"ہاں رات ہی ہوئی ہیں، وہ جو ساتھ والی بستی میں باڑہ ہے نا وہاں سے چور رات لے گئے تھے۔"

"کوئی چوکیدار نہیں تھا وہاں پر؟" میں نے پوچھا۔

"دو بندے تھے، انہیں باندھ کر پھینک گئے۔ اور گائیں لے گئے۔" بابا خیر دین نے بتایا اور میرے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ کر وہ پورا واقعہ سنانے لگا، میں سنتا رہا، حالانکہ اس تفصیل میں میری کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ سورج ڈوبنے والا ہو گیا۔ بابا خیر دین میرے لئے کھانا لانے چلا گیا اور میں نے اپنا بیگ اٹھا کر اندر رکھ دیا۔

میں اس چوری کے بارے میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ رنگو بوہڑ اور وہ راجھستانی مجھے نہیں بھول پا رہے تھے۔ وہ شاید پیروزاں والے معاملے کو پس پشت ڈال کر پہلے مجھے پکڑ کر

قتل کرنا چاہتے تھے۔ ان گائیوں کو پکڑ کر یا تو وہ یہ دباؤ ڈالیں گے کہ مجھے ان کے حوالے کیا جائے۔ ممکن ہے پیروزاں یا میرن شاہ ان گائیوں کے عوض میرا سودا کر دیتے یا پھر ان کے سامنے ڈٹ جاتے۔ ظاہر ہے اس کا نتیجہ ایک لڑائی تھا جس میں نجانے کتنے مارے جاتے۔

بابا خیر دین کا لایا ہوا کھانا کھا کر میں لیٹ گیا۔ میں یہ سوچ رہا تھا اور کسی ایسی ہی بات کا انتظار کرنے لگا کہ پیروزاں یا پھر میرن شاہ آئے گا اور ایسی ہی کوئی بات کرے گا۔ یہی سوچتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ میرن شاہ کے جو غنڈے ادھر ڈیرے پر دکھائی نہیں دیئے تھے۔ خرگوش کے شکار کے بعد ان میں یہاں آس پاس کوئی بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ لوگ آخر گئے کہاں؟ کہیں کہیں بستی میں ہیں یا انہیں کسی کام پر لگایا ہوا ہے؟ جب سے بختاوران کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، اس کا خاص غنڈہ سجان بھی دکھائی نہیں دیا تھا، وہ کہاں گیا؟ سب سے بڑھ کر وہ نشئی مہر خان، جس سے میری فقط ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ یہ سب کہاں تھے؟ میرے خیالات کے رَو ابھی کی جانب تھی کہ بابا خیر دین نے آ کر بتایا۔

”میرن شاہ تو نہیں ہیں آج یہاں پر، کوئی پنچایت تھی ادھر گئے ہیں رات پتہ نہیں آتے ہیں یا نہیں۔ بی بی سمن نے کہا ہے کہ ذرا خبردار ہو کر رہوں۔“

”ٹھیک بابا، آج تم سے کوئی پرانی باتیں سنیں گے۔“ میں نے پرشوق انداز میں کہا تو وہ چند لمحے میری جانب دیکھتا رہا پھر سکون سے بولا۔

”پھر کبھی سہی پرانی باتیں۔ مجھے ساتھ والی بستی میں جانا ہے۔“ بابا نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ پیروزاں نے اسے جان بوجھ کر بھیجا ہے تا کہ وہ یہاں آ سکے۔ اس گھر کی گھمبیریاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں۔ لیکن جو بھی ہو رہا تھا وہ میرے حق میں تھا اس لئے میں اب سکون سے یہ تماشا دیکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت میرا من چاہا کہ میں زمان مومل کے پاس جاؤں اور جا کر

اپنے طور پر تصدیق کروں کہ وہ تو بھوڑ کیا چاہتا ہے۔ کیونکہ زمان کا رابطہ اس سے تھا۔ تبھی میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چل پھر تجھے چھوڑ دوں گا رستے میں۔"

میں اور بابا خیر دین جیپ میں بیٹھے اور چل دیئے۔ میں نے بابا خیر دین کو اتار اور زمان موبل کے پاس جا پہنچا۔ وہ اس وقت پیڑھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

"اچھا ہو گیا تو آ گیا ہے؟"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے اس کے سامنے پڑے پیڑھے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ دھیمے سے بولا۔

"تجھے پتہ تو چل گیا ہوگا، ورنہ اتنی جلدی واپسی نہ ہوتی تمہاری۔"

"بات تو بتا، ایویں تجسس نہ پھیلا۔" میں نے اکتاہٹ سے کہا۔

"وہی پیروزاں کی کاٹیوں والا معاملہ۔" اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ مجھے اس نے بتا دیا تھا۔"

"ایک تو تیرے پاس فون نہیں ہے ورنہ میں تجھے پہلے ہی بتا دیتا۔" اس نے پرجوش انداز میں کہا۔

"یار عجیب بات ہے، پیروزاں نے مجھے آج ایک فون دیا ہے، بلکہ سم کارڈ بھی لے دیا ہے۔ مگر مجھے چلانا نہیں آتا۔" میں نے سکون سے کہا۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا، میں تجھے سکھا دوں گا، مگر میں جو بات تمہیں بتانے لگا ہوں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔" اس نے مزید دھیمے لہجے میں کہا۔

"وہ کیا بات ہے؟" میں نے حیرت اور تجسس سے پوچھا۔

"مجھے نا...... آج فون آیا تھا رنّو بھوہڑ کا...... وہ بگا راجستانی اسی کے پاس ہے نا...... باقی راجستانیوں کے ساتھ...... ادھر اُدھر کے لوگ بھی اس کے ساتھ مل گئے ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا...... ان گائیوں کے عوض...... وہ تجھے مانگیں گے۔" اس نے ہولے ہولے اپنی بات پوری کی۔

صبح جب میں نے یہ خبر سنی تھی تب مجھے یہی شک ہوا تھا۔ لیکن یہ اتنی بے وقوفی والی بات تھی۔ لیکن ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ لہذا میں نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا۔

"یار، تم سوچ سکتے ہو کہ وہ چالیس گائیوں کے لئے مجھے ان کے ہاتھ دے دیں گے؟"

"پاگل ہو تم، ان کے لئے بندہ مارنا کوئی سا مشکل ہے، اور پھر تیرا کون ہے ادھر، تمہارے حصے سے کچھ بھی کہہ دیں گے۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"ایک بات ہے یار؟" میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کیا......؟" اس نے ہنکارہ بھرنے والے انداز میں کہا۔

"یہ بات تم مجھے کیوں بتا رہے ہو، حالانکہ تمہیں پتہ ہے اگر اس کی بھنک بھی میرن شاہ کو مل گئی تو وہ تجھے معاف نہیں کرے گا۔" میں نے کہا۔

"دیکھ ان راجستانیوں کے ساتھ میں نے کافی کام کیا ہے۔ وہ سب مجھے جانتے ہیں، اس کا پتہ میرن شاہ کو بھی ہے۔ یہ ان کے ساتھ دشمنی تو پیروزاں مائی کی ہوئی ہے نا۔ آج نہیں تو کل یہ بات وہ تمہیں بتا دیں گے۔" زمان نے اطمینان سے کہا تو میں نے چند لمحے سوچا پھر اسی سے پوچھا۔

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"اب یہ تم دیکھو، تمہیں کیا کرنا ہے، چپ چاپ راتوں رات یہاں سے نکل جاؤ یا پھر آنے والے خطرے کا مقابلہ کرو۔" زمان نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا۔

"بات تو تمہاری سوچنے والی ہے، خیر، وہ صبح کیا کرتے ہیں، دیکھ لیں گے۔اس کے بعد ہی میں فیصلہ کروں گا۔"

"وہ تیری مرضی ہے۔" زمان موہل نے اطمینان سے کہا پھر اسی موضوع پر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

جب رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا، میں اٹھا اور ڈیرے کی طرف چل دیا۔

ڈیرے پر پہنچ کر میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ لاشعوری طور پر میں پیروزاں کا انتظار کر رہا تھا لیکن نجانے کیوں مجھے بے چینی سی تھی۔ میرے اندر کا شخص مجھے کچھ ایسا احساس دے رہا تھا جس سے مجھے خطرے کی بو آ رہی تھی۔ اگر زمان موہل مجھے نہ بتاتا تو شاید میں ایسا خطرہ محسوس نہ کرتا۔ میں کچھ دیر تک چارپائی پر لیٹا رہا، پھر کمرے میں چلا گیا۔ میرن شاہ کا دیا ہوا پسٹل اندر پڑا تھا۔ میں نے وہ اٹھایا تو میری نگاہ پیروزاں کے دیئے سیل فون پر پڑی۔ ابھی میں نے اس میں سم کارڈ نہیں ڈالا تھا۔ میں نے اسے وہیں رکھا اور پسٹل نیفے میں اڑس لیا۔ پھر ایک چادر لے کر باہر آ گیا۔ میں کچھ دیر تک وہیں کمرے کے باہر کھڑا رہا پھر چلتا ہوا پھاٹک سے باہر چلا گیا۔

وہ چاندنی رات نہیں تھی۔ ملگجے اندھیرے میں چلتا ہوا سامنے ٹیلے پر جا کر بیٹھ گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے ڈیرے کے اندر کا کمرہ دکھائی تو دے رہا تھا لیکن پوری طرح نہیں۔ اگر کوئی

آ کر مجھے روشنی کر کے دیکھتا تو میں ضرور احساس کر لیتا۔ میں نے وہ چادر وہیں ٹیلے پر بچھائی اور لیٹ گیا۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ سو میں اپنی پرانی یادوں کو سوچتا ہوا وہیں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ رات کا دوسرا پہر بھی ختم ہو گیا۔

رات ختم ہونے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ آسمان پر تاروں کی چال بتا رہی تھی کہ دو گھڑی بعد صبح ہو جانے والی ہے۔ لیکن ڈیرے میں کہیں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی تھی۔ نیند کا غلبہ مجھ پر طاری ہونے لگا تھا۔ جسم بھی سست پڑنے لگا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شاید مجھے نیند کا ایک جھٹکا لگا تھا لیکن اچانک میرے سارے حواس بحال ہو گئے۔ ڈیرے کے دائیں جانب سے مجھے کسی جیپ کی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کوئی جیپ ہے، اتنی دیر میں وہ جیپ ڈیرے کے پھاٹک پر آ کر رُک گئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس بند تھیں۔ میں پوری طرح چوکنا ہو گیا۔ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ میرن شاہ کے لوگ ہوتے تو بلاشبہ ان کی ہیڈ لائٹس جل رہی ہوتیں۔ جیسے سجان اور اس کے کارندے تھے۔ انہوں نے جیپ اندر لے جانا تھی۔ بنا روشنی کے ڈیرے کے باہر جیپ کا کیا کام؟ میں نے نیفے سے پسٹل نکال لیا اور پوری توجہ سے اس جانب دیکھنے لگا۔

جیپ سے نجانے کتنے لوگ اُترے، وہ چار پانچ تھے یا کم زیادہ، اس کا مجھے اندازہ نہیں ہوا وہ پھاٹک کھول کر اندر گئے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آ کر جیپ میں بیٹھے اور چل دیئے۔ میں پوری توجہ سے انہیں دیکھتا رہا۔ انہوں نے جیپ موڑی نہیں سیدھے چلتے چلے گئے۔ کافی آگے جا کر انہوں نے ہیڈ لائٹس روشن کر لیں اور پھر تیزی سے میرن شاہ کے گھر کی جانب سے نکلتے چلے گئے۔ جس وقت وہ میرن شاہ کے گھر کے قریب گئے تھے، تب کتے بھونکنے لگے۔ وہ بھی کچھ اس طرح بھونکے تھے کہ ان کے بھونکنے میں شدت

نہیں تھی۔ ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی مانوس ہو۔ کیا وہ میرن شاہ کے لوگ تھے؟ یہ سوال میرے ذہن میں اٹک گیا۔ اس کا جواب مجھے فوری طور پر نہیں مل سکتا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے ان حالات کو سوچ رہا تھا۔

☆......☆......☆

دن کا اجالا پھیلنے میں ابھی تھوڑا وقت تھا۔ بستی کی مسجد میں سے اذان کی صدا گونج اٹھی تھی۔ گہرے سناٹے میں یہ گونجتی ہوئی آواز اگرچہ ہلکی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے لگا جیسے ہر جانب تقدس پھیل گیا ہو۔ میں نے اٹھ کر چادر سمیٹی، پسٹل نیفے میں رکھا اور ڈیرے کی جانب چل دیا۔

رات جب میں یہاں سے نکلا تھا تو کمرے کی کنڈی لگا کر گیا تھا لیکن اس وقت وہ کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے دروازے کو ہلکا سا دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ ممکن ہے اندر کوئی ہو؟ اس خیال سے میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میں دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ رہائش گاہ کی دیوار میں ہلکے سے میرا نام پکارا گیا۔ میں نے اس جانب دیکھا تو مجھے باورچی دکھائی دی۔ وہ تیزی سے اپنا ہاتھ ہلا کر مجھے اپنی جانب بلا رہی تھی۔ میں اس طرف بڑھ گیا۔ میں جیسے ہی اس کے پاس پہنچا اس نے کہا۔

"آجا، اندر آجا۔"

"اندر، مطلب کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کہہ رہی ہوں نا آجا۔" اس نے کہا اور پلٹ گئی۔ میں دروازہ پار کر کے اندر چلا گیا۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ایک جانب بنے ہوئے باورچی خانے میں لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک سٹور ٹائپ کا کمرہ تھا۔ وہ اس کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے

بولی، "ادھر، اندر ہو کر بیٹھ جا دروازے کے پاس، وہ پیڑھا لے لو۔"

"گھر میں......" میں نے پوچھنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کوئی بھی نہیں ہے سوائے اماں سکینہ کے۔ پیر وڈاں بھی رات کی نہیں ہے، میرن شاہ تو کل شام کا نہیں ہے۔"

"اگر کوئی اور آگیا تو میرا کچھ نہیں جائے گا، تجھے ہی پوچھیں گے۔" میں نے پرسکون ہو کر ایک پیڑھے پر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں اتنے قریب تھے کہ ہولے ہولے کی جانے والی باتیں سنائی دی جا سکیں۔

"ابھی کوئی نہیں آئے گا، آیا بھی تو اسے پتہ نہیں چلے گا۔" اس نے کہا اور چارپائی کے سامنے بیٹھ گئی تب میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اچھا جلدی بات کیا کہنا ہے، اگر کوئی آگیا تو مشکل ہو جائے گی؟"

"رات تم کہاں تھے؟" اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے دھیمے سے پوچھا۔

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"میں رات کئی بار گئی ہوں تمہیں دیکھنے لیکن تم کہیں نہیں تھے۔ کمرے کی کنڈی لگی ہوئی تھی، پھر مجھے لگا کوئی ہے، میں انہیں پہچاننے کی کوشش کرتی رہی ہوں لیکن وہ میری پہچان میں نہیں آئے۔ وہ کوئی تیرے جاننے والے تھے کیا۔" اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، میں تو رات ڈیرے پر تھا ہی نہیں۔" میں نے بتایا تو اس کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔ وہ میری جانب یوں دیکھنے لگی جیسے کوئی احمق دیکھتا ہے۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"علی، تم بچ جاؤ، یا بھاگ جاؤ یہاں سے......"

”ہوا کیا ہے مجھے بتاؤ بھی۔“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”رات جو بندے آئے تھے، وہ تیرے دوست نہیں ہو سکتے۔تم رُخو بھوہڑ کو نہیں جانتے، وہ بہت گندہ بندہ ہے۔“ اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

”میں نے وہ بندے دیکھے ہی نہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں،تم ہی بتا رہی ہو۔“ میں نے صاف مکرتے ہوئے کہا۔

”دیکھ، چاہے کچھ ہو جائے، پیروزاں اور میرن شاہ ایک دوسرے کو نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ لوگوں کے لئے چاہے جتنے دشمن بن جائیں لیکن اندر سے ایک ہی ہیں۔ یہ مت بھولنا کہ یہ ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔“

”تمہارا خیال ہے وہ بندے میرے دشمن بن کر آئے تھے؟“ میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی۔

”میں یہ تو نہیں کہہ سکتی لیکن یہ جو پیروزاں کے طور ہیں نا یہ مجھے بڑے غلط لگ رہے ہیں“

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”میں تجھے رات اس لئے بار بار دیکھنے جا رہی تھی کہ تجھے بتا سکوں پیروزاں مجھے اپنے ساتھ بہاول پور کیوں لے کر گئی تھی۔ تاکہ تجھے خبردار کر سکوں کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔“ اس نے ہولے سے کہا۔

”کیا چل رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اسے بچپن سے جانتی ہوں، وہ کتنی خبیث ہے، یہ بھی مجھے پتہ ہے۔ وہ مجھے تمہارے ساتھ صرف اس لئے لے کر گئی تھی کہ اگر تم میں اور مجھ میں کوئی بات ہے تو اسے پتہ چل جائے۔ اس کے لئے اس نے کوٹھی کے سارے ملازمین کو ہدایت کر دی تھی۔ یہ تو میری ایک

پرانی سہیلی نے بتادیا جواب وہاں ماں باپ کے ساتھ ہے۔ ورنہ بات کھل جانے پر وہ......'' وہ کہتے کہتے رُک گئی تو میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ ایسا کیوں کرے گی؟''

''تم نے اسے خوش کیا؟ جو وہ چاہتی ہے تم نے پورا کیا؟؟ اگر تم نے اسے دھتکار دیا ہے تو کیا یہ اس کی بے عزتی نہیں؟؟ اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میرے کوئی ایسے تعلق تو نہیں بن گئے۔ میں ساری بات سمجھ گئی۔ تم اس کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہو۔ وہ اب تمہیں کسی بھی وقت مروا سکتی ہے۔'' اس نے دبے دبے جوش سے کہا تو میں نے دھیمے سے پوچھا۔

''تم مجھے یہ اطلاع کیوں دے رہی ہو؟''

میں نے کہا تو اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا جیسے میری بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو، ایک دم سے اس کا چہرہ غصے سے بگڑ گیا پھر اگلے ہی لمحے اس نے گھما کر تھپڑ میرے مارا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ مجھے کان اور گردن پر جلن محسوس ہونے لگی۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دکھ، مایوسی اور غصے میں کہا۔

''تجھے مر ہی جانا چاہئے بس...... چلے جاؤ یہاں سے۔''

''ساوری، یہ تم نے کیا کیا، میں نے تو......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے غصے کی انتہا میں کہا

''بس تم چلے جاؤ یہاں سے، مرو جیو، یا جو مرضی کرو...... جاؤ۔''

اس نے منہ پھیر لیا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ اس کا ردعمل بڑا جاندار تھا۔ اتنی شدت تو ابھی میں نے بھی نہیں سوچی تھی۔ وہ دودھ بلونے لگی۔ میں کچھ دیر بیٹھا رہا پھر ہولے سے کہا۔

''ساوری، چل معاف کر دے، غلطی ہوگئی، میں نے تو یونہی پوچھا تھا۔''

''میں نے کہا نا اس وقت میرے سامنے سے چلا جا، تو بس چلا جا۔'' لفظ اس کے منہ ہی

میں تھے کہ باہر ہلکا سا کھٹکا ہوا، جیسے کوئی صحن میں آگیا ہو۔ وہ زور زور سے دودھ بلونے لگی۔ میں نے آواز پر کان دھرا تو باہر کسی کے کھنکارنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی قدموں کی چاپ ابھری، تب ساوری نے مجھے پیچھے دھکیل کر دروازہ بند کرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"چپ رہنا۔"

اس کے ساتھ ہی قدم باہر تک آگئے۔ میں دروازے کی درز میں سے باہر دیکھنے لگا۔ تبھی آواز ابھری۔

"ساوری پتر......"

"آ چاچا، میں ادھر ہوں۔" اس نے کہا تو اس کے ساتھ ایک بوڑھا چرواہا دودھ کا مٹکا اٹھائے اندر آگیا۔ اس کے مٹکا رکھا اور بنا کچھ کہے واپس پلٹ گیا۔ بلاشبہ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ اس کے جاتے ہی ساوری نے دروازہ کھول دیا۔ پھر ہولے سے بولی۔

"اب دن چڑھ جائے گا، تم جاؤ۔ میں نے تجھے خبردار کر دیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام جاؤ......"

میں اٹھا اور احتیاط سے ادھر ادھر دیکھ کر ڈیرے تک جانے والا دروازہ پار کر گیا۔

دن کا اُجالا پھیل چکا تھا جب بابا خیر دین میرے لئے کھانا لے کر آیا۔ میرے چہرے پر شاید ضرورت سے زیادہ سنجیدگی تھی۔ مجھے اس وقت احساس ہوا جب بابا خیر دین نے ٹرے میرے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"خیر تو ہے نا پتر، بڑی گہری سوچ میں ہو؟"

"نہیں بابا، بس رات سے یہی سوچ رہا ہوں کہ میں نے اپنا کام ذرا سا بھی نہیں کیا، ایویں ہی خواہ مخواہ ان کے چکروں میں پڑ گیا ہوں۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"بس یہی تو سب سے بڑا مسئلہ ہے، یہاں کسی کو کچھ سوجھتا ہی نہیں۔" اس نے ذرا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں تو سوچ رہا ہوں واپس چلا جاؤں۔" میں نے کہا تو وہ ایک دم سے مرجھا گیا، جیسے مجھ سے یہ امید نہ ہو، پھر کچھ دیر بعد وقفے سے بولا۔

"ہاں بہتر، تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔"

میں نے ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے نگاہیں پھیر کر باہر کی جانب لپک گیا تھا۔ میں اس کی بات نہیں سمجھ سکا۔ لیکن اس کا لہجہ بہت کچھ بتا رہا تھا یا پھر میں اپنے تئیں خود ہی اندازہ لگا بیٹھا تھا۔

مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں خطرے میں گھر گیا ہوں۔ میرا دشمن میرے سامنے تھا۔ اب مجھے انتظار صرف اس بات کا تھا کہ مجھ پر یلغار کس طرف سے ہوتی ہے۔ رات میں اپنے اندازے کے باعث ایک حملے سے بچ گیا تھا۔ مگر میں یہ پوری طرح یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ لوگ میری خاطر آئے تھے؟ ممکن ہے ان کا ہدف کوئی دوسرا ہو۔ مجھے زمان سوہل کی طرف جانے کا خیال آیا۔ اس وقت وہی ایک شخص اہم تھا۔ وہ چاہے بھول پن میں مجھ سے ساری باتیں کہہ رہا تھا یا کسی کا پیغام مجھ تک پہنچا رہا تھا جو بھی تھا، اس کی باتوں سے کوئی نہ کوئی سرا ملنے کی امید ضرور تھی۔ بابا خیر دین وہاں سے جا چکا تھا۔ میں اٹھا اور سیل فون والا ڈبہ اٹھا لیا۔ میں ایسا پاگل نہیں تھا کہ سیل فون کے بارے میں جانتا ہی نہ تھا۔ جس طرح میں بہت کچھ سوچ کر یہاں پسٹل تک اپنے ساتھ نہیں لایا تھا، اسی طرح میں نے سیل فون بھی ساتھ نہیں لیا تھا۔ میں خالی ہاتھوں کے ساتھ اس علاقے میں آیا تھا۔ صرف میرے پاس حوصلہ تھا اور میرے من میں وہ سلگتا ہوا ہدف تھا جسے میں نے حاصل کرنا تھا۔ میں جانتا تھا کہ سیل فون کس

بلا کا نام ہے۔ یہ اگر بندہ کو چھپا بھی لیتا ہے تو بالکل ظاہر بھی کر دیتا ہے۔ یہ جدید ٹیکنالوجی اسی کی جو اس کے بارے میں انفارمیشن رکھتا ہے۔ میں تیزی سے وہ ڈبہ کھول رہا تھا تاکہ سیل فون کو کھول کر دیکھوں۔ یہیں مجھے پتہ چل جانا تھا کہ پیروزاں کی نیت کیا ہے؟ میں نے ڈبہ کھولا، اس میں سے سیل فون نکال لیا۔ بظاہر اس پر کوئی ایسا نشان نہیں تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ اس فون کو اندر سے کھولا گیا ہے۔ میں نے اندر تک اسے دیکھا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس فون کے ساتھ "چھیڑ چھاڑ" کی گئی تھی۔ اگر میں اس میں سم کارڈ ڈال کر اپنے ساتھ لے کر پھرتا تو میرے بارے میں ہر وقت پتہ چلتا رہتا کہ میں کہاں پر ہوں۔ پیروزاں کے ذہن میں کیا تھا؟ اب یہی فون اس کی نیت کو سامنے لانے والا تھا۔ میں نے وہ ڈبہ بند کیا۔ اسے جیب میں رکھا۔ بسمل نیچے میں اتر سا اور جیپ لے کر ڈیرے سے نکلتا چلا گیا۔

میں جس وقت پھاٹک سے نکلا تھا، اسی وقت میری نگاہ سانول پر پڑی جو اپنے ریوڑ کے ساتھ ببول کے درخت تلے کھڑا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر جیپ روک دی۔ وہ پہلے تو میری جانب نہیں دیکھ رہا تھا لیکن جیپ رک جانے پر اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی نگاہوں میں نفرت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر یوں منہ پھیر لیا جیسے مجھ سے کوئی سروکار نہ ہو۔ وہ جیسا بھی تھا، پہلے کبھی اس نے میری طرف یوں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے جیپ کو اسٹارٹ ہی رکھا اور اتر کر اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر رخ میری جانب کر لیا۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا تو اس نے بڑی بے دلی سے جواب دیا۔ تب میں نے پوچھا۔

"یار، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم کیوں مجھے ایسے دیکھ رہے ہو؟"

"او جاؤ جاؤ، اپنا کام کرو۔ مجھے تم سے بات نہیں کرنی۔" اس نے نفرت آمیز لہجے میں کہا تو میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی طرف سے ایسا اظہار میرے لیے ناقابل فہم تھا۔ وہ

اگر پہلے کی مانند کسی خوف کے باعث مجھ سے بات نہ کرنا چاہتا تو اس کی سمجھ آتی تھی لیکن وہ اس قدر نفرت سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا، یہ میرے لئے عجیب بات تھی۔

''یار بات سن، میری تم سے ایسی کیا دشمنی ہے کہ تم مجھ سے بات کرنا ہی پسند نہیں کرتے ہو؟'' میں نے عجیب بے چارگی سے کہا تو اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تیری میری ایسی دوستی بھی کیا ہے کہ میں تم سے بات کروں۔ جاؤ اپنا کام کرو۔''

اس کے لفظ پہلی بار مجھے دکھ دے گئے۔ اس قدر حقارت، نفرت اور طنز بھرا لہجہ مجھ سے برداشت ہی نہیں ہو پایا۔ میں بنا کچھ کہے پلٹ کر جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ میرا دماغ سلگنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

''لے یوں اس کو چلاتے ہیں دیکھ...... بتا کوئی نمبر اگر کوئی تجھے یاد ہے۔'' زمان موہل نے سیل فون کو روشن کرتے ہوئے کہا۔ وہ سم کارڈ ڈال چکا تھا اور اب مجھے کال کرنے کا طریقہ سمجھا رہا تھا۔ میں چبوترے پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ مجھے ایک نمبر یاد تھا میں نے وہ بتا دیا۔ اس نے تیزی سے وہ نمبر پش کئے اور میرے کان سے لگاتا ہوا بولا۔ ''دیکھو دوسری جانب بیل جا رہی ہے۔''

''یار اتنا تو میں جانتا ہوں۔'' میں نے سیل فون اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر ٹون جانے کی آواز سنتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد دوسری جانب سے فون ریسیو کر لیا گیا۔ وہ چاچا عبدالمجید تھا۔ جس کے پاس میرا بچپن گزرا تھا۔

''ہیلو چاچا، میں جلی بات کر رہا ہوں۔''

''اوئے پتر کی حال اے تیرا، کتھے گواچ گیا اے۔''

''بس چاچا روزی روٹی کے چکر میں یہاں روہی آیا تھا۔ نوکری جو کرنی ہوئی۔ اب یہاں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

"کیسے دن گزر رہے ہیں، موسم کیسا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"موسم پہلے تو اچھا تھا، بڑا پرسکون...... لیکن اب کافی سخت ہو گیا ہے۔" میں نے جواب دیا تو چاچا نے پوچھا۔

"کیا خیال ہے، واپس کب آنا ہے؟"

"دیکھتے ہیں، واپس آنا ہے یا آگے کوئی کام نکل آتا ہے۔" میں نے جواب دیا تو دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ پھر چند لمحوں بعد چاچا بولا۔

"میرے لائق کوئی کل بات؟"

"بس چاچا اپنی خاص دعا میں یاد رکھنا۔ موسم کافی سخت ہے، جلدی جلدی کام ہو جائے اب بھی پتہ نہیں میں کہاں کہاں پہ ہوں گا۔"

"چل ٹھیک ہے پھر، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میری جانب سے بھی فون بند ہوا تو زمان مومل تیزی سے بولا۔

"یوں بات ہو جاتی ہے۔ جب کسی کا فون آ جائے تو یوں سنتے ہیں، دیکھو، میں کال کرتا ہوں تمہیں۔" وہ کچھ دیر تک مجھے فون کے بارے میں سمجھاتا رہا اور میں بڑے تحمل سے اس کی ہر بات سمجھتا رہا۔ اسے یہ باور ہو گیا کہ میں سیل فون کے بارے میں بالکل بھی نہیں جانتا۔ سیل فون والے 'کھیل' سے فراغت ملی تو میں نے پوچھا۔

"سنا پھر رنگو بھوہڑ کی جانب سے کوئی خیر خبر۔"

"میں نے تو بات نہیں کی لیکن اڑتی خبر ملی ہے کہ پیروزاں مائی کی بات ہوئی ہے رنگو بھوہڑ سے۔ اس نے وہی ڈیمانڈ کی ہے، علی کو دے جاؤ اور اپنی گائیں لے جاؤ، یا پھر علی میں ہمت ہے تو آ کر گائیں لے جائے۔"

"یہ ڈھٹو بھوبڑ کی ضد ہے یا پھر ان راستوں کی؟" میں نے پوچھا۔
"اب میں یہ کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس نے بے چارگی سے کہا تو میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر پیڑھے سے اٹھ کر اس کے بیڈ پر لیٹتے ہوئے بولا۔
"یار، میں یہاں پڑا ہوں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"
"جیسے تمہاری مرضی۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں وہیں لیٹا رہا پھر نجانے کب سو گیا۔
میری آنکھ مسلسل فون بجنے سے کھلی۔ میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا تو وہ چاچا عبدالمجید کا تھا۔ میں نے کال پک کی تو وہ میری آواز سنتے ہی بولا۔
"بیٹا میں نے تیرے لئے دعا کر دی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اب تمہارے لئے موسم سخت نہیں رہے گا۔"
"ٹھیک ہے، بس آپ بزرگوں کی دعائیں چاہئیں۔" میں نے منمناتے ہوئے کہا تو چاچا عبدالمجید بولا۔
"ویسے سنا ہے روس میں دودھ مکھن بہت ہوتا ہے۔ کھاؤ پیو اور خوب کسرت کرو۔ تھوڑا جسم بنا کر آنا۔"
"میں بھی سوچ رہا ہوں۔ ویسے کھانے پینے کی فکر نہیں، یہاں بہت کچھ ملتا ہے۔ کسرت تو آج ہی سے شروع کر دوں گا۔"
"یہاں کہیں کوئی ادھر مزار دیکھ لینا، وہاں سے خوب لنگر کھانا، دنوں میں موٹے ہو جاؤ گے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تو میں بھی ہنستے ہوئے بولا۔
"ضرور، کیوں نہیں، لنگر ہی چلے گا۔"

”چلو ٹھیک ہے۔ ہو سکے تو جلدی چکر لگانا۔“ اس نے پیار بھرے انداز میں کہا تو میں نے چند الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

شام ڈھلنے والی تھی، جب میں واپس ڈیرے پر جا پہنچا۔ حسب معمول بابا خیر دین چارپائیاں بچھائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں جیپ کافی پیچھے ہی کھڑی کر کے اس کے پاس بیٹھا ہی تھا کہ اس نے کہا۔

”پتر، میرن شاہ جی تمہارے بارے میں دو بار پوچھ چکے ہیں۔“

”ٹھیک ہے اسے میرے آنے کے بارے بتا دو۔“ میں یہ کہتا ہوا چارپائی پر لیٹ گیا۔ بابا خیر دین اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ میرا کھانا لے کر آ گیا۔ میں کھانا کھا چکا اور بابا خیر دین برتن لے کر جا چکا تو اس کے تھوڑی دیر بعد میرن شاہ آ گیا۔ اور میرے سامنے والی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”یار تمہیں پتہ تو چل گیا ہو گا کہ پیروزاں مائی کی گائیں وہ رنو بھوہڑ اور ان راجستانیوں نے......“

”ہاں میں نے سنا، تیرے پاس اتنے بندے ہیں، تم چھڑوا کیوں نہیں لیتے ہو، ایسے تو کوئی بھی تمہاری گائیں اونٹ مویشی پکڑ کر لے جائے گا۔“

”رنو بھوہڑ نے یہ سب تیری دشمنی میں کیا ہے۔ وہ تجھے مانگ رہا ہے۔“

”پھر کیا سوچا تم نے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی کہ گائیں ان سے واپس لانی ہیں، چاہے جیسے بھی لائی جائیں۔ میں نے چار لوگوں میں بیٹھ کر رنو بھوہڑ سے بات کی، مگر وہاں اس نے تمہاری ضد رکھ دی۔ اور میں تمہیں دے نہیں سکتا، اس طرح سے میری پورے علاقے میں ساکھ ختم ہو جائے گی۔ یوں گائیں بھی نہیں چھوڑی

جا سکتیں، اب سیدھی سیدھی لڑائی بنتی ہے۔وہ میں لڑوں گا۔" اس نے دبے دبے غصے میں کہا۔

"میرے لئے کیا حکم ہے؟" میں نے سکون سے پوچھا۔

"یہ تمہاری مرضی، یہاں رہو، واپس جاؤ یا پھر ہمارے ساتھ لڑو۔" اس نے صاف لفظوں میں کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ میری جانب سے کوئی جواب نہ پا کر بولا، "دیکھو اگر تم وہ گائیں واپس لے آؤ، تو جتنی قیمت بنتی ہے، اس سے دوگنا قیمت میں تمہیں دوں گا، جتنے لوگ ساتھ لے جانا چاہو وہ میں دوں گا۔ جو خرچ آئے کرو۔ یہ اب ساکھ بچانے کا معاملہ ہے۔" اس نے جوش سے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں کل دیکھتا ہوں اس معاملے کو، مجھے بندوں سے ملوا دو، میں کوشش کرتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔" میں نے کہا تو وہ بے ساختہ بولا۔

"یہ ہوئی نا بات، وہ جس کو مانگ رہے ہیں وہی ان سے گائیں لے آئے تو پورے علاقے میں خوف بیٹھ جائے گا۔"

"تو پھر دن ہو گیا، کل مجھے بندے ملوانا، لیکن بہت خاموشی سے دشمن کو پتہ نہیں لگنا چاہئے کہ ادھر کیا ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"صبح کو ڈیرے پر آ جانا، وہیں سب کو ملوا دوں گا۔" اس نے کہا اور پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اٹھ گیا۔

رات کا سناٹا پھیل گیا تھا۔ میں اپنی پوری تیاری کر کے کمرے سے باہر نکلا اور جیپ لے کر نکل گیا۔ میرو ڈاں کا دیا ہوا فون میں نے محفوظ کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا اور میرن شاہ کا دیا ہوا پسٹل میں نے وہیں کمرے میں چھوڑ دیا تھا۔ میرے پاس چند گھنٹے تھے اور انہی چند گھنٹوں میں وہ کچھ کرنا چاہتا تھا، جس سے میں بہت سارے اہداف حاصل کر لینا چاہتا تھا۔

میں پوری گیم سمجھ گیا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مجھے جس طرح گھیرنا چاہ رہے تھے، میں وہی گیم ان پر الٹنا چاہتا تھا۔ میرا رخ بستی چراغ شاہ کے شمال کی جانب تھا۔ وہاں ایک بزرگ کا مزار تھا۔

وہ بزرگ کون تھا؟ اس کا مزار کب سے تھا میں اس کے بارے میں نہیں جانتا تھا لیکن پتہ نہیں کب سے وہاں پر عرس بھی ہوتا تھا اور میلہ بھی لگتا تھا۔ لوگ دور دراز سے وہاں حاضری دینے جاتے تھے۔ مجھے وہاں تک پہنچنے میں تقریباً پندرہ منٹ لگے۔ میں نے جیپ کچھ فاصلے پر پارک کی اور مزار کے احاطے کی جانب بڑھا۔ رات ہونے کی وجہ سے اکا دکا لوگ وہاں پر تھے۔ میں احاطے میں چلا گیا۔ بڑے سارے پکے صحن میں جنڈ کے دو بڑے بڑے درخت تھے۔ جن کے ارد گرد دائرے میں سیمنٹ کی اتنی بڑی منڈیر بنائی ہوئی تھی کہ لوگ وہاں پر بیٹھ بھی جاتے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سو قدم کے فاصلے پر صاحب مزار کا روضہ تھا، جس کا دروازہ اس وقت بند تھا۔ باہر کی جانب کچھ درویش ملنگ لیٹے ہوئے تھے۔ کسی پر گدڑی تھی اور کسی پر نہیں۔ اس وقت ایسی ہی ایک رات کا وحشت ناک منظر میری نگاہوں کے سامنے ابھر گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے چاروں طرف آگ آ گئی ہوں۔ چیختی چلاتی آوازوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا ہوں۔ آہیں، کراہیں اور چیخیں میرے چاروں جانب پھیل رہی ہوں۔ مجھے لگا جیسے میں پھٹ جاؤں گا۔ اچانک سناٹا چیرتی ہوئی مانوس آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”علی بھائی کیسے ہو؟“

”اوہ، شعیب تم، کب پہنچے؟“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میری جانب دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا۔

”ہم کل صبح آئے تھے۔“ اس نے دھیمے سے کہا۔

"رات کہیں تم ہی تو ڈیرے کی جانب......" میں نے پوچھا تو اس نے پہلے میری جانب دیکھا، پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں، ہم نہیں تھے۔"

"تو پھر وہ کون......" میں کہتے کہتے رُک گیا، پھر تیزی سے بولا،" او کے اس کا پتہ بعد میں کرتے ہیں، باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"یہیں ایک بستی ہے، بہادر خان چوھڑ کی وہاں پر ہیں۔" اس نے کہا اور مزار کے احاطے سے باہر جانے کے لئے قدم بڑھا دیئے۔

"کون کون ہیں؟" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"جہانگیر، آفتاب اور مدثر۔" اس نے اختصار سے بتایا۔

"چاچا سے رابطہ ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے ہمیں بتا دیا تھا، ورنہ کل صبح ہم خود تیرے پاس پہنچ جاتے۔ تیرے محکمے کے آفیسر بن کر۔" اس نے کہا اور ہلکا سا قہقہہ لگا دیا۔

"ان کے پاس گاڑی ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، ہے، مگر بات کیا ہے؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔

"انہیں یہاں بلا لو، تب تک میں تمہیں ساری صورت حال بتاتا ہوں۔" میں نے کہا تو اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آر یو شیور......؟"

"بالکل، مکمل کانٹے سے لیس ہو کر آئیں۔" میں نے کہا تو اس نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور کال کرنے لگا۔ ایک آدھ منٹ میں اس نے بات سمجھا دی۔ پھر فون واپس جیب

میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"معاملہ کیا ہے؟"

"پہلی بات تو یہ ہے اس وقت میری جیب میں ایک فون ہے جو مجھے ٹریس کر رہا ہے۔ میں ٹریس کرنے والوں کو دھوکے میں رکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے سمجھایا تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ تب میں اسے بتانے لگا کہ یہاں پر صورت حال کیا ہے۔

☆......☆......☆

ہم طاقتور فور وہیل میں بیٹھے ہوئے درگاہ سے جنوب کی جانب جا رہے تھے۔ یہ وہ راستہ تھا جو رنگو بھوہڑ کے ڈیرے کی جانب جا رہا تھا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اور اس کے راجستانی دوست چوکنا نہ ہوں۔ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ کم از کم میں انہیں غافل نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں نے اپنی جیپ وہیں چھوڑ دی تھی، جس کے ڈیش بورڈ میں پیر وزاں کا دیا ہوا سیل فون پڑا تھا۔ میں نے راستے میں ان چاروں کو اپنے پلان کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ میری بات سمجھ گئے تھے۔ رنگو بھوہڑ کا ڈیرہ تھوڑے سے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ میں نے سامنے دیکھا اور شعیب کو بتایا۔

"وہ دیکھو سامنے، وہاں جو پیلے رنگ کا بلب روشن ہے، وہ ہے ڈیرہ۔"

"کوئی آئیڈیا......" اس نے ہولے سے پوچھا۔

"نہیں، کوئی پتہ نہیں وہاں پر کتنے لوگ ہو سکتے ہیں۔ بس چاردیواری ہے، اس کے اندر مویشی ہوں گے یا پھر چرواہے چوکیدار۔"

"وہ رنگو بھوہڑ......؟" اس نے پوچھا۔

"وہیں جا کر پتہ چلے گا۔"

میں نے کہا تو میری بات سمجھ گیا۔ تبھی اس نے فوروہیل روکتے ہوئے کہا۔

”کیا خیال ہے پھر وہیں جا کر دیکھتے ہیں۔“

کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جو چاہتا ہے کرے، وہ پوری طرح تیار تھے۔ ایک پسٹل اور کافی سارے میگزین لے لئے تھے۔ آفتاب فوروہیل بھگاتا ہوا بالکل پھاٹک کے پاس جا رکا۔ ڈیرے کے اندر سے کتے زور زور سے بھونکنے لگے تھے۔ اندھیرا اتنا گہرا نہیں تھا۔ میرے خیال میں وہاں کوئی بندہ ہوتا تو اب تک اسے جاگ جانا چاہیے تھا۔ اور اگر کوئی جاگ گیا تھا تو پھر وہ انتظار میں تھے۔ جہانگیر نیچے اترا اور اس نے جا کر پھاٹک کھولنے کے لئے دھکیلا۔ عموماً ایسے پھاٹک یا تو کھلے رہتے ہیں یا پھر اندر سے ایک لکڑی پھنسائی ہوتی ہے جسے مقامی زبان میں 'ہوڑا' کہتے ہیں۔ پھاٹک کھلتا چلا گیا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سامنے بڑے سارے صحن میں دو ڈھائی سو مویشی تھے۔ ان میں بکریاں، گائیں، بیل، بھیڑیں اور اونٹ بھی شامل تھے۔ کوئی کھڑا تھا اور کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ آفتاب نے ہارن دیا جو سناٹے کو چیرتا چلا گیا۔ ہمیں امید تھی کہ کوئی نہ کوئی تو باہر آئے گا، پتہ کرے گا۔ کچھ دیر بعد دو نوجوان پھاٹک کے پاس اچانک نمودار ہوئے۔ ایک آگے بڑھا تو دوسرا اس کے پیچھے ٹھہر گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اس کے کور پہ ہے۔ بلاشبہ ان کے پاس ہتھیار تھے۔ لاشعوری طور پر وہ نوجوان ڈرائیور کی جانب گیا۔ وہ ذرا فاصلے پہ اندر دیکھتا ہوا بولا۔

”کیا بات ہے، کون ہو تم؟“

”او یار رُکو بھوجڑ کا ڈیرہ یہی ہے؟“ آفتاب نے جواب دینے کی بجائے پوچھا تو اس نوجوان نے تیزی سے کہا۔

”ہاں یہی ہے، لیکن تم کون لوگ ہو؟“

”یار ہم شہر سے آئے ہیں، اس سے تھوڑا کام ہے۔“ آفتاب نے کہا۔

”وہ تو یہاں نہیں ہے۔ وہ اس وقت اپنے گھر ہوگا۔“ نوجوان نے کہا۔

”یار پھر اسے کیسے پتہ چلے کہ سلمان دوستانہ آیا ہے۔“ آفتاب نے کہا تو اس نوجوان نے پوچھا

”تمہیں اس کے گھر کا پتہ نہیں ہے؟“

”میں پہلی دفعہ آیا ہوں۔ بڑا تنجل خراب ہوئے ہیں، لوگ سے پوچھ پوچھ کر یہاں پہنچے ہیں۔ یار تم تھوڑی مدد کرو اور اسے بتا دو۔“ اس نے سکون سے کہا تو نوجوان تھوڑا تذبذب میں پڑ گیا پھر بولا۔

”تم اندر آنا چاہو تو آ جاؤ، اس سے رابطہ کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ آفتاب نے کہا اور مزید کوئی سوال کیے بنا فور وہیل اندر لے گیا۔ مویشیوں کے درمیان سے کافی راستہ بنا ہوا تھا۔ سامنے چند کچے کمرے تھے۔ جن کے برآمدے میں کچھ لوگ چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پہلے سے جاگ رہے تھے یا ہمارے آنے سے جاگے تھے، یہ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ فور وہیل کی ہیڈ لائٹس میں وہ سبھی دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ایک شخص پر میری نگاہ پڑی تو میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بنگا راجستانی تھا۔ وہی بنگا راجستانی جو مجھے قتل کرنے کے لیے انتہائی بے تاب تھا۔ میں نے ہولے سے سب کو بتا دیا کہ وہ بھی ہمارے لیے ہدف ہو سکتا تھا۔

فور وہیل سے سبھی اتر گئے تھے۔ میں سب سے آخر میں تھا۔ آفتاب سمجھ گیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ وہ چند لوگ تھے۔ ان کے سامنے دیسی شراب کی بوتل کھلی ہوئی تھی۔ چند ایک گلاسوں کے ساتھ جگ اور پلیٹیں دھری ہوئی تھیں۔ وہ موج میں تھے۔ تبھی ایک مقامی نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے وہی سوال جواب شروع کر دیئے جو پہلے اس نوجوان نے کیے تھے۔

اتنے میں وہ نوجوان بھی وہیں آ گئے۔

"یار تیرے پاس فون ہے تو اسے کر لے؟"

"میں اسے کال کر رہا ہوں مگر وہ فون اٹھا ہی نہیں رہا، تم کر کے دیکھ لو، شاید اٹھا لے تیرا فون......" آفتاب نے جواب دیا۔

"چل بگا تو لگا کے دیکھ فون۔" ایک شخص نے کہا تو وہ اپنے جیب سے فون نکالنے لگا۔

ان کے سوال جواب اور باتوں میں ہم نے چاروں طرف اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ کوئی سامنے نہیں تھا۔ کوئی کمرے میں ہوگا تو اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ یہی وہ وقت تھا، جب ہم نے ایکشن لینا تھا۔ میں نے ہلکی سی مخصوص سیٹی بجائی تو سبھی نے ہتھیار نکال کر انہیں کور کر لیا۔

"کوئی بھی نہیں ہلے گا، جو ہلا، وہ مر جائے گا۔" آفتاب نے غراتے ہوئے کہا۔

"کہا تھا نا وہ بڑا شاطر ہے۔" بگا راجستانی نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ نکالا تو وہ خالی تھا۔

"کون شاطر......" آفتاب نے پوچھا۔

"وہی پرویز اں کا دلال، تمہیں اسی نے بھیجا ہے نا۔" اس نے کہا ہی تھا کہ جہانگیر آگے بڑھا اور اس کی گردن پر ہاتھ ڈال کر بولا۔

"میں تیرا باپ ادھر ہی کھڑا ہوں۔ پہچانتا ہو مجھے......چل اٹھ۔" اس نے کہا اور بگا کو چارپائی سے گھسیٹ لیا۔ ایسے میں ایک بندے نے دلیری دکھائی اور کسی شیر کی طرح جہانگیر پہ جھپٹا۔ لیکن تب تک میں نے گنّی اس کے سینے پر ماری وہ اوخ کی آواز کے ساتھ چارپائیوں کے درمیان گر گیا۔

"زیادہ وقت نہیں ہے۔"

میں نے آواز بدل کر کہا تو ہم چاروں نے ان کے ارد گرد فائر کر دیئے۔ وہ ایک دم سے سہم کر چار پائیوں کے ساتھ لگ گئے۔ میں نے بگا کو ٹھوکروں پر رکھا تو وہ مزاحمت کرنے کے لئے اٹھا، میں نے پسٹل کا دستہ اس کے سر پر مارا تو وہیں ڈھیر ہو گیا۔

"چل سب باہر......" مدثر نے فائر کرتے ہوئے کہا تو وہ سبھی اٹھ گئے۔ میں نے بگا کو باندھا اور اسے گھسیٹ کر فور وہیل تک لے گیا، پھر اسے اندر ڈال کر میں نے ایک دوسرے نوجوان کو پکڑا، اسے بھی باندھا اور فور وہیل میں لا پھینکا۔ آفتاب فور وہیل باہر لے گیا۔ ہم باقی تینوں کو لے کر ڈیرے سے باہر آ گئے۔ مدثر نے انتہائی تیزی سے ان کی تلاشی لی۔ ایک کے پاس سے ریپٹر اور دوسرے سے ریوالور نکلا تھا۔

میں نے جس وقت ان کے سامنے پڑی شراب دیکھی تھی، میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ انہوں نے اپنے پاس ہتھیار نہیں رکھے ہوئے، عادی شرابی اپنے پاس ہتھیار یا کوئی تیز دھار آلے کی شے نہیں رکھتا، انہیں یہ پتہ ہوتا ہے کہ وہ نشے میں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ گمان یہی تھا کہ ان کے پاس ہتھیار نہیں ہوں گے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ نکل آیا تھا۔ لیکن یہ کوئی حتمی کلیہ نہیں تھا، کئی عادی مجرم اس وقت ہی جرم کرنے کا حوصلہ پاتے ہیں جب وہ نشے میں ہوں۔

وہ ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ باقی سب بیٹھے تھے تو میں نے پھاٹک کھولنے والے نوجوان سے کہا۔

"اب سمجھے ہو کہ میں کون ہوں؟"

"ہاں تم وہی ہو جو......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے تیزی سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بتا دینا رنگو بھوہڑ کو میں ہیروزا نے بھیجا ہے، میں ان دونوں کو لے جا رہا ہوں۔ اگر اس میں ہمت ہے تو یہ بندے ہم سے لے جائے۔" یہ کہہ کر میں ذرا سا رکا، پھر اسے سمجھاتے

ہوئے بولا، ”اب اس کی اور ہماری دشمنی ہے، مطلب پیروزاں کی......“

”تم انھیں......کہاں...... لے کر...... جا رہے ہو؟“ اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا تو میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

”اگر اسے ہماری دشمنی قبول ہے تو ٹھیک، نہیں تو پیروزاں کی گائیں صبح ہوتے ہی اس کے ڈیرے پر پہنچا دے۔ ہم سمجھ لیں گے، ہماری اور اس کی کوئی دشمنی نہیں رہی، یہ بندے پوری حفاظت سے واپس آجائیں گے۔ ورنہ، وہ اپنا بندوبست کر لے۔“ میں نے کہا اور فوروہیل کی جانب مڑا۔ میں ایک قدم آگے بڑھا یا پھر رکا اور پلٹ کر اس سے کہا، ”اور ہاں یہ بھی کہہ دینا، ہم یہاں موجود لوگوں کو مار کر اس تالاب میں پھینک کر جا سکتے تھے، ان مجبوروں کے ساتھ باندھ کر گولیاں مار دیتے لیکن ہم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس لئے کہ یہ صرف وارننگ ہے، اس کے بعد ہم بخشیں گے نہیں۔“

”ت......تم وہی......جمال ہو جو......اس دن......“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہنا چاہا تو میں نے کہا۔

”وہ کون ہے؟“

”نہیں نہیں کچھ نہیں......“ اس نے تیزی سے کہا تو چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر فوروہیل میں جا بیٹھا تو اسی لمحے آفتاب جیپ لے کر چل پڑا۔

واپسی کے راستے کی اسے کافی سمجھ آ چکی تھی۔ وہ انتہائی تیزی سے دربار سے تھوڑے فاصلے پر جا رکا۔ پھر جیب سے ایک فون سیٹ نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولا۔

”اس سے رابطہ رہے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سیل فون پکڑا اور وہیں اتر گیا۔ مجھے وہاں سے جیپ لے کر بستی

چراغ شاہ جانا تھا۔

میں نے جیپ ڈیرے میں کھڑی کی ہی تھی کہ رہائش گاہ والی دیوار کا دروازہ کھلا اور پیروزاں تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں جیپ سے اترا اور کمرے کے باہر پڑی چارپائیوں کی جانب بڑھا۔ وہ مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی۔ میں اس سے ابھی چند فٹ کے فاصلے پر ہی تھا کہ وہ ہذیانی انداز میں بڑے غصے میں بولی۔

''کہاں گئے تھے تم؟''

''کیوں کیا ہو گیا؟'' میں نے لاپرواہی سے پوچھا۔

''میں کئی بار تمہیں یہاں آ کر دیکھ چکی ہوں، تم یہاں نہیں تھے۔'' اس نے پھر اسی انداز میں پوچھا تو مجھے اچھا نہیں لگا۔ مگر میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی بات پوری کر لے، اس لیے تحمل سے بولا۔

''میں دربار پر گیا تھا۔''

''دربار پر وہاں کیا کرنے گئے تھے؟'' اس بار وہ کافی حد تک بدلے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔ اس کے انداز میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

''لوگ کیوں جاتے ہیں وہاں پر؟'' میں نے جان بوجھ کر بات کو بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''میرا یہ مطلب ہے کہ کم از کم بتا کر جاتے، میں خواہ مخواہ پریشان ہو رہی تھی۔ تمہیں فون بھی کرتی رہی لیکن تم نے فون ہی رسیو نہیں کیا، کہاں ہے تمہارا فون۔'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''اوہو، وہ تو جیپ ہی میں پڑا ہے، میں لاتا ہوں۔''

یہ کہتے ہی میں مڑا اور جیپ کی جانب چلا گیا۔ میں نے جب فون ڈیش بورڈ میں رکھا تھا

اسی وقت 'خاموشی' پر لگا دیا تھا۔ میں نے ڈیش بورڈ سے فون اٹھایا اور لا کر اسے دے دیا۔ اس نے تیزی سے فون میرے ہاتھ سے لیا اور پھر اسکرین روشن کر کے بولی۔

"یہ دیکھو اتنی کالیں کی ہیں تمہیں۔"

"مجھے نہیں پتہ۔"

میں نے لاپرواہی سے کہا تو کچھ لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی۔ میں چارپائی پر جا بیٹھا۔ تو وہ میرے سامنے آ بیٹھی، پھر سکون سے بولی۔

"تمہیں پتہ ہے کہ اس وقت حالات کیسے ہو رہے ہیں؟"

"حالات تو کبھی بھی ایک جیسے نہیں رہتے، جو یہاں ہیں، اس میں منافقت بہت ہے۔ لوگ دھوکا بہت دیتے ہیں۔" میں نے جان بوجھ کر کہا۔

"یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن جب سے رنو بھوہڑ والا معاملہ بنا ہے، حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ میرن شاہ کچھ نہیں کر رہا ہے۔" اس نے کہا۔

"نہیں، وہ تو میرے ساتھ معاملہ کر کے گیا ہے۔ اس نے طے کیا ہے کہ مجھے بندے دے گا۔ کل اس کا فائنل ہو جائے گا۔" میں نے بڑے محتاط انداز میں کہا تو وہ بولی۔

"یہ بات میرن شاہ نے تو مجھے نہیں بتائی، کب ہوئی بات؟"

"ابھی شام کو۔" میں نے بتایا۔

"تو پھر تم تیار ہو؟" اس نے بڑے گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

"ظاہر ہے، اس نے مجھے آفر دی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے میرن شاہ سے ہونے والے معاملہ کی تفصیل اسے بتا دی۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ ساری بات سن کر اس نے کہا۔

"میں پھر پوچھ رہی ہوں کہ تم تیار ہو؟"

"ہاں میں تیار ہوں۔" میں نے حتمی انداز میں کہا۔

"تو ٹھیک ہے، پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ حالات کیا ہو گئے ہیں، صبح بات کرتے ہیں۔" اس نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ میں بہت کچھ سمجھ رہا تھا، ابھی تک دونوں میرے سامنے مکمل نہیں رہے تھے۔ اب صبح ہی ان کا اصل رنگ سامنے آنے والا تھا۔

☆......☆......☆

صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ میں رہائش گاہ کی جانب سے کسی خبر کا منتظر تھا۔ حالات کچھ اس نہج پر آ گئے تھے کہ میں کسی پر بھی اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن نجانے کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ساوری مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی، وہ جو کہتی ہے، وہی سچ ہو سکتا ہے۔ پچھلی صبح جو اس نے اپنے جذبات کی توہین پر جو شدت دکھائی تھی، میں اسے صرف اسی لئے برداشت کر گیا تھا۔ اس کے ذہن میں جو بھی تھا لیکن میرے لئے تو وہ ساوری تھی، جو بتاشے اپنے بھوچھن میں چھپا کر میرے لئے لاتی تھی۔ میں نے ساوری کے بارے میں سوچا تو نجانے میرا من کیوں بھر آیا۔ شاید اب سے ملاقات نہ ہو پائے۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اب میں ڈیرے پر نہیں رہ پاؤں گا۔ رنو بھوہڑ کے ڈیرے پر ہونے والی واردات کی خبر پھیل جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

ایسے میں رہائش گاہ کا دروازہ کھلا اور پروزاں نے جھانکا، کوئی دوسرا نہ پا کر وہ تیزی سے میری جانب بڑھی۔ میں چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے میری جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ سنا تم نے...... وہ رنو بھوہڑ کے ڈیرے پر سے بندے اغوا ہو گئے ہیں۔ کہیں وہ تم نے تو......؟" وہ کہتے کہتے رک گئی تھی پھر ناقابل یقین انداز میں بولی، "مگر وہ چار لوگ تھے

اور تم ...... یہ کیا ہے علی ......؟"

"میں تم سے سن رہا ہوں۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"کہیں یہ کوئی میرن شاہ کی تو چال نہیں؟" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"تم جانو اور تمہارا بھائی، لیکن میں تیری اس بات سے سمجھ گیا ہوں کہ تم بھی مجھ سے دھوکا کر رہی ہو اور تیرا بھائی بھی۔" میرے لہجے میں کچھ اس قدر غصہ تھا کہ اس نے چونک کر میری جانب دیکھا، پھر غضب ناک لہجے میں بولی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"ایک طرف تیرا بھائی مجھے یہ کہہ رہا ہے کہ گوپے پر بندے ملوائے گا اور دوسری طرف مجھے مارنے کیلئے بندے بھیج رہا ہے؟" میں نے غصے میں انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر سرسراتے ہوئے بولی۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا اور لمحہ بھر بعد بولا، "سنو تم دونوں بھائی بہن نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ اب بولو، تم دھوکا دینے والے کو کیا سزا دیتی ہو؟"

اس کے ساتھ ہی میں نے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے نیفے میں سے پسٹل نکال لیا۔ وہ یوں وحشت ناک نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی جیسے پہلی بار موت کو اپنے سامنے دیکھ رہی ہو۔

⚙......⚙......⚙

(قسط نمبر:3)

پیروزاں کی متوحش نگاہوں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس روپ میں بھی اس کے سامنے آ جاؤں گا۔میں نے پسٹل سیدھا کیا، اس کا ہاتھ چھوڑ کر سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔میرے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔میرے کانوں میں چیخیں گونجنے لگیں۔جلتے ہوئے گھر کی آگ سے جو تپش ہوتی ہے، اس سے میرا بدن دہکنے لگا تھا۔وہ گولی جو پسٹل سے نکلنے والی تھی وہ محض ایک گولی نہیں، میری نفرت تھی جو میں پیروزاں کے دماغ میں اتار دینا چاہتا تھا۔میں دانت پر دانت جمائے، شعلہ بار آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔وہ موت کے خوف سے کانپ اٹھی تھی۔اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

"رُک جاؤ علی......" ساوری کی تیز آواز میرے کانوں میں گونج اٹھی۔میں نے دیوانہ وار بھاگ کر آتی ہوئی ساوری کو دیکھا۔وہ ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر آ کے رُک گئی، پھر اکھڑی ہوئی سانسوں میں ہکلاتے ہوئے بولی۔"بی بی سجن کو چھوڑ دو، ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"تم کون ہو گواہی دینے والی؟" میں نے انتہائی تلخی سے کہا تو بولی۔

"سب کچھ غلط فہمی میں ہو رہا ہے۔اگر بیٹھ کر بات سمجھنے کی کوشش کرو تو سب سمجھ میں آ جائے گا۔" اس نے تیز تیز انداز میں کہا۔

"اب اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تو یہ اگلے ہی لمحے مجھے قتل کروانے کا حکم دے دے گی۔یہ صرف دھوکا دے سکتے ہیں۔کسی کا اعتماد نہیں جیت سکتے۔" میں نے نفرت سے کہا تو پیروزاں بولی۔

”ایک بار مجھ سے بات کر کے دیکھ لو، پھر جو تیرا دل چاہے کرنا۔“

”چل آ بیٹھ...... بتا کس طرح تم نے دھوکا نہیں دیا۔“ میں نے اس کا بازو چھوڑتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ پھر ایک طویل اور گہرا سانس لے کر بولی۔

”چل آ، ادھر بیٹھ۔“

ہم دونوں چلتے ہوئے چار پائیوں تک آ گئے۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی اور سادری ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ تبھی پیرو داں نے کہا۔

”میں جب شہر میں تھی، مجھے تب ہی پتہ چل گیا تھا کہ میری گائیں چوری ہو گئی ہیں۔ وہ گائیں رنگو بھوہڑ نے چوری کروائی ہیں۔ یہ بھی مجھے پتہ چل گیا تھا۔ اور یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ اس نے ان گائیوں کے عوض تمہیں مانگا ہے۔“

”پھر تم دونوں بہن بھائیوں نے مجھے......“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولی۔

”میں نے میرن شاہ سے بات ضرور کی تھی لیکن میں ہرگز تمہیں انہیں دینے کی بات تو کیا خود سے الگ کرنے کا سوچ بھی سکتی۔“ یہ کہہ کر وہ سانس لینے کو رکی پھر کہتی چلی گئی، ”میرن شاہ کا مجھے یہی مشورہ تھا کہ میں تجھے دے دوں، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہماری صلح ہو جائے گی۔ سب مسئلے ختم ہو جائیں گے، ہماری کوئی دشمنی نہیں رہے گی۔ کیونکہ ان سے دشمنی میری تھی۔ میرن شاہ کی نہیں۔ مگر میں یہ چاہتی تھی کہ تجھے نہیں دینا، اس کے علاوہ جو بھی بات ہو وہ کی جا سکتی ہے۔ اس پر وہ راجستانی نہیں مان رہے تھے۔“

”جو بھی تھا، مجھے رنگو بھوہڑ کو دینے کا فیصلہ کس کا تھا؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا تو ایک لمحہ میری جانب دیکھا، پھر دھیرے سے بولی۔

”میرن شاہ کا۔“

”مجھ سے بات کی؟“ میں نے تلخی سے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ دھیمے سے بولی۔

”تم بھی اتنی قصور وار ہو جتنا تمہارا بھائی ہے۔ اب میری اور تم لوگوں کی دشمنی ہے۔ بتا دینا اپنے بھائی کو......“ میں نے کہا اور اٹھ گیا۔ میرے سامنے ساوری کھڑی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھا جہاں کسی بھی قسم کے کوئی جذبات نہیں تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا، ”اب بتا اس میں وڈاں کا قصور ہے کہ نہیں، اس نے دھوکا دیا کہ نہیں؟“

وہ خاموش رہی، بلکہ اس نے سر جھکا دیا۔ میں نے مزید کوئی بات نہیں کی بلکہ اپنا بیگ اٹھایا اور جیپ تک آ گیا۔ میں وڈاں میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ مجھے روک لے۔

میں سید معاذ مان سومل کے پاس چلا گیا۔ وہ کوپے ہی میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

”رات کہاں پر تھے؟“

”کیوں، تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ میں نے اس کے پلنگ پر لیٹتے ہوئے پوچھا تو دبے دبے جوش سے بولا۔

”رتو بھوہڑ کے ڈیرے پر رات واردات ہو گئی۔ اس کے بندے اٹھا لیے گئے۔ مطالبہ یہی ہے کہ گائیں واپس بھجوا دی جائیں، یہ تمہارے علاوہ کون کر سکتا ہے؟“

”میں گیا ہی نہیں اس کے ڈیرے پر، اب آگے بول۔“ میں نے صاف جھوٹ بولتے ہوئے کہا تو وہ حیرت سے میری جانب دیکھنے لگا پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”تو پھر وہ کون تھے؟ وہ تو یہی سمجھ رہے ہیں؟“

"تمہاری بات ہوئی ان سے؟" میں نے جواب دینے کی بجائے اس سے پوچھا تو اس نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"دن نکلنے سے پہلے ہی رنو بھوہڑ کی کال آگئی تھی مجھے۔ اس نے میرے بارے میں پوچھا، میں نے تصدیق کی کہ تم ڈیرے پر ہو۔"

"اب کرو کال اسے اور میری بات کراؤ۔" میں نے اچانک کہا تو زمان سوہل جزبز ہو گیا، پھر سیل فون نکال کر نمبر ملائے اور فون میری جانب بڑھا دیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد دوسری جانب رنو بھوہڑ تھا۔

"ہاں بول، زمان کیا خبر ہے۔"

"میں بات کر رہا ہوں علی زین...... مجھ سے پوچھ کیا پوچھنا ہے؟" میں نے بڑے پر سکون انداز میں کہا تو دوسری جانب خاموشی چھا گئی، پھر غصے میں بھری ہوئی آواز ابھری۔

"میں یہ مانتا ہوں کہ تم میں حوصلہ بہت ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ تم ان کے لئے کام کر رہے ہو، جو تجھے بھی مروا دینا چاہتے ہیں۔"

"میں کن کے لئے کام کر رہا ہوں اور کن کے لئے نہیں، اسے چھوڑ دو۔ یہ بتاؤ کہ میں کہاں آؤں؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"کیا مطلب......؟" وہ میری بات نہیں سمجھا تھا۔

"تم مجھے تلاش کر رہے ہو نا، مجھے ڈھونڈ کر مارنا چاہتے ہو، اسی لئے تم نے پیروزاں کی گائیں چرا کر انہیں بلیک میل کیا۔ ان سب کو چھوڑ دو، میں خود آتا ہوں جہاں تم کہو۔ پھر تم نے جو میرے ساتھ کرنا ہے، کر لینا۔" میں نے کہا تو وہ پھر خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں بعد بولا۔

"تم اتنے جی دار ہو یا محض......"

"میں کہہ رہا ہوں، نہیں تو آ جاؤ یہاں، میں زمان مونل کے پاس بیٹھا ہوں۔ یہاں آ کر مجھے پکڑ لو۔ اگر تم میں ہمت ہے۔" میں نے اسے غیرت دلائی تو اس نے کوئی جواب دیئے بغیر فون کال کاٹ دی۔ میں نے سیل فون کو دیکھا اور زمان مونل کو واپس کر دیا۔ ہم میں خاموشی چھا گئی۔ ظاہر ہے وہ اپنی جگہ سوچ رہا تھا کہ اگر رنگو بھونڈا اس کے پاس آ ہی گیا تو پھر اس کا گھر میدان جنگ بن جائے گا؟ میرن شاہ اور پیروزاں کو کیا جواب دے گا؟ ممکن ہے اس کے علاوہ بھی وہ کچھ سوچ رہا ہو۔ تبھی اس نے یونہی بات بڑھانے کے لئے پوچھا۔

"تمہارا فون کہاں ہے؟"

"میں دے آیا ہوں پیروزاں کو۔ اب مجھے ڈیرے پر نہیں رہنا۔ اب میری اور میرن شاہ کی دشمنی ہے۔" میں نے بڑے اطمینان سے کہا تو وہ بری طرح چونک گیا۔ وہ ہونقوں کی مانند میری جانب دیکھنے لگا جیسے میں نے یہ بات پاگل پن میں کہی ہو۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" اس نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور انتہائی اختصار سے بتا دیا کہ میں وہاں سے کیوں آ گیا ہوں۔ وہ ساری بات سن کر بولا۔

"سمندر میں رہ کر مگر مچھ سے بیر...... میرن شاہ سے دشمنی اور اسی کی بستی میں رہو گے، پاگل ہو گئے ہو کیا؟" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تم فکر نہ کرو، میں تمہارے پاس نہیں رہوں گا۔ میں تجھے کسی امتحان میں نہیں ڈالوں گا۔ تم چاہے...." میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں بے غیرت نہیں ہوں کہ اپنے محسن کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ دوں، تم نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے، میرن شاہ کے لئے تو میں کام کرتا ہوں۔ اس میں اور تم میں زمین

آسمان کا فرق ہے۔لیکن......اس سے اچھا نہیں کہ تم واپس چلے جاؤ؟“

”اب نہیں، اس وقت تک نہیں جب تک میں میرن شاہ کو اپنے قدموں پر نہ جھکا لوں۔“ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا تو زمان موہل میری جانب یوں دیکھنے لگا جیسے اسے میری ذہنی حالت پر شک ہو رہا ہو۔ اس کے ساتھ ایسا ہونا بھی تھا۔ وہ نہ میری بات سمجھ سکتا تھا اور نہ مجھے۔ اسے حیرت ہونا ہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، زمان کا فون بج اٹھا وہ بے ساختہ بولا۔

”اوئے رنگو بھوہڑ کا فون۔“

”سن کیا کہتا ہے؟“ میں نے کہا تو اس نے کال رسیو کر لی اور پھر اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری جانب رنگو بھوہڑ ہی تھا۔

”یار وہ علی تیرے پاس ہی ہے یا چلا گیا ہے؟“

”نہیں میرے پاس بیٹھا ہے؟“

”اسے کہو، میں میرن شاہ کے پاس آرہا ہوں، وہ مجھے وہیں ملے۔“ رنگو بھوہڑ نے بڑے سکون سے کہا تھا۔

”لیکن اب وہ میرن شاہ کے ساتھ تمہیں نہیں ملے گا۔“ زمان موہل نے کہا تو وہ حیرت سے بولا

”وہ کیوں......؟“

”اس لئے کہ اب اس کی اور میرن شاہ کی دشمنی چل پڑی ہے۔“ زمان موہل نے کہا تو اس نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ کیوں؟“

”یہ بتاؤ، تم نے گائیوں کے عوض علی کو مانگا تھا؟“

"ہاں، یہی شرط تھی۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"یہ بات اب علی کو پتہ ہے، ظاہر ہے میرن شاہ نے دھوکہ دیا ہے اسے اور وہ اب میرن شاہ کا دشمن ہے۔" زمان مونگل نے بتایا تو دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے کہا۔

"یہی بات میں علی کو سمجھانا چاہ رہا تھا۔ ان بہن بھائی کے لئے انسانوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اب ان کی گائیں واپس چلی جائیں گی۔ میں بھی علی کے خون کا پیاسا اور وہ بھی اسے مارنا چاہیں گے۔ وہ قتل ہو گیا تو انہیں کیا فرق پڑنے والا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" زمان نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"بس پھر اب ہماری اس سے دشمنی نہیں رہی اسے بتا دینا۔" زلو بھوہڑ نے کہا تو زمان بولا۔

"میں نے اسپیکر آن کیا ہوا ہے اور وہ سن رہا ہے۔"

"تم ان کی گائیں دو یا نہ دو، یہ میرا معاملہ نہیں اور نہ میرا مسئلہ تھا۔ میں نے تم لوگوں سے دھوکہ نہیں کیا، صاف بتا دیا کہ سب کچھ غلط فہمی میں ہوا، کوئی بھی مجھے مارنے آتا تو میں نے اپنا دفاع کرنا تھا۔ اب بھی تم لوگ میرے ساتھ دشمنی رکھو، تو سر آنکھوں پر، لیکن اب میں نے خود میرن شاہ کو دشمن بنا لیا ہے۔ اب دیکھنا اس کے ساتھ ہوتا کیا ہے؟"

"دیکھتے ہیں، گائیں تو میں نے بھیج دی ہیں۔ انہوں نے میرے بندے اٹھائے ہیں، اگر تم ان کے بارے میں بتا دو تو میں تم سے دوستی کر لوں گا۔" زلو بھوہڑ نے آفر دی۔ میں یہی چاہتا تھا۔ مجھے وہ کافی حد تک معاملہ فہم لگا تھا، اس قدر جلدی اس نے حالات کو سمجھ کر اس پر اپنا فیصلہ دے دیا۔

"مجھے نہیں معلوم تمہارے بندے کہاں ہیں، یہ بھی سن لو۔ اور نہ مجھے تیری دوستی سے غرض

ہے اور نہ دشمنی سے......" میں نے صاف انکار کر دیا۔
"دیکھو، اگر تم ہمارے اور میرن شاہ کے درمیان سے ہٹ رہے ہو تو پھر تمہیں کوئی نہ کوئی ثبوت تو دینا ہوگا۔ پھر ہم جانیں اور میرن شاہ......" اس نے واضح انداز میں کہا تو میں نے چند لمحے سوچ کر کہا۔
"چل ٹھیک ہے......اگر پیروزاں اور میرن شاہ نے وہ بندے اٹھوائے ہیں تو میں تمہیں بہت جلد تلاش کر دوں گا، یہ میرا وعدہ رہا۔"
"میں منتظر ہوں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔
زمان سوہل خاموش رہا پھر عجیب سے خوف بھرے انداز میں بولا۔
"علی، کہیں کسی دلدل میں نہ پھنس جانا، ایک بار پھر سوچ لو، کہیں تمہیں پھنسانا نہ ہوں۔"
"فکر نہ کرو زمان، سب اچھا ہو جائے گا، تم کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔" میں نے کہا اور پلنگ پر پھیل گیا۔ حالات بڑی جلدی بدل گئے تھے۔ میں لیٹا ہوا انہی حالات پر سوچنے لگا تھا۔
دوپہر ہونے کو تھی۔ گرمی کافی حد تک بڑھ گئی تھی۔ زمان سوہل کچھ دیر میرے پاس بیٹھا تھا پھر وہ بھی غائب ہو گیا تھا۔ وہ کیا کر رہا تھا اور کہاں تھا، اس کی مجھے خبر نہیں تھی۔ ابھی تک آفتاب کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہاں سب ٹھیک تھا۔ لیکن میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ میرن شاہ اور پیروزاں کی طرف سے کوئی ردعمل نہیں ہوا تھا۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ زمان سوہل تیزی سے کوٹھے میں آ گیا، اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ میرے سامنے پیڑھے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
"پیروزاں کی گائیں واپس آ گئی ہیں۔"
"تو پھر پیروزاں کو بھی چاہیے کہ ان کے بندے واپس کر دے۔" میں نے سکون سے کہا

تو وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

”یار، وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔“

”بات کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔“ میں نے کہا تو زمان نے تیزی سے فون نکالا اور نمبر پش کر کے رابطہ کا انتظار کرنے لگا۔ ذرا سی دیر میں رابطہ ہوا تو اس نے فون میری جانب بڑھا دیا۔

”ہاں جیوڑاں مائی، بتا کیا کہنا چاہتی ہے۔“

”تم تو ایک دم مجھ سے بدظن ہو گئے ہو۔ نہ کچھ سوچا نہ سمجھا۔“ اس نے شکوہ بھرے انداز میں کہا تو میں بولا۔

”تم بھی جانتی ہو کہ میں بدظن کیوں ہوا ہوں۔ دھوکا دیا ہے مجھے تم نے۔“

”چل چھوڑ سارا غصہ اور......“

”بکومت، میں اب تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ بچنا ہے تو اب میرے قہر سے بچو تم بھی اور تیرا بھائی بھی۔“ میں نے انتہائی غصے میں کہا۔

”تم کوئی آسمان سے اتری ہوئی مخلوق نہیں ہو اور نہ ہی تم لوہے کے بنے ہو، اس قدر غرور سے بات کرو گے تو مٹی میں ملا دوں گی۔“ وہ غراتے ہوئے بولی تو مجھے لگا اس کے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔ وہ اب کھل کر سامنے آگئی تھی۔ تبھی میں نے اسے غصہ دلاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر دیر کس بات کی ہے، میں ہوں یہاں زمان سوہل کے پاس، آ کر اٹھا لو مجھے اگر تم میں اور تیرے بھائی میں ہمت ہے تو......“ میں نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا تو تڑپ کر بولی۔

”تیرا یہ شوق بھی میں پورا کرتی ہوں۔“

”میں اکیلا اور تیرے پاس فوج ہے لوگوں کی، دھمکیاں مت دو، آؤ میں تمہارا انتظار کر رہا

ہوں۔“ میں نے اسے پھر سے غصہ دلایا تو اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے فون زمان موئل کو واپس کر دیا تو وہ بولا۔

”یار مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم یہ خودکشی کیوں کر رہے ہو۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی......“

”تم اگر میرا ساتھ دینا چاہتے ہو تو خاموش رہو، کچھ نہ کرو۔ میں ابھی تمہاری یہ جگہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“ میں نے غصے میں کہا تو وہ خاموش رہا۔ میں اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ میں اپنی جیپ میں آ بیٹھا اور وہاں سے نکلتے ہی میں نے فون پر آفتاب سے رابطہ کیا۔

”ہاں سناؤ، کیا حالات ہیں۔“

”سکون ہے، وہ بندے بھی سو رہے ہیں، ہر طرف امن ہے۔“

”چل بہت کر لیا آرام، ان بندوں کو چھوڑ کر آدھے گھنٹے کے اندر اندر مجھے ملو۔“ میں نے تیزی سے کہا تو اس نے پوچھا۔

”خیریت ہے نا؟“

”نہیں، پیرزادہ نے دھمکی لگائی ہے، میں یہاں اکیلا ہوں۔ دیکھتے ہیں وہ سامنے آتے ہیں یا نہیں۔“ میں نے کہا تو ساری بات سمجھ گیا اس لئے تیزی سے بولا۔

”ٹھیک ہے، ملتا ہوں۔“

میں نے فون بند کر کے جیب میں ڈالا اور جیپ لے کر نکل پڑا۔

☆......☆......☆

آفتاب نے وہ آدمی ویران صحرا میں ایسی جگہ لے جا کر چھوڑے تھے جہاں سے پتہ نہ چلے کہ وہ رات بھر کہاں رہے ہیں۔ اس میں انہیں آدھا گھنٹہ لگ گیا تھا۔ آفتاب نے اپنے

ساتھیوں کے ساتھ مل کر باتوں ہی باتوں میں ان آدمیوں کو یہ باور کرا دیا تھا کہ انہیں پیروزاں نے اٹھوایا تھا۔ اب جبکہ اس کی گاڑیاں واپس آ گئی ہیں تو انہیں چھوڑا جا رہا ہے۔ وہ تینوں اب میرے قریب تھے اور میں بستی چراغ شاہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔

بستی کے باہر ایک جگہ کھجوروں کا جھنڈ تھا۔ میں نے جیپ وہیں روکی اور جیپ سے اتر کے کچھ فاصلے پر بنی ایک جھونپڑی میں جا بیٹھا۔ مجھے یہی امید تھی کہ اگر پیروزاں کے لوگ مجھ تک پہنچنے کے لئے آئے بھی تو اسی طرف سے آئیں گے۔ میں وہیں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ میں نے آفتاب کو اپنی لوکیشن کے بارے میں بتایا اور انتظار کرنے لگا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ مجھے دور سے چند جیپیں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ مجھے پوری امید تھی کہ راستے میں کھڑی ہوئی میری جیپ دیکھ کر وہ ضرور رکیں گے۔ وہ جس قدر تیزی سے آ رہے تھے، ان کی جیپوں کی رفتار کم ہوئی اور ایک جانب کھڑی جیپ کے نزدیک آ کھڑے ہوئے۔ آفتاب لوگوں کو صورت حال بتا دی تو وہ تیزی سے اسی جانب آنے لگے۔ وہ تین سمتوں میں پھیل کر آگے آ گئے تھے۔ میں جھونپڑی میں کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کچھ لوگ جیپ سے اترے تو میں نے میرن شاہ کے غنڈے سبحان کو دیکھ لیا۔ وہ جیپ سے اتر کر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ اسی جھونپڑی پر پڑی، میں جس میں کھڑا تھا۔ وہ بالکل درست اندازہ لگا رہا تھا۔ لیکن نجانے کیوں تذبذب کے عالم میں کھڑا سوچ رہا تھا۔

وہ دس بارہ لوگ تھے۔ ان کے عقب میں دو جیپیں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ پھیل کر کھڑے ہو گئے تھے۔ سبھی کے ہاتھوں میں اسلحہ پکڑا ہوا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں گن تھی اور کسی کے ہاتھ میں پسٹل یا ریوالور۔ وہ سب ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنا فون آن کیا ہوا تھا اور مسلسل

آفتاب کو بتا رہا تھا کہ سامنے کی صورت حال کیا ہے۔ وہ بھی مختلف جگہوں پر گھات لگا چکے تھے۔ سبحان اور اس کے ساتھی انہیں بھی اچھی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک سبحان نے ادھر ادھر دیکھ کر اونچی آواز میں کہا۔

"اوئے علی زین، چپ چاپ سامنے آجا، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ دم سادھے وہیں کھڑا رہا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اس کے ساتھی بھی ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ وہ بالکل تیار تھے۔ انہیں ذرا سی بھی بھنک مل جاتی تو مجھے قابو میں کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اس نے جب دوسری بار بھی صدا لگائی تو میں نے گن سیدھی کر لی۔ جیسے ہی وہ پھر اونچی آواز میں بولا، اسی لمحے میں نے کہا۔

"ایک......دو......تین......فائر۔"

ایک دم سے فضا فائرنگ کی خوفناک آواز سے تڑتڑا اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی کئی چیخیں بلند ہوئی۔ کئی خون میں لت پت ریت پر تڑپ رہے تھے۔ کراہوں کی آوازیں ہر جانب پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ہونقوں کی مانند چاروں جانب دیکھ رہے تھے۔ انہیں سمجھ ہی نہیں آئی کہ فائر کس جانب سے ہوا ہے۔ ان میں جو زخمی نہیں ہوئے تھے، وہ کسی آڑ کی تلاش میں بھاگے۔ مگر میں انہیں یہ موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ ایک بار پھر سے چاروں جانب سے فائرنگ ہوئی۔ انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا، اس لئے ان میں بھگدڑ مچ گئی۔

"ہتھیار پھینک دو۔" مدثر کی آواز گونجی تو انہوں نے اپنا رُخ اسی جانب کر کے فائرنگ کی لیکن تیسری بار بھی انہیں لگا کہ وہ غلطی پر ہیں۔ ایک زوردار برسٹ پڑا۔ کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"سر پر ہاتھ رکھو اور اپنی جیپوں میں بیٹھ کر بھاگ جاؤ۔" ایک سمت سے جہانگیر کی آواز

گونجی تو سامنے پڑے زخمیوں میں جیسے جان آگئی۔ وہ بے یقینی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگے تھے۔

"سبحان کے علاوہ باقی چلے جائیں اگر رکے تو انہیں گولی ماردیں گے۔" میں نے کہا تو وحشت ناک انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ میں جھونپڑی میں ہوں۔ لیکن کسی کی ہمت نہیں پڑی کہ کوئی ہتھیار اٹھا کر میری سمت بڑھتا۔ وہ تیزی سے جیپوں میں بڑھ رہے تھے۔ سبحان ریت پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں لہولہان ہو رہی تھیں۔ اگلے دو منٹ میں وہاں سوائے سبحان کے کوئی نہیں تھا۔ ایک دم سے سناٹا چھا گیا تھا۔ میں جھونپڑی سے نکلا اور اس کی جانب بڑھ گیا۔ وہ وحشت ناک انداز میں میری جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ میری جانب دیکھ کر گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

"مجھے جانے دو، میں مر جاؤں گا۔"

میں نے اس کے سینے پر پاؤں رکھتے ہوئے نفرت سے کہا۔

"اور جن لوگوں کو تم نے مارا ہے، ان کی جان نہیں تھی کیا؟"

"وہ تو میرن شاہ کا حکم......"

"اور میری اس سے دشمنی ہے۔" میں نے کہا تو خوف زدہ انداز میں میرے جانب دیکھنے لگا، میں نے پاؤں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا، "اگر سچ بولو گے تو شاید تمہیں معاف کر دوں، ہسپتال بھی لے جاؤں گا، ورنہ تجھے قبر بھی نصیب نہیں ہوگی، یہیں آگ لگا دوں گا تمہیں۔"

میرے لہجے کا اثر تھا یا اپنے انجام کی اذیت...... وہ مرے ہوئے انداز میں بولا۔

"پوچھو...... کیا پوچھتے ہو؟"

"پرسوں رات ڈیرے پر تم اٹھا لائے تھے مجھے؟"

"ہاں، میں تھا...... میرن شاہ نے...... کہا تھا...... تجھے...... اٹھا لاؤں۔" اس نے تکلیف

برداشت کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو اسی گھر میں تھا، کہاں لے جانا تھا۔" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"کوپے پر...... وہاں رزتو...... کے لوگوں...... کے حوالے ...کرنا تھا۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"اب کس کے کہنے پر آئے ہو؟" میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

"پیروزاں نے...... میرن شاہ کی مرضی...... کے بغیر نہیں۔" اس نے اذیت بھرے لہجے میں کہا تو اس دوران وہ تینوں مجھ سے کچھ فاصلے پر آن پہنچے۔ مجھے سوال جواب کرتا دیکھ کر رک گئے۔ ایسے میں سبحان کی جیب میں پڑا فون بج اٹھا، اس نے نکالنے کی کوشش کی لیکن نکال نہیں پایا۔ میں نے وہ فون نکال لیا۔ فون مسلسل بج رہا تھا۔ میں نے کال رسیو کی تو پیروزاں چیختے ہوئے بولی۔

"کہاں ہو تم......؟"

"ابھی تو زندہ ہے۔ لیکن ممکن ہے کچھ دیر بعد اگلے جہان پہنچ جائے۔"

"تم......" اس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں میں، یہی پوچھنا تھا نا کہ کتنے مرے اور کتنے زندہ ہیں، ہم یہ حساب بعد میں کرتے ہیں، پہلے یہ فیصلہ کر کے بتا دو تم میں سے پہلے کون مرے گا، تم یا میرن شاہ......" میں پرسکون سے لہجے میں انتہائی طنز سے کہا۔

"بکواس بند کرو۔ تیرے جیسے باؤلے کتے کو میں دیکھتی ہوں۔" اس نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

"مطلب پہلے تم مرنا چاہتی ہو۔" میں نے کہا تو فون بند ہو گیا۔

اب ہم زیادہ دیر وہاں نہیں رک سکتے تھے۔ میں نے سبحان کو اٹھنے کے لئے کہا اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میں نے مدثر کی جانب دیکھا اور اشارے سے اسے سمجھایا کہ کیا کرنا ہے وہ آگے بڑھے ایک نے اس کی ٹانگیں پکڑیں، تو جہانگیر نے اس کے ہاتھ، دونوں نے اسے اٹھایا اور جیپ کے آگے بنے ہیڈ رالک کے اندر رکھ دیا۔

"اب تمہاری قسمت...... مر جاؤ گے یا منزل تک پہنچ جاؤ گے۔"

"ایسے نہ کرو، تم مجھے ہسپتال......" اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں نے میرے سامنے ایک ایسے بندے کو اذیت دے کر مارا تھا، جس کا صرف اتنا قصور تھا کہ اس نے کسی بندے کو پناہ دی تھی۔ تم میں اور روہی کے سانپ میں کوئی فرق نہیں ہے۔" میں نے کہا اور جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ وہ تینوں واپس پلٹ گئے۔ میں آہستہ آہستہ چل پڑا۔ مجھے ان کا انتظار تھا۔ جب مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ میرے پیچھے آرہے ہیں، میں نے رفتار تیز کر دی۔

بستی چراغ شاہ تک پہنچتے ہوئے مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔ میں نے جیپ بالکل پھاٹک کے پاس جا کر روک دی۔ پھر انتہائی تیزی سے اترا اور سبحان کو اتار کر نیچے پھینکا۔ وہ لکڑی کے پھاٹک کے بالکل درمیان میں گرا تھا۔ میں نے گن اٹھائی اور اس کا بٹ پورے زور سے اس کے کاندھے پر مارا۔ وہ چلا اٹھا، شاید اس کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔ پھر دوسرے کاندھے کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا۔ وہ نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ تبھی میں نے نال اس کی جانب کی اور کئی گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔ فائرنگ کی آواز نجانے کہاں تک گئی تھی۔ مگر میں نے دونوں بھائی بہن کو جو پیغام دینا چاہتا تھا، وہ دے دیا۔ میں پلٹا اور جیپ میں آن بیٹھا پھر آگے بڑھ گیا۔

میرے سامنے ببول کا درخت تھا۔ اس کے نیچے سانول کھڑا میری جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کا ریوڑ بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے ہی میں نے جیپ بڑھائی وہ کچے راستے کے کنارے تک آ گیا۔ میرے اس کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تو اس نے ہاتھ لہرا کر مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس کے قریب جا کر ایک دم سے بریک لگا دیئے، پھر کھڑکی میں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا، حیرت جیسے جم سی گئی تھی۔ وہ میری جانب دیکھ لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا

"وہ...... تم نے سبحان کو مار دیا؟"

"ہاں سانول...... تمہیں مارنا چاہئے تھا، تیرا دوست تھا۔" میں جان بوجھ کر اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"تم نے...... تم نے مارا...... تم تو میرن شاہ کے ٹٹو تھے۔" اس نے نفرت سے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یہی غلط فہمی ہے۔ میں کبھی بھی میرن شاہ کا یا کسی کا ٹٹو نہیں رہا، میں نے ہمیشہ حق سچ کا ساتھ دیا ہے؟"

"حق سچ کا ساتھ......" یہ کہتے کہتے وہ رک گیا پھر بولا "وہ جو بندے یہاں زخمی ہو کر آئے ہیں وہ بھی تم نے......؟"

"ہاں، میں نے انہیں گولیاں ماری ہیں، اور میرن شاہ کو بھی مارنا ہے۔ اگر میرن شاہ تمہارا دوست ہے تو بتاؤ......" میں نے جان بوجھ کر کہا تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری جانب دیکھنے لگا، پھر تیزی سے پسنجر سیٹ کی جانب آ کر اشارے سے دروازہ کھولنے کا اشارا کرتا ہوا بولا۔

"کھولو، جلدی کھولو......"

میں نے دروازہ کھول دیا تو وہ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"چل، جلدی چل......" اس کے لہجے میں اضطراب سے زیادہ لرزہ تھا، جیسے اسے یقین نہ آرہا کہ وہ سب کچھ وہی دیکھ سن رہا ہے جو اس کے سامنے ہے۔ میں نے مزید وضاحت سے کچھ نہیں پوچھا بلکہ جیپ بڑھا دی۔ کچھ فاصلے پر جا کر اس نے پوچھا۔

"کوئی ٹھکانہ ہے تیرے پاس، جہاں تم محفوظ ہو؟"

"ایسا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔" میں نے یونہی کہہ دیا۔

"تو چل میرے ساتھ، میں تجھے پناہ دوں گا۔ وہاں تیری طرف کوئی آنکھ بھی اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ چل......" اس نے ہیجانی انداز میں کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

وہ بستی ایک اونچے سارے ٹیلے کے عقب میں تھی۔ وہاں پر زمین یوں ریت میں سے ابھری ہوئی تھی جیسے پانی میں سے کوئی جزیرہ ابھرا ہوا ہو۔ میرے ذہن میں آنے لگا، میں شاید پہلے بھی یہاں آیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا، یہ تو وہی بستی ہے، جہاں میں بابا خیر دین کے ساتھ اپنا بیگ لینے آیا تھا۔ ان لوگوں کی تو پرانی دشمنی چل رہی تھی میرن شاہ سے۔ اسی بستی کا بجا ور تھا جو اس رات رینجرز سے پرے غائب ہو گیا تھا۔ اسے اپنی پناہ میں دینے پر میرن شاہ نے ایک بندہ مار دیا تھا۔ مجھے کافی حد تک اطمینان ہو گیا۔ اس پر چند کچے گھر تھے۔ جھونپڑیاں تھیں اور بستی سے قدرے باہر ایک بڑا سارا گوپا تھا۔ ہم اس گوپے میں جا پہنچے۔ تبھی ساول نے اترتے ہی کہا۔

"چل آجا تم یہاں پر محفوظ ہو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اتر کر گوپے کی جانب بڑھا۔ میں نے فون نکالا اور آفتاب کو صورت حال

بتاتے ہوئے کہا۔
"تم لوگ جاؤ بستی بہادر خان، میں آجاؤں گا، یا پھر فون کرتا ہوں۔"
"او کے۔" آفتاب نے کہا اور فون بند کر دیا۔
بڑے سارے صحن میں چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ساول ایک چار پائی پر بیٹھا ہوا تھا، اس کے علاوہ وہاں پر کوئی نہیں تھا۔ میں اس کے سامنے والی چار پائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر جذباتی لہجے میں بولا۔
"اب پوچھ، جو بھی پوچھنا ہے، جتنی مرضی باتیں کر مجھ سے......"
"یار میں نے تم سے کیا پوچھنا، بس یونہی ڈیرے کے باہر تم نظر آتے تھے، تمہارا نفرت والا رویہ دیکھ کر یونہی......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولا۔
"میں ہر اس بندے سے نفرت کرتا ہوں، جو میرن شاہ اور اس کی بہن کا وفادار ہے۔ وہ ظالم ہیں۔"
"تم کب سے یہاں بستی چراغ شاہ میں رہ رہے ہو ساول؟" میں نے جان بوجھ کر سوال کیا۔
"بچپن سے۔ یہیں ہوش سنبھالا۔" اس نے نہ سمجھتے ہوئے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا
"تم بچپن سے ان کا ظلم دیکھ رہے ہو اور برداشت کر رہے ہو؟" میں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا تو اس نے بڑی گہری نگاہوں سے میری جانب دیکھا وہ میری بات سمجھ گیا تھا اس لیے طویل سانس لے کر بولا۔
"میں کمزور ہوں، میں تو چاہتا ہوں کہ دن نہ چڑھے اور یہ لوگ اس روئے زمین سے مٹ جائیں۔"

”کچھ نہیں کیا تم نے، ان کا ظلم سہنے کے علاوہ......“ میں نے پوچھا۔

”کہا نا، کوئی بھی......“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”تم بے غیرت ہو، اوئے تیرے پاس یہ کلہاڑی بھی نہیں تھی، تم میں اتنی قوت بھی نہیں تھی کہ میرن شاہ کا گلا دبا سکتے؟ بس چپ چاپ اس کا ظلم سہتے رہے، ڈرتے رہے اس سے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو، میں بے غیرت ہوں، میں کچھ نہ کر سکا اور کسی نہ کسی مسیحا کا انتظار کرتا رہا......لیکن اب وہ وقت آ گیا ہے۔“ اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ چند صحرائی لوگ وہیں آ گئے۔ وہ بھی میری جانب بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ سارے میرے دائیں بائیں بچھی ہوئی چارپائیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ ایسے میں ایک ادھیڑ عمر شخص آ گیا تو سبھی اس کے لئے کھڑے ہو گئے۔ میں بھی کھڑا ہوا تو اس نے سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سانول کی جانب دیکھا۔

”چاچا سائیں، یہ ہے وہ کل زین جس نے آج میرن شاہ کے بھان کو ان کے ڈیرے پہ مارا ہے۔“

”دوسرے جو دو بندے مرے ہیں، اور پانچ چار زخمی بھی ہوئے۔“ اس نے بڑے سکون سے پوچھا۔

”صرف دو بندے مرے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، صرف دو لیکن اتنا تو ہوا کوئی تو اس کے سامنے ہوا۔“ چاچا سائیں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”زیادہ ہو جانے چاہئیں تھے۔“ میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تو چاچا سائیں بولا۔

”کوئی بات نہیں، پھر بھی لیکن آج کی رات تم پر بہت بھاری ہوگی، وہ اور اس کے ساتھ شریک قبیلے تمہیں سارے صحرا میں تلاش کریں گے۔ اس کا ساتھ دینے قانون بھی حرکت میں آجائے گا۔“

”کچھ بھی ہو، اب میرن شاہ میرے ہاتھوں سے نہیں بچ پائے گا۔ معاف کرنا چاچا سائیں، اگر تم لوگ بھی میرے یہاں ہونے سے خوف زدہ ہو تو میں ابھی چلا جاتا ہوں۔“ میں نے ان کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا تو چاچا سائیں کے چہرے پر ذرا سا تناؤ آیا اور پھر بڑے سکون سے بولا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن تم اب یہاں ہو تو ہو۔ ہم مر جائیں گے لیکن تم پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔“

”چاچا سائیں یہ صرف میرے لئے ہے یا پھر تم لوگوں کی بھی دشمنی ہے ان سے......“

”دشمنی، پرکھوں سے چل رہی ہے۔“ چاچا سائیں نے دبے دبے غصے میں کہا۔ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ دو لوگ تھرے اٹھائے ہوئے آ گئے۔ انہوں نے وہ ہمارے سامنے رکھا۔ مری بھوک چمک اٹھی تھی، میں کھانے میں مصروف ہو گیا۔ چاچا سائیں کے ساتھ باقی لوگ اٹھ کر جا چکے تھے، صرف سانول میرے ساتھ بیٹھا کھا تا رہا تھا۔

تاروں بھری رات کا ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا جبکہ سانول میرے پاس بیٹھا تھا۔ تبھی مجھے اچانک خیال آیا۔

”سانول او یار تیرا ریوڑ......“

”وہ گھر چلا گیا ہوگا، میں نہ بھی ہوں تو میرا ملازم لے جاتا ہے۔“ اس نے بے خیالی کے سے انداز میں کہا تو میں نے پوچھا۔

"ایک بات بتا ساتول، تجھے میرن شاہ سے نفرت ہے لیکن تم اس کے ڈیرے سے تھوڑی دور روزانہ اپنا ریوڑ لے کر کھڑے ہوتے ہو، ایسا کیوں کرتے ہو؟"

"میں جب وہاں جا کر کھڑا ہوتا ہوں تو میرے اندر کی آگ بھڑکنے لگتی ہے۔ کئی برس ہو گئے میں اس آگ کو بجھنے نہیں دے رہا ہوں۔" اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ میں چونک گیا۔ اگرچہ میرن شاہ کسی پر ظلم کرے تو یہ نئی بات نہیں تھی۔ ساتول پر کیا گزری، اس بارے مجھے تجسس ضرور ہوا تھا۔

"ہوا کیا ساتول......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میری زندگی چھن گئی یار۔" اس نے دکھ سے لبریز لہجے میں کہا۔

"ایسا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"میرے بچپن کو مجھ سے چھین لیا، میری منگیتر، وسائی مائی......" اس نے کہا ہی تھا کہ میرے دماغ میں جھماکا ہوا۔ وہ چہرہ، جس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی، جس کے خدوخال تو واضح ہوتے تھے لیکن مجھے پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کون تھی، جیسے ہی ساتول نے نام لیا تو مجھے یاد آ گیا۔ سنہری سی لڑکی، یوں گڑیا سی جیسے ابھی نیند سے جاگی ہو۔ تیکھے نین نقش والی، پتلے پتلے ہونٹوں پہ ہر وقت غصہ دھرا رہتا تھا، آنکھیں یوں جیسے شرمائی شرمائی سی، بلاشبہ وہ حسین تھی۔ وہ پتہ نہیں کیا کہتا چلا جا رہا تھا۔

"کیا کہا تم نے......" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"میں کہہ رہا ہوں کی اس کی مجھ سے منگنی ہوئی ہی تھی کہ ایک دن وہ میرن شاہ کی نگاہ میں آ گئی۔ مجھے وسائی نے کہا بھی کہ میرن شاہ اس کی طرف بری نگاہ رکھتا ہے لیکن میں نے کوئی اتنی توجہ نہیں دی۔"

"پھر کیا ہوا......؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا ایک رات اس نے اپنے غنڈے بھجوا دیئے، اور اسے گھر سے اٹھوا لیا۔ وہ اسے لیکر اسی ڈیرے میں آئے تھے جہاں تم ٹھہرے تھے۔ میرن شاہ اپنی ہوس پوری کرنا چاہتا تھا۔ اس نے وسائی کو زدوکوب کیا، وہ اپنا آپ بچانے کی کوشش کرتی رہی، لیکن بچ نہ سکی۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ چند لمحے بعد میں نے پوچھا۔

"یہ سب کہاں پر ہوا؟"

"اسے اٹھا کر گوپے پر لے گئے تھے۔ اس کا منشی مہر خان صرف اسی لئے رکھا ہوا ہے۔ جب بھی میرن شاہ کو ایسی طلب ہوتی ہے، وہی اس کی خوراک مہیا کرتا ہے۔"

"یہ واقعہ تجھے وسائی نے خود بتایا؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے اکیلے ہی کو نہیں، پوری بستی چراغ شاہ کو بتایا لیکن کون کرے سامنا ان درندوں کا۔ جو بھی آواز اٹھاتا، یہ اسے چیر پھاڑ دیتے ہیں۔" ساونل نے نفرت سے کہا۔

"کوئی قانون نہیں ہے یہاں پر؟" میں نے پوچھا۔

"قانون تو ان لوگوں کا ہے نا، ان کے ساتھ کچھ ہو جائے تو قانون حرکت میں آجاتا ہے۔ لیکن غریب کی تو کہیں بھی شنوائی نہیں ہوتی۔" اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"تم نے بھی کچھ نہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے کیا کرنا تھا، پولیس چوکی تک نہیں ہے یہاں، میں نے وسائی سے کہا کہ میں تجھے اپنا لوں گا، شادی کر لیتا ہوں تم سے مگر..." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"مگر کیا......؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"اس نے کنویں میں چھلانگ مار دی، مر گئی وہ......" یہ کہتے ہوئے وہ زار و زار رونے

لگا۔ میں نے اسے رونے دیا۔ کچھ دیر تک اس کا جی ہلکا ہو گیا تو میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا

"اب تو چاہتا کیا ہے؟"

"یہی کہ اب اس میرن شاہ سمیت اس کا خاندان ختم ہونا چاہئے۔" اس نے انتہائی نفرت سے کہا تو میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

"ہو جائے گا، فکر نہ کر۔"

میرے یوں کہنے پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ پھر یوں تکنے لگا جیسے اسے یقین ہو گیا ہو۔

میں نے اپنا فون نکالا اور زمان موبل کا نمبر پش کرنے لگا۔ کچھ دیر میں اس سے رابطہ ہو گیا۔ میری آواز سنتے ہی وہ چیختے ہوئے بولا۔

"کہاں ہو تم......؟"

"مجھے چھوڑ یہ بتا، وہ تیرا میرن شاہ کہاں ہے؟" میں نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا تو وہ لمحہ بھر رک کر بولا۔

"وہ اس وقت گوپے پر ہے۔ وہیں بیٹھا ہے۔ ہر طرف بندے بھجوائے ہوئے ہیں تیری تلاش میں۔"

"میں کون سا غائب ہو گیا ہوں، ادھر ہی ہوں۔" میں نے سکون سے کہا۔

"میرا مشورہ ہے، تم خاموشی سے نکل جاؤ۔ ورنہ آج رات کے بعد تم یہاں روہی سے نکل بھی نہیں سکتے ہو۔ ابھی وقت....." اس نے کہنا چاہا تو میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"مجھے ڈرا رہے ہو، خوف زدہ کر رہے ہو؟"

"نہیں، یہ بات نہیں، پورے علاقے میں جو اس کے دشمن ہیں وہ تھو تھو کر رہے ہیں، ایسا

کبھی نہیں ہوا کہ کوئی آ کر، ان کا بندہ، انہی کے ڈیرے پر مار جائے۔ اور جو دوست ہیں وہ سارے مل کر تجھے تلاش کر رہے ہیں۔" اس نے تیز تیز انداز میں مجھے بتایا۔

"اور پیروزاں مائی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ گھر ہی ہوگی۔ مجھے اس کا نہیں پتہ لیکن کل یہاں پر پولیس آجائے گی، ایم پی اے بھی آرہا ہے، جس پر ذرا سا بھی شک ہوا، اسے نہیں چھوڑیں گے، پورا علاقہ بھگتے گا یار۔ یہ لوگوں کو پکڑوا کر اپنی دشمنیاں الگ نکالیں گے اور سارا کام بھی ٹھپ ہو جائے گا۔" اس نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

"کوئی راستہ نکل سکتا ہے؟" میں نے مصلحت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"کہا نا چپ چاپ نکل جاؤ، حالانکہ تم نے دیر کر دی، اب بھی نکلنا مشکل ہے لیکن اگر تمہاری قسمت اچھی ہوئی تو نکل جاؤ گے۔"

"کوشش کرتا ہوں۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"ہاں، زندگی رہی تو مل لیں گے۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ اب مجھ سے جان چھڑانا چاہتا ہو۔ میں نے مزید بات نہیں کی اور فون بند کر دیا۔

سانول میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا سوچتا رہا، پھر اچانک کہا۔

"سانول، چل اٹھ بستی چلتے ہیں۔"

"بستی...... وہاں تو......" اس نے شدت حیرت سے کہا۔ اس کا منہ کھل گیا تھا لیکن کچھ ہی تانیے بعد اس کا منہ بند ہونا شروع ہو گیا۔ اس نے میری بات سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے ساتھ وہاں سے چل پڑا۔

☆......☆......☆

پو پھٹ رہی تھی جب میں ڈیرے کے پاس پہنچ چکا تھا۔ لکڑی کا پھاٹک بند تھا۔ میں نے ہلکے سے اسے کھولا تو پھاٹک ذرا سا چرچرایا۔ میں رک گیا۔ پھاٹک ذرا سا کھلا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا اور پھر اس کے اندر داخل ہو گیا۔ میں اندر داخل ہوتے ہی بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک یونہی دم سادھے بیٹھا رہا۔ کوئی آہٹ نہ پا کر میں نے دروازہ بند کیا اور بیٹھے بیٹھے اس دیوار کی جانب بڑھا، جس میں رہائش گاہ کا دروازہ تھا۔ میں نے دیوار کے ساتھ جڑ میں بیٹھ سامنے دیکھا۔ چار پائیاں ویسے ہی بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر بابا خیر دین کا ہیولا مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا۔ ہر طرح کا اطمینان کر لینے کے بعد میں کھڑا ہوا اور رہائش گاہ کے دروازے تک پہنچا۔ وہ دروازہ اس وقت بند ہوا کرتا تھا۔ میں نے تسلی کے لئے اسے ہلکا سا دبایا تو وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ایک نگاہ بابا خیر دین کو دیکھا، پھر اسی دروازے کی درزوں میں پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھ گیا۔ میں دیوار پر اپنا توازن درست کیا اور دوسری جانب رہائش گاہ میں اتر کر دیوار کی جڑ میں بیٹھ گیا۔ میں وہاں بیٹھا اپنا سانس درست کرتے ہوئے اندر کا جائزہ لیتا رہا۔

اس طرح کسی کے گھر میں داخل ہونے پر سب سے زیادہ خطرہ کتوں کا ہوتا ہے۔ وہ کسی انجان بندے پر فوراً بھونکنا شروع کر دیتے ہیں۔ رہائش گاہ کے اندر اور پار ریوڑ کے پاس، جتنے بھی کتے تھے، میں اب ان کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں نے انہیں کچھ دن راتب ڈالا تھا۔ میرے وہاں ہونے کی دوسری وجہ یہی تھی وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں ایسے وقت میں وہاں پر چلا جاؤں، جب وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ تیسری وجہ وہ وقت تھا، میں جانتا تھا کہ ایسے وقت میں کون کیا کر رہا ہوتا ہے۔

ہر جانب خاموشی تھی۔ مجھے اطمینان ہو گیا تو میں نے کچن کی جانب کان لگائے، میرے

اندازے کے مطابق وہاں پر ساوری کا ہونا لازمی تھا۔ وہاں مجھے کوئی آواز سنائی نہ دی لیکن میں پھر بھی اس جانب بڑھ گیا۔ کچن میں چراغ روشن تھا، ادھ کھلے دروازے میں سے ساوری دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے کچھ دیر یہ اطمینان کیا کہ وہ اکیلی ہے، پھر اندر چلا گیا۔ ایک دم سے مجھے اپنے سامنے پا کر اس کا منہ کھلا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر زور سے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ میرے ساتھ لگی کانپ رہی تھی۔ تبھی میں نے سرگوشی میں کہا۔

”ڈرو مت، بس تھوڑی دیر......“

اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا، جس میں زماہٹ تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ ہٹایا تو اس نے شدت حیرت سے سرگوشی میں پوچھا۔

”تم یہاں، تمہیں نہیں پتہ وہ تیری جان کے دشمن ہو رہے ہیں؟“

”مجھے پتہ ہے، لیکن میں تم سے ملے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔“ میں نے اپنے لہجے میں پیار بھرتے ہوئے کہا تو اس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”مجھے، وہ کیوں...... میں تو......“

”ساوری، میں جانتا ہوں تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں تجھے یہی کہنے آیا ہوں، میں پھر آؤں گا۔“ میں نے محبت سے لبریز لہجے میں کہا۔

”نہیں علی زین، میں خواب نہیں دیکھتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لی پھر حتمی لہجے میں بولی، ”چل ٹھیک ہے، مجھے مل لیا، اب جاؤ، اگر بچ کر نکل جاؤ تو......“ آخری لفظ کہتے ہوئے اس کا لہجہ رندھ گیا تھا۔

”ایسے نہیں کہو، میں......“ میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

”میرن شاہ اپنے کمرے میں ہے۔ ابھی اماں سکین جاگ گئی ہو گی، اسے نیند نہیں آتی،

پرواز بھی گھر پر نہیں ہے، اماں سکینہ کسی بھی وقت یہاں آجائے گی۔تم تو مرو گے، مجھے بھی ساتھ میں مروا دو گے۔" اس نے رونے والے انداز میں کہا۔

"کیا ہوا جو ہم ساتھ مریں گے، جی نہ سکے تو مریں گے اکٹھے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اسے ساتھ چمٹا لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی، چند لمحوں بعد تیز تیز سانسوں کے درمیان بولی۔

"ابھی تو ساتھ میں جیئے بھی نہیں ہیں، تم مرنے کی باتیں کر رہے ہو۔"

"ساوری تم نہیں جانتی ہو، تم میرے دل میں کہاں تک اتری ہوئی ہو، بتا دوں تو ابھی مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ، خیر، جئیں گے، ساتھ جئیں گے۔" میں نے اس کے ماتھے پر اپنے لب رکھتے ہوئے کہا۔

"یقین نہیں ہوتا، زندگی نے اتنا ذلیل کیا ہوا ہے کہ خوشی کی بات بھی انجانی سی لگتی ہے۔ پتہ نہیں تم کون ہو، لیکن تم پر یقین کرنے کو دل کرتا ہے۔" اس نے میری پشت پر سختی سے ہاتھ جماتے ہوئے کہا۔

"ساوری بس ذرا سا انتظار...... پھر سب ٹھیک ہو جائے گا، یا پھر سب ختم ہو جائے گا۔ انتظار کر، بس ذرا سا۔" میں نے اسے بھینچتے ہوئے کہا تو اس نے چونک کر خود کو مجھ سے الگ کر لیا، پھر بولی۔

"چلے جاؤ، اس سے پہلے......"

"ٹھیک ہے، جا رہا ہوں۔" میں نے کہا اور کچن سے باہر جانے لگا۔ تبھی اس نے مجھے اشارے سے روکا، پھر خود باہر نکل گئی۔ اس نے غیر محسوس انداز میں ادھر ادھر دیکھا پھر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں باہر نکل آیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں ڈیرے کی جانب جاؤں گا لیکن

میں میرن شاہ کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ ساوری پہلے تو پاگلوں کی طرح مجھے دیکھنے لگی پھر ایک دم سے ٹھٹک گئی شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ تبھی اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا میں رک گیا تو بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی اور سرگوشی میں بولی۔

''کیا کرنے جا رہے ہو؟''

''مجھے میرن شاہ کو......'' میں نے سرد لہجے میں کہا تو وہ بولی۔

''ادھر سے جاؤ گے تو دروازہ لگا ہوا ہوگا، ادھر اماں سگن کے کمرے میں سے جاؤ۔''

''وہ دروازہ......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

''وہ کھلا ہوا ہے، میں رات ادھر ہی سوئی تھی۔'' اس نے کہا تو ایک دم سے میرے ذہن میں خیال آ گیا۔ میں نے اسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ساوری کو واپس جانے کا اشارہ کیا اور اماں سگن کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے پٹ کھولا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ بڑے سارے کمرے کے درمیان میں وہ جہازی پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں، شاید وہ کچھ پڑھ رہی تھی یا پھر یادوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ آہٹ پاتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اچانک مجھ پر نگاہ پڑی تو وہ پہلے سمجھ نہ سکی، پھر جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ میں کون ہوں تو اس کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔ اس نے شور مچانے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ میں ایک ہی جست میں پلنگ پر جا پہنچا۔ میں نے انتہائی تیزی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی چیخ دب کر رہ گئی۔ اس کی وحشت زدہ آنکھیں مجھ پر مسلط تھیں۔ تبھی میں نے سرگوشی میں کہا۔

''اماں سگن، ڈرو مت، پہلے میری بات سنو۔''

میرے یوں کہنے کا اثر ہوا۔ اس کا پورا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے اس کے منہ سے اپنا

ہاتھ ہٹایا تو وہ بولی۔

"تم اندر کیسے آئے ہو؟"

"اماں سکینہ، میں میرن شاہ سے معافی مانگنے آیا ہوں، اسے سچ بتانا چاہتا ہوں کہ ہوا کیا ہے؟" میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا تو اس نے حیرت زدہ لہجے میں بے یقینی سے پوچھا۔

"سچ کیا ہے؟"

"میں بتاتا ہوں نا میرن شاہ کو، مجھے اس کے پاس لے چلو، مجھے وہ جو مرضی سزا دے، وہ مجھے قبول ہے لیکن میری بات سن لے۔" میں نے سرگوشی میں کہا تو اس نے میری طرف دیکھا، پھر سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"اماں سکینہ تمہاری قسم، ورنہ میں یہاں موت کے منہ میں کیوں آتا۔" میں نے کچھ اس طرح دردناک انداز میں کہا کہ وہ پسیج گئی، پھر پلنگ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"چل آ، اگر تم جھوٹے ہوئے تو تیری خیر نہیں ہے۔"

"بے شک جو چاہے کرنا۔" میں نے کہا تو وہ سلیپر پہن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ میرن شاہ کے کمرے میں جانے والے دروازے کے پاس پہنچی، اندر دیکھا، پھر سوئے ہوئے میرن شاہ کے پاس جا کر بولی۔

"وے میرن، اٹھ، بات سن......"

اپنی ماں کی آواز پر وہ چونک کر اٹھا، پھر جیسے ہی اس کی نگاہ اپنی ماں کے پیچھے کھڑے مجھ پر پڑی تو اسے جیسے کرنٹ سا لگا۔ وہ پلنگ پر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے وحشت زدہ انداز میں بولا۔

"تت...... تم...... یہاں کیسے......"

”میں تم سے سچ کہنے آیا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا تو شدت حیرت سے میری طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”سچ، یہ کیا بکواس ہے؟“

”دیکھو میرن شاہ، میں یہاں آ کر تمہیں سوئے ہوئے کو بھی مار سکتا تھا لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے، میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں، اگر بات سنی ہے تو سنو، ورنہ میں جا رہا ہوں، پھر مجھے نہیں روکنا، اس کا نتیجہ تم جانتے ہو۔“ میں نے اکھڑ لہجے میں درشتی سے کہا تو وہ ایک دم سے سہم گیا پھر بولا۔

”بولو، بات کیا ہے؟“

”مجھے یہاں دیکھ کر تمہیں حیرت نہیں ہوئی کہ یہاں رہتے ہوئے کبھی میں نے تیرے گھر کی دہلیز پار نہیں کی اور آج پہلی بار تیرے کمرے میں ہوں، سوچا ایسا کیوں ہے؟“ میں نے دبے دبے غصے میں کہا۔

”ایسا کیوں......؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”مجھے یہاں پیرو زاں مائی کے بندے چھوڑ کر گئے ہیں، پیرو زاں نے مجھ سے سودا کیا ہے کہ میں تجھے قتل کر دوں۔“ میں نے سکون سے کہا تو یہ لفظ اس پر بم کی مانند گرے۔ وہ ہونقوں کی مانند میری جانب دیکھنے لگا تھا۔ ایک لمحے کو تو مجھے یوں لگا جیسے اس میں جان ہی نہ رہی ہو۔ پھر جیسے اسے میرے لفظوں کی سمجھ آ گئی ہو، اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ایسا ممکن نہیں ہے؟“

”مجھے معلوم ہے، تم یہی کہو گے، لیکن سچ یہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”مگر وہ کیوں کہے گی؟“ اس نے وحشت زدہ انداز میں پوچھا۔

"میں نہیں جانتا، مجھے اگر تمہیں قتل کرنا ہوتا تو اب تک کر چکا ہوتا، یہ دیکھو، میرے پاس پسٹل ہے، اس کا میگزین بھرا ہوا ہے، بتاؤ، فائر کرنے میں وقت لگے گا یا تم سے بات کرنے میں......" میں نے وہ بات کہہ دی جس سے وہ تذبذب میں پڑ گیا، کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا

"پھر تم نے مارا کیوں نہیں اب تک؟"

"میری اور تمہاری کوئی دشمنی ہے؟" میں نے اس پر سوال کر دیا۔

"نہیں، میرا خیال ہے کہ نہیں......"

"پیروزاں ہی نے بتایا تھا کہ بندے مجھے تلاش کرتے ہوئے آ رہے ہیں، اس کے بندے بھی میرے ساتھ تھے، میں نے اکیلے تو اتنے سارے فائر نہیں کر دیئے۔" میں نے دلیل دی تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ سوچنے لگا۔

"وہی تو پھر تم نے مجھے مارا کیوں نہیں اب تک؟" اس نے پھر وہی سوال کر دیا تو میں نے سکون سے کہا۔

"اس لئے کہ میں تمہیں اس کے سامنے لے جانا چاہتا ہوں، سودا اپنی جگہ، میں کوئی پیشہ ور قاتل نہیں، مجھے واپس جانا ہے، تم لوگوں کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا، تم لوگوں کی کوئی دشمنی ہے تو خود سنبھالو، یا تو مجھے خود قصبے تک چھوڑ کے آؤ، یا پھر پیروزاں کے سامنے جا کر معاملہ حل کرو۔" میں نے کہا تو اس کا چہرہ غصے میں تمتمانے لگا۔

"بات تو ٹھیک کر رہا ہے علی زین......" اماں نے کہا تو میرن شاہ نے اپنا فون نکالتے ہوئے تیزی سے کہا۔

"میں بلاتا ہوں اسے یہاں......"

"نہیں میرن شاہ جی نہیں، وہ سمجھ جائے گی کہ کچھ نہ کچھ ایسا ہو گیا ہے جو تم اس طرح فون

کر رہے ہو، اس کے سامنے اس کے منہ سے اپنے قتل کی بابت سنو۔" میں نے طنزیہ
انداز میں کہا تو وہ رک گیا، پھر غصے میں بولا۔
"اور اگر ایسا نہ ہوا؟"
"پھر تم جو چاہے سزا دینا، اماں سکین ضامن ہے۔" میں نے تیزی سے کہا تو وہ چند لمحے
سوچتا رہا پھر ایک دم سے پوچھا۔
"کہاں ہے وہ؟ چلو اس کے پاس۔"
"وہ اس وقت کوپے پر ہے، اس نے میرا وہیں انتظار کرنا ہے۔" میں نے کہا پھر سانس
لیتے ہی کہا، "تم چاہو تو اپنے بندے ساتھ لے سکتے ہو۔"
"وہ تو کرلوں گا، تم چلو۔" اس نے کہا اور پلنگ سے اتر کر جوتے پہنے، سرہانے پڑی
چابیاں اٹھائیں اور چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ تب تک میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔
"میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ، پوچھتی ہوں اس ڈائن سے۔" اماں سکین نے کہا تو
اس کا جواب میرن شاہ نے نہیں دیا، وہ چل پڑا تو اماں بھی اس کے پیچھے بڑھی۔ وہ تیزی سے
صحن میں کھڑی فوروہیل کی جانب بڑھا۔ نیلگوں روشنی پھیل گئی تھی، جس میں ہر شے واضح ہو
رہی تھی۔ جب تک وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، تب تک میں اماں سکین کو لے کر پچھلی نشست پر
بیٹھ گیا، انہی لمحات میں میری نگاہ کچن کے پاس کھڑی ساوری پر پڑی۔ اس کی نگاہوں میں
وحشت تھی، وہ جانتی تھی کہ میں ان کے ساتھ کیا کرنے والا ہوں۔ یہ لمحات بہت ہی زیادہ سنسنی
خیز تھے۔ اگر ساوری اپنے حواس کھو دیتی تو میری موت یقینی تھی۔ اس نے میری جانب دیکھا،
میں نے اسے کوئی اشارہ نہیں کیا، بس ایک نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ میرن شاہ نے فوروہیل
اسٹارٹ کی اور باہر کی جانب چل پڑا۔

اس کا رخ جیسے ہی کوپے کی طرف ہوا، اس نے اپنا سیل فون نکالا اور منشی مہر خان کو کال کی۔ اسے فوراً بندے لے کر کوپے پر پہنچ جانے کی ہدایت کی اور فون ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ جیسے ہی وہ بستی چراغ شاہ کے برابر آیا تو میں نے پسٹل کی نال میرن شاہ کی گدی پر رکھ دی۔

"میرن شاہ، گاڑی بستی کی جانب موڑ لو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"تیری بہن وہاں پر ہے؟" میں نے کہا۔

"کیا مطلب وہ گویا......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے پسٹل کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کر۔ میرے دوسرے ہاتھ میں بھی پسٹل ہے۔"

جیسے ہی میں نے یہ لفظ کہے فوروہیل کو ایک جھٹکا لگا، وہ میری بات سمجھ کر بدحواس ہو گیا تھا۔ تبھی اماں سکھن بولی۔

"تم نے دھوکا دیا بے غیرت......"

"نہیں ابھی تک نہیں، بستی میں چلو۔" میں نے کہا تو اس نے فوروہیل بستی کی جانب موڑ لی۔ میں اسے راستہ بتاتا رہا، دو منٹ بعد ہم مطلوبہ جگہ پہنچ گئے، جہاں میں اسے رکنے کو کہا تو وہ رک گیا۔ میں نے میرن شاہ کو اترنے کا کہا۔ وہ اتر کر کھڑا ہو گیا۔ تب میں نے اماں سکھن کو نیچے اترنے کا کہا اور اسی طرف والے دروازے سے نیچے اتر گیا۔

وہ دونوں میرے سامنے تھے۔ ایسے میں ساتول کچھ لوگوں کے ساتھ گلی کے ایک کونے سے نمودار ہوا۔ وہ تیزی سے ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی حیثیت بالکل ایک تماشائی جیسی تھی۔ میرن شاہ بے یقینی کے سے انداز میں میری جانب دیکھ رہا تھا تبھی اس نے مجھ سے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"یہاں کیوں لائے ہو؟"

"پہچانو، اس جگہ کو......"

"یہ کیا بکواس ہے۔" اس نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا تو میں اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

"تم نہیں تو تیری ماں کو اس جگہ کے بارے میں پتہ ہوگا۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم......" اس نے یوں کہا جیسے خوف زدہ ہو گیا ہو۔

"یاد ہے کچھ......" میں نے اپنے اندر کی آگ پر قابو پاتے ہوئے نفرت سے کہا تو وہ مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے اسے کچھ بھی سمجھ میں نہ آ رہا ہوں۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تم کیا کہہ رہے ہو۔"

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ میں نے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پسٹل اپنے نیفے میں رکھے اور آگے بڑھ کر پوری قوت سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ سناٹا چھا گیا۔ اس نے غصے میں مزاحمت کے لئے ہاتھ اٹھایا تو میں نے ہاتھ اس کی گردن پہ ڈالا اور جھٹکا دیا، وہ لڑکھڑایا تو میں نے اپنا گھٹنا اس کے منہ پر مارا۔ وہ ڈکارتا ہوا ریت پر آ رہا۔ تبھی میں نے ایک ٹھوکر اس کے منہ پر ماری۔ اس دوران اماں سائیں چیختی ہوئی مجھے گالیاں دینے لگی تھی۔ میں زیادہ دیر تک وہ تماشا نہیں لگا سکتا تھا۔ اس لئے پسٹل نکال کر سیدھے کئے اور اس کی ٹانگوں میں فائر کر دیئے۔ فلک شگاف چیخ بلند ہوئی، اس کے ساتھ ہی اماں سائیں کی بھی چیخ ابھری، وہ مجھے مارنے کو دوڑی، تب تک سانول اور اس کے ساتھی اماں کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے واویلا مچاتی ہوئی اماں کو پکڑ لیا۔

میرن شاہ ریت پر تڑپ رہا تھا۔ اس کے حلق سے یوں آوازیں نکل رہی تھیں جیسے بکرا ذبح

کر دیا گیا ہو۔ چند لمحوں بعد اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے معاف کر دو، تم جو کہو گے میں وہ کروں گا، میں......"

"یہ جگہ پہچانو....."

"تم بتا دو......" اس نے چیختے ہوئے بے بسی سے کہا۔

"بے غیرت تم لوگوں نے ظلم ہی اتنے کیے ہیں کہ یاد ہی نہیں۔" یہ کہہ کر میں اماں کے پاس جا پہنچا اور اس کے بال پکڑ کر بولا۔" اللہ بخش رہتا تھا کبھی یہاں پر، جسے تیرے شوہر سیدن شاہ نے صرف اس لئے مروا دیا تھا۔ اس کی بہن تیرے اس بے غیرت بیٹے کو پسند آ گئی تھی۔" میں نے اماں کو چھوڑا اور میرن شاہ کے منہ پر ٹھوکر مارتے ہوئے چیخ کر پوچھا۔" کچھ یاد آیا بے غیرت......"

"تت...... تم کون ہو......"

"میں کوئی بھی ہوں، یاد کرو، تم نے تیرے باپ نے اور اس عورت نے اللہ بخش کی بہن پر ظلم کیا؟ بجائے دادرسی کرنے کے، اس عورت نے ٹھوکریں مار کر اسے اپنے گھر سے نکالا......" میں نے کہا تو مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میرے اندر کی آگ نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ میرے سامنے میرن شاہ پڑا کراہ رہا تھا۔ میرے یاد دلانے پر اماں بھی سہم کر مجھے دیکھنے لگی تھی۔ اسے سمجھ میں آ گیا تھا کہ کوئی اپنا انتقام لینے آ پہنچا تھا۔

"معاف کر دو...... جو ہرجانہ کہو دیں گے...... میرے بیٹے کو چھوڑ دو...... میں تیری ماں جیسی ہوں....."

"نہیں میری جیسی نہیں ہو تم، میری ماں تو اس روہی میں کیڑے مکوڑے کے جیسی تھی، جسے تم جیسے بے غیرتوں نے مسل کر رکھ دیا، کوئی شنوائی نہیں، کوئی عدالت نہیں...... کوئی قانون نہیں

.......“ یہ کہتے ہوئے میں نے میرن شاہ کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا۔ اماں نے بلکتے ہوئے کہا

”چھوڑ دو رب کا واسطہ چھوڑ دو۔“

”یہ سانول ...... اس کی منگیتر وسائی ...... اس کا کیا قصور تھا۔ تب تم نے اپنے بیٹے سے نہیں کہا ...... یہ بھی کسی کی عزت ہے ...... اسے قتل کر دیا ......“ میں نے کہا تو میرن شاہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اماں بھی پاگلوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگی۔ تب میرن شاہ کو یقین ہو گیا کہ میں اسے مار کر رہوں گا۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے، بلکتے ہوئے کہا۔

”مجھے بھلے مار دو، لیکن میری ماں کو چھوڑ دو......“

”نہیں تیری ماں کو اس سے بھی بڑی سزا دوں گا، وہ تجھے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا ہوا دیکھے گی ...... اب تک وہ دوسروں کو تیرے ہاتھوں سے مرتا ہوا دیکھتی رہی ہے، اب تجھے دیکھے گی تو پتہ چلے گا، اپنوں کے مرنے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

وہ بستی کی ریتلی گلی میں گھسٹتا ہوا مجھ سے ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ میرے چاروں طرف کھڑے لوگ دم سادھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ سانول نے اماں سگن کو پکڑا ہوا تھا۔ وہ خود کو چھڑواتے ہوئے مجھے روکتے ہوئے چیخ رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے میرن شاہ نہیں، وہ جلا ہوا گھر تھا، جس کے سامنے میرا باپ خون میں لت پت مجھے کہہ رہا تھا کہ بھاگ جاؤ، یہ تجھے ماردیں۔۔۔ کچھ فاصلے پر میری ماں کی لاش پڑی ہوئی تھی اور اس سے ذرا پرے میری پھوپھی کھلی ہوئی بے جان آنکھوں سے اس ظالم معاشرے کا المیہ بنی پڑی تھی۔

جلا ہوا گھر آج بھی ویسا ہی تھا۔ اس پر گھاس پھونس اُگ چکا تھا۔ کسی نے وہاں پر ”تالے

کی لکڑیاں جمع ہوئیں تھیں۔ میں نے جیب سے ماچس نکالی اور اسے آگ لگانے لگا۔ سوکھی لکڑیاں دھڑ دھڑ جلنے لگیں۔

"خود اس آگ میں جلے گا یا میں تجھے جلاؤں۔" میں نے پوچھا تو اماں نے چیخ مارتے ہوئے کہا

"نہیں....... یہ ظلم مت کرنا......"

"میری ماں کا قصور بتا دو۔" میں نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا تو وہ نڈھال سی ہو گئی۔ جیسے غش کھا گئی ہو۔ میں نے ریت پر پڑے ہوئے میرن شاہ کی طرف دیکھا اور اس کی ٹانگوں پر فائر کرنے لگا۔ وہ سہم کر ساکت ہو گیا تھا، میں نے اسے ٹانگ سے پکڑا اور الاؤ کے قریب لے گیا۔ آگ کی تپش مجھ تک پہنچی تو میرے اندر کی نفرت پورے جوش سے باہر آ گئی۔ میں نے اسے گھمایا اور آگ میں پھینک دیا۔ میرن شاہ کی چیخ بلند ہوئی۔

"نہیں......" اماں وحشیانہ انداز میں ساتول سے خود کو چھڑا کر آگے بڑھی۔ تب تک میرن شاہ کو آگ نے پکڑ لیا تھا۔ وہ چیختا بلکتا ہوا خاموش ہو چکا تھا۔ اماں اسے بچانے بڑھی تھی لیکن آگ میں نہ کود سکی۔ وہ ریت پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ اس عورت کے لئے بڑی بھیانک سزا تھی جو لوگوں پر ظلم کرنا اپنا حق سمجھتی رہی تھی۔

میں نے ساتول کی طرف دیکھا، پھر وہاں کھڑے لوگوں کی جانب، وہ سب خوف زدہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ میں نے سب کی طرف دیکھا اور ایک نوجوان کے پاس جا کر اس کے سینے پر انگلی رکھ کر پوچھا۔

"کیا دیکھا تم نے......؟"

"میں نے کچھ نہیں دیکھا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کس نے قتل کیا ہے......" میں نے پوچھا۔

"ہم اسے جانتے ہی نہیں نہ پہچانتے ہیں۔" اس نے سکون سے جواب دیا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر سب کی طرف دیکھا اور اونچی آواز میں کہا۔

"کب تک ظلم سہتے رہو گے۔ قصوروار تم لوگ ہو۔ ظلم سہتے ہو لیکن ظالم کے سامنے کھڑے ہونے کا حوصلہ نہیں کرتے ہو۔"

میری بات کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں وہاں سے پلٹا اور میرن شاہ کی فور وہیل میں آ بیٹھا۔ وہ اب تک اسٹارٹ ہی تھی، میں نے گیئر لگایا اور وہاں چل دیا، جہاں میری جیپ کھڑی تھی۔ میں نے اپنا فون نکالا اور آفتاب کے نمبر پش کر دیئے۔ پہلی ہی بیل پر اس نے فون ریسیو کر لیا۔

"کیسے ہو؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں، میں نے میرن شاہ کو مار دیا ہے۔ تم فوراً یہ علاقہ چھوڑ دو، ایک لمحہ ضائع کیے بغیر......" میں نے تیزی سے کہا تو وہ میرے بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔

"تمہیں یوں کیسے چھوڑ کر جائیں گے؟"

"میں بھی تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔ پیروزاں اس وقت بہاول پور میں ہے۔ اس کے راستے میں گھات لگانی ہے۔ رستے میں کہیں میرا انتظار کرو۔ پیروزاں کو کہیں رستے ہی میں ختم کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ نہ ہو کہ ہم سب یہیں پھنس جائیں، فوراً نکلو، میں بھی تم لوگوں کے پیچھے آتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ بولا۔

"لیکن یہاں نکلنے میں ہماری ضرورت......"

"یہاں سے زیادہ وہاں ہو گی تیری ضرورت...... تم سمجھتے کیوں نہیں ہو" میں نے اس کی

توجہ دلائی تو وہ تیزی سے بولا۔

"اوہ، ٹھیک ہے، ہم تمہارا انتظار کریں گے، تم نکلو۔"

"ہاں ٹھیک ہے، میں نکل چکا ہوں۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں ابھی بستی سے نکلا ہی تھا کہ میری نگاہ اپنی جیپ پر پڑی۔ اس کے گرد چند لوگ جمع تھے۔ اسکے ساتھ دو مزید جیپیں کھڑی تھیں۔ میں حیران رہ گیا کہ ایسا کیوں ہے؟ اچانک میری نگاہ منشی مہر خان پر پڑی، وہ فور وہیل کی جانب دیکھ رہا تھا، جسے میں ڈرائیو کر کے اپنی جیپ کی جانب جانے والا تھا۔ میں ایک لمحے ہی میں سمجھ گیا، میرن شاہ نے اسے بندے لے کر گوپے کی جانب نکلنے کو کہا تھا۔ وہ نکلا ہوگا اور اس کی نگاہ میری جیپ پر پڑی ہوگی۔ میری جیپ کا وہاں ہونا ہی مشکوک تھا۔

میں ان کے پاس نہیں جا سکتا تھا اور میرے پاس صرف اتنا وقت تھا کہ میں فور وہیل موڑ لوں۔ اس وقت وہ یہی گمان کر سکتے تھے کہ یہ فور وہیل میرن شاہ ڈرائیو کر کے لا رہا ہے۔ ممکن ہے ابھی ان تک اس کے قتل کی خبر نہ پہنچی ہو۔ اگلے ہی لمحے میں نے رفتار ذرا سی ہلکی کی اور فور وہیل کو مخالف سمت میں موڑ لیا۔ فور وہیل کچے راستے سے ہٹ کر ریت پر چڑھی لیکن طاقتور ہونے کے باعث ایک جھٹکے سے نکل گئی۔

میں نے بیک مرر میں دیکھا، وہ لوگ جیپوں پر سوار ہو رہے تھے۔ منشی مہر خان کے اشاروں سے لگ رہا تھا کہ وہ میرا پیچھا کرنے والے ہیں۔ میں نے فور وہیل کی رفتار بڑھا دی۔ میری پوری کوشش تھی کہ میں اس چھوٹی سی تارکول کی سڑک تک پہنچ جاؤں جو قصبے سے ہوتی ہوئی بہاول پور کی جانب نکلتی تھی۔ میں جس کچی سڑک پر جا رہا تھا اسے کسی بستی میں نکلنا تھا، وہ بہرحال تارکول کی سڑک کی جانب نہیں لے کر جا سکتی تھی۔ میں نے پھر بیک مرر میں

دیکھا، وہ جیپیں میرے پیچھے آرہی تھیں۔ میں نے رفتار مزید تیز کر دی۔
میرن شاہ کا قتل کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ دوسرا اس بے دردی سے قتل کرنا کہ صاف پتہ لگتا تھا کہ اسے مارنے میں کتنی نفرت کا اظہار تھا۔ روہی میں جدید دنیا کے جتنے بھی اثرات تھے لیکن قبائلی سسٹم بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا۔ وہی صدیوں پرانی روایات موجود تھیں کہ دشمن کا دوست، دشمن اور دشمن کا دشمن، دوست۔ پھر قبائل کا ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہی ان کی بقا کا باعث ہوتا تھا۔ میرن شاہ صرف اپنے لوگوں کے ساتھ ہی طاقتور نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ چھوٹے بڑے قبیلے بھی تھے۔ اس طرح میرا قتل کر کے روہی سے نکلنا انتہائی مشکل تھا۔ مگر میں اسے ناممکن نہیں سمجھتا تھا۔ ابھی میرے پاس وقت تھا، ممکن ہے انہیں خبر مل گئی ہو لیکن روہی میں ابھی خبر پھیلنے میں وقت لگتا تھا۔ وہ وقت چاہے تھوڑا ہی سہی، میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔
روشن دن میں بھوری ریت چمک اٹھی تھی۔ میرے پیچھے کی جیپیں اتنی طاقتور نہیں تھیں۔ میں بیک مرر میں دیکھ رہا تھا، لمحہ بہ لمحہ میرا اور ان کا فاصلہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں یونہی فور ڈبل بھگائے چلا جا رہا تھا۔ وہ کوئی باقاعدہ رستہ نہیں تھا۔ کہیں پر ریت تھی، کہیں پکی زمین اور کہیں بھربھری مٹی تھی۔ روہی کا صحرا بالکل ہی سپاٹ یا بے آب و گیاہ نہیں بلکہ جھاڑیاں، پودے کہیں کہیں گھاس کی بھرمار ہوتی ہے۔ ایک خاص قسم کی گھاس جسے "طمب" کہتے ہیں اسی کے آس پاس ہرن پائے جاتے تھے۔ اگر کہیں پر پانی کا ٹوبہ بن جائے تو اس ذخیرہ شدہ پانی سے سبزہ بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ مجھے کوئی آئیڈیا نہیں تھا کہ میں فور وہیل کس سمت بھگائے چلا جا رہا ہوں، لیکن سورج کا اندازہ کر کے میں اپنے تئیں تارکول کی سڑک کی جانب بھاگا جا رہا تھا۔ میری کوشش یہی تھی کہ میں جتنی جلدی ہو سکے ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاؤں، پھر

راستہ تلاش کرنا اتنا مشکل نہیں تھا۔

مجھے فور وہیل بھگاتے تقریباً آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ میرے پیچھے آنے والی جیپیں اب دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ میں انہیں جُل دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں، تب میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اب مجھے تارکول کی سڑک کی جانب بڑھنا چاہئے۔ ایک اونچے ٹیلے پر کافی بڑی بڑی جھاڑیاں تھیں۔ میں نے اس کی اوٹ میں فور وہیل کھڑی کی اور فون نکال کر آفتاب کے نمبر ملانے لگا۔ چند لمحوں بعد ہی میرا اس سے رابطہ ہو گیا۔

"کہاں ہو تم؟" اس نے پوچھا۔

"یہی میں تم سے پوچھنے والا ہوں۔ میرے ہر طرف ریت ہی ریت ہے، ٹیلے ہی ٹیلے ہیں۔ جس طرف سڑک ہے وہ سمت سمجھ میں نہیں آ رہی۔" میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا تو وہ بولا

"ہم اس وقت سڑک سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہیں لیکن ہیں پاس ہی۔"

"تو پھر کیا اس کی مدد سے مجھے سمت بتاؤ گے؟" میں نے کہا تو وہ بولا۔

"ایک منٹ میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں۔"

میں انتظار کرنے لگا۔ اگلے دو منٹ میں مجھے اس نے سمت بارے سمجھا دیا۔ میں بالکل اس کے مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ بھگدڑ کی وجہ سے مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ تبھی میں نے کہا۔

"تم لوگ کہیں سکون کر دیا آہستہ آہستہ آگے بڑھو۔ میں پہنچتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور فون کال ختم کر دی۔ میرے خیال میں مجھے دائیں جانب اپنا سفر جاری رکھنا چاہئے تھا۔ مجھے لوکیشن دیکھنے کے لئے ٹیلے کے سرے پر جانا تھا تا کہ اندازہ کر سکوں کہیں کوئی بستی یا راستہ دکھائی دے جائے۔ یا پھر مجھے اندھا دھند ہی یونہی چلتے چلے جانا تھا۔

میں فوروہیل سے اترا اور ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ ٹیلے پر چڑھتے ہوئے میرے پاؤں ریت میں دھنس رہے تھے۔ میں زور لگاتے ہوئے چڑھتا چلا گیا۔ میں جیسے ہی ٹیلے کے اوپر آیا، میں حیران رہ گیا۔ جس طرف میں جا رہا تھا، اس جانب سامنے کوئی دس بارہ جیپیں اور فوروہیل آ رہی تھیں۔ اتنی تعداد میں یہ لوگ دیوانہ وار یونہی بھاگے نہیں چلے آ رہے تھے۔ میں مخالف سمت میں دیکھا، منشی مہر خان کی جیپیں کافی فاصلے پر بھاگی چلی آ رہی تھیں۔ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ میں گھیرا جا چکا ہوں۔ اپنے بچاؤ کے لئے اب جو کچھ بھی کرنا تھا مجھے خود ہی کرنا۔ اگر میں آفتاب کو فون کر بھی دیتا تو فوری طور پر میری مدد کو نہیں آ سکتے تھے۔ یہ آپشن میں نے فوری طور پر ذہن سے نکال دیا۔

میں وہاں جھاڑیوں میں دبک کر بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہاں دبک کر بیٹھنے کا مطلب یہ تھا کہ میں اپنا آپ ان کے حوالے کر دوں۔ زیادہ سے زیادہ دس منٹ بعد وہ مجھے گھیر سکتے تھے۔ ٹیلے سے نیچے کھڑی فوروہیل میری نشاندہی کر سکتی تھی۔ میں پیدل نکل کر بھی نہیں بھاگ سکتا تھا۔ کوئی ایسی آڑ نہیں تھی جہاں میں چھپ سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ میں کسی ٹیلے کی آڑ یا اوٹ میں ہو کر بیٹھ جاتا، اپنے اوپر ریت ڈال کر چھپ جاتا، لیکن کب تک؟ میں نے تیزی سے سوچا اور رسک لینے کا سوچ کر ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔ ٹیلے پر چڑھتے ہوئے دیر لگتی ہے اترنے میں نہیں۔ میں فوراً نیچے اترا، ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ وہ لوگ میرے پیچھے اور آگے کی سمت سے آ رہے تھے میں نے درمیان میں دائیں جانب کا رخ کیا اور فوروہیل بھگا دی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میرا اور سڑک کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔ مجھے ہر حال میں وہاں سے نکلنا تھا۔ میں جیسے ہی ان ٹیلوں کے درمیان سے نکل کر قدرے پکی زمین پر آیا جسے مقامی زبان میں "پک" کہتے ہیں۔ تبھی میری نگاہ دائیں بائیں گاڑیوں پر پڑیں۔ بلاشبہ وہ مجھے

دیکھ چکے تھے اور میری جانب بڑھ رہے تھے۔ یہی میرے امتحان کا وقت تھا۔ میں نے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے فورڈ ہیل کی رفتار مزید تیز کردی۔

میں زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی کلو میٹر تک گیا ہوں گا، دونوں طرف کی گاڑیاں میرے نزدیک ہوگئی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالا اور اپنے نیفے سے پسٹل نکال لیا۔ میرا اگر آخری وقت آ ہی گیا ہے تو میں اکیلا تو نہ مروں، کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر آخری وقت تک مقابلہ کرتے ہوئے مروں۔ میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ میں منشی مہرخان کو ماروں۔ دونوں طرف کی گاڑیاں میرے نزدیک ہوگئی تھی اچانک ان گاڑیوں سے فائرنگ ہونے لگی جو منشی مہرخان کی مخالف سمت سے آرہی تھیں۔ ایک لمحے کو میرا دل میری کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا کہ اب میرا آخری وقت آگیا ہے لیکن اگلے ہی لمحے میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میری فورڈ ہیل کا ٹائر پھٹنے کے ساتھ ہی منشی مہرخان والی جیپوں پر فائرنگ ہونے لگی تھی۔ میں زیادہ دور نہ جاسکا، فورڈ ہیل رک گئی تھی۔

وہ نووارد مجھے روکنے کے ساتھ ساتھ منشی مہرخان کو بھی روک رہے تھے۔ دونوں جانب سے فائرنگ ہونا شروع ہوگئی تھی۔ میں تیزی سے پچھلی سیٹ پر چلا گیا تھا۔ اتنی شدید فائرنگ ہونے لگی تھی میں دبک کر لیٹ گیا۔ اکا دکا گولیاں فورڈ ہیل کو لگ رہی تھیں۔ اچانک فائرنگ رک گئی۔ میں نے لاشعوری طور پر سر اٹھا کر دیکھا تو منشی مہرخان والی جیپیں پلٹ کر جارہی تھیں۔ بلاشبہ وہ یہی سمجھیں ہوں گے میری مدد کو کوئی آگیا ہے۔ ہوا بھی ایسے ہی تھا، نوواردوں نے میری مدد کردی تھی۔ مگر وہ کون تھے؟ دوست یا دشمن؟ اتنی تیزی سے وہ مجھ تک کیسے پہنچ گئے تھے؟ میں پچھلی سیٹ پر پڑا یہی سوچ رہا تھا کہ سناٹے میں آواز ابھری۔

”اوئے زین باہر آجا۔“

یہ تو اسی چاچا سائیں کی آواز ہے، ساول مجھے جس کے پاس لے کر گیا تھا۔ کیا وہ اس قدر تیز ہو سکتا ہے مجھ تک پہنچ جائے یا وہ بھی...... یہی سوچتے ہوئے میں نے سر اٹھایا تو وہ سامنے کھڑا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں اس پر فائر نہیں کروں گا۔ وہ فور وہیل کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اکیلا ہی کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا، اگر کوئی اس کے ساتھ تھے بھی تو وہ ابھی گاڑیوں ہی میں تھے۔ باہر نکلنا ایک بڑا رسک تھا لیکن مجھے باہر تو نکلنا تھا، میں خود نہ نکلتا تو وہ مجھے نکال لیتے۔ میں نے پسٹل کو پھر سے نیفے میں اڑسا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ میں نے ریت پر قدم رکھا ہی تھا کہ چاچا سائیں میری جانب بڑھا۔ اس نے دور ہی سے بانہیں پھیلا دیں۔ میں نے اس کے گلے ملتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"چاچا سائیں تمہیں پتہ کیسے لگ گیا کہ میں......"

"میں ساول کے ساتھ رابطے میں تھا۔ میں بھی ذہنی طور پر تیار تھا کہ تم اگر میرن شاہ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا، اس نے جب بتایا کہ منشی مہر خان تمہیں پکڑنے کے لئے تمہارے پیچھے نکل پڑا ہے تو میں نے اپنے دوست کو ساتھ لے کر نکل پڑا۔" اس نے کہا۔

انہی لمحات میں میری نگاہ اس کے پیچھے فور وہیل سے اترتے ہوئے شخص پر پڑی تو میں چونک گیا۔ وہ رنگو بھوہڑ تھا۔ شاید اس نے میرا چہرہ پڑھ لیا تھا اس لئے رنگو بھوہڑ نے مسکراتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

"گھبراؤ نہیں، میں دوست بن کر آیا ہوں، دشمن نہیں۔"

"اگر تم دشمن بن کر ہی آتے تا تب بھی مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہماری جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

”تمہیں دوست تو اب ہمیں بتانا ہی پڑے گا۔ تم نے وہ کام کر دیا جس کے لئے مجھے کئی برس ہو گئے، مگر نہیں کر سکا۔“

”بس، ہو گیا۔“ میں نے اختصار سے کہا، حالانکہ اسے کیا خبر تھی کہ یہاں تک پہنچنے کے لئے میں نے بے شمار راتیں اپنی آنکھوں میں کاٹی تھیں۔ کن صعوبتوں سے گزرا اور کن مصیبتوں کو سہا تھا۔ میں خاموش رہا تو اس نے پوچھا، ”جس نفرت سے تم نے میرن شاہ کو مارا ہے لگتا ہے تمہاری کوئی پرانی دشمنی تھی اس سے؟“

”اس نے مجھے دھوکا دیا تھا، صرف اپنی گائیوں کے عوض میرا سودا کر دیا، میری یہ قیمت لگائی اس نے۔“ میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے یونہی ایک بات کہہ دی۔ تبھی چاچا سائیں نے بڑے سکون سے کہا۔

”اچھا خیر۔ امیری اطلاع کے مطابق روہی میں پولیس پھیل گئی ہے۔ انہوں نے اس پورے علاقے میں اپنے مخبر چھوڑ دیئے ہیں۔ وہ بستی بستی تلاشی لے رہے ہیں۔“

”اور تمہیں ڈر ہے کہ اب میں تمہاری بستی نہ چلا جاؤں۔“ یہ کہتے ہوئے میں ہنس دیا پھر لمحہ بھر رُک کر بولا۔ ”فکر نہ کرو، میں نے ابھی نکلنا ہے۔ بس سڑک تک پہنچ جاؤں۔“

”سوچنا بھی مت کہ تم سڑک کے ذریعے نکل جاؤ گے۔“ چاچا سائیں نے تیزی سے کہا پھر سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ڈر نہیں اور نہ شک ہے، مجھے یقین ہے، وہ بستی جائیں گے۔ ممکن ہے وہ اب تک ہو کر جا بھی چکے ہوں۔ اس لئے میں نے رشو کو بلایا ہے۔ اب تم اس کے پاس رہو گے تو یہ.....“

”مطلب، سیدھے سیدھے ان کے پاس چلا جاؤں، جو پہلے ہی میری جان کے دشمن ہیں۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”نہیں، ایسا نہیں ہے، اب روہی میں تمہارا سب سے بڑا کوئی دوست ہوگا تو وہ میں ہوں، رَتّو بھوہڑ...... کیونکہ میرن شاہ میرا سب سے بڑا دشمن تھا اور پیرو زاں اس سے بھی بڑی دشمن۔“ اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

”تمہاری اس دشمن کو بھی میں ہی ختم کروں گا۔“ میں نے نفرت سے کہا۔

”لیکن، ابھی نہیں کر سکتے، اس کے لئے کچھ وقت درکار ہوگا، پوری پلاننگ چاہئے اس کے لئے اور......“

”میری گارنٹی ہے، چاچا سائیں کی گارنٹی پتر...... رَتّو بھوہڑ ہمارا دوست ہے، یہ دھوکا نہیں دے گا۔“ وہ بڑے مان سے بولا۔

”کیا، یہ دھوکا......“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”میرا پتر بختاور، اسی رَتّو بھوہڑ کی وجہ سے بچا تھا، وہ اب بڑے محفوظ ہاتھوں میں ہے، اب یہ میرن شاہ مر گیا ہے نا تو وہ بہت جلد میرے پاس آ جائے گا۔“ چاچا سائیں نفرت بھرے لہجے میں جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، جیسے تم کہو لیکن یہ دیکھ لو...... تمہارے یہ احتجاجی دوست ناراض ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا اور خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”وہ اب ناراض نہیں ہوں گے، تم ان سے ملو گے تو پتہ چل جائے گا۔“ رَتّو بھوہڑ نے کہا پھر تیزی سے بولا، ”ساری باتیں یہیں کر لیں گے، یہاں سے نکلیں، ابھی ہم محفوظ نہیں ہیں۔“

اس نے کہا ہی تھا کہ میں اور چاچا سائیں اس کی فور وہیل کی جانب بڑھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ڈرائیور تھا۔ ہم پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئے تو پسنجر سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے رَتّو بھوہڑ نے سب گاڑی والوں کو اشارہ کیا۔ تبھی کوئی کسی جانب نکل گیا تو کسی جانب۔ میں سمجھ گیا۔

ریت پر ثبت ہونے والے نشان اگرچہ زیادہ دیر تک نہیں رہتے لیکن جب تک رہتے ہیں، وہ پوری پوری نشاندہی کر دیتے ہیں۔ وہ سب گاڑیاں یوں نکلی تھی کہ کسی کو خبر نہ ہو کون سی گاڑی کدھر گئی ہے۔

☆......☆......☆

پتہ نہیں کتنا وقت ہوا تھا، آہٹ پر میں نے چونک کر دیکھا۔ چاچا سائیں کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا ٹرے میں کھانا رکھے آ گیا تھا۔ اس نے میرے سامنے کھانا رکھا تو میں اٹھ کر ہاتھ دھونے لگا۔ نوجوان واپس چلا گیا تو وہ بولا۔

"حالات بہت گھمبیر ہو گئے ہیں۔ پروزاں آ گئی ہے اور وہ کسی پاگل کی طرح بے قابو ہو رہی ہے۔"

"اچھا ہے، اسے مزید پاگل ہونے دو چاچا۔"

"اس کے پاگل ہونے سے یہ ہوگا کہ وہ پوری روہی میں تمہیں تلاش کروا رہی ہے۔ اس وقت ہر بندے کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔ بیلی کا چپہ چپہ تک آ گیا ہے۔ گاڑیاں بستی بستی پھیل گئی ہیں۔ جس بے دردی سے تم نے میرن شاہ کو مارا ہے وہ بھولنے والی نہیں اسے جو بھی ......" وہ کہہ رہا تھا لیکن میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"وہ زیادہ سے زیادہ کیا کرے گی، اس کے بندے مجھ تک پہنچ جائیں گے، فرض کرو کہ وہ مجھے پکڑ بھی لیتے ہیں تو کیا مجھے مار دیں گے؟ تو مار دیں، اس کے بعد کیا ہوگا؟" میں نے روٹی توڑتے ہوئے کہا۔

"خیر، میں ان بندوں کو تم تک نہیں پہنچنے دوں گا۔ وہ چاہے جو مرضی کر لیں، پولیس تو آئے گی کیونکہ ہمارے دشمن بھی ان کے ساتھ ہیں۔" چاچا سائیں نے ایک ہی سانس میں

اچھی اور بری بات کہہ ڈالی۔ میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ وہ باہر کے حالات بارے بتاتا رہا۔ میں سیر ہو کر کھا چکا تو اس نے برتن سمیٹ لئے۔ باہر جاتے ہوئے اس نے کہا۔

''میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور پھر سے چار پائی پر لیٹ گیا۔

پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا تھا۔ کبھی میری آنکھ لگ جاتی، کبھی میں غنودگی میں چلا جاتا، مگر لاشعوری طور پر میں چوکنا تھا۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ میں رنگو بھوہڑ کی بستی میں تھا۔ میں اگر چاہتا تو ان کی مدد سے تار کول کی سڑک تک چلا جاتا، آگے جو بھی ہوتا۔ مگر میں خود ہی سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اب میں فیصلہ کر چکا تھا کہ پیر وڈاں کو ختم کر کے ہی واپس جاؤں گا۔ اس کے لئے میں رنگو بھوہڑ کی پوری مدد لوں گا۔

یہی کوئی سہ پہر کا وقت تھا جب جاجا سائیں کمرے میں آ گیا۔ وہ میرے سامنے والی چار پائی پر بیٹھتا ہوا ہولے سے بولا۔

''میرن شاہ کی باقیات کو دفنا دیا گیا ہے۔''

''حالات کیا ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کل بہت بڑا اکٹھ ہونے والا ہے۔ پولیس بھی موجود ہے، جسے حکم دیا گیا ہے اس اکٹھ سے پہلے پہلے قاتل کو پکڑ کر پیش کیا جائے۔'' وہ دبے ہوئے لہجے میں یوں بولا جیسے انتہائی مشکل حالات آنے والے ہوں۔

''کس نے دے دیا ہے یہ حکم؟'' میں نے پوچھا۔

''انہوں نے جن کی اس علاقے میں چلتی ہے۔ پولیس کا بڑا افسر بھی آیا تھا، پورے

علاقے کی سیاست یہاں جمع تھی۔ شہر سے وہ لوگ بھی تھے جو یہاں ان کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں۔ سارے زور آور لوگ تھے یہاں پر۔" اس نے یوں کہا جیسے مرعوب ہو گیا ہو۔ چاچا سائیں کا لہجہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ خوف زدہ شخص کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ لوگ اتنے طاقت ور نہیں ہیں۔ اگر طاقتور ہوتے تو میرن شاہ کے سامنے دب کر نہ رہتے۔ اگرچہ وہ بھی ان کا مقابلہ کر رہے تھے لیکن بختاور وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جس نے اسے پناہ دی تھی وہ بے دردی سے قتل ہو گیا تھا۔ اگر رژو بھوہڑ کے یہاں تلاشی شروع ہو بھی جاتی تو یہ لوگ زیادہ دباؤ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ بستی بہادر خان چدھڑ کے لوگ بھی اتنے طاقتور نہیں ہیں لیکن ان کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی، وہ پھر بھی قابل بھروسہ لوگ تھے۔ تبھی میں نے چاچا سائیں سے بڑے سکون سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے، مجھے یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ورنہ وہ لوگ آپ سب کو بہت تنگ کریں گے۔ ویسے بھی میں کب تک ایک کمرے تک محدود ہو کر پڑا رہوں گا۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن میں تمہاری حفاظت کا وعدہ کر چکا ہوں، میں اور رژو بھوہڑ آخری دم تک تمہاری حفاظت کروں گا۔" اس نے حوصلہ مند لہجے میں کہا۔

"چاچا سائیں یہ نوبت ہی کیوں آئے؟ میں نہیں چاہتا کوئی انگلی اٹھائے۔ مجھے کہیں اور ٹھکانہ کرنا ہو گا۔" میں نے سکون سے کہا۔

"میں تو ہر طرح سے حاضر ہوں باقی تم جیسے کہو۔" اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"اس بستی سے کوئی بھی میری مخبری کر سکتا ہے۔ کسی امتحان میں پڑنے کی بجائے، میرا نکل جانا ہی بہتر ہے۔" میں نے کہا تو چاچا سائیں سر جھکاتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر

سوچتے رہنے کے بعد بولا۔

"تم نہادھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔ پھر دیکھتے ہیں میں رفو بھو ہڑ سے مشورہ کر لوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا پھر اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔

شام ڈھلتے ہی میں بستی سے نکلا تو میرے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ فیصلہ ہو گیا تھا۔ کوئی بستی تک نہ بھی پہنچ سکے یہاں سے مخبری بھی ہو سکتی تھی۔ اب تک کوئی راجستانی میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ ہماری کوشش یہی تھی کہ کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر نکلا جائے۔ ہم پیدل ہی چل پڑے تھے۔ چھوٹا سا بیگ میرے کاندھوں پر تھا، جس میں فالتو میگزین تھے، جبکہ پسٹل میں نے اپنے نیفے میں اڑسے ہوئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کے نوجوان کے پاس کوئی ہتھیار تھا یا نہیں، جب میں چلنے لگا تو وہ میرے ساتھ ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے یہی بتایا تھا، اسکے ساتھ جاؤ، یہ تمہیں ایک محفوظ مقام پر لے جائے گا۔

ہم گپ شپ کرتے ہوئے پیدل چلتے چلے گئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد ایک چھوٹے سے دربار تک پہنچ گئے۔ اس کی چار دیواری نہیں تھی۔ اگر دربار کے اندر اور باہر دیئے روشن نہ ہوتے تو شاید کچھ فاصلے سے بھی اندازہ نہ ہوتا کہ یہاں کوئی دربار ہے۔ کچھ فاصلے پر گھاس پھوس سے بنی جھونپڑیاں تھیں۔ وہ نوجوان مجھے ایک جھونپڑی میں لے گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے ماچس نکال کر دیا سلائی روشن کی اور تلاش کر کے چراغ جلا دیا۔ جھونپڑی کی ایک جانب گھاس پھونس کو اس طرح تہہ کر کے رکھا ہوا تھا جیسے کوئی اس پر سویا ہو۔ اگلے چند لمحوں میں میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے اپنے کاندھے سے چادر اتاری اور وہاں بچھا دی، پھر بولا۔

"لو بھائی یہاں لیٹ جاؤ۔"

"اور تم......؟" میں نے پوچھا۔

"میں یہاں سونے نہیں آیا، میں جاگ کر پہرا دوں گا۔" اس نے بڑی سادگی سے کہا تو میں ہنس دیا۔ پھر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کتنے دن تک پڑے رہیں گے یہاں؟"

"یہی کوئی دو چار دن، جب روہی میں تلاشی والی ہلچل ختم ہو جائے گی تب پھر جو حکم ہوگا۔" اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"چل ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور وہیں لیٹ گیا۔ ایک گونہ سکون میرے بدن میں اتر گیا۔ تبھی اس نوجوان نے اپنے بیگ میں سے ایک پوٹلی نکالی اور تنوریاں روٹیاں میرے سامنے رکھ دیں۔ پھر منرل واٹر کی ایک بوتل مجھے تھماتے ہوئے کہا۔" لے بھائی کھا۔"

"اب تو کھا لیں گے، دو چار دن کیسے گزاریں گے اس ویرانے میں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ بولا۔

"یہاں جو دربار کا مجاور ہے نا، اپنا ہی بندہ ہے۔ اس کا گھر یہیں نزدیک ہی ہے، بس وہی ہمارے لنگر پانی کا بندوبست کرے گا۔"

"ربّ بڑا بے نیاز ہے یار، ہمارے جیسوں کو بھی رزق دیتا ہے۔ یہ اس کی بے نیازیاں ہی ہیں۔" میں نے کہا اور روٹی کھانے لگا۔ وہ میٹھی روٹیاں تھیں، جو اس وقت بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

کھانا کھا کر وہ نوجوان باہر نکل گیا تو میں نے اپنا فون نکالا۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ وہاں پر سگنل ہی نہیں تھے۔ مجھے آفتاب لوگوں کی اتنی فکر نہیں تھی۔ وہ بے وقوف نہیں تھے کہ راستے ہی میں کہیں پڑے ہوئے ہوں گے۔ انہوں نے جہاں جانا تھا وہ چلے گئے ہوں گے۔

میرا اگران سے رابطہ ہو جاتا تو روہی کے اندر ہونے والی ہلچل کے بارے میں پوری طرح پتہ چل جاتا۔ میں نے فون واپس جیب میں رکھا اور آنکھیں بند کر لیٹ گیا۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے دور کہیں کوئی فور جیپ آ رہی ہے۔ میں زمین پر ہی لیٹا ہوا تھا۔ اس لئے زیادہ اچھی طرح محسوس کر سکتا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری ساری سماعتیں اسی آواز کی جانب لگ گئیں۔ لمحہ بہ لمحہ آواز قریب آتی چلی جا رہی تھی۔ میں تیزی سے اٹھا اور جھونپڑی سے باہر آ گیا۔ باہر اندھیرا تھا اور دور دور تک کوئی ہیڈ لائیٹس دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ نوجوان کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے پوری کوشش سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک جانب بڑھ گیا۔ میں ذرا سے فاصلے پر گیا تو مجھے وہ نوجوان سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔

"تم نے سنی یہ آواز......؟" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں، میں سن رہا ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"کون ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے شاید دیکھا نہیں، یہاں سے تھوڑے سے فاصلے پر پکی سڑک ہے، کوئی مسافر ہو گا۔" اس نے بتایا۔

"اور کوئی ہماری تلاش میں ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"تو دیکھ لیں گے۔" اس نے جرأت مندانہ انداز میں کہا اور آواز کی جانب متوجہ ہو گیا۔ پھر ہولے سے بولا، "اگر وہ گاڑی ہماری جانب آ بھی جائے تو فوراً سامنے نہیں جانا، جب تک ......" اس نے کہا تو میں سمجھ گیا اس لئے اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔

"تم فکر نہ کرو، آؤ ادھر۔"

میں اسے لیتا ہوا جھونپڑی سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ وہاں کافی جھاڑیاں تھیں۔ ان میں آسانی سے چھپا جا سکتا تھا۔ ہمیں وہاں بیٹھے دو سے تین منٹ ہوئے ہوں گے کہ ایک فور وہیل جھونپڑی سے کچھ فاصلے پر آ رکی۔ وہ مکمل اندھیرے میں تھی۔ فور وہیل کے اندر بھی روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ ایک شخص اترا اور جھونپڑی کی جانب بڑھا۔ پھر باہر ہی رک کر ہلکے سے آواز دی۔

"علی زین، او ئے رکے......"

میں آواز پہچان گیا۔ وہ چاچا سائیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی دو تین بندے مزید اتر آئے۔ وہ وہاں تک آئے تب تک چاچا سائیں جھونپڑی کی اندر چلا گیا، کچھ دیر بعد ہی وہ واپس آ کر تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

"اندر تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"ہو سکتا ہے وہ کہیں دوسری جگہ......"

"نہیں اندر ان کا سامان پڑا ہے۔ دیا بھی جل رہا ہے۔"

"تو پھر کہاں جا سکتے ہیں؟"

"ادھر اُدھر ہی کہیں ہوں گے۔"

اس کے ساتھ ہی چاچا سائیں نے آواز دی تو ہم جھاڑی سے باہر نکل آئے۔ ہم جیسے ہی ان کے سامنے گئے تو وہ سبھی جھونپڑی میں آ بیٹھے۔ چاچا سائیں کے ساتھ رَتّو بھوہڑ بھی تھا اور اس کے ساتھ دو راجستانی تھے۔ وہ دونوں نوجوان تھے۔ ایک دم خاموشی کے بعد چاچا سائیں نے کہا۔

"علی زین! اروہی میں اب تمہارا رہنا مشکل ہو گیا ہے۔"

”تو میں نکل جاتا ہوں روہی سے۔“ میں نے فوراً کہا۔

”یہاں سے لے کر بہاول پور تک، سمجھ تیرے لئے ہر جگہ خطرہ ہے۔ چوہدری وڈاں نے تیرے سر کی قیمت پچاس لاکھ رکھ دی ہے۔ زندہ یا مردہ، جس حالت میں بھی تم ملو۔“

”واہ۔ اب تو میری اہمیت ہوگئی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تم ہنس رہے ہو، لیکن آج شام ہی تمہارے ہونے کا شک لے کر پولیس میرے پاس آئی تھی۔ وہ پتہ نہیں مطمئن ہوئے ہیں یا نہیں۔“ رَتو بھوہڑ نے تشویش زدہ انداز میں کہا۔

”ہوسکتا ہے وہ تمہارے پیچھے ہی آگئے ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اب تو کوئی بھی انہونی ہو سکتی ہے۔ سنا ہے اماں سکھن اپنا سب کچھ لٹا کر تجھے پکڑنا چاہتی ہے۔ وہ اس طرح رو رہی ہے کہ ہر بندہ اس سے ہمدردی کر رہا ہے، کیا سیاست دان اور کیا پولیس والے۔“ اس نے اکتاہٹ سے کہا۔

”تم لوگ کیوں آئے اور اب کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دیکھ، یہاں اب تمہیں کوئی بھی نہیں رکھے گا، اگر کوئی رکھے گا تو اس پچاس لاکھ کے لالچ میں۔ بہاول پور تک تم جا نہیں سکتے، تمہارے پاس ایک ہی آپشن بچا ہے۔“ رَتو بھوہڑ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا......؟“ میں نے پوچھا۔

”جب تک معاملہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا، تم بارڈر پار چلے جاؤ۔ بختاور بھی وہیں ہے۔ جب واپس آنا تو اسے بھی ساتھ ہی لے کر آ جانا۔“ چاچا سائیں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”کیا مجھے ابھی جانا ہوگا؟“ میں نے صورت حال سمجھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، کیونکہ کل سے یہ آنا جانا بھی کچھ بند ہو جائے گا۔ ادھر ادھر کا سارا کام تو شب

سمجھو۔ اُدھر جاؤ گے تو کام بھی سمجھ لینا۔" یہ کہہ کر اس نے سانس لی پھر راجستھانیوں کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ "یہ دونوں تمہیں لے جائیں گے، ساری بات ہو گئی ہے۔ چند دن سکون کر۔" رنگو بھوہڑ نے کہا۔

"ہاں، بختاور کو بھی ساتھ لے آنا۔" چاچا سائیں شاید اپنے بیٹے سے کچھ زیادہ ہی اداس ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں جانے کے لئے ایک دم سے تیار ہو گیا۔ تو وہ مجھے بتانے لگا۔

"جہاں ہم کھڑے ہیں یہاں سے گریٹر چولستان کی سمجھو شروعات ہے۔ آگے گاڑی نہیں جا سکتی، تم لوگوں کو اونٹوں پر سفر کرنا ہو گا۔ ابھی نکلو گے تو بارڈر پار کرتے دن چڑھ جائے گا۔"

"لے بھایا...... کپڑے بدل لے۔" ایک راجستھانی نے اپنی پوٹلی میں سے کپڑے نکال کر دیئے۔ میں نے وہ کپڑے بدل لئے۔ اپنے پسٹل لئے، بیگ سنبھالا اور اپنا فون رنگو بھوہڑ کو دیتے ہوئے کہا۔

"اس فون میں صرف دو نمبر محفوظ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کال کرے، تو میرے بارے میں سب کچھ ٹھیک بتا دینا۔"

"ٹھیک میں بتا دوں گا پر تم پریشان نہ ہو، اُدھر جا کر تجھے بڑا اچھا فون مل جائے گا، جتنی مرضی یہاں کے لوگوں سے باتیں کرنا۔" رنگو بھوہڑ نے سکون سے کہا تو چاچا سائیں بولا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہئے۔"

"ہاں، چل رکھے، گاڑی میں بیٹھ، اور تم جاؤ۔ اونٹ مل جائیں گے آگے۔" اس نے تیزی سے کہا۔

کچھ دیر بعد ہم تینوں چل پڑے تھے۔ میرے دونوں ساتھیوں میں سے ایک کا نام رتن تھا

اور دوسرے کا رگھو۔ وہ دونوں ہی ہندوؤں کی نچلی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ ہم خاموشی سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

صبح کا نیلگوں اجالا پھیل رہا تھا، جب ہم راجستھان کے پھیلے ہوئے صحرا میں پیدل چلتے چلے جا رہے تھے۔ بارڈر پار کرنے سے پہلے ہم نے اونٹ چھوڑ دیئے تھے۔ تب سے اب تک کوئی دس کلومیٹر کا فاصلہ ہم پیدل کر چکے تھے۔ ہم تینوں میں سوائے مطلب کے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اچانک رتن نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

"بھایا، تھک تو نہیں گئیو۔"

"نہیں ابھی مزید چل سکتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دھیرج رکھو، بس یہی دو کلومیٹر اور ہے۔ پھر بستی ما پہنچ جائیں گے۔" اس نے یوں کہا جیسے اسے بھی گھر جانے کی خوشی ہو رہی ہو۔ تبھی رگھو بولا۔

"یہ تو بتا، آج ادھر ہی رہنا ہے یا......"

"آج کا دن اسے ادھر ہی رکھیں گے۔ کل پھر سوچیں گے آگے کی، ایک دن تو سکون کر لیں یار۔" اس نے کہا۔

"وہ چاچا سائیں کا بیٹا بختاور کدھر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو شہر میں رہتا ہے بڑے ٹھاٹھ سے۔ اس کا باپ خرچ دیتا ہے۔ تجھے ادھر ہی لے کر جانا ہے، تیرا خرچ رتن بھوجر کرے گا۔" اس نے مجھے بتایا تو میں مسکرا دیا۔ مجھے لگا وہ مجھ سے کوئی اہم ہی کام لینا چاہتا تھا۔

وہ چند گھروں کی بستی تھی، جس میں کسی گھر کی کوئی چار دیواری نہیں تھی۔ کہیں مٹی کے چکور

اور کہیں گول دیواریں بنا کر اوپر گھاس پھوس کے بنائے چھپر ڈالے ہوئے تھے۔ کسی نے زیادہ کھڑا بنایا ہوا تھا کسی کا کم۔ ہر گھر میں جلانے والی لکڑیوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ اسی طرح ہر گھر میں کوئی نہ کوئی جانور ضرور تھا۔ وہ گائیں تھیں یا بھیڑ بکریاں۔ اونٹوں کے ریوڑ کے ریوڑ موجود تھے۔ مجھے ایک چکور دیواروں والے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد رتن اور رگھو نجانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ پہلے پائل کا چھنا کا ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک پکی عمر کی عورت اندر داخل ہوئی۔ وہ لمبے سے قد کی تھی۔ تیکھے نقوش، سیاہ رنگ کا گھاگھرا چولی پہنا ہوا تھا۔ جس میں میں مختلف سبز پیلے رنگوں کے پھول بنے ہوئے تھے۔ اس کا رنگ سانولا تھا، اس نے سیاہ آنچل سر پہ جمایا ہوا تھا، چولی اتنی تھی کہ پوری کمر اور پیٹ پر کچھ نہیں تھا، پھر کہیں جا کر گھاگھرا شروع ہوا تھا۔ اس کی باہوں میں کہنیوں تک سفید چوڑیاں پہنی ہوئیں تھیں۔ اس کی بغلیں پسینے سے بھیگی ہوئی تھیں۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ میری جانب تک رہی تھی۔ چند لمحے یونہی دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔

”اے بھایا...... سو مت جانا، ابھی روٹی پکا رہی ہوں، بتا دودھ کے ساتھ کھا لے گا یا کچھ بھنڈی ترکاری بنا دوں؟“

”جیسے تیرا دل چاہے۔“ میں نے کہا اور اس کے چہرے پر دیکھا۔ کوئی عام سی عورت ہوتی تو بلاشبہ نظریں جھکا لیتی یا پھر نگاہیں چرا کر بات کرتی مگر وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”پھر جو بناؤں کھا لینا، اِدھر کے لوگوں کو زیادہ پسند نہیں آتے اُدھر کے کھانے۔“

”چل پھر میں دودھ کے ساتھ ہی کھا لوں گا۔“ میں نے کہا تو مسکراتے ہوئے باہر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ دودھ کا کٹورا بھرے اور ایک چنگیر میں روٹی رکھے آ گئی۔ اس نے وہ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ لے، کھا لے، پھر آرام سے سو جانا۔"

"رتن اور رگھو کہاں ہیں؟" میں نے کٹورا پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو نہیں آویں گے شام تک۔ تجھے میرے ذمے ڈال گئے ہیں۔" اس نے سکون سے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا، میری ذمے داری اب تم پر ہے؟"

"ہاں نا، تمہاری روٹی پانی، تمہیں دبانا، تھکاوٹ دور کرنا، کوئی بھی خدمت جو تم کہو۔" اس نے یہ سارا کچھ یوں کہہ دیا جیسے وہ سب ایک ہی جیسی 'خدمات' ہوں۔

"یہاں آنے والے ہر مہمان کی یونہی خدمت کرتی ہو؟"

"ہاں، ایسے ہی، جو ایک بار میرے پاس آتا ہے، وہ دوبارہ میرے پاس آنے کی خواہش ضرور کرتا ہے۔" اس نے ایک ادا سے اپنا آنچل سینے سے ہٹاتے ہوئے کہا تو میں سمجھ گیا وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ تبھی میں نے کہا۔

"مجھے شام تک سونا ہے، اگر تم......"

"روٹی کھا کے سو جا، کوئی ادھر نہیں آئے گا۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا پھر رک کر بولی۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"بول کیا پوچھتی ہے۔"

"دھندہ کرتے ہو یا قتل کر کے آئے ہو؟" اس نے سیدھے پوچھ لیا۔

"تیرا اس سے کیا مطلب......؟" میں نے پوچھا۔

”ہے نا، دھندہ کرنے والا ڈرپوک ہوتا ہے اور قتل کرنے والا بہادر۔“ اس نے یوں کہا جیسے مجھ پر طنز کر رہی ہو۔

”دیکھ، مجھ سے ایسے سوال نہ کر، تو نے روٹی کھلائی، تیرا شکریہ، اب تم کون ہو، کیا چاہتی ہو، میں نہیں جانتا۔“ میں نے کسی حد تک چڑتے ہوئے کہا۔ پتہ نہیں وہ کیا جانچنا چاہتی تھی، اس کی نیت کیا تھی۔ وہ میری طرف گہری نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر کچھ بولے بغیر باہر چلی گئی۔ لیکن میرے دماغ میں یوں چبھنے لگی جیسے اس کے من میں کچھ تھا جس کا اظہار نہیں کر پا رہی تھی۔

مجھے اُونگھ آ گئی تھی یا میں سو گیا تھا لیکن اچانک اٹھنے والے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر کوئی مردانہ آواز میں جھگڑ رہا تھا۔ اس کے ساتھ تیز تیز آواز میں وہی عورت باتیں کر رہی تھی۔ پھر اس کے ساتھ ہی ایک دوسری مردانہ آواز ابھری، جو مصلحت بھری تھی۔ اس میں میرا ہی ذکر تھا۔ ایک دم سے میرے سارے حواس بیدار ہو گئے۔ یہ باہر کیا ہنگامہ مچ گیا ہے؟ میں تیزی سے اٹھ کر دروازے تک گیا۔ میں نے دروازے کی درز سے دیکھا، باہر دو اجنبی راجستانی اور وہی عورت کھڑے تھے۔ ان میں زور شور سے بحث چل رہی تھی۔

”نہ، نہ کھیانہ...... میں اسے یوں نہیں لے جانے دوں گی، تیری دشمنی جو بھی ہے، رتن اور رگھو کو لے آؤ، وہ لے جائیں تو لے جائیں۔“ اس عورت نے تیکھی لہجے میں کہا۔

”وہ دونوں تو اب نہیں آنے والے، وہ گئے، اس بستی میں وہ کبھی نہیں آئیں گے۔ باقی رہی اس بندے کی بات وہ تو میں لے جاؤں گا۔“ ایک بوڑھے سے بندے نے غصے میں کہا

”پھر مجھے مار دے، اور لے جا۔“ عورت نے بھی غصے میں کہا۔

”تو کیوں اس کے لئے مرنے کو تیار ہے، تجھے نہیں پتہ یہ کون ہے؟“ ساتھ کھڑے

نوجوان مرد نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”دیکھ کھیا، تجھے پتہ ہے، میرے پاس جو آتا ہے میں اس کی خدمت کے پیسے لیتی ہوں، وہ کوئی بھی ہوتا ہے مجھے اس سے غرض نہیں، یہی میرا دھندہ ہے۔ آج اگر اسے میں نے دے دیا بکل کون آئے گا میرے پاس۔“ اس نے بھی سمجھانے والے انداز میں کہا تو کھیا بولا۔

”تجھے پتہ ہے بگا کون ہے، میرا اپنا ہے، اس کی دشمنی چل رہی ہے اس بندے کے ساتھ، جب تک وہ واپس نہیں آ جاتا، یہ میرے پاس رہے گا۔ باقی رہی پیسے کی بات، چار گنا لے مجھ سے......“ ادھیڑ عمر نے کہا۔

”وہ ادھر ہے بارڈر پار اور تجھے یہاں پتہ چل گیا کہ اس کی دشمنی ہے بگا کے ساتھ۔“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میں روز بات ہوتی ہے اس سے۔ مجھے رات ہی بتا دیا تھا اس نے۔ اب سیدھے سیدھے مجھ سے پیسے لے اور اسے میرے حوالے کر دے، ورنہ میں ابھی بی ایس ایف کو بتاتا ہوں، وہ......“ ادھیڑ عمر نے کہنا چاہا تو وہ عورت تنک کر بولی۔

”تو میرا کیا، بھی کا دھندہ چوپٹ ہوگا۔ تم کر لو گے دھندہ؟ تیرا وہ بگا آ جائے گا واپس؟...... نہ کھیا، مجھے دھمکی مت دے۔ بس رتن اور رگھو کو لے آ اور اسے لے جا۔ باقی میں کچھ نہیں جانتی۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو میں نے دروازہ کھول دیا۔ ان سب نے میری جانب دیکھا اور خاموش ہو گئے۔ میں کمرے سے باہر آ گیا۔ میں ان کی طرف دیکھتا ہوا ان کے پاس آ گیا۔ پھر اسی ادھیڑ عمر کی طرف دیکھ کر بولا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ میری بگا سے کوئی دشمنی نہیں، وہ خواہ مخواہ دشمنی بنا رہا ہے۔ دوسری بات مجھے اگر یہاں خراش بھی آئی نا...... تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ادھر کسی کو کچھ نہیں ہوگا۔“

"مجھے جو کچھ بنگا نے کہا، میں تو وہی جانتا ہوں۔ رتن اور رگھو ہمارے دشمن ہیں، ان کی تو ایک نہیں چلے گی یہاں، رنّو بھوہڑ کام ہمارے ساتھ کرے اور دشمنوں سے بھی ویسی ہی سانجھ رکھے، ایسا نہیں ہوگا۔ رنّو بھوہڑ کی نیت خراب لگتی ہے۔ اگر بنگا کے ساتھ تمہارا کچھ نہیں چل رہا تو پھر اس کے ساتھ تجھے یہاں بھیجا تھا۔ پھر میں نے اپنے بیٹے کو بچانا ہے، وہ آجائے تو میں تجھے جانے دوں گا۔" اس نے اپنا مدعا کہہ دیا۔

"دیکھ، تو ایک بار رنّو بھوہڑ سے بات کر لے، تیری یہ ضد کام نہیں آنے والی، میں یہاں ہوں۔ یہاں سے نہیں جانے والا۔ زیادہ ضد کرو گے تو کام خراب ہو جائے گا، بہت کچھ ختم ہو جائے گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا تو نوجوان نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"تم بھی ضد مت کرو۔ ہمارے پاس رہو، مہمان ہو ہمارے۔ بنگا آجائے تو تم چلے جانا۔" اس نے پھر وہی بات کر دی۔ مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا۔ وہ خواہ مخواہ بلائے جان کی طرح نازل ہو گئے تھے۔ میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

"میں تو نہیں جانے والا، میری رنّو بھوہڑ سے بات کرا دو پھر یہاں سے چلے جاؤ، دماغ مت خراب کرو۔" میں نے انتہائی سخت انداز سے کہا تو نوجوان نے نجانے کس دھن میں مجھے تھپڑ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا، جیسے ہی اس کا ہاتھ میری جانب بڑھا، میں نے اس کی کلائی پکڑ لی، اسی کلائی کو جھٹکا دیا تو وہ دوہرا ہو گیا میں نے دوسرے ہاتھ سے مکا اس کی پسلیوں پر مارا۔ وہ طاقتور تھا اس لئے کوئی آواز نہ نکلی، اس نے زور لگا کر اپنی کلائی مجھ سے چھڑا لی، اس سے پہلے کہ ہم گتھم گتھا ہو جاتے، وہ عورت ہمارے درمیان میں آ گئی۔ اس نے نوجوان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"دیکھ، تم زیادتی کر رہے ہو۔ میرا غصہ مت جگاؤ، اب چلے جاؤ۔"

”نہیں جاسکے گا یہ اس بستی سے۔ اگر یہ یہاں سے گیا تو میں تجھے ماردوں گا، سن لے۔“ نوجوان نے کہا اور پھر پلٹ کر ادھیڑ عمر سے کہا، ”فیصلہ کر، اگر آج رات تک بنگا آجاتا ہے تو ٹھیک ورنہ......“

”چل، میں کرتا ہوں ان کا بندوبست۔“ ادھیڑ عمر نے کہا اور نوجوان کو لے کر چل پڑا۔ میں انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ مجھے وہاں یہ پریشانی تھی کہ اگر انہوں نے بھارتی فورسز میں سے کسی کو بھی اطلاع دے دی تو سب کچھ چوپٹ ہو جانے والا تھا۔ مجھے شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں اگر بنگا کو اسی رات ماردیتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ سانپ ہر صورت میں سانپ ہی ہوتا ہے، اس کی آنکھیں نیلی ہوں یا سیاہ۔

”یہ کیا کرسکتے ہیں؟“ میں نے اس عورت سے پوچھا۔

”کرتو بہت کچھ سکتے ہیں، مگر یہ مجھے نہیں جانتے۔“ اس نے کہا اور پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولی، ”میں کرتی ہوں کچھ۔“

یہ کہتے ہی وہ اونچی آواز میں کسی کو آوازیں دینے لگی۔ اس کے جواب میں کسی گھر سے کوئی زور سے پکارتے ہوئے جواب دیا۔ چند لمحوں میں ایک لڑکا باہر ایک گھر سے باہر آگیا۔ وہ تیزی سے ہماری جانب آرہا تھا۔ اس نے میلی سی پتلون پہنی ہوئی تھی اور اسی طرح کی شرٹ تھی۔ بال لمبے لمبے جیسے پتہ نہیں کب سے نہ کٹائے گئے ہوں۔ اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے اس عورت کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ اسے کچھ سمجھانے لگی۔ وہ کھڑا سر ہلاتا رہا۔ ان کی باتوں کے دوران ہی ایک فور وہیل اچانک موڑ لے کر سامنے آرکی۔ میں چونک کر اس فور وہیل کو دیکھا، شاید دشمن سر پر آن پہنچا تھا۔ میرے لئے راہ فرار بھی نہیں تھا۔ میں بالکل سامنے کھڑا تھا، عورت اپنی بات بھول کر فور وہیل کی جانب دیکھنے لگی۔ تبھی فور وہیل کی ڈرائیونگ

سائیڈ کا شیشہ نیچے ہوا تو میری نگاہ ڈرائیور پر پڑی۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ مجھے اس کا چہرہ جانا پہچانا لگا، جیسے میں نے اُسے کہیں دیکھا ہوا ہو۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے وہیں رُک کے رہنے کا اشارہ کیا اور فوراً وہیل سے اتر کر میری جانب بڑھ آیا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سیاہ پتلون پر سفید قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا ہوا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر رکا اور چشمہ اتار کر بولا۔

"مجھے پہچانا؟"

"نہیں تو......" میں نے اس کے جانے پہچانے سے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ذرا سا مسکرایا، پھر بولا۔

"بستی چراغ، اونٹ، دوپہر، اور آخری مسافر اور......"

"اوئے تم بختاور ہو۔" میں نے جوش سے کہا۔

"ہاں نا، میں ہی بختاور ہوں۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں میرے بارے میں کیسے......" میں نے پوچھنا چاہا تو اس نے کہا۔

"باتیں کرنے کا بڑا وقت ہے، میں ذرا اس سے بات کر لوں۔" اس نے عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، پھر اپنی جیب سے فون نکال کر نمبر پش کیے اور رابطہ ہو جانے پر حیران سی عورت کو فون تھماتے ہوئے بولا۔ "لے رتن سے بات کر۔"

وہ فون پکڑ کر باتیں کرنے لگی۔ پھر فون واپس کرتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے لے جا سے۔"

جیسے ہی اس نے اجازت دی، بختاور نے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی جانب بڑھا دی۔ اس نے یوں پکڑی جیسے یہ اسی کا حق ہو۔ بختاور نے مجھے اشارہ کیا، میں نے اندر سے اپنا بیگ

اٹھایا اور اس کے ساتھ چل دیا۔
فور وہیل میں ایک بندہ بیٹھا ہوا تھا۔ میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا تو اس نے فور وہیل بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
"کہو کوئی بندہ آیا تھا؟"
"ہاں آیا تھا لیکن مجھے سمجھ نہیں آئی۔" میں نے کہا اور کچھ دیر پہلے کی روداد بتادی تب وہ بولا۔
"رگھو نے بے ایمانی کی ہے۔ اس نے بنگا کے باپ کو تمہارے بارے میں بتا دیا۔ اب وہ چین سے تو نہیں بیٹھے گا، مگر اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ مجھے رتن نے بتایا تو میں فوراً بھاگا۔"
"زیادہ سے زیادہ کیا کرے گا وہ؟" میں نے سرسراتے ہوئے پوچھا۔
"یہی اپنے بندے لگائے گا تمہیں پکڑنے کے لیے، اُدھر بنگا بھی بھاگ گیا ہے نارو بھوہڑ کے پاس سے۔" اس نے صورت حال بتائی۔
"انہیں میرے بارے میں پتہ ہے؟" میں نے پوچھا۔
"پتہ ہو یا نہ ہو، تم سکون سے رہو، میں دیکھ لوں گا سب۔" اس نے مجھے اطمینان دلایا اور پتلی سی تارکول کی سڑک پر فور وہیل بھگا دی۔
تھوڑا سا سفر طے ہو گیا تو میں نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔
"یار، تم اس دن کہاں غائب ہو گئے تھے؟"
میرے اس سوال پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا، پھر مزہ لیتے ہوئے بولا۔
"تمہیں آج تک یاد ہے"
"تم یاد ہو تو وہ بھی یاد ہے، مجھے آج تک تجسس ہے، تم تو یوں غائب ہوئے تھے جیسے

گدھے کے سر سے سینگ......" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یار، سیدھی سے بات تھی، کسی نے بھی عقل استعمال نہیں کی، میں اتنی دیر میں کہاں جا سکتا تھا بھلا، اُڑ تو سکتا نہیں ہوں۔"

"پھر کہاں گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"اسی ریڑھے کے پیچھے کنڈے لگا کر رسے باندھے ہوتے ہیں، اگر سامان کو باندھنا ہوں تو وہی رسے کام آتے ہیں۔ میں انہیں پکڑ کر چپک گیا تھا، کسی نے بھی پیچھے نہیں دیکھا۔ پھر تم پھنس گئے، مارا ماری ہونے لگی۔ ریڑھا چل پڑا، تھوڑا آگے جا کر، میں پھر ریڑھے پر بیٹھ گیا۔" یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگا دیا۔ میں یونہی خجل سا ہونے لگا کہ یہ سامنے کی بات میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی تھی۔ پھر سوچا اچھا ہوا نہیں آئی۔ میں خاموش ہو گیا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم "سکاسر" قصبے کے نواح میں واقع ایک فارم ہاؤس میں آ گئے۔ وہ ذرا سا بھی گنجان آباد علاقہ نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کوئی زرعی علاقہ تھا۔ ایک نہر اس قصبے کے درمیان سے گزرتی تھی۔ جس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم اس فارم ہاؤس تک پہنچے تھے۔

بختاور نے مجھے ایک آرام دہ کمرے میں لا کر کہا۔

"لو جی، کرو آرام، رات کو ملتے ہیں۔"

میں ایک بیڈ پر لیٹا تو مجھے نیند آ گئی۔

☆......☆......☆

رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ میں اور بختاور کھانا کھا چکے تھے۔ اس نے مجھے ایک پتلون اور شرٹ دے دی تھی جسے پہن کر میں بہت سکون محسوس کر رہا تھا۔ میں تازہ دم تھا۔ وہ مجھے

لے کر باہر آ گیا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اگر کوئی دوسرا وقت ہوتا تو میں اسے بڑا رومانوی ماحول سمجھتا لیکن ابھی تک مجھے اس ماحول کی خود سمجھ نہیں آئی تھی۔ دور تک سنسان سا علاقہ تھا۔ دور دور تک لان بنے ہوئے تھے۔ سامنے ایک لان میں کرسیاں پڑی ہوئیں تھیں۔ وہاں ملگجا اندھیرا تھا۔ وہ ایک کرسی پر جا بیٹھا تو میں نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا

"اکیلے ہی رہتے ہو تم یہاں؟"

"نہیں تو...... وہ دوسری جانب کئی بندے ہیں، سبھی دھندے والے ہیں، انہیں ابھی تیرے بارے میں نہیں بتانا۔" اس نے سکون سے کہا۔

"وہ کیوں، وہ کوئی......" میں نے پوچھنا چاہا تو وہ بولا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں، ابھی تجھ سے اودھے رام ملیں گے، وہی جس کے پاس ہم نے پناہ لی ہے، کہنے کو وہ ایک سیاست دان ہے۔ زمیندار ہے لیکن جرم کی دنیا میں وہ اس علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے۔ ابھی آئے گا تو مل لینا، پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" اس نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کم اور وارننگ دینے والا لہجے میں زیادہ سمجھایا تھا۔ میں خاموش رہا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

"میرا پیچھے مسلسل رابطہ ہے۔ وہاں جو کچھ ہوا، مجھے اس کا اندازہ تو ہے، لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کون سی بات......؟" میں نے پوچھا

"یہ میرن شاہ سے تمہاری کوئی پرانی دشمنی تھی یا کیا تھا کہ...."

"بختاور کا چھوڑا ہوا سے، جب میں پیرزادوں کو ختم کر دوں گا تو پھر ساری بات بتا دوں گا۔ یہ سب یاد کر کے میرے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔" میں نے انتہائی دکھ سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے پھر کسی وقت سہی۔"

ہم میں کچھ لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر ہم وہاں کے ماحول بارے باتیں کرنے لگے۔ ایسے میں دور سے فور وہیل کی ہیڈ لائیٹس ابھریں، بختاور کے منہ سے نکلا۔

"لو بھئی، او وہ مہے رام آ گیا۔ دیکھو، سنبھال کے بات کرنا۔"

میں خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد فور وہیل ہمارے قریب آ رکی پھر اس میں سے ایک ناٹے سے قد کا گول مٹول سا ادھیڑ عمر شخص برآمد ہوا۔ وہ چلتے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے کمسن گھیریاں کھا رہا ہو۔ اس نے سفید کرتا اور دھوتی باندھ رکھی تھی۔ گلے میں زرد رنگ کا پٹکا تھا، جیسے عموماً ہندو شدت پسند قسم کے لوگ پہنتے تھے۔ وہ ہمارے قریب آ گیا۔ اس کا منہ بڑا اسا را تھا اور آدھا سر گنجا تھا۔ اوپری لب پر ہلکی سی مونچھ تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے ہولے سے کہا۔

"رام رام بھائیا جی، بیٹھو بیٹھو۔" وہ بیٹھ گیا تو ہم بھی بیٹھ گئے۔ تبھی اس نے میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا، "مجھے آج جانا تھا، لیکن تم سے ملنے کا وقت تو مجھے نکالنا ہی تھا۔ سیدھے کام کی بات کریں۔"

"جی جی کیوں نہیں......" میں نے کہا۔

"دیکھ بھائیا...... یہاں بیٹھ کر تجھے روٹیاں تو توڑنی نہیں ہیں، جو جہاں تک میں نے تیرے بارے میں سنا اور جو مجھے بتایا اس سے تو یہی لگتا ہے کہ تم دھندے والے بندے نہیں ہو۔ یہ کھیپ لے کر جانا آنا، یہ چھوٹے چھوٹے کام والے تم بندے ہی نہیں ہو۔ کیا ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"جی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ بات تو تم اچھی طرح سمجھتے ہو گے کہ یہ جرم کی دنیا ہے، یہاں نہ دین دھرم یا جاتی کو

نہیں دیکھا جاتا۔ بس اپنا فائدہ اور طاقت دیکھی جاتی ہے۔ کچھ بڑا کرنا ہے تو بتاؤ، جیسا کہو گے ویسا کام ہے میرے پاس۔'' اس نے میرے چہرے پر نگاہیں گھماتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھیں اودھے رام جی، میں کچھ دن کاٹنے ہیں یہاں، اس کے بعد میں نے چلے جانا ہے۔ تب تک جو کام ہو......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

''چل جتنے دن ہے ادھر کام کر، دو چار بڑے کام ہیں۔ واپس جائے گا تو لمبے ڈالر لے جائے گا۔ میں جا رہا ہوں جیسلمیر، ادھر آ جا تو بختاور کے ساتھ۔ وہیں سارا معاملہ سمجھا دوں گا۔ عیش سے رہنا ادھر۔'' اودھے رام نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے فوراً رضامندی دے دی۔ تبھی وہ اٹھتا ہوا بولا۔

''بختاور، جی خوش ہو گیا، اس سے مل کر بندہ سمجھدار ہے، زیادہ بیچ بیچ نہیں کرنا پڑی، معاملے کو سمجھتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے میری جانب ہاتھ بڑھایا، پھر میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولا''چل آ، ملتے ہیں وہیں۔''

''وہ جو پیچھے بکا اور......'' بختاور نے کہنا چاہا تو اودھے رام حقارت سے گالی بکتے ہوئے بولا۔

''وہ چھوڑ ان کو، انہیں تو اب پتہ بھی نہیں چلے گا یہ کدھر ہے۔ باقی میں انہیں خود دیکھتا ہوں، کچھ لوگوں کا مغز ٹھیک کرنا ہے۔ تم لوگ تیاری کرو۔'' اس نے کہا اور میرا ہاتھ چھوڑ کر اپنی فوروہیل کی جانب چل پڑا۔ میں اس اعتماد پر کافی حیران تھا۔ پہلی ملاقات میں یوں اعتماد کر لینا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اودھے رام کے چلے جانے کے کوئی گھنٹہ بھر بعد ہم بھی چل پڑے۔ ہمارے ساتھ اس بار ایک ڈرائیور اور ایک نوجوان تھا۔

☆......☆......☆

ستا سری سے جیسلمیر کی کوئی چھ گھنٹے کی ڈرائیونگ تھی۔ رات کا دوسرا پہر ختم ہونے کو تھا، جب ہم شہر کے ایک گنجان آباد علاقے میں جا پہنچے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سارے ہی شہر میں حویلیاں ہی حویلیاں ہوں۔ ہم ایک ایسی حویلی میں جا پہنچے جو خاصی قدیم لگتی تھی۔ یہ غنیمت تھا کہ وہ گلی کافی کشادہ تھی۔ ہم فوروہیل سمیت حویلی کے اندر تھے۔ سامنے برآمدہ میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بڑھے اور ہمیں ایک روشن کمرے میں لے گئے، جو کافی حد تک خنک ہو رہا تھا۔ وہاں بیڈ لگا ہوا تھا، بھینی بھینی خس کی مہک تھی۔ میں بیڈ پر پھیلتے ہوئے کہا۔

''بخشاور یار...... اتنی خاطر مدارت ہو رہی ہے، رب خیر ہی کرے۔''

''اسی سے اندازہ لگا لو، کام بھی تو بڑا ہوگا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا چل وہ تو دیکھا جائے گا، لیکن کام کیا ہے اور وہ بتاتا کس نے ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ اکتاہٹ بھرے انداز میں بولا۔

''جب ضرورت ہوگی تو بتا دیں گے، جلدی کا ہے کی ہے۔''

''تو پھر اب سوئیں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''اگر پینی ہے، یا کوئی دوسرا شغل کرنا ہے تو بتاؤ، ورنہ سو جاؤ۔'' اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار، یہ پینے دینے کا چکر نہیں، جب کوئی کام نہیں تو آرام ہی کرنا ہے۔'' لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

''آجاؤ۔'' بخشاور نے کہا تو ایک گھٹے ہوئے بدن والا جوان اندر آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ پتلی سی، جس کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ اس کے چہرے پر اگر کوئی فوری توجہ حاصل کرنے کی شے تھی تو اس کی بڑی بڑی آنکھیں، یوں لگتا تھا جیسے نیند سے بھری ہوئی ہوں، موٹے موٹے لب جو رس سے بھرے ہوئے ہوں۔ لمبی گردن میں لاکٹ لٹک رہا تھا، جو شیولنگ کی

علامت تھا۔ اس سے لگ رہا تھا کہ وہ لڑکی ہندو ہے۔ دونوں نے نیلی جینز اور سیاہ ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھے۔ بجتا ور انہیں دیکھتے ہی اٹھا۔ دونوں سے گلے ملا۔ میرے ساتھ دونوں نوواردوں نے ہاتھ ملائے اور بیڈ پر ہی بیٹھ گئے۔ نوجوان نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ہے وہ جوان، جس کا ذکر اوودھے رام نے کیا تھا؟''

''ہاں یہی ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

''تو پھر کریں کام کی بات؟'' اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا، پھر میری ہاں اور ناں جانے بغیر تیزی سے بولا، ''یہاں کے ایک بزنس مین کو قتل کرنا ہے۔''

''تم لوگوں سے کیوں نہیں ہو سکا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تو ایک لمحہ کو وہ گڑبڑا گیا پھر ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہم نے یہاں رہنا ہے۔ کب تک یہ معلوم نہیں، تمہارا کام جب ختم ہو جائے گا، تمہیں یہاں سے جانا ہوگا۔'' اس نے اپنی طرف سے دلیل دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، بندہ بتاؤ۔'' میں نے سکون سے کہا تو اس نے ایک سیل فون میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اس میں ساری معلومات ہیں۔ اسے دیکھو، جو بات سمجھ میں نہ آئے، تمہیں ضرورت ہو، وہ مجھے بتانا، پھر ڈسکس کر لیں گے۔''

''ڈن ہو گیا۔'' میں نے کہا تو وہ میری جانب دیکھ کر بولا۔

''یہ اتنا آسان ٹارگٹ نہیں ہے، پہلے معلومات دیکھو، پھر بات کرنا؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ہلکی سی مسکان سے کہا تو شاید وہ چڑ گیا، اس نے دبے دبے غصے میں کہا۔

”یہ کام تمہیں اس لئے دیا جا رہا ہے کہ تم......“
اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے درمیان سے ٹوکتے ہوئے کہا۔
”ایسی باتیں کرنے سے بندہ بزدل لگتا ہے، بلکہ تمہر دلا بھی۔ تم نے کہہ دیا بس ہو گیا۔ اب کوئی دوسری بات کرو۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ بھڑک اٹھا۔ یہی میں چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، بختاور نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے کہا۔
”علی بھائی تم اس کے بارے میں نہیں جانتے ہو، یہ ندیم ڈانڈیا ہے، اگر تم ذرا سی بھی خبروں میں دلچسپی رکھتے ہو تو اس کا نام ضرور سنا یا پڑھا ہوگا۔ وہاں یہ مسٹنگ پرسن ہے۔“
”اوہ، تو یہ ہے ندیم ڈانڈیا......“ میں نے سر سراتے ہوئے کہا۔
”ہاں، ادھر یہ بم دھماکوں میں، بندے مارنے میں مشہور رہا ہے۔ فورسز اس کے پیچھے پڑ گئی تو یہ بارڈر پار کر کے ادھر آ گیا، تیری میری طرح دشمنوں کے چکر میں ادھر نہیں آیا۔“ بختاور نے مزید بتایا تو مجھے اس سے نفرت سی ہونے لگی۔ بے گناہ لوگوں کا قاتل میرے سامنے کس طرح بیٹھا ہے۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
”ہاں مسٹنگ پرسن...... ادھر لوگ اس کے لئے احتجاج کر رہے ہیں، اور یہ یہاں سکون سے بیٹھا ہے۔“ میں نے دبے دبے انداز میں ہونٹے سے کہا تو وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولا۔
”سکون سے کہاں یار...... پورا نیٹ ورک دیکھ رہا ہوں، خیر چھوڑو، اگر تم یہ کام کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھو یہاں تیرے لئے راستے کھل جائیں گے۔ جس طرح چاہئے رہنا۔“
”ٹھیک ہے۔ کرتے ہیں بات۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”اگر کچھ موڈ ہے تو آ جاؤ۔“ اس نے دعوت دی، میں نے انکار میں سر ہلا دیا، جبکہ بختاور

اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے سیل فون کھولا اور اس بزنس مین کے بارے میں معلومات ویڈیو کی صورت میں دیکھنے لگا۔ بختاور جس وقت واپس آیا تو وہ سرور میں تھا۔ تب تک میں ساری معلومات دیکھ چکا تھا۔

دن کافی چڑھ آیا تھا۔ میں حویلی کے صحن میں آیا تو سفید رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ اس کے پاس ہی ندیم ڈانڈیا اور وہی رات والی لڑکی کھڑی تھی اس نے سرخ رنگ کا لانگ اسکرٹ اور سیاہ ٹائٹس پہن رکھا تھا۔ اس نے اپنے اسکرٹ کے رنگ والی لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی۔ اس کی سوئی سوئی آنکھیں چشمے کے پیچھے چھپی ہوئیں تھیں۔ میرے پیچھے ہی بختاور آ گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ڈانڈیا بولا۔

"ذرا سنبھال کے، تیرے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے کہ تم تورسٹ ہو۔ لیکن جو لڑکی تمہارے ساتھ جا رہی ہے، تیز چھری ہے۔"

"رابطہ رکھنا۔" میں نے دو لفظوں میں اس کی بات کا جواب دیا تو وہ لڑکی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا تو وہ چل دی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم مین روڈ پر آ گئے۔

"میرا نام مالتی ہے، بتاؤ کیا پلان ہے تمہارا؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اس وقت تک کوئی پلان نہیں ہے۔ اس لئے آج صرف جیسلمیر کی سیر کریں گے۔" میں نے سکون سے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"چلو پھر، آج سیر ہی سہی۔"

"یہ شہر دیکھا ہوا ہے تم نے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، بہت اچھی طرح پچھلے دو ماہ سے ہوں یہاں پر۔" اس نے بتایا۔

"وہ جو بندہ ہمارا ٹارگٹ ہے، اس کے بارے میں جانتی ہو؟" میں نے ایک خیال کے

تحت پوچھا تو وہ بولی۔
"ہاں، پہلے میں نے اور ڈانڈیا نے کوشش کی تھی، لیکن کوئی ایسا راستہ نہیں ملا، جس سے کام ہو جاتا۔ دوبار کوشش کی ہے۔"
"کیوں نہیں ہو سکا کام؟" میں نے پوچھا۔
"اس کے ارد گرد لوگ بہت ہوتے ہیں، وہ صرف بزنس مین ہی نہیں، یہاں کا جو دو نمبر دھندہ ہوتا ہے، اس کا وہ بڑا ہے۔ اس کے جانے سے اُودھے رام کو دونوں طرح کا فائدہ ہوگا۔" اس نے سڑک پر نگاہیں جمائے بتایا۔
"کہاں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"اس شہر میں اس کے کئی ٹھکانے ہیں۔ کوئی قلعے کے پاس، ایک فورٹ روڈ پر، اور کچھ اِدھر اُدھر۔" اس نے لاپرواہی سے بتایا۔
"اب کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"یہی قلعے کی طرف، وہیں اچھا وقت گزر سکتا ہے، لوگوں کا بھی رش ہوتا ہے۔" اس نے موڑ مڑتے ہوئے بتایا۔ میں خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک پارکنگ میں کار لگائی اور پیدل ہی قلعے کی جانب چل پڑے۔ مانسی نے ٹکٹ لئے اور قلعے کے اندر داخل ہو گئے۔
اندر بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔ ابھی ہمیں کچھ دیر ہی ہوئی تھی قلعہ دیکھتے ہوئے کہ مانسی کا فون بج اٹھا۔ وہ کچھ دیر سنتی رہی، پھر فون کال بند کر کے بولی۔
"ڈانڈیا کا فون تھا، بتا رہا تھا کہ آج رات ایک ریزارٹ میں اس بزنس مین نے آنا ہے، وہاں ایک بڑا فنکشن ہے۔"

"ہم اس وقت وہاں جاسکیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"شاید جاسکیں، عام طور پر ٹکٹ ہوتا ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"چلو ادھر چلتے ہیں۔ ایک بار دیکھ کر آتیں۔ اگر ٹکٹ مل سکا تو..." میں نے کہا تو مانسی میری بات سمجھتے ہوئے سر ہلا کر چل دی۔

وہ ریزارٹ قلعے میں ہی بنا ہوا تھا۔ یہاں پر زیادہ تر لوگ، شام کا نظارہ کرنے آتے تھے۔ ہم کچھ دیر باہر کا نظارہ کرنے کے بعد ہال میں چلے گئے۔ کھانوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ میں اور مانسی ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ مانسی نے کچھ روایتی کھانے منگوا لیے۔ میں وہاں کے ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ کھانے کے بعد لاؤنج میں آئے تو رات ہونے والے فنکشن کے کچھ پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ ایک جانب اسی بزنس مین کی تصویر والا پوسٹر تھا۔ مانسی کاؤنٹر پر چلی گئی۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ اس نے خالص راجستانی میں پوچھا۔

"کیا اس پروگرام کے ٹکٹ مل سکتے ہیں؟"

کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا پھر بولی۔

"سارے ٹکٹ بک چکے ہیں۔"

"اوکے۔" مانسی نے کہا اور پلٹ گئی۔ میں اس کے ساتھ چل دیا۔ میں تیزی سے سوچنے لگا کہ اس کے علاوہ یہاں آنے کا کوئی جواز کیا ہو سکتا ہے۔ میں یہی سوچتا ہوا چند قدم ہی چلا تھا کہ ایک لڑکا ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگا، اس نے مانسی سے کہا۔

"ٹکٹ چاہیے آپ کو؟"

"ایک کے تین میں مل جائیں گے، کتنے چاہئیں؟" اس نے تیزی سے پوچھا تو مانسی نے کہا۔

”اتنا مہنگا نہیں۔“ اس نے صاف انکار کر دیا، پھر ان میں بھاؤ تاؤ ہوا اور ماسی نے دو ٹکٹ خرید لئے۔ ہم واپس حویلی چل دیئے۔

☆......☆......☆

رات کا آنچل پھیل چکا تھا۔ میں اور ماسی کسی رومانوی جوڑے کی مانند اس ریزارٹ میں جا پہنچے تھے۔ ماسی نے شرٹ پتلون پہنی ہوئی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے۔ ہم ریزارٹ کے اس حصے میں تھے جو کھلی فضا میں تھا۔ یہ جگہ دراصل شہر کی جانب والے قلعے کے کنگرے تھے۔ قلعہ سب سے اونچی جگہ پر تھا۔ وہاں سے شہر کی روشنیوں کا نظارہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ مگر میرے دماغ میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ملگجی سی روشنی تھی۔ وہاں پر کئی جوڑے یونہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ماسی میرے ساتھ جڑ کر کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم اس کے دماغ میں کیا تھا۔ لیکن میں اپنی سوچوں میں اس سے بہت زیادہ فاصلے پر تھا۔ وہاں پر کھڑے رہنے کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہم اپنے ساتھ کوئی بھی ہتھیار اندر نہیں لا سکے تھے۔ ڈانڈیا نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ہم تک کوئی نہ کوئی ہتھیار ضرور پہنچا دے گا۔ ہم تک کوئی نہیں آیا۔ ہم کافی دیر گزار کر وقت پر اس پنڈال میں پہنچ گئے تھے جہاں روایتی رقص پیش کیا جانے والا تھا۔ وہاں کوئی اسٹیج نہیں تھا۔ دائرے میں کرسیاں لگی ہوئیں تھیں۔ بالکل اس طرح جیسے ہاکی یا کرکٹ میچ میں تماشائی بیٹھتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ رقص دیکھنے کے لئے تقریباً سو ڈیڑھ سو لوگ ہوں گے۔ ان میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ ملکی اور غیر ملکی مرد و عورتیں۔

رقص کا آغاز ہونے جا رہا تھا۔ لیکن ابھی تک ہمیں کوئی ہتھیار نہیں ملا تھا۔ وہ بزنس مین بھی ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ ایسے میں ماسی کا فون بج اٹھا۔ وہ چند لمحے سنتی رہی پھر فون میری جانب بڑھا دیا۔ دوسری جانب ڈانڈیا تھا۔

"سن، سامنے ان رقص کرنے والوں کو دیکھ۔"

وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا تو میں نے سامنے دیکھا۔

"دیکھ لیا۔" میں نے بتایا۔

"ان میں صرف ایک ہی گہری نیلی پگڑی والا ہوگا، ساز ندوں میں بیٹھا ہوگا، اسے ذرا غور سے دیکھ۔"

"ہاں مجھے دکھائی دے گیا ہے، موٹا سا ہے، کافی بڑی بڑی مونچھیں ہیں اور سیاہ رنگ ہے اس کا۔" میں نے بتایا

"بالکل وہی۔" وہ دبے دبے جوش سے بولا پھر سانس لے کر کہا، "وہ ابھی اٹھ کر واش روم کی جانب جائے گا، تم اس کے پیچھے چلے جاؤ۔ اس سے یہی پوچھنا کہ جودھ پور سے آئے ہو یا ستاسری سے، بس وہ پہچان لے گا۔" اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔" میں نے کہا اور فون جیب میں ڈال لیا۔ مانسی نے مجھ سے فون نہیں مانگا۔ وہ یوں میوزک میں مست ہو رہی تھی جیسے اسے کچھ اور سوجھ ہی نہ رہا ہو۔ میں اس نیلی پگڑی والے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ فون سن رہا تھا، پھر فون سنتے ہی اٹھا اور ایک جانب چل دیا۔ میں اٹھا اور اسے نگاہوں میں رکھتا ہوا اس کے پیچھے چل دیا۔

میں نے اسے واش روم سے پہلے ہی جا لیا۔ اس کے ساتھ لگتا ہوا بولا۔

"ارے بھائیا...... جودھ پور سے آئے ہو یا ستاسری سے۔"

"جودھ پور سے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر کاندھوں پر ڈالی ہوئی شال کو ذرا سا ہٹا کر بولا، "یہ لو۔"

میں نے نیچے دیکھے بغیر اندازے سے چادر کے نیچے ہاتھ ڈالا تو ایک ڈبہ میرے ہاتھ سے

ٹکرایا۔ میں نے وہ پکڑا اور اس سے الگ ہو گیا۔ وہ سمجھدار تھا، اس نے یوں چھپا کر مجھے دیا تھا کہ اگر کہیں کوئی کیمرہ بھی دیکھ رہا ہو تو اس میں نہ آ سکوں۔ میں نے وہ ڈبہ لیا اور واش روم میں گھس گیا۔ میں نے جلدی سے اسے کھولا، ایک جدید پسٹل اور ایک میگزین پڑا ہوا تھا۔ میں نے پسٹل چیک کیا، وہ لوڈڈ تھا، میں نے اسے شرٹ کے نیچے کیا۔ ڈانڈیا نے یہ عقل مندی کی تھی کہ پسٹل پر سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ فالتو میگزین جیب میں ڈالا اور نکل کر باہر چل دیا۔ میں خود کو پوری طرح تیار محسوس کر رہا تھا۔

میں دوبارہ پنڈال میں آیا تو وہاں کافی ہلچل تھی۔ ناچنے گانے والوں کے بالکل سامنے وی آئی پی نشستوں پر کافی لوگ براجمان ہو گئے تھے۔ میں مانسی کے پاس پہنچا تو ناچ شروع ہو چکا تھا۔ دو جوان لڑکیاں گہرے زرد رنگ کا چمکیلا چولی گھاگرا پہنے، بڑا سا آنچل لئے ناچ رہی تھی۔ میوزک کی تیز آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں مانسی کے قریب بیٹھ گیا تو اسے اپنے قریب کر کے پوچھا۔

"کون ہے وہ بے چارہ؟"

"وہ سامنے، جس نے سفید رنگ کا کرتا پہنا ہوا ہے، اس کے اوپر سرخ صدری ہے، بڑی مونچھوں والا گنجا ہے۔" اس نے نشاندہی کی تو میں اسے پہچان گیا۔ دوپہر کے وقت میں نے اس کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ میں نے وہاں کا جائزہ لینے کے لئے ہر طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھ اور پیچھے کچھ لوگ کھڑے ہیں۔ جو کسی بھی ہنگامی صورت میں اسے بچا سکتے تھے۔ میرا اور ان کا فاصلہ یہی کوئی ساٹھ ستر فٹ کا رہا ہوگا۔ وہ دونوں لڑکیاں درمیان میں ناچ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ذرا سے فاصلے پر ایک بڑے سارے ڈھول پر دو آدمی کھڑے اسے بجا رہے تھے۔ باقی پیچھے بیٹھے ساز بجا رہے تھے۔ روایتی دھن عروج پر آ گئی

تھی۔ میں نے ہولے سے مانسی کا ہاتھ پکڑا۔ اس نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھا، اس کی آنکھوں میں بہت کچھ تھا۔ میں نے ہولے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اٹھ گیا۔ میں ان ساری نشستوں کے پیچھے چلا گیا۔ مجھے صرف دس سے بیس سیکنڈ چاہئیں تھے۔

میں پیچھے جا کر وہاں جا کھڑا ہوا جہاں کافی حد تک اندھیرا تھا۔ میں نے خود کو تیار کیا، ایک دم سے پسٹل نکالا اور نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ کھٹاک سے آواز آئی، میں نے اپنے ہدف کو سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرے لئے اتنا ہی کافی تھا، یہی چند لمحے تھے انتہائی قیمتی تھے۔ میں نے وہاں مزید کچھ نہیں دیکھا، میں پیچھے پلٹا اور اس جانب دوڑا جہاں میں اور مانسی پہلے کھڑے تھے۔

قلعے کے ان کنگروں میں بڑے بڑے سوراخ تھے۔ پرانے زمانے میں چاہے وہ جن بھی جنگی مقاصد کے لئے استعمال ہوتے ہوں گے، مگر میں انہیں استعمال کرنے کا سوچ چکا تھا۔ میں ایک سوراخ میں داخل ہوا تو سامنے شہر تھا لیکن سوراخ سے نیچے جو زمین تھی وہ کم از بیس فٹ سے زیادہ تھی، وہ تہ ایک ڈھلوان تھی، جس کے بعد پھر اتنی ہی اونچی دیوار تھی، جو سیدھی تارکول کی سڑک کنارے تھی۔ ایک بار اتنی اونچائی خوف زدہ کر دینے والی ہوتی ہے۔ مگر میں نے ذرا سا بھی وقت نہیں لیا۔ سوراخ سے پار ہو کر میں لٹک گیا۔ پھر دیوار کے ساتھ چپک کر ہاتھ چھوڑ دیئے۔ میں اگلے چند لمحوں میں ڈھلوانی تہ پر تھا، میرے کولہے پر دباؤ پڑا۔ ایک لمحہ کو لگا جیسے میں اپنا توازن کھو دوں گا۔ اس کا نتیجہ یہی تھا کہ میں سڑک پر جا پڑتا۔ پھر کوئی بھی گاڑی مجھے کچل سکتی تھی۔ میں نے خود کا توازن برقرار رکھا اور پھر اگلی دیوار پر ایسے ہی لٹکا۔ یہ بلا شبہ رسک تھا۔ نیچے سڑک پر مجھے کوئی بھی دیکھ سکتا تھا۔ کوئی مجھے دیکھ کر شور بھی مچا سکتا تھا لیکن یہ وقت ایسی باتیں سوچنے کا نہیں تھا۔ چند لمحوں کا یہ کھیل تھا۔ میں نے پھر خود کو دیوار کے ساتھ

لٹکایا اور پھر روک کر میں نے خود کو چھوڑ دیا۔ میری کوشش تھی کہ میں اپنے پاؤں پر رکھو لیکن گرتے ہوئے میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑھکتا ہوا چند فٹ تک گیا۔ میں تیزی سے اٹھا تو میرے گھٹنے اور دائیں کولہے میں شدید درد اٹھا۔ یہی دراصل تربیت ہوتی ہے۔ اتنی اونچائی سے نیچے آنا اور پھر درد برداشت کرنا ہی تربیت ہوتی ہے۔

اس وقت میرے لئے پہلا مسئلہ یہی تھا کہ میں وہاں سے غائب ہو جاؤں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، ایک موٹر سائیکل والا آ رہا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ دیا تو وہ نہیں رکا، لیکن اگلے ہی دو منٹ میں ایک آٹو رکشے والا آ گیا۔

"کدھر جانا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ریلوے اسٹیشن۔" میں نے کہا اور اس میں بیٹھ گیا۔ اس نے آٹو بھگا دیا۔

مجھے نہیں معلوم وہ درست راستے پر جا رہا تھا یا نہیں۔ ایسے میں فون بجنے لگا۔ مانسی کا فون ایسے ہی کسی وقت کے لئے میں نے جیب میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے کال پک کی تو دوسری جانب ڈانڈیا تھا۔

"کہاں ہو؟"

"پتہ نہیں، آٹو رکشہ میں ہوں۔ ریلوے اسٹیشن جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اوہ، چل ٹھیک ہے، ہم آ رہے ہیں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

رکشے والے نے مجھے ریلوے اسٹیشن پر اتارا تو میں نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر اسے دیا۔ اس نے پہلے سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"کھلا نہیں صاحب۔"

"رکھ لو۔" میں نے کہا تو اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا پھر نوٹ جیب میں رکھتے

ہی چل پڑا۔ میں ریلوے اسٹیشن کی عمارت کو دیکھا۔ اوپر سرخ رنگ میں شہر کا نام لکھا ہوا تھا اور ادھر اُدھر بنی برجیوں سے مغل تعمیر کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے ارد گرد دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کافی خطرناک جگہ پر کھڑا ہوں۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر آرمی کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بلاشبہ گاڑی کے پاس کوئی نہ کوئی آرمی والا تو ہوتا ہی ہے۔ اگرچہ میں نروس نہیں ہوا تھا لیکن مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے جانا کدھر ہے؟ کیا میں اسٹیشن کے اندر چلا جاؤں یا پھر یہیں کھڑا رہوں؟ اس جگہ کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ان چند منٹوں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اسٹیشن آرمی والوں کے استعمال میں زیادہ رہتا ہے۔ میرے گھٹنے اور کولہے کا درد بڑھنے لگا تھا جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں اگر چلتا تو میری لڑکھڑاہٹ واضح دکھائی دیتا تھی۔ ماحول ایسا نہیں تھا کہ میں بھاگ سکتا۔ مجھے کسی راستے کا بھی علم نہیں تھا۔ سیڑھیوں کے ساتھ ساتھ جالیاں تھیں، میں اس سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا، میں اگر چاہتا بھی تو راجستھانی انداز میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ میری قریب ایک کار آن رکی۔ اس میں ڈانڈیا کے ساتھ بجنا ور بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے خود پر قابو پایا اور سکون سے چلتا ہوا کار میں جا بیٹھا۔ تبھی کار چل پڑی۔

میں جب کار میں بیٹھا تو میرا درد شدت اختیار کر گیا۔ میں خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ڈانڈیا نے بیک مرر میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”خیر تو ہے نا؟“

اس کے پوچھنے پر میں نے اسے اپنی حالت کے بارے میں بتایا تو مجھے کوئی جواب دینے کی بجائے اس نے تیزی سے فون نکالا اور کسی سے بات کرنے لگا۔

حویلی میں موجود کمرے میں دری بچھی ہوئی تھی۔ میں اس دری پر الٹا لیٹا ہوا تھا۔ میرے

اردگرد، بختاور، ڈانڈیا اور ماسی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھا میرے قریب بیٹھا ہوا میرے کولہے اور ٹانگ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک کہیں کہیں سے دباتا رہا، پھر بولا۔

”نہیں کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی۔ بس یہی لگتا ہے پٹھوں کو دباؤ پڑا ہے۔ یہ اوپر جسم پر جو خراشیں آئی ہیں، ان کی وجہ سے زیادہ درد محسوس ہو رہا ہے۔“

”کوئی اپائے ہے تو کرو۔“ ڈانڈیا نے تیزی سے کہا۔

”کرتا ہوں نا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی ساتھ لائی ہوئی پوٹلی میں سے ایک شیشی نکالی۔ اس میں سیاہ رنگ کا تیل تھا، وہ ڈانڈیا کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا، ”یہ لے، یہ سارا تیل ہلکی ہلکی مالش سے جذب کر دے، یہ بھلا چنگا ہو جائے گا۔“

ڈانڈیا نے وہ شیشی پکڑی اور میرے تیل لگانے لگا۔ جیسے ہی وہ تیل میرے بدن پر لگا، مجھے یوں لگا جیسے میرا بدن وہاں سے جل گیا ہو۔ میں نے پوری قوت لگا کر اپنی چیخ کو روکا تھا، میں تڑپنے لگا۔ تبھی بوڑھا زور زور سے لیٹنے رہنے کے لئے کہتا رہا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، کچھ دیر بعد مجھے یوں لگا جیسے ٹھنڈ پڑ گئی۔ مگر جیسے ہی دوبارہ تیل لگتا، وہی جلن ہونے لگتی۔ یہ آزمائش کوئی گھنٹہ بھر رہی۔ وہ سارا تیل جذب ہو گیا تو مجھے سکون ہو گیا۔ ڈانڈیا اور بختاور اس بوڑھے کے ساتھ چلے گئے، جبکہ ماسی میرے قریب بیٹھی رہی۔ نجانے اسے کیا سوجھی، وہ میرے بدن پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

”نہ کرو، اب میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

”میں نے اس دنیا میں ایسا حوصلہ اور پھرتی کسی میں نہیں دیکھی، ہم اسے قتل کرنے کا دو ماہ سے سوچ رہے ہیں اور تم......“

”کوئی اور بات کرو۔“ میں نے کہا تو وہ ہولے سے بولی۔

”تو پھر سنو...... جتنی جلدی ہو سکتا ہے یہاں سے نکل جاؤ۔“

”ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟“ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کوئی ممبئی یا کراچی نہیں ہے جہاں تم انسانوں کے سمندر میں غائب ہو جاؤ، یہ جیسلمیر ہے، یہاں آرمی کا بہت اثر ہے، جو بندہ قتل ہوا ہے، وہ بہت اہم شخص تھا۔ جتنی آسانی سے تم نے یہ کام کیا، اتنا ہی مشکل ہے یہاں سے نکلنا، بہت مشکل......“ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”کیا یہ لوگ معاملہ نہیں سنبھال سکتے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ مجھے نہیں پتہ لیکن یہ دیکھو، ہلچل مچ گئی ہے۔“ اس نے کہا اور اپنا فون میرے آگے کر دیا۔ اس میں کچھ تصویریں تھیں۔ وہ کسی سی سی ٹی وی سے لی گئی تھیں۔ وہ ریزارٹ کے اندر کی تھیں۔ کچھ دوپہر کی اور کچھ شام کی۔ دو تین میں مانسی بھی ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔ ایک خاکہ تھا، جو میرے چہرے سے بہت حد تک ملتا جلتا تھا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ جس رکشے پر میں ریلوے اسٹیشن پہنچا تھا، اس رکشے والے کی بھی تصویر تھی۔ اب وہ پکڑا گیا تھا یا خود پولیس اسٹیشن چلا گیا تھا۔ میں نے تصویریں دیکھ کر کہا۔

”اس میں تو تم بھی نظر آرہی ہو۔“

”میں تو برقعہ پہن کر یا چادر اوڑھ کر نکل جاؤں گی، لیکن تم کیسے نکلو گے؟“ اس نے کہا تو میں ہنس دیا۔

”یار نکلنا تھوڑی ہے۔ یہاں آرام کریں گے چند دن۔“ میں نے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ پھر ہنستے ہوئے میرے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”بس یہی چاہتی ہوں، ہم تم کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے۔“

"او جاؤ یار، میرا دماغ مت کھاؤ۔" میں نے تلخی سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس کے چہرے پر تلخی آ گئی۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی، پھر اٹھ کر باہر چلی گئی۔

صبح میں بالکل فریش تھا۔ کہیں کوئی درد نہیں تھا۔ ایک خاتون کمرے میں پتلون اور شرٹ رکھ گئی تھی۔ میں فریش ہو چکا تو بجنا ور آ گیا۔ وہ مجھے لے کر نیچے گیا تو ناشتہ لگا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے میز پر بیٹھ گیا۔ ناشتے کے بعد جب میں چائے لے کر بیٹھا ہوا تھا، تبھی ڈانڈیا بولا

"علی یار، تم نے مانسی کو ہرٹ کر دیا۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے پوچھا تو اس نے مجھے بتاتے ہوئے کہا، "اوئے یار وہ ایسی لڑکی نہیں، وہ تو کسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتی۔ تم پر نجانے کیسے مہربان ہو گئی۔"

"وہ مہربان ہے یا نہیں مگر بات اس نے تھرڈ کلاس کی تھی، مجھے اچھی نہیں لگی، اس لئے جھٹک دیا۔" میں نے سکون سے کہہ دیا تو اس نے پوچھا۔

"خیر چھوڑ، ابھی ہم نے باہر نکلنا ہے، کیا تم خود کو فٹ محسوس کر رہے ہو؟"

"بالکل، میں فٹ ہوں۔" میں نے کہا تو ہم اٹھ کر باہر آ گئے۔ اس بار صحن میں فور وہیل کھڑی تھی۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔

وہ بھی شہر کا کوئی پرانا علاقہ تھا۔ پر پیچ گلیوں میں ہوتے ہوئے فور وہیل ایک جگہ کھڑی کر کے پیدل جانا پڑا۔ بھول بھلیوں کے جیسی گلیوں میں سے ہوتے ہوئے ہم ایک حویلی کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اس کی ڈیوڑھی کھلی تھی اور اس میں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کے پاس اسلحہ تھا۔ ہم تینوں اندر چلے گئے۔ بلاشبہ وہ ڈانڈیا کو جانتے تھے۔ ڈیوڑھی پار کر کے ہم صحن میں آ گئے۔ وہاں بھی کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں صرف ایک بار دیکھا، پھر اپنی اپنی مصروفیت میں کھو گئے۔ ہم ایک کمرے میں چلے گئے تو سامنے صوفے پر

اودے رام بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"ارے آؤ آؤ یار...... تم نے کمال کر دیا۔ میں نے سمجھا تم کوئی دن لو گے، مگر یہ ایک دن میں ہی......"

"بڑا کام کر دیا ہے جی۔" ڈانڈیا نے کہا تو وہ اودے طنزیہ لہجے میں بولا۔

"تم سے تو نہیں ہوا نا، اسے کہتے ہیں کام۔" یہ کہہ کر وہ صوفے پر بیٹھتا ہوا مجھے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر میری جانب دیکھ کر پوچھا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے بڑا کام کیا ہے بول، تجھے کیا انعام دیا جائے؟"

"مجھے کچھ نہیں چاہئے۔" میں نے سکون سے کہا۔

"ارے یار کچھ تو......" اودے رام نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد بولا۔

"تم بندے ہو کام کے، اس لئے تیرا محفوظ رہنا بہت ضروری ہے۔ تمہیں آج رات ہر حال میں یہاں سے نکلنا ہوگا، کیونکہ شہر میں احتجاج شروع ہوگا، ابھی کچھ دیر بعد جلوس نکلیں گے۔ مجھے بھی ایک جلوس میں شامل ہونے کے لئے جانا ہے، پولیس پر بہت زیادہ دباؤ آ گیا ہے۔ دوسری فورسز بھی تمہاری تلاش میں لگی ہوئی ہیں۔"

"تو پھر کرنا کیا ہے، تم بتاؤ گے یا ہم ہی کچھ کریں؟" ڈانڈیا نے پوچھا۔

"ابھی شہر میں ہلچل نہیں ہوئی، حکومت کہہ رہی ہے کہ شام تک کا وقت دیا جائے، یہاں کی ساری نفری تلاش میں لگی ہوئی ہے۔ لیکن جو بھی ہے، اگر یہ یہاں سے نکلا تو پکڑا جائے گا۔"

"اودے جی، کرنا کیا ہے؟" اس بار بجناور نے اکتاتے ہوئے پوچھا۔

”تم لوگ جاؤ، میں اس کا بندوبست کر دیتا ہوں۔“ اس نے دونوں کی جانب باری باری دیکھتے ہوئے کہا تو وہاں خاموشی چھا گئی۔

”ٹھیک ہے۔“ ڈانڈیا نے کہا اور اٹھ گیا، اس کے ساتھ ہی بختاور بھی چل دیا۔ میں بیٹھا رہا۔ وہ مجھ سے تفصیل پوچھنے لگا کہ میں نے یہ سب کیسے کیا۔ اس میں کوئی پانچ دس منٹ لگ گئے۔ ایسے میں ایک شخص اندر آ گیا۔ میں اسے دیکھ کر چونک گیا۔ یہ وہی سازندہ تھا، جس نے مجھے پسٹل دیا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا تو میں نے اس کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

”یہ مادھو کر ہے، پہچان گئے ہو۔“

”جی بالکل، میں سمجھتا ہوں اصل کام اسی کا تھا۔“ میں نے اس کی تعریف کی تو وہ اپنی آنکھوں سے بھی ہنس دیا۔

”چند دن اس کے ساتھ رہنا ہے، اتنے دن میں تمہارے کچھ کاغذ بن جائیں گے، پھر تمہیں یہاں کوئی نہیں پوچھے گا، سکون سے رہنا۔“ اودے نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

”ایک بات پوچھوں......؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے ان دونوں سے الگ کیوں کر دیا، حالانکہ وہ......“ میں کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

”بندے، بندے میں فرق ہوتا ہے، تم آزاد رہو، اب جاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور مادھو کر کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے پہلے میرے کپڑے بدلوائے۔ میں بالکل کسی راجستھانی کے جیسا لگ رہا تھا۔ پھر ہم اس حویلی سے نکلتے چلے گئے۔

☆......☆......☆

ہم دونوں ایک پرانے سے موٹر سائیکل پر سوار شہر کے شمالی علاقے کی جانب چل

دیئے۔ راستے میں ایک بڑا سا سارا گودام آیا تھا تو وہیں سے دائیں جانب سڑک سے ہوتے ہوئے صحرا کی جانب نکل گئے۔ ایک جگہ چند جھونپڑیاں آ گئیں تو مادھو کر نے ایک جگہ لے جا کر موٹر سائیکل کھڑا کر دیا۔ وہاں مختلف عمر کے مرد اور عورتیں تھیں۔ بچے بھی تھے۔ انہوں نے ہمیں ایک نگاہ دیکھا اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ میں موٹر سائیکل اترا تو اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ رہا ہمارا جھونپڑا، ہم ادھر ہی رہیں گے۔"

ہم اس جانب چل دیئے۔ پرانے کپڑوں کو جوڑ کر بنایا ہوا وہ ایک چھوٹا سا ٹینٹ تھا۔ زمین پر ایک پتلا سا گدا تھا، اس کے ایک طرف تکیہ تھا۔ میں وہاں جا کر لیٹ گیا۔ اس نے پانی کی ایک بوتل میرے پاس لا کر رکھ دی۔

"بڑی پرسکون جگہ ہے یار۔"

"ہاں، ہے تو، رات کے وقت مزید پرسکون ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پوچھا۔ "پینے ہو تو لاؤں؟"

"نہیں، میں ایسا کوئی شغل نہیں کرتا۔"

میرے کہنے پر وہ ہنس دیا، پھر جھونپڑے سے باہر چلا گیا، میں سکون سے لیٹ گیا۔ میں حالات پر غور کرنے لگا۔ اودھے نے مجھے ڈانٹا اور مجاور سے الگ کیوں کیا؟ شہر میں کسی جگہ میں محفوظ کیوں نہیں رہ سکتا تھا؟ کیا یہ جھونپڑا زیادہ محفوظ ہے؟ کیا یہ مادھو کر اس کا اتنا ہی قابل اعتماد بندہ ہے کہ مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا؟ یا پھر کوئی میرے ساتھ نیا کھیل تو نہیں کھیلا جائے گا؟ مجھے مانسی کی باتیں یاد آنے لگیں اس نے کہا تھا کہ جتنی جلدی ہو جائے میں یہاں سے نکل جاؤں۔

میں ایسی ہی باتیں سوچتا ہوا آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا۔ میرا پیچھے کی دنیا سے رابطہ کٹ چکا تھا کس کے ساتھ کیا ہوا؟ میں یہی سوچ رہا تھا کہ خوشگوار پرفیوم کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی، میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، میرے سامنے مانسی تھی۔ اس نے بھی راجستانی عورتوں کی مانند گھاگر چولی پہنی ہوئی تھی۔ اسے یوں دیکھ کر میں ہنس دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ میرے اوپر آن پڑی۔ میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں پر سہارا نہ ہوتا تو وہ میرے سینے پر گرتی۔ میں نے اسے سنبھال لیا تو وہ میرے ساتھ لگ کر چپک گئی۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ تبھی میں نے پوچھا۔

”تم یہاں کیسے؟ اور اس حال میں؟“

”جو بھیس یار نے بنایا، میں نے بھی بنا لیا۔“ پھر ایک دم سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی، ”او ظالم تم نے اپنی اداؤں سے مجھے لوٹ لیا ہے۔ اب تجھے اپنی نگاہوں سے غائب نہیں ہونے دوں گی۔“ اس نے قربان ہو جانے والی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں پتہ کیسے چلا کہ میں یہاں ہوں؟“ میں نے پوچھا تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے بولی۔

”دیکھ علی زین، میں جو کہنے جا رہی ہوں، اسے غور سے سننا۔ پہلے جو بھی تھا، اس پر لکیر پھیر دو، اب اور اس وقت سے میں تمہارے ساتھ کبھی جھوٹ نہیں بولوں گی۔ کبھی بھی نہیں۔ میں تمہیں سچ بتاؤں گی، باقی تم خود سنبھال لینا۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”وہی کہہ رہی ہوں نا، سچ یہ ہے کہ مجھے اودھے رام نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ تا کہ میں تم سے دوستی بناؤں، تیرے ساتھ رہوں۔“ پھر ایک دم سے مزہ لیتے ہوئے بولی، ”تیری

اور میری جوڑی بنا رہا ہے وہ......"

"کیا شادی کرلو گی میرے ساتھ؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"شادی کا ایک نقصان ہے یار، اس میں صرف ایک سہاگ رات ہوتی ہے۔ یوں ساتھ رہنے میں......" وہ کہتے ہوئے رک گئی اور زور سے آنکھ ماردی۔ مجھے اس کی یہ ادا اچھی لگی۔ لیکن ایسی نہیں کہ میں وہیں ڈھیر جاؤں۔ میرا کوئی خاص ردعمل نہ پا کر بولی "یار ظاہر ہے جوڑی اس لئے بنا رہا ہے کہ ہم مل کر کام کریں گے، اور کیا؟"

"مانسی میں کون سا پروفیشنل ہوں، حالات کا مارا ہوا یہاں تک آ پہنچا ہوں۔ اب یہ لوگ......"

"میں جانتی ہوں کوئی کیسا بھی حالات کا مارا ہوا ہو، وہ تیرے جیسا نہیں ہو سکتا، تیرے سامنے نجانے کتنے پروفیشنل پانی بھریں۔ خیر۔! اس دنیا میں اعتبار نہیں ہوتا۔ کب ساتھ چھوٹ جائے کوئی نہیں کہہ سکتا لیکن جتنا بھی وقت ساتھ گزاریں، اچھا گزاریں۔" یہ کہتے ہوئے وہ میرے سینے کے ساتھ لگ کر میرے اوپر لیٹ گئی۔

"مجھے پتہ تھا تمہاری ان باتوں کو سننے والا تو کہہ دے گا نا کہ تم بہت تجربے کار ہو، بڑی پرکھ ہے تمہیں۔ تم ہو کیا؟" میں نے اسے خواہ مخواہ غصہ دلاتے ہوئے پوچھا تو اس نے اپنی انگلی میرے لبوں پر پھیرتے ہوئے ہولے سے کہا۔

"وقت آئے گا نا تو خود بخود پتہ چل جائے گا، میں کیا بتاؤں تمہیں۔"

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے۔ انہی لمحات میں تھوڑے فاصلے سے کسی جیپ کی آواز آئی، اس کے ساتھ ہی کئی جیپوں کی آواز ابھری۔ اگلے لمحے مجھے لگا جیسے وہ ساری جیپیں رک گئی ہوں۔ ان میں سے کئی لوگ اترے۔ میری چھٹی حس بیدار ہوگئی۔

میں نے اٹھنا چاہا تو مانسی نے مجھے ہولے سے کہا۔

"لیٹے رہو......"

میں نے اس کی ایک نہیں سنی، میں نے جھونپڑے کے نیچے سے جو تھوڑی سی جگہ ہوتی ہے وہاں سے دیکھا، کافی فاصلے پر کئی لوگ کھڑے تھے۔ ان کے بوٹوں سے لگ رہا تھا کہ وہ آرمی کے لوگ ہیں یا پھر کسی بھی فورسز کے ہو سکتے تھے۔ ایک ہی لمحے میں میرے سارے حواس بیدار ہو گئے۔

میں نے مانسی کو ایک جانب کیا اور اپنے نیفے میں پڑے پسٹل کو نکال لیا۔ میں نے باہر کی جانب کان لگا دیئے تھے۔ قدموں کی آوازیں آرہی تھی۔ تبھی کسی نے سخت اور اونچی آواز میں پوچھا۔

"اوئے سن، ادھر کوئی اجنبی بندہ تو نہیں آیا۔"

اس کیساتھ ہی سناٹا چھا گیا۔

میں نے مانسی کے چہرے پر دیکھا، جہاں اس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیل چلی تھیں۔ وہ ایک ٹک میری جانب دیکھے چلی جا رہی تھی۔

(قسط نمبر:4)

ایک لمحے کو یوں لگا جیسے سناٹا چھا گیا ہو۔ مانسی کے چہرے پر وحشت پھیل چکی تھی۔ اسے نگاہوں میں رکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ یہ فورسز یہاں تک کیسے پہنچ گئیں؟ اس کے ساتھ ہی میں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ ان حالات سے کیسے نمٹا جائے؟ میرے کان باہر کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ شاید منمناتے ہوئے کسی نے جواب دیتے ہوئے کچھ کہا تھا، جس کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔ تبھی مادھو کر کی آواز ابھری، وہ راجستانی میں بات کر رہا تھا۔

"کسی اجنبی کو ہم یہاں کیوں آنے دیں گے؟" اس نے حیرت زدہ لہجے میں جواب دیا تو کسی نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"ممکن ہے تم لوگوں نے کسی کو چھپا کر رکھا ہو؟"

"ہم کیوں چھپا کر رکھنے لگے؟" مادھو کر کی پھر سے آواز آئی۔

"تمہیں پتہ ہی نہ ہو اور کوئی ادھر چھپا ہوا ہو؟" کسی نے کہا۔

"صاحب، ہماری یہی چند جھونپڑیاں ہیں، آپ چاہیں تو آ کر دیکھ لیں۔" اس نے بھرپور اعتماد سے کہا تو میں پوری طرح چوکنا ہو گیا۔ یہ انتہائی رسک تھا۔ اس کے ساتھ ہی پھر سناٹا چھا گیا۔ یہ چند لمحوں کی خاموشی بڑی کھردری تھی۔ تبھی بھاری اور سخت آواز میں کہا گیا۔

"دیکھو کوئی بھی اجنبی ادھر دکھائی دے تو ہمیں فوراً اطلاع دینی ہے؟"

"جی ٹھیک ہے۔" اس نے عاجزانہ لہجے میں کہا تو پھر اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ اگلے چند لمحوں کے بعد قدموں کی دھمک دور ہوتی چلی گئی۔ گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور

دھیرے دھیرے سناٹا ہوتا چلا گیا۔ مادھو کر ہمارے پاس آ بیٹھا۔

"کون لوگ تھے؟" میں نے سکون سے پوچھا۔

"آرمی والے تھے۔" اس نے ہولے سے بتایا۔

"آرمی......" میں نے حیرت سے کہا پھر اگلے ہی لمحے وضاحت طلب انداز میں پوچھا، "کیا اس سطح پر تلاشی شروع ہو گئی ہے اور......"

"نہیں، یہ بات نہیں، یہاں پولیس کا اتنا اثر رسوخ نہیں ہے، یہاں سے مراد اس صحرائی علاقے میں، پولیس بس شہر تک محدود رہتی ہے۔" اس نے کافی حد تک پریشان لہجے میں وضاحت دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن ان کا یوں آ جانا......" میں نے پوچھنا چاہا تو وہ تیزی سے مگر پرسکون انداز میں بولا "یہ ان کا معمول ہے۔ اکثر یوں آتے ہی رہتے ہیں۔ آج چونکہ شہر میں ہلچل ہے، اس لئے پوچھا ہوگا، گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"کیا اب وہ چلے گئے ہیں، میرا مطلب اتنا ہی پوچھنا تھا انہوں نے بس؟" تانی نے پوچھا۔

"یہاں صحرا میں جتنی بھی جھونپڑیاں ہیں، یہ اسی طرح سب سے پوچھتے رہیں گے، ایسا چلتا رہتا ہے۔" اس نے پرسکون انداز میں کہا۔

"اچھا ایک بات بتاؤ، وہ ریزارٹ میں جو تمہارے ساتھ وہ عورتیں اور سازندے تھے، کیا وہ یہاں تمہارے اس ڈیرے کے تھے؟" میں نے تیزی سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔

"نہیں، کوئی کہیں کا تھا اور کوئی کسی جگہ کا، شہر میں ایسے کئی لوگ ہیں جو فنکاروں کو جوڑ کر گروپ بناتے ہیں اور پھر ایسے پروگرام کرواتے ہیں۔"

"پولیس نے اس بندے کو نہیں پکڑا جس نے وہاں پر اس گروپ کو بھیجا تھا؟" میں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"پکڑا تھا، ان سب کے ساتھ میں بھی تو رات بھر تھانے میں رہا ہوں۔ اس نے ضمانت دی ہے کہ اگر اس کے گروپ میں سے کوئی بندہ بھی قصوروار ہوا تو وہ اس کا ذمے دار ہے۔" اس نے بتایا تو میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ اب ہم یہاں پر محفوظ ہیں؟"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" مانسی نے تیزی سے پوچھا تو میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"مانسی، تمہیں اگر میرے بارے میں پتہ چل سکتا ہے تو کسی دوسرے کو بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ تم سیدھے یہاں ......" میں کہہ رہا تھا کہ وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"مجھ پر شک مت کرو، مجھے اودھے رام نے یہاں بھیجا ہے، تم اپنی کہو، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ تم یہاں آسانی سے پہنچ سکتی ہو تو کوئی بھی یہاں آسکتا ہے، مادھو کر کو چاہے چھوڑ دیا گیا ہے لیکن وہ تھانے سے ہو کر آیا ہے، یہ اب بھی نگاہ میں ہوگا، یہ اکیلا کیا، اس کے گروپ کا ہر ایک بندہ، اگر یہاں کی فورسز اس قتل کی تلاش میں سنجیدہ ہیں تو ......" میں نے تشویش سے کہا تو اس نے میری بات سن کر پوچھا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اگر میں مان بھی لوں مانسی کہ تمہیں اودھے رام نے یہاں بھیجا ہے تو کس لئے؟ تمہیں کیسے پتہ میں یہاں پر ہوں؟ تمہیں کوئی نہ کوئی تو چھوڑنے یہاں آیا ہوگا؟ اسی طرح مادھوکر

......" میں نے کہنا چاہا تو ماسی قہقہہ لگا کر تیکھے لہجے میں بولی۔

" میں تم لوگوں کے پیچھے پیچھے آئی ہوں، اس کا پتہ مادھو کر کو ہے، کوئی مجھے یہاں چھوڑ نے نہیں آیا سمجھے۔ وہاں گودام تک میں ٹیکسی میں آئی اور پھر وہاں سے یہی مادھو کر لے کر آیا ہے مجھے، اب میری چھوڑ، آگے کی سوچ۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ چند لمحے یونہی خاموشی رہی پھر مادھو کر سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔

" میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

" تو پھر نکل، دیر مت کر۔" میں نے کہا۔

" لیکن ابھی دن کی روشنی میں نکل نہیں سکتے نا۔" اس نے الجھتے ہوئے کہا تو میں نے لاشعوری طور پر باہر کی جانب دیکھا، سہ پہر ہونے کو تھی۔ میں خاموش رہا تو مادھو کر ایک دم سے اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ میں بے چین ہو گیا تھا۔ وہ جھونپڑی محفوظ نہیں لگ رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم ایک میدان میں پڑے ہیں اور ہر کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے۔

ہم دونوں اس جھونپڑے میں خاموشی سے لیٹے ہوئے تھے۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا۔ میں ہر اس پہلو کا جائزہ لے رہا تھا، جس سے محفوظ رہا جا سکتا ہو۔ اچانک ماسی کا فون منمنانے لگا۔ اس نے بہت کم آواز رکھی ہوئی تھی۔ اس نے فون نکالا اور اسکرین پر نگاہ ڈالتے ہی بولی۔

" اودھے رام کا فون ہے؟"

" تو سن لو۔" میں نے کہا تو اس نے اسپیکر آن کرتے ہوئے کال ریسیو کر لی۔ اس کی ہیلو کے جواب میں اودھے رام نے کہا۔

" وہ مادھو کر کہہ رہا ہے کہ تم وہاں سے نکلنا چاہ رہے ہو؟"

" ہاں، یہاں ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔

”دیکھو، شہر کے حالات کافی خراب ہیں، پارٹی کا ہر بندہ اس قاتل کی تلاش میں ہے، جس نے قتل کیا ہے۔“ اس نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

”تو پھر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ اس نے پوچھا۔

”اسے تو پتہ نہیں یہاں کے معاملات کا، نہ وہ کوئی راستہ جانتا ہے، زبان اسے بولنا نہیں آتی۔ تجھے اس کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔ تم اسے سمجھا نہیں سکی ہو کہ کرنا کیا ہے؟“ وہ تیز تیز انداز میں بول رہا تھا۔

”یہاں بھی تو حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ مادھو کر نے بتایا نہیں آپ کو؟“ اس نے پوچھا تو وہ جواباً بولا۔

”بتایا ہے، خیر، اس کا اطمینان زیادہ ضروری ہے۔ میں کرتا ہوں پھر بات، ابھی رکھتا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی کال ختم ہوگئی۔ اس فون کال سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ اگر یہ کال ڈرامہ نہیں تھی تو وہ میرے لیے زیادہ پریشان تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

ہم اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ہمارے درمیان کچھ دیر خاموشی رہی، پھر اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کیا واقعی تمہیں یہاں جھونپڑی میں خطرہ محسوس ہو رہا ہے؟“

”ہاں، مجھے لگتا ہے، پتہ نہیں اودھے رام نے اس کے ساتھ مجھے کیوں بھیج دیا تھا۔“ میں نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

”شاید اودھے رام کو معلوم نہیں تھا کہ وہ تجھے اپنی جھونپڑی میں لے جائے گا، کیونکہ وہ اس سے پہلے ایسے کام لیتا رہا ہے۔“ مانسی نے کہا۔

”لیکن یہ بھول گیا کہ اس بار مادھو کر خود شک کی زد میں ہے۔ کوئی بھی تفتیش کرنے والا اس شخص کو یوں اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں کر سکتا۔ اگر آرمی والے معمول کی پوچھ تاچھ نہ کرتے تو بھی خطرہ ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم نے مجھ پر شک کیا تو......“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”جس دنیا کے ہم جی رہے ہیں، اس میں تو سایہ بھی اپنا نہیں ہوتا، اس پر بھی شک کیا جاتا ہے۔ ایک معمولی چور بھی، جہاں چوری کرنا چاہتا ہے نا، وہاں پہلے بھاگنے کا راستہ سوچ کر رکھتا ہے۔ تحفظ بزدلی نہیں، وار کرنے کے لئے خود کو تیار کرنے کا نام ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم۔“ اس نے دھواں دھواں لہجے میں کہا تو ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ یہ خاموشی کچھ دیر تک ہم میں حائل رہی، ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں ایک سوال کلبلا رہا تھا، میں وہ سوال ماسی سے پوچھنا چاہتا تھا۔ اس لئے پوچھا۔

”ماسی، میں پار سے آیا ہوں، مجھے یہاں پناہ ملی ہے، اور یہ پناہ دینے والے لوگ اپنا عوضانہ ضرور لیتے ہیں۔ یہ لوگ چاہے بارڈر کے اس طرف ہیں یا دوسری جانب، ایک جیسے ہی ہیں۔ میں نہیں جانتا وہ کون شخص تھا، جس کا خون میرے ہاتھوں ہوا۔“

”سمجھ لو، وہ اودھے رام کی راہ میں بڑی رکاوٹ تھا۔“ ماسی نے کہا تو میں نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

”ایک بات میرے دماغ میں کھٹک رہی ہے ماسی؟“

”وہ کیا......؟“ اس نے پوچھا۔

”جو بندہ قتل ہوا ہے، وہ کوئی عام بندہ تو تھا نہیں، اس کا بھی کوئی نیٹ ورک ہوگا، اس کے پاس بھی لوگ ہوں گے، وہ اب تک......“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات سمجھتے ہوئے تیزی سے بولی۔

”وہ کوئی کمتر بندہ نہیں تھا، اس کے لوگ بھی بڑی رسائی رکھتے ہیں۔ اودھے رام نے بہت سوچ کر تمہارا پتہ کھیلا ہے۔ کسی کو تمہارے بارے میں معلوم ہی نہیں، خود اودھے رام حیران ہے۔ اتنی جلدی یہ سب کیسے ہو گیا۔ وہ تمہیں کسی قیمتی ہیرے کی مانند بچا کر رکھنا چاہتا ہے۔ کیونکہ آج تک تمہارے جیسا بندہ اس کے پاس آیا ہی نہیں۔“

”وہ یہ سمجھتا ہوگا، ورنہ یہ تو موقعہ ملنے والی بات ہوتی ہے، مجھے موقعہ مل گیا اور میں نے کام کر دیا لیکن میرے سوال کا جواب تم نے اب بھی نہیں دیا۔“ میں نے پرسکون انداز میں کہا۔

”وہ حکومت کا خاص آدمی تھا، بڑے عرصے سے یہاں ان دیکھی حکومت کر رہا تھا۔ اس لئے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اس کے قاتل کی تلاش نہیں ہوگی، وہ پوری کوشش کر رہے ہوں گے۔“ مانسی نے کہا۔

”تمہارے خیال میں وہ ہم تک پہنچ سکتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں پہنچ سکتے ہیں؟“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”کیسے......؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”وہ اس طرح کے اودھے رام کا کوئی بندہ غداری کرے اور انہیں بتا دے۔ لیکن ایسا کوئی کرے گا نہیں۔“ مانسی نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”ایسا کوئی کیوں نہیں کرے گا؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”کیونکہ اب اودھے رام اس کی جگہ لینے والا ہے، جو ہمارے ہاتھوں ختم ہوا، اب کوئی بھی

اودھے رام کے خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' تو میں کسی حد تک پر سکون ہو گیا۔

شام کے پھیلتے ہوئے اندھیرے ہونے لگا۔ ہم خاموشی سے چلتے چلے جا رہے تھے۔ میرے دائیں جانب ماتسی اور بائیں طرف مادھو کر تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کافی دور کوئی سڑک ہے جہاں تھوڑی بہت ٹریفک رواں ہے۔ اکا دکا کوئی گاڑی یا بائیک گزر جاتی۔ تبھی اسی سڑک سے دو فور وہیل دکھائی دیں۔ پچھلی کی ہیڈ لائٹس میں اگلے والی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اچانک انہوں نے انتہائی تیزی سے ٹرن لیا اور ہماری سیدھ میں آنے لگی۔ تبھی مادھو کر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا......''

''کیا نہیں ہو سکتا؟'' میں نے پوچھا تو وہ سرسراتے ہوئے وحشیانہ انداز میں بولا۔

''فوراً جھاڑی کی اوٹ میں ہو جاؤ۔''

میں نے ارد گرد دیکھا، اندھیرے میں چند جھاڑیاں دکھائی دیں۔ میں انتہائی سرعت سے اس میں جا بیٹھا، میرے پیچھے ہی ماتسی آ گئی۔ وہ میرے ساتھ چپٹ کر بیٹھ گئی۔ ہم دم سادھے وہیں دبکے ہوئے تھے۔ میری نگاہیں ان گاڑیوں پر تھیں۔ مادھو کر بڑے سکون سے چلا جا رہا تھا۔ ایک بار یوں لگا جیسے وہ دونوں گاڑیاں اس کے پاس سے گزر جائیں گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ بریک چرچرائے اور اگلی فور وہیل ذرا سا آگے نکل کر رک گئی۔ اس کے پیچھے والی کے بھی بریک لگ گئے۔ اگلے ہی لمحے چند آدمی گاڑیوں میں سے نکلے اور تیر کی طرح مادھو کر کی جانب آ گئے۔ میں جو سوچ رہا تھا، وہی ہوا۔ میرے اندر جو الجھن ہو رہی تھی، وہ نکل گئی۔ ان میں سے ایک نے دور ہی سے اونچی آواز میں پوچھا۔

''کہاں ہے وہ، جو تم نے چھپا کر رکھا ہے؟''

اس کے ارد گرد چند آدمی گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ مادھو کران کے درمیان میں کھڑا تھا۔ یہی سوال جب دہرایا گیا تو مادھو کر نے انتہائی مسکین لہجے میں ڈرتے ہوئے انداز میں کہا

"آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"وہی قاتل......" کسی کے وحشیانہ لہجے میں آواز ابھری۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی، میں کیسے یقین دلاؤں، رات بھر......" اس نے کہنا چاہا تو اس کی بات کاٹتے ہوئے کسی نے سرد سے لہجے میں پوچھا۔

"دیکھو، ہر وہ بندہ ہمارے لئے قاتل ہے جو وہاں موجود تھا۔ ہمیں تم پر شک ہی نہیں یقین ہے۔ سی سی ٹی وی میں صرف ایک تم ہو جو اپنے گروپ میں سے اٹھ کر کچھ دیر کے لئے کہیں گئے تھے۔ بندہ اگر تمہارے پاس نہیں ہے تو تمہیں پتہ ضرور ہے۔ سچ اگل دو ورنہ......"

"دیکھو، تم مجھے جہاں چاہے لے جاؤ، جیسا چاہے اطمینان کر لو، میں تمہارے سامنے ہوں۔ اب اس کے سوا میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" مادھو کر نے حتمی لہجے میں کہا تو چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی، تبھی کسی نے کہا۔

"چل لے چل اسے اپنے ساتھ، پہلے اس کا ڈیرہ دیکھیں۔"

"چلو۔" کسی نے کہا اور وہ سارے واپس فوراً جنگل کی جانب مڑے۔ انہوں نے مادھو کر کو اپنے ساتھ لے لیا۔ چند منٹ بعد وہاں سناٹا چھا گیا۔ وہ ان جھونپڑیوں کی جانب چلے گئے تھے، جہاں سے ہم آئے تھے۔

"تمہارا شک درست ثابت ہوا۔" ماسی نے ہولے سے کہا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ بھی وہیں پر ہے۔ میں نے اسے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"مادھو کران کے چنگل میں پھنس گیا ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ انہیں مادھو کر پر شک کیوں ہوا؟

یا پھر...... کسی نے غداری کردی؟“

”یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی، ابھی یہاں سے نکلیں۔“ اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

”نکلنا تو پڑے گا، یہاں تو نہیں ٹھہر سکتے۔لیکن جائیں گے کہاں؟“

”یہاں سے نکلو، بتاتی ہوں۔“ اس نے کہا اور اٹھ گئی۔اس کے ساتھ ہی میں اٹھا تو میرے بدن میں ایک ٹیس اٹھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔یہ درد وہی تھا جو قلعے کی دیوار کے ساتھ نیچے لڑھکتے ہوئے چوٹ آئی تھی۔مجھے لگا کہ یہ درد وقتی طور پر ختم ہو گیا تھا لیکن اب دوبارہ شروع ہو گیا ہے۔یہ وقت ایسا تھا کہ مجھے اس درد کو لے کر بیٹھ نہیں جانا تھا، بلکہ ہر حال میں برداشت کرنا تھا۔میں نے خود پر قابو پایا اور چلنے کو تیار ہو گیا۔مانسی ایک جانب تیزی سے چل دی تھی۔میں اس کے ساتھ ہو لیا۔وہ راستے سے تھوڑا ہٹ کر چل رہی تھی۔اس نے اپنا سیل فون نکالا اور کسی کے نمبر ملانے لگی۔

ہم سڑک تک پہنچ گئے تھے۔مانسی نے فون پر مسلسل رابطہ رکھا ہوا تھا۔ہم کچھ اس طرح کھڑے تھے کہ فوراً ہم پر نگاہ نہ پڑ سکے۔کچھ ہی دیر میں ایک فورویل آگئی۔ہم فورویل میں بیٹھے اور شہر کی جانب چل دیئے۔

وہ شہر کا نجانے کون سا علاقہ تھا جو نیا تعمیر ہو رہا تھا۔وہاں کئی سارے بنگلے بن چکے تھے، کچھ بن رہے تھے۔ان میں سے ایک بنگلے کے گیٹ پر گاڑی جا رکی۔ڈرائیور نے ہارن دیا تو گیٹ کھل گیا۔پھر گاڑی سمیت پورچ تک چلا آیا۔ڈرائیور نے اتر کر چابی سے داخلی دروازہ کھول دیا۔اس دوران میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔وہاں چند لوگ تھے، شاید انہیں اندر جانے کی اجازت نہیں تھی جو داخلی دروازہ لاک تھا۔اس بنگلے میں ابھی کام ہو رہا تھا۔نیچے کافی

سامان بکھرا ہوا تھا۔ وہ ہمیں اوپر منزل کے ایک کمرے میں لے گیا۔ وہاں دو تین کمرے ٹھیک تھے۔ وہاں فریش ہونے کے بعد ہمیں پتلون شرٹ بھی مل گئے۔ کھانا کھانے کے بعد گرم گرم چائے بھی مل گئی تو مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔ میں درد کو برداشت کرتے ہوئے بے حال ہو رہا تھا۔ کبھی درد بڑھ جاتا اور کبھی کم ہو جاتا۔ ڈرائیور محض ڈرائیور نہیں تھا۔ وہ اودھے رام کا خاص آدمی تھا۔ اس نے شہر کے حالات بتانے کے بعد ہمیں یہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ تقریباً دو گھنٹوں کے بعد مجھے کچھ دوائیں مل گئیں۔ جس سے وقتی طور پر سکون ہو گیا تھا۔ لیکن میری بے چینی کم نہیں ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں کمرے میں اکیلا تھا۔ باہر سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو مانسی کے ساتھ ندیم ڈانڈیا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی خاموش ہو گئے۔ مانسی کے چہرے پر اکتاہٹ تھی۔ جسے میں نے نظرانداز کر دیا۔ ڈانڈیا مجھے دیکھتے ہی اٹھا اور میرے گلے ملتے ہوئے بولا۔

”رات مادھو کر کو زخمی کر کے وہیں پھینک گئے تھے۔“

”اب کیسا ہے وہ؟“ میں نے دکھ سے پوچھا۔

”بچ گیا، ہسپتال میں ہے۔“ وہ بتاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا پھر تیزی سے بولا، ”اس نے بتایا کچھ نہیں۔“

”اودھے رام کیا کہتا ہے اس بارے میں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تمہاری بات کرواتا ہوں۔“ اس نے کہا اور اپنے سیل فون سے نمبر ملانے لگا۔ کچھ دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ تمہیدی باتوں کے بعد بولا، ”لو بات کرو۔“

"یہ کیا کرنا ہے اب؟" میں نے پوچھا۔

"پولیس تو کچھ نہیں کرے گی، لیکن باقی فورسز تو اپنا کام کر رہی ہیں۔ یہ لوگ بھی انہی کے کہنے پر اودھم مچائے ہوئے ہیں۔ کافی سارے لوگوں کو نقصان پہنچایا ہے انہوں نے۔" اودھے رام نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یہ کب تک چلے گا؟" میں نے پوچھا۔

"میرے خیال میں دو چار دن شور کریں گے اور بس، پھر ہوا نکل جانی چاہئے۔" اس نے کافی حد تک مایوسی سے کہا۔

"اور اگر ایسا نہ ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"تو پھر ہوا نکالنی پڑے گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بولا، "میں نے مادھو کر پر اعتماد کر کے تھوڑی غلطی کی، میں مانتا ہوں۔ میرے خیال میں اتنی چھوٹی سی جگہ پر ان کی نگاہ نہیں جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، اگر میں یہاں محفوظ نہیں تو کہیں اور....." میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"نہیں نہیں، آج شام تک میں تمہیں فون کرتا ہوں۔"

"میں انتظار کروں گا۔" میں نے کہا تو اس نے کال بند کر دی۔ میں نے فون ڈانڈیا کو واپس کر دیا۔

ماسی اٹھ کر چلی گئی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد آئی تو بہت سارا کھانے پینے کا سامان سامنے لا رکھا۔ ہم کھانے کے ساتھ یونہی شہر میں ہونے والی ہلچل کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ڈانڈیا معلومات دیتا رہا۔ کھانے کے دوران میں نے شدت سے محسوس کیا ڈانڈیا اور ماسی میں

تناؤ جیسی کیفیت چل رہی ہے۔ایسا کیوں ہے، میں سمجھ نہیں سکا۔وہ جب برتن لے کر کچن میں چلی گئی تو ڈانڈیا نے ہولے سے کہا۔

"یہ مانسی بھی تمہارے لئے خطرناک ہے؟"

"ایسا کیوں؟" میں نے پرسکون سے انداز میں کہا۔

"وہ اس وقت تیرے ساتھ تھی، کئی ساری فوٹیج میں بھی وہ تیرے ساتھ دکھائی دیتی رہی ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے، اسے خود سے الگ کر دے۔" اس نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ آواز اتنی ہی آہستہ رکھی کہ مانسی سن نہ لے۔ تبھی میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"میں نے اسے اپنے ساتھ نہیں رکھا، یہ خود مجھ پر مسلط ہے، کہہ رہی ہے، اودھے رام نے بھیجا ہے کیونکہ میں یہاں اجنبی ہوں۔"

"اوہ...... ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ تمہارے ساتھ کوئی نیا تعلق بنانے کی کوشش تو نہیں کی...... میرا مطلب......" وہ کہتے کہتے رک گیا تو میں نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے کچھ دوسری طرح کی لڑکیاں پسند ہیں۔"

"اوہ، میں کوشش کر کے اسے آج بھیج دیتا ہوں۔" اس نے کہا تو میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی تو کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔

"ارے یار، تم بتا رہے تھے کہ تم مسنگ پرسن ہو، یہ کیا ڈرامہ ہے؟"

"یہ ڈرامہ نہیں، حقیقت ہے۔" اس نے جذباتی انداز میں کہا۔

"وہی تو پوچھ رہا ہوں یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا تو اس نے بتایا۔

"میں ملتان کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ غربت میں آنکھ کھولی تو ہر شے مجھے اپنی دسترس سے دور ہی دکھائی دی۔ میرا باپ ایک زمیندار کے ہاں مزارع تھا۔ بہت مشکل

سے روزی روٹی پوری ہوتی تھی۔"

"مطلب غربت کے مارے ہوئے ہو۔" میں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تو وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"شاید ایسا نہ ہوتا، لیکن میں پڑھنے لگا۔ گاؤں سے نکل کر شہر آ گیا۔ کہیں مزدوری کرتا، کہیں کچھ، بس کام چلتا رہا۔ انہی دنوں میں اُدھر ایک تنظیم کے ساتھ کام کرنے لگا۔ وہ مجھے معاشی طور پر سپورٹ کر رہی تھی یہاں تک کہ میں کالج سطح تک آ گیا۔ تب پھر مجھے پتہ چلا اس تنظیم کی آڑ میں ہو کیا رہا ہے۔"

"کیا کرتے تھے وہ لوگ......؟" میں نے پوچھا۔

"یہی غیر قانونی کام، پیسہ بنانا، مختلف قسم کی وارداتیں، دھندہ۔" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"تم بھی غیر قانونی کام کرنے لگے؟" میں نے پوچھا

"ظاہر ہے میں ان کا حصہ بن گیا تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ ہمیں باہر سے پیسے ملنے لگے۔ ہمارے کام کی نوعیت ہی بدل گئی۔ مختلف طرح کی نفرت پھیلانا، منفی پراپیگنڈا، اور ایسی باتیں۔"

"وہاں تو اچھا تھا، پھر بھاگے کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"وہاں مجھ سے قتل ہو گئے۔ اب میں وہاں رہ تو نہیں سکتا تھا، مجھے پھانسی ہو جاتی یا پھر میں کہیں مارا جاتا۔ میں ادھر آ گیا۔ وہاں میری تنظیم والوں نے شور مچایا ہوا ہے کہ مجھے فورسز نے پکڑ کر غائب کیا ہوا ہے۔ بس یہی......"

"کوئی اور لوگ بھی تیری طرح ہیں یہاں پر......؟" میں نے پوچھا۔

”بہت سارے ہیں، یہاں پھیلے ہوئے ہیں، کوئی میرے طرح دھندا کر رہا ہے، کوئی تربیت لے رہا ہے، تم بھی اگر چاہو، تو انہیں میں شامل ہو جاؤ۔ یقین جانو عیش کرو گے۔ واپس بھی چلے جاؤ گے تو تمہارا پورا تحفظ کریں گے۔“ اس نے بڑے جذباتی انداز میں بتایا۔

”ظاہر ہے پورا نیٹ ورک ہوگا، اس کے بغیر یہ کیسے چل سکتا ہے۔“ میں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

”بالکل پورا نیٹ ورک ہے، اودھے رام تو اس کا ایک معمولی سا مہرہ ہے۔ اس کے بڑے تو اوپر بیٹھے ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”یار، اگر ایسا ہوتا تو اب تک مجھے پکڑنے والی اچھل ہی ختم ہو چکی ہوتی، جبکہ اس کے لوگ دندناتے پھر رہے ہیں، بادھو کر کا حال ہی دیکھ لو۔“ میں نے اسے زچ کرتے ہوئے کہا تو وہ جذباتی لہجے میں کہتا چلا گیا۔

”میں تمہیں ایک بات بتا دوں، جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا، اب معاملہ ختم ہے، میں آیا ہی اس لئے ہوں کہ تمہیں یہاں کے ایک بڑے سے ملوا دوں۔ پورے شہر پر کیا پورے علاقے پر اسی کا راج ہے۔ اس نے خود تم سے ملنے کی خواہش کی ہے۔ اودھے رام والا معاملہ ہی اب ماضی ہو گیا۔“

”وہ کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بتاتا ہوں، لیکن اس کا ذکر ماتسی سے نہیں کرنا۔“ اس نے ہولے سے کہا۔

”میں تو جلد از جلد واپس جانا چاہوں گا، لیکن تب تک یہاں ہوں جب تک میرے حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے۔“ میں نے کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔ جیسا چاہو گے...... ویسا ہی تمہارا وقت گزرے گا، بس مجھ پہ یقین رکھنا۔“

اس نے کہا اور ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

اتنے میں ماسی واپس آ گئی تھی۔ اس کے آتے ہی ڈانڈیا نے اونچی آواز میں اسے سناتے ہوئے کہا۔

”چل علی زین جلدی سے تیار ہو جا، کہیں جانا ہے۔“

”کہاں جانا ہے؟“ ماسی نے حیرت سے پوچھا۔

”کہیں تو لے کر جاؤں گا۔ اس کے درد کا مسئلہ ہے۔ بس تم ادھر ہی رہنا، میں یہاں سے لے لوں گا تمہیں۔“ اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تو میں نے ماسی کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر اکتاہٹ مزید گہری ہو گئی تھی۔ میں نے پھر اسے نظر انداز کیا اور کمرے کی جانب مڑ گیا۔

میں نے اپنے دماغ کو فی الوقت کسی بھی سوچ سے آزاد کر دیا تھا۔ ایویں خواہ مخواہ ذہنی مشقت کا کیا فائدہ؟ میں تیار ہو کر آ گیا۔ میں نے چیک دار شرٹ کے ساتھ سیاہ پتلون پہنی ہوئی تھی۔ ماسی نے ڈانڈیا کا مہنگا چشمہ اٹھا کر میرے لگایا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”لگا رہنے دو، اچھا لگتا ہے۔“ اس نے ہولے سے کہا تو ڈانڈیا چل دیا۔ وہ چند قدم بڑھا ہی تھا کہ ماسی میرے ساتھ ملنے کے لئے میرے ساتھ لگ گئی۔ پھر ہولے سے بولی۔

”بہت محتاط رہنا، میں اپنا نمبر تیری جیب میں ڈال رہی ہوں، رابطہ کرنا۔“ یہ کہتے ہی وہ الگ ہو گئی۔ میں سمجھ نہ سکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اسے خود سے الگ کیا اور ڈانڈیا کے پیچھے چل پڑے۔ نیچے ایک فور وہیل کھڑی تھی۔ میں اس میں جا بیٹھا تو ڈانڈیا نے فور وہیل کو گیئر لگا دیا۔ وہ مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا، شہر سے باہر ایک جدید طرز تعمیر والے محل نما گھر کے

سامنے آ رکا۔ کچھ دیر گیٹ پر رکنے کے بعد ہم ایک پورچ میں جا رکے۔ اس نے فوروہیل ایک جانب لگائی اور مجھے ساتھ لے کر اندر کی جانب چل دیا۔

اگرچہ وہاں ہال میں کافی سارے لوگ کام کر رہے تھے لیکن ایک خاص قسم کا سناٹا ہر جانب پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف استقبالیہ تھا۔ ڈاڈیا نے وہاں ایک لڑکی سے کچھ باتیں کیں، پھر چند منٹ کی فارمیلٹی کے بعد ہم لفٹ کی جانب بڑھ گئے۔ تیسری منزل کی راہداری میں وہ کونے والا کمرہ تھا۔ ہم اس میں چلے گئے تو سامنے ایک فٹ بال نما موٹا سا گنجا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سمیت آنکھیں بھی گول تھیں۔ وہ میری جانب گھورے چلا جا رہا تھا۔ اس نے کوئی بات کیے بغیر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کسی تعارف کے بغیر اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جذبات سے عاری لہجے میں پوچھا۔

"یہاں رہ کر کام کرنا ہے یا واپس جانا ہے؟"

"جیسے کہو؟" میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"گڈ، اچھا لگا۔" اس نے کورے لہجے میں کہا، پھر لمحہ بھر سانس لے کر بولا، "آج شام گیارہ بارہ لوگوں کا ایک گروپ ٹرین سے یہاں پر آ رہا ہے، ابھی یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں رکیں گے اور کتنے وقت کے لئے۔ خیر، یہ معلومات مل جائیں گی۔ وہ گروپ دلی سے چل پڑا ہے۔ ان میں دو مقامی لڑکیاں ہیں۔ ان کا زندہ حالت میں ہم تک پہنچنا ضروری ہے۔ اگر کر سکو تو......"

"وہ تو کر لوں گا، لیکن یہاں کی پولیس اور......" میں نے کہنا چاہا تو وہ دیدے گھماتے ہوئے تیزی سے بولا۔

"کوئی تجھے پہچانے گا تبھی نا، پولیس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہاں، او دھے کے مخالف

لوگوں نے اودھم مچایا ہوا ہے وہ سنبھالے جا سکتے ہیں، شاید انہیں بھی روکنا پڑے۔“

”ان لڑکیوں کی پہچان کیا ہے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے ذرا سا پیچھے ہٹ کر اپنے سامنے کا دراز کھولا، اس میں سے ایک سیل فون نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس فون میں اس گروپ کی کچھ تصویریں ہیں، ممکن ہے مزید تصویریں بھی آ جائیں۔ ان دونوں کی الگ سے بھی تصویریں ہیں۔ اسی فون سے رابطے میں رہنا۔“

”اوکے۔“ میں نے فون پکڑتے ہوئے کہا تو اس نے دراز سے ایک شناختی کارڈ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

”یہ لو، اب تم رانا ویر سنگھ ہو۔ تم کہاں رہتے ہو، یہ ساری معلومات اسی فون میں ہیں دیکھ اور سمجھ کر ختم کر دینا۔“ اس نے کہا اور پھر نوٹوں کی ایک گڈی میری جانب بڑھا دی۔ پھر وہ اپنے فون میں مگن ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب وہ مجھ سے مزید بات نہیں کرے گا۔

”اوکے۔“ میں نے کہا اور اٹھ گیا۔ اس نے میری جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ میں اور ڈاڈیا جیسے ہی کمرے سے باہر آئے سامنے ایک ادھیڑ عمر عورت کھڑی ہماری جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے ہوئے کہا۔

”آئیں، میرے ساتھ بیٹھ کر ایک کپ چائے پئیں۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ ڈاڈیا کا کہنا فضول گیا تھا کیونکہ وہ پہلے ہی مڑ گئی تھی۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ وہ ایک پرسکون کمرے میں لے گئی۔ وہاں اس نے ایک بڑے سارے آئینے کے سامنے مجھے بٹھا دیا۔ کئی دنوں بعد میں نے خود کو غور سے دیکھا تو عجیب سی وحشت ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہی تھی۔ کافی دیر بعد میں وہاں سے نکلا تو کافی حد تک بدل چکا تھا۔ پہلی نگاہ میں رانا ویر سنگھ ہی دکھائی دے رہا تھا۔

ڈانڈیا مجھے اسی بوڑھے کے پاس لے گیا تھا جس نے میرا درد ٹھیک کیا تھا۔ اس نے پھر کچھ وقت لگا کر مساج کیا تو بہت حد تک درد رفو ہو گیا تھا۔ اس بوڑھے کے پاس کچھ دیدک علاج تھا۔ وہ ان پرانے لوگوں میں سے ایک تھا، جس کے پاس آج بھی جادو اثر دوائیں موجود تھیں۔ اس نے اپنا جادو مجھے دکھا دیا تھا۔ مجھے کچھ اطمینان ہوا تو مجھے چاچا عبدالمجید کا خیال آیا۔ میں نے ڈانڈیا کا فون لیا اور چاچا عبدالمجید کے نمبر ملا دیئے۔ تھوڑی دیر بعد فون رسیو کر لیا گیا۔ میری آواز سنتے ہی چاچا جذباتی ہو گیا۔

"کہاں تک پہنچ گئے ہو؟"

اس کے اس سوال پر میں نے انتہائی اختصار سے بتاتے ہوئے کہا۔

"بس چاچا، مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے ہدف کے قریب پہنچ چکا ہوں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" اس نے پرجوش انداز میں پوچھا۔

"یہ نمبر جس کا ہے، وہیں سے رستہ نکلے گا۔" میں نے کہا۔

"اوہ، تو یہ اہم بندہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پتہ نہیں، لیکن یہ اقرار کر چکا ہے کہ یہ مسنگ پرسن ہے۔" میں نے کہا تو وہ تیزی سے جذباتی لہجے میں بولا۔

"بس اب، میں اسے چیک کر لوں گا۔ تم اپنا خیال رکھنا، میری دعا ہے کہ تم اپنے مشن میں کامیاب ہو جاؤ۔"

"چاچا، تمہیں پتہ ہے، اس راہ میں کہاں موت آ جائے، لاش ملے بھی نہ ملے، سوائے ایک خواہش ہے۔" میں نے کہا تو میرا گلا رندھ گیا۔

"بول میرے بچے۔" انہوں نے بھی جذباتی لہجے میں پوچھا۔

”میں پتہ نہیں دوبارہ، روہی جا سکوں گا یا نہیں، پیروزاں کو ختم کر سکوں گا یا نہیں، لیکن وہاں پر بابا خیر دین اور ساوری ہے، انہیں وہاں سے نکال لیں، انہیں کم از کم سکون کی زندگی دے دیں۔“ میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا تو وہ بولا۔

”سانول غائب ہے، یہ پتہ نہیں کیوں مل جائے گا اگر زندہ ہوا، باقی تم ساوری اور خیر دین کے بارے فکر نہ کرو، اب وہ میری ذمہ داری ہیں۔“ چاچا نے پر یقین انداز میں کہا تو مجھے سکون مل گیا۔ تبھی میں کہا۔

”اب تک مجھے کوئی راستہ نہیں ملا تھا لیکن لگتا ہے، اب میں اپنی راہ پر آ گیا ہوں۔ میں کوشش کروں گا آپ سب کو جلدی کوئی خوش خبری سناؤں۔“

”میری دعا ہے کہ تجھے جلد از جلد کامیابی ملے۔“ اس نے کہا تو میں نے فون کال بند کر دی۔ میں زیادہ باتیں کر کے نہ خود کسی خواہش میں پڑنا چاہتا تھا نہ کسی کو کوئی امید دینا چاہتا تھا۔ میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک کر جلد ہی میں نے خود پر قابو پالیا۔

ہم سہ پہر تک اسی کے پاس رہے۔ میرا درد تو ختم ہو گیا لیکن میرے بدن پر پڑنے والی خراشیں اب بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ وقفے وقفے سے ہمیں فون پر معلومات مل رہی تھی۔ ایک نسوانی آواز مجھے اسی گروپ کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفے سے تصویریں بھیجتی رہی۔ وہ گروپ مستیاں کرتا ہوا، جیسلمیر کی جانب آ رہا تھا۔ جیسے ہی مجھے یہ پتہ چلا کہ وہ کس ہوٹل میں ٹھہریں گے، تبھی ڈانڈیا کو بھی ہدایت مل گئی کہ اس نے مجھ سے الگ ہو جانا ہے۔ شام ڈھل رہی تھی جب ڈانڈیا مجھے ایک پارک کے سامنے ڈراپ کر کے چلا گیا۔

☆......☆......☆

میں ٹہلتا ہوا ایک بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ موسم تھوڑا سا گرم تھا۔ لوگ اتنے زیادہ نہیں تھے۔ تھوڑے سے بچوں نے کافی رونق لگائی ہوئی تھی۔ مگر میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ جیسے کوئی نہ سمجھ آنے والی کیفیت ہو۔ مجھے وہاں بینچ پر بیٹھے کچھ دیر ہوئی تھی کہ اسی نسوانی آواز نے مجھ سے کہا۔

"رانا ویر سنگھ، وہیں پارک میں رہیں، میں پہنچ رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کسی بھی جذبے سے عاری لہجے میں کہا۔

"رانا جی مجھے پہچانو گے کیسے؟" وہ خوشگوار انداز میں بولی تو میرے اندر بھی ایک دم سے کمزوری بے چینی صاف ہو گئی۔ تبھی میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جتنی تمہاری خوبصورت آواز ہے، تم بھی اتنی ہی خوبصورت ہو گی، جو سب سے زیادہ خوبصورت ہو گی وہی تم ہو گی۔"

"اوہ...... مطلب جو وقت بھی گزرے گا تمہارے ساتھ اچھا گزرے گا، لگتا ہے تمھیں لڑکیاں پٹانا آتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہلکا سا قہقہہ لگا دیا۔

"یہ تو ملنے کے بعد پتہ چلے گا۔" میں نے کہا تو وہ بولی۔

"اپنے سامنے دیکھو، میں کھڑی ہوئی، سیاہ پتلون اور کاسنی شرٹ میں۔" میں نے سامنے دیکھا، ایک پتلی سی لڑکی کھڑی تھی۔ گورا رنگ اور سیاہ لانبے بال جو ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ سیل فون کان سے لگائے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا تو بولی

"آ جاؤ چلتے ہیں۔"

میں نے فون جیب میں رکھا اور اٹھ کر چل دیا۔ ہم ایک ساتھ ہی پارک سے باہر آ گئے۔ وہ بالکل میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"واقعی خوبصورت ہو، خاص طور پر تمہاری یہ آنکھیں۔"

"میں کانتی دیوی ......" اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے یوں کہا جیسے میں نے اس کی کوئی خاص تعریف نہ کی ہو۔

ہم یونہی باتیں کرتے پارکنگ میں جا پہنچے۔ وہاں ایک سفید رنگ کی کار کھڑی تھی۔ ہم اس میں بیٹھے اور نکلتے چلے گئے۔ سڑک پر آکر اس نے ایک چوراہے سے کار موڑ کر سیدھے جاتے ہوئے کہا۔

"وہ لوگ، ریلوے اسٹیشن پر اتر چکے ہیں۔ ابھی کچھ دیر میں شہر سے باہر موجود ایک ریزارٹ میں جائیں گے۔ میں نے بھی ایک دن کے لئے وہاں کمرہ لے لیا ہے۔"

"اوہ......اس کا مطلب کام اطمینان سے کرنا ہے۔" میں نے سکون سے کہا تو اس نے تیزی سے پوچھا۔

"تم کیا سمجھ رہے تھے؟"

"میں نے سوچا، اسٹیشن سے ہوٹل کے راستے ہی میں......" میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"نہیں، اس میں خون خرابہ والی بات نہیں ہوگی، یاد رکھنا جب تک انتہائی ضرورت نہ ہو، تب تک کسی کو مارنا نہیں۔" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا، پھر لمحہ بھر بعد بولی، "ہم بھی ٹورسٹ ہیں، وہیں ٹھہریں گے، دو بیگ ڈگی میں پڑے ہیں جو ہمارا سامان ہے۔ میں بتاتی ہوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے باقی تم جانو......" یہ کہتے ہوئے وہ اپنا پلان بتانے لگی تو میں خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ سڑک پر کار بڑھائے چلی جارہی تھی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ جیسے اسے کوئی جلدی نہیں ہے۔

اندھیرا پھیل چکا تھا جب ہم شہر سے باہر بنے ریزارٹ میں جا پہنچے۔ کار پارکنگ میں لگانے کے بعد ہم نے ڈگی سے سامان نکالا اور اندر کی جانب بڑھے۔ انہی لمحات میں ایک ویگن وہیں رکی۔ مسافر اس میں سے نکلنے لگے۔ یہ وہی گیارہ لوگ تھے جن کے لئے ہم یہاں تھے۔ میں انہیں دیکھنے کے لئے وہیں ٹھہر گیا۔ بظاہر میں کار میں 'کچھ' تلاش کر رہا تھا لیکن میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں لڑکیاں زندگی سے بھرپور انداز میں چہک رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ہی انہیں گائیڈ کر رہی ہوں۔

ہم ان کے ساتھ ہی اندر کی جانب بڑھے۔ پورچ میں ریزارٹ کے ملازمین کھڑے تھے۔ ایک لڑکی کے ہاتھ میں پوجا کی تھالی تھی۔ وہ ان سب کے ماتھے پر سیندور لگانے کو تیار کھڑی تھی۔ ہم ان کے ساتھ یوں تھے جیسے انہی کے ساتھ ہوں۔ وہ ملازم لڑکی سیندور لگاتے ہوئے قہقہے لگا رہی تھی، انہی کے ساتھ ہماری طرف بھی ہاتھ بڑھایا تو کانتی نے تیزی سے کہا۔

''ہم ان کے ساتھ نہیں، آپ انہیں لگاؤ.....''

اس کی اس بات پر ایک لڑکی نے چہک کر کہا۔

''کوئی بات نہیں ہم سب یہاں ایک جیسے ہی مہمان ہیں، پلیز......'' اس نے کانتی کو آگے کر دیا، ملازم لڑکی نے اس کے ماتھے پر سیندور لگایا، پھر میرے ماتھے پر، ہم آگے بڑھ کر لاؤنج میں آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ان کے کمروں سے ذرا سا ہٹ کر ہمیں بھی کمرہ دے دیا گیا۔

''لو جی رانا جی، اب تمہارا کام شروع ہے۔'' اس نے بیڈ پر گرتے ہوئے کہا تو میں خاموش رہا۔ میں نے اس بارے ابھی کچھ نہیں سوچا تھا، میں سکون سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔

''اے سی تو چلا دو، تمہیں گرمی محسوس نہیں ہو رہی؟''

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور اسے ہی آن کر دیا۔

ہم فریش ہو کر کپڑے تبدیل کر کے کمرے میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ کب وہ گروپ باہر نکلتا ہے۔ جیسے ہی ان کے کمرے میں ہلچل ہوئی۔ ان میں لوگ باہر آنے لگے تو ہم بھی اپنے کمرے سے باہر آ گئے۔ ہمارا انداز ایسا ہی تھا جیسے ہم اتفاقیہ ان کے نکلتے ہی باہر نکلے ہیں۔ ہمارے درمیان مسکراہٹوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ کانتی فوراً ہی ایک لڑکی کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ ہم چلتے ہوئے ریزارٹ کے عقبی حصے میں آ گئے۔

وہ ریزارٹ کافی حد تک جدید تھا۔ یہ خاص طور پر ان کے لئے بنایا گیا تھا، جو صحرا سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے تھے۔ ریزارٹ کے عقبی حصے میں ایک وسیع میدان تھا، اس میں گھاس لگا کر سبزہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایک جانب سوئمنگ پول تھا، جہاں اب رش نہیں تھا، تھوڑے سے لوگ سوئمنگ کر رہے تھے۔ میدان میں جا بجا کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ جن پر لوگ ڈنر کے لئے بیٹھے تھے۔ میدان کے سرے پر ایک سٹیج بنا ہوا تھا۔ جس پر رنگ برنگی روشنیاں پڑ رہی تھیں۔ میرا گمان تھا کہ یہاں پر روائتی ناچ پیش کیا جاتا ہوگا۔ میں اور کانتی جان بوجھ کر اس گروپ کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ ہمارا اتنا ہی فاصلہ تھا جیسے ان کی باتیں ہم سن سکتے تھے۔

وہ دونوں لڑکیاں میرے سامنے تھیں۔ میں انہیں ایسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے کوئی شکاری اپنے ہدف کو دیکھتا ہے۔ دونوں نے ایک جیسی سیاہ ٹائیٹس اور گہرے رنگ کی سلیولیس شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ دونوں ہی زندگی سے بھرپور تھیں۔ ان کا ایک جیسا ہیر اسٹائل تھا۔ چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ اس وقت تک میرے ذہن میں کوئی پلان نہیں تھا کہ ان پر حملہ کب اور کیسے کرنا ہے۔ میں انہی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں لڑکیاں اپنے سامنے بیٹھے نوجوان

لڑکوں کے ساتھ باتوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ وہی کیا ان کے گروپ کا ہر بندہ اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ میرا گمان تھا کہ اگر انہیں الگ الگ ہو جانے کا موقع مل جائے تو وہ فوراً کوئی تنہا گوشہ تلاش کر لیں گے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" کاشی نے ہولے سے کہا تو میں نے ان سے نگاہیں ہٹا کر کاشی کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم بھی دیکھ رہی ہو، میں کیا دیکھ رہا ہوں۔"

"ان میں جو صحت مندسی ہے نا، چھوٹے قد کی، اس کا نام ششما ہے اور جو دوسری پتلی اور لمبی سی ہے، وہ ریتا ہے۔"

"ان کے پروگرام کے بارے کوئی معلومات......" میں نے پوچھنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

"یہ صبح سویرے صحرا میں نکلیں گے۔ مطلب سورج کو صحرا میں ابھرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد یہ شہر کی جانب نکلیں گے۔ شام وہاں دیکھیں گے اور رات تک وہیں رہیں گے۔"

"اس کے بعد کا کوئی پلان؟" میں نے پوچھا۔

"کہہ رہی تھی کہ وہ یہاں سے زیرو لائین تک جانا چاہتے ہیں۔ بارڈر کی طرف، وہاں کچھ مندر وغیرہ اور صحرا دیکھیں گے۔" کاشی نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کہیں ان پر ہاتھ ڈال دیا جائے، ورنہ مشکل ہو جائے گی۔" میں نے کہا تو کاشی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کیا چاہ رہا ہوں۔ اس نے اپنی آنکھوں کے اشارے سے طے ہو جانے

کاغذ پہ دے دیا۔ اتنے میں ویٹر ہمارے قریب آ گیا۔ وہ آرڈر لے کر اسی گروپ کے پاس چلا گیا تو سٹیج پر ایک رقاصہ نمودار ہو گئی۔ تیز موسیقی سے وہ میدان گونج اٹھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس رقاصہ نے مقامی گیت چھیڑ دیا۔

"دیہاں کا بدماس رے، مہارے کھیت ما جو تھا باڑ دیو"

(اسے بہت بڑے بدمعاش، تم نے ہمارے کھیت میں بھینسا چھوڑ دیا۔)

وہ گیت گانے کے ساتھ بے ہودہ قسم کے اشارے بھی کر رہی تھی۔ جس پر کانتی ہنس ہنس کر دوہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ایسا ہی کچھ حال اس گروپ کا بھی تھا۔ وہ شام خوشگوار ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

صبح کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی جب میں اور کانتی ریزارٹ سے نکل چکے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک جگہ ایسی تھی جہاں مقامی لوگ سجے سنورے اونٹ لے کر کھڑے ہوتے تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو کافی سارے اونٹوں کے ساتھ کئی سارے لوگ دکھائی دیئے۔ ایک جانب فور وہیل کھڑی تھی۔ ہماری کار جیسے ہی رکی۔ فور وہیل میں سے ایک نوجوان نکل کر باہر آ گیا۔ جیسے ہی وہ قریب آیا، کانتی نے اپنی کار کی چابی اس کی جانب بڑھا دی۔ اس نے اشارے سے دور کھڑے ایک ساربان کی جانب اشارہ کیا۔ وہ لمبے قد کا جوان تھا۔ اس نے سرخ پگڑی باندھی ہوئی تھی اور سفید شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ ہم نے سب کچھ وہیں چھوڑا اور اس ساربان کی جانب بڑھ گئے۔ جب تک ہم اس کے پاس پہنچے اس نے اونٹ بٹھا دیا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں اپنے پاس پسٹل کی موجودگی کا احساس کر لیا تھا۔ اس لئے بڑے اعتماد سے ہم اونٹ پر سوار ہو گئے تو وہ خود اگلے اونٹ پر بیٹھ گیا۔ کانتی میرے پیچھے بیٹھی تھی۔ پھر اگلے دو

منٹ میں اونٹ کھڑے ہوئے اور ہم چل پڑے تھے۔

وہاں صحرا کی طرف جانے والے اونٹوں میں زیادہ تر ایسے بھی تھے کہ ساربان تیز تیز قدموں سے پیدل جا رہے ہیں۔ وہاں آنے والے سیاح اونٹوں پر بیٹھے ہوئے صحرا کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس وقت شاید ہم جلدی آ گئے تھے، یا ہمیں دیر ہو گئی تھی۔ ہماری نگاہ کسی ایسے قافلے پر نہیں پڑی تھی۔ ساربان تیز تیز چل رہا تھا جس سے ہمیں اچھے خاصے ہچکولے لگ رہے تھے۔

"یوں لگ رہا ہے جیسے اندر کا سب کچھ باہر آ جائے گا۔" کاتی نے پریشان لہجے میں ہچکولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تبھی میں نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔

"شکر کرو سنافت باہر نہیں آ گئے گی۔"

"اگر کچھ دیر وہ گروپ دکھائی نہ دیا تو شاید بہت کچھ باہر آ جائے۔" وہ پریشان لہجے میں بولی تو میں نے پوچھا۔

"ویسے حیرت ہے، وہ اب تک دکھائی کیوں نہیں دے رہے؟"

"میں نے خود انہیں نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ پارکنگ میں ان کی وین بھی نہیں تھی۔ ممکن ہے وہ کسی دوسرے پوائنٹ سے نکل گئے ہوں۔" کاتی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ اس وقت ہم ایک ٹیلے پر چڑھ کر دوسری جانب اترنے کو تھے کہ میری نگاہ دور ایک قافلے پر پڑی۔ ذرا غور کیا تو اسی گروپ والا قافلہ تھا۔ میں نے اونٹ کو ہشکارا دیا تو وہ تیز ہو گیا۔ ساربان نے محسوس کر لیا تھا۔ میں جونہی اس کے قریب پہنچا تو اس نے میری جانب دیکھا۔ میں نے قافلے کی جانب تیز چلنے کا اشارہ کر دیا۔ اونٹ کی رفتار تیز ہو گئی۔ کاتی نے اپنی بانہیں میرے پیچھے سے ڈال کر مجھے یوں مضبوطی سے پکڑ لیا کہ وہ میری پشت سے جڑ گئی تھی۔

ہم اس قافلے کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ ایک اونچے ٹیلے پر رک گئے تھے۔ ہم بھی ان کے پاس جارکے۔ کاننی نے اونٹ پر بیٹھے بیٹھے ششما سے پوچھا۔

"آپ لوگ یہاں کیوں رُک گئے؟"

"سب کا خیال ہے کہ ہم یہاں سے ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھیں گے۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

"اگر آپ لوگ اجازت دیں تو ہم بھی یہیں رُک جائیں۔" کاننی نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں، آجاؤ۔" رتنا نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا، اس نے بھرپور انگڑائی لی تھی۔ یوں جیسے رات کا خمار ابھی تک اس کی آنکھوں میں ہو۔

میں نے ساربان کو رُک جانے کو کہا۔ اس نے اونٹ بٹھا دیئے اور ہم بھی ان کے ساتھ جا کھڑے ہوئے۔

مشرقی افق پر سورج ابھرنے کی ہلکی سی سرخی ابھر آئی تھی۔ سبھی اس جانب دیکھ رہے تھے۔ ہر کسی کے ہاتھ میں کیمرہ یا سیل فون تھا۔ رتنا ایک نوجوان کی باہوں میں باہیں ڈال کر مشرق افق کی جانب دیکھ رہی تھی، جبکہ ششما اکیلی ایک طرف کھڑی تھی۔ اس کا ساتھی ابھی تک ٹیلے کی ریت پر بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے کاننی کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئی کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ ایک بہت اچھا موقعہ ہے۔ ایسا موقعہ پھر شاذ ہی ہاتھ آئے۔ کاننی نے فوراً اپنا سیل فون نکالا اور نمبر پش کرنے لگی۔ اس دوران وہ ہم سے چند قدم کے فاصلے پر چلی گئی۔ چند لمحے بات کرنے کے بعد وہ پلٹی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے

آنکھوں کے کونے سے اشارے سے ڈن کر دیا۔ ہم غیر محسوس انداز میں ششما اور رتنا کے قریب چلے گئے۔ کچھ لمحوں بعد کانتی نے رتنا کی جانب اپنا سیل فون بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم ہماری ایک تصویر بنا دو گی؟"

"اوہ، کیوں نہیں۔" اس نے کہا اور فون کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ ہم اکٹھے کھڑے ہو گئے۔ اس نے تصویر بنا دی۔ اس نے سیل فون واپس کیا تو کانتی نے رتنا سے پوچھا۔

"کیا تم میرے ساتھ تصویر بنوا لو گی؟"

"کیوں نہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ کانتی کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ اسی دوران کانتی نے ششما کی جانب دیکھا اور اشارے سے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے دائیں جانب آ کھڑی ہوئی۔ اس نے فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے فون پکڑ کر جیب میں ڈال لیا۔ وہ اس حرکت پر حیرت کا اظہار پوری طرح نہ کر پائیں تھیں کہ میں نے پسٹل نکال لیا۔ کانتی بھی پسٹل نکال چکی تھی۔

"کوئی حرکت نہ کرے؟" میں نے دھاڑتے ہوئے کہا تو کئی چیخیں نکل گئیں۔ وہ سب ہمارے طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے ہم کوئی آسمانی مخلوق ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھتے، ایک نوجوان نے کہا۔

"دیکھو، تمہیں جو چاہئے لے لو، مگر کسی کو نقصان نہیں پہنچانا۔"

"تم سب سن لو، اگر کسی کو مرنے کا شوق ہے تو آگے آ جائے، ورنہ سب لیٹ جاؤ یہاں فوراً......" میں نے آخری لفظ دھاڑتے ہوئے کہا تو سبھی ریت پر لیٹنے لگے۔ رتنا اور ششما بھی لیٹنے لگی تو کانتی نے کہا۔

"تم ہمارے ساتھ چلو گی دونوں......"

اس نے اتنا کہا ہی تھا کہ دونوں ایک دم سے کانتی پر ٹوٹ پڑیں۔ انھوں نے زوردار انداز میں گھونسے اس کے سینے پر مارے تھے۔ کانتی کی آنکھوں کے ساتھ زبان باہر آ گئی۔ یوں لگا جیسے اس کا سانس اکھڑ گیا ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے پانسہ پلٹ گیا ہے۔ میں نے اسی لمحے ایک جست لگائی اور اچھلتے ہوئے دونوں کے کاندھوں پر اپنی کلائیوں سے مارا، بلاشبہ وہ لڑنے کے فن سے آشنا تھیں۔ انہیں کچھ نہیں ہوا سوائے اس کے کہ انہوں نے کانتی کو چھوڑ دیا۔ وہ میری طرف سیدھی ہوئی ہی تھیں کہ کانتی نے فائر کر دیا۔

"کانتی انہیں سنبھالو، کوئی بھی حرکت کرے، گولی مار دینا۔" میں نے کہا اور رتنا اور ششما کے آمنے سامنے ہو گیا۔ وہ دونوں میری جانب میرے سامنے تھیں، وہ مجھے نگاہوں میں تولتی ہوئیں مقابل آ گئیں۔ میں انہیں حملے کا موقع دینا چاہ رہا تھا۔ اچانک رتنا ذرا سا ابھری، اس نے میرے چہرے پر وار کرنا چاہا تھا، لیکن میں اسے بچا گیا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے بڑھی تو میں نے اس کی پیٹھ پر گھونسہ دے مارا۔ وہ ریت پر گر گئی، تب تک کسی ناگہانی بلا کی مانند ششما نے میری گردن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں نے اس کی کلائی کو جھٹکا دیا، پھر اسے مروڑتے ہوئے اپنے سامنے لے آیا۔ وہ قہر آلود نگاہوں سے مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے اس کی کلائی کو ایک جھٹکا دیا اور پیچھے پھینک دیا۔ وہ ریت پر گر گئی۔ تبھی میں نے پسٹل اس پر تان لیا۔

"مرنا ہے؟" میں نے سرد لہجے میں کہا

"کون ہو تم اور کیوں......؟" لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ میں نے اس پر یوں فائر کر دیا کہ اسے نہ لگے۔ وہ دونوں وہیں سہم گئیں۔ کانتی اپنی شرمندگی کا احساس مٹانے کے لئے غصے میں آ گئی ہوئی تھی۔ اس نے بلاوجہ کئی فائر کر دیئے تھے۔ جس کا یہ فائدہ ہوا کہ اس گروپ میں سے کوئی نہیں اٹھا تھا۔ وہ انہیں کور کیے ہوئی پیچھے ہٹنے لگی۔ میں رتنا اور ششما کی جانب بڑھا اور

پیچھے سے ان کی شرٹوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ پھر اپنا چہرہ ان کے قریب لے جا کر بولا۔

”ابھی تک تم دونوں کو کچھ نہیں کہا میں نے۔ اب اگر سستی کی تو......“

میں نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی، پھر انہیں دھکیل کر ٹیلے سے اترنے لگا۔ وہ ریت سے بھر گئی ہوئیں تھیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا، کانتی سب کو کور کیے کھڑی تھی۔ اسی لمحات میں ٹیلے کے پیچھے وہی فور وہیل آ گئی، جس میں سے ایک نوجوان نکلا تھا۔ اس میں سوائے ڈرائیور کے کوئی نہیں تھا۔ میں نے جیسے ہی ششما اور رتنا کو اندر دھکیلا، اسی لمحے مڑ کر کانتی کو دیکھا۔ وہ الٹے قدموں فور وہیل تک آ رہی تھی۔ اسی لمحے ایک نوجوان نے سر اٹھایا اور ہاتھ سیدھا کیا۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ صرف ایک لمحہ کی دوری پر ہم میں سے کسی کی موت تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ اٹھا کر فائر کرتا، میں نے اس پر فائر کر دیا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی ایک دلدوز چیخ ابھری۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ گولی اس کے کہاں لگی تھی۔ کیونکہ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا ہی نہیں تھا۔ کانتی مجھ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ آگے ہی پسنجر سیٹ پر بیٹھی تو میں پیچھے بیٹھ گیا تبھی فور وہیل چل پڑی۔ ششما اور رتنا کو میں نے دبا کر رکھا ہوا تھا۔ میری کوشش تھی کہ انہیں باندھ دوں۔ میں چاہتا تھا کہ تھوڑا دور نکل جائیں تو یہ رسک لوں۔ میں ان کے لڑنے کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی معمولی شے نہیں تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ڈرائیور کس جانب جا رہا ہے۔ میں نے سورج کی سمت سے اندازہ لگایا تھا کہ ہم جیسلمیر سے جنوب مشرق کی جانب جا رہے تھے۔ اس کی منزل کہاں تھی، میں اس کے بارے میں بھی نہیں جانتا تھا۔ اب میں اس کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ بس صحرا میں فور وہیل بھگاتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی صاف زمین آ جاتی اور کبھی ریت۔

☆......☆......☆

تقریباً دو گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد ہم جس جگہ پہنچے وہ بڑے سارے تالاب کے کنارے اونچی جگہ پر بنا ہوا دو منزلہ مکان تھا۔ وہ اپنی طرز تعمیر اور حالت سے یوں لگ رہا تھا جیسے پرانے زمانے میں کوئی جنگی پڑاؤ کرنے والی جگہ ہو۔ جس وقت فور وہیل اوپر پہنچ کر گیٹ کے پاس رکی تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ایسی ہی کوئی جگہ تھی۔ وہاں سے دور دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ وہاں سے یوں بھی احساس ہو رہا تھا کہ جیسے یہاں صحرا ختم اور سبزہ والی زمین شروع ہو رہی تھی۔ گیٹ کھل جانے پر ہم اندر چلے گئے۔

وہاں سناٹا تھا۔ گیٹ کھولنے والے کے سوا، وہاں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اندر چوکور صحن تھا، جس کے تین جانب، تین سٹیپ والی سیڑھیاں تھیں۔ تین جانب برآمدہ تھا، ہر سیڑھی کے سامنے ایک بڑا دروازہ تھا۔ اب ان کے اندر کیا تھا، یہ اندازہ بھی نہیں تھا۔ ہم دائیں جانب والی سیڑھیوں کے پاس جا رکے۔ دروازہ کھولتے ہی کانتی نیچے اتر آئی۔ وہ رتنا اور ششما کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے ابھی کھا جائے گی۔ ان دونوں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے اندر کتنا کرودھ لئے ہوئے تھی۔ اگر اسے موقع مل جائے تو وہ انہیں دھنک کر رکھ دے۔ ڈرائیور پیچھے رہ گیا اور ہم چاروں دائیں جانب والی سیڑھیاں چڑھ کر اندر کمرے میں چلے گئے۔

اس کمرے کے اندر مزید کمرے تھے۔ مجھے لگا جیسے وہ تین دروازے تین الگ الگ کمرے کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ ہم کمرے میں کھڑے تھے کہ ایک پہلوان نما شخص برآمد ہوا۔ اس نے دھوتی کرتا پہنا ہوا تھا۔ بڑے سے منہ پر مونچھیں بھدی لگ رہی تھیں۔ اس نے ہم سب کی جانب دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں رتنا اور ششما پر ٹک گئیں۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتا رہا، پھر میری جانب دیکھ کر راجستھانی اور ماڑواڑی ملی جلی زبان میں بولا۔

”تم نے کام کر دیا، اب جاؤ واپس۔“

”میں چلا تو جاؤں گا، لیکن ایک بار میں بات کرلوں تو......“ میں نے کہا اور جیب سے فون نکال لیا۔ تبھی کانتی نے تیزی سے اپنا فون نکالتے ہوئے کہا۔

”تم رکو، میں بات کرتی ہوں۔“

میں نے اپنا فون جیب ہی میں پڑا رہنے دیا، کانتی تیزی سے نمبر پش کر کے رابطے کا انتظار کرنے لگی۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہو گیا تو اس نے اپنے پہنچ جانے کے بارے میں بتایا۔ پھر دوسری جانب سے سنتی رہی اور فون بند کر دیا۔

”کیا کہا اس نے......؟“ میں نے پوچھا۔

”تم ادھر رہو گے، میں اور ڈرائیور واپس جائیں گے۔“ اس نے رتنا اور ششما کی جانب یوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے ان سے نپٹنے کی اسے حسرت ہی رہ گئی ہو۔

”ہم ہیں ادھر، کوئی ضرورت نہیں یہاں کسی کو رہنے کی۔“ وہ پہلوان نما شخص یوں بولا جیسے اسے ہمارا وجود وہاں برا لگ رہا ہو۔ اس پر کانتی نے اس کی طرف غصے میں دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا۔

”تمہارے کہنے یا نہ کہنے سے فرق نہیں پڑتا۔ باس سے بات کر لو، اگر تمہیں کوئی تکلیف ہے تو۔ چلو پہلے ان کے لئے رہنے کا بندوبست کرو۔“

”زبان سنبھال کے بات کر۔“ پہلوان نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا، اتنے میں اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے فون نکال کر دیکھا اور پھر بات کرنے لگا۔ شاید وہ فٹ بال نما باس کا ہی فون تھا۔ چند لمحے سنتے رہنے کے بعد فون بند کر کے بولا۔

”ٹھیک ہے، پیچھے والے کمرے میں چلے جاؤ۔“

"جاؤ اپنا کام کرو، میں کچھ دیر آرام کے بعد واپس چلی جاؤں گی۔" کانتی نے کہا اور اندر کی جانب چل دی۔ میں نے رتنا اور ششما کو ٹہوکا دیا تو وہ بھی چل پڑیں۔ اگلے کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا، اس پر تکیے پڑے ہوئے تھے۔ ایک بڑی سی کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئیں تھیں۔ اس سے آنے والی روشنی سے کمرہ روشن تھا۔ میں قالین پر بیٹھا تو رتنا نے میری جانب دیکھ کر پوچھا۔

"کیا تم لوگ بتا سکتے ہو کہ ہمیں کیوں اغوا کیا گیا؟"

"نہیں، یہ تو جس نے اغوا کروایا ہے، وہ جانتا ہے۔" میں نے سکون سے کہا اور ایک تکیہ پکڑ کر لیٹ گیا۔

"سیدھے کہو تم بھاڑے کے ٹٹو ہو۔"

"چپ کر......" کانتی نے غصے میں کہا تو میں نے کاندھے اچکا کر کہا۔

"تم کہہ سکتی ہو۔ کم از کم میں تو بھاڑے کا ٹٹو ہوں۔ مجھے نہیں پتہ تمہیں کیوں اغوا کیا گیا۔ یاد کرو جس سے......" میں نے کہنا چاہا تو رتنا بولی۔

"مرجانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، لیکن ہمارا اغوا تم لوگوں کو بہت مہنگا پڑنے والا ہے۔"

"مجھے نہیں، اسے...... جس نے تمہیں اغوا کروایا ہے۔ مجھے ابھی حکم ملے گا اور میں نکل جاؤں گا۔" میں نے سکون سے کہا اور اس کی طرف دیکھنے لگا، وہ غصے میں دیکھتے ہوئے خاموش رہی تو میں بولا، "دیکھو، اتنا غصہ کرنے سے کچھ نہیں ہوگا، بیٹھو، سکون کرو، فریش ہونا ہے تو یہاں باتھ روم بہت پرانی طرز کا ہے۔ یہ ہے اصل مسئلہ اس پر سوچو۔"

"شٹ اپ۔" ششما نے انتہائی غصے میں کہا تو کانتی اسے مارنے کو لپکی تو میں نے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں کانتی، یہ اس وقت بے بس ہیں، ان پر ہاتھ نہیں اٹھانا۔“

”ان کی زبان......“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”نہیں، کہنے دو، کوئی بات نہیں۔“ میں نے پرسکون انداز میں کہا اور ان کی طرف دیکھنے لگا، وہ چند لمحے کھڑی رہیں پھر ایک دوسری کی جانب دیکھ کر قالین پر بیٹھ گئیں۔ اتنے میں ایک شخص نمودار ہوا، اس نے صراحی اٹھائی ہوئی تھی۔ وہ رکھ کر اس نے جیب سے مٹی کا گلاس نکالا اور قریب رکھ کر واپس چل دیا۔ تبھی میں نے اسے آواز دیتے ہوئے کہا۔

”کچھ کھانے کو ہے؟“

”ابھی کھانا نہیں بنا۔“ اس نے سرد سے لہجے میں کہا۔

”تو پھر کوئی پھل ہی لے آؤ۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دیکھتا ہوں۔“ اس نے ہولے سے کہا اور چل دیا۔ کانتی نے پانی پیا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر چلی گئی۔ میں ان کے پاس لیٹ گیا۔ ہمارے درمیان خاموشی آن ٹھہری تھی۔ وہ دو تھیں، لڑنے کا فن بھی جانتی تھیں اور میں اکیلا ان کے پاس تھا، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایسی خونخوار بلیوں کی رکھوالی پر رکھ چھوڑا گیا ہوں جو موقع ملتے ہی مجھ پر جھپٹ پڑیں۔

وہی شخص، ایک ٹرے میں تھوڑے سے پھل لے کر آ گیا۔ جن میں کیلے سیب اور مقامی پھل تھے۔ اس نے وہ ہمارے سامنے رکھے اور کوئی بات کیے بنا واپس پلٹ گیا۔ اس نے سمجھداری یہ کی تھی کہ کوئی چھری یا چاقو ساتھ میں نہیں دیا تھا۔ میں نے ایک سیب اٹھایا اور باقی ان دونوں کے سامنے رکھ دیا۔

”بڑے سمجھدار ہو تم، ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور......“ رتنا نے کہنا چاہا مگر میں نے اس کی بات اچکتے ہوئے کہا۔

”ابھی کھول دیتا ہوں لیکن اگر تماشا کیا تو پھر مشکل ہو جائے گی۔“ میں نے کہا اور سیب سے بائٹ لے لی۔

”مرد بھی بنتے ہو اور ڈرتے بھی ہو۔“ رتنا نے طنزیہ انداز میں کہا تو میں مسکرا دیا، پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم لڑو گی میرے ساتھ، ہے نا؟“

”تم کیا سمجھتے ہو ہم خاموش بیٹھی رہیں گی۔“ ششنا نے غصے میں کہا۔

”اچھا چلو، تم لڑنے کا شوق بھی پورا کر لینا۔ میں پہلے تھوڑا کھا لوں، پھر تم دونوں کو کھول دوں گا ٹھیک؟“ میں نے انہیں غصہ دلانے والے انداز میں کہا وہ خاموش رہیں تو میں نے کہا، ”دیکھو، جیسے تم نے مجھے بھاڑے کا ٹٹو کہا ہے تو بالکل ٹھیک کہا ہے۔ میں نے اپنی کچھ مجبوریوں کے ساتھ تم لوگوں کو اغوا کیا، میں نہیں جانتا تم کون ہو اور انہوں نے تمہیں کیوں اغوا کروایا۔ مجھے اگر تم قتل بھی کر دو گی تو کسی کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔“

میں نے کہا اور پھر سکون سے پھل کھانے لگا۔ وہ دونوں مجھے خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ میں کھا چکا تو پہلے میں نے ششنا کے ہاتھ کھولے، پھر رتنا کے۔ اس کے ساتھ ہی ٹرے ان کے آگے کر دیا۔ دونوں بلاشبہ اپنے طور پر کوئی خاموشی میں فیصلہ کر چکیں تھیں۔ اس لئے چپ چاپ وہ پھل کھانے لگیں۔ میں ذہنی طور پر تیار تھا کہ وہ کسی بھی وقت مجھ پر حملہ کر سکتی ہیں۔ وہ سب کچھ چٹ کر جانے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے رتنا نے کہا۔

”تم نے اپنا کام کر دیا، تمہاری یہ ڈیوٹی بھی ہے کہ ہمیں قابو کئے رکھو۔ ہمارے ساتھ ایک معاہدہ کرو۔“

”وہ کون سا......؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

"اگر تم ہمیں ہرا دو، ہمیں بے بس کر دو تو جو کہو گے وہی کریں گی۔ لیکن اگر ہم تمہیں بے بس کر دیں تو پھر ہمیں جانے دو گے۔" رتنا نے پورے اعتماد سے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ ایک فائٹر آخری دم تک لڑتا ہے۔ تم نے تو اپنی بقا کے لئے لڑنا ہے۔ تم اپنی جان لڑا دو گی۔ میں پھر بھی تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں مگر۔۔! ان لوگوں کا کیا کرو گی جو یہاں پر موجود ہیں، کیا وہ تم دونوں کو یہاں سے جانے دیں گے؟" میں نے سمجھانے والے انداز میں پوچھا۔

"وہ ہمارا مسئلہ ہے۔" ششما نے تیزی سے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر......" میں نے کہا ہی تھا کہ وہ دونوں کسی خوں خوار بلیوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑیں۔ وہ دونوں ہی میرے سینے پر حملہ آور ہوئیں تھیں۔ میں ایک دم سے لیٹ گیا وہ میرے اوپر آپڑی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے پورا زور لگا کر انہیں خود سے پرے ہٹایا۔ جس وقت تک میں کھڑا ہوا، وہ میرے مقابل کھڑی ہو گئی تھیں۔ وہ قدم قدم آگے بڑھ رہی تھیں۔ میں ان کے پینترے سمجھ رہا تھا۔ اچانک رتنا نے اچھل کر مجھ پر وار کیا جبکہ ششما نے مجھے پیچھے سے پکڑا۔ میں ان کے چنگل میں آ گیا تھا۔ میں نے لمحہ بھر کے لئے ششما کو خود سے چھڑایا اور رتنا کو دونوں ہاتھوں سے قابو کر لیا۔ پہلے اسے میں نے اپنے ساتھ لگا کر پوری قوت سے دبایا کہ اس کی ہڈیاں چیخ اٹھیں پھر گھما کر دیوار میں دے مارا۔ تب تک ششما میرے پاؤں اکھاڑ چکی تھی۔ میں اپنا توازن کھو چکا تھا، اس لئے جیسے ہی قالین پر گرا، ششما نے اپنا پورا بوجھ میرے اوپر لاد دیا، اس کے ساتھ ہی اس نے پوری قوت سے گھونسہ میری گردن کی جڑ میں مارا۔ ایک بار مجھے تارے دکھائی دے گئے۔ میں ایک جھٹکے سے اسے خود سے الگ کیا تو رتنا اس وقت تک اٹھ چکی تھی۔ وہ ہوا میں اچھل کر مجھ پر حملہ آور ہوئی، میں اسے جھکائی دے

گیا جیسے ہی وہ اپنے پاؤں پر رکی، وہ پلٹی اور اس نے پوری قوت سے کہنی میری دائیں پسلی میں ماری۔ میں نے بہ مشکل حلق سے نکلنے والی آواز کو روکا، میں سمجھ گیا تھا کہ اگر انھیں زیادہ وقت دیا تو یہ میرا کوئی نہ کوئی نقصان کر دیں گیں۔ میں اب انہیں زیادہ وقت نہیں دینا چاہتا تھا۔

اب وہ دونوں پھر میرے مقابل تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر وار کرتیں، میں نے ششما پر وار کرنے کی جھکائی دی اور رتنا کو پکڑ کر اٹھایا اور پوری قوت سے قالین پر دے مارا، ششما مجھ وار کرنے کو پلٹی تو میں نے اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے گرتے ہی میں نے پوری قوت سے ٹھوکر اس کی پسلی میں ماری، وہ ڈکارتی ہوئی بے سدھ ہو گئی، تب تک اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے رتنا کو میں نے گردن سے پکڑا اور ایک گھونسہ اس کے سر پہ مارا، وہ بے سدھ ہو کر قالین پر ڈھ گئی۔

میں نے چند منٹ اپنے حواس بحال کیے۔ وہ دونوں بے ہوش تھیں۔ میں اٹھا اور صراحی تک گیا، گلاس میں پانی انڈیلا اور ششما پر پھینک دیا۔ وہ ہوش میں آ گئی، تب تک میں دوسرا گلاس بھر کر رتنا پر گرا چکا تھا۔ اس نے بھی ہوش پکڑ لیا۔ وہ دونوں میری جانب غور سے دیکھ رہی تھیں جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں ان کے سامنے کھڑا ہو گیا، میں جانتا تھا کہ جو ضربیں میں انہیں لگا چکا ہوں، ان سے نکلنے میں انھیں تھوڑا وقت لگے گا۔ مگر میں یہ بھی مان رہا تھا کہ وہ اچھی فائٹر تھیں۔

انہیں ہوش سنبھالنے میں چند منٹ لگے۔ میرا گمان تھا کہ وہ اٹھ کر دوبارہ لڑنے کے لئے تیار ہو جائیں گی۔ انہوں نے بالکل ایسا ہی کیا۔ وہ مدہوش سی پھر میرے مقابل تھیں۔ تبھی میں نے کہا۔

"تھوڑا آرام کر لو، پھر لڑ لینا۔"

"نہیں ہم فیصلہ کر کے ہی یہ ختم کریں گی۔" رتنا نے غصے میں کہا۔ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ وہی شخص کمرے میں نمودار ہوا، جو چکمہ دے گیا تھا۔ اس نے صورت حال دیکھی تو الٹے پاؤں پر پلٹ گیا۔

"اب بھی وقت ہے...... سکون سے بیٹھ جاؤ، ورنہ پچھتاؤ گی۔" میں نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ جو شخص یہاں آ کر فوراً پلٹ گیا ہے وہ باہر سے کسی کو ضرور بلا کر لائے گا۔ پھر بات میرے بس میں بھی نہیں رہے گی۔ لیکن وہ سمجھ نہیں رہی تھیں۔

"نہیں...... تمہیں ختم کریں گی۔" رتنا نے نفرت سے کہا۔ وہ غصے میں آ کر اپنے حواس کھو بیٹھی تھیں۔ انہیں شاید یہ معلوم نہیں تھا یا پھر وہ بھول گئیں تھیں کہ میرے پاس پسٹل موجود ہے۔ میں ایک گولی میں ان کا کام تمام کر سکتا تھا لیکن میں خود ان کے ساتھ کھیلنے لگ گیا تھا۔ مگر وہ مان ہی نہیں رہی تھیں۔ تبھی باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی، اس کے ساتھ ہی وہ پہلوان نما اور دوسرا شخص اندر آ گئے۔

"کیا ہوا؟" اس نے ہم سب کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تم جاؤ، یہ ہمارا معاملہ ہے؟" رتنا نے کہا تو وہ پہلوان غلیظ گالی بکتے ہوئے غصے میں بولا

"تیری یہ اوقات، تم مجھ سے اس طرح بولو، ابھی زمین میں گاڑ دوں گا۔" پھر میری جانب دیکھ کر بولا "اے لونڈے، کس نے کہا تھا ان کے ہاتھ کھول، اب بھگت لیا نا۔ چل، چل باہر۔"

میں خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں بھی باہر آ گئے، انہوں نے باہر سے کنڈی چڑھائی اور میری طرف دیکھ کر حقارت سے بولا "یہ عورت ذات جو ہے نا بڑی چلتر ہے، اس کے دام میں جو پھنس گیا سو پھنس گیا۔ میں نہ آتا تو اب تک تیری چٹنی بنا دیتیں۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔" میں نے فوراً اس کی بات مان لی تو وہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا بولا۔

"ادھر باہر والے کمرے میں لیٹ کر آرام کر انہیں پڑی رہنے دے اندر۔ بھوکی پیاسی رہیں گی تو عقل ٹھکانے آجائے گی۔"

"یہاں سے بھاگ تو نہیں جائیں گی۔" میں نے پوچھا۔

"ابے نہیں، یہاں سے جانے دیتا ہوں میں۔" اس نے پھر اپنی مونچھ کو تاؤ دیا اور باہر کی جانب چل پڑا۔ دوسرے نے مجھے کھاٹ لا کر دینے کو کہا اور باہر چلا گیا۔ میں کچھ دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا، یہاں تک کہ وہ مجھے کھاٹ دے گیا۔ میں لیٹا تو دوسرا شخص وہیں ان دونوں کی نگرانی کرنے بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

شام ہونے کو تھی جب میری آنکھ کھلی۔ وہ شخص کمرے میں نہیں تھا۔ میں نے اٹھتے ہی پسٹل کو محسوس کیا۔ وہ میرے نیفے میں تھا۔ میں کمرے سے باہر برآمدے میں آگیا۔ وہ وہیں باہر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ سامنے کھلا صحن تھا۔ جس میں سے چوکور آسمان دکھائی دے رہا تھا۔

"اٹھ گئے، کافی نیند پوری کر لی تم نے؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"رات بھی انہی کے چکروں میں ٹھیک سے نہیں سویا تھا۔" میں نے کہا۔

"چل کوئی نہیں، کھانا کھا کر پھر سو جانا۔" اس نے فراخ دلی سے کہا تو میں چونک گیا۔ یہ مجھ پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا ہے؟ تبھی میں نے اس پوچھا۔

"یہاں کوئی چہل پہل نہیں ہے۔ اب تک تم تینوں کو دیکھا ہے، تمہیں پہلوان کو اور وہ گیٹ والا؟"

”ہم تینوں ہی ہیں یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ اب تم تین آ گئے ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”باس سے کوئی بات ہوئی، کیا کرنا ہے ان دونوں لڑکیوں کا؟“ میں نے عام سے انداز میں پوچھا تو وہ بولا۔

”کہہ رہا ہے کہ چند دن ادھر ہی رہیں گی۔ تم بہر حال صبح گاڑی آئے گی کچھ سامان دینے، اس کے ساتھ تم واپس چلے جاؤ گے۔ تمہارا کام ختم۔“ اس نے پھر مسکراتے ہوئے کہا پھر اٹھتے ہوئے بولا، ”شام ہو رہی ہے، میں ذرا جنریٹر چلا دوں۔“

وہ اٹھ کر چلا گیا اور میں وہیں بیٹھا سوچتا رہا۔ یونہی اوٹ پٹانگ سوچیں مجھے گھیرے رہیں۔ وہیں بیٹھے میرا دل کیا کہ میں اپنے فون سے چاچا صبا مجید سے بات کروں، پھر خیال آیا کہ ڈائنڈیا کو کال کر کے یہاں کی صورت حال بتاؤں، کاتی سے بات کروں۔ لیکن میں نے فون ہی جیب سے نہیں نکالا۔ مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

دو کمروں میں روشنی ہوئی تو میں وہاں سے اٹھ کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ میں نے کان لگا کر سنا، اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سوچا اب وہ تھک ہار کر بیٹھ گئی ہوں گی۔ انہیں احساس ہو گیا ہوگا کہ وہ بلا وجہ اپنی توانائی برباد کر رہی ہیں۔ میں دوبارہ کھاٹ پر آ کر لیٹ گیا تھا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وہی شخص ٹرے میں کھانا رکھے آ گیا۔ اس نے ایک پلیٹ میں کھانا میرے سامنے رکھ دیا اور ٹرے لے کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

”اندر دینا ہے، آؤ چلے میرے ساتھ۔“

میں اٹھا اور میں نے دروازے کی کنڈی کھولی۔ وہ دونوں قالین پر پڑی ہوئی تھیں۔ ان

دونوں نے بیک وقت ہماری طرف دیکھا۔اس شخص نے ٹرے رکھا اور پلٹ گیا۔میں نے پھر کنڈی چڑھادی۔

میں نے کھانا کھا کر برتن ایک طرف رکھ دیئے۔قریب پڑی صراحی سے پانی پیا اور ڈکار مار کر برآمدے میں ٹہلنے لگا۔کچھ دیر بعد پھر کمرے میں آگیا۔مجھے لیٹے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ اس شخص کے ساتھ پہلوان کمرے میں آگیا۔اس نے میری جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔آگے بڑھ کر کنڈی کھولی اور اندر چلا گیا۔وہ شخص بھی اس کے ساتھ ہی اندر داخل ہو گیا۔کمرے میں جہاں ایک بلب روشن تھا، وہاں ایک مزید روشن ہو گیا۔میں ٹھٹک گیا۔یہ کیا ماجرا ہے۔مگر میں کھاٹ پر بیٹھا رہا۔اندر کی آوازیں مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔پہلوان کہہ رہا تھا۔

"تم دونوں کو اب کچھ دن تو ادھر رہنا ہے۔آرام سے میری بات مانتی رہو گی تو مزے میں رہو گی، ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" شمشا نے پوچھا۔

"کہنا مجھے کچھ نہیں، بس ایک بار کہہ دیا، میں دوسری بار کہنے کا عادی نہیں ہوں۔بس آرام سے کپڑے اتار دو۔"

"اوئے تم ہوش میں تو ہو؟" رتنا نے وحشیانہ انداز میں کہا تو میں چونک گیا، پہلوان کے تو ارادے ہی دوسرے تھے۔وہ سختی سے بولا۔

"تم ہوش کرلو تو اچھی بات ہے ورنہ میں تمہارے ہوش اڑا دوں گا بھی۔"

"اگر تم ہماری مرضی کے بغیر ہمارے کپڑے اتروا سکتے ہو تو آؤ۔" رتنا پھر لڑنے کو تیار ہو گئی تھی۔میں جانتا تھا کہ یہ بے وقوفی نہیں تھی بلکہ مزاحمت تھی جس حد تک وہ کرسکتی تھیں۔

”تمہیں تو ہر حال میں میری بات ماننا ہی پڑے گی۔“ پہلوان نے کہا تو مجھ سے نہیں رہا گیا۔ میں اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ اندر کی صورت حال ویسی ہی تھی جیسا میں نے سوچا تھا۔ وہ دونوں قالین پر بیٹھی ہوئیں تھیں اور ایک جانب پہلوان ان پر گن تانے کھڑا تھا۔ میں نے جا کر کہا۔

”دیکھو پہلوان، انہیں اغوا کر کے لایا گیا ہے۔ میرا خیال ہے انہیں واپس بھی کرنا ہوگا، اگر بات نہ مانی گئی تو پھر مارنا ہوگا۔ تم یوں ان کے کپڑے اتروا رہے ہو۔ کچھ ہوش کرو، باس کو اگر پتہ چل گیا تو......“

”اسی کا حکم ہے، ان کے کپڑے اتار کر، ان کی ویڈیو اس تک پہنچانی ہے۔ بلکہ یہاں کے ساتھ......وہ ویڈیو بھی......“ آخری لفظ کہتے ہوئے اس نے دانت نکال دیئے تھے۔

”او نہیں یار، ایسا نہیں ہو سکتا۔“ میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہو کیوں نہیں سکتا، ہم ویرانے میں ایسے ہی بیٹھے ہیں۔ پتہ نہیں کتنا عرصہ ہو گیا عورت کی مہک لئے۔ ہمارا کام بھی ہو جائے گا اور باس کا بھی۔“ اس نے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ان دونوں کی جانب دیکھا۔ ان کے چہروں پر کافی حد تک خوف پھیلا ہوا تھا۔

”ایسا نہیں کرو، مجھے باس سے بات کر لینے دو۔“ میں نے مزاحمتی انداز میں کہا تو پہلوان مسکراتے ہوئے بولا۔

”پوچھ لو، اگر اس نے بھی کہہ دیا تو پھر تم بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جانا۔“

پہلوان نے اپنا سیل فون نکال کر نمبر پش کرنا چاہے تو میں نے کہا۔

”نہیں مجھے باس سے بات نہیں کرنی لیکن ایک بات میری سن لو۔“

”بولو، جلدی بولو۔“ اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”انہیں چاہے گولی مار کر مار دو۔ مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا لیکن عورت کی یوں بے حرمتی کرو گے وہ مجھے برداشت نہیں۔“

میں نے کہا تو اس نے یوں میری جانب دیکھا جیسے میں نے اسے گالی دے دی ہو۔ وہ یوں حیرت سے مجھے دیکھنے لگا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ پھر اس کا چہرہ بگڑنے لگا، اس نے حقارت سے کہا۔

”میں تجھے کہہ رہا ہوں یہاں اس کمرے سے دفع ہو جاؤ، کہیں ان سے پہلے میں تجھے ہی نہ مار دوں۔“

”اس کی مجھے کوئی پروا نہیں ہے لیکن میں تمہیں ان کی بے حرمتی نہیں کرنے دوں گا۔“ میں نے حتمی لہجے میں کہا تو اس نے بھنا کر میری طرف دیکھا اور میری جانب بڑھ آیا۔ اس نے میرے ماتھے پر پسٹل رکھ دی اور پھر دانت پیستے ہوئے کہا۔

”شیر کے منہ سے شکار چھینتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے یونہی نال میرے ماتھے پر رکھے رہا۔ میں خاموش رہا۔ کوئی مزاحمت نہ پا کے اس نے پسٹل ہٹایا اور اپنے ساتھی شخص کی طرف دیکھ کر بولا، ”چل تم ہی ان کے کپڑے اتار کر شروع ہو جاؤ۔ میں بناتا ہوں ان کی ویڈیو۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا سیل فون نکال لیا۔ میں نے دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ رتنا نے مجھے خفیف سا اشارہ کیا۔ میں نے ویسے ہی اس کا جواب دیا تو وہ ہلکا سا مسکرا دی۔ پہلوان سمجھ گیا۔ اس نے انتہائی تیزی سے مجھ پر فائر کیا تو میں اس وقت تک اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ اس کا وار خالی گیا تو اس نے اپنی ہی جھونک میں دوسرا فائر کر دیا۔ میں تب تک اپنا پسٹل نکال چکا تھا، میں گھوما اور ایک کک اس کے ہاتھ پر ماری، اس کے ہاتھ سے پسٹل نکل کر دور جا گرا

تھا۔ میں نے وہ پسٹل نہیں اٹھایا، بلکہ ششما کو اشارہ کیا۔ یہ میں بہت بڑا رسک لے چکا تھا۔ اس نے چشم زدن میں وہ پسٹل اٹھایا اور اگلے ہی لمحے اس نے پہلوان کی طرف نال کر کے فائر کر دیئے۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ نکلا اور پہلوان وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وہ شخص جو دونوں کے کپڑے اتارنے کو آگے بڑھا تھا، ایک جانب خوف زدہ سا کھڑا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے کیوں خوش تھا۔ اس کی وجہ مجھے سمجھ آ گئی تھی۔ وہ ہونقوں کی مانند تڑپتے ہوئے پہلوان کو دیکھ رہا تھا۔ میں اسے بچا کر وہاں کی معلومات لینا چاہتا تھا لیکن ششما نے لمحہ بھی نہیں لگایا اور اس شخص پر فائر کر دیئے۔ وہ تڑپتا ہوا خون میں لت پت قالین پر جا گرا۔ شاید اسے بہت غصہ تھا، اس نے پسٹل کی نال مرتے ہوئے پہلوان کی طرف کی تو میں نے روکا۔

”رک جاؤ، ابھی تیسرا بھی ہے یہاں۔“

میں نے کہا ہی تھا کہ رتنا فوراً کمرے سے باہر نکلی۔ اس نے باہر جا کر دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ مجھے یاد تھا کہ وہ گیٹ والا نوجوان بھی وہیں تھا۔ وہ اب تک دکھائی نہیں دیا تھا۔ اچانک برآمدے میں دھپ کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے شاید گمان بھی نہیں تھا کہ اندر کی صورت حال بدل سکتی ہے۔ اس نے جب ہمیں دیکھا تو گھبرا گیا، پھر اس نے دروازے میں سے اندر جھانکا تو پہلوان کی لاش دیکھ کر سٹپٹا گیا۔ اس نے مرے ہوئے انداز میں ہماری جانب دیکھا تو میں نے اس کی جانب بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”تیرے سوا مزید کتنے لوگ ہیں یہاں؟“

”کوئی نہیں ہے جی۔“ اس نے مارواڑی زبان میں کہا۔

”یہاں سے شہر کیسے جاتے ہو؟“ ششما نے تیزی سے پوچھا۔

"پیدل جاتے ہیں جی، یا جب گاڑی آئے۔" اس نے بتایا تو رتنا کو جیسے اس پر غصہ آ گیا اس نے اسے پکڑا اور زور سے دیوار میں دے مارا، پھر اسے اٹھا کر دوبارہ دیوار میں مارا تو اس کا سر پھٹ گیا۔ اس کی سہمی ہوئی چیخ بلند ہوئی۔ وہ زور زور سے کہنے لگا "سچ کہہ رہا ہوں۔۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"رتنا وقت ضائع نہ کرو، یہاں سے نکلو۔" ششما نے اونچی آواز میں کہا تو اس نے اس نوجوان کو وہیں چھوڑا اور پیچھے ہٹ گئی۔ ششما نے کسی تردد کے بغیر وہ پسٹل کی نال سیدھی کی اور ساری گولیاں اس نوجوان کے بدن میں اتار دیں۔ خالی پسٹل پھینک کر اس نے طویل سانس لی اور کمرے سے باہر چل دی۔

ہم کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئے تو باہر گھپ اندھیرا تھا۔

"ٹھہرو، واپس جا کر ان کے سیل فون لے آؤ، کم از کم تارچ کا کام تو دیں گے۔" رتنا نے کہا تو ششما بھاگی اور کچھ دیر بعد ایک ہی فون لے کر پلٹ آئی۔ وہ پہلوان کا فون تھا، باقی شاید دونوں کے پاس نہیں تھا، تبھی میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم یہ فون لے آئی ہو، لیکن انتہائی ضرورت کے علاوہ تارچ مت جلانا، ورنہ اندھیرے میں ہم دور سے بھی دکھائی دے جائیں گے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو، ممکن ہے اس کی ہمیں ضرورت ہی نہ پڑے۔" اس نے کہا اور چل دی۔ ہم تیزی سے گیٹ کی جانب بڑھے اور پھر باہر نکل کر ڈھلوان اترتے چلے گئے۔ نیچے آ کر میں نے ان سے کہا۔

"لو بھئی، تم اپنا راستہ ناپو، میں اپنا راستہ لیتا ہوں۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟" رتنا نے پوچھا۔

"مجھے خود نہیں معلوم، کہیں نہ کہیں تو جا کر نکلوں گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں تم ہمارے ساتھ چلو، یا پھر ہمیں اپنے ساتھ لے چلو۔" وہ تیزی سے بولی تو میں نے کہا۔

"اندر کی بات الگ تھی، لیکن میں اپنے دشمن پر بھروسہ نہیں کرتا۔"

"دیکھو، نہ کرو بھروسہ، لیکن کسی ٹھکانے پر پہنچ کر تم چلے جانا، جب تک ساتھ رہیں گے تو......" اس نے لجالت سے کہا تو میں نے ایک لمحہ سوچا، پھر کہا۔

"ٹھیک ہے، چلو۔"

میرے یوں کہتے ہی وہ ایک جانب چل پڑیں۔ تھوڑا آگے جا کر اس نے پہلوان والا فون آن کیا۔

"ششما آخری کال یہاں سے ہوئی ہے، اس کا نمبر ذہن میں رکھ لینا۔" رتنا نے تیزی سے کہا تو ششما نے ہنکارا بھر دیا۔ پھر اس نے نمبر ملا کر کسی سے رابطہ کیا۔ چند لمحوں بعد اس کا رابطہ ہو گیا۔ اپنے بارے تسلی دینے میں اسے کچھ وقت لگ گیا۔

"میری لوکیشن دیکھو اور مجھے گائیڈ کرو۔ یہاں سے میں......" اتنا کہہ کر وہ سننے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے فون بند کر دیا۔

"کیا کہتا ہے؟" رتنا نے پوچھا۔

"یہاں سے کم از کم دو گھنٹے پیدل چلنے کے بعد شاہراہ ہے۔ اس کے ارد گرد کئی چھوٹے چھوٹے قصبے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی پھر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی، "ہم اگر اس سمت میں چلتے رہے تو اس شاہراہ تک پہنچ جائیں گے۔"

"پھر وہاں سے کیسے جائیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ کہہ رہا ہے تب تک کوئی بندوبست کرتا ہے۔ ہم نے واپس جیسلمیر نہیں جانا، ہمیں جودھ پور سے ٹرین پکڑنا ہوگی اگر وہاں تک پہنچ گئے تو۔" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"واپس کیوں نہیں جانا؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے خلاف بڑی گہری سازش ہوئی ہے۔ جسے تم چاہو بھی تو نہیں سمجھ سکتے۔ ہمارے ساتھ جودھپور تک چلو، پھر جہاں چاہو چلے جانا۔" رتنا نے کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تاکہ وہاں لے جا کر قتل کر دو۔"

"اگر ہم چاہئیں تو تمہیں یہاں بھی قتل کر سکتی ہیں، کچھ دیر پہلے بھی ہو سکتے تھے لیکن ...... خیر اگر تم اعتماد کرو تو۔" رتنا نے عجیب سے لہجے میں کہا تو ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ میں مسکرا کر رہ گیا۔ پتہ نہیں کس کی قسمت میں کیا تھا۔ اچانک پہلوان والا سیل فون بجنے لگا۔ ششما نے دیکھا اور بڑبڑائی۔

"باس کی کال ہے۔"

"تو......" رتنا نے کہا۔

"لاؤ مجھے فون دو۔" میں نے کہا اور فون لے کر کال رسیو کرتے ہوئے اسپیکر آن کر دیا۔ گہرے سناٹے میں وہ کافی آواز تھی جو دوسری جانب سے فٹ بال جیسا باس بولا تھا۔

"ابھی تک ویڈیو نہیں آئی؟"

"وہ اندر ہیں، انہوں نے فون مجھے دے دیا ہے کہ کال آئے تو بتا دوں۔" میں نے کہا تو میری آواز سن کر بولا۔

"اچھا اچھا، انہیں کہو جلدی کریں، ویڈیو بھیجیں، کہیں بات کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تم بھی چاہو تو، عیش کرو۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ تبھی رتنا کے ساتھ شتما نے بے دریغ گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اگر وہ سامنے ہوتا تو اسے چیر پھاڑ دیتیں۔ کچھ دیر بعد رتنا نے سوچتے ہوئے انداز میں مجھ سے پوچھا۔

"تمہارے پاس فون ہے؟"

"ہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"اس پر اب تک کوئی کال کیوں نہیں آئی؟" اس نے پوچھا۔

"اس میں ایک ہی نمبر ہے، شاید اسے ضرورت محسوس نہیں ہوئی مجھے کال کرنے کی۔" میں نے کہا اور اپنا سیل فون نکال کر اسے دے دیا۔ وہ رک کر میرا فون دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے مجھے واپس دیتے ہوئے کہا۔

"جب ہم شاہراہ تک پہنچ جائیں تو اسے پھینک دینا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس فون سے ہمیں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ باقی بات پھر سمجھا دوں گی۔" اس نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا اور خاموش ہو گئی۔

ایک محدود سے دائرے میں روشنی کر کے ہم پیدل چلتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اس اندھیری رات میں شاید ہمارا سفر ختم ہی نہیں ہو گا۔ مگر ہم مسلسل چل رہے تھے۔ شاید ہم باتیں کرنا چاہ رہے تھے لیکن کسی کا بھی بولنے کو من نہیں کر رہا تھا۔ ہماری پوری توجہ اس شاہراہ تک پہنچ جانے میں تھی، جس کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم رک جاتے۔ رتنا فون پر سمت کا اندازہ کر لیتی اور پھر ہم چل پڑتے۔ یہاں تک کہ ہم شاہراہ تک جا پہنچے۔ تھکن سے ہمارا برا حال ہو چکا تھا۔

ششمارابطے میں تھی۔ کچھ دیر بعد ایک گاڑی ہم تک پہنچ گئی۔ ہم جودھ پور کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک جگہ چھوٹا سا نالہ دکھائی دیا۔ رتنا نے ڈرائیور کو وہاں رکنے کو کہا۔ وہ رک گیا۔ اس نے میرا اور پہلوان والا فون وہیں نالے میں پھینک دیا تھا۔ پھر ذرا سا سوچ کر اس نے ڈرائیور کا فون بھی وہیں پھینک دیا۔ اپنی طرف سے اس نے آگے کے لئے پچھلے نشان مٹا دیئے تھے۔

میں راستے میں یہی سوچتا چلا جا رہا تھا، جب بھی کوئی دشمن سامنے آتا ہے، تبھی انسان چوکنا ہو جاتا ہے۔ شاید یہی چیز دشمن پر توجہ مرکوز کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اس وقت تو ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھا جاتا ہے جب دشمن سازشی ہو۔ سازشی دشمن بالکل کسی سانپ کی مانند ہوتا ہے جو نجانے کس بل سے نکل کر کب ڈس لے۔ اس کا پتہ نہیں ہوتا۔

☆......☆......☆

صبح کا نیلگوں اجالا پھیلا ہوا تھا جب ہم جودھ پور پہنچ گئے۔ شہر میں زندگی جاگ اٹھی تھی۔ ٹریفک رواں دواں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک صاف ستھرے علاقے میں موجود ایک گھر میں جا پہنچے۔ گاڑی ہمیں باہر ہی چھوڑ کر چلی گئی۔ گیٹ ایک ادھیڑ عمر خاتون نے کھولا۔ ہم اندر گئے تو وہاں خاصا سناٹا تھا۔ چھوٹے سے لاؤنج میں جا کر بیٹھے ہی تھے کہ اس خاتون نے دھیمے سے انگریزی میں ایک کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم سب فریش ہو جاؤ، تب تک میں کھانے کے لئے کچھ کرتی ہوں۔"

وہ یہ کہہ کر ایک جانب چل دی۔ ہم سب نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ہمارے کپڑے مٹی میں اٹ چکے تھے۔ تبھی ششما تیزی سے اٹھ کر اس خاتون کے پیچھے لپکی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں کافی سارے کپڑے تھے۔ ایک پتلون اور

شرٹ میری جانب پھینک کر بولی۔

"پہلے تم جاؤ، جلدی واپس آجاؤ گے۔"

میں نے وہ کپڑے سنبھالے اور کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ہم تینوں ایک میز کے گرد بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ ششما اور رتنا نے ڈھیلی سی شلوار قمیص سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ آنچل بھی گلے میں ڈالا ہوا تھا۔ ان کپڑوں میں دیکھ کر کوئی بھی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کس قدر خوف ناک ہیں۔ میں خاموشی سے کھاتا رہا، یہاں تک کہ ایک مگ چائے کا لیکر اٹھ گیا۔ جس وقت میں نے چائے ختم کی، وہ بھی وہیں آ گئیں۔ تب میں نے خالی مگ ایک جانب رکھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہئے۔ تم دونوں اپنے......"

"لیکن میرا خیال کچھ دوسرا ہے۔" ششما نے تیزی سے کہا۔

"وہ کیا......؟" میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے کہتی چلی گئی۔

"کیا تم یہ نہیں جاننا چاہو گے کہ ہمیں کیوں اغوا کیا گیا؟ ایسے کسی شخص کو کیوں استعمال کیا گیا جو ہمیں بالکل بھی نہیں جانتا؟ وہ ہماری ویڈیو ہی کیوں بنانا چاہ رہے تھے؟ اور آخری سوال کہ ہمارے اغوا کے بعد انہوں نے کیا مطالبہ کیا، اس بارے تم جانتے ہو؟"

"میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہم جانتی ہیں کہ تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم، بلکہ ہمیں یقین ہو گیا کہ تمہیں صرف اغوا کے مقصد کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ بلکہ تمہیں دو دن پہلے یہ بھی معلوم نہیں ہو گا کہ کوئی ایسا کام تم سے لے گا۔" اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا تو میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی، اب تم کیا چاہتی ہو۔"

"یہ ششما بھی تو بس پہیلیاں ڈال رہی ہے۔" رتنا نے اکتاہٹ سے کہا پھر لمحہ بھر بعد بولی،

"سیدھی بات کرو۔"

"تو سیدھی بات یہ ہے میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔" ششما نے کہا اور چند لمحے رُک کر کہتی چلی گئی، "ہمارا تعلق جرم کی دنیا سے بالکل بھی نہیں ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں جو صرف بھارت ہی میں نہیں دنیا بھر میں کہیں بھی کوئی ظلم کرتا ہے تو ہم اس کی مزاحمت کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں نہ کوئی مذہب ہے، نہ کوئی قوم، نہ کوئی نظریہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ بس ہم انسانیت کے لئے کام کر رہے ہیں۔ یہی ہمارا سب کچھ ہے۔"

"یہ بھی تو ایک نظریہ ہی ہوا نا؟" میں نے تبصرہ ملا سوال کیا۔

"کہہ سکتے ہو، خیر۔ ہماری کوئی ایک تنظیم دشمن نہیں ہے، کئی ساری ہیں، ہم ہر محاذ پر ان کا مقابلہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس وقت جو سب سے بڑا محاذ ہے، وہ سوچ میں تبدیلی کا ہے۔ کچھ قومیں یہ چاہ رہی ہیں کہ ہم اپنی دشمن قوم کی سوچ ہی تبدیل کر دیں۔" اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پوری قوم کی سوچ کیسے تبدیل ہو سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں پھر خبر ہی نہیں، ہو رہی ہے۔ بلکہ بہت حد تک ہو بھی چکی ہے۔ یہی محاذ سب سے زیادہ سرگرم ہے۔ جدید دنیا میں کمپیوٹر اور نیٹ کے استعمال نے دنیا بدل دی ہے۔ سوچنے والی قومیں تو پورا پلان کر کے بیٹھی ہوئی ہیں کہ کتنے عرصے میں کس قوم کو کس حد تک بدل دینا ہے۔" ششما نے بڑے جذباتی انداز میں بتایا تو میں نے پوچھا۔

"تم اس جنگ میں کیا کر رہی ہو؟"

"ہم دونوں نے یہی پڑھا ہے اور اسی میں کام کر رہی ہیں۔ ہم نے بہت ساری

کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ ہمارا دشمن جو اسی بھارت ہی میں ہے، ہمیں روک رہا ہے۔ جس وقت ہمارا اغوا ہوا، تب مجھے شک تھا لیکن جب ویڈیو بنانے کی بات ہوئی تو میں اپنے دشمن کو پہچان گئی۔ تم یوں سمجھ لو کہ دکھائی دینے والی دنیا کے پیچھے ایک ان دیکھی دنیا ہے، ہم اس میں سرگرم ہیں۔" شششما نے بات کو سمیٹنے کے انداز میں کہا۔

"اور یہ تمہارا لڑنا، یہ فائٹر ہونا اور......" میں نے کہنا چاہا تو رتنا بولی۔

"اپنی حفاظت کے لئے یہ ہمارا شوق بھی ہے۔ ویسے میں یہ سمجھ گئی ہوں کہ تم کہیں اچھے فائٹر ہو۔ جس لیول پر تمہاری تربیت ہے، ہم ویسی نہیں، ہمیں ابھی بہت کچھ سیکھنا تھا لیکن ہمارے سامنے بہت سارے چیلنج آ گئے۔"

"دیکھو، تم کیا ہو، کس تنظیم کے ساتھ ہو، مجھے اس کی کوئی سمجھ نہیں، میں تو بس ایک ایسا بندہ ہوں، جو نہ چاہتے ہوئے جرم کی اس دنیا میں آ گیا ہوں، بلکہ پھنس گیا ہوں۔ نہ میری کوئی منزل ہے اور نہ کوئی ٹھکانہ، نہ میرا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی میرا دشمن۔ نہ جانے کب، کہاں مارا جاؤں۔" میں نے بڑے جذباتی انداز میں پورے اعتماد سے جھوٹ بول دیا۔

"تو سمجھو، آج سے تم مر گئے ہو، اور آج ہی سے تمہارا نیا جنم ہوگا۔ کچھ دیر بعد یہ خبر وائرل ہو کر دشمنوں تک پہنچ جائے گی کہ ہم تینوں مر چکے ہیں۔" رتنا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ایسا کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں دشمنوں سے تو بعد میں بدلہ لینا ہے لیکن پہلے اندر کے غداروں کو تلاش کرنا ہوگا۔ ہمارے خلاف کون ہیں جو ہمیں زندہ نہیں دیکھنا چاہتے۔" رتنا نے یوں کہا جیسے وہ دشمنوں کو گردن سے پکڑنے کے لئے ابھی سے بے تاب ہو رہی ہو۔ تبھی میں نے پوچھا۔

"یہ لوگ جو یہاں تک ہمیں لائیں ہیں، کیا انہیں نہیں پتہ، یا اس نیٹ ورک کے لوگ نہیں

ہیں جس کے لئے تم کام کر رہی ہو؟"

"نہیں، یہ وہ لوگ نہیں، میں تمہیں سمجھاتی ہوں یہ کون ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے سانس لی پھر کہتی چلی گئی۔ "کمپیوٹر استعمال کرنے والے جانتے ہیں کہ ایک بیک اپ ہوتا ہے، جسے وقت پڑنے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم جس تنظیم کے لئے کام کر رہی ہیں وہ تو ہے ہی لیکن ہمارا اپنا ایک بیک اپ ہے، یہ وہ چند لوگ ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔"

"یہ کسی بھی دہشت گرد تنظیم کے سلیپر سیل کی مانند ہیں۔" رتنا نے کہا تو میں نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"تم تو بہت خوف ناک ہو، میرا تم لوگوں کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔"

"نہیں، تم ہم سے کہیں زیادہ خطرناک ہو۔ لیکن آج سے ہم نے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا ہے۔ تم جو بھی ہو، تمہارا ماضی تمہارے ساتھ، ہم ایک لفظ اس کے بارے میں نہیں پوچھیں گے۔ آج سے ایک نئی زندگی......" اس نے کہا تو نہ جانے مجھے کیوں لگا کہ قدرت میرا ساتھ دے رہی ہے۔ وہ قابل بھروسہ تھیں یا نہیں، ان کے ذہن میں کیا چل رہا تھا، یہ جاننے کے لئے میرے پاس کوئی پیمانہ نہیں تھا لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ میں اپنے ہدف کے کہیں آس پاس ہوں اور یہ دونوں میرے کام آسکتی ہیں۔ تبھی مجھ سے ششما نے پوچھا۔

"کیا سوچنے لگے؟"

"یہی کہ اگر تم پر میرا دل آ گیا تو پھر رتنا میرے خلاف ہو گی یا نہیں؟" میں نے یہ سوال بڑی معصومیت سے کیا تھا جس پر دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔ تبھی رتنا نے کہا۔

"نہیں میں خلاف نہیں ہوں گی مجھے اچھا لگے گا۔"

"چل اٹھ چلیں، ابھی تھوڑا کام کر لیں، پھر سونا بھی ہے۔" ششما نے کہا۔

"لیکن مجھے تمہارے اس پلان سے اختلاف ہے کہ ہم مر گئے۔" میں نے کہا۔

"یہ میں اس لئے کر رہی ہوں کہ میرے دشمن سمجھیں کہ چونکہ اب ہم نہیں رہے تو وہ......"
اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، کل پھر اسی طرح سامنے آنا ہوگا، یہ بات نہیں بلکہ تم یہ تاثر دو کہ کہیں گم ہو گئے ہو، کسی بھی وقت دشمن کے سر پہنچ سکتی ہو۔ جب تک تم سامنے نہیں آجاتی دشمن اضطراب میں رہے گا۔"

"تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو، میرا طریقہ یہ تھا کہ میں اندر ہی اندر، خاموشی سے اپنے دشمن تک پہنچ جاتی۔" شرشا نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہو یا نہیں ہو...... یہ تاثر ان کے لئے زیادہ اہم ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اوکے، میں تمہاری بات مان لیتی ہوں۔ کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ ہم کہاں ہیں، اس وقت تک جب تک دشمن تلاش نہیں کر لیا جاتا۔"

"میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں، میں کہیں گم ہوں۔ کوئی پتہ نہیں کہاں ہوں۔ شاہراہ پر پہنچ کر ہمارا ساتھ نہیں رہا۔" میں نے اسے سمجھایا تو اس نے چونک کر میری جانب دیکھا، پھر خوشگوار لہجے میں بولی۔

"یہ ٹھیک ہے، اس طرح زیر زمین دنیا میں زیادہ کھلبلی مچ جائے گی۔" یہ کہہ کر اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو ہم تینوں اٹھ کر اس گھر کی اوپری منزل پر چلے گئے۔

ایک کمرے میں اے سی لگا ہوا تھا، وہاں چند کمپیوٹر پڑے تھے۔ وہ دونوں جاتے ہی ان پر کام کرنے لگیں۔ جبکہ میں قریب پڑے بیڈ پر لیٹ کر انہیں دیکھنے کی کوشش میں نجانے کب سو گیا۔ اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میری آنکھ کھلی۔ میرے ساتھ بیڈ پر دائیں جانب

ششما اور بائیں جانب رتنا پڑی گہری نیند میں تھیں۔ میں خالی ذہن کے ساتھ کافی دیر تک یونہی لیٹا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کی نیند خراب ہو۔ کافی دیر یونہی لیٹے رہنے کے بعد میرے دماغ میں یہ خیال گونجنے لگا کہ میں ان دونوں کے چنگل میں پھنس گیا ہوں یا پھر میں نے انہیں پھنسا لیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب وقت ہی دے سکتا تھا۔

☆......☆......☆

رات گہری ہو چکی تھی۔ اوپری منزل کا صحن کافی کھلا تھا۔ مغرب کی طرف سے چلنے والی دیسی ہوا کافی خوشگوار ہو گئی تھی۔ ہم تینوں کے سامنے جسوندر سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تھا تو سکھ لیکن روایتی نہیں تھا۔ اس نے نہ تو دستار پہنی ہوئی تھی اور نہ ہی کیس رکھے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیر پہلے ایک بڑا سا کارٹن لے کر آیا تھا۔ رتنا اور ششما نے کیا منگوایا تھا، میں اس کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ رتنا اس سے باتیں کرنے لگی تو ششما اتنی دیر میں چائے بنا کر لے آئی تھی۔ اس نے درمیان میں دھری چھوٹی سی میز پر کپ رکھے اور خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

”کچھ پتہ چلا؟“

”ہاں، کافی حد تک معلومات مل گئی ہیں۔ یہ وہی گروپ ہے جس کے دو لوگ سے پور میں مارے گئے تھے۔ یاد ہے تمہیں، سنیاسی بابا کے چکر میں تھے وہ لوگ......“ جسوندر نے اسے یاد کرواتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی، لیکن وہ تو چند لونڈوں لپاڑوں کا گروپ تھا، وہ باقاعدہ کسی تنظیم کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ لوگ تو ہمارا ٹارگٹ ہی نہیں تھے۔ وہ تو جان بوجھ کر بیچ میں آ گئے تو ......“ رتنا نے اپنی بات کہتے ہوئے درمیان میں چھوڑ دی تو جسوندر نے کہا۔

”لیکن اب وہ بے شنکر نامی تنظیم میں ہیں۔ انہوں نے تو کافی اودھم مچایا ہوا ہے۔ ان کا ایک بڑا اڈہ یہیں جیسلمیر میں بیٹھا ہوا ہے۔“

”تبھی ہمیں گھیر کر پونا سے دہلی بلوایا گیا اور پھر وہاں جیسلمیر تک لے جایا گیا تھا۔“ ششما نے سر سراتے ہوئے کہا تو رتنا تیزی سے بولی۔

”ہمیں گھیرا نہیں گیا، بلکہ ہماری ایکٹی وٹی پر نگاہ رکھی گئی تھی۔ جیسے ہی ہم اس شہر میں گئے تبھی ہمیں اغوا کرنے اور بعد میں نجانے کیا کیا پلان بنایا گیا۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“ جسوندر نے پوچھا تو اس نے میری طرف دیکھا اور پھر دھیمے انداز میں بولی۔

”جس شخص نے ہمیں اغوا کیا تھا، وہ ایک دن پہلے اس شہر میں آیا تھا۔ اسے ہمارے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا، اس کا تعلق کسی بھی تنظیم سے نہیں تھا، یوں جیسے کسی راہی سے کوئی معمولی سا کام لے لیا جائے۔ میں اس بندے کو بھی جان گئی ہوں جس نے یہ ٹاسک دیا تھا۔ لیکن مجھے وہ چاہئے جس نے ہماری نگرانی کی۔“

”وہ جو کوئی بھی ہے، اسے نہ صرف تمہاری خفیہ سرگرمیوں کے بارے میں پوری جانکاری ہے بلکہ وہ تمہارے دوستوں کے بارے میں بھی جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ اسی گروپ میں ہو، جس کے ساتھ تم دلی سے گئی تھیں۔“ جسوندر نے حتمی انداز میں کہا تو مجھے سمجھ آ گیا۔

”رتنا یہ طے ہے کہ وہ جو کوئی بھی تھا، اسی گروپ میں تھا۔ اس کی وجہ وہ تصویریں ہیں جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد معلومات کے لئے بھیجی جا رہی تھیں۔ وہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ تمہارے اسی گروپ میں موجود تھا۔“ میں نے جیسے ہی یہ خیال ان کے سامنے رکھا تو ششما نے حیرت سے کہا۔

”یار یہ سامنے کی بات ہمیں کیوں پتہ نہ چلی؟“

”بالکل وہ وانجی میں سے تھا۔اس سے سب پتہ چل جائے گا۔“ رتنا نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”بس پھر اسے تلاش کرو، باقی پھر دیکھ لیتے ہیں۔“ جسوندر نے کہا تو رتنا نے سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ تو پتہ چل جائے گا لیکن ہم زیادہ دن یہاں نہیں رہ سکتے۔“

”وہ بھی ہو گیا سمجھو، اگر تم آج رات ہی پونا واپس جانا چاہتی ہو تو میں بندوبست کر دیتا ہوں۔ورنہ یہاں ہمارے ہی ایک بندے کا فارم ہاؤس ہے۔وہاں کوئی نہیں پوچھنے والا۔تم سکون سے جتنے چاہے دن وہاں رہ کر کام کر سکتی ہو۔“ جسوندر نے اطمینان سے کہا۔

”اوکے، میں تھوڑا دیکھ لوں مجھے یہاں رہنا ہے یا پونا واپس جانا ہے، میں صبح تک بتا دوں گی۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا تو جسوندر نے اپنے سامنے پڑی میز پر چائے کا خالی کپ رکھ دیا پھر اٹھ کر بولا۔

”میں تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ہم سے باری باری ہاتھ ملایا اور چل دیا۔اس کے جانے کے بعد میں نے رتنا سے کہا۔

”تم نے فون ضائع کروا دیئے ورنہ ان میں بہت کچھ تھا۔“

”وہ اچھا ہو گیا، ورنہ ہمارے دشمن ہم تک پہنچ چکے ہوتے۔میں نے نئے سیل فون منگوائے ہیں، ابھی تمہیں دیتی ہوں۔“ اس نے کہا اور اندر چلی گئی۔میرے اور ششما کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر بعد رتنا ایک فون لے کر آ گئی۔وہ اتنا زیادہ قیمتی نہیں تھا لیکن اس سے بہتر کام چلایا

جا سکتا تھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے کمپیوٹر پر بیٹھ گئیں تو میں نے چاچا عبدالمجید کو فون ملا لیا۔ میری آواز سنتے ہی وہ بولا۔

"شکر ہے تم سے رابطہ ہوا۔"

"مجھے بے شکر نامی تنظیم کے بارے میں پتہ کرنا ہے، معلومات مل سکتی ہیں کہیں سے......"

میں نے فوراً اپنے مطلب کی بات کی۔

"معلومات تو مل سکتی ہیں لیکن کچھ وقت لگے گا۔ میں تمہیں ایک نمبر دیتا ہوں، اس پر رابطہ کرو، وہ تمہارا وہاں ہر مسئلہ حل کرے گا، تمہارے بارے میں اسے سب پتہ ہے۔" چاچا نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹھیک ہو گیا۔" میں نے کہا۔

"لگتا ہے تم تھوڑی بہت کامیابی لے چکے ہو؟" اس نے تبصرہ کرنے والے انداز میں پوچھا تو میں نے کہا۔

"ہاں، کچھ معاملہ آگے بڑھا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں اپنے ہدف تک پہنچ جاؤں گا۔ اب یہ زیادہ دنوں کی بات نہیں رہی۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" اس نے کہا اور مجھے نمبر بتا دیا، میں نے اسے دہرایا اور ذہن نشین کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ میں نے وہ نمبر ملایا، چند لمحوں بعد میرا رابطہ ہو گیا۔ لیکن دوسری جانب سے میری کال کاٹ دی گئی۔ میں دوبارہ کوشش نہیں کی بلکہ انتظار کرنے لگا۔

میں اپنے طور پر سوچ چکا تھا کہ رتنا اور ششما سے کیا کام لینا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ باصلاحیت تھیں، دلیر تھیں اور حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی رکھتی تھیں لیکن ان

کے کام کرنے کا انداز وہ نہیں تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ اسی لئے وہ ٹریپ ہوگئی تھیں۔ جرم کی دنیا ہو یا زیر زمین کارروائیاں کرنے والی تو تیں، ان میں فوری فیصلہ ہی کارآمد ہوتا ہے۔ چوہے بلی کا کھیل صرف وقت ضائع کرنے کے ساتھ ساتھ بہت خطرناک عمل ہو گیا تھا۔ کیونکہ باقی دنیا کی نسبت جدیدیت نے زیادہ اثر کیا ہوا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے جرم پہلے ہوتا ہے اور قانون بعد میں بنتا ہے۔

فون کی منمناہٹ نے مجھے سوچوں سے نکال باہر کیا۔ اسکرین پر وہی نمبر جگمگا رہے تھے جو کچھ دیر پہلے میں نے ملائے تھے۔ میں نے کال رسیو کی تو دوسری جانب سے ایک خوشگوار مردانہ آواز ابھری۔

''جی رانا دیر سنگھ کیسے ہیں آپ؟''

اس ایک فقرے نے مجھے ساری بات سمجھا دی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں، آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔'' میں نے کہا تو وہ بڑے سکون سے بولا۔

''یہ کوئی ایسی تنظیم نہیں ہے، جو کسی بڑے پیمانے پر کام کر رہی ہو۔ تھوڑا عرصہ ہی ہوا ہے اس کا نام مارکیٹ میں آیا ہے۔ اس کا زیادہ کام بھی بلیک میلنگ ہے۔ اس میں کوئی مسئلہ ہو جائے تو قتل بھی کر دیتے ہیں۔ ان کا آن لائن کام زیادہ ہے۔''

''ان کا کوئی بڑا؟...... یا یہ لوگ سامنے آتے ہیں؟''

''زیادہ تر یہ خفیہ ہی کام کرتے ہیں۔ لیکن اتنا ہے کہ اس میں کچھ طاقت ور لوگ ہو سکتے ہیں۔ ورنہ اس قدر منظم ہو نہیں سکتا۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔

''اگر ان کے کسی بڑے تک پہنچنا ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کوشش کی جا سکتی ہے، ناممکن تو کچھ بھی نہیں۔'' اس نے کہا۔

"آپ دیکھیں اسے میں بھی دیکھتا ہوں، ہو سکتا ہے اس سے کوئی معاملہ کرنا پڑ جائے۔"
میں نے کہا تو چند باتوں کے بعد کال ختم کر دی۔
میں باہر اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں اندر مصروف تھیں۔ میں اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔
وہاں جا کر چائے بنائی اور ان کے پاس دو کپ رکھ دیئے۔ تبھی ششما نے میری طرف دیکھ کر کہا
"تم چاہو تو سو جاؤ۔"
"تمہارا کیا خیال ہے میں تم دونوں کے حسن سے اپنی نگاہیں ٹھنڈی نہ کروں۔ یہ بھی تو
ایک بڑا کام ہے نا۔" میں نے کہا وہ دونوں ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔ ماحول کافی خوشگوار ہو
گیا تھا۔
رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ وہ دونوں کمرے کے کونے میں لگے میز پر دھرے کمپیوٹر
میں کھوئی ہوئی تھیں۔ میں بیڈ پر لیٹا ہوا اپنی سوچوں میں گم تھا کہ ششما کی آواز کمرے میں گونجی
"لے رتنا پکڑ لیا۔"
"کون ہے؟" اس نے سر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔
"یہ دیکھو، یہ وکرم راٹھور، اس کی میل دیکھ۔ اس میں ساری بات سامنے ہے، اس چڑیل کو
کی گئی میل......" اس نے کہا تو رتنا وہ دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد سر اٹھا کر بولی۔
"بس پھر پکڑ اس کو، دیکھ یہ ہے کہاں پر؟"
"اسے نہیں چھوڑوں گی۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ میں ان کے قریب چلا گیا۔
تھوڑی دیر کوشش کے بعد وہ وکرم راٹھور کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ میں نے اس کی
تصویر دیکھی تو ایک لمحہ میں وہ میری نگاہوں کے سامنے سے گھوم گیا۔ یہ وہی تھا جس نے پسٹل
سے ہم پر فائر کیا تھا۔ لیکن میں نے جوابی فائر کیا تو ایک چیخ بلند ہوئی تھی، وہ اس کی تھی یا کسی

دوسرے کی، یہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔

یہ اتفاق نہیں تھا کہ وہ جودھ پور کے ہی ایک ہوٹل میں موجود تھا۔ انہیں یقین تھا کہ رتنا اور ششما یہیں کہیں ہوں گی۔ بلاشبہ وہ انہیں تلاش کرنے کے چکر ہی میں یہاں تھے۔ وہ اکیلا نہیں ہو سکتا تھا۔

"اب بولو، کیا کہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی نکلیں گے اور اسے......" رتنا کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"چپ کیوں ہو گئی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے یہاں ان تک پہنچنے کے لئے ہمیں ایک پلان تو کرنا ہو گا۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے سوچو۔" میں نے کہا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ میں نے وہی نمبر پش کئے تو دوسری جانب سے وہی خوشگوار آواز سنائی دی۔ میں انتہائی اختصار سے اپنا مدعا بتایا تو اس نے سن کر اطمینان سے کہا۔

"کوئی بات نہیں، مجھے تصویر بھیج دو، یہ ہوٹل شاستری چوک سے اگلے کراس پر ہے۔ ایک گھنٹے تک میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔"

"اوکے، میں بھیجتا ہوں۔" میں نے کہا اور اندر کمرے میں جا کر اس کی تصویر بنائی اور کچھ دیر میں اسے بھیج دی۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" ششما نے پوچھا۔

"تم اپنا کام کرو، میں اپنا کرتا ہوں۔" میں نے سکون سے کہا تو وہ حیرت سے میری جانب دیکھنے لگی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

☆......☆......☆

دن نکلنے کے آثار واضح ہو رہے تھے۔ ہم شاستری کراس سے آگے پہنچ چکے تھے۔ جسوندر اپنی فور وہیل ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ زیادہ پرجوش تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی، مجھے اس کے بارے میں کوئی اندازہ بھی نہیں تھا۔ ہم چاروں اس ہوٹل کے باہر جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کوئی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ میرے فون پر کال آ گئی۔

"ہمارے دو بندے اس کے کمرے تک پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے اور وہ نشے میں ہیں۔ اسے نیچے لے آئیں یا تم لوگ اوپر آؤ گے؟"

"ہم آ رہے ہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"لفٹ کے پاس ایک گرین شرٹ والا لڑکا ہوگا، اس کے سر پر گہرے سبز رنگ کی ٹوپی ہوگی، اسے پوچھنا دوست کہاں ہے۔ وہ لے جائے گا کمرے تک۔" اس نے کہا اور کال ختم کر دی۔

جسوندر اپنی فور وہیل میں رُک گیا۔ میں نکلا تو میرے پیچھے رتنا باہر آ گئی۔ ششما بھی وہیں رہی۔ ہم دونوں بڑے اطمینان سے استقبالیہ کے سامنے سے گزر کر لفٹ تک جا پہنچے۔ وہ ہمیں لیتا ہوا تیسری منزل تک چلا گیا۔ اس نے ایک کمرے کی جانب اشارہ کیا اور واپس پلٹ گیا۔ میں دروازے کے سامنے تھا، رتنا میرے پیچھے تھی۔ میں جانتا تھا کہ اندر بندے موجود ہیں لیکن پھر بھی میں پوری طرح محتاط تھا۔ میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ بند تھا، میں نے ہلکے سے دستک دی تو اگلے ہی لمحے کھل گیا۔ اسی لمحے میری نگاہ سامنے بیڈ پر بیٹھی جس عورت پر پڑی، میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں چکرا کر رہ گیا۔ وہ کانتی تھی۔ تبھی میں نے رتنا کو وہیں رکنے کا اشارہ کر کے اندر چلا گیا۔ کانتی بھی مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

"تت...... تم یہاں......" اس نے پوچھا۔

”یہ تم دونوں کی خوش قسمتی ہے کہ مجھے پتہ چل گیا۔ فوراً نکلو، ورنہ تم دونوں کے لئے بہت مشکل پیدا ہو جانے والی ہے۔“

”یہ لوگ.... ؟“ کاتی نے پوچھا۔

”یہ ہمارے دوست ہیں۔ میں انہی کے پاس تو تھا۔ اب دیر مت کرو۔ کوئی پتہ نہیں کب حملہ ہو جائے۔“ میں نے آخری لفظ یوں کہے جیسے کوئی انہونی ہو جانے والی ہو۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ میرے خیال میں وہ پہلے ہی ان دونوں سے سہمے ہوئے تھے۔ وہ فوراً اٹھے تو وہاں پر موجود نوجوانوں نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

”ہمیں آپ پر شک ہو گیا ہے۔“

یہ ایک نئی افتاد پڑ گئی تھی۔ ان کا مجھ پر شک کرنا بنتا تھا۔ کاتی کی وجہ سے مجھے پینترا بدلنا پڑا تھا۔ میں نے تیزی سے فون نکالا اور اس پر نمبر پش کر دیئے۔ لمحوں میں رابطہ ہو گیا۔ تبھی میں نے تیزی سے کہا۔

”یہ دوستوں کو مجھ پر شک ہو گیا ہے، انہیں بتائیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے فون ایک کو تھما دیا۔ اس نے چند لمحے بات سنی اور فون میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بتائیں کیا کرنا ہے۔“

”انہیں لے کر فوراً نیچے آ جاؤ، میں نیچے گاڑی لئے کھڑا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں کاتی سے کہا، ”فوراً نکلو، ممکن ہیں وہ دونوں چڑیلیں یہیں کہیں ہوں۔“

”اوکے۔“ وہ نکلنے کے لئے اٹھے تو میں دروازے سے باہر تھا۔ میں نے رتنا کو واپس جانے کو کہا تا کہ ان سے پہلے لفٹ سے نیچے چلا جاؤں۔ جیسے ہی ہم لفٹ میں پہنچے، تو رتنا نے پوچھا۔

"ہوا کیا، مجھے......."

"کانتی تھی اندر، بغیر کسی مشکل کے کام ہو گیا۔"

"کانتی کون؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"ابھی سب پتہ چل جائے گا، بس خاموشی سے دیکھو۔" میں نے کہا اور انتہائی اختصار سے اسے بتایا۔ تب تک تو ہم نیچے آ گئے۔

میں نے فون کر کے اپنے کرم فرما کو بتایا کہ میرا پلان کیا ہے۔ اپنے لوگوں کو فون پر بتا دیں۔ اسے بتایا کہ کرنا کیا ہے۔ یہ بات رتنا بھی سمجھ گئی تھی۔ اس لئے فوراً اپنی گاڑی تک چلی گئی۔ میں باہر کھڑا رہا، چند منٹ بعد وہ چاروں یوں تیزی سے نیچے آئے جیسے کسی کام کے لئے نکل رہے ہوں۔ ساتھ آنے والے نوجوان کا فون کان سے لگا ہوا تھا۔ اس نے فون کان سے ہٹا کر مجھے دیکھا اور جیسے ہی وہ میرے قریب آئے، تو میں نے نوجوان سے پوچھا۔

"گاڑی کہاں ہے؟"

"ابھی آتی ہے۔" اس نے کہا اور کوئی اشارہ کیا، اگلے منٹ میں ایک وین وہاں آ گئی۔ وہ پہلے اندر گیا، شاید اس نے بات سمجھائی تھی، چند لمحوں بعد اس نے ہمیں بیٹھنے کو کہا ہم تیزی سے اس میں بیٹھ گئے تو فوراً چل دی۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں؟"

"مجھے فون کر کے بتایا گیا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو میں تم دونوں کو یہاں سے نکال لوں۔ اس لئے یہاں پہنچا ہوں۔"

"وہ دونوں بھی ادھر ہی ہیں؟" پہلی بار دکرم راٹھور نے مجھ سے سوال کیا تو میں نے انتہائی اعتماد سے کہا۔

”مجھے بھی بتایا گیا ہے، یہ حملہ شاید انہیں کی طرف سے ہونے والا ہو۔“

”ہم تو خود ان کی تلاش میں تھے۔“ وکرم نے کہا۔

”انہیں بھی تلاش کر لیتے ہیں۔“ میں نے کہا اور ریتا کو مس کال دے دی۔ اب مجھے انتظار تھا کہ وہ کیا کرتی ہیں۔ ان تینوں نوجوانوں نے بات سمجھ لی تھی، اس لئے مجھے اطمینان تھا۔

اس بار ہم شاستری کراس کی طرف نہیں جا رہے تھے بلکہ سیدھے چل رہے تھے۔ صبح ہونے کے باعث ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ انتہائی تیزی سے جانے کے باعث تقریباً پانچ منٹ میں ہم ریلوے لائن تک جا پہنچے۔ جیسے ہی ریلوے کا پل پار کیا۔ جسوندر والی فور وہیل ان کے برابر آ گئی، پھر اس نے سائیڈ دباتے ہوئے رکنے پر مجبور کر دیا۔ وین رک گئی۔ ایسے میں پچھلی سیٹ سے ششما اور ریتا باہر نکلیں۔ ان کے ہاتھوں میں پسٹل تھا۔ انہیں دیکھ کر کانتی کے منہ سے نکلا۔

”یہ کیا......؟“

”یہ پہنچ گئیں......؟“ وکرم کے منہ سے نکلا

اس وقت تک وہ دونوں وین تک پہنچ گئی تھیں۔ ان کے پیچھے ہی جسوندر تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔

”انہیں روکو، پسٹل نکالو۔“ وکرم نے تیزی سے کہا۔

”ہمیں کسی کو مارنے کا حکم نہیں۔“ نوجوان نے کہا تو وہ اس کا منہ دیکھنے لگے، تبھی وکرم نے ایک غلیظ گالی نکالتے ہوئے کہا۔

”تو یہ پسٹل کیوں لیئے پھرتے ہو، لاؤ مجھے دو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پسٹل چھیننا چاہا لیکن نہ چھین سکا۔ اس وقت تک وین کا دروازہ کھل چکا تھا۔ ششما پسٹل تانے کھڑی تھی۔

"باہر نکلو، ایک سیکنڈ میں نکلو ورنہ یہیں ڈھیر کر دوں گی۔"

"مارو، چلاؤ گولی......" وکرم نے کہا اور وین سے اترا، تبھی ششما نے پوری قوت سے اس کے سر پر پسٹل مارا، وہ وہیں لڑکھڑا گیا۔ کانتی کو میں نے پکڑا اور باہر لے آیا، ہمارے باہر نکلتے ہی وہ نوجوان وین لے کر نکل گئے۔

اگلے دو منٹ میں ہم تینوں کو فور وہیل کی پچھلی نشست پر ٹھونسا۔ ششما اور رتنا نے اگلی سیٹ پر بیٹھ کر ہم پر پسٹل تان لیا۔ جسوندر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور ہم چل دیئے۔ اب اگلی منزل کا پتہ نہیں تھا کہ وہ ہمیں کہاں لے کر جا رہے تھے۔ دن نکل رہا تھا۔ ہم ریلوے لائن کے ساتھ انتہائی تیزی سے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک شاہراہ پار کر گئے۔ تھوڑا آگے جا کر دائیں طرف چلنے لگے۔ اس دوران وکرم بہت بے چین تھا۔ ششما اور رتنا اُن سے سوال نہیں کر رہی تھیں۔ ان میں برا حال کانتی کا تھا۔ وہ بے ہوش ہونے والی ہو گئی تھی۔

شاید وہ جسوندر کا ہی کوئی سیف ہاؤس تھا۔ وہ آبادی سے ہٹ کر ایک ایسا مکان تھا جس میں چند کمرے تھے اور بہت کھلا سا کچا صحن تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ جسوندر فور وہیل سمیت اندر چلا گیا۔ ہمیں باقاعدہ دھکے دے کر اندر ایک کمرے تک لایا گیا۔ ننگے فرش پر بٹھانے کے بعد رتنا نے پسٹل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور وکرم کی طرف دیکھ کر بولی۔

"پہنچ گئے نا تم تک......"

"مگر اب بچو گی نہیں۔" اس نے کہا تو رتنا نے اس کے منہ پر لات دے ماری۔ اس کا سر فرش سے جا ٹکرایا، تبھی اس نے کانتی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم سے تو بعد میں نپٹتی ہوں، پہلے اس بے غیرت سے معاملہ کر لوں۔" یہ کہہ کر اس نے بائیں ہاتھ سے اس کے سر کے بال پکڑے اور بولی۔ "بتا بے سالے، کس نے سپاری دی تھی

ممبری......؟“

”یہ ایسے نہیں بکے گا، پہلے ان کی دھنائی ہوگی، پھر یہ خود ہی بولیں گے۔ ابھی چھوڑ دے انہیں۔“ پیچھے کھڑی ششما نے کہا تو وہ الگ ہو گئی۔ اس نے غضب ناک انداز میں ہمیں دیکھا اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

ہم میں خاموشی چھا گئی۔ کوئی بھی نہیں بول رہا تھا۔ کافی دیر بعد کانتی نے سرسراتے ہوئے انداز میں کہا۔

”وکرم، شاید ہم نے غلطی کی جو......“

”کوئی غلطی نہیں کی، انہیں بہر حال مرنا ہوگا، یہ ہمارے لئے بہت خطرناک ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”لیکن یوں آ کر ہوٹل میں پڑے رہنے سے تو کچھ نہیں ہوا نا، وہ ہم سے تیز نکلیں۔“ کانتی نے شکوہ بھرے انداز میں کہا۔

”ان کا کوئی سراغ ہی نہیں مل رہا تھا۔“ وکرم نے چند لمحے بعد کہا تو میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارے بڑوں کو تو پتہ چل گیا تھا، جبھی تو انہوں نے مجھے یہاں بھیجا، حیرت ہے تمہیں کیوں نہیں بتایا انہوں نے؟“

”یہ تو مجھے پریشانی ہے۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔“ وکرم نے کہا۔

”ضرور تم نے کہیں غلطی کی ہے۔“ میں نے کہا۔

”غلطی، کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”کہیں تمہارے بڑے یہ تو نہیں چاہتے کہ تمہیں ہی صاف کر دیں اور کوئی ان تک نہ پہنچ

سکے؟'' میں نے اس پر خوف طاری کرنے کی ایک کوشش کی جو کافی حد تک کامیاب ہو گئی۔ اس نے چند لمحے سوچا اور دھیرے سے بولا۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

''دیکھو، مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کیا چکر چل رہا ہے۔ اس کے بارے میں کانتی اچھی طرح جانتی ہے۔ اگر معاملہ صرف تمہارا ہے تو پھر تم نہیں بچ سکتے، تیرے ساتھ ہم بھی گئے۔ لیکن اگر معاملہ تمہارا اکیلے کا نہیں تو شاید کوئی راہ نکل آئے، مجھے شروع سے بتاؤ۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا تو چند لمحے میری جانب دیکھتا رہا پھر بولا

''یہ دونوں بہت شاطر ہیں، یہ ہماری تنظیم کے بڑوں تک پہنچ گئیں ہیں۔ جن کا کہیں کوئی ریکارڈ نہیں۔ وہ بڑے نہیں چاہتے کہ اب یہ زندہ بچیں۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو انہیں مار دیا گیا ہوتا، جبکہ مجھے یہ کہا گیا کہ ہر حال میں انہیں زندہ پہنچانا ہے۔ بولو کانتی، ایسا نہیں تھا؟'' میں نے کانتی کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ بولی۔

''پھر میرے وہاں سے آنے کے بعد ویڈیو بنوانا، یہ بھی غلط تھا۔''

''کہیں نا کہیں کچھ غلط ہے وکرم۔'' میں نے کہا۔

''تم وہاں تھے، تمہارے ساتھ کیا ہوا؟'' اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا جس کا جواب میرے پاس تیار تھا، میں نے تیزی سے کہا۔

''انہوں نے جب پہلوان کو مارا، تو میں وہاں سے فرار ہو گیا۔ آج دوپہر کے وقت میرا رابطہ ہوا، تو مجھے یہاں جودھ پور پہنچا دیا، میں سویا ہوا تھا کہ مجھے تمہارے بارے میں بتایا گیا۔''

''یہ سوچو کہ اب کیا ہوگا؟'' کانتی نے کہا تو میں تیزی سے بولا۔

"دیکھو، میں تو مرنا نہیں چاہتا، میں ان کی ہر بات مان لوں گا۔ تم دونوں اپنا سوچو، میں سمجھتا ہوں تم نے سچ نہیں بولنا اور انہوں نے تمہیں مار دینا ہے۔"

"کیا سچ بول دینے سے وہ۔" وکرم نے کہا تو میں سمجھ گیا وہ اندر سے ڈر گیا ہے۔ تبھی میں نے کہا۔

"ممکن ہے، کیونکہ پھر تم درمیان سے ہٹ جاؤ گے۔"

"میں ایسا ہی کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔ ہمارے درمیان پھر خاموشی چھا گئی تھی۔

کافی دیر بعد رتنا کے ساتھ ششما اندر آئیں تو ان کے ہاتھ میں لکڑی کی وکٹیں تھیں۔ انہوں نے آتے ہی وکرم کی جانب بڑھیں تو اس نے ہاتھ اٹھاتے ہی کہا۔

"جو پوچھو، میں بتا دیتا ہوں لیکن......" یہ کہتے ہوئے وہ خاموش ہوا تو ششما نے کہا۔

"لیکن کیا......؟"

"تم مجھے مارو گی نہیں۔" اس نے خوف زدہ انداز میں کہا۔

"بولو......" ششما نے پوچھا۔

"تم دونوں کا قصور یہی ہے کہ تم مہتا رانی اور شیا سی باوا کو قتل کر کے سب ختم کیا، ان کے اکاؤنٹ خالی کر دیئے۔" اس نے بتایا۔

"تو اس سے تمہارا کیا تعلق؟" پاس کھڑی رتنا نے تیزی سے پوچھا۔

"تم جانتی ہو یہ کس کے لوگ تھے؟" اس نے پوچھا۔

"کس کے......؟" ششما نے پوچھا۔

"کلیان جی کے۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"اوہ، یہ تو اس کے لوگ تھے۔" رتنا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہاں انہوں نے ہی مجھے یہ ٹاسک دیا تھا کہ تم دونوں کے ساتھ تعلق بڑھاؤں، پھر کسی طرح تمہیں گھیر کر اس طرح کر دوں کہ ان کا سارا نقصان پورا ہو جائے، اگر نہ مانو تو قتل کر دیے جاؤ۔" اس نے کسی شرمندگی کے بغیر کہا۔

"ایک جگہ تم جھوٹ بول گئے ہو۔" رتنا نے کہا۔

"وہ کیا......؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"کلیان جی، اس کے آگے نجانے کتنے لوگ ہیں اور وہ کبھی کسی سے ملا تک نہیں، وہ تمہیں خود کیسے ٹاسک دے سکتا ہے؟" اس نے کہا تو دکرم ایک لمحے کو گھبرا گیا، پھر تیزی سے بولا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو، اس کا نیٹ ورک ساری دنیا میں ہے۔ لیکن اس کے اپنے بھی تو کچھ خاص لوگ ہیں۔"

"اور تم ان میں سے ایک ہو۔" ششما نے طنزیہ انداز میں کہا پھر لمحہ بھر بعد بولی، "تمہارا فون تو ہے نا تمہارے پاس، کرو اس سے بات۔ ابھی طے ہو جاتا ہے کہ تمہارے ساتھ کیا کرنا ہے۔"

یہ سنتے ہی اس نے اپنا فون سیٹ نکالا، نمبر پش کیے اور رابطے کا انتظار کرنے لگا۔ ششما نے آگے بڑھ کر فون اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کا اسپیکر آن کر دیا۔ کچھ دیر بیل جاتی رہی، پھر کسی کی خمار آلود آواز ابھری۔

"ہاں بے دکرم، مل گئی وہ؟"

"جی کلیان جی۔" اس نے کہا۔

"لیکن تمہاری آواز مری ہوئی کیوں ہے۔"

دوسری جانب سے آواز ابھری تو ششما نے کہا۔ "اس لیے کہ یہ میرے قبضے میں ہے۔"

"تم کون ہو؟" آواز میں حیرت تھی۔

"وہی جسے یہ پکڑنے آیا تھا، جس سے تم اپنا نقصان پورا کرنے والے تھے اور......"

"اوہ، تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں۔" دوسری جانب سے آواز ابھری۔

"ابھی نہیں، کچھ وقت بعد میں داد دینا، جب میں تم تک پہنچ جاؤں گی۔" شششما نے غصے میں کہا تو دوسری جانب سے ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا، پھر آواز ابھری۔

"اب تم نے خود سے بڑی بات کی ہے۔ تم ایک ہفتے کے اندر میرے سامنے کھڑی گڑگڑا رہی ہوگی۔ ہاں اگر نقصان پورا کر دو تو پھر تمہارے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔"

"اس طرح تو یہ مجھے مار دیں گی۔" وکرم نے خوف زدہ لہجے میں تیزی سے کہا تو دوسری جانب سے کہا گیا۔

"میں زخمی گھوڑے نہیں رکھتا۔"

اس کے ساتھ ہی کال کاٹ دی گئی۔ وکرم کا رنگ اڑ گیا۔ کانتی باقاعدہ رونے لگی۔ اب ان کے لئے معافی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ رتنا نے پسٹل نکالا اور کانتی کے ماتھے پر نال رکھ کر فائر کر دیا۔ خون کے چھینٹے دیوار پر جا لگے۔ وہ لڑھک کر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ وکرم نے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ رتنا نے اس کے ماتھے پر نال رکھی تو وہ ایک دم سے اچھلا، مگر اس نے دیر کر دی تھی۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ رتنا نے دوسرا فائر کر دیا۔ اس نے چند جھٹکے لئے اور پھر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا۔

فائر کی آوازیں سن کر جسوندر کمرے میں آ گیا۔ اس نے ایک نگاہ میں سارا منظر دیکھا اور رتنا سے بولا۔

"آؤ چلیں، انہیں ٹھکانے لگانے کوئی اور آ جائے گا۔"

کچھ دیر بعد ہم فوروہیل میں بیٹھے، اسی سڑک سے واپس جا رہے تھے جو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم اس فارم ہاؤس جا پہنچے جس کے بارے میں جسوندر نے بتایا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ ناشتہ کیا جو وہاں موجود ایک شخص نے ہمیں بنا کر دیا تھا۔ پھر ہمیں وہاں چھوڑ کر، دوبارہ آنے کا کہہ کر چلا گیا تھا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی ہوں کہ ہمارا دشمن کلیان جی ہوگا۔" ششما نے بیڈروم میں پڑے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا تو اس کی آواز میں کافی حد تک خوف جھلک رہا تھا۔ اس پر رتنا خاموش رہی۔ وہ اس کے ساتھ جا بیٹھی تو میں نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کلیان جی ہے کون؟"

"یہ صرف ایک نام ہے، ممکن ہے کوئی شخص بھی ہو لیکن اسے کسی نے آج تک دیکھا نہیں ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وکرم سے اسی نے بات کی ہوگی۔" ششما نے بتایا تو اس کا لہجہ بھی ڈرا ہوا تھا۔

"لیکن جس طرح وکرم کے نقصان کا بتایا تو ایسا ممکن ہے، مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ جانے انجانے میں ہم کتنا بڑا دشمن پیدا کر چکی ہیں۔" رتنا نے سرسراتے ہوئے انداز میں کہا۔

"تو پھر جاؤ، جا کر اس سے معافی مانگ لو، اس کا نقصان پورا کر دو۔" میں نے سکون بھرے انداز میں کہا تو اس نے میری جانب دیکھا پھر کسی جذبے سے بھی عاری لہجے میں کہا۔

"میں اس سے خوف زدہ نہیں ہوں، بلکہ جتنی وہ قوت رکھتا ہے، جتنی اس کی رسائی ہے، ہم اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ ذرا غور کرو، وکرم کو صرف چارہ بنا کر ہمیں سامنے لایا گیا ہے۔ اب یہ شہر ہمارے لئے تنگ کر دیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے اب تک ان دیکھا حصار بن گیا ہو۔"

''تم بہت ڈر گئی ہو اور میرا خیال ہے اس خوف کی وجہ سے تمہیں اب نیند بھی نہیں آئے گی۔'' میں نے اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''جب انسان حملہ کرنے اور دشمن کو زیر کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے نا تو بہت کم سوچتا ہے، بس وہ وار کر دیتا ہے، لیکن جب انسان اپنی بقا والی سطح پر آجائے تو اس کے پاس سوائے سوچوں کے کچھ نہیں رہتا۔''

''میں خوابوں کی دنیا میں رہنے والی نہیں، حقیقی زندگی کی بات کر رہی ہوں۔'' اس نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔

''یہ حقیقت ہے حسین لڑکی، شکست اس وقت ہوتی جب ہم شکست کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ وار سے بچنا ایک الگ بات ہے اور وار کرنے کے بارے میں سوچنا ایک دوسری چیز۔'' میں نے کہا تو سوچ میں پڑ گئی، پھر چند لمحے بعد بولی

''تم ٹھیک کہتے ہو، زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا، وہ ہمیں ختم کر دے گا، لیکن اس وقت تک میں اسے اتنا نقصان پہنچا چکی ہوں گی کہ وہ......''

''اب بھی تم غلط سوچ رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' اس نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''تم اسے ختم کرنے کا کیوں نہیں سوچتی ہو۔ دشمن کو ختم کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ اسے مار دو، بلکہ اس پر خوف طاری کر دو۔''

میں نے کہا تو اب تک خاموش بیٹھی ششما نے کہا۔ ''یہ ہے بات...... میں سمجھ گئی۔ اس نے تو ایک ہفتے میں گڑگڑانے کی بات کی ہے، ہم ایک ہفتے تک بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ گھبراؤ

مت۔" اس نے رتنا کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بولو، پھر کہاں سے شروع کریں۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"صرف یہ کہ سب سے زیادہ نقصان کہاں پہنچایا جا سکتا ہے۔" میں نے سکون سے کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

"ڈن......"

"یہ ہوئی نا بات، اب لگ جاؤ کام پر۔" میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اب ان سے کیسے کام لینا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ صرف میرے لئے کام کریں گی۔ میں نے فون نکال کر وہی نمبر ملا دیا، جہاں سے خوشگوار آواز والا مرد مجھ سے بات کرتا تھا۔ میں نے اسے کلیان جی کے بارے میں پوچھا تو اس نے سکون سے کہا۔

"کلیان جی ایک نام ہے، زیر زمین دنیا میں ہر وہ جرم جس کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے، وہی ان کا کام ہے۔ ممکن ہے ایسے کسی نام کے شخص نے کوئی تنظیم بنائی ہو، لیکن پچھلے چند برس سے اس کا بہت شہرہ ہو گیا ہے۔" اسی خوشگوار آواز والے مرد نے مجھے بتایا۔

"اس کا کوئی سراپتہ، ان تک پہنچا کیسے جا سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہی تو اس تنظیم کی کامیابی ہے۔ اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہا جا سکتا، جس طرح کسی درخت پر آکاش بیل پھیلی ہوتی ہے، اس کا زمین سے کہیں تعلق نہیں ہوتا، ایسا ہی ان کا وجود ہے۔ یہ اسی لئے تیزی سے پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا زیادہ زور برصغیر کے ممالک میں ہی ہے۔" اس نے بتایا پھر لمحہ بھر سانس لے کر پوچھا، "تمہیں اس سے کیا کام پڑ گیا؟"

"رات جو بندے اٹھائے تھے، وہ اسی تنظیم کے تھے۔" میں نے بتایا۔

"اوہ...! اب وہ کہاں ہیں؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

”وہ تو اب نہیں ہیں کیونکہ وہ محض ٹشو پیپر تھے۔“ میں نے بتایا اور پھر کلیان جی سے ہونے والی بات بھی کہہ دی۔ سب کچھ سن کر بولا۔

”کوئی بات نہیں، بس پوری طرح چوکنا رہو، حالات پر گہری نگاہ رکھو، میں بھی دیکھتا ہوں۔ کہیں بھی ہلچل ہوئی تو پتہ چل جائے گا۔ ویسے شہر کی پولیس کافی زیادہ متحرک ہو چکی ہے۔ ممکن ہے وہ تمہاری وجہ سے ہو۔“

”اگر اس ہلچل کے پیچھے کلیان جی تنظیم ہے تو پھر ان تک پہنچا جاسکتا ہے۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

”یہ آسان نہیں ہوگا، لیکن ناممکن نہیں، میں دیکھتا ہوں اس بارے میں کیا کیا جاسکتا ہے“ اس نے کہا پھر چند باتوں کے بعد میں نے کال ختم کردی۔ میں کئی آپشن پر سوچنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

سہ پہر ہونے کو تھی۔ میں بھرپور نیند کے بعد بیدار ہو گیا تھا۔ میں بالکل فریش تھا۔ میں تھوڑی دیر کمرے میں رہا اور پھر باہر نکل گیا۔ راہداری سے ہوتے ہوئے جب میں عقبی حصے میں گیا تو کاریڈور میں دھوپ ابھی تک باقی تھی۔ گرمی کا اتنا احساس نہیں تھا۔ میں چھاؤں میں پڑیں کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ تازہ ہوا میں یوں بیٹھنا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے وہاں بیٹھے ہوئے محسوس کیا کہ سناٹا بہت گہرا ہے۔

وہیں بیٹھے ہی مجھے تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ ششما اور رتنا کہاں ہیں؟ میں تیزی سے اٹھا اور ان کے کمرے کی جانب گیا۔ وہ دونوں وہاں نہیں تھیں۔ میں تیزی سے پلٹ کر اس بندے کو تلاش کرنے لگا، جو وہاں فارم ہاؤس پر موجود تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سامنے لان میں موجود پودوں کو پانی دیتا ہوا دکھائی دیا۔ میں اس کی جانب بڑھا تو اس نے پانی والا پائپ چھوڑ

دیا اور میری جانب متوجہ ہو گیا۔ تو میں نے پوچھا۔

”وہ دونوں کہاں ہیں؟“

”وہ تو جی دو گھنٹے ہوئے یہاں سے گئی ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”کس کے ساتھ؟“ میں نے پوچھا۔

”جسوندر صاحب آئے، ان کے ساتھ گئی ہیں۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”کوئی پیغام؟“ میں نے یونہی پوچھا۔

”یہی کہا تھا کہ جب آپ بیدار ہو جائیں تو میں آپ کو چائے دے دوں، چائے پئیں گے آپ؟“ اس نے پوچھا۔

”اوکے، میں فریش ہوتا ہوں، تم چائے لے آؤ۔“ میں نے کہا اور واپس کمرے کی جانب پلٹ گیا۔

نجانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ ورنہ وہ مجھے بتا کر جاتیں۔ میرے دماغ میں کئی خیال آنا شروع ہو گئے۔ میں کمرے میں گیا، نہا کر فریش ہوا تو کمرے میں سائیڈ ٹیبل پر چائے رکھی ہوئی تھی۔ میں نے چائے کا سپ لیتے ہوئے ششما کو فون کر دیا۔ کچھ دیر بیل جاتی رہی، پھر اس نے میری کال کاٹ دی گئی۔ میں اس کی طرف سے کال کا انتظار کرتے ہوئے چائے پینے لگا۔ میں بے چین ہو گیا تھا۔ اگر وہ دونوں غائب ہو گئیں تو مجھے نئے سرے سے اپنا کام شروع کرنا پڑے گا۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ششما کا میسج آ گیا۔ ”ہم رستے میں ہیں، واپس آ رہے ہیں۔“

میرے پاس ان کے انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں اٹھ کر پھر کاریڈور میں چلا گیا۔ مجھے وہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی، یہاں تک کہ شام ڈھل گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ جودھ پور اتنا بڑا شہر

ہے کہ اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے میں اتنی دیر لگتی ہے۔شام کے سائے پھیل گئے تھے کہ پورچ میں فوروہیل رُکی۔میں اٹھ کر اندر راہداری میں چلتا ہوا لاؤنج میں آیا تو جسوندر، ششما اور رتنا کے ساتھ ایک لڑکی کھڑی تھی۔اس نے تنگ سی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ اس پر منی اسکرٹ تھی۔اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ہونٹوں پر بڑے سلیقے سے لپ اسٹک لگی ہوئی تھی۔بلاشبہ وہ ایک ایسی حسین لڑکی تھی جس کا حسن پہلی نگاہ ہی میں مرد کو گھائل کر دے۔وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری جانب دیکھے چلی جارہی تھی۔

''مجھے پوجا کہہ سکتے ہو تم۔'' اس نے صاف انگریزی میں کہتے ہوئے میری جانب ہاتھ بڑھا دیا۔میں نے اس کا سفید مرمریں ہاتھ تھاما اور پھر ہلکا سا دبا کر چھوڑ دیا۔

''ہمیں دو کام تھے، ایک تو اس پوجا کو لینا تھا، دوسرا ہمارا سامان، جس کے بغیر ہم ادھوری ہیں۔'' رتنا نے میرے قریب آ کر کہا۔

''مجھے بتا کر جاتی تو میں پریشان نہ ہوتا۔'' میں نے دھیمے سے کہا۔

''اب کوئی پریشانی نہیں رہے گی، اس پوجا کی باتیں ساری پریشانی دور کر دیں گی۔'' ششما نے میرے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دی۔اس کی خوشی دیکھ کر مجھے لگا کہ وہ کافی حد تک اعتماد میں آ گئیں ہیں۔کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور اس پوجا میں۔وہ تینوں بڑا سارا کارٹن اٹھائے اندر چلی گئیں اور میں جسوندر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ہمارے درمیان شہر کے حالات بارے باتیں ہوتی رہیں۔اس نے بتایا کہ وکرم اور کانتی کی لاشیں پولیس نے تلاش کر لی ہیں اور اس کے بعد شہر میں کافی پکڑ دھکڑ ہوئی ہے۔وہ اور اس کے لوگ پوری طرح دیکھ رہے ہیں کہ کون لوگ ہیں جو اس میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔انہی کو نگاہوں میں رکھا جائے گا۔لازمی بات ہے انہی میں سے کوئی کلیان جی کا کارندہ ہوگا۔وہ کچھ دیر تک

بیٹھا رہا پھر ڈنر کے بعد وہ چلا گیا میں اپنے کمرے میں جا پہنچا۔ جسوندر کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ معاملات ویسے نہیں ہیں، جیسے میں سوچ چکا تھا۔

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا جب ششما نے کمرے میں آ کر کہا۔

"کمرے ہی میں پڑے رہو گے، باہر آؤ، بہت اچھا موسم ہے۔"

"چلو۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو ہم اکٹھے ہی باہر نکل گئے۔ ہم عقبی حصے میں آئے تو ہلکے ہلکے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ ہم اس طرف بڑھتے چلے گئے۔ ایک لان پار کرنے کے بعد سامنے سوئمنگ پول آ گیا۔ وہاں ملگجی روشنی تھی۔ رتنا اور پوجا سوئمنگ پول میں تھیں۔ دونوں نے بکنی پہنی ہوئی تھی۔ دھیمی روشنی میں ان کا سفید بدن دمک رہا تھا۔ صورت حال ہلچل مچا دینے والی تھی۔

"آ جاؤ دونوں۔" رتنا نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔

"نہیں، میرا من نہیں چاہ رہا۔" ششما نے کہا۔

"او تم آ جاؤ......" پوجا نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ہم یہاں بیٹھیں گے۔" میں نے کہا اور قریب پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مجھے لگا پوجا کو کوئی پہنچی ہوئی شے ہے جو اس قدر بولڈ ہے۔ یہ تو اس وقت ہی پتہ چلے گا جب اس کی پرتیں کھلیں گئیں۔ ہمارے بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد وہ دونوں گاؤن پہنے آ گئیں۔ وہ آ کر ہمارے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھ گئیں تو میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"یہی بکنی اور گاؤن لینے شہر گئی تھی تم دونوں۔"

"ارے نہیں یہ تو یہیں پڑے مل گئے۔ سوچا سوئمنگ کر لیں۔" رتنا نے ہنستے ہوئے کہا تو پوجا بولی۔

"لیکن ہم تو اپنی چیزیں اپنے ساتھ لائے ہیں، ششما کہاں ہے؟"
"یہاں تھوڑی لاؤں گی، اندر ہی پڑا ہے۔" اس نے کہا۔
"چل پھر وہیں چلتے ہیں۔" اس نے کہا اور اٹھ گئی۔ وہ دونوں بھی بڑی سعادت مندی سے اٹھ کر اس کے ساتھ چل دی۔ ظاہر ہے مجھے بھی اٹھنا پڑا۔ میں حیران تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ دونوں ہی پوجا کی خوشنودی کیوں چاہ رہی ہیں۔ وہ ایسی کیا شے ہے؟
کمرے میں بیڈ پر پینے کا سامان سجا ہوا تھا۔ جب تک رتنا اور پوجا کپڑے تبدیل کر کے آئیں ششما نے بوتل لا کر درمیان میں دھر دی۔ ان کے بیٹھنے تک ششما نے گلاس سیدھے کیے تو میں نے ایک گلاس کم کر دیا۔
"ارے تم پیتے نہیں ہو؟" پوجا نے پوچھا۔
"نہیں، میں نہیں پیتا۔" میں نے سکون سے کہا۔
"او ظالم پھر جیتے کیسے ہو؟" اس نے ایک ادا سے کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"تم جیسی حسیناؤں سے فلرٹ کر کے۔"
"ارے واہ، مزہ آ گیا، اگر تم کہتے نا عشق کر کے تو ذرا مزہ نہیں آنا تھا۔ لا ششما، موڈ بنائیں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاس لیا اور ایک ہی جرعے میں گلاس خالی کر دیا۔ تبھی ششما نے اس کا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔
"پوجا میری بڑی گہری سہیلی ہے، آج صبح مجھے اس کا خیال آیا تو میں نے اسے کال کر لی یہ سات گھنٹے کا سفر کر کے یہاں پہنچی ہے۔"
"ششما نے پوجا کو اس لیے بلایا ہے کہ تم سے ملاقات ہو سکے اور کچھ ایسی باتیں ہیں، جو اس سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ خاص طور پر یہ کلیان جی والے معاملے میں۔" رتنا نے گہری

سنجیدگی سے کہتے ہوئے گلاس سے بڑا سا راسپ لے لیا۔ مجھے فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا پوچھنا ہے، اس لئے میں نے کہا۔

"مطلب کیسی باتیں۔"

"ارے یار......" پوجا نے سر مارتے ہوئے کہا پھر لمحہ بھر بعد بولی، "ہمیں کون سا جلدی ہے، جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔"

"چلو تم وہ بات بتاؤ، وہ راکیش ورما والی۔"

"ہاں وہ۔" اس نے یوں کہا، جیسے اسے یاد آ گیا ہو۔ اس نے دوسرا گلاس خالی کیا اور پھر کہتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

پوجا اپنی دنیا میں مست تھی۔ اس کے جہاں اور بہت سارے شوق تھے، وہاں ایک جنون کرکٹ بھی تھا۔ اسے کرکٹ دیکھنے کا کریز تو تھا ہی اس کے ساتھ وہ کرکٹ پر جوا بھی کھیلتی تھی۔ وہ اس دنیا میں اکیلی نہیں تھی، کچھ ایسے لوگ تھے جو مل کر معلومات کا تبادلہ کرتے اور پھر پیسہ لگاتے۔ اس شوق میں اس نے اپنے گروپ کے ساتھ مل کر بہت کمایا تھا۔ چونکہ وہ ذہین تھی اور سوشل میڈیا کو استعمال کرنا جانتی تھی۔ وہ سوشل میڈیا سے ہی کرکٹ کی معلومات لیتی اور اس طرح وہ سوشل میڈیا کے کئی گروپس میں شامل تھی جہاں کرکٹ کے بارے میں باتیں ہوتی، اسے وہاں سے بہت ساری ٹپس مل جاتیں جو اسے کرکٹ جوا کھیلنے میں مدد دیتی تھیں۔ یہ سلسلہ کافی عرصے سے چل رہا تھا۔

ایسے ہی ایک دن کرکٹ کے شوقین لوگوں کے ایک گروپ میں اس نے دیکھا کہ راکیش ورما نام کا ایک شخص بہت ایکٹو ہے۔ وہ کرکٹ بارے بات تو کرتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ

لڑکیوں پر لائن مارنے کی کوشش بھی ضرور کرتا تھا۔ پوجا کئی دن تک اسے دیکھتی رہی، وہ اس پر بھی لائن مارنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک دن پوجا کو نجانے کیا سوجھی، اس نے راکیش ورما کے بارے میں جاننا شروع کر دیا۔ اسے لگا کہ اسی نام کا ایک شخص بھارت کا سیاست دان ہے اور حکومت میں ایک وزیر کے عہدے پر ہے۔ تبھی سے وہ اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔ اسے تجسس تھا کہ کیا یہ وہی سیاست دان ہے یا پھر اس کا کوئی ہم نام؟

چند ماہ اسی میں گزر گئے۔ راکیش ورما اس کی کرکٹ کی معلومات سے بہت متاثر تھا۔ گروپ میں پوسٹ لگانے کے علاوہ وہ اس کے ساتھ ان بکس میں بھی باتیں کرنے لگا۔ تھوڑے ہی عرصے میں بات کرکٹ سے ہٹ کر ذاتیات پر آ گئی۔ دوسری جانب راکیش ورما کسی طرح یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ وہ واقعی ہی کوئی لڑکی ہے یا اس کے پیچھے کوئی لڑکا بیٹھا ہوا ہے۔ پوجا اسی تجسس کو بڑھائے چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اکتاہٹ کا شکار ہو گیا۔ تب ایک دن پوجا نے بڑے اصرار پر اس سے ویڈیو کال کر لی۔

اس ویڈیو کال میں اس نے خود کو ایک عام سی کالج کی لڑکی ظاہر کیا جو صرف اور صرف کرکٹ کی دیوانی ہے۔ اس کے علاوہ اسے دنیا جہان کا کوئی پتہ نہیں۔ اس نے پلان کے تحت، جانے انجانے انداز میں ایسی معلومات دیں۔ جس سے کرکٹ جوا میں کافی مدد مل سکتی تھی۔ اسی معلومات کی بنیاد پر راکیش ورما نے بہت سارا پیسہ کما لیا تو وہ پوجا کا دیوانہ ہو گیا۔ یوں یہ تعلق بڑھتا چلا گیا۔ اس نے اپنے اس تعلق کے بارے میں اپنے خفیہ گروپ کو بتا دیا۔ ان میں سے ایک لڑکے نے یہ شک ظاہر کیا یہ ممکن ہے وہ کوئی دوسرا ہو اور اس کا نام استعمال کر رہا ہو۔ اگر وہ واقعی حکومتی وزیر ہے تو ہمارے کام آ سکتا ہے۔ اسی بنیاد پر ایک دن پوجا نے یونہی اس سے پوچھ لیا۔

"تم وہی راکیش ورما ہو جو سیاست دان ہے یا اس کے ہم نام ہو؟"

"ارے پگلی، میں وہی سیاست دان ہوں اور وزیر بھی ہوں۔"

"اس کا کیا ثبوت ہے؟"

"آج کا اخبار دیکھ لو، اس میں میری تصویریں شائع ہوئیں ہیں۔"

"یہ تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے۔ ممکن ہے تمہاری شکل اس سے ملتی ہو اور تم اس کا فائدہ اٹھا کر......"

"تم کیسے یقین کر سکتی ہو؟"

"جو کل اخبار میں شائع ہونا ہے وہ مجھے آج بتا دو۔"

"ٹھیک ہے، کل جو اخبار میں آئے گا میں بتا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے دن بھر کی مصروفیات بتا دیں۔ پھر اگلے دن وہی سب شائع بھی ہوا۔

پوجا اور اس کے گروپ کو یقین ہو گیا کہ یہ وہی حکومتی وزیر ہے۔ یوں گروپ کی مرضی اور خواہش پر اس نے راکیش ورما کے ساتھ تعلق میں شدت پیدا کر لی۔ ان بکس میں رنگینیاں در آئیں۔ راکیش ورما اس پر کھل گیا کہ وہ اندر سے کیا ہے لیکن پوجا جان بوجھ کر اسے محبت کا رنگ دیئے جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ دوبئی میں کرکٹ ٹورنامنٹ کا سیزن شروع ہو گیا۔ راکیش ورما کا اصرار تھا کہ وہ بھی دوبئی چلے۔ وہاں دو چار دن رہ کر خوب عیاشی کریں گے۔ گروپ کے ہی ایک لڑکے نے پوجا کو تیار کر دیا کہ وہ جائے۔ وہ خود کو اکیلی مت سمجھے اس کے ساتھ بہت لوگ ہیں۔ پوجا کے ذہن میں بھی نہیں تھا وہ لڑکا اس سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ کرکٹ جوا میں بہت آگے تک پہنچ جانے والی ہے۔ اسی نے سارا بندوبست کیا اور ایک دن وہ بھی اس کے ساتھ ایئر پورٹ پر تھا۔ جہاز میں سفر کے دوران اس نے پوجا

کو سمجھایا کہ راکیش ورما کے ساتھ کس طرح ٹریٹ کرنا ہے۔

وہ دوبئی کے ایک مہنگے ہوٹل میں جا ٹھہری۔ اسی شام راکیش ورما بھی دوبئی پہنچ گیا۔ دونوں کی ملاقات کرکٹ میچ کے بعد ہوئی۔ رات گئے انہوں نے اسی ہوٹل میں ڈنر کیا جہاں راکیش ورما ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں پوجا کو پوری طرح تصدیق ہو گئی کہ وہ واقعی ہی ایک سیاست دان ہے۔ حکومت میں وزیر ہے اور اپنے علاقے کا ایک طاقتور شخص ہے۔ وہ رات خاصی رنگین گزری۔ صبح جب وہ اپنے ہوٹل جانے لگی تو راکیش ورما نے ڈالرز کی ایک گڈی اسے دیتے ہوئے کہا۔

"یہ رکھو، تمہارے کام آئیں گے۔"

پوجا نے اس گڈی کی جانب دیکھا اور پھر پوری قوت سے ایک تھپڑ راکیش ورما کے منہ پہ دے مارا۔ اس سے پہلے کہ راکیش ورما کہتا وہ روتے ہوئے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ توقع کے عین مطابق کچھ ہی دیر بعد راکیش ورما کا فون آنا شروع ہو گیا۔ اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ یہاں تک کہ سارا دن گزر گیا۔ اس نے فون بند کیا اور سو گئی تھی۔ اس شام وہ میچ دیکھنے اسٹیڈیم میں تھی۔ اس نے فون کھولا تو راکیش ورما کے نجانے کتنے میسج آئے ہوئے تھے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا، یہاں تک کہ میچ کے بعد وہ اپنے ہوٹل چلی گئی۔

اگلے دن صبح وہ اس کے ہوٹل آن پہنچا۔ دروازے پر آئے ہوئے کو منع نہیں کر سکتی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ رونے لگی۔

"بات کیا ہوئی کچھ بولو گی بھی تو سہی؟" راکیش ورما نے پوچھا۔

"مجھے افسوس ہوا، مجھے خود سے گھن آنے لگی ہے، تم نے مجھے ایک طوائف سمجھا۔ رات کی قیمت نوٹوں کی گڈی۔ میں خود کو بہت گھٹیا سمجھ رہی ہوں۔"

”میں نے تو......“ اس نے کہنا چاہا لیکن وہ پھٹ پڑی۔

”تم کیا سمجھتے ہو، میں یہاں پر صرف میچ دیکھنے آئی ہوں۔ میں تمہاری محبت میں یہاں تک آئی تھی۔ لیکن بہت بڑا دکھ لے کر جا رہی ہوں۔“

”نہیں پوجا، مجھے تم سے محبت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم شادی نہیں کر سکتے لیکن تم میرے دل میں بستی ہو۔“

”جھوٹ کہتے ہو تم، ڈالروں کی یہ گڈی دے کر مجھے میری قیمت دے رہے تھے یا ایک رات کا معاوضہ؟“

”ایسا نہیں ہے، میں تو اس لئے دے رہا تھا کہ تم شاپنگ کرو، اپنی پسند کا کوئی تحفہ خریدو۔“

”میں تو خود تمہارے لئے ایک تحفہ لے کر آئی تھی۔ مجھے تو اب وہ تحفہ بھی گھٹیا لگ رہا ہے۔ خیر، میں آج جا رہی ہوں واپس۔“

”نہیں۔ ایک رات مزید......“

”نہیں، پھر سہی، اگر مجھے لگا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو، ورنہ نہیں۔“

”او کے۔ جیسے تم چاہو۔“

”ٹھیک ہے تم مجھے خود ایئرپورٹ چھوڑ دو گے۔“

”میں چھوڑ کے آؤں گا۔“

ایسی باتوں کے بعد راکیش نے اسے منا لیا کہ وہ آئندہ تعلق ضرور رکھے گی۔ ضروری نہیں کہ دوبارہ ملاقات دوبئی ہی میں ہو۔ بھارت میں کسی جگہ ہو سکتی ہے۔ پوجا نے اپنا بیگ کھولا اور ایک قیمتی سیل فون اسے دیا، ایک ہیرا جڑی ٹائی پر لگانے والی پن دی۔

”یہ ہر وقت تمہارے پاس ہوں۔ میں تصویروں میں دیکھتی رہوں گی۔ جس دن میں نے

نہ دیکھے، میں سمجھوں گی تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔"

"میں اسے دل سے لگا کر رکھوں گا۔"

اسی شام پوجا واپس چل دی۔

بھارت واپسی کے ایک ہفتے بعد اس کے ساتھ گئے لڑکے سے اس کی ملاقات ہوئی، تب اس نے انکشاف کیا کہ جو چیزیں راکیش ورما کو دی گئی ہیں، وہ ایسے ٹرانسمیشن ڈیوائس ہیں جن سے اس کی ساری باتیں سنی جا سکتی ہیں۔ اس کی لوکیشن کو جب چاہئے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک خطرناک کھیل تھا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ تب پوجا ایک نئی دنیا میں داخل ہو گئی۔ وہ تھی جرم کی دنیا جہاں بلیک میلنگ سے لے کر قتل تک کیے جاتے تھے۔ وہ زیر زمین دنیا میں ڈی فالٹرز کے نام سے مشہور رہتے۔

راکیش ورما کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ مگر حکومتی سطح پہ ہونے والے فیصلوں اور معلومات سے فائدہ اٹھا لیتے تھے۔ وہ کوئی سیدھا سادھا سیاست دان نہیں تھا۔ اس کا تعلق بھی جرائم کی دنیا سے تھا۔ جس کے سہارے وہ حکومتی ایوانوں میں اپنی ساکھ بنائے ہوئے تھا۔

"میں تمہاری کہانی سچ مان لیتا ہوں لیکن اتنا بتا دو، پھر راکیش ورما کا کیا بنا، اسے مار دیا، بلیک میل کیا یا......" میں نے پوجا سے پوچھا جو تین پیگ پینے کے بعد جیسے ہوش میں آ گئی ہو۔ اس نے مزید پینے کے لئے ہاتھ بھی نہیں بڑھایا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کس طرح کی پینے والی ہے۔

"وہ اب بھی میرا دوست ہے۔" اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

"کیا وہ اتنا ہی بے وقوف اور گدھا ہے کہ اسے تیرے فون اور پن کی حقیقت کا پتہ نہیں چلا؟" میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"وہ میں نے ایک خاص وقت کے بعد واپس لے کر ان کی جگہ نئے دے دیئے تھے۔ وہ میری اس سے تیسری ملاقات تھی، یہیں ممبئی میں ہوئی تھی۔ اسے علم ہی نہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔" اس نے سکون سے کہا۔

"وہ کیوں......؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جو کام لینے تھے، لے لئے گئے تھے۔ مزید ہم پر ایک ایسا انکشاف ہوا تھا، جس سے مزید یہ کھیل جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔"

"ایسا کیا انکشاف تھا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"راکیش ورما اور اس جیسے چند لوگ کلیان جی نامی ایک تنظیم کے ساتھ تھے۔ سمجھو ہر بندہ ہی کلیان جی ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ ہم ان کے بارے میں جان گئے ہیں تو وہ ایک پھونک میں ہمیں اس دنیا ہی سے اُڑا دیتے۔ سو ہم پیچھے ہٹ گئے۔" اس نے بڑے آرام سے انکشاف کیا تو میں نے رتنا کی طرف دیکھا، باوجود نشے میں اس کی آنکھیں کھل گئیں تھیں۔ ششما نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ مجھے ایک بار لگا جیسے پوجا ہی کلیان جی کی طرف سے ہم تک آن پہنچی ہے۔

"اچھا ایک بات بتاؤ......" ششما نے پوچھنا چاہا تو پوجا بیڈ پر سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔

"چھوڑو باتوں کو، آ ادھر میرے پاس، ابھی آرام کرتے ہیں، کل ہوتی رہیں گی باتیں۔"

وہ نشے میں تھی۔ اس نے ششما کو اپنی بغل میں لیا اور بیڈ پر سیدھی ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگی۔ میں نے رتنا کو اشارہ کیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ میرے پاس آ گئی۔

"یہ تم کس مصیبت کو اٹھا لائی ہو، کہیں کلیان جی کو......"

”مجھے بھی یہ شک ہے۔“ اس نے مرتعش لہجے میں کہا۔

”پھر کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے اتنا تو پتہ ہے کہ یہ فائٹر نہیں ہے۔ لیکن میرا دل بھی یہی کہہ رہا کہ اسے پتہ ہی نہیں کہ ہمارا کچھ کلیان جی کے ساتھ چل رہا ہے۔ میں نے اس سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ بس مدد کے لئے بلایا ہے۔“

”سانپ چاہے رنگین اور خوبصورت نقش و نگار والا ہو، اسے پالا تو نہیں جا سکتا، اس کی فطرت تو ڈسنا ہے۔“ میں نے کہا تو رتنا سوچ میں پڑ گئی۔

”دیکھو، جو بھی ہونا ہوا، اس رات میں ہو جائے گا، کل میں اس کا کچھ کر لوں گی، بس آج رات مشکل ہے۔“

”چلو میں تمہاری مان لیتا ہوں، ہم جاگ کر یہ رات گزار لیں گے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ میرے سینے سے آ لگی۔ اس کا انداز ایسے تھا جیسے اس نے اپنا آپ میرے سپرد کر دیا ہو۔ میں ہولے ہولے اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔ میں اسے احساس دینا چاہ رہا تھا کہ میں ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں۔

وہ ایک کٹھن رات تھی جس کے سینے میں نجانے کیسی آفتیں چھپی ہوئی تھیں۔ میں اور رتنا ان آفتوں کے منتظر تھے۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اب پوجا سے کس طرح ڈیل کرنی ہے۔

☆......☆......☆

”سوری، رات پتہ نہیں میں کیا کیا باتیں کرتی رہی۔“ پوجا نے چائے کا مگ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”رات گئی بات گئی۔“ ششما نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس موضوع کو ٹالنے کے

لئے کہا مگر رتنا نے پوچھا۔
''لیکن پوجا، یہ تم نے بتایا ہی نہیں کہ اب بھی تمہارا تعلق راکیش ورما سے ہے یا نہیں۔''
''اب بھی ہے لیکن اب جیسے کئی رابطے میں آ گئے ہیں۔ تم اپنا کام بولو، جس کے لئے تم نے مجھے اتنی دور سے یہاں بلوایا ہے۔'' پوجا نے کہا۔ یہ بات ہونا بھی تھی۔ لیکن اسی لئے میرے دماغ میں یہ بات آ گئی کہ اگر رتنا نے خود اسے فون کر کے بلایا ہے تو شاید ابھی تک پوجا کو ہمارے بارے میں اور کلیان جی کے معاملے کی خبر نہ ہو؟ اور اگر اسے خبر ہے تو وہ کمال مہارت سے چھپائے ہمارے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہی ہے۔ ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد رتنا نے سوچتے ہوئے کہا۔
''پوجا ہم اس وقت سخت مشکل میں ہیں، تمہیں میں نے بتایا کہ ہمیں اغوا کر کے ہمارے ساتھ کیا کرنے کی کوشش کی گئی۔ آگے سوائے دشمنی کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ تم ہی بتاؤ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔''
''یہ کوئی اتنی مشکل بات نہیں ہے۔ ابھی میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ راکیش ورما جیسے کئی لوگ میرے رابطے میں ہیں۔ اب تم یہ سوچ کر مجھے بتاؤ کہ تم کیا کر سکتی ہو۔ یا پھر تمہیں کرنا کیا ہے، ویسا ہی ہو جائے گا۔''
''یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔'' رتنا نے تیزی سے کہا۔
''دیکھو، یہیں پاس ہی ایک شہر ہے دیوگڑھ...... وہاں پر ایک ایسا شخص موجود ہے، جو اس سارے علاقے پر راج کر رہا ہے۔ کہنے کو وہ بھی ایک سیاست دان ہے۔ لیکن وہ حکومت کا خاص آدمی ہے۔''
''لیکن میں......'' رتنا نے کہنا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔

"وہاں اس کے پاس تیرے جیسے کمپیوٹر پر کام کرنے والے کچھ ماہر لوگ ہیں۔ میں بھی ان کے لئے کام کرتی ہوں۔ ہم سب مل کر ذہنوں سے کھیلنے کا کام کرتے ہیں۔ میں جہاں مرضی رہوں، چاہئے کسی دوسرے ملک بھی پھرتی رہوں، میرا ان کے ساتھ کام جاری رہتا ہے۔ اگر تم وہاں رہ کر کام کرنا چاہو تو وہیں رہو، یا کسی بھی شہر میں چلے جاؤ، وہاں سکون سے کام کرتی رہو۔ تمہیں پورا تحفظ ملے گا۔" پوجا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا او ونگ سے ایک بڑا سا راسپ لے لیا۔ اس دوران میرے دماغ میں بہت سارے سوال جنم لے چکے تھے، میں نے خود پر قابو رکھا۔ تبھی میں نے کہا۔

"میں تو ان دونوں کی طرح نہیں ہوں۔ میں کچھ نہیں جانتا، میرے جیسے بندے کا اس کے پاس کوئی......"

"ارے یار، جس طرح مجھے شَشما نے تیرے بارے میں بتایا ہے، تجھے تو وہ سر آنکھوں پہ بٹھائیں گے۔ ان کا پورا ایک نیٹ ورک ہے، حکومت انہیں پوری طرح سپورٹ کرتی ہے۔ میں نے کہا نا وہ حکومت کا خاص آدمی ہے، اس لئے کہ وہ حکومت کی خفیہ ایجنسی کے لئے پوری طرح کام کر رہا ہے۔ ایجنسی کا اس پر اتنا اعتماد ہے کہ دشمن ملک سے پکڑے ہوئے لوگ بھی اس کے پاس رکھ چھوڑتے ہیں۔ وہاں تربیت دی جاتی ہے......" میں اس سے زیادہ کچھ نہیں سن سکا۔ میرے اندر ہلچل مچ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے ہدف کے بالکل قریب پہنچ چکا ہوں۔ جس مقصد کے لئے میں نے سفر شروع کیا تھا، وہ میرے سامنے تھوڑے سے فاصلے پہ موجود تھا۔ میں نے پوجا کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کر لیا۔

✿......✿......✿

(قسط نمبر:5)

اس وقت پوجا مجھے ایک ایسے رنگین سانپ کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ جو دیکھنے میں تو بڑا خوبصورت اور پر کشش ہوتا ہے لیکن جس کا زہر انتہائی تیزی سے اثر کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کنڈلی مارے بیٹھی ہوئی ہو۔ پوجا انہیں سنہرے خواب دکھا کر یوں حصار میں لے چکی تھی کہ وہ کسی بھی طرح نکل نہ پائیں۔ وہ کسی بھی وقت اپنا پھن پھیلا کر ڈس لے گی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ دونوں نے خود اپنی موت کو آواز دے لی تھی۔ مجھے لگا کلیان جی نے جو ایک ہفتے کا وقت دیا تھا، وہ بہت زیادہ تھا۔ دونوں ایک ہی دن میں ان کے جال میں آ گئیں تھیں۔

"لیکن وہ ہم پر کیسے اعتماد کر لیں گے؟" رتنا نے شک بھری مزاحمت کرتے ہوئے کہا تو پوجا نے ایک بڑا سا کش لیا پھر اسے نگل کر بولی۔

"کون کہتا ہے کہ وہ تم پر فوراً اعتماد کر لیں گے۔ اس دنیا میں کوئی بھی کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔ ہاں مگر اپنے کام سے ثابت کیا جاتا ہے۔"

"لیکن پوجا، میں خون خرابے میں نہیں پڑنا چاہتی، میرا مقصد صرف پیسہ بنانا ہے اور بس۔" رتنا نے حتمی لہجے میں کہا۔

"پھر تو کوئی مشکل نہیں، بلکہ یہ زیادہ اچھا ہے۔ ساری دنیا سے چھپ کر صرف میرے ساتھ کام کرو۔ جہاں مرضی رہو، مجھے بھی نہ بتاؤ کہ تم کہاں ہو، یہ اپنے کمپیوٹر وغیرہ ادھر رکھو اور شروع ہو جاؤ، اس میں اتنا تردد کیسا، کیا تم پہلے ایسے کام نہیں کر چکی ہو؟" پوجا نے سکون

بھرے لہجے میں اعتماد سے کہا۔

''میں آزاد پھر بھی نہیں رہ پاؤں گی، یہ جود شمنی......'' رتنا نے تیزی سے کہا۔

''کچھ عرصہ غائب رہو گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ، فکر نہ کرو۔'' پوجا نے لاپرواہی سے کہا اور مگ سے باقی چائے حلق میں انڈیل کر مگ ایک جانب رکھ دیا۔ پھر میری جانب دیکھ کر بولی، ''اور تم دیر سنگھ، کچھ بھی مت کرنا، بس میری سہیلیوں کا دل بہلاتے رہنا، سمجھو تمہاری بھی زندگی عیش میں گزرنے والی ہے۔''

''بڑی مہربانی، لیکن ان سے تو پوچھ لو، یہ مجھے اپنے ساتھ رکھیں گی بھی یا نہیں؟'' میں نے یوں کہا جیسے میں ایسی ہی کوئی سوچ پہلے ہی سے سوچ کر بیٹھا ہوا ہوں۔ اس پر رتنا نے میری جانب مسکرا کر دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس دی پھر بڑے مخمور لہجے میں بولی۔

''تیرے جیسے کو تو میں سنوار کر رکھوں گی۔''

''چل پھر بس ڈن ہو گیا۔ ہم آج ہی پونا کے لئے نکلتے ہیں، تیاری کرو۔'' پوجا نے کہا اور صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔

''ڈن ہو گیا۔'' ششما نے کہا اور اٹھ گئی۔

میں بھی ان کے پاس سے اٹھ کر عقبی حصے میں آ گیا۔ میں وہاں اس طرح بیٹھا تھا کہ کسی طرف سے بھی کوئی آ جائے تو میں دور سے دیکھ لوں۔ میں چند لمحے بیٹھا سوچتا رہا پھر میں نے فیصلہ کرتے ہوئے خوشگوار مردانہ آواز کو کال کر دی۔ ذرا سی دیر میں اس نے کال رسیو کر لی۔ میں نے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے اپنا شک ظاہر کیا تو وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

''یہ تو بہت خطرناک صورت حال ہو سکتی ہے؟''

"میرا گمان تو یہی کہہ رہا ہے۔" میں نے کہا تو سنجیدگی سے بولا۔

"تو پھر کیا ارادہ ہے؟" اس نے پوچھا تو میں اپنی سوچ کے بارے میں اسے بتانے لگا۔ اس صورت حال کو سمجھنے اور نکلنے کے لئے جو میرے ذہن میں تھا اس سے کہتا چلا گیا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے میری ساری بات غور سے سنی۔ پھر وہ سمجھ گیا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ میں مطمئن ہو کر اس معاملے پر مزید سوچنے لگا۔

اچانک میری نگاہ پوجا پر پڑی، وہ راہداری میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ وہ میرے پاس یوں آ کر کھڑی ہو گئی جیسے وہ آگے بڑھنا چاہ رہی ہو لیکن یونہی میرے پاس رک گئی ہو۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں فون پکڑا ہوا تھا۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"یہاں الگ سے کیوں آ کر بیٹھ گئے ہو؟"

"تنہائی میں بندہ کیوں بیٹھتا ہے؟" میں نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا تو اس نے خوشگوار حیرت سے میری جانب دیکھا پھر پوچھا۔

"اوہو، بات کیا ہے؟"

"بات تو نہیں ایک خواہش ہے لیکن پتہ نہیں تم سے کہنی بھی چاہئے یا نہیں۔" میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہہ دو یار، ہم سے کیا پردہ۔" اس نے اپنے لب مخصوص انداز میں دباتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

"لیکن اگر تم برا نہ مانو تو......؟" میں نے تجسس پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں برا نہیں مانوں گی، جو دل میں ہے کہہ دو۔" اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا تو میں

نے چند لمحے رک کر کہا۔ "خواہش یہ ہے کہ میں کچھ وقت بھرپور انداز میں تمہارے ساتھ تنہائی میں گزارنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ، ایسا کیوں......؟" اس بار اس نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتہ پہلی نگاہ میں محبت ہوتی ہے یا نہیں، لیکن کل جب میں نے تمہیں دیکھا تو سمجھو تمہارے سامنے دل ہار گیا ہوں۔ رات سوئمنگ پول پر کسی چکنی مچھلی کی مانند تمہارا بدن میری نگاہوں ہی سے نہیں ہٹ سکا۔ میں تمہارا دیوانہ ہو رہا ہوں۔" میں نے یوں کہا جیسے میں اپنے آپ ہی میں نہ رہا ہوں۔ وہ آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا تم سمجھ رہے ہو کہ تم کتنی بڑی بات کہہ رہے ہو؟"

"ہاں، میں نے اپنی خواہش بتائی ہے، پوری کرنے یا نہ کرنے کا اختیار تمہارے پاس ہے۔ میں جانتا ہوں، میں کوئی بہت بڑا آدمی نہیں، رائیش ورما نہیں، عام سا بندہ ہوں، پر خواہش تو کر سکتا ہوں۔" میں نے تشنہ لب لہجے میں کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر میرے پیچھے آ کر اپنا ایک ہاتھ میرے سینے پر رکھ دیا۔ پھر میرا سینہ سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"اتنی شدت سے میری خواہش ہے؟"

"ہاں، اتنی شدت شاید اس کا اندازہ تم نہ کر پاؤ۔" میں نے خمار بھرے لہجے میں کہا۔

"عورت جو ہوتی ہے نا مرد کی آنکھ میں شدت بھی پڑھ لیتی ہے۔ میں تمہیں تنہائی میں وقت دے دوں تو یہ دونوں برا مان جائیں گی۔" اس نے ایک نئے طرح سے مجھے پرکھنا چاہا اور میرے سینے پر سے ہاتھ ہٹا کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ تب میں نے کھڑا ہوتے ہوئے اکتاہٹ سے کہا۔

"میں ان سے اُکتا گیا ہوں، دونوں سے کھیلنا بہت مشکل ہے۔"

وہ بالکل میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خمار آگیا تھا۔ یہ فطرتی بات ہے کہ جیسے عادی شراب پینے والے کے سامنے جام آجائے تو اس کا بدن ٹوٹنے لگتا ہے، ایسا ہی حال پوجا کا بھی تھا۔ میرا اور اس کا فاصلہ بالشت بھر کا تھا۔ دونوں کے درمیان اعصابی تناؤ ٹھہرا ہوا تھا۔ تبھی اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے جو میری چاہت کی ہے، میں اس کی قدر کرتی ہوں، کیا ایک بار چاہنے سے تمہاری تشنگی ختم ہو جائے گی؟''

''میں نہیں جانتا، کب اور کس وقت حالات بدل جائیں۔ بس جو وقت ہاتھ میں ہے، وہی اپنا ہے۔ ہاں اگر تم چاہو تو یہ تعلق طویل بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے مبہم سی بات کر دی۔

وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی۔ پھر اپنا ہاتھ میری گال پر لا کر ہلکے ہلکے میری گردن تک لے آئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کافی حد تک پگھل گئی ہے۔ میں نے اس کی کمر پر ہاتھ ڈال دیا تو میرے ساتھ لگ گئی۔ اس کا گداز بدن اور گرم سانسیں میری گردن ہی کو نہیں مجھے بھی گرما رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ ہم بے خودی میں چلے جاتے، اس نے میرے سے خود کو الگ ہوتے ہوئے کہا۔

''ابھی کچھ دیر ٹھہرو، میرے خیال میں رتنا اور شتما برداشت نہیں کر پائیں گی۔''

''وہ تو نہیں...... لیکن پھر......'' میں نے مضطرب انداز میں یوں کہا جیسے مجھے شدید غصہ آگیا ہو۔ لیکن میں جو جاننا چاہ رہا تھا، اس کی مجھے سمجھ آگئی تھی۔

''یہ اب تمہارا کام ہے کہ تم انہیں کس طرح مطمئن کرتے ہو۔'' اس نے بڑی سادگی سے کہا اور بے دم سی ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اوکے، اب ان سے اجازت لینا ہو گی۔'' میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا اور کرسی

پر بیٹھ گیا۔ میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں مایوس ہو گیا ہوں۔ پتہ نہیں پوجا کے دل میں اس وقت کیا تھا کیونکہ اس کے چہرے پر کسی بھی طرح کے جذبات نہیں تھے۔ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

"میں کرتی ہوں کچھ، مگر تھوڑا صبر کرو۔"

"کیا کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ تو کروں گی نا لیکن......" اس نے مسکراتے ہوئے ادھورا فقرہ کہا اور میرے لئے تجسس چھوڑ دیا۔ تبھی میں نے پوچھا۔

"لیکن کیا......؟"

"میں جو کہوں گی وہی کرنا ہوگا، اگر منظور ہے تو......" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے ایک دو لمحے سوچا اور اس کا سفید ہاتھ تھام لیا۔ اس نے میرا ہاتھ دبایا، لبوں پہ مسکراہٹ لا کر میری جانب دیکھا، پھر میرا ہاتھ چھوڑا اور پھیل کر بیٹھ گئی۔ اس کا انداز مجھے لبھانے والا تھا۔ وہ مجھے مزید دیوانہ بنا دینا چاہ رہی تھی اور میں دیوانہ بن جانا چاہ رہا تھا۔ میرا انداز ہی ایسا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھی، میرا ہاتھ پکڑا اور اندر کی جانب چل دی۔ ہم لاؤنج میں آ گئے۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور وہ اپنے فون میں کھو گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد سر اٹھاتے ہوئے رتنا سے بولی۔

"تیاری کر لی ہے تم دونوں نے؟"

"سمجھو ہو گئی۔" اس نے کہا۔

"سمجھو ہو گئی مطلب؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"سب سامان تو اکٹھا کر لیا ہے میں نے لیکن یہاں سے جانا کیسے ہے، یہ سمجھ میں نہیں

آ رہا۔ وہ میرے جاننے والے کا فون بند جا رہا ہے؟" رتنا نے پریشانی میں کہا تو پوجا لاپرواہی کے انداز میں بولی۔

"چلو کوئی بات نہیں تھوڑی دیر بعد کھل جائے گا، پھر چل دیں گے۔"

اس نے کہا ہی تھا کہ ایک ہائی ایس وین پورچ میں آرکی۔ میرے سمیت رتنا اور ششما نے چونک کر وین کو دیکھا۔ تبھی ششما کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"یہ کون ہے؟ کس کی وین......"

ہمیں حیران ہونے کے لئے زیادہ وقت نہیں ملا، چند لوگ تیزی سے اترے، انہوں نے ہاتھوں میں پسٹل پکڑے ہوئے تھے۔ وہ انتہائی سرعت کے ساتھ لاؤنج میں آ گئے۔ میں صوفے سے اٹھ کر اندر بھی نہیں جا سکا تھا۔ پہلے کے بعد دیگرے دو لوگ اندر داخل ہوئے، پھر جیسے ہی ان کے پیچھے دو مزید آئے تو چاروں نے ہم پر پسٹل تان لئے۔ تبھی ان میں سے ایک بولا۔

"چپ چاپ ہمارے ساتھ چلو، جس نے بھی انکار کیا وہ زندہ نہیں رہے گا۔"

"کون ہو تم لوگ......؟" میں نے سخت انداز میں کہا۔

"پھول بیچنے والے تو نہیں ہیں ہم۔" اسی نے طنزیہ انداز میں کہہ کر وہی کوڈ دہرا دیا، جو میرے اور خوشگوار مردانہ آواز کے درمیان طے ہوا تھا۔

"باتیں مت کرو چلو، نہیں تو......" اس کے پیچھے کھڑے ایک لڑکے نے کہا اور آگے بڑھ کر اس نے رتنا کو پکڑ کر دھکا دے دیا۔ دوسرا ششما کی جانب بڑھا، اس نے اس کی کنپٹی پر پسٹل رکھا اور اسے باہر لے جانے لگا۔ ایک لڑکا میری جانب آیا تو میں نے اسے روکتے ہوئے باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

”میم آپ چلیں۔“ ایک لڑکے نے بڑے احترام سے کہا۔

”مجھے ان کے ساتھ نہیں جانا، الگ سے گاڑی لائے ہو۔“ پوجا نے نخوت سے کہا تو رتنا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔ یہی حال شِشما کا تھا۔ تبھی اس لڑکے نے کہا۔

”وہ راستے میں ہمیں مل جائے گی فکر نہ کریں، آپ چلیں۔“

”چلو پھر۔“ پوجا نے ہم سب پر نفرت بھری نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔ انہوں نے ہمیں وین میں بٹھایا اور پسٹل لے کر ہم پر مسلط ہو گئے۔ پوجا بڑے سکون سے ان کے درمیان میں بیٹھ چکی تھی۔ تبھی وین چل دی۔

”پوجا، یہ تم نے اچھا نہیں کیا؟“ رتنا نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

”تمہیں کس نے کہا تھا مجھے بلاؤ۔ میں کسی کے ساتھ دشمنی نہیں لے سکتی، ہاں اب تم دونوں کو دے کر کچھ پیسہ کما لوں گی۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”میں اس سے بھی زیادہ دے دیتی۔“ رتنا نے نفرت سے کہا۔

”مگر میں دشمنی افورڈ نہیں کر سکتی.......سوری۔“ اس نے کہا تو سامنے دیکھنے لگی۔ وین تیزی سے بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ روشن دن میں، باہر کی دنیا کو بالکل بھی پتہ نہیں تھا کہ کوئی اغوا ہو کر جا رہے ہیں۔ کچھ دیر تک تیزی سے چلتے رہنے کے بعد پوجا نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

”ابھی تک گاڑی نہیں آئی؟“

”میم کورٹ روڈ پر چڑھتے ہی جو پہلا فلنگ اسٹیشن آئے گا، وہاں موجود ہے گاڑی، بس پانچ منٹ۔“ اسی لڑکے نے کہا اور پھر اس نے میری جانب دیکھا، میں سمجھ گیا تھا مزید پانچ منٹ ہیں۔ پوجا کا چہرہ سامنے کی طرف تھا۔ میں نے ساتھ بیٹھے ہوئے لڑکے سے پسٹل لیا تو جو اس نے مجھے آرام سے دے دیا، میں نے اسے نال سے پکڑا اور دستہ پوجا کے سر پر

دے مارا۔شاید اسے حیران ہونے کا بھی موقع نہیں ملا ہوگا، اس لئے اس نے آواز بھی نہیں نکالی اور ایک جانب لڑھک گئی۔

رتنا اور ششما میری جانب حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔میں نے انہیں زیادہ حیران نہیں ہونے دیا اس لئے میں نے تحمّی سے کہا۔

"یہ ہے تمہارے دوست پوجا......" وہ دونوں حیرت سے میری طرف دیکھتی رہی تھیں۔ ان کی زبان پر ایک بھی لفظ نہیں آیا تھا۔چند لمحوں بعد میں نے کہا،" کیا تم دونوں اس وقت جسوندر سنگھ یا کسی بھی محفوظ جگہ جاسکتی ہو؟"

"جا تو سکتی ہیں،لیکن......" رتنا نے تشویش زدہ لہجے میں کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی تو میں نے تیزی سے کہا۔

"تو جاؤ،میں کچھ دیر بعد فون پر رابطہ کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

فلنگ اسٹیشن پر ایک گاڑی کھڑی تھی۔میں نے پوجا کا فون ایک لڑکے کو دے دیا تو وہ لڑکا وہاں اتر گیا۔وہ دونوں بھی وہیں اتر گئیں۔کچھ دیر بعد ہم آگے بڑھ گئے۔مجھے لگا کہ میں ایک حصار سے نکل آیا ہوں۔

☆......☆......☆

وہ شہر کے مغربی علاقے میں ایک کالونی تھی۔دن ہونے کے باوجود کوئی چہل پہل نہیں تھی،ممکن ہے وہاں کے لوگ کام پر نکل جاتے ہوں اور کالونی سونے پن کا منظر پیش کر رہی ہو۔کالونی کے اندر ایک کارنر والا دو منزلہ بڑا سا گھر تھا۔وین اس کے پورچ میں جا رکی۔ داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔پوجا ابھی تک بے ہوش تھی۔میں نے اسے ہوش میں لانا مناسب

نہیں سمجھا۔ میں نے لڑکوں کو اشارہ کیا کہ اسے اٹھائیں اور اسی طرح اندر لے چلیں۔ وین سے داخلی دروازے تک چند سیکنڈ میں اسے لے جایا گیا اور پھر لاؤنج میں جاتے ہی ایک لڑکے نے کہا۔

"پیچھے ایک الگ تھلگ کمرہ ہے، اگر اسے......"

"ہاں ادھر ہی لے چلو۔" میں نے کہا اور ہم بھی اسی لاؤنج میں موجود راستے سے اس کمرے تک لے گئے۔ وہاں قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی سی فریج بھی پڑی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ کمرہ شاید اسی مقصد کے لئے استعمال ہوتا ہو۔ رتا اور شاچلی گئیں اور وہ لڑکے وہیں باہر رہ گئے۔ میں نے فریج کھول کر دیکھا اس میں پانی پڑا تھا۔ میں نے پانی کے چھینٹے پوجا کے چہرے پر مارے تو وہ کسمسا کر اٹھ گئی۔ اس نے حیرت سے ارد گرد دیکھا پھر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ سب سمجھ گئی۔ تبھی اس نے سرسراتے ہوئے پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

"میرے دل کے پاس۔ تمہیں تنہائی چاہئے تھی نا تو میں تمہیں یہاں لے آیا ہوں۔" میں نے صدقے واری ہو جانے والے انداز میں کہا۔

"اوہ...... مطلب یہ لوگ تم نے بلائے تھے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، تم کیا سمجھتی ہو؟ تیری چاہت مجھے ایسا بھی نہ کرنے دیتی؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ سمجھ گئی تبھی اس نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ دونوں......؟"

"وہ تو اڑن چھو ہو گئیں۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"مم...... میں...... سمجھی نہیں۔" اس نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"یار وہ بھاگ گئی ہیں۔ اس وقت تو وہ شہر سے بھی نکل گئی ہوں گی۔" میں نے اکتاہٹ بھرے انداز میں اسے بتایا تو وہ یوں پیچھے ہٹی جسے ابھی بے ہوش ہو جائے گی۔ میں اسے پکڑنے کے لئے آگے جھکا ہی تھا کہ وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی اور دونوں ہاتھیں میری گردن میں ڈال دیں۔ میں نے لاشعوری طور پر اسے خود سے الگ کر کے دیوار کی جانب پھینکا۔ مگر وہ مجھ سے یوں چمٹ گئی تھی جیسے آکٹوپس جکڑ لیتا ہے۔ وہ میری گردن پر دباؤ ڈال کر مجھے بے بس کر دینا چاہ رہی تھی، میرا سانس بند ہونے لگا تھا۔ میرے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے اس کی پسلیوں میں اپنی کہنیاں ماریں مگر اس نے دباؤ مزید بڑھا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے مجھے چھوڑ دیا تو یہ اس کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی، اس لئے پوری جان لڑا رہی تھی۔ میں قالین پر گر گیا تھا۔ وہ اپنا سارا وزن مجھ پر ڈال کر میری سانس بند کرنے کی کوشش میں تھی۔

وہ مجھے پوری طرح دبا کر ایک ہاتھ سے میرا بدن ٹٹولنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پسٹل تلاش کر رہی ہے۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ میری دائیں جانب پینٹ میں اڑسے ہوئے پسٹل پر لگا، وہ پسٹل نکالنے کی کوشش میں لگ گئی۔ اب میں اسے زیادہ موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے پوری قوت سے اپنے بدن کو لہرایا تو اس کی گرفت کمزور ہو گئی۔ میں نے جھٹکا دیا تو وہ الگ ہو گئی۔ شاید اسے اپنی شکست کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ پھر سے مجھ پر جھپٹ پڑی۔ اس نے اپنے ناخن میری گردن میں گاڑنا چاہے تو میں نے پوری قوت سے اس کے سر میں ٹکر ماری۔ وہ لمحہ بھر کے لئے بدحواس ہو گئی، مجھے اتنا ہی وقت چاہئے تھا۔ میں نے اسے پرے دھکیل دیا۔ وہ گرتے ہی اسپرنگ کی مانند اچھلی اور پھر سے مجھے جکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اب میں اسے کوئی موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ وہ لڑنے کا فن نہیں جانتی۔ وہ بس اپنی بقا

کے لئے یوں لڑ رہی تھی جیسے خطرے کے وقت بلی گلے پڑ جاتی ہے۔ وہ جیسے ہی مجھ پر حاوی ہونے کے لئے میری جانب آئی، میں نے ذرا سی جھکائی دی اور اس کی گردن میں بازو ڈال کر اسے جکڑا اور پھر پوری قوت سے دیوار میں دے مارا۔ اس کا کاندھا، کان اور سر دیوار سے ٹکرایا تو وہ وہیں ڈھیر ہوتی چلی گئی۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر سیدھا کیا اور اس کی کمر پر گھٹنا دے مارا۔ وہ بے بس ہو کر قالین پر گر گئی۔ وہ لمبے لمبے سانس لیتی ہوئی یوں ہانپ رہی تھی جیسے اسے سانس لینا مشکل ہو رہا ہو۔ میں نے اس کی تھوڑی کے نیچے ہاتھ ڈال کر اس کی گردن مضبوطی سے پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''تم یہ تماشا اپنی جان بچانے کے لئے کر رہی ہو؟''

''ہاں...... میں یہ...... بھی جانتی ہوں...... تم مجھے...... زندہ...... نہیں چھوڑو...... گے۔'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں زندہ چھوڑ سکتا ہوں، کیونکہ تم تو شطرنج کا مہرہ ہی نہیں ہو، اگر پیادہ بھی ہوتی نا تو شاید میں تم پر تھوڑا وقت ضائع کرتا۔ اس وقت تمہاری حیثیت ایک ٹشو پیپر کے برابر بھی نہیں ہے۔'' میں نے اسے آخری حد تک ذہنی اذیت کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''سچ بتاؤ، کون ہو تم؟'' اس نے میری چہرے پر دیکھتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں پوچھا تو میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ سکون سے بتا دو گی تو بہت اچھا ہوگا، نہیں تو مجھے تم سے بہت زیادہ پیار کرنا پڑے گا۔''

میرے یوں کہنے پر وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر حسرت سے میری جانب دیکھ کر سر جھکا لیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ پھنس گئی ہے۔ میں نے پانی کی بوتل ایک طرف رکھی اور دیوار

سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں اسے سوچنے کا پورا موقع دینا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر بولی۔

"میں یہ مانتی ہوں کہ رتنا اور ششما سے میرا تعلق پرانا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے کام بھی آتی رہی ہیں۔ اسی ناطے انہوں نے مجھے مدد کے لئے بلایا تھا۔ میں دل سے ان کی مدد کے لئے ہی نکلی تھی لیکن 'کلیان جی' نے مجھے اس وقت فون کیا جب میں ان کی مدد کے لئے نکل چکی تھی۔ میں یہ کام نہ کرتی تو کوئی اور کر دیتا۔ فارم ہاؤس پہنچنے تک میں نے انہیں اطمینان دلا دیا تھا کہ میں بڑی آسانی سے انہیں ٹریپ کرلوں گی۔ ایسا ہو بھی جاتا تھا۔ میں ان دونوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں، ان کا مجھ پر اعتماد بھی ہے۔ ششما نے مجھے آج صبح تمہارے بارے میں بتایا تو میں نے ارادہ بدل دیا۔ میں نشے میں نجانے کیا اول فول بکتی رہی۔ صبح ہی مجھے احساس ہو گیا کہ راکیش ورما کی کہانی جو میں سنا چکی ہوں اور کلیان جی کے بارے میں جو میرے منہ سے نکل گیا ہے، تم اسے ضرور پکڑ لو گے اور ایسا ہی ہوا۔"

"تم کیا کرنا چاہ رہی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میرے فون کی لوکیشن پر وہ یہاں آ کر ہمیں لے جاتے۔ مگر تم نے میری سوچ سے بھی آگے سوچا۔" اس نے حسرت سے کہا۔

"اور اب وہ فون کی لوکیشن پر ہی جائیں گے۔" میں نے دھیمے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ظاہر ہے میں انہیں بتا ہی نہیں سکی کہ..." یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں پھر تیزی سے بولی، "میرا فون...... اوہ، وہ آنے والے ٹریپ میں آ جائیں گے؟"

"ہاں، کلیان جی یہی سمجھیں گے کہ تم نے انہیں دھوکا دیا، رتنا اور ششما کو بچانے کے

لئے۔" میں نے سکون سے کہا تو اس کی حالت غیر ہو گئی۔ پھر رو دینے والے انداز میں بولی۔

"اگر ان کا ایک بندہ بھی...... کسی کو کچھ ہو گیا تو میں نہیں بچ سکتی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟" میں نے سرد لہجے میں کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خوف جم گیا تھا۔ تبھی میں نے مفاہمانہ انداز میں کہا۔ "تمہارے پاس صرف دو راستے ہیں؟"

"وہ کیا......" اس نے خوف زدہ انداز میں پوچھا۔

"میرے ساتھ تعاون کرو گی تو میں تمہیں فرار کا راستہ دے سکتا ہوں۔ یہاں تک کہ کسی بھی ملک نکل جانا۔ دوسرا، میرے ساتھ دھوکا کرو گی تو اسی کمرے میں دبا دوں گا۔" میں نے آخری لفظ بہت سخت لہجے میں کہے تھے۔

"کیا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا تو میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"رتنا اور شتما کو کہاں لے کر جانا تھا؟"

"دیو گڑھ...... کلیان جی ہی کے ایک اہم آدمی پرتاپ راؤ کے پاس۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"تم جانتی ہو اس کے بارے میں؟"

"نہیں، اتنا زیادہ نہیں؟" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ کلیان جی اصل میں ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی، مجھے تو بس راکیش ورما کا پتہ ہے۔ اسی نے اس نام سے متعارف کروایا ہے۔"

"تم اس کے لئے کتنا کام کر چکی ہو؟" میں نے پوچھا۔

''بہت زیادہ، بھجوراکیش ورما کے ساتھ اب بھی کام کر رہی ہوں۔'' اس نے بتایا تو میں خاموش رہا۔ پھر بڑے سکون سے پوچھا۔

''رتنا اور ششما کو پکڑنے کے لئے تمہیں کس 'کلیان جی' نے کہا تھا؟''

''پرتاب راؤ نے وہ اس علاقے کا......'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''بے تاج بادشاہ ہے، اسی کا حکم چلتا ہے وغیرہ وغیرہ۔''

میرے یوں کہنے پر وہ خاموش رہی۔ میں بھی سوچنے لگا۔ میرے سامنے اب ایک ہی نام تھا، دیوگڑھ کا پرتاب راؤ۔ لیکن میں آنکھیں بند کر کے اس پر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ جو کچھ بوجا کہہ رہی ہے وہ درست ہی ہوگا۔ وہ مجھے غلط معلومات دے سکتی تھی۔ اس لئے میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تمہاری دی ہوئی معلومات اگر غلط ہوئیں تو سمجھ سکتی ہو تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے، اگر درست ہوئیں تو مجھے بتا دو، تم کہاں جانا چاہو گی؟''

''مجھے بس آزاد کر دیا جائے، میں خود ہی پہنچ جاؤں گی جہاں مجھے جانا ہوا۔''

اس نے تیزی سے کہا تو میں اٹھتے ہوئے بولا۔ ''تو پھر آرام کرو۔''

''بھگوان کے لئے، مجھے مار نامت میں......'' اس نے لجاجت سے کہا تو میں ایک لمحہ کے لئے کنفیوژ ہو گیا۔ وہ واقعی ہی خوف زدہ ہو گئی ہے یا محض ڈرامہ کر رہی ہے۔ اس دنیا میں آنے والے لوگ اتنے بزدل نہیں ہوتے، جتنا وہ دکھا دا کر رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور دروازہ لاک کیا اور لاؤنج میں آ گیا۔ وہ لڑکے گھر کے اس حصے میں اس کی نگرانی کے لئے چلے گئے۔

☆......☆......☆

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ میں شہر کے گنجان آباد علاقے کی سڑک پر پیدل جارہا تھا۔اس سڑک پر کافی رش تھا۔ بالکل سامنے ایک ٹاور دکھائی دے رہا تھا۔اس مارکیٹ کا ایک قدیم گیٹ تھا جو میں پار کر کے آگے بڑھ چکا تھا۔وہاں راجستھانی روایتی لباس میں بہت کم لوگ دکھائی دے رہا تھے۔ ممکن ہے یہ وہی ہوں جو اردگرد کے دیہات سے وہاں پر آئے ہوں۔ گیٹ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک چوک تھا۔ مجھے دائیں جانب مڑنا تھا۔وہ دور تک جاتی ہوئی سڑک تھی جس پر وہی لوگوں کا رش اور دوکانوں کے باہر پھیلا ہوا سامان تھا۔تقریباً دوسو میٹر آگے جانے کے بعد مجھے ایک دوکان کا بورڈ دکھائی دیا، جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔وہ ویسی ہی ہول سیل کی روایتی دوکان تھی۔سامنے ہی گدی پر نوجوان لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔جس کے سامنے گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔میں نے اس سے جا کر کہا۔

”مجھے مشرا جی سے ملنا ہے؟“

”وہ پیچھے بیٹھے ہیں......“

اس نے لاپرواہی سے کہا تو میں نے سامنے دیکھا۔دوکان کے ایک کونے میں ایک موٹا سا ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا جس نے سفید کرتا پاجامہ پر سیاہ صدری پہن رکھی تھی۔اس نے گول شیشوں کی عینک لگائی ہوئی تھی۔بڑی بڑی بے ترتیب مونچھیں اور سر پر سیاہ ٹوپی تھی۔اس کے سامنے حقہ دھرا ہوا تھا جس کی نال اس کے منہ میں تھی۔وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔میں جیسے ہی اس کے پاس گیا،اس نے اٹھ کر مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”خوش آمدید رانا ویر سنگھ جی۔“ یہ وہی خوشگوار آواز تھی جو میں فون پر سنتا رہا تھا۔مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی تھی کہ وہ مجھے پہچان کیسے گیا ہے۔میں نے اسے دیکھا پھر ماحول کو دیکھا تو وہ مسکرادیا۔پھر اسی خوشگوار آواز میں بولا”آپ سے مل کر اچھا لگا۔راستے میں کوئی پریشانی تو

نہیں ہوئی؟"

"جی بالکل نہیں ہوئی۔" میں نے کہا

"آپ بالکل صحیح وقت پر پہنچے ہیں، میں ابھی گھر کے لیے نکلنے والا تھا۔ میرا خیال ہے گھر ہی چلیں وہیں باتیں ہوں گیں۔" اس نے اپنے لیدر کے سلیپر پہنتے ہوئے کہا۔

ہم پیدل ہی سڑک پر چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ تھوڑے فاصلے پر دائیں جانب ایک پتلی سی گلی تھی۔ وہ اس میں داخل ہو گیا۔ پھر اس میں ایک ویسی ہی گلی تھی۔ جو آگے سے بند دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ایک پرانے سے مکان میں داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی پار کرتے ہی ہم صحن میں آ گئے۔ وہی پرانی طرز کا گھر تھا۔ گھر میں کچھ افراد تھے لیکن شاید مجھے دیکھ کر وہ ہماری جانب نہیں بڑھے۔ اس نے اپنے سامنے کھڑی ایک ادھیڑ عمر خاتون سے کہا۔

"کھانا اوپر لگوا دیں۔"

"جی۔" خاتون نے اتنا ہی کہا اور ہم اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ گئے۔ سامنے دو کمرے تھے اور دائیں بائیں ایک ایک کمرہ تھا۔ اس کے سامنے بڑا سارا صحن۔ ہم سامنے والے ایک کمرے کے باہر جوتے اتارے اور اندر چلے گئے۔ کمرے میں اے سی چل رہا تھا۔ قالین پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ہم وہاں جا کر بیٹھ گئے۔

"میاں اب بتاؤ کیا صورت حال ہے؟ پھر آگے کی کوئی بات ممکن ہو سکتی ہے۔" اس نے پھیل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا تو میں نے اختصار سے بتایا تب وہ سنجیدگی سے بولا، "میرے خیال میں پوجا سچ کہہ رہی ہے۔ پرتاب راؤ اپنے علاقے میں انتہائی اثر رسوخ والا آدمی ہے۔ اس کا حکومت میں بھی تعلق ہے، جرم کی دنیا میں وہ انتہائی خطرناک آدمی مانا جاتا ہے۔ وہ ایسا آدمی نہیں ہے کہ سیدھے اس پر ہاتھ ڈالا جا سکے۔"

"میں اس پر ابھی ہاتھ ڈالنا بھی نہیں چاہتا، کوئی اندر کا بندہ مل جائے تو شاید میرا اور اس کا سامنا ہو ہی نہیں۔" میں نے پوچھا۔

"میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم اصل میں چاہتے کیا ہو، لیکن تم نے جواب تک کیا، اسے دیکھتے ہوئے میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ میرے بھی پرتاب راؤ کی طرف کچھ ادھار باقی ہیں، وہ بھی چکتا ہو جائیں گے۔" اس نے یوں کہا جیسے کوئی اپنی خواہش کا اظہار کر رہا ہو پھر سانس لے کر بولا، "مشکل تو ہے کوئی بندہ لیکن کچھ نہ کچھ تو کریں گے۔"

"بس یہی چاہئے، باقی میں دیکھ لوں گا۔" میں نے اعتماد سے کہا۔

"ہو جائے گا، فکر نہ کرو۔" اس نے کہا۔

"یہ کلیان جی والا کیا معاملہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر تم اس دنیا سے واقف ہوتو کیا تمہیں نہیں پتہ، ایک نام گھڑ لیا جاتا ہے اور پھر اس کے اوپر جرائم سے لے کر دہشت گردی تک کر کے خوف طاری کر دیا جاتا ہے۔ ایسا کون کرتے ہیں، یہ بھی تم جانتے ہو گے۔ یہ کلیان جی بھی ایک ایسا ہی گھڑا ہوا نام ہے۔ جب چاہے، جس جگہ ضرورت ہو اپنا مہرہ بڑھا کر اسی نام سے کام نکال لیا جاتا ہے۔ جتنا بھی اسے صاف کر لیا جائے، یہ ختم نہیں ہو گا۔ کیونکہ اس کے چلانے والے اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ راکیش ور ما ہو یا پرتاب راؤ یا ایسا ہی کوئی بندہ، یہ سب مہرے ہوتے ہیں، کوئی فیل ہوتا ہے، کوئی گھوڑا، کوئی بادشاہ، کوئی ملکہ......" اس نے لاپرواہ سے انداز میں کہا تو باہر آہٹ ہوئی۔ ہلکی سی دستک کے ساتھ وہی ادھیڑ عمر خاتون اندر آ گئی۔ اس نے ٹرے لا کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ باہر کوئی دوسرا بھی تھا۔ چند منٹ بعد اس سے بھی کچھ چیزیں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ ہم کھانے کے دوران حالات پر بہت ساری باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے سمجھاتا رہا کہ اس علاقے میں

صورت حال کس طرح کی ہے اور اس سے کیسے نبرد آزما ہوا جاتا رہا ہے۔

مشراء جی سے ملاقات سے مجھے بہت ساری معلومات مل گئی تھیں۔ میرے ذہن میں جس طرح کا ایک شخص تھا وہ اس سے بالکل ہٹ کر تھا۔ وہ بھی جرم کی دنیا کا ایک بندہ تھا لیکن وہ بہت محتاط ہو کر بڑے کام اس قدر خفیہ انداز میں کرتا تھا کہ کسی کو ہوا تک نہیں لگتی تھی۔ میری اس تک اس لئے رسائی ہو گئی تھی کہ وہ میرے نیٹ ورک کے لئے کئی کام کر چکا تھا اور اب پھر اس سے نئے کام کی ڈیل ہو گئی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا جب مشراء جی اور میرے درمیان چائے کا دور چلا۔ تبھی اس نے کہا۔

"آپ چائے پی کر تھوڑا آرام کرو۔ اب رات تک کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جوڑی کو جا دہاں پر ہے، اسے وہ لڑکے ہی ٹھکانے لگا دیں گے۔ ابھی اسے چند دن رکھنا ہے۔ میں ان سے کہہ دیتا ہوں۔"

یہ پہلی بات تھی جو اس نے انتہائی نرم انداز میں کہی تھی۔ یوں لگا جیسے ایک چائے کی پیالی اور کسی کو مار دینا ایک ہی بات ہے۔ میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اس قدر خوشگوار باتیں کرنے والا اتنا سفاک بھی ہو سکتا ہے۔

چائے پینے کے بعد مشراء جی باہر چلا گیا اور میں وہیں لیٹ گیا۔ مجھے اب رتنا اور ششما کی کوئی فکر نہیں تھی۔

☆......☆......☆

فور وہیل تیزی سے دیوگڑھ کی جانب بھاگی چلی جا رہی تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ لمبا تڑنگا، مضبوط جسم کا مالک تھا۔ ملگجی روشنی میں اس کے چہرے کے نقوش جیسے دکھائی دیئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بال کلین شیو تھا۔ اس نے ہاف سلیو سفید شرٹ پہنی ہوئی

تھی۔ میں ایک شاپنگ سنٹر تک گیا تو انہوں نے مجھ سے رابطہ کر لیا۔ پھر وہیں سے انہوں نے مجھے پک کر لیا تھا۔ تھوڑی سی جان پہچان کے بعد ہمارے درمیان خاموشی طاری تھی۔ میرے دماغ میں کوئی سوچ نہیں تھی اور نہ ہی میں سوچنا چاہتا تھا۔

میں راستے کے بارے میں بالکل بھی نہیں جانتا تھا۔ بس نوجوان نے مجھے اتنا بتایا تھا کہ وہ اہم شاہراہ سے نہیں بلکہ چھوٹی سڑکوں سے ہوتے ہوئے دیوگڑھ جائیں گے۔ یہ راستہ تقریباً چار گھنٹے کا تھا۔ فور وہیل کے اندر کا ماحول خنک تھا۔ مجھے مشرا جی پر اعتماد تھا۔ جو وہ پورے نکلتے ہی میں سونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ مجھے نہیں معلوم سفر کیسے سمٹا۔ اس وقت میں جاگ رہا تھا۔ ایسے میں نوجوان نے کہا۔

"یہ آگے پتلا سا دریائے کماری آئے گا، پھر تھوڑی دیر بعد ہم دیوگڑھ پہنچ جائیں گے۔ کچھ کھانا پینا ہے تو بتاؤ، یہاں پکوڑھا بے ہیں۔"

"وگر آگے شہر میں جا کر کچھ نہیں ملے گا تو کھا لیتے ہیں۔" میں نے سکون سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"رات گہری ہو گئی ہے نا، یہاں بیٹھے تو بہت سارا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ پھر شاید......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"پھر کھانے کو چھوڑو، بس نکلتے ہیں۔" اس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

ہم شہر میں داخل ہوئے تو وہی ماحول تھا جو گہری رات کے وقت ہوتا ہے۔ ہمیں ایک مخصوص فلنگ اسٹیشن تک جانا تھا، جہاں ہمارے انتظار میں تین لوگ موجود تھے۔ کچھ دیر بعد ہم وہاں پہنچے تو وہ لوگ ہمیں فلنگ اسٹیشن کے بالکل سامنے سڑک کے پار کھڑے دکھائی دیئے۔ وہ لاپروائی سے کھڑے سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ہم نے فور وہیل فلنگ کے لئے

کھڑی کی تو ہمیں دیکھتے ہی ان میں سے ایک نے فون کال ملائی، میرے ساتھی کا فون بج اٹھا۔ دونوں میں شناسائی ہوگئی۔ فلنگ کی ادائیگی جب تک ہوئی تب تک وہ تینوں سڑک کنارے آ گئے۔ ہم چل پڑے اور اگلے چند منٹوں میں وہ ہمارے ساتھ تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی ایک نے کہا۔

”یہاں سے دو کلو میٹر کے فاصلے پر ایک ایسی سڑک ہے جہاں رات بھر رونق رہتی ہے۔ وہاں ایک کیسینو ہے۔ جس کی رونق اس وقت عروج پر ہوگی۔ وہ پرتاب راؤ کا ہے۔ تم اپنے اس شہر میں آنے کا احساس دلا دو۔“

”اوکے......“ میں نے سکون سے کہا۔ میرے ساتھی ڈرائیور کو اس کیسینو کا پتہ تھا۔ میرے پیچھے بیٹھے ایک نوجوان نے وہاں کی صورت حال کے بارے میں بتایا۔ تبھی میں نے اس صورت حال کے تناظر میں ایک پلان انہیں بتا دیا کہ ہمیں کرنا کیا ہوگا۔

وہ سڑک واقعی ہی روشن تھی۔ وہاں گمان ہی نہیں ہو رہا تھا کہ رات کا پچھلا پہر ہے۔ ایسی کسی سچویشن میں آسانی بھی ہوتی ہے کہ ساتھیوں میں ذہنی ہم آہنگی ہو۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو یہی ساتھی سب سے زیادہ مشکل کا باعث بن جاتے ہیں۔ میں ان کے نام کیا، ان کے چہرے بھی ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ پایا تھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ سب مجھے اکیلے ہی کرنا پڑے گا۔

فور وہیل میں کافی طرح کا اسلحہ تھا۔ میں نے دو پسٹل لئے، ان کے میگزین دیکھ کر شرٹ کے نیچے اُڑس لئے تھے۔ اس کے ساتھ میں نے ایک دستی بم بھی جیب میں ڈال لیا۔ میں نے اور میرے کور پر جانے والے نے اپنا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا لیا تھا۔ ہم پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔

ڈرائیور نے رنگ برنگے چمکتے ہوئے نیون سائن کی روشنیوں کے نیچے بالکل اس کیسینو کے

گیٹ کے سامنے فوروہیل روک دی۔ گیٹ پر تعینات دو گارڈ فوروہیل کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

میں انتہائی تیزی سے فوروہیل سے اُتر کر گیٹ کی جانب بڑھا تو داخلی دروازے پر کھڑے دونوں گارڈ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اندر کہیں مجھے سی سی ٹی وی کیمرہ سے دیکھا بھی جا رہا ہوگا۔ وہ ہمارے سیاہ نقاب دیکھ کر الرٹ ہوگئے ہوں گے۔ ہمارا مقصد وہاں سوائے دہشت پھیلانے کے اور کچھ نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ تاثر یہی دینا تھا کہ وہاں ڈکیتی کی گئی ہے۔ اس دوران مجھے کور دینے کے لئے نوجوان اتر کر میرے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔ میں نے انہی گارڈز سے ابتدا کرنے کا سوچ لیا تھا۔

وہ دونوں گارڈ میرے سامنے تن کر کھڑے ہوگئے تھے۔ میں اپنے دونوں پسٹل نکال چکا تھا۔ میں نے بیک وقت ان دونوں پر فائر کر دیئے۔ بلاشبہ اس فائر کی آواز اندر تک گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی سمجھتا، میں اندر چلا گیا۔

اندر واقعتاً ہلچل مچ چکی تھی۔ سامنے کاؤنٹر تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا بار تھا جہاں کافی سارے مرد اور عورتیں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب میری جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں میرے چہرے پر سے زیادہ میرے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پسٹل پر تھیں۔ میں تیزی سے کاؤنٹر کی جانب بڑھا تھا۔ میں نے دیکھا کیسینو کے ایک کونے میں دو لوگ انتہائی سرعت سے گن نکال چکے تھے۔ میں نے لمحے کا ایک حصہ بھی ضائع نہیں کیا اور ان پر فائر کرنے لگا۔ فائر کے ساتھ وہاں پر چیخ و پکار شروع ہوگئی۔ لوگ میزوں کے نیچے چھپنے لگے۔ کوئی زمین پر لیٹ چکا تھا۔ میں فائر کرتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں لوگ نیچے چھپ گئے تھے۔ میں نے کاؤنٹر کی آڑ لی اور فائر کرنے لگا۔ مجھے کور دینے والا نوجوان میرے پیچھے آچکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ وہ فائر کرتا چلا جا رہا تھا۔ میں کاؤنٹر کے پیچھے چھپے

تین لوگوں پر فائر کر چکا تھا۔ وہاں سامنے کافی سارا کیش گڈیوں کی صورت میں پڑا تھا۔ میں نے انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ نوجوان میرے قریب آ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ اس نے وہ سارے نوٹ اس بیگ میں ڈالنے شروع کر دیئے۔ میں اندر ہونے والی ہر حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں بھی مجھے خطرہ محسوس ہوتا، میں فوراً فائر کر دیتا۔ نوجوان بیگ بھر چکا تھا۔ میں کاؤنٹر سے نکل کر بار تک پہنچ گیا۔ انہی لمحات میں سامنے سے فائرنگ ہونے لگی۔ نوجوان نے بیگ گلے میں ڈالا اور گن سے فائر کرنے لگا۔

لوگوں کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ بار کے کاؤنٹر پر شراب پھیل چکی تھی۔ لوگ وہاں سے اٹھ کر نیچے چھپے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بوتل اٹھائی اور اسے ریک میں لگی بوتلوں پر دے مارا۔ جس سے بہت ساری بوتلیں ٹوٹ گئیں اور ان سے شراب بہنے لگی۔ میرا کام ختم ہو چکا تھا، میں نے فائرنگ کی سمت اور پھر داخلی دروازے کا اندازہ لگایا۔ نوجوان کو اشارہ کیا کہ اب نکلنا ہے۔ میں نے اسے کور دیا، وہ تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ میں نے جیب سے دستی بم نکالا، اس کی پن نکالی اور وہیں بار میں لڑھکا دیا۔ اب میرے پاس بھی کوئی وقت نہیں تھا۔ میں نے دوسرا پسٹل نکالا اور اندھا دھند فائر کرتے ہوئے وہاں سے نکل کر دروازے کی سمت بھاگا۔ میں جانتا تھا کہ اگر باہر سے کوئی حملہ آور ہوا تو فور وہیل میں بیٹھے نوجوان موجود ہیں، وہ ان پر حملہ کر دیں گے۔ باہر بالکل خاموشی تھی۔ میں نے چند لمحوں کا فاصلہ بہت مشکل سے طے کیا۔ جیسے ہی میں داخلی دروازے کے پاس پہنچا، اندر ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ میں پوری جان سے لرز گیا۔ میں گرتے گرتے سنبھلا تھا۔ میں نے اپنے قدم مضبوطی سے جمائے اور فور وہیل تک جا پہنچا۔ میں جیسے ہی بیٹھا، ڈرائیور نے فور وہیل بڑھا دی۔ وہاں سے نکلتے ہوئے میں نے اندر آگ بھڑکتے ہوئے دیکھی۔ فور وہیل تیزی سے سڑک پر بھاگتی چلی جا رہی تھی۔

میرے پیچھے بیٹھا ایک اور نوجوان کسی کو وہاں ہونے والی صورت حال بارے بتا رہا تھا۔ میرے کانوں میں اب تک ہونے والے دھماکے اور لوگوں کی چیخ و پکار گونج رہی تھی۔ میں خاموشی سے پسٹل کا میگزین بدل کر کسی بھی نئی صورت حال کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

اس سڑک کے اختتام پر ایک بڑا سا راؤنڈ اباؤٹ تھا۔ وہاں تک ابھی کیسینو پر حملہ کی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔ وہاں سب معمول کے مطابق تھا۔ ڈرائیور نے فوروہیل نہیں روکی بلکہ سیدھا چلتا چلا گیا۔ اگلے کراس سے پہلے ہی وہ ایک چھوٹی سی ذیلی سڑک پر مڑ گیا۔ وہاں سے نکلا تو سامنے ایک بڑی سڑک تھی۔ وہ بالکل ویران سڑک تھی۔ یہاں تک کہ ایک جگہ دو کاریں کھڑی دکھائی دیں۔ ڈرائیور ان کے پاس جا کر رک گیا۔ جب تک فوروہیل رکی میرے پیچھے بیٹھے نوجوان نے مجھے بتایا کہ میں کس کار میں جا کر بیٹھ جاؤں۔ میں نے ویسا ہی کیا۔ باقی بھی اتر کر دوسری کار میں بیٹھنے لگے۔ میرے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے کار بھگا دی۔

مجھے سمجھ آ رہا تھا۔ فوروہیل کسی نہ کسی کیمرے میں آ چکی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ حملہ آور کون ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اس فوروہیل سے جان چھڑا لی تھی۔ پھر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ میں نے بیک مرر میں دیکھا فوروہیل میں دھماکہ ہوا، وہ پھٹ چکی تھی اور اس میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اپنی طرف سے کوئی بھی ثبوت وہیں ختم کر دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں نے سیٹ سے ٹیک لگا لی۔

کاریں واپس شہر کی جانب آ گئیں تھیں۔ ایک جگہ آ کر دوسری کار ہم سے جدا ہو گئی۔ تب میں نے ڈرائیور کی جانب دیکھا تو چونک گیا۔ اگرچہ اس کا چہرہ تھوڑا سا ڈھانپا ہوا تھا۔ مجھے شک ہوا جیسے وہ کوئی لڑکی ہو۔ میں نے زیادہ تجسس نہ کیا اور سامنے دیکھنے لگا۔ تقریباً بیس منٹ تیز تر سفر کرنے کے بعد ہم ویران سڑکوں سے ہوتے ہوئے ایک پوش علاقے میں آ گئے۔

ایک آہنی گیٹ کے سامنے اس نے کار روکی تو روشنیوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بنگلہ کافی بڑا ہے۔ ہم جیسے ہی رکے فوراً ہی چند سیکورٹی گارڈ لپکے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے کہ وہ ہمارے انتظار میں ہوں۔ سیکورٹی والوں نے زیادہ وقت نہیں لیا اور کار کو اندر آنے دیا۔

سامنے بنگلے کا مین پورچ تھا۔ کار ادھر نہیں گئی بلکہ فوارے سے گھوم کر دائیں جانب چلی گئی۔ سامنے یوں عمارت بنی ہوئی تھی جیسے بنگلے سے ہٹ کر کوئی آفس یا الگ قسم کا گھر ہو۔ ڈرائیور نے کار روک دی پھر اترتے ہوئے مجھے آنے کا اشارہ کیا تو میں پیچھے آ گیا۔ وہ مجھے لیتی ہوا داخلی دروازے سے اندر چلی گئی۔ سامنے ہی ایک مضبوط جسم کا ایک گارڈ نما شخص کھڑا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا تو لڑکی نے ہاتھ اوپر کر دیئے۔ گارڈ نے اس کی تلاشی لی۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا تو اس نے جانے کا اشارہ کر دیا۔

لمبی راہداری میں دائیں جانب مڑ کر وہ ایک کمرے کے سامنے آ کھڑی ہوگئی۔ اس نے دروازہ ہلکا سا بجایا اور پھر کھول کر پہلے خود اندر گیا پھر چند لمحے بعد مجھے اندر بلا لیا۔ پرتعیش سامان سے سجے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک خوشگوار بھینی بھینی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ کمرے میں روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ سفید سیاہ اور طلائی رنگ وہاں کی ہر شے میں نمایاں تھا۔ تبھی میری نگاہ سامنے کھڑی ایک عورت پر پڑی۔ اس کی پشت میرے سامنے تھی۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے میرے سامنے کوئی طلائی بت نصب ہے یا کوئی موی مجسمہ۔ اس نے میرون رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اسی رنگ کا مختصر سیلولیس بلاؤز تھا۔ اس کی کمر آدھی ساڑھی کے پلو نے اور آدھی اس کے لمبے سیاہ بالوں نے ڈھانپی ہوئی تھی۔ پیلی روشنی سے اس کا سفید بدن طلائی رنگ کا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے رکتے ہی وہ دھیرے دھیرے مڑی تو میں چونک کر رہ گیا۔ لمبی، سڈول بدن، لانبے گیسو، بھاری سینے اور لانبی گردن والی اس عورت

کا آدھا چہرہ باقی آدھے چہرے سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ ایک طرف سے وہ بالکل حسین تھی۔ لیکن دوسری جانب یوں لگ رہا تھا جیسے چہرہ بگڑنے کے بعد پلاسٹک سرجری سے اسے ٹھیک کر دیا گیا ہو لیکن وہ ٹھیک نہ ہو سکا ہو۔

''اچھا تو تم ہو رانا اور سنگھ......'' اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا۔ اس پر میں خاموش رہا تو بولی، ''میں نہیں جانتی اور نہ میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ تمہاری پرتاب راؤ سے کوئی دشمنی ہے یا نہیں، لیکن میں اتنا ضرور پوچھنا چاہوں گی کہ کیا تم اس کے بارے میں جانتے ہو یا انجانے میں یہ آفر قبول کر لی ہے؟''

''نہیں جانتا تو جان جاؤں گا اور جان لے بھی لوں گا۔'' میں نے پر سکون لہجے میں کہا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''تم چاہے جان لے لو یا دے دو مگر یہ جو ہمارے اور تمہارے درمیان ملاقات ہے، اسے اپنی زندگی سے کھرچ دینا، جو چاہو گے ملے گا۔''

''مجھے بس اتنا ہی چاہیے۔'' میں نے اس بار قدرے لاپرواہی سے کہا۔

''مجھے تمہارا انداز دیکھ کر خوشی ہوئی۔ تم ہمارے خاص مہمان رہو گے۔'' اس نے کسی بھی جذبے سے عاری لہجے میں کہا۔

''مجھے کرنا کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھو، دشمن کو مار دینا، کوئی بڑی بات نہیں ہوتی، وہ تو مر گیا، جان چھوٹی اس کی۔ اہم بات یہ ہے کہ دشمن کو بے بس کر کے، اسے اس کی اوقات دکھانا ہوتی ہے۔ وہ سامنے پڑا سسکے اور اس کی سسکاری دراصل تمہاری فتح ہے۔'' اس نے غرانے والے انداز میں کہا، پھر چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے میرے ساتھ کھڑی لڑکی کی جانب اشارہ کرتے

ہوئے کہا۔" یہ تمہاری بہت اچھی میزبان ثابت ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری بہت جلد دوبارہ ملاقات ہوگی۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے مجھے پلٹ جانے کے لئے ہاتھ کا ہلکا سا اشارہ کیا۔ اگرچہ میرے ذہن میں کئی سوال گردش کر گئے تھے لیکن میں کوئی بھی سوال کرنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے پلٹ گیا۔

وہ لڑکی میرے پیچھے تھی۔ میں کمرے سے باہر آ گیا۔ اس عورت نے میرا دماغ سلگانے کی کوشش کرتے ہوئے مجھے واضح پیغام بھی دے دیا تھا کہ میں کوئی بھی کامیابی لیتا ہوں تو ٹھیک ورنہ ناکامی کی صورت میں وہ مجھے قبول نہیں کریں گے۔ میں اس کی منشاء سمجھ گیا تھا۔ مجھے اس کے کسی پیغام سے کوئی غرض نہیں تھی مجھے اپنے مقصد سے غرض تھی۔ شہر میں داخل ہوتے ہی جو ہم مجھے دے دی گئی تھی اس سے بلاشبہ وہ عورت یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ اگر میں اس مہم میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو وہیں میرا فیصلہ ہونا تھا کہ آگے وہ میرے ساتھ کیسا برتاؤ رکھتے ہیں۔ اس مہم کے فوراً بعد یہ ملاقات سے مجھے یہی تاثر دیا گیا تھا کہ نہ صرف وہ مجھ سے خوش ہوئی بلکہ آئندہ کے لئے ان کے نزدیک میری حیثیت کیا ہوگی وہ بھی بتا دیا۔

ہم ایک بنگلہ نما گھر میں پہنچ گئے جو اس آہنی گیٹ والے بنگلے سے کافی دور تھا۔ دن نکلنے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ نیلگوں روشنی ہر جانب پھیل گئی تھی۔ گاڑی پورچ میں رکنے کی بجائے سیدھی گیراج میں چلی گئی تھی۔ میں وہاں اترا تو ڈرائیور بھی اتر آئی۔ اس نے مجھے سامنے والے دروازے میں سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں اندر چلا گیا۔ سامنے راہداری تھی۔ جس کے بعد کمرے تھے۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر جانے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گئی۔ میں لمحہ بھر رکا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ وہ ایک پرآسائش کمرہ تھا۔

میں ابھی کمر بھی سیدھی نہیں کر پایا تھا کہ ہلکے سے کھٹکے سے میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ تبھی کھڑکی سے دبیز پردہ ہٹا تو اُجالا کمرے میں در آیا۔ ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں کچھ دیر سو یا تھا۔

پردہ ہٹانے والی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ بوائے کٹ بالوں والی نے سیاہ ٹائیٹس کے ساتھ ڈھیلی سی سفید سلیولیس ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ گول چہرے پر تیکھے نقش نہیں تھے۔ اس کا ناک تھوڑا بیٹھا ہوا تھا، ہونٹ سرخ لیکن موٹے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جن پر چتون بنائی ہوئی تھی۔ سفید رنگ کے ساتھ پتلا سا جسم تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن وہ مجھ سے بے نیاز پردہ ہٹا کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ چند لمحے میری جانب دیکھتے رہنے کے بعد خالص راجستانی لہجے میں بولی۔

"اگر حسن اُٹھ گئے ہو تو جا کر فریش ہو جاؤ۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ میں پہچان گیا تھا کہ یہی رات والی لڑکی ہے۔ میں جواب دینے کے بجائے اٹھا اور فریش ہونے چل دیا۔

واپس پلٹا تو میز پر کافی کچھ کھانے کے لئے پڑا تھا۔ وہ ایک کرسی پر انتظار والی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس بار میں نے اس کا چہرہ بھرپور انداز میں دیکھا تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ یہ میک اپ بھی کرلے تو اتنی خوبصورت نہیں لگے گی۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی کرختگی تھی۔ اس نے کوئی بات کئے بنا کھانا شروع کرنے کا اشارہ کیا اور خود بھی کھانے لگی۔

وہ مجھ سے پہلے ہی سیر ہو کر کرسی کھسکا کر بیٹھ گئی۔ میں نے کھانا ختم کیا تو اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”تم مجھے رتیو کے نام سے پکار سکتے ہو۔“

”میرا نام تجھے معلوم ہی ہوگا۔“ میں نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا تو وہ اس کے چہرے پر ہلکی سی بھی مسکان نہیں ابھری، بلکہ اسی سنجیدگی سے بولی۔

”ہاں معلوم ہے، رانا دیر سنگھ۔“

”مجھے یہاں کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی جو رانی بھاگ وتی چاہے گی۔“ اس نے روکھے سے لہجے میں کہا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے جان بوجھ کر کہا۔

”چلو، میں تمہیں تھوڑا بتا دیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے چند لمحے سوچا، پھر کہتی چلی گئی۔

”جس سے تم رات ملے تھے، وہ رانی بھاگ وتی تھی۔ اس کے ماتا پتا، کسی زمانے میں اس علاقے کے مالک تھے۔ وہ نہیں رہے۔ یہ اکلوتی ہے۔ اس کا کوئی بھائی نہیں۔ یہ بڑے آرام سے اپنی زندگی گزار رہی تھی کہ پرتاب راؤ اس کی زندگی میں آ گیا۔ اس نے رانی بھاگ وتی کا سب کچھ چھننا شروع کر دیا یہاں تک کہ اسے اپنے محل تک محدود کر دیا ہے۔“

”تو کیا وہ اب اس سے بدلہ......“ میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

”پرتاب راؤ نے اس سے سب کچھ ہی نہیں چھینا، اس کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ وہ شادی نہیں کر سکتی، کیونکہ پرتاب راؤ نہیں چاہتا۔ اس کا حسن ختم کر دیا کہ وہ اسے داغدار کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اسے جینے بھی نہیں دیتا۔“

”مجھے یہ بتاؤ تمہاری رانی بھاگ وتی چاہتی کیا ہے؟“ میں نے اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا

”پچھلے دو برس سے اس نے تہیہ کر لیا ہے کہ اس پرتاب راؤ سے چھٹکارا پانا ہے۔ لیکن رانی کا کوئی بس نہیں چل رہا۔ ایک دو بار کوشش بھی کی لیکن رانی ہی کے بندے مرے۔ اب رانی

آخری کوشش کرنا چاہتی ہے۔ اسی مقصد کے لئے اس نے کچھ لوگ اکٹھے کیے ہیں۔ جن میں ایک تم بھی ہو۔" رضو نے کہا تو مجھے لگا کہ یہ کہانی کافی ادھوری سی ہے۔ اصل کہانی کیا ہے؟ مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مجھے اپنے مقصد سے مطلب تھا اس لئے میں نے کرید نہیں کی۔ وقت نے اگر میرا ساتھ دیا تو یہ کہانی خود بخود میرے سامنے آجائے گی۔ سو میں نے بات کرنے کا موضوع ہی پلٹتے ہوئے پوچھا۔

"کیا رانی بھاگ وتی کے اس نیٹ ورک کو تم ہی دیکھ رہی ہو؟"

"ابھی تک یہاں کوئی نیٹ ورک نہیں بنا ہے۔ بس لوگ ہی لوگ ہیں جنہیں رانی پال رہی ہے اور بس۔ ان سے کوئی کام نہیں لیا جا رہا ہے۔ یوں سمجھو کہ کوئی کام لینے والا ہی نہیں ہے۔ ہاں رات جو پہلا اٹیک ہوا، اس میں بھرپور کامیابی ملی ہے۔ یہ تاب راؤ تڑپ رہا ہے۔"

"اصل میں کرنا کیا ہے، راؤ کو قتل کرنا ہے یا......"

"ختم کرنا ہے۔ اس کا گھمنڈ، اس کی طاقت اس کا یہ سارا نیٹ ورک۔" رضو نے نفرت سے کہا۔

"تم لوگ کیا سوچ رہے ہو، کس بنیاد پہ یہ سب ختم کر سکو گے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا تو اس نے میرا لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے پاس اس کے بارے میں بہت زیادہ معلومات ہیں، ان کے اندر تک ہمارے لوگ موجود ہیں، جن سے فائدہ لیا جا سکتا ہے، تم یہ تو جانتے ہو اور تمہیں بھی ہونا کہ معلومات خود ایک طاقت ہیں۔"

"معلومات کون دیتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت سارے لوگ ہیں، جو اس پورے علاقے میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔" اس نے

میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"جس طرح تم بتا رہی ہو، پرتاب راؤ ایک طاقت ور آدمی ہے تو اس کا نیٹ ورک بھی تو ہوگا، تو کیا وہ تم تک نہیں پہنچ سکتا؟" میں نے پوچھا۔

"پہنچ سکتا ہے، لیکن ہمیں یہی کوئی ثبوت نہیں دینا کہ ہمارے پیچھے رانی بھاگ وتی ہے۔ اسی لئے کچھ لوگ اکھٹے کئے ہیں۔" اس نے بتایا تو میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، جب میری ضرورت پڑے بتا دینا۔"

میرے یوں کہنے پر وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی پھر کچھ کہے بنا برتن اٹھا کر چلی گئی۔ میں بیڈ پر جا کر لیٹ گیا۔

نجانے مجھے کیوں لگا تھا کہ وہ بہت کچھ چھپا رہی تھی۔ اگر رانی بھاگ وتی نے بساط بچھا ہی لی تھی تو کرائے کے مہرے کب تک چلتے؟ اس کے اپنے لوگ کیا اتنے وفادار نہیں ہیں کہ وہ اپنی رانی کے لئے جان تک دے دیں؟ رانی اور پرتاب راؤ کا کوئی نہ کوئی ایسا تعلق ضرور ہوگا جس کی بنیاد پر یہ دشمنی ہے؟ میرا ذہن یہ قبول ہی نہیں کر رہا تھا کہ ایسا کچھ رہا ہوگا۔ اندر کی بات کیا تھی، یہ تو وقت ہی بتا سکتا تھا۔ مجھے ان کی دشمنی سے کوئی غرض نہیں تھی، مجھے اپنے مقصد سے مطلب تھا۔ اگر وہ مجھے دکھائی دے گیا تو پھر نہ مجھے رانی سے اور نہ پرتاب راؤ سے کسی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد رتنو پھر آن وارد ہوئی، اس کے ہاتھ میں ایک انگریزی اخبار تھا۔ اس بار اس نے ڈھنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے سیاہ پتلون پر نیلی چیک دار شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس نے اخبار میری جانب بڑھا کر خود کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اس واردات کو ڈکیتی کا ہی رنگ دیا گیا ہے؟"

میں نے اخبار پر سرسری سی نگاہ ڈالی، مرنے والوں اور زخمیوں کی تعداد لکھی ہوئی تھی۔ ڈکیتی کی رقم اور ڈکیتوں کے بارے درج تھا۔ سی سی ٹی وی کیمرہ سے تصویریں بھی تھیں۔ میں نے اخبار ایک جانب رکھتے ہوئے پوچھا۔

"پرتاب راؤ کا کیا خیال ہے، وہ بتاؤ؟"

"وہ ابھی کچھ نہیں بولا۔" اس نے کہا۔

"جب وہ بولے تو بتانا۔" میں نے پرسکون انداز میں کہا۔ وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی، پھر پوچھا۔

"کچھ معلومات ہیں، لیکن اس سے پہلے میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ ان حالات میں ہم کوئی کارروائی کر سکتے ہیں یا ابھی چند دن رکنا ہوگا؟"

"تم نجانے میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہو؟ یا شاید میرا امتحان لے رہی ہو؟" میں نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب میں تو......" اس نے کہنا چاہا تو میں تیزی سے بولا۔

"جب جنگ کا آغاز کر دیا جائے تو پھر دشمن کو سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دینی چاہئے۔ کس کا کتنا نقصان ہوتا ہے یہ بھی نہیں دیکھا جاتا، ہار جیت کا فیصلہ تب ہوتا ہے جب دشمن صلح کے لئے ہاتھ بلند کر دے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے تلخی سے کہا۔

"میرا مطلب جو بھی ہے، لیکن تم یوں فیکٹس اینڈ فگر پر بات کر رہی ہو جیسے ہم کوئی گیم کھیل رہے ہیں۔ ہاں یہ کھیل ہے مگر موت کا، ہم کسی کو مارنے جائیں تو یہ سوچ کر جائیں کہ ویسی ہی گولی ان کے پاس بھی ہے جو ہمارے بدن کے پار بھی ہو سکتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو، ہمارے پاس معلومات تو بہت ہیں لیکن انہیں استعمال کیسے کرنا ہے، ظاہر ہے اس کے لئے پلاننگ تو کرنا ہوگی۔" رنتو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مثلاً کیسی معلومات......؟" میں نے پوچھا۔

"مثلاً،" پرتاب سنگھ کے اردگرد لوگوں کے بارے میں، وہی جو اس وقت اس کی اصل طاقت بنے ہوئے ہیں۔" اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے کہا۔

"ایک بندے کو ماریں گے تو اس کی جگہ نیا آ جائے گا، دھندہ تو چلتا ہے، وہ تو رکنے والا نہیں۔ سیٹ اپ تو اس کا وہی رہے گا۔"

"تو پھر کیا کرنا ہوگا؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اصل بات ہے ان پر دہشت طاری کرنا، وہ ڈر جائیں۔" میں نے سکون سے کہا تو وہ بولی، "کیسے......؟"

"وہ خود کہاں ہے، اس کے بارے پوری معلومات لو، پھر کوئی پلان بنایا جاتا ہے، لیکن......" میں کہتے کہتے رک گیا۔

"لیکن کیا......؟" اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کسی بھی کام کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اسی مقصد کے مطابق معلومات کو استعمال کر کے پلان کیا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہی تو سوچنا ہے، کہاں سے کیا کریں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"دیکھو، اپنی رانی بھاگ وتی سے پوچھو وہ چاہتی کیا ہے، اس کا اصل ہدف کیا ہے، جب تک ہمارے پاس ہدف نہیں ہوگا، ہم کوئی پلان نہیں کر سکتے۔ پلان تبھی ہوگا، جب کوئی ہدف ہمارے پاس ہوگا۔ مثلاً صرف راؤ کو ختم کرنا ہے، اس کا نیٹ ورک تباہ کرنا یا اسے کمزور کر کے

اس کی جگہ لینی ہے کیا کرنا ہے، یہ پوچھو۔" میں نے اکتائے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، میں کرلوں گی بات۔ ابھی تمہیں ایک صاحب سے ملانا ہے، آؤ میرے ساتھ۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

پھر میرا جواب سنے بغیر وہ باہر نکلتی چلی گئی۔ میں اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔ ہم دونوں ایک راہداری میں چلتے ہوئے پچھلی جانب کاریڈور میں آگئے۔ وہاں سے اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ دوسری منزل پر جا کر ایک کمرے میں آئے تو وہاں ایک کمپیوٹر لیب بنی ہوئی تھی۔ جس میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ ان سے ذرا فاصلے پر ایک نرم سے چہرے والا ادھیڑ عمر شخص بیٹھا ہوا کمپیوٹر اسکرین میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے ہماری جانب دیکھا، پھر اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ ہم اس کے پاس بیٹھ گئے۔ اس کا چہرہ نرم اور پر سکون، آنکھیں بھوری سی متورم اور خشخشی داڑھی تھی۔ اس نے میرے چہرے پر غور سے دیکھا، پھر لبوں میں مسکرا دیا۔

"یہ ملکیت سنگھ ہیں۔" رتو نے ہولے سے تعارف کرایا پھر میرے بارے میں اسے بتایا۔ "یہ رانا دیر سنگھ ہیں۔"

"نام سے کیا فرق پڑتا ہے، کام ہونا چاہئے۔" اس نے نرم سے انداز میں کہا اور پھر لبوں میں مسکرا دیا۔

"اسی لئے تو آئیں کہ کام سمجھا دیں کرنا کیا ہے۔" میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا جس میں طنز کی آمیزش تھی۔

"ایک میان میں دو تلواریں تو سنا ہی ہوگا آپ نے۔" ملکیت سنگھ نے انتہائی سنجیدگی سے کہتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا، پھر گھمبیر لہجے میں بولا، "لیکن معاملہ اس سے بھی

ہٹ کر ہے۔ جسے جاننا ضروری تو نہیں؟"

"ضروری نہیں...... مطلب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں، جن کا نہ جاننا ہی بہتر ہوتا ہے۔" اس نے مسلسل میرے چہرے پر نگاہیں جمائے کہا تو میں نے ایک طویل سانس لی اور پھر اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"اب تک آپ لوگ ایسی باتیں کرتے چلے جا رہے ہیں، جن کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ سو مجھے بھی کوئی چیتا نہیں۔ میں نیچے جا کر سو رہا ہوں۔ جب کوئی کام ہو تو بتا......" میں نے مسکراتے ہوئے بات پوری کرنا چاہی تو ملکیت سنگھ نے کہا۔

"یہاں ہمارے پاس بیٹھا کرو۔ یہاں راؤ پرتاپ سنگھ کے بارے میں بڑی معلومات ملیں گی۔ ابھی تو یہی کام ہے۔ پھر دیکھتے ہیں۔"

ملکیت سنگھ نے اتنے نرم انداز میں کہا جتنا کسی نوآموز شاگرد کے لئے لہجہ اپنایا جا سکتا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، اپنے کاندھے اچکا دیئے، جس کا یہی مطلب تھا کہ جیسے تم لوگ چاہو۔ کچھ دیر بعد میرے سامنے ایک لیپ ٹاپ تھما دیا گیا۔ جس میں پرتاپ راؤ کے بارے میں معلومات تھیں۔ جسے لے کر میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

☆......☆......☆

ہر وہ ریاست جو توسیع پسندانہ عزائم رکھنے کے علاوہ اپنی دھاک بھی قائم رکھنا چاہتی ہو وہ ایسے ناجائز ہتھکنڈے ضرور استعمال کرتی ہے۔ کسی بھی ریاست میں ایک ایسا ان دیکھا ٹولہ، گروہ یا مافیا موجود ہوتا ہے جو اپنی مرضی مسلط رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ یہ بہت تھوڑے لوگ ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ اسکے لئے انہیں اپنے ہم

وطن مارنا پڑیں یا کسی دوسرے ملک میں کاروائیاں کرنا پڑیں، وہ دریغ نہیں کرتے۔ ریاست چلانے والے بھی ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔

پورا دن پرتاب راؤ کے بارے میں جانکاری حاصل کرتے ہوئے گزر گیا۔ جس کے مطابق وہ ان عناصر میں سے ایک تھا، جو ریاست کے ساتھ مل کر نہ صرف امور نپٹاتے تھے بلکہ اپنی جرم کی دنیا کو بھی پورا تحفظ دیتے تھے۔ ریاست بھی ان سے وہ ناجائز کام لیتی ہے جو وہ سیدھے سبھاؤ نہیں کر سکتی۔ پرتاب راؤ کی اصل طاقت ریاست کے ساتھ جڑے ہونا ہی تھا، جس کی وجہ سے وہ بے دھڑک مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھا۔

میں اس کے بارے میں پڑھ پڑھ کر بور ہو چکا تھا۔ مختلف ایجنسیوں کی رپورٹس سے لے کر اخباری خبریں اور تجزیے تھے۔ اس کے ساتھ بہت زیادہ تعداد میں چھوٹے بڑے ویڈیو کلپس بھی تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ڈنر کے بعد انہیں دیکھوں گا۔

ڈنر پر میں اور رتو ہی تھے۔ وہ تھوڑی دیر مجھ سے باتیں کر کے اٹھ گئی۔ میں نے لیپ ٹاپ اٹھایا اور ایک ایک کر کے ویڈیو دیکھتا رہا۔ وہ اس کی سیاسی اور گھریلو زندگی دکھا رہی تھیں۔ اسی دوران میں نے ایک فولڈر کھولا۔ اس میں چند ویڈیوز تھے۔ میں نے جونہی پہلی ویڈیو کھولی تو چونک گیا۔

وہ کسی چھوٹے سے کیمرے سے بنائی گئی ویڈیو تھی۔ اس کا رزلٹ اتنا اچھا تو نہیں تھا لیکن اتنا برا بھی نہیں تھا کہ کچھ سمجھ نہ آسکے۔ وہ کسی ایسی جگہ کی چوری چھپے بنائی گئی ویڈیو تھی جہاں کچھ لوگ قید تھے۔ کھلے آسمان کے نیچے پنجرے میں بند ننگے انسان، جو شاید بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ کہیں درختوں کے ساتھ بندھے انسان تھے۔ وہ جس کسی نے بھی ویڈیو بنائی تھی، ویڈیو بنانے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ ویڈیو خفیہ طور پر بنائی گئی ہے۔ کسی جگہ فوکس نہیں ہو پا رہا

تھا۔ اچانک اندھیرا ہوا اور کلپ ختم ہو گیا۔ میں نے جلدی سے اگلا ویڈیو کلپ چلایا۔ وہ ایک غار نما جگہ تھی۔ جس کے اندر کہیں کہیں مدقوق سے بلب جل رہے تھے۔ وہاں مجھے عورتیں بندھی ہوئی دکھائی دیں۔ یہ مختلف عمر کی تھیں۔ منظر تیزی سے بدلتے چلے جا رہے تھے۔ اچانک ایک جگہ مجھے ایک ادھیڑ عمر جوڑا بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے کلپ وہیں روک دیا۔ وہ منظر دھندلا گیا۔ میں نے پھر سے دیکھا، پھر بار بار دیکھا، جس طرح میں دیکھتا جا رہا تھا، میرے اندر آگ بھڑکتی چلی جا رہی تھی۔ میرا روم روم شعلے اگلنے لگا تھا۔ جس طرح وہ مجبور اور بے کسی کی حالت میں پڑے تھے، میرے اندر کا درندہ اتنی ہی قوت سے جاگ گیا تھا۔ یہاں تک کہ میرے سامنے کا منظر دھندلا گیا۔

نجانے کتنی بار میں نے وہ منظر دیکھا اور پھر خود پر قابو پانے میں کتنا وقت لگا تھا، مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میرے لئے وقت کا احساس مٹ گیا۔ میں نے اگلے ویڈیو کلپ دیکھے۔ وہ وہیں کے تھے۔ وہ ادھیڑ عمر جوڑا پھر سے دکھائی دیا تھا۔ بس ایک لمحہ انہیں دیکھا تھا۔ باقی کلپ اسی جگہ کے مزید مناظر تھے۔ باہر قیدی کام کر رہے تھے۔ کچھ لوگ ان پر مسلط تھے۔ جس وقت میں نے باقی فولڈر میں موجود ویڈیو دیکھے، تب رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

میں بے چین ہو چکا تھا۔ وہی ادھیڑ عمر جوڑا میرا ہدف تھا۔ جس کے لئے میں اتنا سفر کر کے یہاں تک آ پہنچا تھا۔ میں ایک منزل سر کر چکا تھا۔ اب اگلی منزل کے لئے مجھے تیار ہونا تھا۔ میں نے لیپ ٹاپ ایک طرف رکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ مجھے اس گھر کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔ میں راہداری پار کر کے کاریڈور میں آ گیا۔ میں خود پر قابو پانے کی کوشش میں تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ تبھی مجھے اپنے پیچھے کسی کے ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، میرے پیچھے رجو کھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے یوں خاموشی سے آ کر

کھڑے ہونے کی وجہ پوچھتا، اس نے ہولے سے پوچھا۔

"کیا بات ہے ویر سنگھ......؟"

"یہ تیرا پرتاب سنگھ تو بہت ہی ظالم بندہ ہے؟" میں نے سر سراتے ہوئے انداز میں کہا تو وہ دھیمے سے بولی۔

"شاید تمہاری سوچ سے بھی زیادہ۔"

"رجو، مجھے ایک فون چاہئے۔" میں نے سکون سے کہا۔

"اوہ، ابھی چاہئے تو یہ لو۔" اس نے نہ سمجھتے ہوئے اس نے اپنا فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے ایک نگاہ فون کی طرف دیکھا پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بالکل نیا، جس کا سم کارڈ......" میری بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ سمجھ گئی۔

"ٹھیک ہے، میں ابھی کوشش کرتی ہوں۔" اس نے کہا اور اسی لمحے واپس پلٹ گئی۔ میں وہیں کاریڈور میں ٹہلنے لگا۔ پھر وہاں سے لان میں موجود ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ ایک تصور اب ایک حقیقت میں بدل گیا تھا۔ اس حقیقت کو قابو کرنے کے لئے میرے دماغ میں جو طوفان اٹھا ہوا تھا، وہ میرے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔

"یہ لو......" رجو کی آواز پر میں چونکا۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ کب میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ انتہائی خطرناک معاملہ تھا۔ میرے جذبات کوئی دوسرا سمجھ جائے، یہ میری غفلت ہی نہیں انتہائی درجے کی بداحتیاطی تھی۔ جس راہ کا میں مسافر تھا، اس میں غفلت ہی سب سے بڑا جرم ہوتا ہے۔ میں نے خود کو سرزنش کی اور فون پکڑتے ہوئے کہا۔

"شکریہ رجو۔"

"کوئی بات نہیں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوئی پھر بولی، "میرے خیال میں تم

واپس کمرے میں جاؤ، فریش ہو کر پرسکون ہونے کی کوشش کرو۔ اگر تم چاہو تو میں وہاں آجاتی ہوں۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، بس ایسے ہی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ، ٹھیک ہے۔" اس نے بھی مسکراتے ہوئے کہا اور واپس پلٹ گئی۔

میں نے کچھ دیر تک فون کو جانچا۔ وہ میرے لئے "بے ضرر" تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے چاچا عبدالمجید کے نمبر ملائے اور رابطے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی لمحات بعد رابطہ ہو گیا۔ چاچا عبدالمجید کی شناسا سا آواز میرے کانوں میں گونجی تو میرا لہجہ حد درجہ جذباتی ہو گیا۔ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں ہوں چاچا......"

"خیر تو ہے نا پتر......" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں پہنچ گیا ہوں۔" میں نے کہا ہی تھا کہ دوسری جانب سناٹا چھا گیا۔ یوں جیسے میری بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"کیسے ہیں وہ......؟" چاچا عبدالمجید نے یوں پوچھا جیسے وہ میرا جواب جانتے ہوں اور سننا بھی نہ چاہتے ہوں۔

"میں بتا نہیں سکتا۔" میرا لہجہ رو دینے والا ہو گیا تھا۔

"میں سمجھ گیا ہوں پتر۔" انہوں نے کڑک دار آواز میں کہا پھر کچھ دیر بعد بولے: "لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ہمت......"

"نہیں چاچا ایسی بات نہیں، بس یہ وقتی کیفیت ہے۔" میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو وہ سکون سے بولے۔

”بالکل، یہ فطری سی بات ہے۔ بہر حال گھبرانے کی ضرورت نہیں، مجھے ساری معلومات دو، میں کرتا ہوں کچھ۔“

”میرے پاس چند ویڈیوز کے علاوہ مزید کچھ بھی نہیں ہے، پتہ نہیں یہ کب کی ہیں، اس وقت وہ کس حال میں ہیں، ہیں بھی یا........“ یہ کہتے ہوئے میں رک گیا پھر انتہائی اختصار سے انہیں بتا دیا۔ سب کچھ سن کر وہ بڑے اطمینان سے بولے۔

”کوئی بات نہیں، تم وہ ویڈیوز مجھے بھیجو۔ جگہ کا بھی اندازہ ہو جائے گا اور جو تم سے پہلے اس مشن پر جا چکے ہیں، ان کا رابطہ بھی تمہارے ساتھ ہو جائے گا۔ تم بس خود پر قابو رکھنا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں ابھی بھیجتا ہوں۔“ میں نے کہا اور الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

میں واپس کمرے میں گیا۔ لیپ ٹاپ آن کر کے ویڈیوز جا جا کو بھیج دیں۔ کچھ دیر بعد ان کا جواب آ گیا کہ پہنچ گئیں ہیں۔ ساتھ میں یہ تنبیہہ بھی کر دی کہ خود پر ہر طرح سے قابو رکھنا ہے، یہ بہت نازک وقت ہے۔

آدھی رات سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ رتنا ہاتھوں میں چائے کے مگ پکڑے کمرے میں آ گئی۔ اس نے ایک مگ مجھے تھمایا اور دوسرا خود لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ خاموشی سے چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔ میں بھی چائے پینے لگا۔ کافی دیر بعد اس نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا۔

”رانا، بولو کس بات نے اتنا دکھی کر دیا ہے تمہیں؟“

اس کے یوں کہنے پر میں چند لمحے یوں چپ رہا جیسے سوچ رہا ہوں، پھر مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

”رتنو، جب کوئی بے بس انسان پر ظلم ڈھاتا ہے نا، وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔

سامنے طاقتور دشمن ہے یا کمزور، جیسا بھی ہے اگر وہ ہتھیار اٹھائے ہوئے ہے تو اس سے مقابلہ بنتا ہے۔لیکن۔۔!وہ جو کمزور ہے، بے بس ہے، جسے قیدی بنالیا جاتا ہے، اور پھر اس سے غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے، وہ برداشت نہیں ہوتا۔"

"پرتاپ سنگھ، ایسا کر سکتا ہے، یہ میں مانتی ہوں، مگر یہ تجھے کہاں سے احساس ملا؟" وہ سرسراتے ہوئے تجسس بھرے لہجے میں بولی۔

"یہی جو ملکیت سنگھ نے پڑھنے اور دیکھنے کو دیا، اسی میں کچھ ویڈیو کلپ ہیں، انہیں دیکھ کر لگا مجھے۔" میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"دکھاؤ مجھے۔" اس نے تجسس بھرے انداز میں کہتے ہوئے لیپ ٹاپ کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے وہ خاص ویڈیوز نکال کر لیپ ٹاپ اسے دے دیا۔ وہ کچھ دیر تک دیکھتی رہی، پھر سر اٹھا کر بولی۔ "یہ تو اس کا ایسا خاص کام ہے، جس پر ریاست بھی اس پر اعتماد کرتی ہے۔"

"اچھا، مطلب......" میں نے کہنا چاہا لیکن وہ بولی۔

"اسی کے بل بوتے پر وہ من مانی کرتا ہے۔"

"یہ جگہ کہاں ہے؟" میں نے اپنے لہجے پر پوری طرح قابو رکھ کر یوں سرسری سے انداز میں پوچھا۔ وہ کچھ لمحے سوچتی رہی پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے لاپرواہی سے بولی۔

"مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں، لیکن اتنا یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ اسی علاقے میں ہو سکتا ہے۔"

"یہ ویڈیو کس نے بنائی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو ایک راز ہے۔ اس قدر حساس......" اس نے کاندھے اُچکاتے ہوئے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"ملیت سنگھ کو تو پتہ ہوگا؟"

"ممکن ہے۔" اس نے سکون سے کہا پھر چونک کر بولی، "تمہیں اس ویڈیو سے اتنی دلچسپی کیوں ہو گئی ہے؟"

یہی وہ سوال تھا جس سے میں بچنا چاہ رہا تھا۔ اگر میں انہیں اپنی دلچسپی کے بارے میں بتا دیتا تو میرا مقصد نجانے کہاں گم ہو جاتا اور وہ مجھے اسی دلچسپی کی وجہ سے نجانے کب تک بلیک میل کر کے اپنا مطلب نکالتے رہتے۔ میں انہیں تو کیا کسی کو بھی اس کی بھنک نہیں لگنے دینا چاہتا تھا۔ سو بڑے آزردہ لہجے میں کہا۔

"یہ جو قیدی ہیں، وہ کس قدر بھیانک حالات میں ہیں۔ سب سے زیادہ مجبور، بے بس اور لاچار زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ یہ انسانیت کی تذلیل اور ظلم کی انتہا ہے۔"

"بے شک ایسا ہی ہے۔ لیکن نہ اس مقام کے بارے میں پتہ ہے اور نہ اس کی جگہ کی سیکورٹی بارے علم ہے۔" رتو نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

"پتہ کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہی وہ مقام ہے جہاں ضرب لگائی جائے تو پرتاب سنگھ کی قوت کو ختم کیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا تو رتو خاموش رہی۔ پتہ نہیں اسے میری بات سمجھ میں نہیں آئی تھی یا وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ ہم میں خاموشی آن ٹھہری تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"تم آرام کرو، صبح کوئی پلاننگ کرتے ہیں۔"

"اوکے۔" میں نے کہا اور بیڈ پر پھیل گیا لیکن نیند میری آنکھوں سے غائب تھی۔ مجھے سوچوں نے گھیر لیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے بھی نیند میری آنکھوں میں نہیں اتری تھی۔ یہاں تک کہ صبح کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ میری حالت اس وقت یوں تھی کہ جیسے کوئی دیوار کے ایک

طرف کھڑا ہو اور اسے یقین ہو کہ دیوار کے دوسری جانب اس کا ہدف اس کا انتظار کر رہا ہے۔ یہاں دیکھی دیوار مجھے حد درجہ بے چین کر رہی تھی۔ میں ان لوگوں کو چھوڑ کر خود اپنے طور پر کوشش کروں یا ان کے ساتھ رہ کر اپنے ہدف تک پہنچنے کی کوشش کروں؟ یہی سوال اس وقت میرے دماغ میں گونج رہا تھا۔ میری سوچ کو کوئی سرا نہیں مل رہا تھا کہ ایسے میں سیل فون بج اٹھا۔ میں نے کال رسیو کی تو دوسری جانب ایک بھرپور مردانہ آواز ابھری۔ اس نے صاف انگریزی لہجے میں پوچھا۔

"رانا ویر سنگھ بول رہے ہو......؟"

"ہاں، میں بات کر رہا ہوں، آپ کون؟" میں نے پوچھا ہی تھا کہ دوسری طرف سے چاچا عبدالمجید کی آواز ابھری۔

"تمہاری بھیجی ہوئی ویڈیو میں نے دیکھ لی تھیں۔"

"اوہ، تو آپ ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تیمور ہے لیکن یہاں پر ایک ہندو نام سے رہ رہا ہے۔ یہ بھی تمہاری طرح اسی ہدف کے لئے یہاں ہے۔" چاچا عبدالمجید نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"رانا جی، میں تھوڑی دیر پہلے یہاں دیوگڑھ پہنچا ہوں۔ ہوتی ہے ہماری ملاقات، میں کرتا ہوں فون۔" تیمور نے کہا تو الوداعی باتوں کے بعد کال ختم ہو گئی۔ میرے ذہن میں چند لمحے پہلے جو الجھن تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر کامران ملک اور ڈاکٹر فائزہ ملک نے اس وقت شادی کی تھی جب وہ امریکہ سے ڈگری لے کر واپس وطن آئے تھے۔ اگرچہ ان کے درمیان محبت کی کونپل تبھی پھوٹ پڑی تھی،

جب دیارِ غیر میں پڑھتے ہوئے ایک برس بھی نہیں ہوا تھا۔ تقریباً تین برس تک انہوں نے اکٹھے پڑھتے، ایک دوسرے کو سمجھتے ہوئے اور بہترین دوستی میں گزار دیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ واپس وطن جائیں گے۔ وہیں اپنے والدین سے بات کریں گے اور ان کی مرضی سے شادی کریں گے۔ والدین کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سو دو خاندانوں نے ہنسی خوشی ان کی شادی کر دی اور وہ بھرپور زندگی گزارنے لگے۔

ڈاکٹر کامران ملک اور ڈاکٹر فائزہ ملک نے وطن واپس آ کر حکومت کے خصوصی ادارے میں ایٹمی توانائی کی چند جدید شاخوں پر اپنی پوری قوت صرف کر دی۔ جس طرح ان کے درمیان محبت شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی، اسی طرح وہ اپنی تحقیق میں مگن رہے۔ ان کے ہاں ایک بیٹا اور دوسری بیٹی پیدا ہوئی۔ جن کی پرورش ددھیال میں ہونے لگی۔ وہاں انہیں زندگی کی تمام تر سہولیات میسر تھیں اور یہ دونوں میاں بیوی بے فکری سے اپنی تحقیق میں مگن رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے عالمی سطح پر خود کو منوا لیا۔ وہ جس طرح اپنی تحقیق میں کامیابیاں سمیٹے جا رہے تھے، اسی قدر ان کی حفاظت کا بندوبست بھی کیا جا رہا تھا۔

تقریباً چھ برس تک میں ان کی حفاظت پر مامور رہا تھا۔ اس دوران ان کا میرے ساتھ ہی نہیں اپنی حفاظت پر مامور ہر شخص کے ساتھ ایسا سلوک تھا جیسے والدین اپنے بچوں کے ساتھ رکھتے ہیں۔ میرا وہاں پر جتنا بھی وقت گزرا تھا، میں اسے اپنی زندگی کا شاندار ترین دور سمجھتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا جیسے میں اپنے والدین کی خدمت پر مامور ہوں۔

دو برس قبل وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے تھے تو ہمیں بھی وہاں سے جانا پڑا۔ کچھ نئے لوگ وہاں آ گئے۔ یہ ڈاکٹر کامران ملک اور ڈاکٹر فائزہ ملک کی زندگی کا ایک نیا فیز تھا۔ اس میں وہ عالمی سطح پر مختلف فورم پر اپنے مقالات پڑھتے، اپنے نکات کو منواتے اور اپنے

شعبے کے عالمی لوگوں سے ملنے لگے تھے۔

دو ماہ قبل وہ تھائی لینڈ کے شہر پٹایا میں ایک عالمی فورم کے لیے گئے تھے۔ کانفرنس کے اختتام پر وہ اپنی سیکورٹی کے حصار میں ہوٹل واپس جا رہے تھے کہ راستے میں کہیں اغوا ہو گئے۔ وہ نہ صرف خود اغوا ہوئے بلکہ ان کی سیکورٹی کے دونوں لوگ بھی غائب تھے۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ تمام تر کوشش کے باوجود ان کا سراغ نہیں ملا تھا کہ وہ کہاں پر ہیں؟ ان کی بازیابی کے لیے جہاں اور بہت سارے لوگ کام کر رہے تھے، وہاں مجھے بھی حکم ملا کہ میں انہیں تلاش کرنے نکل پڑوں۔ یہ تلاش صرف ایک اڑتی ہوئی اطلاع پر تھی کہ ممکن ہے انہیں راجھستان کے کسی علاقے میں رکھا ہوا ہو۔

دنیا بھر میں جہاں جہاں بھی خفیہ ایجنسیاں کام کر رہی ہیں، وہاں ان پر نگاہ رکھنے کا بھی پورا پورا انتظام موجود ہے۔ یہ ایک دوسرے کی سوچ سے بھی آگے جا کر کام کر رہی ہیں۔ جو پہلے سوچ گیا اور اس پر عمل کر گیا اسے کامیابی ملتی ہے۔ دہشت گردی کی طرز پر حتی وارداتیں وہی ایجنسیاں کر رہی ہیں جو ذہنی طور پر اپنی شکست تسلیم کر چکی ہیں۔ یا پھر ایک ایجنسی اپنا مقصد لے کر چل رہی ہے تو دوسری اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ کئی ان دیکھے محاذ ہیں جہاں یہ سب ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ میرا انفرادی طور پر ان کی تلاش میں جانا بھی ایک ایسی ہی خفیہ پلاننگ کا حصہ تھا۔ کسی کی سمجھ ہی میں نہ آ سکے کہ میں کون ہوں، مجھے کہاں جانا ہے؟ میرا ہدف کیا ہے؟ اس وقت تک میں کسی پر کھل ہی نہ سکوں کہ میں کس مقصد کے لیے نکلا ہوں جب تک میں ہدف کو پوری طرح نہ پالوں۔ میرے لاشعور میں تھا کہ میری طرح اور لوگ بھی ہوں گے جو اس راہ کے مسافر بن گئے ہوں۔ کون کس طرح، کہاں پر کام کر رہا تھا، مجھے نہیں معلوم تھا۔ اب جبکہ میں اتفاقاً اپنے ہدف تک پہنچ گیا تھا۔

اصل میں اب میرا امتحان شروع ہوا تھا۔ روہی میں وارد ہونے سے لے کر یہاں پہنچ جانا اسی تلاش کا ایک ایسا حصہ تھا کہ اگر کوئی میرے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا، یا میں کہیں پکڑا جاتا تو اصل ہدف کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ میں اگر اس تاریک راہ میں مارا بھی جاتا تو یہ راز میرے ساتھ ہی دفن ہو جاتا۔

میں اپنے ہدف تک پہنچ گیا تھا۔ شاید یہ اتنا بڑا کام نہیں تھا، اصل کامیابی یہ تھی کہ میں ڈاکٹر کامران ملک اور ڈاکٹر فائزہ ملک کو پوری حفاظت سے نکال کر واپس وطن پہنچا دیتا۔ ایسا ممکن تھا یا نہیں، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

☆......☆......☆

وہ دیوگڑھ کا مہنگا ترین ہوٹل تھا جس کے لمبے اور بڑے کاریڈور تھے۔ محراب دار ستونوں پر بنی چھت کے نیچے ٹیبل سجے ہوئے تھے۔ وہاں بیٹھ کر سامنے پر سکون جھیل کا نظارہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ لمبے قد والا تیمور نپے تلے قدم اٹھا کر میری جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ میں نے اگر اسے پہلے نہ دیکھا ہوتا تو شاید پہچان ہی نہ پاتا۔ وہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ پہلی نگاہ ہی میں ہندو دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سفید کرتا اور پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ کلین شیو اور سر پر ہلکے ہلکے بال تھے۔ وہ دھیمی سی مسکان کے ساتھ میرے پاس آیا اور میرے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔ اس نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں پچھلے ایک ماہ سے پنجاب کے مختلف علاقوں میں بھٹک رہا ہوں۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اتنی جلدی یہاں تک پہنچ جاؤں گا۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”لوکیشن کا کوئی پتہ چلا؟“

''ابھی تک تو نہیں، تم سناؤ، تمہارا کیا پلان ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں نزدیک ہی محبوب علی پیا کی درگاہ ہے۔ اس کے عقب میں ایک گھر ہے، آج شام تک وہاں کچھ دوست پہنچ رہے ہیں۔ ان میں ایک بندہ مقامی ہے۔ دیکھیں، کیا ہوتا ہے؟''

یہ کہہ کر اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم بولو......؟''

''یہاں ایک عورت ہے رانی بھاگ وتی، اس کی پرتاب سنگھ کے ساتھ کیا دشمنی ہے، یا کیا معاملہ ہے ابھی تک مجھ پر نہیں کھلا، لیکن وہ چاہتی ہے کہ پرتاب سنگھ ختم ہو جائے۔ وہ جو پرتاب سنگھ نے اپنا قد آور بت بنا لیا ہے اسے زمین بوس کرنا ہے، یہی ٹاسک دیا ہے اس نے مجھے۔ اب اگر تم لوگ......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں بالکل نہیں، تم اس کے ساتھ رہو اور اس کی قوت پوری طرح استعمال کرو۔ یہ اچھا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں رات تک تمہیں ساری صورت حال بتا دوں گا۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''کیا تم جانتے ہو رانی بھاگ وتی کو؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''پوری طرح تو نہیں لیکن یہاں کے کچھ لوگوں کے بارے میں ضرور معلومات حاصل کی ہیں۔ لگتا ہے رانی بھاگ وتی کوئی معمولی شے نہیں ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے کافی معلومات لی ہیں۔'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا تو مسکاتے ہوئے بولا ''اور بھی بڑے مگرمچھ ہیں، لیکن وہ زیادہ پرتاب سنگھ کی طرف ہیں۔''

''مگر ہمیں کیا، بہر حال تمہیں سب سے پہلے محفوظ پناہ گاہ لینا ہو گی۔'' میں نے اپنے اطمینان کے لئے اسے مشورہ دیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''ابھی تک اس ہوٹل سے بڑھ کر محفوظ پناہ گاہ کوئی نہیں ہے۔ یہاں سے رابطہ کرنے میں

بڑی آسانی ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے غیر محسوس انداز میں اپنی جیب میں سے ایک سیل فون نکالا اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا" یہ میرے اور تمہارے درمیان رابطے کا کام دے گا، یہ خاص ہے اور انتہائی محفوظ ہے۔ یہی دینے کے لئے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔"

میں نے اک نگاہ سیل فون پر ڈالی اور اسے جیب میں رکھنے کی بجائے اپنے سامنے رکھ لیا۔ ایسے ہی وقت ایک ویٹر ہمارے لئے لنچ لے کر آ گیا۔ تیمور نے پہلے ہی آرڈر دے دیا ہوا تھا۔ لنچ کے دوران ہم نے بہت ساری باتیں کیں۔ ہم نے ماضی کو نہیں دیکھا بلکہ ساری گفتگو اسی حوالے سے رہی کہ آنے والے دنوں میں کیا کرنا ہوگا۔ لنچ کے بعد میں وہاں سے اٹھنے لگا تو اس کا دیا ہوا سیل فون میں نے جیب میں رکھ لیا۔ تبھی وہ بولا

"شام تک جو بھی ہوا، میں فون پر بتا دوں گا۔ تم جو چاہو سو کرو، میں اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔"

"اوکے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے نمسکار کے لئے ہاتھ جوڑے اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

میں انتہائی محتاط تھا۔ میں کوئی بھی ایسا پہلو نظر انداز نہیں کر رہا تھا جس سے کوئی بھی میری طرف متوجہ ہو جائے۔ یہاں تک کہ یہاں آتے ہوئے میں نے رجنو کو بھی نہیں بتایا تھا۔ میں تیمور کی دی ہوئی لوکیشن پر پہنچ گیا تھا۔ واپسی پر میں کافی حد تک راستے سے واقف ہو گیا تھا۔ میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ رجنو کی کال آ گئی۔

"کہاں ہو تم......؟" اس کے لہجے میں ہلکی ہلکی تشویش تھی۔

"یہیں تمہارے شہر کی سیر کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا تو وہ تیزی سے بولی۔

"تم جہاں بھی ہو، فوراً واپس پہنچو۔"

"خیریت ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"یہاں آ جاتے ہو تو بتاتی ہوں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جب اس نے بتانا مناسب نہیں سمجھا تو میں نے بھی اسے اپنے ذہن پر سوار نہیں کیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں واپس پہنچا تو رتنو لاؤنج میں ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھا تو وہ چند لمحے میری جانب دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔

"رانی جی نے ایک صلاح دی ہے، اگر تمہیں اچھی لگے تو......؟"

"کیسی صلاح؟" میں نے پوچھا۔

"ان کی ایک فیکٹری دو چار برس سے بند پڑی ہے۔ صلاح یہ ہے کہ تم اسے دوبارہ چالو کرو۔ وہ......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو فیکٹری وغیرہ کا کوئی تجربہ ہی نہیں، میں کیسے چالو کر سکتا ہوں۔"

"تمہیں کچھ نہیں کرنا، دوسرے بہت لوگ ہیں کرنے والے، بس تمہارا یہاں رہنے کا جواز پیدا کرنا ہے۔ میں اور تم دونوں اس کی نگرانی کر چھوڑیں گے۔" اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تو ٹھیک ہے، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ یوں پڑے رہنے سے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا اچھا ہے۔" میں نے کاندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

"رانی چاہتی ہیں کہ پرتاب سنگھ کے بارے جو کرنا ہے وہیں سے کریں۔" اس نے اصل بات بتائی تو میں سمجھ گیا۔ مجھے لگا کہ رانی بھاگ وتی ذہنی طور پر پرتاب سنگھ کی نہ صرف برتری قبول کر چکی تھی بلکہ اس سے خوف زدہ بھی تھی۔ وہ طاقت جمع کر کے اس کے خلاف استعمال بھی کرنا چاہتی تھی لیکن کسی بھی ردعمل سے ڈرتی تھی۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے اور کیا کرنے والی ہے۔ مجھے چند دن یہاں رکنا تھا۔ جیسے ہی میں اپنے ہدف

تک پہنچ جاتا، اس کے بعد میرا یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"آؤ پھر چلیں، فیکٹری دیکھ کر آتے ہیں۔"

میں اٹھا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ پورچ میں کار کھڑی تھی۔ رتنو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنے پہلو میں پسٹل کو چیک کیا اور پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ شاہراہ پر آ کر رتنو نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پرتاب راؤ کل شام ہی سے شہر میں نہیں ہے۔ وہ کسی اجلاس کے لئے دلّی گیا ہے۔ اگلے دو دن تک اس کے آنے کا امکان نہیں۔"

"کیا یہ کوئی حیرت انگیز خبر ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں، حیرت انگیز نہیں۔" اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"تو پھر اصل بات کہو، کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں حیران تھی کہ ابھی تک پرتاب راؤ کی طرف سے کوئی ردعمل نہیں ہوا، ایک خاموشی تھی۔" یہ کہہ کر وہ سانس لینے کو رکی تو میں نے پوچھا۔

"خاموشی تھی مطلب، اب کیا ہوا، جو تم اتنی پریشان ہو؟"

"تھوڑی دیر پہلے پتہ چلا ہے اس نے بجندر کو یہ ٹاسک دیا ہوا تھا کہ کیسینو کے حملہ آوروں کو تلاش کرے، اس نے اب تک کئی لوگوں کو اٹھا لیا ہوا ہے۔ ظاہر ہے وہ ہمارے آدمی بھی اٹھائے گا۔" رتنو نے اصل تشویش کا اظہار کیا تو میں نے بڑے سکون سے کہا۔

"تم اپنے لوگوں کو ایسے ہی الرٹ کر دو......"

"وہ تو میں نے کر دیا، اب دو ہی باتیں ہوں گی۔ وہ ہمارے لوگوں کی طرف رخ کرے گا

تو ہمیں بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ یا پھر وہ نہیں آئے گا۔ اسی سے اندازہ ہوگا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔'' رجو نے کہا تو مجھے اس کی باتیں بڑی بچکانہ سی لگیں۔ وہ پتہ نہیں کس طرح سوچ رہی تھی یا پھر یہ ساری کی ساری سوچیں رانی بھاگوتی کی تھیں۔ وہ نجانے کتنا لمبا پلان کر کے بیٹھی تھی۔ میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

دیوگڑھ کے جنوبی علاقے میں جہاں شہر کی آبادی کم تھی، وہ فیکٹری وہاں پر تھی۔ وہ آبادی نئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جب فیکٹری بنائی گئی تھی، تب یہاں آبادی نہیں تھی۔ گیٹ پر چوکیدار تھا۔ وہ رجو کو دیکھ چکا تھا۔ اس نے گیٹ کھول دیا۔ ہم کار سمیت اندر چلے گئے۔ وہاں چھ چوکیدار تھے۔ جو ہمارے وہاں پہنچتے ہی جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ایک طرف رہائش گاہیں تھیں، جہاں کوئی بھی نہیں رہتا تھا۔ کچھ کوارٹرز تھے جن میں یہ چوکیدار موجود تھے۔ دفاتر کی حالت بھی کافی خستہ ہو چکی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے دوبارہ اپنی درست حالت میں لانے کے لئے کئی ماہ درکار تھے۔ اسی وقت میرے دماغ میں آ گیا کہ یہاں پر توجہ دینا وقت کا ضیاع ہوگا۔

سورج ڈھلنے کے بعد ہم وہاں سے نکلے تو موسم خاصا خوشگوار ہو رہا تھا۔ مجھے تیمور کی طرف سے فون کال کا انتظار تھا۔ میرا ذہن اسی طرف لگا ہوا تھا۔

رجو کار بھگائے چلی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مجھے وہی باتیں بتا رہی تھی جو میں پرتاب سنگھ کے بارے میں جان چکا تھا۔ وہ شہر میں موجود مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کے بارے میں بتاتی چلی جا رہی تھی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی سن رہا تھا۔ مجھے رستوں کا اندازہ نہیں تھا۔ بس ایسے ہی لاشعوری انداز میں ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اندھیرا ہو جانے اور پھر روشنیاں جگمگانے کے باعث کچھ ایسا اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ رجو نے ایک ریستوران کے سامنے

کار دھیمی کی اور پھر اس کی پارکنگ میں روک دی۔

شہر سے دور وہ ایک پرسکون جگہ تھی۔ ریستوران کے پیچھے شہر اور سامنے کی جانب پہاڑی سلسلہ تھا۔ دور بائیں جانب کافی بڑی سڑک تھی۔ ہم اوپن ایئر میں آبیٹھے۔ سرسبز لان میں دھیمی روشنی اور ہلکا ہلکا میوزک ماحول کو خوشگوار بنا رہا تھا۔ ہمارے درمیان میز پر ایک لالٹین رکھی ہوئی تھی جس میں الیکٹرک بلب یوں جگمگا رہا تھا جیسے شعلہ بھڑک رہا ہو۔ ہمیں آئے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ ویٹر آرڈر لینے آ گیا۔ رمشا اسے سمجھانے لگی تو اس دوران تیمور کا فون آ گیا۔ میں نے کال رسیو کرتے ہوئے محض ہیلو کہا تو تیمور مجھے وہاں ہونے والی میٹنگ کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کا لب لباب یہی تھا کہ وہ کل آٹھ لوگ ہیں جن میں دو مقامی بھی ہیں اور وہ ہمہ وقت تیار ہیں۔ آج رات وہ پوری کوشش کریں گے کہ وہ جگہ تلاش کر لی جائے۔ میں نے ساری بات سمجھ کر فون بند کر دیا۔

رمشا آرڈر دے کر میری جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ وہ فون بارے تجسس کرے گی لیکن اس نے پوچھا نہیں۔ ممکن تھا کہ وہ پوچھتی اچانک اس کے چہرے پر حیرت ملی تشویش پھیل گئی، یوں جیسے اس نے کسی کو غیر متوقع طور پر دیکھ لیا ہو۔ میں نے اس کی نگاہوں کے رخ پر مڑ کر دیکھا تو سامنے سے چار لوگ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔

”کیا بات ہے رمشا؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”جمشید ر......“ اس نے سرسراتے ہوئے کہا تو میں ایک دم سے چوکنا ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے جو اس نے اندازہ لگایا تھا وہ سچ ہوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چند لوگ تھے اور آتے ہی ہمارے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ ان کے درمیان لمبے سے قد والا جوان کرسی کھینچ کر میرے

دائیں جانب آبیٹھا۔ اس کے لمبے لمبے بال تھے۔ اجاڑ قسم کی داڑھی اور مونچھیں، آنکھیں سرخ، گلے میں شیو کا لاکٹ، کرتا پاجامہ پہنے ہوئے وہ میری جانب دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے میری جانب دیکھتا رہا پھر مجھ پر نگاہیں ہٹائے بغیر بولا۔

"رتو ڈارلنگ، بتاؤ کی یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟"

تبھی رتو نے کسی جھجک کے بغیر فوراً اعتماد سے کہا۔

"میرا منگیتر ہے، شری رانا ویر سنگھ۔"

"کب آیا ہے یہ تمہارے پاس؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تو میں نے ہلکی سی مسکان کے ساتھ اس سے کہا۔

"تم ایسا کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ارے، ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری کوئی خدمت کی جائے۔ رتو کو چاہے برا لگے مگر تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہوگا، اٹھو......" آخری لفظ اس نے درشت انداز میں تحکمانہ لہجے میں کہے تو میں نے پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

"رتو کو برا لگے یا نہیں لیکن مجھے تمہارا یہ گھٹیا پن بہت برا لگ رہا ہے۔ اس لئے فوراً اپنی شکل گم کر جاؤ۔"

"او واہ......" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا پھر ہنستے ہوئے بولا، "چلو کوئی تو میرے سامنے بولا، کسی نے تو بات کی، رتو اسے سمجھا، اسے نہیں پتہ میرے بارے میں۔"

"تمہاری اس گھٹیا فلمی انٹری سے میں سمجھ گیا تھا کہ تم کوئی تھرڈ کلاس قسم کے غنڈے ہو۔ اس سے زیادہ جاننے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو اردگرد کھڑے لڑکوں نے اپنے ہتھیاروں کی نمائش کر دی۔ ایک آدھ نے تو پسٹل کا بولٹ بھی مار دیا۔

"سیانے سچ کہتے ہیں، لاعلمی بڑی شے ہے۔ تمہیں میرے بارے میں نہیں پتہ، اس سے پہلے کہ میں تمہیں توڑ پھوڑ کر یہاں سے لے جاؤں، اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔" اس نے غراتے ہوئے کہا۔

"کیا عورتوں کی مانند ہتھیاروں کے بل بوتے پر دھمکیاں لگائے چلے جا رہے ہو۔ اگر تم اپنے ہاتھ سے مجھے توڑ پھوڑ کے لے جاؤ تو مجھے تمہارے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" میں نے کاندھے اُچکاتے ہوئے کہا ہی تھا کہ اس نے میری گردن پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اس کی کلائی پکڑ کر اسے وہیں روک دیا۔ وہ پوری قوت لگا کر اپنا ہاتھ بڑھانے کی کوشش میں تھا کہ میری گردن پکڑ سکے، مگر میں نے اسے وہیں ساکت کر دیا تھا۔

وہ پورا زور آگے کی جانب لگا رہا تھا۔ تبھی میں نے اسی کے زور کو استعمال کرتے ہوئے اچانک آگے کی جانب دھکیل دیا۔ وہ کھنچا چلا آیا۔ وہ میز اور کرسی کے درمیان گرا تو میں نے اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ اسی دوران میں نے اپنا پسٹل نکال کر اس کی گدی پر رکھ دیا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ میں نے ہی انتہائی تیزی دکھائی ہے لیکن اس وقت میرے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی جب رتو کسی گیند کی طرح اچھلی، سامنے والے لڑکے کا ذرا سا سہارا لے کر اس کے اوپر سے ہوتی ہوئی اپنے پاؤں پر جا کھڑی ہوئی۔ اس کے بدن کی لچک اور پھرتی ناقابل اعتبار تھی۔ اسی دوران مجھے کسی ہتھیار کے بلٹ مارنے کی آواز آئی تو میں نے غرا کر کہا۔

"مر جائے گا یہ......"

وہ سب ساکت ہو گئے۔ بجندر میرے پاؤں کے نیچے پوری قوت سے مچل رہا تھا۔ شاید اسے احساس نہیں تھا کہ میرے ہاتھ میں پسٹل ہے۔

"پیچھے ہٹ جاؤ، ورنہ جان سے جاؤ گے۔" رتنو کی غراتی ہوئی آواز آئی تو ہمارے اردگرد کھڑے لڑکوں نے دیکھا۔ شاید انہیں فیصلہ کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ وہ حیرت زدہ سے کھڑے ہمیں دیکھتے رہے۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے اردگرد ہلچل مچ چکی تھی۔ ریستوران کے لان میں کئی دوسرے لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے درمیان ہونے والی دھینگا مشتی ایسی نہیں تھی جس سے لوگ متوجہ نہ ہوں۔

"اپنے لوگوں کو ہٹ جانے کا کہتے ہو یا پھر کروں سوراخ تمہارے دماغ میں۔" میں نے بھندر سے کہتے ہوئے نال اس کی گردن میں چبھو دی۔ اسی لمحے وہ سہم گیا۔ موت کا خوف بڑا ظالم ہوتا ہے۔ اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

"پیچھے ہٹو۔" رتنو کی آواز آئی تو وہ لڑکے پیچھے ہٹنے لگے۔

"رتنو، ان سب سے ہتھیار لے کر تلاشی لو۔" میں نے اونچی آواز میں کہا تو رتنو انتہائی تیزی سے آگے بڑھی۔ اس کے اپنے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ رتنو نے ان سے ہتھیار لے کر میز پر ڈال دیئے۔ پھر ان کی تلاشی لے کر بولی۔

"ہو گیا۔"

تبھی میں نے بھندر کی گردن سے پاؤں ہٹا لیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنا پسٹل رتنو کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے پکڑ لیا تو میں نے اپنا ہاتھ پھیلا کر اونچا کر دیا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ آؤ اب میرے مقابلے پر۔ وہ انتہائی غصے میں میری جانب دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے اپنی ہزیمت پر شرمندگی تھی اس لئے وہ بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح میری جانب بڑھا۔ یہ اس کی ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا اظہار تھا۔ جس کا میں پوری طرح فائدہ

اٹھا سکتا تھا۔ میں نے اسے ذرا سی جھکائی دی تو وہ اپنی جھونک میں آگے بڑھ گیا، میں نے تیزی سے اسے کمر سے پکڑا، اسے اوپر اٹھایا اور لان کی سبز گھاس پر پٹخ دیا، اس کے ساتھ ہی ایک بھرپور ٹھوکر اس کی پسلیوں میں ماری۔ اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اسی لمحے ایک لڑکا مجھ پر حملہ آور ہوا تو رنجو نے اس پر فائر کر دیا۔ وہ ایک دم سے ٹھٹک کر رک گیا۔ گجندر اٹھنا چاہ رہا تھا کہ میں نے ایک مزید ٹھوکر اس کے سر پر ماری، وہ پھر زمین بوس ہو گیا۔ ایسے میں ایک طرف سے کافی سارے لوگ بھاگتے ہوئے آ گئے۔ وہ ریستوران کا منیجر تھا۔

"سر سر کیا ہو گیا۔"

"اس سے پوچھو، جو ہمیں اغوا کرنے آیا تھا۔" مجھ سے پہلے ہی رنجو نے انتہائی غصے میں کہا

"سر چھوڑیں، میں دیکھتا ہوں، میں نے پولیس بلوا لی ہے، وہ بس آتے ہی ہوں گے۔" منیجر نے لجالت سے کہا تو میں نے ایک دم سے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ جو تینوں کھڑے ہیں، انہیں پولیس کے حوالے کریں، اسے میں خود اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔"

"آپ سر کہاں...... میں دیکھتا ہوں نا۔" اس نے منت بھرے انداز میں کہا لیکن میں جو سوچ چکا تھا اس پر عمل کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے گجندر کو کالر سے پکڑا اور پارکنگ کی جانب چل پڑا۔ رنجو سمجھ گئی کہ میں کیا کرنا چاہ رہا ہوں۔ وہ تیزی سے میز کی جانب بڑھی، وہاں پڑے ہتھیار اٹھائے اور تیزی سے پارکنگ کی جانب چل دی۔

میں گجندر کو پکڑے وہاں تک گیا تو وہ کار اسٹارٹ کیے کھڑی تھی۔ میں پچھلا دروازہ کھولا اور گجندر کو اس میں پھینک کر خود اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تبھی میں نے پوچھا۔

"ہتھیار کہاں ہیں؟"

”وہ جھاڑیوں میں......“ اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”چلو، کسی ویرانے میں۔“ میں نے کہا تو اس نے کار بھگا دی۔

بجندر سیٹوں کے درمیان پڑا مچل رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھ پر حملہ کر دے۔ میں اسے دبا کر بیٹھا ہوا تھا۔ رینو انتہائی رفتار سے کار بھگائے چلی جا رہی تھی۔ پھر ایک دم کار کی رفتار کم ہو گئی اور اس نے کسی کچی سڑک پر کار موڑ لی۔ کار کو ہچکولے لگ رہے تھے جس سے بلاشبہ بجندر کو تکلیف ہو رہی تھی۔ تبھی وہ گھگیاتے ہوئے بولا۔

”کیا تم مجھے مارنے کے لئے لے جا رہے ہو؟“

”تجھے مارنا ہوتا نا تو میں تجھے یہاں تک لانے کی کوشش کبھی نہ کرتا، ہاں اگر تم خود مرنا چاہو تو میں تمہیں مار سکتا ہوں۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”خود مرنا، مطلب......؟“ اس نے دھیمے آواز پوچھا تو میں نے کہا۔

”جو پوچھوں گا اگر بتا دو گے تو کچھ نہیں کہوں گا، اور اگر تم ٹھیک طرح نہیں بتاؤ گے تو خود مرنے والی بات ہے نا۔“ میں نے اس سے کہا تو وہ خاموش ہو گیا تبھی رینو نے کار روک دی۔

باہر اندھیرا تھا۔ رینو نے ہیڈ لائٹس بند کر دی تھیں۔ اگر جلائے رکھتی تو نجانے کتنی دور سے ہم کسی کی بھی نگاہوں میں آسکتے تھے۔ اس نے اپنے سیل فون کی روشنی کر لی۔ میں نے بجندر کو باہر نکالا تو رینو اس پر پسٹل تان کر کھڑی ہو گئی۔ وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف پھیل چکا تھا۔

”کس نے ہم تک بھیجا ہے تمہیں؟“

”میں خود آیا ہوں۔ ہمیں یقین ہے کہ کیسینو پر حملہ کروانے والی بھاگوتی کے علاوہ کوئی دوسری ہو ہی نہیں سکتی۔ میں دو دن سے رینو کی ریکی کروا رہا تھا۔ آج یہ تمہارے ساتھ باہر آ گئی

ہے تو مجھے پتہ چل گیا۔"

"کس نے بتایا تمہیں؟" میں نے اپنا شک دور کرنا چاہا۔

"وہاں فیکٹری میں ایک بندہ ہے ہمارا، اس نے مجھے اطلاع دی تو میں بس پہنچ گیا کہ تم لوگ وہاں سے نکل پڑے۔ میں تمہارے پیچھے آیا ہوں۔" وہ کسی ریکارڈر کی طرح بولنے لگا۔

"رانی جی پر ہی کیوں شک ہوا تمہیں؟" رجو نے پوچھا۔

"اس شہر میں اس کے علاوہ کسی کی جرات نہیں کہ ہم پر ایسا حملہ کر سکے۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"میں یہ تو مانتی ہوں کہ میرا تعلق رانی جی سے ہے، تم میرے منگیتر کے بارے میں یہ کیسے ......" وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ جسبیر تیزی سے بات کاٹ کر بولا۔

"ہمیں یہ اڑتی ہوئی اطلاع مل چکی ہے کہ کوئی بندہ باہر سے آیا ہے، وہ ویر سنگھ کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"چل چھوڑ، کیسینو والے چکر کو، یہ بتا، یہ تیرے پرتاپ سنگھ نے اپنی جیل کہاں بنا رکھی ہے؟" میں جلدی سے مطلب کی بات پر آ گیا۔ اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں کوئی انہونی بات کر رہا ہوں۔ تبھی اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتا۔"

"تو پھر کون جانتا ہے؟" میں نے غصے میں پوچھا۔

"میں صرف ڈرگز کے معاملات دیکھتا ہوں، اس کے علاوہ کیا ہوتا ہے میں نہیں جانتا۔" اس نے کہا تو میں نے رجو کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ اس نے پسٹل میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے پسٹل اس پر تانتے ہوئے کہا۔

"مطلب تم اب مرنا چاہتے ہو؟"

"بھگوان کی قسم، میں نہیں جانتا۔ اس طرح کے کام گوپال داس دیکھتا ہے، وہی سب کرتا ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" میں نے کہا اور اس کی دائیں ران میں فائر جھونک دیا۔ اس کے منہ سے چیخ بلند ہوئی اور وہ تڑپتے ہوئے کہنے لگا "میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے مت مارو......"

"بولو قیدی کہاں رکھے ہیں؟" میں نے غراتے ہوئے پوچھا۔

"بھگوان قسم نہیں معلوم......" اس نے پھر کہا تو میں نے پھر اس کی بائیں ران میں فائر کر دیا۔ اس کی چیخ بلند ہوئی اور وہ زمین پر گر گیا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ میں نے اسے یونہی چھوڑ دیا۔ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ تبھی رتنو میرے قریب ہوئی، اس نے سرسراتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہوسکتا ہے یہ سچ بول رہا ہو؟"

"فون لگواؤ اپنی رانی کو، اس سے پوچھو۔ اسے تو بہر حال مرنا ہے۔" میں نے سرگوشی میں کہا اور بھنڈر کے سر پر جا پہنچا۔ وہ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ میں نے پسٹل کی نال اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اب بھی سچ بول دو۔ بچ جاؤ گے۔"

"میں......سچ......کہہ......رہا ہوں......" اس کے منہ سے اٹک اٹک کر لفظ نکلنے لگے۔

"تمہارا مطلب ہے گوپال داس.... لے چلو گے مجھے اس کے پاس.... میں نے اس سے......"

"مم......مجھے......گولی مارو......" اس نے اذیت ناک لہجے میں کہا۔

"کیوں، میں تو تجھے مارنا نہیں چاہتا۔" میں نے سکون سے کہا۔

"اسے جب ...... پتہ چلا ...... میں نے ...... اس کا نام ...... بتایا ...... ہے ...... وہ ......

مجھے ...... پہلے مارے ...... گا۔" اس نے پھر اکتے ہوئے کہا تو اتنے میں رجو نے میرے قریب

آ کر کہا۔

"یہ سچ کہہ رہا ہے۔"

"چل چھوڑ دیا تجھے۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔

"ہم مجھے ...... ہسپتال ...... لے ......" اس نے کہا مگر میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں

دی۔ میں چلتا ہوا پسنجر سیٹ پر آن بیٹھا۔ رجو تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آئی اور پھر اگلے چند

لمحوں میں ہم وہاں سے نکل پڑے تھے۔

جیسے ہی بڑی سڑک پر آئے۔ رجو نے فون نکالا اور مجانے کس کے نمبر ملا کر اب تک

ہونے والی تمام صورت حال بتانے لگی۔ مجھے یہی اندازہ ہوا کہ وہ ملکیت سنگھ کو سب بتا رہی

تھی۔ شاید اسے کوئی مزید ہدایت ملی تھی یا نہیں۔ اس نے کال ختم کر کے فون جیب میں رکھا تو

میں نے پوچھا۔

"تم جانتی ہو گوپال داس کو۔"

"اسے شہر میں کون نہیں جانتا، وہ ایک بڑا بزنس مین ہے۔ اس کا ایک سیاسی بیک گراؤنڈ

ہے۔ لگتا نہیں کہ وہ اس قدر خفیہ معاملات چلا رہا ہو گا۔" رجو نے کہا۔

"کیا خیال ہے، اس تک پہنچا جا سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں، وہ کون سا جن بھوت ہے۔" رجو نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو مجھے لگا جیسے

اس کا مجھ پر اعتماد بحال ہو گیا۔

”چلو پھر، ایک بار اس طرف چلو، جہاں وہ رہتا ہے۔“

”دیکھ لو، کہیں......“ وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ میں نے اس کا جواب نہیں دیا تو وہ پوری توجہ سے کار چلاتی چلی گئی۔

وہ ایک بڑا سارا بنگلہ تھا۔ آہنی گیٹ سے اندر کا ماحول دکھائی دے رہا تھا۔ وہی بڑے بڑے لان، درمیان میں سفید رہائشی عمارت، پورچ تک جاتی ہوئی سڑک، پیلی روشنی کے بڑے بڑے بلب جگمگا رہے تھے۔

”پتہ نہیں اس وقت وہ گھر پر ہوگا بھی یا نہیں۔“ رتنو نے ہولے سے کہا۔

”کوئی بات نہیں، مل جائے گا وہ بھی۔“ میں بھی ہولے ہی سے بولا اور تیمور والے فون سے وہاں کی لوکیشن اسے بھیج دی۔ پھر ایک ویڈیو بنائی، وہ بھی بھیج دی۔ اس کے ساتھ میں نے یہ لکھ کر بھیج دیا کہ یہ ہے گوپال داس کا گھر جس کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ہی قید خانے کے معاملات دیکھتا ہے۔

اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ سیدھے سبھاؤ جاؤں اور گوپال داس کو گردن سے پکڑ کر کھینچ لاؤں مگر یہ محض سوچ ہو سکتی تھی۔ اس کی عملی صورت بہت مشکل تھی۔ اگر وہ اس طرح آسانی سے مل جاتے ہوتے تو نجانے کب کے، کتنے لوگوں کے ہاتھوں ختم ہو چکے ہوتے۔ اس طرح سوچے سمجھے بغیر کسی پر چڑھ دوڑنا خودکشی کے مترادف تھا۔ میں خود پر قابو پاتا ہوا سامنے سڑک پر دیکھتا رہا۔ رتنو اس بنگلے کے آگے سے گزر کر اگلا کراس بھی پار کر چکی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ رتنو نے کہا تو میں اپنے خیالوں سے باہر آ گیا، پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”یہی کہ اس گوپال داس کو کیسے اٹھایا جائے۔“

"اسے اٹھانا تھوڑا مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

"کیسے......؟"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس کی سیکورٹی اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ زیادہ تر عوام میں رہتا ہے۔ جس طرح یہ عام سیاست دان ڈرامے کرتے ہیں، یہ بھی آئے دن ایسے ڈرامے کرتا رہتا ہے۔ خود کو بڑا مذہبی بنا کر لوگوں کو دکھاتا ہے، پوجا پاٹ کا......" یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رک گئی، پھر یوں چونکی جیسے بہت اہم بات یاد آ گئی ہو۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے اس نے مسکراتے ہوئے کہا، "یہ اس کا معمول ہے کہ وہ ہر صبح مہادیو والی مندر میں پوجا کے لئے جاتا ہے۔"

"واہ، یہ پکی بات ہے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"بالکل پکی بات۔" اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

میں اس سے مزید بات کرنا چاہ رہا تھا کہ انہی لمحات میں اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھے اور پھر فون رسیو کرتے ہوئے اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری جانب سے ایک غصے میں بھری ہوئی مردانہ آواز ابھری۔

"اے رجو، کہاں ہے بجندر......؟"

"مجھے کیا پتہ۔" اس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"بکواس کرتی ہو تم بے غیرت، اگر اسے کچھ ہو گیا تو تمہیں اور تمہاری رانی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے چیختے ہوئے کہا تھا۔

"اے چل بھڑوے، ابھی تم میرے سامنے تو آ کر دکھاؤ، رانی جی کی بات بعد میں کر لینا،

سالا بھونکتا ہے۔" اس نے لفظ چبا کر کہا۔
"دیکھ، جگندر کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ چھوڑ دے اسے۔" اس نے غراتے ہوئے کہا تو رتو بولی۔
"وہ میرے پاس نہیں ہے، میں اسے ویرانے میں پھینک آئی ہوں۔ جاؤ جا کر اسے تلاش کرو۔"
"کہیں تم نے اسے......" اس نے کہتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تو رتو نے گول مول سا جواب دیتے ہوئے کہا۔
"اس نے حملہ کرنے کی غلطی کی، اسے سزا تو دینی تھی نا۔"
"بہت برا کیا تم نے......اب تم نہیں بچ سکتی ہو۔" اس نے دھاڑتے ہوئے کہا۔
"میرے سامنے تو آؤ نا۔" رتو نے طنزیہ انداز میں کہا۔
"میں جانتا ہوں رتو، وہ شخص جو تیرے ساتھ تھا، اسی نے کیسینو پر حملہ کیا، تیرا اور تیری رانی کا جرم اب معاف نہیں ہوگا، تھوڑا سا صبر کر۔" یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ کار میں خاموشی چھا گئی۔
"کون تھا یہ......؟" میں نے پوچھا۔
"یہی جگندر کینگ کا ایک غنڈہ...... پرتاب سنگھ کے پالتو۔" اس نے نفرت سے ہونٹ سیکوڑتے ہوئے کہا۔
"مطلب یہ ہے رتو، ہم دشمنوں کے سامنے کھل گئے ہیں۔" میں نے سکون سے کہا۔
"ان کا اندازہ تو درست ہے۔" رتو نے کہا۔
"رتو......اب ہمارا واپس اپنے ٹھکانے پر جانا شاید خطرناک ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح تم لوگوں کے مخبر ان کے ہاں ہیں، اسی طرح ان کے تمہارے لوگوں میں موجود

ہیں۔ ایک چوکیدار کی مخبری سے بات یہاں تک آن پہنچی ہے۔“

”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ وہ رانی پر تو حملہ نہیں کر سکتے۔ لیکن جہاں میں ہوں گی وہاں ضرور چڑھ دوڑیں گے۔“ اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

”تو پھر......“ میں نے پوچھا۔

”تو کوئی بات نہیں، ہمارے پاس کون سا ٹھکانے کم ہیں، کسی اور جگہ چلے جاتے ہیں۔“ اس نے کہا اور کار کی رفتار بڑھا دی۔

”نہیں، تم ایسے کرو، واپس اسی فیکٹری میں چلو۔“ میں نے کہا تو رینو نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ کچھ لمحے سوچ کر اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اگلے کراس سے وہ دائیں جانب مڑ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ فیکٹری ہی جائے گی۔

میں سوچنے لگا۔ دیوگڑھ کوئی اتنا بڑا شہر نہیں تھا کہ جہاں انسانوں کے سمندر میں کوئی گم ہو جائے اور کوئی اسے تلاش نہیں کر پائے۔ جو لوگ اس شہر پر راج کر رہے تھے، وہ کوئی معمولی لوگ تو نہیں تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کا بندہ ہم مار دیں اور وہ ہمیں تلاش نہ کر پائیں۔ کیسینو پر حملے کے بعد تھوڑا بہت ابہام تھا کہ پتہ نہیں یہ حملہ کس نے کیا ہوگا۔ اب جبکہ انہیں یہ تصدیق ہو گئی تھی کہ یہ سب رانی بھاگ وتی کے لوگ کر رہے ہیں تو ان کا ہمیں تلاش کرنا کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ رانی بھاگ وتی کو براہ راست تھریٹ کر سکتے تھے۔ اس کا ردعمل کیا ہوگا، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ میں ابھی یہ جانتا ہی نہیں تھا کہ رانی بھاگ وتی کس حد تک ان کا سامنا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ میں رانی بھاگ وتی پر پوری طرح اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔

فیکٹری سے تھوڑی دور ہی رنجو نے کار روک دی۔ اس نے کار اس طرح لگائی کہ فوری طور پر کوئی دیکھ نہ سکے۔ میں نے اپنا پسٹل سنبھالا، ڈلیش بورڈ سے میگزین لئے اور نیچے اتر گیا۔ دوسری جانب سے رنجو بھی اتر آئی۔ وہاں پر اندھیرا گہرا تھا۔ ہم بڑے محتاط قدموں فیکٹری کی سمت چل دیئے۔

گیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ ہم نے کچھ دیر وہاں ٹھہر کر یہ یقین کر لیا کہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہاں کون آتا جاتا تھا جو کوئی چوکیدار وہاں بیٹھا رہے۔ گیٹ اندر سے بند تھا۔ دور اندر کہیں بلب روشن تھے۔ وہاں گیٹ پر بالکل اندھیرا تھا۔

”ہم نے اندر سے کسی کو بلانا نہیں، یہ گیٹ ہم نے پار کرنا ہے، کہیں سے دیوار پار کرتے ہیں۔“ میں نے کہا تو رنجو ہنس دی، پھر بولی۔

”تم چاہو تو کوئی دیوار تلاش کرلو، میرے لئے یہ گیٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔“

”مطلب، کس طرح اہمیت نہیں رکھتا؟“ میں نے پوچھا، ابھی لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ وہ ذرا سا پیچھے کو ہٹی، پھر آگے بڑھ کر کسی چھپکلی کی مانند گیٹ پر چڑھتی چلی گئی۔ چشم زدن میں وہ گیٹ کے اوپر تک پہنچ گئی اور اگلے ہی لمحے وہ نیچے اترنے لگی۔ میں اس کے بدن کی لچک کچھ دیر پہلے ریستوران میں دیکھ چکا تھا، جہاں وہ اپنے پاؤں پر سے اٹھی تھی اور ایک ہی لمحے میں لڑکے کے اوپر سے دوسری جانب چلی گئی تھی۔ میں ان چند لمحوں میں جو دیکھ سکا تھا، اس کے پیچھے نجانے کتنی مدت کی ریاضت جھلک رہی تھی۔ وہ وقت نہیں تھا کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا۔ وہ گیٹ کھول چکی تھی۔ میں گیٹ کے اندر چلا گیا۔ اس نے گیٹ بند کر دیا۔

ہم پورچ کی طرف جانے والی سڑک کی بجائے لان میں ہو گئے۔ اگرچہ وہاں پر کافی جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ ہم نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ وہاں پر موجود چوکیداروں کے سر پر اچانک پہنچنا

ہے۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو لازمی طور پر ان میں موجود مخبر کسی کو بھی اطلاع دے سکتا تھا۔ ہم کوئی آواز پیدا کیے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہمارا رخ ان کوارٹرز کی طرف تھا جہاں وہ رہتے تھے۔ ذہن میں یہی خیال تھا کہ وہ اس وقت اپنے کوارٹرز میں ہوں گے۔ وہ کوارٹرز فیکٹری کے دفاتر سے ذرا ہٹ کر دیوار کے ساتھ تھے۔ وہاں چند بلب روشن تھے، جن کی ملگجی روشنی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ وہیں دوسرے عملے کی رہائش گاہیں بھی بنی ہوئیں تھیں۔ جو اس وقت بے آباد تھیں۔ ہم ملگجی روشنی سے بچتے ہوئے کوارٹرز کے پاس پہنچ گئے۔

ہم رک گئے تھے۔ ایک کوارٹر کے اندر سے باتیں کرنے اور قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یوں احساس ہو رہا تھا جیسے کافی سارے لوگ وہاں جمع ہوں۔ ایسے میں رتو میرے ساتھ لگ کر میرے کان میں ہولے سے بولی۔

"لگتا ہے سارے ہی یہاں اکٹھے ہو کر موج میلہ کر رہے ہیں۔"

"تو پھر کیا خیال ہے؟" میں نے دھیمے سے پوچھا۔

"تم یہیں رکو، میں اوپر جا کر دیکھتی ہوں، وہیں فون پر صورت حال بتاتی ہوں۔ یہاں دروازے سے اندر گئے تو حالات کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔" اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے ہولے سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا ہی تھا کہ وہ مجھ سے الگ ہوئی اور تیزی سے کوارٹرز کے آخری سرے پر چلی گئی۔ وہاں اس نے ہلکی سے جست لگائی اور دیوار پر جا چڑھی، وہیں سے اس نے اوپر منڈیر کی درزوں میں ہاتھ پھنسایا اور اپنا پورا بدن اوپر اٹھا کر چھت پر جا پہنچی۔ یہ سب ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہوا۔ وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک چھت سے دوسری چھت تک جانے والی تھی۔ میں نے رتو کا دیا ہوا سیل فون نکال لیا۔

اس نے جونہی کال کی میں نے کال رسیو کر لی۔

"یہ تو چھ کے چھ یہاں بیٹھے ہیں۔" اس نے ہولے سے کہا۔

"کہیں یہ سارے ہی تو آپس میں ملے ہوئے نہیں ہیں؟" میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ ان کے سامنے شراب پڑی ہوئی ہے اور یہ پی رہے ہیں، کھانے پینے کا سامان بھی پڑا ہے۔"

"یوں کہو نا سب ہم نوالہ ہم پیالہ ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم اندر جاؤ، میں اوپر سے تمہیں کور کروں گی۔" اس نے کہا تو میں نے فون بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ پھر پسٹل نکال کر کھلے ہوئے دروازے کے اندر چلا گیا۔

مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ سب حیرت سے میری جانب دیکھنے لگے تھے۔ ہر اس بندے کی حیرت مزید بڑھ جاتی، جس کی نگاہ میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل پر پڑتی۔

"سب دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔" میں تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"صاحب، کیا ہو گیا؟" ایک بندے نے کہا تو میں نے بلا جھجک اس کے پیروں میں فائر کر دیا۔ وہ فائر اسے لگا تو نہیں اور نہ ہی میں مارنا چاہتا تھا لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ تیزی سے اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔

"تم لوگوں کو پتہ ہے کہ فیکٹری میں نے خرید لی ہے۔" میں نے ان سب سے کہا تو سبھی نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ تبھی ان میں سے ایک بولا۔

"نہیں پتہ صاحب۔"

"لیکن یہ تو پتہ ہوگا، کہ ہمارے یہاں آنے کی اطلاع بجندر کو کس نے دی تھی۔" یہ کہہ کر میں نے سب کی طرف دیکھا۔ سبھی کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ گئیں۔ وہ میری طرف یوں

دیکھنے لگے جیسے میں نے کوئی عجوبہ بات کہہ دی ہو۔ وہ سبھی خاموش تھے۔ تبھی میں نے کہا

"ایک بندہ ہے، وہ بتا دے ورنہ باقی پانچ یونہی خواہ مخواہ میں مارے جائیں گے۔"

میرے یوں کہنے پر سبھی اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے لگے۔

"نہیں صاحب، ہم تو کسی بجندر کو نہیں جانتے۔" اسی بندے نے جواب دیا تو میں نے سکون سے کہا۔

"اپنی اپنی جیب سے فون نکال کر یہاں چارپائی پر پھینک دو۔ اسی سے پتہ چل جائے گا، کون ہے وہ؟" میں نے یونہی اندھیرے میں تیر پھینکا تو دو نے فوراً اپنے فون چارپائی پر پھینک دیئے۔ ایک نے انکار کر دیا کہ اس کے پاس فون نہیں، پھر باقیوں نے بھی اپنے فون پھینک دیئے۔

"صاحب ہم غریب آدمی ہیں، ہم سے ایسی کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔" اسی شخص نے بڑی بے چارگی سے کہا تو میں بولا۔

"میں یہاں پر اکیلا نہیں آیا، تم لوگ ہر طرف سے گھر چکے ہو، وہ بندہ اپنے بارے میں خود بتا دے، ورنہ سب مارے جاؤ گے۔" یہ کہتے ہوئے میں اونچی آواز میں کہا، "فائر......"

تبھی اوپر سے یکے بعد دیگرے دو فائر ہو گئے تو ان سب کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ بدحواس ہو گئے، انہی میں سے ایک بندے نے بالکل آخر میں کھڑے ایک ناٹے قد والی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

"یہ رہا ہے بجندر کے ساتھی، اسی نے اسے کال کی ہو گی۔"

"آگے آؤ۔" میں نے اسے اشارہ کیا تو وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"غلطی ہو گئی صاحب...... میں کوئی......" لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ میں نے اس کی

رانوں پر فائر کر دیئے۔ وہ چلاتے ہوئے زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔

"کب سے کام کر رہے ہو اس کے لئے۔"

"بہت عرصے سے..... میں اس کے ساتھ تھا، یہاں وہ اپنا مال رکھتا ہے۔ اس کے پیسے دیتا ہے۔ ہم سب کرتے ہیں کام۔" اس نے تیزی سے بتایا تو میں نے سب کی طرف دیکھا۔

"جی صاحب، خالی فیکٹری ہے، ہمیں پیسہ مل جاتا ہے۔" ایک بندے نے کہا تو سارا راز کھل گیا۔ وہ اس خالی فیکٹری کو اپنا مال رکھنے کے لئے استعمال کر رہے تھے۔

"کیسا مال رکھتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تھوڑا اسلحہ ہے، کچھ شراب اور......"

"سب شامل ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جی، ہم سب ہی۔" اس نے ندامت سے کہا۔

"تم ادھر آجاؤ، تم نے سچ بولا۔" میں نے کہا تو وہ فوراً الگ ہو گیا۔

"آؤ دکھاؤ، کہاں ہے ان کا مال۔"

"اس کے پاس چابیاں ہیں۔" اس نے اسی شخص کی طرف اشارہ کیا، جس نے پہلے مجھ سے بات کی تھی۔ اس نے چابیاں نکال دیں تو وہ میرے ساتھ باہر کی جانب چل پڑا۔ باقیوں کو نجانے کیا ہوا وہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگے۔ میں نے ان کی ذرا بھی پروا نہیں کی، اس اکیلے شخص کو لے کر باہر آ گیا۔ جیسے ہی میں دروازے سے نکلا، اوپر سے رعنو نے فائر کرنا شروع کر دیئے۔ اندر سے چیخیں بلند ہوئیں تو میرے ساتھ کھڑا شخص کانپنے لگا۔ کچھ دیر بعد رعنو دروازے میں سے باہر آ گئی۔

وہ ہمیں دفاتر کی جانب لے گیا۔ اس نے کمرے کھول دیئے۔ ایک کمرے میں کافی کچھ

پڑا ہوا تھا۔

"اس کے علاوہ کچھ......" رجنو نے پوچھا۔

"اور کچھ نہیں ہے۔" اس نے بتایا تو رجنو نے سیل فون نکالا اور ملکیت سنگھ کو ساری صورت حال بتانے لگی۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے فون بند کیا اور پلٹ کر اس سے بولی۔

"تم صبح تک یہیں رہو گے۔"

"جی ٹھیک ہے۔" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

"آؤ چلیں۔" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ میں اس کے ساتھ باہر نکل کر سڑک پر چلنے لگا۔ تھوڑا چل کر اس نے بتایا۔

"میری ملکیت سنگھ سے بات ہوئی ہے۔ یہاں مال رکھ کر وہ دہرا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ عام حالات میں مال کا سٹور تھا۔ اگر پکڑا جاتا تو سید حا رانی جی پر پڑتا۔ اب وہ راتوں رات یہاں سے لاشیں اور مال غائب کروا دے گا۔"

"اور ہم واپس......" میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

"رانی جی نے بلایا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے، اس کے پاس آ جاؤ۔ وہاں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ چل دیا۔

☆......☆......☆

رانی بھاگ وتی کے بنگلے کا وہ حصہ جو شاید ملازمین وغیرہ کے لیے مختص کیا ہوا تھا، ہم وہاں پر آ گئے تھے۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ جب ہم فریش ہو کر، کھا پی چکے تھے۔ رجنو شاید کچن میں تھی اور میں اپنے کمرے میں تھا۔ میں نے تیمور کو اب تک کی صورت حال کے بارے میں بتا دیا ہوا تھا۔ وہ بھی یہی سوچنے لگا کہ گوپال داس کو اٹھا لیا جائے۔ اس سے بہت کچھ مل سکتا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر گوپال داس کو اٹھا لیا تو پھر اس کے بعد قید خانے تک رسائی انتہائی مشکل ہو جائے گی۔ پرتاب سنگھ کے ساتھ ساتھ ریاستی قوت بھی ہمارے خلاف ہو جائے گی۔

تیمور کی بات بالکل درست تھی۔ دیو گڑھ ایک چھوٹا سا شہر تھا، گوپال داس کو اٹھا لینے کے بعد ہم چاہتے ہوئے بھی نہ باہر نکل پائیں گے۔ سب سے زیادہ توجہ مجھ پر ہو جائے گی اور مجھے رانی بھاگ وتی سے مانگا جائے گا۔ اس کے بعد ہم مٹھی بھر لوگ کوئی بھی خفیہ کاروائی نہیں کر پائیں گے۔ میرے سامنے ایک طرح سے بند گلی آگئی تھی۔ مجھے کیا کرنا چاہئے، ایسا کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں اٹھا اور کمرے سے باہر آگیا۔ سامنے سے مجھے رنجو آتے ہوئے دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں دو مگ پکڑے ہوئے تھے جن میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ایک مگ میری جانب بڑھایا اور میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں، بس ایسے ہی تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا۔" میں نے سپ لیتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ، میرے بارے میں سوچ رہے تھے؟" اس نے خوشگوار حیرت سے کہا، پھر دائیں آنکھ دباتے ہوئے بولی، "کب سے میرے بارے میں سوچنے لگے ہو؟"

"آج ہی سے......" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں؟" اس نے تجسس سے پوچھا، پھر خود ہی بولی، "کچھ دیر بیٹھ کر گپ شپ کریں۔"

"چاہے ساری رات بیٹھو، منع کس نے کیا ہے۔" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا تو وہ ہنس دی۔ اس نے مجھے اپنا مگ پکڑایا اور کرسیاں لینے چل دیں۔

میں اور ریحو کمرے سے نکل کر اوپری منزل میں ایسی جگہ آ کر بیٹھ گئے تھے جہاں ہم کھلے آسمان کے نیچے تھے۔ یہ دوسری منزل پر بڑھا ہوا شیڈ تھا۔ وہاں گہرا اندھیرا نہیں تھا۔ ملگجی سی روشنی تھی جو باہر سے چھن کر آ رہی تھی۔ ہم آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"بتایا نہیں پھر تم نے......" اس نے کہا۔

"تمہارے بدن کی لچک دیکھی میں نے، یہ تو بڑی ریاضت کے بعد آتی ہے۔ تم اس جرم کی دنیا میں کیسے......؟" میں نے کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بڑے عجیب سے لہجے میں بولی۔

"جرم کی یہ دنیا میرے لیے نئی نہیں ہے اور میرا کوئی مقصد نہیں ہے۔ میں بس اس دنیا میں ہوں تو ہوں۔" اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھا نہیں؟" میں نے پوچھا، میں واقعی اس کی بات نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ میری طرف دیکھتی رہی، پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

"رانا جی، میں نے جھونپڑیوں میں آنکھ کھولی تھی، وہیں ہوش سنبھالا۔ میرا باپ ایک نٹ خانہ بدوش تھا، قلابازی لگانا، تنے ہوئے رسے پر کرتب دکھانا، اس کا پیشہ تھا۔ اسی سے ہم کھاتے کماتے تھے۔ دوسرے بچوں کی طرح میں نے بھی یہ سب سیکھنا شروع کر دیا۔ میرا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔ وہ بھی سیکھنے لگا۔ میں بہت چھوٹی عمر میں یہ کرتب سیکھ گئی تھی۔"

"اب بھی آتے ہیں تمہیں یہ کرتب......" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"سنو ناں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر کہتی چلی گئی۔ "پتہ نہیں کب میرے باپ

کے دل میں آئی کہ وہ مجھے پڑھائے لکھائے۔ اس نے ہمیں ایک سرکاری اسکول میں داخل کروادیا۔ خود ایک ٹولی کے ساتھ مل کر کماتا۔ ہمارا قبیلہ نجانے کہاں سے کہاں چلا گیا، مگر ہم دیو گڑھ ہی میں رہے۔"

"مطلب پھر تم بھول گئیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں، میری ماں خود ایک نٹ کی بیٹی تھی۔ اس نے میرے بدن پر خاص توجہ دی۔ مجھے لچک دار بنادیا۔ جب میں نے سکول کی تعلیم ختم کی تو مجھے اپنے باپ والے سرکس میں کام مل گیا۔ میرا سارا دن پڑھنے اور نئے کرتب سیکھنے میں لگ جاتا۔ شام ڈھلتے ہی سرکس کا کام شروع ہو جاتا۔ سرکس مختلف شہروں میں پھرتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن میرا باپ ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا۔ شاید ہم سنبھل جاتے لیکن تھوڑے عرصے بعد ہی میری ماں نے شادی کرلی۔ یہ شادی کوئی محبت کی شادی نہیں تھی، میری ماں کو پناہ چاہئے تھی اور میرے سوتیلے باپ کو ہماری صورت میں کمائی کا بڑا ذریعہ مل گیا تھا۔ بس یہیں سے ہماری زندگی بکھر گئی۔"

"کیا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں پڑھنا چاہتی تھی اور میرے باپ نے مجھے کالج میں داخلہ دلوادیا۔ میں سمجھی کہ وہ مجھ پر رحم کررہا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس نے مجھے ایک ایسے مافیا کے ہاتھوں میں دے دیا جو منشیات کا کاروبار کرتا تھا۔ کیا عجیب بات تھی، ایک طرف میں منشیات سپلائی کرتی تھی تو دوسری جانب کالج کی بہترین اتھلیٹ بن گئی تھی۔ میں نے بہت سارے مقابلے جیتے۔ میں باہر جانا چاہتی تھی لیکن میرا انسٹرکٹر اڑ گیا۔ میں باہر نہ جاسکی، انہی دنوں ہمارے لوگ کمزور پڑ گئے تو نئے لوگوں نے دھندا سنبھال لیا۔ پھر وہی مار کٹائی، روز کے دنگے، ایک دن ایک لڑکا میرے ہاتھوں مرگیا۔ بس تب سے اس دنیا میں ہوں۔"

"نہ تم بہترین اتھلیٹ بن سکی اور نہ......" میں نے کہنا چاہا تو جذباتی انداز میں میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"کچھ بھی نہیں بن سکی۔ ماں نہ رہی، بھائی اپنی دنیا میں کھو گیا اور میں چند برس سے یونہی اس دنیا میں ہوں۔ یہ تو رانی بھاگ وتی نے مجھ پر رحم کیا، وہ مجھے پناہ دی۔ میں بھی اس کی خدمت میں لگ گئی۔"

"کوئی مقصد نہیں، کبھی سوچا بھی نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیا سوچنا، کیسا مقصد، کوئی گولی آئے گی اور یہ زندگی چاٹ جائے گی۔ اگلے پل کی خبر نہیں۔ بس یہ چاہتی ہوں کہ جتنی سانسیں ہیں، اپنی مرضی سے جی لوں اور کچھ نہیں چاہئے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بہت مایوس ہو زندگی سے؟" میں نے تبصرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں اب نہیں ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"وہ کیوں......؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارا انداز اور حوصلہ دیکھ کر لگا کہ جینا اسی طرح چاہئے، جب تک زندگی ہے تو بس ہے، اسی طرح جیو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اب تک میں نے اس سے جو باتیں کی تھیں، وہ سب اسے قریب کرنے کے لئے تھیں، وہ جھوٹ بول رہی تھی یا سچ مجھے اس سے بھی غرض نہیں تھی۔ میں نے جس مقصد کے لئے اس سے باتیں کرنا چاہئیں تھیں، وہ سوال میرے لب پر آ گیا۔ میں اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن نجانے کیوں رُک گیا۔ میں نے اسے کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھا۔ میں بھاگ وتی اور پرتاب سنگھ کے تعلق یا پھر دشمنی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، پھر میں نے یہ ارادہ ہی ترک کر

دیا۔ ہم وہیں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ رتنو کا فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر دیکھا تو سرسراتے ہوئے بولی۔

"رانی جی کا فون ....." میں خاموش رہا تو اس نے کال ریسیو کر لی۔ وہ کچھ دیر سنتی رہی، پھر کال بند کر کے میری طرف دیکھ کر بولی۔ "رانی جی نے ابھی بلایا ہے۔"

"تو جاؤ پھر۔" میں نے کہا۔

"تمہیں بھی ساتھ ہی بلایا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ تب میں نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص بات......؟"

"یہ تو وہیں جا کر پتہ چلے گا۔" اس نے کہا اور قدم بڑھا دیئے۔

رانی بھاگ وتی اسی کمرے میں تھی جہاں پہلی بار اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ساڑھی پہننے کا انداز وہی تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی ریشمی ساڑھی اور سلیولیس بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ اس نے ہمیں سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو ہم بیٹھ گئے۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی ہماری طرف دیکھتی رہی پھر دھیمے سے لہجے میں بولی۔

"ویر سنگھ جی، ہم نے اپنی طاقت ان چھوٹے چھوٹے غنڈے موالیوں پر صرف نہیں کرنی، یہ طاقت ایسی جگہ استعمال ہونی چاہئے جہاں پرتاب سنگھ پر کاری ضرب لگے۔"

"یہی بات تو یہی ہے رانی جی کہ آپ نے کچھ بتایا ہی نہیں کہ مجھے کرنا کیا ہے، جو کہا اور جتنا سامنے آیا، وہ کر دیا۔ اب بتا دیں۔" میں نے بڑے سکون سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو، اب تک جو ہوا اس سے پرتاپ سنگھ کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ اسکی ہلچل تو ان غنڈے موالیوں میں ہوتی رہتی ہے۔“ رانی نے لاپرواہانہ انداز میں کہا۔

”اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟“ میں نے اسی سکون سے کہا تو اس نے بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا، تب میں بولا، ”نجانے مجھے یہ کیوں لگتا ہے کہ آپ ذہنی طور پر پرتاپ سنگھ سے شکست قبول کر کے اس سے خوف زدہ ہیں۔ آپ اس کے خلاف بہت کچھ کرنا بھی چاہتی ہیں لیکن ڈرتی ہیں۔ آپ کا یہ خوف اور ڈر آپ کو کوئی بھی بڑا فیصلہ کرنے سے روکتا ہے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ اس نے تیزی سے کہا۔

”یہی کہ آپ شطرنج پر مہرے تو رکھ لیتی ہیں لیکن کوئی بھی چال چلنے سے گھبرا جاتی ہیں۔ بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ آپ کو مہرے رکھنا بھی نہیں آتے۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا تو اس نے صوفے سے اپنی ٹیک چھوڑ دی۔

”میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھی۔“ اس نے حیرت سے کہا۔

”آپ پرتاپ سنگھ کو ختم کرنا چاہتی ہیں، اسے اپنے سامنے سسکتا دیکھنا چاہتی ہیں، لیکن یہ نہیں سمجھتیں ہیں کہ وہ اپنے پیچھے ریاست کی قوت لئے کھڑا ہے۔ آپ اس کا کچھ نہیں بگاڑ پائیں گی، جب تک اس کے پیچھے سے ریاست نہیں ہٹے گی۔ آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا، جس سے ریاست آپ کے پیچھے آ کر کھڑی ہو جائے۔“ میں نے کافی حد تک جذباتی انداز میں کہا تو اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے سکون سے پوچھا۔

”تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہئے؟“

”ٹارگٹ صرف اور صرف پرتاپ سنگھ ہونا چاہئے۔ وہ ختم ہو گیا تو پھر باقی کیا بچے گا، پھر

بھی نہیں۔" میں نے کہا تو وہ صوفے سے ٹیک لگا کر نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

" مجھے باقی سے غرض ہی نہیں ہے۔ میں اسے اپنے سامنے گڑگڑاتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ میرے پاؤں پڑے اور میں اسے ٹھوکر مار دوں۔"

" معاف کرنا رانی جی، میں نے ایسے حالات بنا دیئے ہیں لیکن آپ سے پھر بھی کچھ نہیں ہونا۔" اس بار میں نے دبے دبے غصے میں کہا۔

" کیوں نہیں ہونا رانا جی، آپ ایسے حالات تو بنا دو۔" اس بار رانی بھاگ وتی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

" حالات تو بن جائیں گے اور میں بنا بھی دوں گا۔ لیکن آپ اس موقعہ پر پرتاب سنگھ کے سامنے جھک گئیں، یا کوئی مصالحت کر لی تو پھر میں آپ کا سب سے بڑا دشمن ہوں گا، یہ یاد رکھئے گا۔" میں نے کرخت انداز میں کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی، پھر خوشگوار انداز میں بولی۔

" مجھے تمہاری دشمنی قبول ہوگی۔"

میرے خیال میں رانی سے بات ختم ہو چکی تھی۔ اب تک رتنو نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کہتا رتنو نے کہا۔

" رانی جی، ہمارے لئے کیا حکم ہے؟"

" کچھ نہیں، بس وہی بات جو میں نے رانا جی سے کہہ دی، میرا خیال ہے سمجھ گئے ہو۔" اس نے لاپرواہانہ انداز میں کہا تو میں اٹھتے ہوئے بولا۔

" مجھے اجازت۔"

" ٹھیک ہے۔" اس نے کہا تو میں اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ رتنو بھی میرے پیچھے آ گئی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے چلے جا رہے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت

رتنو کیا سوچ رہی تھی لیکن میرا دماغ بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ میری تمام تر سوچوں کا مرکز رانی بھاگ وتی سے ہونے والی باتیں تھیں۔ ان باتوں سے ایک خیال میرے دماغ میں رینگ گیا تھا۔ میں اسی پر سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ جس رہائش گاہ میں ہم ٹھہرے تھے، اس کی سیڑھیاں چڑھ کر جیسے ہی ہم چھوٹے سے لاؤنج میں آئے، رتنو نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''بہت خاموش ہو گئے ہو، کہیں رانی کا باتوں کا برا تو نہیں منا لیا؟''

''نہیں، بلکہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ پرتاب سنگھ پر ایک ایسی ضرب لگاؤں، جس سے وہ تڑپ اٹھے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ایسا کیا ہو سکتا ہے؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''میں نے جب پرتاب سنگھ کے بارے میں پڑھا اور اس کی ویڈیوز دیکھی تھیں، اس میں ایک یہ بھی تھا کہ پرتاب سنگھ نے اپنی ہی حویلی میں ایک چھوٹا سا مندر بنا رکھا ہے۔'' میں نے کہا تو تیزی سے بولی۔

''ہاں، ہے ایک کالی کا مندر۔ وہ اس کی حویلی کے پچھلی جانب ہے۔''

''اور اس مندر میں روزانہ پرتاب سنگھ کی ماں پوجا کرنے جاتی ہے۔'' میں نے کہا تو رتنو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ہونقوں کی طرح میرے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ تبھی وہ دبے سے لہجے میں بولی۔

''رانا، یہ تم کیا سوچ رہے ہو، اس کے لئے تو ایک فوج......''

اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں، فوج نہیں، صرف ہم دو۔ اگر حوصلہ کر سکتی ہو تو۔''

''یہ کیسے ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

”میں تمہیں سب بتا دیتا ہوں۔تم دل کڑا کرو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے آگے بڑھی اور میرے سینے سے لگ گئی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ وہ اپنا چہرہ کبھی دائیں اور کبھی بائیں میرے سینے پر رکھ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ پرسکون ہو گئی۔ پھر پیچھے ہٹ کر بولی۔”شاید وہ وقت آ گیا ہے جب میں خود کو رانی پر وار دوں۔ تم جو کہو، میں وہی کرنے کو تیار ہوں۔“

میں نے اسے دونوں شانوں سے پکڑا اور صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”بیٹھو، میں تمہیں سمجھاتا ہوں کیا کرنا ہوگا۔“

وہ بیٹھ گئی تو میں اسے سمجھانے لگا۔

☆......☆......☆

ہر طرف نیلگوں روشنی کا احساس تھا۔ رات لمحہ بہ لمحہ دن میں بدلتی جا رہی تھی۔ رجو نے فور وہیل ایک جگہ پارک کی اور نیچے اتر آئی۔

”یہاں سے پانچ منٹ کا راستہ ہے۔“ اس نے بڑبڑانے والے انداز میں مجھے بتایا۔ میں نے ضروری سامان کا بیگ اپنے کاندھے پر رکھا اور چل دیا۔ وہ میرے آگے آگے تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ تقریباً پانچ منٹ چلتے رہنے کے بعد ہم پرتاب سنگھ کی حویلی کی پچھلی جانب آ گئے جہاں ایک بڑا سارا جوہڑ تھا۔ جس کے ارد گرد بہت سارے درخت اُگے ہوئے تھے۔ حویلی کی دیوار کافی اونچی تھی۔ جس کے سرے پر کانچ لگا ہوا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے بیگ کھولا اور اس میں سے رسہ نکالا۔ اس کے آگے ہک لگی ہوئی تھی۔ میں نے ہک کو زور سے گھماتے ہوئے رسہ پھینکا تو وہ دیوار کے دوسری جانب اٹک گیا۔ میں نے رسے کو کھینچا اور پھر مضبوط پا کر رجو کی طرف دیکھا۔ اس نے خود رسے کو آزمایا اور پھر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر

لٹک گئی، اس نے اپنے پاؤں رسے کے گرد جوڑے اور پھر لمحوں میں اوپر چڑھتی چلی گئی۔

وہ دیوار پر پہنچ گئی تھی۔ کانچ اس کے پاؤں زخمی کر سکتے تھے۔ اس نے دیوار پر چڑھنے سے پہلے لوہے کی ایک چھوٹی سی سلاخ سے کانچ کو توڑا اور پھر پاؤں رکھنے کی جگہ بنالی۔ اس دوران وہ لاشعوری طور پر اندر کا جائزہ لیتی رہی۔ اندر بالکل پرسکون ماحول پا کر اس نے مجھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بیگ لیا اور رسے کی مدد سے اوپر اٹھ گیا۔ جیسے ہی میں دیوار کے اوپر پہنچا۔ وہ میرے لئے کانچ توڑ کر جگہ بنا چکی تھی۔ میں نے اندر کا جائزہ لیا۔ وہاں ہر جانب سکون تھا۔ کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رجو نے رسہ اندر کی جانب لٹکایا اور پھر اترتی چلی گئی۔ جیسے ہی وہ زمین پر اتری میں بھی اس کے پیچھے نیچے اتر گیا۔

ہمارے دائیں جانب ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ ایک بڑے سے سرسبز قطعہ کے عین درمیان میں سفید چبوترہ بنا ہوا تھا۔ جس کے چاروں طرف سیڑھیاں تھیں۔ بالکل درمیان میں چار ستونوں پر ایک سفید محراب بنی ہوئی تھی۔ اس کے بالکل نیچے کالی کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ وہاں ایک بلب روشن تھا، جس میں کالی کی مورتی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کالے پتھر سے تراشی ہوئی مورتی کی باہر نکلی ہوئی زبان سرخ تھی۔ اس بدہیت مورتی کو پوری طرح خوف ناک بنایا گیا تھا۔ میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ تبھی رجو نے ہولے سے کہا۔

”بڑی بی اس طرف سے آتی ہے۔ اس کے ساتھ تھوڑے سے ملازم بھی ہوتے ہیں۔“

”جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔“ میں نے کہا اور اپنے اردگرد دیکھا۔ ہمارے اردگرد بڑے بڑے درخت تھے۔ میں نے ایک درخت کا انتخاب کیا اور اس پر چڑھتا چلا گیا۔ رجو بھی میرے پیچھے ہی آ گئی۔ ہم تھوڑے فاصلے پر موٹی شاخوں پر بیٹھ گئے تھے۔ اب ہمیں صرف بڑی بی کا انتظار تھا کہ وہ کب وارد ہوتی ہے۔ میں نے ایک پسٹل پر سائیلنسر لگایا اور

جیب سے تیمور کا دیا ہوا فون نکال کر اسے میسج کر دیا۔

تیمور اور اس کے ساتھی گوپال داس کو اغوا کرنے کا پلان کر چکے تھے۔ اس وقت وہ سب مہادیو دایو لی مندر کے پاس پہنچ چکے تھے۔ میں رات کے پچھلے پہر ہی انہیں بتا دیا تھا کہ اگر وہ گوپال داس کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو رانی بھاگ وتی کی پرانی فیکٹری میں اسے لے جائیں۔ وہ رات وہاں ہونے والی کارروائی سے پوری طرح باخبر ہو گئے تھے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے وہاں کا ایک چکر لگا کر جا چکے تھے۔ وہ جگہ انہیں کافی بہتر لگی تھی۔ تیمور کی سب سے بڑی خامی یہی تھی کہ وہ دیوگڑھ میں ابھی تک کوئی سیف ہاؤس نہیں بنا پایا تھا۔ اس کمی کو میں نے پورا کر دیا تھا۔ اس نے اگر گوپال داس کو وہاں رکھنا تھا تو زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے تک، پھر اس کے بعد انہوں نے وہاں سے نکل جانا تھا۔ میں تیمور سے چیٹ میں مصروف تھا کہ رتنو کی سرسراتی ہوئی آواز آئی۔

"وہ دیکھو۔"

میں نے سامنے دیکھا۔ دو ملازمائیں وہاں پر آ چکی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں جھاڑو تھے۔ ایک نے جلدی سے پائپ کو سیدھا کرنا شروع کر دیا اور دوسری جھاڑو پھیرنے لگی۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں سارے مندر کو دھو ڈالا تھا۔ اس میں اگربتیاں لگا دی تھیں۔ ایک بڑے سے شاپر بیگ میں پیلے پھولوں کی مالا کالی کے مجسمے کی گردن میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھیں یا ان کا یہ معمول تھا۔ وہ اپنا کام ختم کر کے جا چکی تھیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ بڑی بی یہاں ضرور آئے گی۔

سورج کی کرنیں پھوٹنے کو تھیں۔ نیلگوں ماحول ختم ہو گیا تھا۔ ایسے میں ایک سفید ماروتی نمودار ہوئی۔ وہ بالکل مندر کی سیڑھیوں کے پاس آ رکی۔ اس میں سے پہلے ایک لڑکی نکلی، جس

نے سیاہ رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھیں۔ اگلی جانب سے ایک نوجوان سا ڈرائیور نکلا۔ اس کے بعد پچھلی نشست سے بھی ایک لڑکی نکلی، اس نے بھی سیاہ رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پوجا کی تھالی تھی۔ اس کے بعد بڑی بی نکلی۔

"یہی ہے پرتاپ سنگھ کی ماں......" رتنو نے سرگوشی کی۔

اس نے نارنجی رنگ کی پیلے بارڈر والی بیش قیمت ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس نے کچھ زیور بھی پہنا ہوا تھا۔ بڑی بی نے مندر کی سیڑھیوں پر ماتھا ٹیکا، پھر سیدھی کھڑی ہو کر پوجا کی تھالی لی۔ لڑکی نے پوجا کی تھالی میں رکھا ہوا دیا، ماچس کی تیلی سے روشن کر دیا تو بڑی بی دھیمے قدموں سے کالی کی مورتی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ تھالی کو گھماتے ہوئے جو بھی بھجن کہہ رہی تھی، وہ ہم تک نہیں پہنچ رہے تھے۔

میں غور سے ماحول کو دیکھا۔ وہ ڈرائیور ایک جانب کھڑا تھا۔ اس نے سفاری سوٹ پہنا ہوا تھا۔ مجھے اس کے انداز سے یوں لگا جیسے وہ فقط ڈرائیور نہیں بلکہ کوئی تربیت یافتہ شخص تھا۔ میری رگوں میں خون بڑی تیزی سے گردش کرنے لگا تھا۔ میں نے ہولے سے پوچھا۔

"رتنو تم تیار ہو؟"

"ہاں، میں تیار ہوں۔" اس نے کہا۔

"چلو۔" میں نے کہا اور ہم پوری احتیاط سے نیچے اترنے لگے۔ میں پہلے اتر آیا تھا۔ رتنو کے پاؤں میرے کاندھوں پر تھے۔ اگلے لمحے وہ پھسل کر میری پشت سے لگ گئی تھی۔ ہم دونوں درخت کی اوٹ میں تھے۔ میں نے سامنے کھڑے ہوئے ڈرائیور کو دیکھا اور پھر نشانہ باندھ کر فائر کر دیا۔ اگرچہ مجھے اپنے نشانے پر پورا یقین تھا لیکن میں نے مزید دو فائر کر دیئے۔ وہ ڈرائیور اپنا سینہ پکڑ کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے منہ سے اونچی کراہ نکلی تھی۔ جسے سن

کر بڑی بی سمیت ان دونوں لڑکیوں نے گھوم کر دیکھا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ان کی آنکھوں میں حیرت جم کر رہ گئی۔ میں نے ان لڑکیوں پر فائر کر دیا۔ ایک کے سر پر فائر لگا تھا وہ گھومتی ہوئی کالی کے چرنوں میں جا گری۔ دوسری سینہ تھام کر فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک دم سے تین لاشیں دیکھ کر بڑی بی نے حیرت سے ارد گرد دیکھا۔ اسی لمحے رتنو کسی اسپرنگ کی مانند اچھلتی ہوئی بڑی بی کے پاس جا پہنچی۔ میں تیزی سے کار کی جانب لپکا۔ میں دیکھ رہا تھا بڑی بی صورت حال دیکھ کر چکرا گئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے تھالی چھوٹ کر گر گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔ رتنو نے وقت ضائع نہیں کیا۔ اس نے بڑی بی کو اٹھایا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی ماروتی کی پچھلی نشست پر آن بیٹھی۔ جیسے ہی وہ بیٹھیں، میں نے گیئر لگا دیا۔

ہم حویلی کے دائیں جانب سے نکلے تھے۔ تقریباً تین میٹر چلنے کے بعد ایک جانب پورچ تھا لیکن سامنے ایک بڑا سا فوارہ بنا ہوا تھا۔ میں اس گول چکر کی جانب چل دیا۔ وہاں سے سیدھی سڑک گیٹ تک جا رہی تھی۔ میں نے دور سے دیکھا گیٹ پر دو سیکورٹی والے کھڑے تھے۔ وہ ماروتی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ بڑی بی کی گاڑی پہچان رہے تھے یا جو بھی تھا۔ میں چند میٹر کے فاصلے پر زور سے بریک لگائے تو رتنو نے سر باہر نکال کر کہا۔

”جلدی کھولو گیٹ......ہسپتال جانا ہے۔“

ایک سیکورٹی والا ہماری جانب بڑھا، اس نے اندر نگاہ ڈالی تو بڑی بی کو پچھلی نشست پر لیٹے ہوئے پایا۔ اس نے اشارے سے گیٹ کھولنے کا کہا اور خود بھاگ کر گیٹ پر گیا۔ گیٹ کھل چکا تھا، میں نے تیزی سے ماروتی کو حویلی سے باہر نکال لیا اور پھر پوری رفتار سے چل پڑا۔

صبح کے وقت سڑکیں خالی تھیں۔ رتنو مجھے بتانے لگی کہ ہماری فورڈ نیل کہاں کھڑی ہو سکتی

ہے۔اس کے لیے ہمیں گھوم کر حویلی کی پچھلی جانب آنا تھا۔ قریباً دس منٹ بعد ہم فورو ویل تک جا پہنچے۔ رتنو نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا، وہ سیدھی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی، اس دوران میں نے بڑی بی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئی تھی۔ ایک بار مجھے یوں لگا جیسے وہ کہیں پرواز ہی نہ کر گئی ہو۔ رتنو نے جس حد تک ہو سکا رفتار پہ حاوی تھی۔ بڑی بی کا ہچکولے کھاتا ہوا سر میری ران پر تھا۔ تبھی مجھے خیال آیا تو میں نے رتنو سے کہا۔

"رانی کو پتہ نہیں ہے کہ ہم کیا کر کے آرہے ہیں۔"

"ہاں اسے اچانک پتہ چلے گا تو وہ......" اس نے کہنا چاہا لیکن میں بات کاٹتے ہوئے کہا

"نہیں، اسے فون کر کے بتا دو، تا کہ وہ ذہنی طور پر تیار رہے۔"

"لو تم بتا دو۔ نمبر پر رانی لکھا ہے۔" اس نے جیب سے فون نکال کر مجھے تھماتے ہوئے کہا۔ میں نے نمبر پش کیا تو چند لمحوں میں کال ریسیو کر لی گئی۔

"بولو......" رانی کی خمار آلود آواز ابھری۔

"میں بات کر رہا ہوں، رانا دیر سنگھ۔" میں نے کہا تو وہ تشویش سے بولی۔

"رتنو کہاں ہے؟"

"پریشان نہ ہوں، وہ میرے ساتھ ہے۔ میری بات سنیں۔" میں نے کافی حد تک سخت لہجے میں کہا۔

"ہاں بولو۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں اس وقت پتہ ہے کسے اغوا کر کے لا رہا ہوں۔" میں نے سکون سے کہا تو وہ انتہائی تجسس سے بولی۔

"کسے لا رہے ہو؟"

"پرتاب سنگھ کی ماں کو۔" میں نے اسی سکون سے کہا تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اوہ، یہ کیا غضب کر دیا۔"

"میں نے کہا تھا کہ تم سنبھال نہیں پاؤ گی، بولو، لاؤں بنگلے پر یا واپس لے جاؤں، جلدی بولو۔" میں نے کہا اور بے ساختہ میں آپ سے تم پر اتر آیا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکی یا شاید اسے احساس نہیں ہوا، وہ تیزی سے بولی۔

"نہیں نہیں لے آؤ، لیکن انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔"

"نہیں ہو گی۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

فور وہیل رانی بھاگ وتی کے بنگلے کے آہنی گیٹ کے سامنے آ رکی تھی۔ سیکورٹی والے اس فور وہیل کو پہچانتے تھے۔ گیٹ کھل گیا اور رینو فور وہیل لئے اندر جا پہنچی۔ سامنے پورچ تھا۔ فور وہیل وہاں جا رکی۔ میں نے دیکھا، رانی بھاگ وتی پہلے ہی سے اندر کی طرف کھڑی منتظر تھی۔

"رینو، یہ پانی کی بوتل دینا۔" میں نے کہا تو رینو نے جلدی سے پانی کی بوتل اٹھائی، اسے کھولا اور پانی کے چھینٹے بڑی بی کے منہ پر مارے۔ وہ ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی، میرے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔ اس نے باہر کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہ رینو پر پڑی۔ تب رینو نے پچکارتے ہوئے کہا۔

"آئیں نیچے اتریں، ڈریں مت، اب کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

"تم مجھے کہاں لے آئی ہو؟" بڑی بی نے پوچھا۔

"آپ آئیں تو سہی۔" اس نے بڑی بی کا ہاتھ پکڑا۔ میں نے بھی اسے اٹھایا تو وہ اٹھ گئی۔ رینو جلدی سے نیچے اتری اس نے گیٹ کھولا تو بڑی بی باہر آ گئی۔ میں اسے سہارا دے کر

اندر کی جانب بڑھا۔ وہ چاروں جانب دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ اندر گئی تو اس کے سامنے رانی بھاگ وتی کھڑی اسے دیکھ کر بڑی بی کے منہ سے حیرت بھرے انداز میں بے ساختہ نکلا۔

”بہو تم.......“

”ہاں، ماتا جی میں۔ آ گئیں۔“ یہ کہتے ہوئے رانی نے بڑی بی کو خود پکڑ لیا تو مجھے بہت ساری کہانی کی سمجھ آ گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک تشویش بھرا خوف میرے اندر در آیا کہ جو میں نے سوچا ہے، کہیں رانی کی وجہ سے وہ درہم برہم نہ ہو جائے۔

رتنا اور رانی اس بڑی بی کو اوپری منزل کے ایک کمرے میں لے گئیں۔ بڑی بی کی حیرت ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ جیسے ہی بیڈ پر بیٹھی، اس نے اسی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”بہو، مجھے یوں کیوں لایا گیا ہے؟“

رانی بھاگ وتی نے ایک بار میری طرف دیکھا، شاید اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، اس لئے میں نے تیزی سے کہا۔

”اس لئے کہ تمہاری بہو، کچھ دن تمہاری خدمت کرنا چاہتی ہے۔“

”میں جانتی ہوں اس خدمت کو، میرے پرتاب کو پتہ چل گیا نا تو سب ختم ہو جائے گا، میں تم سب کا قصور معاف کر سکتی ہوں اگر تم مجھے ویسے ہی واپس چھوڑ کر آ جاؤ۔“

”بڑی بی ابھی آپ آرام کرو، میں تمہارا بیٹا ابھی یہیں لا رہا ہوں۔ پھر دیکھنا کون کسے ختم کرتا ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو بڑی بی کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔ وہ حیرت سے میری جانب دیکھنے لگی تھی۔ میں نے رانی بھاگ وتی کی طرف دیکھا اور اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں کمرے سے باہر آیا تو وہ بھی میرے پیچھے لپکی۔ وہ بالکل میرے سامنے تن کر کھڑی تھی۔ تب میں نے کہا۔

"یہ تمہارا امتحان ہے دانی جی، چاہے کچھ ہو جائے اسے چھپا کر رکھنا، باقی میں دیکھ لیتا ہوں"

"تم نے بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ویر سنگھ۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

"میں جا رہا ہوں، میری اگلی چال کا انتظار کرنا۔" یہ کہہ کر میں نیچے کی طرف چل دیا۔ میں نے ابھی سیڑھیاں طے کی تھیں کہ درشتو بھی بھاگتی ہوئی میرے پیچھے آ گئی۔ اس نے پھولے ہوئے سانس میں پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"یہ مت پوچھو، میں کہاں جا رہا ہوں، لیکن تم ایک بات یاد رکھنا۔"

"وہ کیا......؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔

"یہ رانی بھاگ وتی کسی بھی وقت تمہاری قربانی کر سکتی ہے۔ کیونکہ معاملہ اب بہو ساس میں آ گیا ہے، کاش تم مجھے پہلے بتا دیتی۔"

"میں جانتی ہوں، ایسا ہو سکتا ہے لیکن...... میں سنبھال لوں گی۔" اس نے کہا تو میں نے اس کے چہرے پر دیکھا، جہاں دکھ کی کیفیت پھیل گئی تھی۔ پھر میں مڑا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

پورچ میں کھڑی فور وہیل کو سٹارٹ کیا اور نکلتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

شہر میں دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ تیمور نے گوپال داس کو اغوا کر لیا تھا۔ اس وقت وہ تیزی سے پرانی فیکٹری کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مجھے اس نے تفصیل نہیں بتائی تھی، محض ایک چھوٹا سا میسج کیا تھا۔ مجھے راستوں کی پوری طرح شناسائی نہیں تھی، پھر بھی میں فور وہیل بھگائے ہوئے جا رہا تھا۔ میں جلد از جلد ان کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

شاید گوپال داس کا اغوا اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا، جتنا بڑی بی کو اغوا کرنا پرتاب سنگھ کے لئے

اہم تھا۔ میں جانتا تھا کہ بڑی بی کو اغوا کرنے کے بعد میں نے پرتاب سنگھ کے دل پر ہی نہیں عقل پر بھی ہاتھ ڈال دیا تھا۔ میں شاید ایسا نہ کرتا لیکن اس نے میری ماں جیسی فائزہ ملک کو جس طرح رکھا ہوا تھا، وہ منظر میری نگاہوں سے نہیں ہٹ رہا تھا۔ میرے بھی دل پر اسی طرح ہاتھ پڑا تھا۔ میں بھی عقل کھو بیٹھا تھا۔ میں چاہتا تو پورے شہر میں آگ لگا دیتا مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے ڈاکٹر کامران ملک اور ڈاکٹر فائزہ ملک کو بازیاب کروانا تھا۔ اگر گوپال داس سے معلومات مل گئیں تو ٹھیک ورنہ دوسری صورت میں مجھے بڑی بی کا کارڈ استعمال کرنا تھا۔ اب یہ رانی بھاگ وتی پر تھا کہ وہ کس قدر مضبوط رہتی ہے۔

میں پرانی فیکٹری کے پاس پہنچ چکا تھا۔ زنگ آلود گیٹ بند تھا۔ میں نے تیمور کو کال کی۔

''کہاں پر ہو؟''

''میں شاید راستہ بھول گیا ہوں، ابھی تک میں فیکٹری نہیں پہنچ پایا۔'' اس نے پریشان لہجے میں کہا تو ایک لہر میرے اندر سرایت کر گئی۔ یہ تو بہت غلط ہو گیا تھا۔ مجھے بھی پوری طرح شہر کے بارے میں علم نہیں تھا۔ میں نے اپنے دماغ کو قابو میں رکھا اور سکون سے کہا۔

''تمہارے پاس اس فیکٹری کی لوکیشن تو ہے نا؟''

''ہاں ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''دیکھو، میں وہاں تک پہنچ گیا ہوں۔ میں تمہیں دوبارہ لوکیشن بھیج رہا ہوں، تم اسے فالو کرتے ہوئے آجاؤ۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''فوراً بھیجو۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے تیزی سے لوکیشن اسے بھیج دی۔ اب میرے پاس سوائے انتظار کرنے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں فور وہیل سے نیچے اترا۔ گیٹ تک گیا اور اسے کھول دیا۔ میں واپس فور وہیل میں بیٹھا اور اندر پورچ تک چلا گیا۔ میں

نے فوراً جنگل ایک سائیڈ پر کھڑی کی اور دفاتر والی عمارت کی طرف چلا گیا۔ وہاں دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ جس کمرے میں سامان پڑا تھا اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں کچھ دیر تک کھڑا اپنی سانسیں بحال کرتا رہا، پھر تیمور کو فون کرنے کے لئے اپنا سیل فون نکالا، اس سے پہلے کہ میں کال کرتا، رتو کے دیئے ہوئے سیل فون پر کال آنے لگی۔ میں نے اسے جیب سے نکالا تو ایک اجنبی نمبر اسکرین پر جگمگانے لگے۔ وہ نمبر پہلی بار فون پر آئے تھے۔ میں نے کال رسیو کرتے ہوئے بڑے اعتماد سے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے بھاری مردانہ آواز ابھری۔

"پرتاب سنگھ بات کر رہا ہوں۔"

"کون پرتاب سنگھ......" میں نے جان بوجھ کر کہا۔

"یہ تمہارے لئے بہت اچھا ہوگا کہ تم میرا تعارف نہ ہی لو، مگر میں تم تک پہنچ گیا ہوں۔" اس نے لفظ چبا چبا کر کہا۔

"پہنچ ہی گئے ہو تو آؤ مل لیتے ہیں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ذرا سا صبر کرو۔" یہ کہتے ہی فون بند کر دیا گیا۔ میں نے فون اسکرین پر دیکھا اور جیب میں ڈال لیا نجانے مجھے یہ کیوں لگا کہ میں پرتاب سنگھ کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں۔ کسی بھی وقت میرا اور اس کا آمنا سامنا ہونے والا ہے۔

❁......❁......❁

(قسط نمبر:6)

اگرچہ یہ اتنی حیرت انگیز بات نہیں تھی کہ اس نے میرا فون نمبر کہاں سے لے لیا تھا لیکن سوچنے والی ضرور تھی۔ کیا وہ رتنو تک پہنچ گیا تھا؟ کیونکہ اب تک میں نے جو چند کالیں کیں تھیں وہ رتنو کے فون پر ہی کی تھیں۔ ان میں سے ایک دو چاچا عبدالمجید کو کی تھیں۔ میں اس بارے میں بے فکر تھا۔ وہ ایسے نمبر تھے جو کسی نیٹ ورک میں نہیں آتے تھے۔ رتنو کے کال ریکارڈ سے میرا نمبر لینا کوئی مشکل نہیں تھا۔ ان کی اتنی رسائی تو تھی کہ وہ یہ کال ریکارڈ لے سکتے تھے۔

میں جانتا تھا کہ وہ اس فون ہی کے ذریعے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے لئے یہی اندازہ کر لینا کافی تھا کہ میری لوکیشن کہاں کی ہے اور کس ٹاور کی رینج میں ہوں۔ میں وہ فون وہاں پر پھینک بھی نہیں سکتا تھا۔ میں فون بند بھی کر لیتا تو پرتاب سنگھ فوراً پرانی فیکٹری تک پہنچ جاتا۔ ابھی رات ہی تو وہاں سے بندے صاف کیے تھے۔ یہ ٹھکانہ مشکوک ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر بعد تیمور اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں پہنچنے والا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھی پرتاب سنگھ کی نگاہوں میں آ جائے۔ یہی سوچتے ہوئے میں اوقاتر والی عمارت سے باہر آ گیا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ تیمور کو فون کر کے صورت حال معلوم کروں کہ گیٹ پر حرکت ہوئی۔ ایک شخص نے گیٹ کھولا اور پھر ایک فور وہیل اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ چند منٹ میں وہ تیزی سے میرے قریب آ کر رک گئی۔ فور وہیل میں تیمور سمیت شخص چار لوگ تھے۔ پانچواں شخص سیٹوں کے درمیان میں دبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا،

وہی گوپال داس ہے۔ تیمور اور اس کے ساتھیوں نے اُسے اُتارا اور اندر لے گئے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا:

"تم فوراً گاڑی واپس لے جاؤ۔"

"خیریت تو ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں خیریت ہے، ایک بہت ضروری کام ہے۔" میں نے کہا۔

"جی ٹھیک ہے بولیں۔" اس نے کہا تو میں نے اس کی طرف سیل فون بڑھاتے ہوئے کہا

"یہ بند نہیں کرنا، بلکہ راہ جاتی ہوئی کسی گاڑی یا ٹرک میں پھینک دینا، یہ فون جتنا دور ہو سکتا ہے ہو جائے۔"

"جی میں سمجھ گیا، آپ کیا چاہتے ہیں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"بس تو پھر تیزی سے نکل جاؤ۔" میں نے کہا تو اس نے فون لے کر ڈیش بورڈ پر رکھا اور فوراً وہیل لے کر نکلتا چلا گیا۔

میں دفاتر کی عمارت میں آ کر اسی کمرے میں گیا جہاں سامان رکھا ہوا تھا۔ گوپال داس فرش پر پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی ابھی تک تھی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس نے دھوتی کے ساتھ سفید کرتا پہنا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال درمیان میں سے اڑے ہوئے تھے۔ اس کے سفید بال جھالر کی طرح تھے۔ تاہم اس کی صحت قابل رشک تھی۔ دو لوگ اس کے پاس کھڑے تھے جبکہ تیمور مضطرب سا میری جانب دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے پوچھا لیکن اس نے منع کر دیا۔ تب میں گوپال داس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس کے بدن میں ذرا سی لرزش ہوئی۔ پھر وہ نارمل ہو گیا۔ تبھی میں نے پوچھا۔

”گوپال داس جی، یہی تمہارا نام ہے نا؟“

”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو، سیدھی بات کرو۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو میں نے بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

”دیکھو بڑے میاں، میں نہیں چاہتا کہ تم پر تشدد کروں۔ تم جانتے ہو کہ یہ ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب کوئی جھوٹ بولے۔ میرے چند سوالوں کے جواب دے دو، مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔“

”بولو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ اس نے کہا۔

”پرتاب سنگھ کے ساتھ تمہارا تعلق کس حد تک ہے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے فوراً کہا۔

”ہم مل کر بزنس کرتے ہیں، وہ میرا بزنس پارٹنر ہے۔“

”بزنس یا دھندا......“ میں نے پوچھا۔

”تم جو بھی سمجھ لو۔“ اس نے کہا۔

”مطلب تم سیدھے بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہو۔“ میں نے دبے دبے غصے میں کہا اور ساتھ اس کی کلائی زور سے پکڑ لی۔ اس کے بدن میں ایک لمحہ کو تشنج کی سی کیفیت آئی۔ تبھی اس نے کہا۔

”میں سیدھی بات ہی کروں گا تم پوچھو۔“

”پرتاب سنگھ کا کون کون سا دھندہ دیکھتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہر طرح کا۔“ اس نے مختصراً کہا۔ وہ بہت شاطر لگ رہا تھا، وہ مجھ سے اگلوانا چاہتا تھا کہ دراصل میں اس سے کیا پوچھنا چاہتا ہوں۔

”میں جانتا ہوں تمہارے مرجانے سے پرتاب سنگھ کے دھندے کو فرق نہیں پڑنے والا،

تمہاری جگہ لینے کے لیے بہتیرے تیار بیٹھے ہوں گے۔ مجھے بھی تمہیں مارنے میں کوئی وقت نہیں لگے گا۔ یہ بتاؤ کون سے بڑے دھندے کو دیکھتے ہو۔“

”سچ پوچھو تو میں اب صرف مشورہ ہی دیتا ہوں، سارا کام تو عام لوگ کرتے ہیں، تم بولو، تمہیں کیا چاہیے۔“ اس نے پھر وہی گول مول بات کر دی۔ وہ میری نفسیات سے کھیل رہا تھا یا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”گوپال داس جی، یہ بتاؤ، رانی بھاگ وتی سے اُس کا کیا تعلق ہے، کیوں دشمنی ہے اس کے ساتھ۔“ میں نے پوچھا۔

”کوئی وقت تھا، وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ بھاگ وتی کا باپ نہیں چاہتا تھا کہ یہ شادی ہو، لیکن وہ خود چاہتی تھی۔ دونوں نے خفیہ شادی کر لی، پھر کچھ ہی دن بعد بھاگ وتی کا باپ قتل ہو گیا۔ بھاگ وتی کو یہ باور کرا دیا گیا کہ اس کے باپ کو پرتاپ سنگھ نے قتل کروا دیا ہے اور یہ شادی اس کی دولت کے لئے کی گئی ہے۔ اسی بات سے وہ متنفر ہو گئی۔ تب سے دونوں کے درمیان دشمنی چل رہی ہے۔“

”اس کا چہرہ کیوں بگاڑا گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بہرحال پرتاپ سنگھ کی زیادتی تھی۔ لیکن یہ ان دونوں کا معاملہ تھا، کوئی اس میں کیا کر سکتا تھا۔“ اس نے پرسکون انداز میں بتایا۔

”کیا یہ سچ ہے کہ بھاگ وتی کے باپ کو پرتاپ سنگھ ہی نے قتل کروایا تھا۔“ میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں اس بارے کچھ نہیں جانتا۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”یہاں تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ میں نے کہا۔

”میں نے کہا نا میں......“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے ٹوکتے ہوئے تیزی سے کہا
”یہ بھی کہو گے کہ پرتاب سنگھ نے بھاگ وتی کے باپ کو اپنے ذاتی قید خانے میں نہیں رکھا، جس کے تم نگران ہو۔“
”اس وقت قید خانہ تھا ہی نہیں، جب وہ قتل ہوا تھا۔“ گوپال داس وہ بات کہہ گیا جو میں پوچھنا چاہ رہا تھا۔ میرے بدن میں خون کی روانی تیزی سے بڑھ گئی تھی۔ میں نے خود پر قابو پایا اور سکون سے کہا۔
”تو گوپال داس جی، تمہارے اس قید خانے میں ہمارے دو آدمی قید ہیں۔ ہمیں وہ چاہئیں، اس کے بعد ہماری دشمنی ختم سمجھو۔“ میں نے کہا تو اس نے پوچھا۔
”کون سے دو آدمی؟“
”میں ابھی ان کے بارے میں بتا کر ان کے نام ظاہر نہیں کروں گا، تم مجھے یہ بتاؤ، وہ بندے کس طرح مجھے دو گے؟“ میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔
”تم کس طرح لینا چاہتے ہو؟“ اس نے پوچھا
”یہ تو تم نے ہی بتانا ہے۔“ میں نے کہا۔
”ٹھیک ہے پھر مجھے وہاں تک لے جاؤ اور اپنے بندے لے لو۔“ اس نے بڑے آرام سے کہا۔
”کہاں ہے تمہارا قید خانہ، بولو۔“ میں نے پوچھا۔
”تم وہاں تک نہیں پہنچ پاؤ گے۔ اگر پہنچ بھی گئے تو قید خانے کے اندر گھسنا تو درکنار، اس کی چار دیواری کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے۔“ اس نے کچھ اس اعتماد سے کہا کہ

مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا۔

"گوپال داس، ہم اگر تجھے اغوا کر سکتے ہیں تو قید خانے تک بھی پہنچ جائیں گے، یہ......"

"تمہاری بھول ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میرا اغوا تم لوگ اس لئے کر پائے ہو کہ یہ میری غلطی تھی۔ میں اپنی سیکورٹی کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ تم لوگ میرے قیمتی بندے مارنے میں اس لئے کامیاب ہو گئے کہ وہ غافل تھے۔ ورنہ ہمارے قریب تو چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔"

"مجھے آخری بار پوچھنا ہے کہ تمہارا قید خانہ کہاں ہے، بولو۔"

"اگر میں نے بتا دیا تم اسی وقت مجھے ختم کر دو گے۔" اس نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

"نہ بتاؤ، مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ سوری تمہاری چتا کو آگ نہیں لگ پائے گی، تجھے میرے کتے کھا جائیں گے۔" یہ کہہ کر میں نے یوں کہا جیسے کسی کو حکم دے رہا ہوں۔ "ڈال دو اسے کتوں کے آگے۔"

"اگر میں بتا دوں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"تو یقین جانو، میں تمہیں اس وقت تک زندہ رکھوں گا جب تک وہاں سے اپنے لوگ نہیں لے آیا۔ اس کے بعد میں تمہیں چھوڑ دوں گا، یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔" میں نے پورے اعتماد سے کہا تو چند لمحے خاموش رہا پھر بڑے اعتماد سے بولا۔

"شہر کے جنوب مغرب میں جو پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا ہے، وہیں سے ایک بہت کھلا راستہ اوپر کی طرف جاتا ہے۔ یہ قدرتی نہیں خود بنایا ہوا راستہ ہے۔ وہ سڑک ایک مندر کے قریب سے گزرے گی۔ وہ مندر در اصل اس قید خانے کی چوکی ہے۔ اسی کے بالکل سامنے وہ قید خانہ ہے۔"

"اب تمہاری زندگی اور موت کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم جھوٹ بولتے ہو یا سچ، دو گھنٹے

میں تمہارا فیصلہ ہو جائے گا۔" میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"ایک بات کہوں......"

"کہو...." میں نے کہا۔

"مجھے مارومت، میرے ساتھ ڈیل کرو۔ تمہارے لوگ تم تک پہنچ جائیں گے۔"

"میں تمہارے سچ اور جھوٹ کو دیکھ لوں، اگلے دو گھنٹوں میں ہو سکتا ہے میں تمہارے ساتھ ڈیل کرلوں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے اعتماد سے کہا تو میں نے تیمور کو اشارہ کیا۔ اس نے گوپال داس کے ہاتھ باندھے اور وہیں چھوڑ دیا۔

ہم چاروں باہر آ گئے۔ تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں فوروہیل لے کر آ گیا۔ ہم اس میں بیٹھ کر وہاں سے چل دیئے۔ تیمور سمجھ چکا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ اس نے اپنا فون نکالا اور اپنے ساتھ جڑے کسی مقامی بندے کو کال کرنے لگا۔ اس نے پوری بات بتائے بغیر صرف اس مندر کے بارے میں تصدیق کرنے کے لئے کہا اور فون بند کر دیا۔

"تیمور، یہ فوروہیل مشکوک ہو چکی ہے۔ ہم اسے کہیں بھی پارک کر کے اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب نکل جائیں گے۔"

"اس گوپال داس کا کیا کرنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ایک آدھ دن میں نہیں مرنے والا، دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے اس کے ساتھ، تم تصدیق کر کے بتاؤ ممکن ہے اسے اٹھا کر اس قید خانے تک لے جانا ہی پڑے۔" میں نے کہا اور فوروہیل کی رفتار بڑھا دی۔

☆......☆......☆

رانی بھاگ وتی کے بنگلے کے آہنی گیٹ کے سامنے سڑک پر میں آٹو رکشے سے اترا۔ میں نے رکشے والے کو کرایہ دیا۔ وہ آگے بڑھا تو میں گیٹ کی جانب چل پڑا۔ انہی لمحات میں مجھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے آواز کی سمت مڑ کر دیکھا تو چند لوگ دیوانہ وار میرے جانب بھاگتے چلے آرہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے، ہاکیاں اور پتہ نہیں کیا کیا تھا۔ آہنی گیٹ بند تھا۔ اسے سیکورٹی والوں نے تصدیق کے بعد ہی کھولنا تھا۔ جبکہ حملہ آور مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ میرے پاس ایک پسٹل تھا۔ میں اس سے ہی انہیں ڈرا سکتا تھا۔ وہ میرے سر پر پہنچ چکے تھے۔ میں اگر پسٹل نکال کر فائر بھی کرتا تو ایک آدھ ہی نشانہ بنتا۔ باقی مجھے پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے۔ اتنے آدمیوں کے چنگل سے نکلنا بہت مشکل ہو جاتا۔ میرے پیچھے آہنی گیٹ تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے لئے فوری نہیں کھل سکتا تھا اور یہی گیٹ میرے لئے دیوار بن جانے والا تھا۔ میں اگر دائیں نکلتا یا بائیں تبھی میرے بچت ہو سکتی تھی۔ ممکن ہے وہ بھی یہی سوچ رہے ہوں، میں نے اپنے پیر مضبوطی سے سڑک پر جمائے اور پھر انہی کی جانب تیزی سے بڑھا۔ وہ اپنی جانب آتا دیکھ کر ایک لمحہ کو ٹھٹکے تب تک میں ان کے سروں کے اوپر تھا۔ میں نے ایک بندے کے سر پہ ہاتھ رکھ کر سہارا لیا اور ہوا میں تیرتا ہوا ان کے پیچھے جا پہنچا تھا۔ جیسے ہی میرے قدم سڑک پر لگے، میری نگاہوں کے سامنے ایک ہاکی والا تھا۔ جب تک وہ پلٹتے میں نے ایک جھٹکے سے وہ ہاکی چھین لی۔ میں الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور ان سے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔

وہ دس سے بارہ لوگ میرے سامنے تھے۔ وہ حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے اور میں اسی طرح پیچھے ہٹ رہا تھا۔ میں نگاہوں ہی نگاہوں میں انہیں تول رہا تھا کہ اگر مجھے حملہ کرنا پڑے تو کدھر سے کروں گا۔ وہ جتھے کی صورت میں تھے اور آہستہ آہستہ دائرے کی

صورت میں پھیل رہے تھے۔ یہ میرے لئے خطرناک تھا۔ میں رک گیا تو ایک بندے نے بڑھ کر ڈنڈے سے مجھ پر حملہ کیا جو میں نے ہاکی سے روک لیا۔ انہی لمحات میں کئی ڈنڈے ابھرے اور مجھ پر آن پڑے، میں نے لاشعوری طور پر اپنے سر کو بچایا تھا۔ میرے ہاتھوں بازوؤں اور کمر سے اٹھنے والی ٹیسیوں نے مجھے ادھ موا کر دیا تھا۔ میں ہاکی لئے پھرکی کی طرح گھوم گیا۔ میں نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ کس کے کہاں پڑ رہی ہے اور نہ میں نے یہ پرواہ کی کہ میرے کہاں کہاں پڑ رہی ہیں۔ چشم زدن میں چند لوگ زمین پر پڑے تھے۔ میں اس ایک لمحے میں سمجھ گیا تھا کہ میں اگر کامیاب ہو بھی گیا تو اس وقت تک میں بہت زیادہ زخمی ہو جاؤں گا۔ میرے بدن پر لگنے والی ضربیں اتنی شدید تھیں کہ میں مزید کچھ دیر ہی ان کے مقابلے میں ٹھہر سکتا تھا۔ میں نے اسی لیے فیصلہ کیا اور فوراً الٹے قدموں بھاگا، چند قدم کے فاصلے تک جاتے ہوئے میں نے ہاکی پھینک کر اپنا پسٹل نکال لیا۔ میں اپنے پاؤں پر مڑا اور فائر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چیخ بلند ہوئی۔ ایک بندہ سڑک پر گر کر تڑپنے لگا تھا۔

میں بھاگتا ہوا سڑک کے دوسرے کنارے ایک درخت کے پیچھے جا پہنچا۔ وہیں سے میں نے تاک کر دوسرا فائر کیا۔ بلاشبہ وہ کسی کے لگا تھا، ایک شور مچ اٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سامنے سے فائر ہوا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی فائر ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ہجوم سے ایک ہی شخص فائر کر رہا تھا، میں نے تاک کر نشانہ لیا اور تین فائر کر دیئے۔ اس کا ہاتھ بلند ہی رہ گیا اور وہ سڑک پر گر گیا تھا۔

انہی لمحات میں رانی بھاگ وتی کے بنگلے کا آہنی گیٹ کھلا اور چند سیکورٹی والے باہر آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی ہوائی فائر شروع کر دیا۔ ان کا مقصد ہجوم کو ڈرانا دھمکانا ہی تھا۔ وہ جو چند لوگ وہاں کھڑے تھے، وہ دائیں بائیں بھاگنے لگے۔ چھ لوگ سڑک پر پڑے ہوئے تھے۔

سیکورٹی گارڈز نے فائرنگ بند کر دی تھی۔ میں نے جب یہ تسلی کر لی کہ ان میں سے کوئی نہیں اٹھے گا، میں درخت کی اوٹ سے نکلا اور سڑک پر آ گیا۔

میں تیزی سے آہنی گیٹ تک جا پہنچا۔ سیکورٹی والوں نے مجھ پر گنیں تان لیں۔ میں بڑے اعتماد سے ان کے قریب چلا گیا۔

"کون ہو تم......" ایک سیکورٹی والے نے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

"اپنی رانی سے کہو، رانا وریندر سنگھ ہوں۔" میں نے سختی سے کہا۔

"کیا آپ رانی سے ملنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا تو میں نے ہنستا کر کہا۔

"اسے جلدی کر، ورنہ یہیں کوئی فائر کر دے گا مجھ پر۔"

یہ کہتے ہوئے میں گیٹ سے اندر کی جانب چلا گیا۔ وہاں پر ایک کرسی پڑی تھی میں اس پر بیٹھ گیا۔ ایک سیکورٹی والا اندر کہیں بات کر رہا تھا۔ میرے پاس رتنو کا فون ہوتا تو میں اب تک اندر پہنچ چکا ہوتا اور کوئی بھی یہاں سے بچ کر نہ جاتا۔ لیکن وہ فون اب تک نجانے کہاں تھا۔

مجھے وہاں بیٹھے دس منٹ سے بھی زیادہ ہو گئے تھے۔ میں حیران تھا کہ اتنا وقت کیوں لیا جا رہا ہے۔ تبھی میں نے ایک چھوٹی سی کار گیٹ کی طرف آتے ہوئے دیکھی، وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر رک گئی۔ اس میں رتنو بیٹھی ہوئی تھی۔ کار رکتے ہی وہ تیزی سے میری جانب آئی۔

"کن لوگوں نے حملہ کیا؟"

"مجھے نہیں پتہ، شاید وہ میری تاک میں یہاں موجود تھے۔" میں نے اسے بتایا تو وہ سرسراتے ہوئے بولی۔

"یہ پرتاب سنگھ ہی کے لوگ تھے۔ وہ مجھے کئی بار فون کر چکا ہے۔"

"کیا کہتا ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"وہ تمہارے بارے ہی میں پوچھ رہا تھا، وہ تمہیں بتاتی ہوں، چوٹ زیادہ تو نہیں لگی؟"

اس نے تیزی سے پوچھا

"اوئے چوٹ نہیں چوٹیں کہو۔اس پسٹل نے بچا لیا ورنہ۔ ...."میں نے کہا تو وہ مڑتے ہوئے بولی۔"آؤ چلیں۔"

میں اس کے ساتھ کار میں آ بیٹھا تو وہ چل دی۔

"کیا کہتا رہا ہے پرتاب سنگھ تمہیں......"میں نے پوچھا۔

"وہ صرف تمہارا پوچھ رہا ہے۔"اس نے بتایا۔

"تم نے کیا بتایا؟"میں نے پوچھا۔

"یہی کہ میں نہیں جانتی تم کون ہو۔"اس نے بتایا۔

"اس نے رانی سے کوئی بات کی؟"میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں، بس اتنا پتہ چلا ہے کہ وہ ابھی تک یہاں دیو گڑھ نہیں پہنچا، اس کے آنے سے کوئی بات شاید بڑھے۔"وہ سکون سے بولی، پھر یوں کہا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو،"تم نے مجھے فون کیوں نہیں کیا؟"

"سارا فساد تمہارے فون کا ہے، تمہارے نمبر سے وہ مجھ تک پہنچا ہے، اس نے مجھے کال کی تھی۔یہی کہا کہ وہ مجھ تک پہنچ رہا ہے، میں نے تمہارا فون ضائع کر دیا۔"

"اوہ......میرا یہ فون بھی اب خطرناک ہے۔"اس نے سرسراتے ہوئے کہا تو میں خاموش رہا۔میرے بدن کی ٹیسیں مجھے بے چین کر رہی تھیں۔میں خود پر قابو رکھا ہوا تھا۔وہ مجھے اسی رہائش گاہ میں لے گئی جہاں ہم ٹھہرے تھے۔چھوٹے سے لاؤنج میں آتے ہی بولی۔

"شرٹ اتار کے لیٹو یہاں، دیکھوں کہاں کہاں چوٹ آئی ہے۔"

میں نے شرٹ اتاری اور صوفے پر لیٹ گیا۔ وہ کافی دیر تک مجھے ہر طرح سے ٹٹول کر دیکھتی رہی۔ اس دوران بیل بجی تو وہ دروازے تک گئی۔ واپسی پر اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ وہ وہیں بنگلے میں ملازم تھا۔ اس نے بھی مجھے ہر طرح سے ٹٹول کر دیکھا، پھر فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی۔"

"ہاں وہ میں نے بھی دیکھ لیا ہے۔" رجّو نے کہا۔

"چوٹیں ہیں، ایک دو دن میں آرام آ جائے گا، یہ دوائیں دے دو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے کچھ سٹرپ نکالے اور رجّو کو تھما دیئے۔ جس وقت تک میں نے کپڑے پہنے، وہ جا چکا تھا۔

"رانی کو میری آمد کا نہیں پتہ؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ ہے، اسی نے کہا کہ پہلے میں تمہیں دیکھ لوں، پھر فریش ہو کر اس کے پاس جانا ہے۔" رجّو نے کہا تو میں باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔ جیسے ہی میرے بدن پر پانی پڑا، مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن میں آگ لگ گئی ہے۔ میں بڑی مشکل سے نہایا۔ باہر آ کر میں کتنی دیر تک صوفے پر پڑا رہا۔ رجّو میرے دوا لگاتی رہی۔ جب میں کافی حد تک خود کو پرسکون محسوس کرنے لگا تو میں رجّو کے ساتھ رانی بھاگ وتی کی جانب چل پڑا۔

رانی بھاگ وتی نے ہمیں اپنے کمرے ہی میں بلا لیا۔ وہ صوفے پر براجمان تھی۔ اس نے سیاہ ساڑھی پہن رکھی تھی، زلفیں یونہی کھلی چھوڑ رکھی تھیں۔ میں نے جب بھی اسے دیکھا تھا، اس کے ساڑھی پہننے کا انداز ایک جیسا تھا صرف رنگ بدلتا تھا۔ وہی تنگ سا، کسا ہوا اسلیو لیس بلاؤز، ساڑھی کے پیچھے سے بے نیاز کمر اور لپکتا ہوا پلّو۔ میں اس کے چہرے پر دیکھ رہا تھا

جہاں تذبذب بکھرا ہوا تھا۔ وہ نچلے ہونٹ کا دائیں کونا بار بار دانتوں سے دبا رہی تھی۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ خود بات کرے۔ کافی دیر خاموشی کے بعد اس نے دھیمے سے کہا۔

"رانا جی تم نے ایک بڑے امتحان میں ڈال دیا۔"

"تو ٹھیک ہے، میں اپنی قربانی دے دیتا ہوں، بڑی بی کو جیسے لایا ہوں، ویسے ہی ان کے ہاں چھوڑ آتا ہوں۔" میں نے بڑے تحمل سے کہا تو بے ساختہ تیزی سے بولی۔

"نہیں ایسا نہیں، اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ کچھ بھی ہو جائے، میں تم پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔"

"پھر آپ اتنا۔۔۔" میں نے کہنا چاہا تو وہ میرے بات سنے بغیر بولی۔

"میں جو میرے دشمن سے جنگ لڑنا چاہ رہی تھی، تم نے ایک ہی ہلے میں میدان جنگ کا رخ بدل دیا ہے۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ وہ میرے بنگلے کے آس پاس بھی پھٹک جائے، لیکن انہوں نے تم پر حملہ کر دیا۔ ان کی اتنی ہمت ہو گئی۔"

"بڑی بی کیا کہتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اب پر سکون ہے۔ اسے یقین ہو گیا ہے کہ کوئی اسے نقصان نہیں پہنچائے گا، وہ کہیں ایسی جگہ نہیں جہاں اس سے کوئی اونچی آواز میں بھی بات کر سکے، میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔" رانی نے سکون بھرے انداز میں کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر پریشانی کیا ہے؟"

"یہی کہ آج تم پر حملہ کیا ہے، کل وہ اپنے غنڈوں کے ساتھ یہاں بھی آجائے گا۔" اس نے پریشان لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا نا آپ نے بساط تو بچھالی مگر آپ کو مہرے چلنا نہیں آتے، نہ ہی آپ کو

جنگ لڑنا آتی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے سانس لیا پھر پوچھا۔ "پرتاب سنگھ کا کوئی فون آیا؟"

"کئی بار آ چکا ہے، میں نے اس کا فون ہی نہیں سنا۔"

"فون سنیں اور جتنا بڑا مطالبہ ہو سکتا ہے، وہ کریں۔ بڑی بی والا مہرہ جتنا کھیل سکتی ہیں کھیلیں۔ ایسا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔" میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا تو دھیمے سے بولی۔

"بات تو تمہاری بالکل ٹھیک ہے، میں ایسا سمجھتی بھی ہوں، لیکن......"

"آپ پرتاب سنگھ سے بات نہیں کر پا رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

"ایسا ہی کچھ سمجھ لو۔" اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنا مطالبہ بتاؤ، میں بات کر لیتا ہوں۔" میں نے حتمی انداز میں کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

"میرا ایک ہی مطالبہ ہے، میں اسے اپنے قدموں پر ڈھیر کرنا چاہتی ہوں، اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔"

"اگر میں یہ کر دوں......" میں نے اعتماد سے کہا تو اس نے چونک کر میری جانب دیکھا، پھر چمکتی ہوئی آنکھوں سے بولی۔

"تم جو مانگو گے دوں گی۔"

"تو پھر یہ کھیل مجھے خود کھیلنے دو۔ اپنے لوگوں کو میرے بارے میں بتا دو، ایسا نہ ہو کہ میں گیٹ پر آ جاؤں اور کوئی مجھے پہچانے بھی نہیں۔"

"اب ایسا نہیں ہو گا، تمہیں اجازت ہے۔" اس نے کہا ہی تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ملازمہ اندر آ گئی۔ اس نے رانی کی طرف دیکھ کر نرم سے انداز میں کہا۔

"گیٹ پر پولیس کمشنر ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"پولیس کمشنر......؟" رانی نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا پھر میری طرف دیکھ کر بولی، "بلاؤ۔" وہ ملازمہ واپس چلی گئی۔ رانی میری جانب سوالیہ نشان سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے بڑے سکون سے کہا۔

"وہ اگر بڑی بی کو لے جانے کے لئے سرچ وارنٹ لے کر آیا ہوگا تو بڑی بی کسی بھی صورت واپس نہیں جانی چاہئے۔ اگر وہ گئی چلی تو پرتاب سنگھ بڑے غضب کے ساتھ حملہ آور ہوگا، مجھے صرف ایک دن چاہئے، پھر دیکھنا حالات کیا بنتے ہیں۔"

"میں دیکھتی ہوں۔" اس نے کہا اور اٹھ کر باہر کی جانب چل دی۔ رتو اس کے پیچھے چلی تو میں بھی پیچھے ہولیا۔

رانی اور رتو لاؤنج میں چلی گئیں، جبکہ میں باہر ہی رہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پولیس کمشنر اپنے ایک ماتحت کے ساتھ رانی کو دیکھ کر احترام میں کھڑا ہو گیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نمسکار کیا تو رانی نے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تشریف رکھیں۔"

وہ بیٹھ گئی تو پولیس کمشنر نے بیٹھ کر کہا۔

"میں اس لئے آیا تھا، ابھی کچھ دیر پہلے یہاں بنگلے کے باہر فائرنگ ہوئی ہے، کہیں وہ آپ کو نقصان پہنچانے کے لئے حملہ تو نہیں تھا۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔" رانی نے بڑی متانت سے کہا، پھر لمحہ بھر رک کر بولی، "وہ کوئی راہ گیر تھا، جس پر کچھ لوگوں نے حملہ کیا تھا، وہ اپنی جان بچانے گیٹ کے اندر آ گیا تھا۔"

"اب وہ کہاں ہے۔"

”مجھے سیکورٹی والوں نے بتایا ہے کہ وہ چلا گیا ہے۔“ رانی نے سکون سے کہا تو پولیس کمشنر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”چلیں، میں اب چلتا ہوں۔“

”بیٹھیں، چائے پی کر جائیں۔“ رانی نے کہا۔

”نہیں بس، میں چلتا ہوں۔“ اس نے کہا پھر رک کر بولا ”شہر میں اچانک ہی وارداتیں بڑھ رہی ہیں۔ ممکن ہے وہ راہ گیر نہ ہو، یا معاملہ کچھ بھی ہو آپ کو بہر حال محتاط رہنا ہے۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ رانی نے کہا۔

”کسی بھی صورت میں ہمیں اطلاع ضرور دیں۔“ اس نے کہا اور تیزی سے نکلتا چلا گیا۔

کمشنر کی گاڑی جیسے ہی پورچ سے چلی، میں لاؤنج میں چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا، رانی خود ہی بول اٹھی۔

”کمشنر کا مقصد، وہ نہیں تھا جو اس نے کہا، بات کوئی دوسری ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔ یہ سب آپ کے فون نہ سننے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اب اگر کال آئے تو آپ نے بات کرنی ہے۔“ میں نے کہا تو وہ میرے چہرے پر دیکھ کر بولی۔

”کیا کہوں گی میں......؟“

میں چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ویسی ہی مسکان کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ بہت اچھی طرح سمجھتی ہیں، بس کہیں بھی جذباتی نہیں ہونا، اکثر جذباتی فیصلے پچھتاوے کا باعث بنتے ہیں۔“

میری بات کا اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھ کر اندر جانے لگی تو اسی دوران اس کا فون بج

اٹھا۔اس نے فون اسکرین پر دیکھا پھر چونک کر بولی۔

''لو یہ آ گیا فون.......''

''تو پھر کریں بات۔'' میں نے کہا تو وہ چند لمحے اسکرین پر دیکھتی رہی، پھر اس نے کال رسیو کر کے اسپیکر آن کر دیا۔

''دھنے واد مہارانی جی، تم نے میرا فون سننے کی زحمت کی۔'' دوسری طرف سے طنزیہ لہجے میں کہا گیا۔

''کام کی بات کرو۔'' رانی نے جھڑکنے والے انداز میں کہا۔

''کشٹ آیا ہے تو فون سنا، ورنہ.......''

''کہا نا، کام کی بات کر.......'' اس نے اسی لہجے میں کہا۔

''سن، ماتا جی کو جس طرح لے کر گئے ہو، اس طرح نہیں، بلکہ خود لے کر آ جاؤ، میرے شہر میں پہنچنے سے پہلے پہلے، اور ہاں ساتھ میں وہ دونوں مجھے چاہئیں، جو ماتا جی کو لے کر گئے ہیں۔ انھیں بھی ساتھ لے کر آنا، ورنہ تمھیں پتہ ہے، میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''تم کچھ بھی نہیں کر سکتے ہو۔'' رانی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''ہاں تمہارے لئے تو کچھ بھی نہیں کر سکا لیکن اپنی ماتا جی کے لئے تو اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''تو پھر جان ہی دے کر دکھاؤ، اگر تم میں ہمت ہے تو اپنی ماتا جی کو میرے ہاں سے لے جا کر دکھاؤ، میں دیکھتی ہوں تم کتنے سورما ہو۔'' رانی نے طنزیہ انداز میں کہا تو دوسری جانب سے قہقہہ بلند ہو گیا۔

''دیکھ میں نہیں چاہتا کہ ماتا جی کو لے کر بات میڈیا تک چلی جائے، اگر چلی بھی گئی تو کوئی

بات نہیں، جو کچھ لوگ تمہارے بارے میں نہیں جانتے وہ بھی جاننے لگ جائیں گے۔ سو بھلائی اسی میں ہے کہ میرے شہر پہنچنے سے پہلے خود......"

"تم سے بھلائی کی امید نہیں ہے مجھے پرتاب سنگھ، ایک بار کہا ہے، اگر تم میں ہمت ہے تو اپنی ماتا جی کو لے جاؤ، میں بھی تمہیں وچن دیتی ہوں، مر جاؤں گی، مار دوں گی پر......" یہ کہتے ہوئے وہ خاموش ہو گئی۔

"تم ایسے نہیں مانو گی، کل میں آ رہا ہوں، دیکھتا ہوں، تم کیا کرتی ہو۔ تم اور تیرا وچن گیا بھاڑ میں......" ایک دم اس نے انتہائی غصے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ رانی بھاگ وتی چند لمحے فون اسکرین کو دیکھتی رہی پھر کوئی بات کیے بنا، لاؤنج سے نکلتی چلی گئی۔

یہ وہ وقت تھا جب میں رانی کو پرتاب سنگھ کے خلاف مزید بھڑکا سکتا تھا۔ اسے حوصلہ دے کر بڑی بڑی باتیں کر کے مزید مضبوط کر سکتا تھا۔ لیکن میں خاموش رہا۔ میں رانی کی نفسیاتی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ میں اس کے اندر کی نفرت کو دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کس حد تک ہے۔ اگلے چند گھنٹوں میں سب واضح ہو جانے والا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ رتو کا سیل فون بجا، اس کے ساتھ ہی وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔

"لو یہ پرتاب سنگھ کا فون......"

"لاؤ مجھے دو۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو رتو نے فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے کال ریسیو کی اور بڑے سکون سے ہیلو کہہ دیا۔

"رتو، تم اپنی رانی کو......"

"میں بات کر رہا ہوں رانا دیر سنگھ۔" میں نے سرد لہجے میں کہا تو وہ ایک دم سے خاموش ہو گیا، پھر غراتے ہوئے بولا۔

’’اچھا ہوا تم سے بات ہو گئی۔ میں سمجھ گیا ہوں تم شاطر بھی ہو اور تربیت یافتہ بھی، مگر تم نہیں جانتے کہ......‘‘ وہ کہہ رہا تھا لیکن میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

’’میں جانتا ہوں، تم صرف فون پر دھمکیاں دے سکتے ہو۔‘‘

’’تم نے میرا دل اپنی مٹھی میں کر لیا ہے، ورنہ اب تک تیرے جیسے کو میں کئی ٹکڑوں میں بانٹ چکا ہوتا۔‘‘ اس نے انتہائی غصے میں کہا۔

’’ماتا جی کو بھول جاؤ، وہ اس وقت تک تمہیں نہیں مل سکتی، جب تک میں نہیں چاہوں گا۔‘‘ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تاکہ اس کا غصہ مزید بڑھے۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ بڑے سکون سے بولا۔

’’تم کیا چاہتے ہو؟‘‘

’’تمہارا خاتمہ۔‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

’’تم خواب دیکھ رہے ہو یا پھر پاگل ہو، یہ پاگل میرے سامنے ایک لمحہ کو بھی نہیں ٹک سکتی اور تم اس کے پالتو کتے بن کر مجھ پر بھونک رہے ہو۔ تم اپنی اوقات میں رہو۔ میرے شہر آنے سے پہلے یہ شہر چھوڑ کر چلے جاؤ۔ اسی میں تمہاری زندگی ہے، ورنہ بہت سسکا سسکا کر ماروں گا۔‘‘ اس نے لفظ چبا چبا کر کہا۔

’’میں تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں۔ میدان تمہاری پسند کا ہوگا، وہیں تجھے ماروں گا۔‘‘ میں نے سرد لہجے میں کہا تو وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا، پھر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کال ختم کر دی۔ میں نے فون رتنو کی طرف بڑھایا تو اس نے پوچھا۔

’’کیا کہہ رہا تھا؟‘‘

’’وہی دھمکیاں۔‘‘ میں نے اختصار سے کہا تو رتنو بولی۔

"تمہیں اس کی قوت کا اندازہ نہیں ہے۔ ہم دونوں اس کا کچھ نہیں بگاڑ پائیں گے۔"

اس نے کہا تو مجھے رتنو پر بے تحاشا پیار آیا۔ وہ خود کو مجھ سے الگ نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس کا "ہم دونوں" کہنا، اس سوچ کا غماز تھا۔ میں نے اپنے سامنے کھڑی رتنو کو ایک نگاہ دیکھا، پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑے ہی جذباتی انداز میں کہا۔

"رتنو، قوت نہیں حوصلہ لڑتا ہے۔ جب تک بڑی بی یہاں پر ہے، وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"میں جانتی ہوں رانی اس کے سامنے پگھل سکتی ہے۔" رتنو نے خوف زدہ لہجے میں کہا تو میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تم رانی کو حوصلہ دیتی رہو اور بڑی بی کی نگرانی رکھو، کہیں بنگلے کے اندر رہو۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔"

"تم پر بھروسہ ہے۔" اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اب جاؤ، بڑی بی کے آس پاس رہو۔" میں نے کہا اور پلٹ کر بنگلے سے نکلتا چلا گیا۔

اس وقت میں رہائش گاہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب تیمور کا فون آ گیا۔ میں نے اس کی کال رسیو کی تو وہ بولا۔

"جہاں سے پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا ہے، وہاں سے ایک راستہ اوپر کی جانب جاتا ہے۔ وہاں پر ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ چند پجاری قسم کے لوگ بھی موجود ہیں۔"

"کیا تم خود وہاں پر ہو یا......" میں نے پوچھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی، اس پر وہ بولا۔

"نہیں، میں اس طرف نہیں گیا۔ ایک مقامی اور دوسرا اپنا ساتھی وہاں گئے ہیں۔ ابھی انہوں نے کال کی ہے۔"

”وہاں کسی کو شک نہ ہو جائے۔“ میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

”وہ وہاں پر یوں گئے ہیں جیسے راستہ بھول گئے ہو، وہ بس دو چار منٹ ٹھہرے ہیں اور پھر واپس آرہے ہیں۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”شام تک پوری طرح تیار رہنا، آریا پار......“ میں نے کہا تو وہ تیزی سے پرسکون لہجے میں بولا۔

”بالکل، میں تیار ہوں۔“

”اوکے ڈن۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اسی لمحے مجھے گوپال داس کا خیال آیا۔ وہ پرانی فیکٹری میں پڑا تھا۔ بلاشبہ اس نے سچ بولا تھا۔ لیکن یہ ایسا وقت تھا کہ نہ تو میں اسے جا کر چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی میں اسے مار سکتا تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

☆......☆......☆

میں رہائش گاہ پر پہنچا ہی تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ کچھ کھا پی کر تھوڑی دیر آرام کر لوں، پھر مجھے ہر حال میں شام کے وقت یہاں سے نکلنا تھا۔ مجھے یہاں سے کوئی گاڑی یا اسلحہ نہیں چاہیے تھا۔ اس کا سارا انتظام تیمور کر چکا تھا۔ مجھے بس یہاں سے اسی طرح نکلنا تھا کہ کسی کی نگاہوں میں نہ آؤں۔ سب یہی سمجھیں کہ میں یہیں بنگلے پر ہوں۔ اسی مقصد کے لئے میں نے رتنو کو بھی بنگلے کے اندر رہنے کا کہا تھا۔ یہی سوچتا ہوا میں نے فریج کھولا اور اس میں سے تھوڑے پھل نکالے۔ میں ابھی بیٹھا بھی نہیں تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ساتھ ہی رتنو کی آواز ابھری۔

”رانا، دروازہ کھولو۔“

میں نے تیزی سے دروازہ کھولا تو سامنے رتنو کھڑی تھی۔ اس کی مٹھی میں فون تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

"خیر تو ہی نا رشو.......؟"

"ہاں خیر ہی ہے، آؤ بیٹھو تمہیں بتاؤں۔" اس نے اندر بڑھتے ہوئے کہا اور پھر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہوا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود کہے جو کہنا چاہ رہی تھی۔ تبھی اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

"وہ تم نے ایک بات یا کہاوت یا جو بھی ہے سنی ہے کہ دوست کا دوست، دوست ہوتا ہے اور دشمن کا دشمن، دشمن......"

"میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔" میں نے کہا۔

"پرتاپ سنگھ کے جتنی دوست نہیں ہیں، جنہیں اس نے کچلا ہے، وہ دشمن آج بھی اسے ختم کرنے کی حسرت دل میں لیے ہوئے ہیں۔ وہ کوئی شریف شرفاء لوگ نہیں ہیں، وہ بھی جرم کی اسی دنیا کے لوگ ہیں۔"

"تم سیدھی بات کہو، کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"میں ساری بات تم سے کہہ دوں گی لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ، گوپال داس کو کس نے اغواء کیا ہے، تم نے یا......؟" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے ایک بھی لمحہ سوچے بغیر کہا۔

"ہاں، میں نے اسے اغواء کیا ہے۔"

"ایسا کب ہو گیا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"جب ہم بڑی بی بی کو اغواء کر کے لا رہے تھے۔" میں نے سکون سے بتا دیا تو اس نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"تو اس کا مطلب ہے تمہارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں؟"

"ہاں میرے ساتھ لوگ ہیں۔" میں نے اسے سچ بتا دیا تو ایک دم سے اس نے اپنے تنے ہوئے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی پھر انتہائی سنجیدگی سے بولی۔

"مجھے شک تو پہلے ہی سے تھا، اب تم نے سچ بول کر میرا دل جیت لیا ہے۔ مجھے لگا، تم میرے ساتھ دھوکا نہیں کر رہے ہو۔"

"رجو، مجھ سے مزید کچھ نہیں پوچھنا، اس میں تمہاری ہی بہتری ہے۔"

"میں سمجھ گئی ہوں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد کہتی چلی گئی۔ "ہاں، سنو اب میری بات، یہاں کسی دور میں جگدیش لعل جسے سب یہاں جگو دادا کے نام سے جانتے ہیں، اس کا طوطی بولتا تھا۔ وہ پرتاب سنگھ کی طرح طاقت ور تو نہیں تھا اور نہ سیاست دان کا روپ دھارے ہوئے تھا لیکن یہاں اور آس پاس کے علاقوں پر اس کا راج تھا۔ پرتاب سنگھ اپنی جگہ بنانے کے لیے اسے ختم کرنا چاہتا تھا۔ دونوں طرف سے لڑائیاں فساد چلتا رہا۔ یہاں تک کہ پرتاب سنگھ نے اس کے دونوں بیٹے قتل کروا دیے، تبھی جگو دادا زیر زمین چلا گیا۔ کتنا عرصہ اس کا پتہ ہی نہیں چلا۔ تقریباً ایک برس سے وہ میرے ساتھ رابطے میں تھا۔ آخری بار ایک ماہ پہلے بات ہوئی تھی اس کے بعد ابھی کچھ دیر پہلے مجھے اس کا فون آیا ہے۔"

"جگو دادا...... یہ اچانک، ممکن ہے جگو دادا کے نام سے کوئی چال ہی چل رہا ہو، تم اسے کیسے جانتی ہو اور وہ تم تک کیسے پہنچ گیا۔" میں نے ایک ہی سانس میں کئی سارے سوال کر ڈالے۔

"کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں کالج دور میں نفسیات پڑھتی رہی ہوں۔ میں بھی ایک

نیٹ ورک کا حصہ تھی، ایک برس سے میں اسکے ساتھ رابطے میں ہوں اور......" اس نے تیزی سے کہا۔

"ہاں، تم نے بتایا تھا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ جگو دادا ہی کا نیٹ ورک تھا۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور وہ بھی مجھے جانتا ہے۔ اگر پرتاب سنگھ میرے فون سے تم تک پہنچ سکتا ہے تو کیا جگو دادا کو شہر میں ہونے والے حالات کا نہیں پتہ؟" اس نے دلیل دیتے ہوئے کہا۔

"کیا گوپال داس کے بارے میں اس نے تمہیں بتایا؟" میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی۔

"ہاں، وہی نہیں، یہاں کی زیر زمین دنیا میں گوپال داس کے اغواء سے ہلچل مچی ہوئی ہے۔ شاید کسی کو پتہ نہ چلتا لیکن یہ جو گیٹ پر تمہارے ساتھ مارا ماری ہوئی ہے سبھی اسی سے جوڑ رہے ہیں۔ پرتاب سنگھ کے لوگوں میں بھی یہی بات پھیلی ہوئی ہے کہ گوپال داس کو اغواء کرنے والا رانی بھاگ وتی کا کوئی کارندہ ہے۔ جس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے اغواء کیا۔"

"تو جگو دادا مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، وہ پرتاب سنگھ کو ختم کرنے کے لئے ہمارا ساتھ دینا چاہتا ہے۔" اس نے اصل بات بتادی۔

"کیا ہم اس پر بھروسہ کر سکتے ہیں؟" میں نے رجو کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تو وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی، پھر آنکھیں بند کرکے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب میں نے کہا۔ "لاؤ میری اس سے بات کراؤ۔"

"ابھی کرواتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون پر موجود نمبر پش کئے اور رابطے کا انتظار کرنے لگی۔ پھر کال ملتے ہی بولی۔ "دادا، یہ کرو بات۔" یہ کہہ کر اس نے فون میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے بھاری آواز میں بولا۔

”داد دیتا ہوں تمہیں۔جی خوش کر دیا، کوئی تو ہے جو راون کی لنکا ڈھانے آ گیا ہے۔“

”دادا، یہ بولو، میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں۔“ میں نے پوچھا۔

”چھوٹا منہ بڑی بات...... میں اب تک پڑا اپنے زخم چاٹ رہا ہوں۔یہ تو میں نے پوچھنا ہے کہ میں تمہاری کیسے مدد کر سکتا ہوں۔میں اگر چھپ کر بیٹھا ہوں تو غافل نہیں ہوں۔میری اردگرد پر نگاہ ہے۔بس قوت نہیں ہے۔گوپال داس کو قابو کرنے کا مطلب تم نے پرتاب سنگھ کی شاہ رگ پکڑ لی ہے۔“ اس نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ دی۔اسی بات میں سب کچھ تھا۔تبھی مجھے خیال آیا تو میں نے سکون بھرے لہجے میں کہا۔

”اگر میں گوپال داس تمہیں سونپ دوں تو کیا تمہیں کوئی فائدہ ہو گا؟“

”مجھے فائدہ ہو نہ ہو، اس کے ساتھ کھیل کھیلا جا سکتا ہے۔ویسے بھی اسے قتل کر کے مجھے سکون ملے گا۔“ اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

”دادا، چل پھر جو کھیلنا ہے کھیلو، جی بھر کے کھیلو، راون کی لنکا میں جہاں چاہے آگ لگاؤ، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ میں نے خوش کن لہجے میں کہا۔

”اس کا ایک ہی بیٹا ہے اور مجھے وہ مارنا ہے۔بس۔“ اس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

”جو دل چاہے کرنا، رتی تمہیں بتا دیتی ہے کہ گوپال داس کہاں ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے فون اسے تھما دیا۔اسے بالکل نہیں پتہ تھا کہ گوپال داس کو کہاں رکھا ہوا ہے اس لئے سوالیہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا تو میں نے دھیمے سے کہا۔”پرانی فیکٹری، دفتر کا کمرہ۔“ میرے اتنے کہنے پر وہ سمجھ گئی۔اس نے دادا کو فون پر اچھی طرح سمجھا دیا کہ گوپال داس کہاں مل سکتا ہے۔اس نے فون بند کیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔اس کے چہرے پر حیرت ملی مسکراہٹ تھی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تم پرانی فیکٹری کو اس طرح استعمال کرو گے۔"

"اگر تم نہیں سوچ سکتی ہو تو پرتاب سنگھ کے لوگ کیسے سوچ سکتے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ

تشویش زدہ لہجے میں بولی۔

"کیا وہ زندہ مل جائے گا وہاں پر......؟"

"زندہ یا مردہ، دونوں حالتوں میں وہ دادا کے کام آ سکتا ہے اگر دادا میں تھوڑی بہت بھی عقل ہوئی تو۔" میں نے کہا تو رنتو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ تبھی میں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے جذباتی لہجے میں کہا، "رنتو، اگر زندگی رہی تو اب تم صرف ایک نٹ کی بیٹی نہیں رہو گی جو زندگی اور موت کے کھیل میں سانس لے رہی ہے۔ ایک بھرپور زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ بس ایک دو دن......"

میرے یوں کہنے پر وہ میرے چہرے پر دیکھتی رہی، پھر ایک دم سے میرے سینے کے ساتھ آ لگی۔ وہ رو دی تھی۔ روتے ہوئے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں، نجانے اسے زندگی کی کون سی تلخی یاد آ گئی تھی۔ میں نے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر اسے رونے دیا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ بادل بھی چھٹ ہی جائیں۔ شاید وہ میری صورت میں ایک ہمدرد پا چکی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ مجھ سے الگ ہوئی اور اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

"آؤ میں تمہیں سب سیکورٹی گارڈ سے ملوا دوں، انہیں میں نے ایک جگہ اکٹھا کر رکھا ہے۔"

"چلو۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ میز پر پڑے پھلوں کو دیکھ کر بولی۔

"انہیں واپس رکھ دو، ابھی ہم کھانا کھاتے ہیں۔"

میں نے پھل فریج میں رکھے اور اس کے ساتھ چل دیا۔

☆......☆......☆

شام ڈھل چکی تھی۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں بنگلے کے عقبی دروازے سے نکل کر باہر سڑک پر آ چکا تھا۔ میں وہاں رکا نہیں بلکہ ایک سمت چلتا چلا گیا۔ بنگلے کے پیچھے والا روڈ چھوٹا تھا۔ اس طرف سے بڑی گاڑیاں نہیں گزر رہی تھیں۔ چھوٹی کاریں، موٹر سائیکل، سائیکل یا پھر پیدل لوگ۔ اس روڈ پر موجود چند دوکانوں کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ میں ان کے سامنے سے گزرتا ہوا، بڑی سڑک پر آ گیا۔ یہاں کافی ٹریفک تھی۔ میں اس مخصوص کار کو دیکھنے کی کوشش میں تھا، جس نے مجھے پک کرنا تھا۔ میں پیدل چلتا گیا، یہاں تک کہ میں اس بڑے کراس تک جا پہنچا جہاں کافی رش تھا۔

میرے حساب سے اب تک گاڑی مجھ تک پہنچ جانی چاہیے تھی، لیکن مجھے اس کے دور دور تک آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ میرے پیچھے لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی۔ میں وہاں رک کر تیمور کو فون کرنا چاہتا تھا۔ میں نے فون نکالا اور بے خیالی میں فون کرنے لگا۔ انہی لمحوں میں میرا سیل فون بجنے لگا۔ میں نے دیکھا، وہ اجنبی نمبر تھے۔ میں نے کال رسیو کر کے ہیلو کہا تو دوسری طرف ہمارا ہی ایک ساتھی بات کر رہا تھا۔

”کہاں ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں پر سب سے بڑا بل بورڈ دیکھیں، جس پر سیاہ کپڑوں والی دوشیزہ آپ کو دیکھ رہی ہے۔“ اس نے شوخی سے کہا تو میں نے ارد گرد دیکھا تبھی مجھے وہ بل بورڈ دکھائی دے گیا۔ وہ اسی کراس میں ایک بڑے بل بورڈ کے نیچے فور وہیل لئے کھڑا تھا۔ وہ میرے دائیں جانب کھڑا تھا۔ میں نے کال بند کی اور عام سے انداز میں چلتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔ میں اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر جا بیٹھا۔ میرے بیٹھتے ہی وہ چل پڑا۔

”اتنی دیر کیوں لگا دی؟“ میں نے سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس یہ فور وہیل اٹھانے میں ذرا دیر لگ گئی۔" اس نے سکون سے کہا تو میں نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"او یار، ان میں ٹریکر ہوتے ہیں، فوراً پتہ چل...."

"او سر مت گھبرائیں، اس کا ٹریکر جام ہو چکا ہے، یہ دیکھیں۔" اس نے ڈیش بورڈ کی جانب انگلی کا اشارہ کیا۔

وہاں ایک سیاہ رنگ کی ڈبیا سی چپکی ہوئی تھی۔ میرے علم میں تھا کہ یہ ڈیوائس جہاں بھی لگا دی جائے، وہاں جیمر لگ جاتا تھا۔ اگر کوئی ہمیں کال بھی کرنا چاہتا تو اسے ہمارا فون نہیں ملنا تھا۔ تبھی میں نے تیزی سے کہا۔

"تم نے مجھے کال کی تب یہ...."

"اس وقت نہیں لگایا تھا۔ ابھی یہاں سے چلتے ہوئے لگایا ہے۔ کسی کو بھی اس فور وہیل کا کہیں تک سراغ نہیں ملے گا۔ اگر آپ نے کال کرنی ہو تو مجھے بتانا، یہ بھی اس میں ہے۔" اس نے بتایا اور ڈیوائس پر لگے ہوئے بٹن کی جانب اشارہ کیا۔ میں اسے سمجھانا نہیں چاہتا تھا اس لئے میں نے "اوکے" کہا اور سامنے سڑک پر دیکھنے لگا۔ میں تھوڑا بے چین ہو گیا تھا کہ اگر تیمور نے مجھے فون کیا تو اسے میرا فون بند ملے گا۔ اتنی اہم کارروائی کے دوران اس کا پریشان ہونا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

تقریباً آدھا گھنٹہ چلتے رہنے کے بعد وہ ایک جگہ آ کر رک گیا۔ اس نے فور وہیل سڑک کنارے کھڑی کر دی۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

"اتریں سر۔" میں اتر گیا تو اس نے پچھلی سیٹ پر سے بیگ نکالا، اس میں ایک چھوٹا سا بم نکالا، پھر اسے ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے ایڈجسٹ کر دیا۔ میں یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا،

بلاشبہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور رہی ہوگی۔ اسی لئے میں خاموش تھا۔ وہ بم لگا چکا تو اس نے کہا، ”چلیں سر۔“

”یہ سب کیوں کیا؟“ میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اس وقت ہمارا ایک ساتھی، ہمیں دیکھ رہا ہے، وہ اسی پہاڑی پر موجود ہے۔ اگر کوئی پولیس، یا کوئی دوسرے یہاں اس راستے سے اوپر جانے کی کوشش کریں گے تو وہ اپنے پاس رکھے ریموٹ کنٹرول سے یہ گاڑی پھاڑ دے گا۔“

”کس لئے......؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک ہمیں پتہ چل جائے گا کہ گاڑی پھٹی ہے تو ضرور کوئی خطرہ ہے۔ دوسرا تھوڑی دیر تک ہی سہی آنے والوں کا رستہ رک جائے گا۔“ اس نے تفصیل سے سمجھایا تو میں نے غور سے دیکھا۔ اس نے اوپر جانے والے راستے کے بالکل کنارے پر فور وہیل کھڑی کی تھی۔ میں ان کی شاندار پلاننگ پر خوش ہوا۔ تبھی میں نے اوپر کی طرف جاتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”پتہ نہیں تیمور پہنچا ہے کہ نہیں؟“

”تیمور یہاں پہنچ چکا ہے۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ وہ دیکھیں، وہ پیچھے فور وہیل کھڑی ہے۔ وہ اسی پر آئے ہیں۔ باقی آپ اسے فون کر لیں۔ لیکن اب ہم نے اس راستے پر نہیں جانا، ہٹ کر جانا ہے۔“ اس نے بھی دھیمی آواز میں کہا تو میں نے فون نکال کر تیمور سے رابطہ کیا۔ وہ پہنچ چکا تھا۔ میں نے فون جیب میں رکھا اور اس کے ساتھ تیزی سے پہاڑی چڑھنے لگا۔

وہ سب ایک اونچی جگہ پر یوں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک طرف سے بڑی سی آڑ تھی۔ میرے جاتے ہی ذرا سی ہلچل ہوئی تو میں نے تیمور سے صورت حال پوچھی۔ اس نے ایک نوجوان کی

طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ دوپہر سے یہاں موجود ہے اور میرا اس سے مسلسل رابطہ رہا ہے۔ یہ تفصیل سے صورت حال بتا دیتا ہے۔"

"سر، میں دوپہر سے یہاں ہوں۔" اس نے تیزی کہا، پھر سانس لے کر کہتا چلا گیا، "وہ سامنے جو مندر دکھائی دے رہا ہے، وہ جہاں دیئے روشن ہیں، وہاں پانچ سے چھ بندے پجاریوں کے روپ میں موجود ہیں۔ یہاں سارے دن میں پوجا کرنے والا کوئی نہیں آیا۔ وہ بیٹھے ہیں اور بیٹھے گپیں لگاتے رہے ہیں۔ تین بندے مطلب پجاری ہر وقت موجود رہتے ہیں۔"

"کوئی مزید ہلچل.....؟" میں نے پوچھا۔

"جب شام ڈھل رہی تھی تو وہاں مندر کے بالکل سامنے سے دو لوگ یہاں مندر پر آئے تھے۔ کچھ دیر ٹھہر کر واپس چلے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اندر جانے کا یہی ایک راستہ ہے۔"

"لیکن ہم سارے اس ایک راستے سے نہیں جائیں گے۔" میں نے تیمور سے کہا، "بلکہ ہم میں سے آدھے اسی طرح اوپر سے چلتے ہوئے آگے وادی تک جائیں گے، وہاں سے اگر کوئی راستہ ملا تو ٹھیک ورنہ وہ واپس یہیں آ کر اندر آئے گا، ایک حصہ سامنے سے جائے گا۔"

"ٹھیک ہو گیا۔" تیمور نے کہا تبھی ایک نوجوان نے مجھے جیکٹ دے دی۔ وہ سب بھی جیکٹ پہنے ہوئے تھے۔ میرے پاس پسٹل اور فالتو میگزین تھے۔ ان سب کے پاس بھی اسلحہ تھا۔ ہم پوری طرح تیار تھے۔ میں نے سب کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کسی کو کوئی شک؟"

"کوئی شک نہیں۔" سب نے دھیمے سے کہا۔

"میں پیچھے جا رہا ہوں، پہلے ان پجاریوں سے نپٹ لوں، پھر وہیں سے آگے بڑھتے ہیں، تم انہیں لے کر نکلو۔" میں نے تیمور سے کہا تو وہ ایک ٹکڑی کے ساتھ اوپر ہی اوپر سے چل دیئے، جبکہ میں چند ساتھیوں کے ساتھ مندر کی جانب بڑھا۔ جو ہمارے نشیب میں تھا۔

میں اس مندر کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ میرے سامنے اندھیرے میں وہ چھوٹا سا مندر تھا۔ اس پر ٹین کی چھت تھی اور نیچے کافی سارے دیئے روشن تھے۔ جن کی روشنی میں جو مجسمہ دکھائی دے رہا تھا اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس بھگوان کا ہے۔ شاید ایک لمبا سا پتھر گاڑھ کر اسے شیو لنگ کا نام دیا ہوگا، ورنہ مجسمہ کسی خاص صورت میں نہیں تھا۔ اس کے سامنے تین پجاری بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کسی پوجا میں مصروف نہیں تھے۔ بلکہ یونہی باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔

میں نے کچھ دیر تک انتظار کیا، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ان کے باقی ساتھی کہاں ہیں۔ چند منٹ تک ان کے علاوہ کوئی بھی دکھائی نہیں دیا، نہ ہی کسی کے ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور خود آگے بڑھا۔ میں اندھیرے میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میں ان کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔

ان میں ایک پجاری مقامی زبان میں کوئی کہانی سنا رہا تھا، باقی دو انہماک سے وہ کہانی سن رہے تھے۔ میں اچانک ان کے سر پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھنے لگے تو میں نے ایک کو دبوچ لیا۔ باقی دو بھی میرے ساتھیوں کے ہاتھوں میں دبوچے جا چکے تھے۔ میں نے جس کا سر نیچے فرش پر لگایا ہوا تھا، اس نے مزاحمت کرتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہو تم......؟"

"یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں، تم پجاری ہو یا......"

"پجاری ہی ہوں۔" اس نے خود کو چھڑانے کے لئے زور لگایا تو میں نے اسے ذرا سا ڈھیلا چھوڑا۔ اس نے سر اُوپر کیا تو میں نے اس کا سر زور سے فرش پر دے مارا۔ اس سے پہلے کہ اس کی چیخ نکلتی میں نے اس کا منہ دبا دیا۔ میرے دیکھا دیکھی میرے ساتھیوں نے بھی ان کے سر فرش پر پچھاڑ دیئے۔

"سچ بولو۔" میں نے غراتے ہوئے کہا۔

"سچ ہی تو بول رہے ہیں۔" اس نے زور سے کہا۔

"ابھی تم سچ نہیں بول رہے ہو۔" میں نے اپنی پنڈلی سے خنجر نکالتے ہوئے کہا۔

دیوں کی روشنی میں چمکتا ہوا خنجر ویسے ہی خوفناک لگ رہا تھا۔ میں نے خنجر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تو وہ اسے دیکھنے لگا، میں نے جب اس کی گردن پر رکھ دیا تو وہ گھگھیانے لگا۔

"سس......سچ......بتا......رہا......ہوں......"

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے خنجر اس کی گردن پر پھیر کر اسے دور پھینک دیا۔ وہ خرخر کی خوفناک آواز نکالتے ہوئے تڑپنے لگا۔ باقی دونوں کے چہروں پر خوف لہرانے لگا تھا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا تو ان میں ایک تیزی سے خوف بھرے لہجے میں بولا۔

"ہم پجاری نہیں، یہاں سیکورٹی گارڈ ہیں۔"

"یہاں ایسا کیا ہے، جس کی سیکورٹی پر لگے ہوئے ہو۔" میں نے پوچھا۔

"یہاں جیل ہے، وہ سامنے پہاڑی میں۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا تو میں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اس نے سچ بولا، اسے چھوڑ دو۔"

وہ اسے چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ وہ پجاری وہیں دبکا بیٹھا رہا، اسے شاید یہ یقین ہو

کیا تھا کہ ہم اسے مزید کچھ نہیں کہیں گے۔“

”کیا جیل کا یہی ایک راستہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی راستہ ہے، دراصل یہ ایک غار ہے جو دوسری جانب جا کر کھل جاتی ہے۔“ اس نے تیزی سے بتایا۔

”کتنی لمبی ہے یہ غار؟“ میں نے پوچھا۔

”کافی ہے، اندر سے بہت بڑی ہے۔“ اس نے کہا۔

”اندر نفری کتنی ہے۔“ جیسے ہی میں نے یہ پوچھا، اس نے چونک کر ہماری جانب دیکھا، اسی ایک سوال سے وہ سمجھ گیا کہ ہم اندر جانا چاہتے ہیں۔ اب اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو اشارہ کیا تو انہوں نے اپنے اپنے خنجر نکالے اور دونوں کو اسی طرح گردن سے وار کر کے دور پھینک دیا۔ ہم نے خنجر واپس رکھے اور ان تینوں کو گھسیٹ کر ایک جانب یوں چھپا دیا کہ فوراً ان پر نگاہ نہ پڑے۔ اس کے بعد کچھ دیر تک وہیں دبکے ہوئے غار کی جانب دیکھتے رہے۔ مجھے امید تھی کہ کوئی نہ کوئی باہر ضرور نکلے گا۔ لیکن آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ کا وقت ہو گیا تھا۔ اندر سے کوئی بھی نہیں نکلا تھا۔ تب میں نے اندر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں غار کے پاس پہنچ چکا تھا۔ میرے ہاتھ میں پسٹل تھا اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا۔ سامنے یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ ایک چٹان ہی ہے، لیکن اس کا راستہ بائیں جانب سے تھا، جہاں کوئی گیٹ نہیں لگا ہوا تھا۔ میں انتہائی محتاط انداز میں آگے بڑھا اور میں نے اندر قدم رکھ دیئے۔ پہلی نگاہ میں اندھیرا ہی معلوم ہوا لیکن کافی آگے جا کر تھوڑی سی روشنی ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے کسی نے ٹارچ روشن کر رکھی ہو۔ میں نے ایک چھوٹا سا پتھر غار میں لڑھکا دیا۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ وہ پتہ نہیں کتنی دور تک گیا تھا۔ پتھر کی آواز کے ردعمل میں کچھ بھی

نہیں ہوا۔ ایک ذرا سی بھی آواز نہیں آئی تھی۔ میں نے اپنے سارے حواس مجتمع کئے اور اندر چل پڑا۔

میں بہت محتاط انداز میں چل رہا تھا۔ ایک ساتھی نے غار کے باہر رہنا تھا باقی میرے پیچھے پیچھے آ گئے تھے۔ میں اس دھیمی سی روشنی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ واقعی ہی ایک چھوٹی ٹارچ تھی جو سامنے ایک راستے کو روشن کرنے کے لئے دیوار پر لگائی گئی تھی۔ دراصل وہاں سے غار میں موڑ پڑتا تھا۔ سامنے راستہ بند تھا۔ جیسے ہی میری نگاہ اس راستے پر پڑی، میرا دل تڑپ کر رہ گیا۔ وہاں لوگ زنجیروں سے بندھے ہوئے پڑے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گوشت پوست کے مجسمے سکھا کر وہاں ڈال دیئے گئے ہوں، یا پھر لغیر ممیوں کے میاں وہاں رکھ دی گئی ہوں۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ مجھے دیکھی ہوئی ویڈیوز یاد آنے لگیں۔ میں جس طرف سے اندر داخل ہوا تھا اور جس جگہ کھڑا ہوا تھا یہ ویڈیوز میں بالکل آخر میں تھیں۔ گویا، ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم یہیں کہیں تھے۔ میں نے غور سے ایک ایک کو دیکھا، وہ سب یوں مدہوش پڑے ہوئے تھے جیسے ان میں زندگی کی کوئی رمق بھی نہ ہو۔

میں حیران تھا کہ اب تک وہاں کوئی سیکورٹی والا دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ کہاں ہیں؟ کیا یہاں کوئی نہیں ہوتا یا پھر کہیں ہماری تاڑ میں تو نہیں کہ ایک دم ہم ان کے جال میں آ جائیں؟ ایک دم سے کئی سوال میرے دماغ میں گھوم گئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا، وہ سب غار کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ میں روشنی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ ممکن ہے کہیں کیمرہ لگا ہو اور میں اس میں دیکھ لیا جاؤں۔ مگر یہ رسک مجھے لینا تھا۔ میں نے اشارہ کیا اور آگے بڑھنے کے لئے قدم بڑھا دیئے۔ میرے دو ساتھی میرے کور پر میرے ساتھ چل دیئے۔

میرے سارے حواس بیدار تھے۔ میں کسی متوقع آواز پر پوری طرح چوکنا تھا۔ میری نگاہ غار کی دیوار کے ساتھ پڑے قیدیوں پر بھی تھی کہ ممکن ہے ان میں ڈاکٹر صاحب ہوں۔ میں دھیرے دھیرے بڑھتا چلا گیا۔ اس غار کا فاصلہ کوئی دو ڈھائی سو فٹ کے قریب ہوگا، لیکن میں نے اسے بیس منٹ میں طے کیا۔ یہاں تک کہ میں غار کے اس دہانے پر پہنچ گیا جو دوسری جانب تھا۔

میرے سامنے کا منظر بڑا عجیب سا تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے بلب روشن تھے۔ شاید وہ کسی بیٹری پر لگائے گئے تھے۔ ان کی روشنی پھیلی ہوئی نہیں تھی۔ ایک بڑا سا میدان تھا، جس کے ایک طرف باڑے کی طرح لکڑیاں لگائی ہوئیں تھیں۔ ان میں کئی عورتیں اور مرد قیدی کھڑے تھے۔ اس باڑے کے بالکل سامنے چند لوگ موجود تھے۔ ان کے سامنے بڑے بڑے پتیلے دھرے ہوئے تھے۔ ان میں تین لوگ کھانا تقسیم کر رہے تھے۔ باقی وہیں لکڑی کے بنچوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

یہ میرے لئے کوئی تائید غیبی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میں اس وقت یہاں پہنچا ہوں جب یہ لوگ کھانا کھا رہے ہیں۔ باڑے میں سے ایک قیدی نکلتا، وہ اپنے برتنوں میں کھانا لیتا اور واپس چلا جاتا، تب کوئی اور قیدی نکل کر باہر آ جاتا۔ میں نے غور سے ان قیدیوں میں ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم کو دیکھا، وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیئے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا، کہیں وہ اس قید خانے کی سختیاں برداشت کرتے ہوئے اس دنیا سے تو رخصت نہیں ہو گئے؟ ممکن ہے ویڈیوز اس وقت بنائی گئی ہوں، جب وہ زندہ تھے۔ اب وہ نہ رہے ہوں۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے میری اب تک کی ساری ریاضت کسی بھی کام نہیں آئی۔

”کیا بات ہے سر۔“ میرے پیچھے کھڑے نوجوان نے کہا تو مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے

ہولے سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”آپ کے منہ سے دردناک آواز نکلی تھی۔“ اس نے بتایا تو میں واقعتاً ہوش میں آ گیا۔ مجھے خبر بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں اس حد تک کھو گیا ہوں۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ اگر ڈاکٹر صاحب نہیں رہے تو یہ بھی نہیں رہیں گے۔ ان لوگوں کا اور ہمارا فاصلہ کوئی بیس فٹ کے قریب رہا ہوگا۔ میں نے فاصلے کو ناپا ہوں میں تولا اور ہولے سے کہا۔

”ایک دم سے ان کے سر پر پہنچنا ہے۔“

”اوکے۔“ میرے پیچھے سے آواز آئی تو میں نے اگلے ہی لمحے باہر چھلانگ لگا دی۔ میں نے زمین پر قدم رکھا اور پھر گھومتا ہوا ان کے سر پر جا پہنچا۔ ہم ان کے لئے یوں ثابت ہوئے جیسے آسمان سے اترے ہوں۔ وہ پوری طرح کھڑے بھی نہیں ہو پائے تھے۔ میں نے جاتے ہی زوردار انداز میں کہا۔

”کوئی ہلنے کی غلطی نہ کرے۔“

اسی لمحے ایک بندے نے انتہائی سرعت سے گن سیدھی کی ہی تھی کہ یکے بعد دیگرے کئی فائر اس کا بدن چھلنی کر گئے۔ وہ چیختا ہوا زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

”سب زمین پر لیٹ جاؤ، جلدی۔“ میرے ساتھی نوجوان نے کہا تو سبھی زمین پر لیٹنے لگے۔ ایک نے ذرا سستی دکھائی تو میرے ساتھی نے دھاڑتے ہوئے اس پر کئی فائر جھونک دیئے۔ وہ بھی زمین پر گر کر تڑپنے لگا تھا۔ میں نے ایک بندے کے پاس جا کر اسے اٹھایا اور پوچھا۔

”تمہارے باقی لوگ کہاں ہیں؟“

”یہی ہیں سب۔“ اس نے خوف زدہ آواز میں بتایا۔

”دیکھ جھوٹ بولے گا تو......“ میں نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی اور ان دو لوگوں کی طرف اشارہ کیا جو زمین پر تڑپ رہے تھے۔

”یقین جانیں آج اتنے ہی ہیں، چار پانچ اور ہوتے ہیں، انھیں آج شہر بلا لیا گیا ہے۔ آج ہم اتنے ہی ہیں۔“

”باندھ دو ان سب کو۔“ میں نے کہا اور قریب کھڑے ایک قیدی سے کہا، ”ہم تم لوگوں کو آزاد کروانے آئے ہیں۔ آج سے تم سب آزاد ہو۔“

”تم سچ کہہ رہے ہو؟“

”ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں، بس اتنا بتا دو، ان کے مزید ساتھی ہیں، تاکہ انھیں پکڑ لیں اور تم لوگوں کو لے جاؤں۔“ میں نے پوچھا تو اس نے کہا۔

”دو لوگ وہاں ہیں۔“ اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا تو میں نے اس طرف دیکھا، اسی لمحے وہاں شعلہ لپکا، ایک فائر ہوا، تب تک میں قیدی کو لئے نیچے گر چکا تھا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی میرے ساتھی اس جانب بڑھ گئے۔ سامنے سے وہ دو ہی فائر ہوئے تھے، پھر انھیں مہلت نہیں ملی۔ میرے ساتھیوں نے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ انتہائی سرعت سے اس جگہ پہنچے جہاں سے فائر ہو رہے تھے۔ اگلے چند منٹ میں وہ وہاں سے دو تڑپتے ہوئے جسم لے کر باہر آ گئے۔ انھیں لا کر چیلوں کے پاس پھینکا تو میں اس بندے کے پاس جا کھڑا ہوا جس نے جھوٹ بولا تھا۔

”تم نے جھوٹ بولا نا؟“ میں نے پوچھا، لفظ ابھی میرے منہ ہی میں تھے کہ اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں ایسے ہی کسی ردعمل کا منتظر تھا، میں نے اس کا وار بچایا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے بڑھا تو میں نے اس کی کمر پر لات رسید کی وہ لڑھکتا ہوا زمین پر جا گرا، تبھی میں نے

اس پر فائر کیے۔ وہ تڑپنے لگا۔

میں نے اس کی طرف مزید نہیں دیکھا، بلکہ اس باڑے کی جانب چلا گیا، جہاں قیدی موجود تھے۔ میں ٹارچ روشن کر کے سب کو دیکھنے لگا۔ اس وقت میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا جب میں نے باڑے کے ایک کونے میں ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم کو زمین پر پڑے ہوئے دیکھا۔ میں انتہائی تیزی سے ان کی جانب لپکا۔ میں نے ان کے چہرے پر روشنی کی تو دونوں حسرت سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔

وہ صاف و شفاف چہرے مٹی میں اَٹے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے سر کے بالوں سمیت شیو بڑھی ہوئی تھی۔ وہ پہچانے نہیں جا رہے تھے، ان کے ساتھ بیٹھی ڈاکٹر فائزہ، جو میری ماں کی طرح تھیں، وہ یوں مجھے دیکھ رہی تھیں جیسے مجھے پہچان نہ پا رہی ہوں۔ میں نے دونوں کو سینے سے لگایا تو وہ اچانک ڈاکٹر صاحب نے نحیف سی آواز میں پوچھا۔

"علی زین ہو نا۔"

"ہاں میں وہی بدبخت ہوں جو آپ کی حفاظت نہیں کر پایا، بس اب چلیں، دشمن سر پر ہے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"ان سب کو لے جاؤ۔" ڈاکٹر فائزہ نے کہا تو تیزی سے بولا۔

"ہاں ہاں سب لے جائیں گے، آپ اٹھیں۔"

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھایا۔ وہ نقاہت کے باعث چل نہیں پا رہے تھے۔ میں نے فون پر تیمور سے رابطہ کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ اندر کی صورت حال کے بارے میں اسے ساتھ ساتھ خبر مل رہی تھی۔ وہ واپس باہر کے دہانے کی طرف آ رہا ہے۔ ایک نوجوان کو کہا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو اٹھائے، ڈاکٹر فائزہ کو میں نے اٹھایا اور تیزی سے غار میں داخل ہو گیا۔

میں دہانے پر آیا تو تیمور وہاں تک آچکا تھا۔
"تم ڈاکٹر صاحب کو لے چلو، یہاں میں دیکھتا ہوں۔"
"اندر کم از کم پچیس سے تیس قیدی ہیں۔" میں نے کہا۔
"اتنے لوگ ہم رکھیں گے کہاں؟" اس نے انتہائی تشویش سے کہا تو میں بھی ایک دم سے چکرا گیا۔ یہاں تو وہ لوگ ہیں جنہیں یہاں رکھنے میں خود ریاست ملوث تھی، وہ تو پھر قید ہو جائیں گے؟
"تم انہیں نکال کر لاؤ، نیچے سڑک پر جا کر دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔
"اوکے۔" اس نے کہا تو ہم دونوں پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔
وہ نوجوان بھاگتا ہوا میرے پیچھے آرہا تھا جو فور وہیل ڈرائیو کر کے یہاں تک مجھے لایا تھا۔ وہ مجھے کراس کر کے آگے نکل گیا۔ وہ فون پر اس نوجوان سے رابطے میں تھا جس کے ہاتھ میں ریموٹ تھا۔ جب تک میں فور وہیل تک پہنچا، تب تک وہ دونوں وہیں کھڑے تھے۔
"بم ہٹا دیا ہے۔" میں لے جاتے ہی پوچھا۔
"ہاں، میں نے اسے وہاں پہاڑی پر رکھ دیا ہے۔" میں نے بیگم صاحبہ کو اتارا، نوجوان نے ڈاکٹر صاحب کو فور وہیل میں بٹھایا تو بیگم صاحبہ بھی بیٹھ گئیں۔ تبھی میں نے فور وہیل سے کچھ فاصلے پر جا کر تیمور کو فون کیا۔
"میں نکل رہا ہوں، تم جب تک ان سب کو نیچے لاؤ گے، میں شہر پہنچ جاؤں گا، وہاں جا کر میں کچھ کرتا ہوں ان کے لئے۔"
"ہاں تم نکلو، تم کچھ بھی کرو، لیکن یہ ذہن میں رہے کہ میں نے سامنے نہیں آنا، ہم یہیں سے نکل جائیں گے۔" اس نے تیزی سے کہا۔
"بالکل ٹھیک ہے، تم لوگ گم ہو جاؤ، لیکن وہ جو یہاں پر سیکورٹی والے ہیں، انہیں ختم

کردو، وہ بھی......"

"ختم کر دیے ہیں میں نے۔" اس نے تیزی سے بتایا۔

"اچھا کیا، میں نکلتا ہوں۔" یہ کہتے ہی میں نے فون بند کیا۔

ڈرائیور سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے فوراً جیل میں بیٹھتے ہی اسے چلنے کو کہا تو وہ طوفانی انداز میں چل پڑا۔ تب میں ڈاکٹر صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔

"سر، آپ کو ان لوگوں نے بہت تکلیف دی ہو گی؟"

"ہاں شاید جانوروں کو زیادہ اچھا رکھا جاتا ہوگا۔" انہوں نے دردناک لہجے میں کہا تو دکھ کی ایک لہر میرے اندر پھیل گئی۔

"تم آ گئے ہو نا بیٹا تو سارے دکھ بھول جائیں گے ہم۔" بیگم صاحبہ نے رو دینے والے انداز میں کہا تو میرا دل رونے لگا۔

"بس، مجھے تھوڑی سی مہلت دے دیں، ہم شہر تک بحفاظت پہنچ جائیں۔" میں نے یہ کہہ کر نوجوان سے پوچھا۔ "کیا تھوڑی دیر کے لئے یہ ڈیوائس ہٹ سکتی ہے نا؟"

"ہاں جی، بتایا تھا نا، بس اسے جیمر سے آف کرنا ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جیمر آف کیا تو میرے سیل فون پر سگنل آنے لگے، تبھی میں نے رنجو کے نمبر ملائے تو کال جاتی رہی۔ کچھ دیر بعد فون رسیو ہوا تو میں نے ہیلو کہا۔

"تم ویر سنگھ کہاں ہو؟"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں پرتاب سنگھ نے اُت مچائی ہوئی ہے۔ وہ شہر کے چند لوگ لے کر بنگلے کے لان میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ رانی جی سے ملنا چاہتا ہے لیکن رانی اس سے ملنے ابھی تک نہیں گئی۔"

”اُسے صرف آدھا گھنٹہ مزید روکو، میں پہنچتا ہوں۔“

”تم ہو کہاں؟“ اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

”میں آدھے گھنٹے کے بعد تمہارے پاس ہوں گا، تم ایک کام کرو، پچھلے دروازے کو کھول کر رکھنا، تمہارے سوا وہاں پر کوئی نہ ہو، مجھے انتہائی خفیہ انداز میں رہائش گاہ تک جانا ہے، پھر میں دیکھ لیتا ہوں اس سورما کو۔“

”ویر سنگھ کوئی خاص بات......“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”سب کچھ تمہارے سامنے آ جائے گا، ابھی تم ایسا کرو جگو دادا کو فون لگا کر اسے کانفرنس کال میں لو، تم بھی سن لینا۔“ میں نے کہا۔

”ایک منٹ۔“ اس نے کہا اور پھر کال ملانے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لائن پر تھا۔ تبھی میں نے پوچھا۔

”بولو دادا، گوپال داس کا کیا بنا؟“

”ارے میرے لعل، کیا بات ہے تمہاری، جس طرح مکھن سے بال نکلتا ہے، ایسے میں اسے وہاں سے اٹھا لایا، یہ تو بڑا کام کر دیا تو نے۔“ اس نے تیزی سے بتایا۔

”اب سن، ایک اور بڑا کام دے رہا ہوں، سارے حالات ہی بدل جائیں گے۔ سمجھو پرتاب سنگھ زمین پر گر گیا ہے۔“ میں نے تجسس پھیلاتے ہوئے کہا، میں اس کی فطرت سمجھ گیا تھا اس لئے بات کو بڑھا کر بتایا۔

”ایسا کیا ہے؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”تم شاید نہیں جانتے ہو، پرتاب سنگھ نے اپنا ایک قید خانہ بنا رکھا تھا، میں نے اس کے سارے قیدی آزاد کر دیئے ہیں اور وہ اس وقت سڑک پر ہیں۔ سارا پولیس وہاں پر لے جاؤ

اور حالات اپنے کنٹرول میں لے لو، اس سے بڑا چانس تمہیں کبھی نہیں ملے گا۔“

”ارے باپ رے، اتنا بڑا جھٹکا۔“ اس نے حیرت سے کہا۔

”وقت نہیں ہے دادا، نکل لو بس۔“

”چل رکھتا ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ تبھی رتنو بولی۔

”پرتاب سنگھ کو تو جھٹکا لگ گیا مجھو نگر ریاست کے لوگ......“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”وہ دیکھ لوں گا۔ تمہیں جو کہا ہے وہ کرو۔ باقی سمجھاتا ہوں آ کر۔“

”اوکے، جلدی پہنچو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔ اسی لمحے ایک خیال میرے دماغ میں رینگ گیا، میں نے تیمور کو فون ملا دیا۔

”ہاں بولو۔“ اس نے کہا۔

”تمہارے پاس کوئی دستی بم ہے، ایک بم تو پہاڑی پر رکھا ہے ایک ساتھی نے۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، ہے میرے پاس۔“ اس نے کہا۔

”نکلنے سے پہلے جتنے بھی بم ہیں تمہارے پاس، سب چلا دینا۔ آس پاس کے لوگ خود ہی یہاں پہنچ جائیں گے۔“ میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”میں سمجھ گیا۔“

”نکلتے ہی چاچا عبدالمجید کو بتا دینا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ڈیوائس کا بٹن آن کر دیا۔

☆......☆......☆

میں بنگلے کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے ڈیوائس کا بٹن بند کیا اور رجو کو کال کر دی۔ وہ دیوار کے پار موجود تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے پہلے ڈاکٹر صاحب کو اتارا، پھر بیگم صاحبہ کو۔ ڈرائیور نے ڈاکٹر صاحب کو سہارا دیا اور میں نے بیگم صاحبہ کو۔ اگلے دس منٹ میں کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر ہم اس رہائش گاہ تک جا پہنچے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ ساتھی ڈرائیور نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور نکلتا چلا گیا۔ رجو پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ دو ادھیڑ عمر لوگوں پر اتنا تشدد بھی کیا جا سکتا ہے۔

”رجو، فوراً ان کے لئے کپڑوں کا اور کھانے کا بندوبست کرو، باقی میں سنبھالتا ہوں پرتاب سنگھ کو، اپنا فون دو مجھے۔“ میں نے کہا تو رجو کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے مجھے اپنا فون دیا اور انہیں بیڈروم میں لے گئی۔

میں نے پہلی کال جگو دادا کو کی۔ اس نے فوراً فون پک کر لیا۔

”دادا، کیا صورت حال ہے۔“

”میں ادھر ہی جا رہا ہوں، ادھر تو بڑے بم دھماکے ہوئے ہیں، پولیس کو میں نے کہا ہے وہ ادھر ہی جا رہے ہیں۔“

”دیکھو دادا، اگر یہ حالات سنبھال گیا نا تو شہر پر تیرا راج ہو گا۔ بہت حاضر دماغی سے۔“ میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”تم فکر نہ کرو، اب دیکھو میں کرتا کیا ہوں۔“

”وہ لوگ بہت بیمار ہوں گے، انہیں ہسپتال لے جانا۔“ میں نے کہا۔

”ایسا ہی کروں گا۔“ اس نے کہا تو میں نے کال ختم کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اگلی کال

میں رانی بھاگ وتی کو کی۔اس نے فوراً ہی میری کال ریسیو کر لی۔وہ رجنو کی کال سمجھی تھی لیکن جیسے ہی میں بولا تو اس نے تلخی سے کہا۔

"کہاں ہو دیر سنگھ، تمہیں پتہ ہے اس وقت.... "

"میں جانتا ہوں رانی جی، میں بھی ادھر ہی ہوں، آپ نے پرتاب سنگھ سے نہیں ملنا، میں دیکھتا ہوں مگر آپ نے گھبرانا نہیں۔" میں نے کہا۔

"مگر وہ باہر شہر کے معززین لے کر بیٹھا ہوا ہے۔" رانی نے غصے میں کہا۔

"ابھی کچھ دیر بعد وہ خود ہی باہر نکل جائے گا، میں اسے نکال لوں، پھر آتا ہوں آپ کے پاس۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے جلدی نکالو اسے۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے پرتاب سنگھ کو کال ملائی۔اس نے کال ریسیو کر کے ہیلو کہا تو میں نے سرد لہجے میں کہا۔"اے او بھڑوے، تم کیا رانی جی کے ہاں ڈیرے لگا کر بیٹھے ہو؟"

"تم، یہ تم کس طرح بات کر رہے ہو؟" اس نے دھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"تم میرے سامنے نہیں ہو، ورنہ تمہیں زمین پر لٹا کر جوتے مارتا، یہ تو ابھی میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں کہا۔"

"تم ایک بار میرے سامنے آ جاؤ، میں......" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا تو میں نے ٹھہر ٹھہر کر اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"اگر تم میں ہمت ہے تو ہسپتال میں آ جاؤ، وہاں تمہارے قید خانے کے سارے قیدیوں کی ٹریٹمنٹ ہو رہی ہے، میں بھی وہیں ہوں، آ جاؤ۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" اس نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

”آجاؤ، خود دیکھو، تم کتنے بے وقوف ہو، ابھی تک تیرے لوگوں نے تجھے یہ تک نہیں بتایا؟“ میں نے حقارت سے کہا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ اس نے دبے ہوئے انداز میں کہا۔

”سنو، ان قیدیوں میں میرا باپ اور میری ماں بھی ہے۔ تم نے ان پر جتنا تشدد کیا ہے، جتنی اذیت تم نے انہیں دی ہے، اس کے بدلے اگر میں تمہاری ماں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چوک میں بھی پھینک دوں تو میرا بدلہ نہیں پورا ہونے والا۔ ابھی تو تیرا سارا خاندان ختم کرنا ہے مجھے۔ اب اگر تم اگلے منٹ میں اٹھ کر واپس نہ گئے تو تمہاری ماں کے بدن کا پہلا ٹکڑا باہر پھینک دیا جائے گا۔ اگر آزمانا چاہتے ہو تو آزما لو۔“ میں نے کہا تو نجانے میرے لہجے میں اتنی نفرت، حقارت اور درد کہاں سے آ گیا تھا۔

”نہیں تم کچھ بھی نہیں کرو گے۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”میں خود تمہاری ماں کے بدن کا ٹکڑا لے کر آتا ہوں۔ مجھ سے مل بھی لینا کیونکہ میں نے اسی وقت کے لئے تیری ماں کو یہاں رکھا تھا۔“ میں نے کہا تو وہ چیختے ہوئے بولا۔

”نہیں، میں جاتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”سن، میں نے تجھے بھی مارنا ہے، تم جتنا بچ سکتے ہو بچ جاؤ۔“ میں نے کہا تو اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اس نے فون بند کر دیا تھا۔

رنجو میری بات سن رہی تھی۔ اسے سمجھ آ گئی کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں رانی کے پاس جا رہا ہوں۔“

”لیکن جلدی آنا۔“ اس نے کہا۔

"تم میرے ماں باپ کا خیال کرو، میں آتا ہوں۔" میں نے کہا اور تیزی سے نکلتا ہوا باہر چلا گیا۔

رانی اپنے بیڈ روم میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بیڈ پر بڑی بی بڑی تمکنت سے براجمان تھی۔ میں نے جاتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے ہوئے بڑی بی سے پوچھا۔

"کیسی ہو آپ؟"

"بھلی چنگی ہوں۔ تم کیسے ہو؟" بڑی بی نے کہا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا پھر یونہی بات بڑھاتے ہوئے پوچھا "ماتا جی سنا ہے آپ اپنے دور میں کھانا بہت بڑھیا بنایا کرتی تھیں؟"

"ارے ہاں، ہمارا تو مقابلہ ہی نہیں تھا۔"

اس دوران رانی بھاگ وتی اٹھ گئی۔ اس نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا تو میں نے بڑی بی سے کہا۔

"دیکھا آپ کی بہو آپ سے جل گئی۔" میں نے کہا اور بڑی بی کی کوئی بات سنے بغیر اس کے پیچھے چل دیا۔

وہ دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی کاریڈور کے آخری سرے پر چلی گئی تھی۔ وہاں کافی اندھیرا تھا۔ شاید لائیٹ نہیں جلائی گئی تھی اور جان بوجھ کر اندھیرا کیا ہوا تھا۔ وہاں سے باہر لان دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اندھیرا تھا ہی اس لئے کہ یہاں اندھیرے میں کھڑے ہو کر باہر دیکھا جا سکتے۔ لان میں اب کوئی نہیں تھا، خالی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ تبھی رانی نے ہولے سے کہا۔

"ایسا کیا کہا تم نے کہ وہ فوراً ہی یہاں سے چلا گیا؟"

”بڑی بی کو پتہ ہے کہ باہر پرتاب سنگھ......؟“ میں نے جواب دینے کی بجائے پوچھا تو وہ درشت لہجے میں بولی۔

”نہیں اسے نہیں پتہ، تم میری بات کا جواب دو۔“

”میں نے اسے دھمکی لگا دی تھی کہ اگر وہ نہ گیا تو اس کی ماں کی لاش جائے گی یہاں سے۔“ میں نے سکون سے کہہ دیا۔

”اور وہ خاموشی سے چلا گیا؟ یہ بات دماغ میں نہیں اترتی ویر سنگھ جی۔“ اس نے میری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ میرا طریقہ ہے کہ میں اس کے......“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے پوچھا۔

”سچ کیا ہے؟“

”اگر آپ سچ جاننا چاہ رہی ہیں تو کچھ دیر ٹھہر جائیں، مجھے چند گھنٹے دے دیں، میں سب تفصیل سے بتا دوں گا۔“

”ویر سنگھ، تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟“ رانی نے کہا۔

”ہاں، میں چھپا رہا ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی آپ اسے نہ جانیں تو بہتر ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

”ویر سنگھ، میں جانتی ہوں تم جو کہتے ہو وہ کر گزرتے ہو، مجھے تم پر یقین ہے۔ بس اپنا خیال رکھنا۔“

”جی ٹھیک ہے رانی جی، یاد رہے، جب تک یہ بڑی بی آپ کے پاس ہے، آپ کی زندگی کی ضمانت ہے۔“ میں نے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لیا پھر ہولے سے بولی، "میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی تھی۔ چند لمحے یونہی کھڑے رہے تو میں نے بے دھڑک رانی کا ہاتھ پکڑ لیا، بڑے نرم سے انداز میں اسے دبایا اور پھر بڑے احترام سے بوسہ دے کر چھوڑ دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت رانی کی حالت کیا ہوئی ہوگی۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ بھوسے کے ڈھیر میں جلتی ہوئی دیا سلائی پھینک دینا۔ بھوسے میں آگ نہیں بھڑکتی لیکن اس طرح سلگتا ہے کہ اندر ہی اندر دور تک ایسی آگ بھڑکتی چلی جاتی ہے جو بجھائے نہیں بجھتی۔

میں تیزی سے پلٹا اور کاریڈور پار کرتا ہوا نیچے جانے والی سیڑھیاں اترنے لگا۔

میں تیزی سے واپس رہائش گاہ آ گیا تھا۔ ڈاکٹر کامران ملک اور ڈاکٹر فائزہ ملک فریش ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کھانا کھا چکے تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو رجو برتن ہٹا رہی تھی۔ میں نے رجو کا فون اسے واپس کیا اور ان کے پاس قالین پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

"میں بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں۔" انہوں نے بتایا تو بیگم صاحبہ بولیں۔

"اچھی خاصی توانائی آ گئی ہے۔ یہاں کچھ میڈیسن مل جائیں گی؟"

"بالکل، میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا تو رجو بولی۔

"میں ابھی دیتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے بیٹی۔" بیگم صاحبہ نے کہا تو بیڈ روم کا دروازہ بند کر کے باہر چلی گئی۔ میں ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا، مجھے خود یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ میرے سامنے ہیں۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر چاچا عبدالمجید کو فون کر دیا۔ اس نے چند لمحوں میں ہی فون رسیو کر لیا۔

”ہاں بول میرے بچے۔“

”تیمور نے بتا دیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، بتا دیا تھا، اب کہاں ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ابھی تک ہم بالکل محفوظ جگہ پر ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”تم بالکل فکر نہ کرو، میری دلی سفارت خانے سے بات ہو گئی ہے۔ ہاٹ لائن پر بھی معاملات چل رہے ہیں۔ دو تین گھنٹے مشکل ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ انہوں نے بتایا تو میں نے کہا۔

”لیں ڈاکٹر صاحب سے بات کریں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے فون ڈاکٹر صاحب کو دے دیا۔ انہوں نے تھوڑی سی بات کی اور پھر فون مجھے دیا۔ میں نے الوداعی بات کر کے فون بند کر دیا۔ ایسے میں رینو چائے کے ساتھ ایک بیگ میڈیسن کا لے آئی۔ اس نے چائے رکھی اور بیگ بیگم صاحب کے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اس میں دیکھ لیں اگر کوئی آپ کے کام کی ہو۔“

وہ میڈیسن دیکھنے لگیں تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

”کیا ہوا تھا پٹیالہ میں، کس لئے اغواء کیا تھا، کون تھے وہ لوگ؟“

میرے پوچھنے پر وہ چند لمحے خاموش رہے۔ پھر کہتے چلے گئے

☆......☆......☆

وہ تین دن کے لئے پٹیالہ میں کانفرنس تھی۔ اصل میں وہ کانفرنس حکومتی سطح پر نہیں تھی۔ ایک عالمی تنظیم ہے جو دنیا میں بڑھتے ہوئے اسلحہ سازی کے خلاف ہے۔ میرا ابھی یہی خیال ہے کہ دنیا میں جو یہ اسلحہ بڑھ رہا ہے اور اس ٹیکنالوجی میں جدید سے جدید ہتھیار لائے جا رہے ہیں

یہ دراصل ہم انسان خود ہی اپنی تباہی کا سامان کر رہے ہیں۔ دنیا بھر میں چند اسلحہ بنانے والے سرمایہ داروں نے دنیا کو جنگی جنون میں مبتلا کر دیا ہوا ہے۔ کوئی جارحیت کے لئے اسلحہ خرید رہا ہے تو کوئی اپنے دفاع کے لئے۔ جبکہ اس جنگی جنون میں انسان مر رہا ہے، انسانیت مر رہی ہے۔ کب تک یہ سلسلہ چلے گا؟ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہم انسانوں نے ہی اس زمین کو پھاڑ دینا ہے۔ اسی مقصد کو لے کر ہم کچھ لوگوں نے یہ سوچا تھا کہ اس جنگی جنون کو کم کیا جائے یہاں تک کہ ختم ہو جائے۔ تسخیر کائنات کے اور بہت سارے راز ہیں جنہیں حل کیا جا سکتا ہے۔ ان پر کام کی ضرورت ہے۔ بیماریوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہی سوچ و بچار کرتا تھا وہاں پر۔ میں اس لئے وہاں گیا تھا کہ میں اور میرے ساتھ دنیا سے چند لوگ ایسی ٹیکنالوجی پر کام کر رہے تھے، جن سے میزائل اس طرح کے دوسرے اسلحہ کو ناکارہ بنایا جا سکے۔ اگر کوئی جنگی جنون لئے ہوئے ایسا اسلحہ چلانا بھی چاہے تو نہ چلا سکے۔ ہم اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو چکے تھے۔ وہاں جا کر زندگی کے دوسرے شعبوں سے لوگ مل کر ایک مہم کا آغاز کرنا چاہ رہے تھے۔ اگرچہ ہم یہ کام بڑی رازداری سے کر رہے تھے لیکن دوسری قوتیں بھی تو اپنا کام کر رہی ہیں۔ انہیں اس راز کی بھنک مل گئی تھی۔ اصل میں ہو کیا رہا ہے یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

بظاہر وہ کانفرنس بیماریوں کے خلاف میڈیکل کے جدید رجحانات بارے تھی۔ تین دن تک وہاں باتیں ہوتی رہیں لیکن ہم کچھ لوگ اپنے طور پر خفیہ انداز میں سوچ بچار کرتے رہے تھے۔ مجھے وہاں پر جو سیکورٹی مہیا کی گئی تھی اس میں میرے ساتھ گئے ہوئے چند لوگ تھے۔ وہاں کے مقامی گارڈ بھی تھے۔ آخری دن جب ہم کانفرنس سے واپس آ رہے تھے تو ڈرائیور نے بجائے ہوٹل لے کر جانے کے، کسی دوسرے راستے پر کار ڈال دی تھی۔ مجھے اس کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔ میرے لئے وہ شہر بالکل اجنبی تھا۔ مجھے پتہ اس وقت چلا، جب وہ ایک

گھر میں مجھے لے گئے۔ اصل میں وہ ڈرائیوران اغواہ کرنے والوں کے ساتھ مل گیا تھا۔ اسی کی مدد سے گارڈ وہاں سے زبردستی ہٹا دیئے گئے۔ ان کی جگہ اغواہ کرنے والوں نے لے لی اور ہمیں قید کر لیا گیا۔

ہم دو دن تک وہیں پڑے رہے۔ ہر دو چار گھنٹے بعد دو بندے ہمارے پاس آجاتے اور یہی سوال کرتے رہے کہ اصل میں اس کانفرنس کا ایجنڈا کیا تھا؟ کسی نے کوئی پر تشدد بات نہیں کی۔ دو دن بعد ہمیں یہ کہا گیا کہ وہ ہمیں وطن واپس بھیج رہے ہیں۔ ہمیں ائیر پورٹ تک لے جایا گیا۔ سارے مراحل انہوں نے خود پورے کئے اور ہمیں ایک چارٹرڈ جہاز تک لے جایا گیا۔ ایک بار مجھے شک تو ہوا کہ یہ درست نہیں، ہمیں عام پرواز سے واپس وطن بھیجنا چاہئے تھا۔ میں نے اس پر احتجاج بھی کیا۔ میں نے کہا کہ وہ ہمیں تھائی حکومت کے حوالے کر دیں مگر میری کسی نے نہیں سنی۔ میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ میرے ساتھ ٹھیک نہیں ہو رہا۔ انہوں نے ہمیں زبردستی اس چارٹرڈ جہاز میں بٹھا کر نا معلوم منزل کی جانب چل پڑے۔

چند گھنٹوں کی پرواز کے بعد ایک ویران سے ائیر پورٹ پر ہمیں اتارا گیا۔ وہاں سے ایک گاڑی کے ذریعے ہمیں ایک گھر میں لے گئے۔ وہاں تک ہمیں یہی بتاتے رہے کہ ہم پاکستان پہنچ چکے ہیں ضروری کارروائی کے بعد ہمیں جانے دیں گے لیکن شام سے رات ہو گئی کسی نے ہمیں نہیں پوچھا۔

اگلے دن صبح چند لوگ آئے اور انہوں نے ہم پر سوال و جواب کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ یہی پوچھنا چاہتے تھے کہ ہم کس طرح کی ٹیکنالوجی متعارف کروا رہے ہیں۔ مجھے پتہ چل گیا کہ ہمارا راز کہیں نہ کہیں سے افشا ہو گیا ہے۔ وہ پوری کوشش کرتے رہے جبکہ میرا جواب نہ میں تھا۔ میں نے انہیں ذرا سی بھی بھنک نہیں لگنے دی۔ وہاں مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں اپنے

وطن میں نہیں کہیں دوسری جگہ ہوں۔ پھر یہ راز بھی کھل گیا۔ انہوں نے مجھے واضح بتادیا کہ ہم بھارت میں ہیں۔ وہ مجھے ہر طرح کا لالچ دینے لگے کہ اگر میں انہیں سب کچھ نہ بتاؤں بلکہ یہیں اس ملک میں رہ کر کام کروں تو میں جوان سے مانگوں وہ مجھے دیں گے۔ مگر ہمارے لبوں پر انکار ہی رہا۔

دو ہفتے اسی کوشش میں گزر گئے۔ آخر وہ ہم سے تنگ آ گئے انہوں نے ہمیں جان سے مار دینے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ ہمارا کھانا ایک وقت کا کر دیا۔ میں تب بھی نہ مانا تو انہوں نے ہمیں اس قید خانے میں لا کر پھینک دیا جہاں سے آج ہم آزاد ہوئے ہیں۔

وہ اپنی روداد سنا چکے تو صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے، تب میں نے دکھی لہجے میں پوچھا۔

”کیا انہوں نے قید خانے میں آپ پر تشدد کیا؟“

”وہاں ہونے کا مطلب ہی تشدد تھا، انہوں جسمانی تشدد تو کیا سو کیا، لیکن وہ جو ذہنی اذیت دیتے تھے، اس سے میں اندر تک ٹوٹ پھوٹ چکا ہوں۔“ انہوں نے روہانسا لہجے میں کہا تو میرے اندر تک دکھ پھیل گیا۔ میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

”وہ آپ سے چاہتے کیا تھے؟“

”یہی کہ جس مشن پر میں کام کر رہا ہوں اس کی تفصیلات بتا دوں، یا پھر ان کے لئے کام کروں۔ اس کے عوض جو چاہوں ان سے لے سکتا ہوں۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ مجھے یہاں قید خانے میں رکھ کر اس لئے اذیتیں دے رہے تھے کہ میں کبھی نہ کبھی تو مان ہی جاؤں گا۔ اور شاید میں مان بھی جاتا۔“ یہ کہتے ہوئے ان کا لہجہ دکھ سے بھر گیا تھا۔

”ایسا کیا ہو گیا تھا۔“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”فائزہ کی وجہ سے...... وہ اس کی بہت بے عزتی کرتے تھے، ذاتی اذیت کے علاوہ وہ ......“ یہ کہتے ہوئے ان کا گلا رندھ گیا، وہ کوئی لفظ نہ کہہ پائے۔ مجھے لگا جیسے میری سگی ماں کے بارے میں کوئی بتا رہا ہو کہ اس کی سرعام بے حرمتی کی گئی ہے۔ ایک لمحہ میں کئی ساری ایسی تصویریں میرے دماغ میں گھوم گئیں، جن سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے ڈاکٹر فائزہ کی طرف دیکھا اور پھر انتہائی شرمندگی سے بولا۔

”سوری ماں، میں جلدی نہیں پہنچ پایا، میں اس پر شرمندہ ہوں۔“

”نہیں میرے بچے، اس میں تمہارا کیا قصور، بس اب یہی خواہش ہے کہ جلد از جلد ہم وطن واپس پہنچ جائیں۔“

”میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہی یہی ہے۔“ میں نے کہا تو ڈاکٹر صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔

”بیٹا، تم ہمیں قید خانے سے تو نکال لائے ہو، یہ بہت بڑی کامیابی ہے، لیکن اس ملک سے نکلنا بہت مشکل ہوگا، کیونکہ اب یہ صرف اسی ملک کا معاملہ نہیں رہے گا، وہ تو تمہیں بھی حرکت میں آجائیں گی جو ان کے پیچھے ہیں۔ یہاں صرف ہم ہی نہیں دوسرے بہت سارے لوگ بھی تھے۔“

”میں کوشش کر رہا ہوں، آگے جو قدرت کو منظور ہوگا۔ آپ بس بھروسہ رکھیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔ میں نے چاہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر سکون سے نیند لے لیں۔

میں اٹھ کر لاونج میں آ گیا۔ میرے لئے لمحہ لمحہ قیمتی تھا۔ میں جانتا تھا کہ صرف یہی ملک

اغواء میں ملوث نہیں تھا، اس میں دوسری بھی قوتیں شامل تھیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ ہم تنہا تھے۔ اگر ہمارے دشمن تھے تو ہمارے دوست بھی موجود تھے۔ اوپری سطح پر کیا ہو رہا تھا، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اب ڈاکٹر صاحب اور بیگم صاحبہ کی ذمہ داری میری تھی۔ میں اپنے خیالات سے اس وقت چونکا، جب رتو میرے پاس صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں جگو دادا سے پوچھوں کیا صورت حال ہے؟"

"ہاں پوچھو۔" میں نے بے خیالی میں کہا تو اس نے اپنے فون سے اسے کال ملا دی۔ رابطہ ہو جانے پر اس نے پوچھا۔

"کیا صورت حال ہے۔"

"یہاں تو ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا ہے۔ پولیس کے ساتھ نجانے کہاں کہاں کے لوگ ہیں یہاں پر۔ پولیس بھی آ گئی ہے۔"

"تم کہاں پر ہوں؟" میں نے جھنجلاتے ہوئے پوچھا۔

"میں بھی وہیں ہوں، لیکن پولیس والے آگے بڑھے ہیں، وہ انہیں اپنے حصار میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔" اس نے تیزی سے بتایا۔

"پھر تمہارا وہاں کیا فائدہ، شور مچاؤ کہ انہیں پہلے ہسپتال لے کر جاؤ، کسی بھی طرح انہیں تھانے مت لے جانے دینا، ورنہ یہ پھر قید خانے میں چلے جائیں گے۔ انہیں......" میں سمجھ گیا۔ اس نے کہا اور کوئی مزید بات کئے اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے تشویش ہو گئی تھی۔ وہ قیدی نجانے کون کون تھے اور کہاں کے تھے۔ یہ تو طے تھا کہ انہیں غیر قانونی طور پر قید کیا ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بے چارے بھی کسی طرح آزاد ہو جائیں۔

"پتہ نہیں انہیں لائیو دکھایا بھی جا رہا ہوگا کہ نہیں؟" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تو رخشو اٹھی اور اس نے دیوار پر لگے ہوئے ٹی وی کو آن کر دیا۔ وہ مختلف چینل دیکھنے لگی۔ ایک نیوز چینل پر وہاں کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ ایک آدمی بڑے دردناک انداز میں کہہ رہا تھا۔

"یہ بیمار ہیں، ان سے اٹھا نہیں جا رہا، پتہ نہیں کس نے انہیں یہاں قید کیا ہوا تھا، انہیں پہلے ہسپتال لے کر جانا چاہیے۔"

"یہ جگو دادا ہے۔" رخشو نے پرجوش انداز میں میری طرف دیکھ کر کہا۔ وہاں پر کافی سارے لوگ ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ وہ تیز تیز انداز میں کہتا چلا جا رہا تھا۔ جگو دادا ادھیڑ عمر تھا۔ اس کے تیکھے نقوش تھے۔ سفید بال شانوں تک پھیلے ہوئے تھے، بڑی بڑی بے ترتیب مونچھیں اور داڑھی تھی۔ لیکن اس کی آواز بہت زوردار تھی۔ میں وہاں کے مناظر دیکھنے میں محو تھا کہ میرا فون بجا۔ میں نے اسکرین پر دیکھا، وہاں کوئی نمبر نہیں تھے۔ میں نے کال پک کی تو دوسری طرف چاچا سعید اللہ تھے۔

"دلی سے ایک ہیلی کاپٹر اڑ چکا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے تک وہاں پہنچ جائے گا۔ ایک نمبر لکھو، وہ تمہیں فون کرے گا۔ اس کے سوا کسی پر بھی اعتبار مت کرنا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا تو چاچا نے فون کال بند کر دی۔ مجھے حوصلہ ہو گیا کہ تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے۔ میرا خون تیزی سے گردش کرنے لگا تھا۔ میرے لیے مشکل ترین مرحلہ یہی تھا کہ ہیلی کاپٹر جہاں بھی لینڈ ہوا، وہاں تک پہنچنا کیسے ہے۔ اس دوران کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر انہیں میں بتا دوں کہ میں رانی بھاگ وتی کے بنگلے میں چھپا بیٹھا ہوں تو وہ عتاب میں آجاتی۔ خود غرضی تو یہی تھی کہ میں رانی بھاگ وتی کی پرواہ کیے بغیر وہاں سے نکل کر ہیلی کاپٹر

تک چلا جاتا۔ لیکن نجانے کیوں میرے اندر کا انسان یہ بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ میں محسن کشی کروں۔ نجانے کونسے انسان ایسے ہوتے ہیں جو کسی کے در کا کھا کر بھی انہیں زخم لگاتے ہیں، وہ کتوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ کتے میں بھی قدرت نے یہ صفت رکھی ہے کہ وہ جس در کا کھا لیں، وفاداری ضرور نبھاتے ہیں۔ میں رانی بھاگ وتی کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے سب کچھ بتا دوں گا۔

"رجو، میں ذرا رانی بھاگ وتی کے پاس جا رہا ہوں۔"

"خیر ہے یوں اچانک......" اس نے پوچھا۔

"میں اسے سب بتا دوں گا، پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو وہ کاندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

"یہ تمہاری مرضی، تم جو چاہو۔"

میں اٹھا اور لاؤنج سے باہر نکلتا چلا گیا۔ میں جس طرح قید خانے سے یہاں تک آیا تھا، اسی طرح تھا۔ یہاں تک کہ میں نے نہ تو ہتھیار رکھے تھے اور نہ ہی کپڑے بدل کر ایزی ہونے کا کوئی موقعہ ملا تھا۔ جب میں کچھ دیر پہلے رانی بھاگ وتی سے ملنے گیا تھا، تب منہ صاف کیا تھا اور خود پر سے مٹی جھاڑی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوں رانی بھاگ وتی کے بیڈ روم کی طرف چل پڑا۔ میرے پاس وقت کم تھا اور ایک ڈیڑھ گھنٹے میں مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔ میرا دماغ مختلف آپشنز پر سوچ رہا تھا۔ ذہن میں یہی تھا کہ اگر رانی نے تعاون نہ کیا تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا۔

خلاف توقع لاؤنج کی بتیاں بجھی ہوئیں تھیں۔ میں نے ان چند دنوں میں یہی دیکھا تھا کہ اگر وہاں پر کوئی بھی نہیں ہے تو لاؤنج ہر وقت روشن رہتا تھا، چاہے اس کی بتیاں ویسی ہی

کیوں نہ ہوں۔ میں نے محتاط انداز میں اندر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک شخص انتہائی سرعت سے میری جانب لپکا۔ میں نے لاشعوری طور پر خود کو بچانے کی کوشش کی تھی مگر نہیں بچ سکا۔ وہ مجھے لیتا ہوا قالین پر گر گیا۔ جس وقت ہم گتھم گتھا گر رہے تھے لاشعوری طور پر میں نے خود کو اس پوزیشن میں لے لیا کہ وہ میرے نیچے آجائے۔ ایسا ہی ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک طاقتور آدمی تھا۔ مجھے خود کو چھڑانے میں بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔ تاہم چند لمحوں ہی میں اپنے ہاتھ آزاد کروانے میں کامیاب ہو گیا۔

اس نے مجھے کمر سے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے ذرا سا اٹھ کر اپنا گھٹنا اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان مارا تو ایک لمحے کو وہ سکڑ کر رہ گیا، تبھی میں نے خود کو آزاد کروا لیا۔ میں اسے مزید مہلت نہیں دینا چاہتا تھا، اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا، میں نے اس پر گرتے ہوئے اپنی کہنی اس کے سینے پر ماری، وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پوری قوت سے ایک مکہ اس کی ناک پر مارا، وہ بے دم سا ہو گیا۔ اس کی ناک سے خرخراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ وہ پوری قوت لگا کر میرے نیچے سے نکلا تو میں نے اسے کمر سے دبوچ لیا۔ میں نے پیچھے کی جانب زور لگایا تو اس نے خود کو چھڑانے کے لئے آگے زور آزمایا، تبھی میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا گیا، تبھی میں نے گھوم کر ایک کک اس کی گردن کے قریب ماری۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا۔

ابھی میں اس سے نبرد آزما تھا۔ تبھی اوپر سے میں نے قدموں کی آواز سنی میں نے اوپر دیکھا تو کاریڈور کی روشنی میں مجھے رانی بھاگ وتی دکھائی دی۔ اس کے ساتھ دو لوگ تھے، اور اس کے پیچھے بڑی بی کو پکڑے ایک بندہ مزید آ رہا تھا۔ میں لمحوں میں سمجھ گیا کہ یہ کارروائی چل رہی ہے۔ میرے پاس صرف اتنا وقت تھا، جب تک وہ نیچے نہیں آجاتے۔ میں نے انتہائی سرعت سے اس آدمی کے منہ پر ہاتھ رکھا کہ وہ کوئی آواز نہ نکالے۔ اسی دوران میں نے اپنا

پسٹل نکالا اور پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارا۔ وہ ایک بار کسی مچھلی کی طرح میرے نیچے پڑا اچھلا اور پھر بے سدھ ہو گیا۔

میں اسے چھوڑ کر قالین پر لیٹ گیا۔ میں دیکھ رہا تھا، رانی بھاگ وتی آہستہ سے اتر رہی ہے لیکن وہ دونوں مرد اسے کھینچ کر نیچے لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ظاہر ہے ان کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار ضرور ہوگا، ورنہ رانی یوں ان کے ساتھ نیچے نہیں آسکتی تھی۔ اس کے پیچھے جو بندہ تھا، وہ بڑے ادب اور احترام سے بڑی بی کو نیچے لا رہا تھا۔ لازم تھا کہ اس کے پاس بھی ہتھیار ہوں گے لیکن اس کے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے ایک لمحہ میں صورت حال کا اندازہ کیا اور فیصلہ کر لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

وہ دونوں دائیں بائیں تھے اور رانی ان کے درمیان میں تھی۔ میں قالین پر دم سادھے یوں تیار تھا کہ جیسے ہی وہ میرے برابر سے نکلیں میں ان پر حملہ کر دوں۔ اس میں رسک یہی تھا کہ کسی سے بھی پسٹل چل سکتا تھا۔ وہ میرے برابر آکر دو قدم آگے چلے گئے۔ سامنے لاؤنج کا داخلی دروازہ تھا، باہر چاندنی کے علاوہ بنگلے میں موجود برقی قمقموں کی روشنی ہو رہی تھی۔ اس میں دونوں کے ان ہاتھوں کا اندازہ ہو گیا کہ پسٹل کس پوزیشن میں ہیں۔ ایک نے رانی کا دائیں بازو پکڑا ہوا تھا اور اس کے دائیں ہاتھ میں پسٹل تھا، جبکہ دوسرا ایک قدم پیچھے دائیں ہاتھ میں پسٹل پکڑے ساتھ جا رہا تھا۔ اچانک وہ رک گئے۔ ان میں سے ایک، جس نے رانی کا بازو پکڑا ہوا تھا، اس نے اپنی جیب میں سے فون نکالا اور تیزی سے نمبر پش کرنے لگا۔ میں نے بڑی بی کی جانب دیکھا، اسے بھی وہیں پیچھے روک لیا گیا تھا۔ میرے ذہن میں یہی آیا کہ وہ کسی نہ کسی گاڑی والے کو کال کر رہے ہیں۔ کیونکہ باہر پورچ میں کہیں بھی گاڑی نہیں تھی۔ اگلے ہی لمحے میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ وہ مقامی زبان میں کسی کو فوراً گاڑی

لانے کا کہہ رہا تھا، یہی وہ لمحہ تھا جب میں انتہائی سرعت سے اٹھا، فون والے پر فائر کیا اور سیدھا اس بندے کو لیتا ہوا نیچے گر گیا، جو ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے اسے مہلت نہیں دی۔ اس کے سر پر نال رکھی اور فائر کر دیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے وہاں سے جگہ چھوڑ دی۔

"خبردار اگر ذرا بھی ہلے تو......" میں نے کہا اور ایک ہی جلے میں اس پر جا پڑا۔ تب تک اس نے فائر کر دیا تھا۔ جو میرے تو نہیں لگا، بلکہ عین اسی جگہ پڑا تھا جہاں سے میں نے آواز نکالی تھی۔ میں اسے لیتا ہوا قالین پر گر گیا۔ وہ مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا تھا۔ میں اسے زیادہ مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ باہر گاڑی آ جائے گی اور اس میں کوئی نہ کوئی تو ہوگا، ممکن ہے زیادہ لوگ ہوں۔ میں نے اس کی گردن دبوچی اور پسٹل کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ وہ میرے نیچے پڑا ساکت ہوا تو میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"رانی، ابھی لائٹ مت جلانا۔ دروازے کی اوٹ میں ہو جاؤ۔"

شاید وہ سمجھ گئی تھی یا میری بات مانی تھی وہ دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔ میں بھی بھاگتا ہوا دروازے کے ساتھ لگ گیا۔ اتنی دیر میں ایک فور وہیل باہر پورچ میں آ رکی۔ اس میں ایک ہی شخص ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ فور وہیل روک کر اندر کی جانب دیکھ رہا تھا، تبھی میں نے اس پر فائر کر دیا۔ وہ فائر اسے نہیں لگا، اس نے فور وہیل بڑھانا چاہی لیکن شاید اس سے گیئر نہیں لگا، یا اسے سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے دوسرا فائر کر دیا، پھر فائر کرتا ہوا باہر کی جانب چل پڑا۔ وہ دوسری جانب سے نکل کر بھاگنے کی کوشش میں باہر نکلا، چند قدم ہی چلا تھا کہ میں نے اس کی ٹانگوں میں فائر کر دیئے، یہاں تک کہ میگزین خالی ہو گیا۔ وہ سڑک پر گر گیا تھا۔ میں نے وہ پسٹل اڑسا اور دوسرا نکالتے ہوئے واپس پلٹا۔ میں نے باہر ہی سے کہا۔

"رانی لاؤنج کی روشنی کرو۔"

اس نے قریب کہیں بٹن سے روشنی کی تو میں اس وقت تک اندر پہنچ چکا تھا۔ میرے سامنے دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور دو بندے بے ہوش تھے۔ رانی بھاگ وتی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئیں تھیں۔ وہ ان سب کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے انہیں پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

"ناقابلِ یقین......" اس نے حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"کس کا یقین نہیں آ رہا۔" میں نے پوچھا۔

"یہی، یہ دو لوگ تو یہاں بنگلے پر سیکورٹی والے ہیں۔" ان نے قالین پر پڑے لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا، جن میں ایک بندہ مر چکا تھا اور دوسرا بے ہوش تھا۔ تبھی میں نے کہا۔

"آپ اس بڑی بی کو لے کر اوپر جاؤ، میں دیکھتا ہوں۔"

"اب تو ان سیکورٹی والوں پر بھی بھروسہ نہیں رہا۔" وہ شک بھرے لہجے میں بولی۔

"اس لئے کہا ہے نا، اس بڑی بی کو اوپر لے جاؤ۔ یہ اس وقت سب سے زیادہ قیمتی ہے۔"

"نہیں میں یہیں رہوں گی، ورنہ یہ تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔"

مجھے اس کی بات سمجھ میں آ گئی۔ وہ بڑی بی کے ساتھ وہیں کھڑی رہی۔ میں نے ایک مرے ہوئے شخص کی قمیص پھاڑی اور اسے دو ٹکروں میں کر کے بے ہوش پڑے بندوں کے ہاتھ باندھنے لگا۔ پھر دوسری کی شرٹ اتار کر ان کے پاؤں باندھ دیئے۔ اسی دوران باہر بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ میں نے پسٹل ہاتھ میں لیا تو چند سیکورٹی گارڈ مجھے باہر دکھائی دیئے۔ جو بھی اندر دیکھتا، وہ حیرت زدہ رہ جاتا۔ ایسے میں سیکورٹی گارڈز کا ہیڈ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوا۔ اس نے ایک نگاہ ماحول پر ڈالی اور پھر رانی کی طرف دیکھا تو وہ غضب ناک انداز میں بولی۔

"تم میں سے اور کون کون ہے پرتاب سنگھ کا وفادار۔"

"رانی جی کیا ہوا؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"یہ لوگ مجھے اغوا کرنے آئے تھے اور تم سب مر گئے ہو۔" اس بار وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔ تب میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک کر سیکورٹی ہیڈ سے کہا۔

"وہ باہر جو بندہ پڑا ہوا ہے زندہ ہے یا مر گیا؟"

"پتہ نہیں، میں دیکھتا ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا تو میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کوئی بندہ بھیجو، اسے پرتاپ سنگھ کی حویلی میں چھوڑ آئے۔ کسی ہسپتال میں مت لے جانا۔"

"جی بہتر۔" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

"ساتھ میں یہ لاشیں بھی وہیں پھینک آئے۔" میں نے قالین پر پڑی ہوئی لاشوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے فوراً سیکورٹی گارڈ بلائے اور اگلے چند منٹ میں وہ لاشیں وہاں سے اٹھالی گئیں۔

بڑی بی سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس نے لرزتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"کیا یہ بندے پرتاب سنگھ نے بھیجے تھے؟"

"ہاں، اسی نے بھیجے تھے۔" رانی بھاگ وتی نے تلخی سے کہا۔

"اس نے......" وہ کہتے ہوئے خاموش ہو گئی، اسے سمجھ آ گئی تھی کہ یہ سب تماشا کیوں ہو رہا تھا۔ وہ بے دم سی ہو کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے بے ہوش پڑے ہوئے ایک بندے کو ٹھوکر ماری تو وہ کسمسا کر ہوش میں آ گیا۔ وہ جیسے ہی پوری طرح ہوش میں آیا تو بدلا ہوا ماحول دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بندہ وہیں بنگلے پر سیکورٹی گارڈ تھا۔ اس نے ایک نگاہ رانی بھاگ وتی کو دیکھا، پھر اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ میں دوسرے بندے کا ناک چند لمحے بند کیا

تو اسے ایک دم سے ہوش آ گیا۔ اس کا بھی وہی حال تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا تو سمجھ گیا کہ وہ پھنس چکا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

"ایک ہی سانس میں بتا دو، کس نے بھیجا ہے؟"

اس نے ایک بار پھر سب کی طرف دیکھا اور پھر دھیمے سے لہجے میں بولا۔

"پرتاپ سنگھ نے۔"

"کس لئے آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ماتا جی کو لینے، ساتھ میں رانی جی کو بھی......" وہ کہتے ہوئے خاموش ہو گیا تو میں نے کہا

"جانتے ہو، اب تمہیں کیا سزا ملنے والی ہے؟"

"نہیں جی۔" اس نے کہا تو میں نے قریب کھڑے سیکورٹی والوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ان دونوں کو باہر لے جاؤ، میں بتاتا ہوں ان کے ساتھ کیا کرنا ہے۔"

وہ انہیں گھسیٹ کر باہر کی جانب لے گئے۔ میں نے رانی کے چہرے پر دیکھا، جہاں اب تک وحشت تھی۔ اس کی ساڑھی کئی جگہ سے مسلی جا چکی تھی۔ اس کی آنکھیں غصے میں پھیلی ہوئیں تھیں۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"دیکھا، وہ ایسا بھی کر سکتا ہے؟"

"لیکن میں کیا کر سکتا ہوں، رانی جی تم نے یہ نہیں دیکھا۔" میرے یوں کہنے پر وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔

"اگر تم بروقت نہ آتے تو شاید......" وہ کہتے ہوئے رُک گئی۔ تب میں نے لاپرواہی کے

سے انداز میں پوچھا۔ ”تمہارا فون کہاں ہے؟“

”وہ شاید بیڈ روم میں۔“

”چلو پھر بیڈ روم میں، وہیں بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا تو اس نے بڑی بی کی جانب دیکھا، میں نے اسے بھی ساتھ لے جانے کا اشارہ کیا تو رانی نے اسے بازو سے پکڑا اور اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ اس بار رانی کے انداز میں جارحیت تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں بیڈ روم میں پہنچا تو رانی بڑے غضب میں بڑی بی پر دھاڑ رہی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی خاموش ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ سائیڈ ٹیبل پر فون پڑا تھا۔ میں نے وہ اٹھایا اور اسے دیتے ہوئے کہا۔

”پرتاب سنگھ کا نمبر ملا کر دو۔“

اس نے تیزی سے نمبر دیکھا، پھر وہ نمبر پش کر کے فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے رابطہ ہونے کا انتظار کیا، کچھ ہی لمحوں میں پرتاب سنگھ کی آواز گونجی۔

”ہیلو رانی......“

”تمیز سے بات کرنا، تمہاری ماتا جی بھی سن رہی ہے۔“ میں نے کہا تو اگلے ہی لمحے اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”تم، یہاں ہو بنگلے میں......؟“

”میں کہیں بھی ہو سکتا ہوں، تم ہسپتال نہیں آئے تو میں واپس آ گیا۔“ میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

”تم نے جو کچھ کیا ہے نا، اس کی معافی نہیں مل سکتی، میں وہاں تک تمہیں ختم کر دوں گا جہاں تک تمہاری جڑیں ہیں۔“ اس نے غضب ناک انداز میں کہا تو میں طنزیہ انداز میں بولا۔

"کیا ماتا جی کے ساتھ رانی جی پہنچ گئی ہیں تمہارے پاس؟"

"کیا مطلب......؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"تم نے بندے بھیجے تھے نا، ان کی لاشیں آرہی ہیں تمہارے پاس، انہیں ریسیو کر لینا۔" میں نے کہا۔

"میں صرف ماتا جی کی وجہ سے تمہیں بخش رہا ہوں ورنہ......"

"تم اب کچھ بھی نہیں کر سکتے ہو، میں نے تمہاری جڑیں اکھاڑ دی ہیں، قید خانے سے آزاد ہونے والے قیدی تم نے ابھی تک نہیں دیکھے۔" میں نے کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہا پھر مفاہمانہ انداز میں بولا۔

"دیکھ، میری ماتا کو ایک خراش بھی نہیں آنی چاہئے۔ اس کے بدلے تم جو کہو، میں ماننے کو تیار ہوں۔"

"اس کے لئے میری ایک ہی شرط ہے، تم خود آؤ اور اپنی ماتا جی کو لے کر چلے جاؤ، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"تم کہو تو میں ابھی آجاتا ہوں۔" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ اس وقت تم اتنے غافل ہو، تیرے جیسے لوگ اپنی ماں کو بھی بیچ دیتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت کیا کر رہے ہو۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ تم اس وقت صفر ہو چکے ہو۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں تمہاری ماتا کے ٹکڑے کر کے سڑک پر بھی پھینک سکتا ہوں اور تم مجھے نہیں روک سکتے ہو۔" میں نے غضب ناک انداز میں کہا۔

"بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟"

"دو گھنٹے کے بعد تم سے بات کروں گا۔ میرے بات کرنے سے پہلے اگر تم نے کچھ بھی کیا

تو سمجھو یہ میری آخری وارننگ ہے۔" میں نے کہا اور فون کال بند کر دی۔ میں نے بات ختم کر کے خود پر قابو پایا تو میری نگاہ بڑی بی پر پڑی، وہ خوف زدہ انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس وقت بڑی بی کا خوف زدہ ہونا اچھا نہیں تھا۔ میں نے فون رانی بھاگ وتی کی طرف بڑھایا اور خود گھٹنوں کے بل بڑی بی کے پاس بیٹھ گیا۔ میں اس کے چہرے پر دیکھتا رہا جہاں خوف پھیلا ہوا تھا۔ تبھی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"آپ یہاں پر ہیں، کسی نے ایک بھی سخت لفظ کہا؟"

"نہیں، کسی نے نہیں۔" اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو پھر آپ پریشان نہ ہوں، ایک خراش تو کیا آپ سے اب بھی کوئی سخت لفظ نہیں بولے گا۔" میں نے اعتماد سے کہا۔

"پر بیٹا یہ سب کیا چل رہا ہے؟" اس نے تھوڑا ہمت کر کے پوچھا۔

"آپ جانتی ہو کہ آپ کا بیٹا مجرم ہے، وہ مجرمانہ زندگی گزار رہا ہے، اس نے کئی قتل کیے ہے، ڈرگز کی صورت میں موت بانٹ رہا ہے۔ لیکن مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، اس نے ایک بہت بڑا جرم کیا ہے، اس نے میری ماتا اور پتا کو اپنے قید خانے میں بند کر کے ان پر ظلم اور تشدد کرتا رہا ہے۔" میں نے کہا تو رانی بھاگ وتی نے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری ماتا پتا......؟"

"ہاں میرے ماتا پتا۔ آپ کا بیٹا تو اپنی ماتا کے لئے اتنا تڑپ رہا ہے، کیا میں بیٹا ہو کر اپنے ماتا پتا کے لئے نہیں تڑپ سکتا۔" میں نے کہا تو بڑی بی نے انتہائی جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ "لاؤ مجھے فون دو، میں ابھی اس سے کہتی ہوں کہ وہ......"

"ضرورت نہیں ہے اسے کہنے کی۔ میں نے اپنے ماتا پتا اس قید خانے سے چھڑوا لئے

ہیں۔ اس کے ساتھ کئی لوگ ہیں، زندگی اور موت کے درمیان جی رہے ہیں اور یہ سب آپ کا بیٹا کرتا رہا ہے۔" میں نے حقارت سے کہا تو بڑی بی یوں خاموش ہو کر بیٹھ گئی جیسے اس نے موت دیکھ لی ہو۔

"مجھے بتاؤ ویر سنگھ، کہاں ہیں تمہارے ماتا پتا؟" رانی نے کہا تو میں اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"آپ یہاں آرام کریں۔ صبح پرتاب سنگھ کو یہاں بلائیں گے تب آپ چلی جانا، کوئی بھی نہیں روکے گا۔"

"میں یہیں ہوں۔" بڑی بی نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ رانی میرے پیچھے آئے گی۔ میں کمرے سے باہر آکر کھڑا ہو گیا۔ وہی ہوا، چند ہی لمحوں بعد رانی کمرے سے باہر آگئی۔ مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ مسکرا دی جیسے اسے بھی یقین ہو کہ میں باہر ہی ہوں گا۔ اس نے آتے ہی میرا ہاتھ پکڑا اور کاریڈور کے اسی کونے میں لے کر چل دی جہاں ہم کچھ دیر پہلے کھڑے باتیں کر چکے تھے۔

"ویر سنگھ، اصل بات کیا ہے؟ کیا سچ مچ تمہارے ماتا پتا......"

"ہاں رانی جی، میرے ماتا پتا، اسی کے قید خانے میں تھے۔" میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا تو اس نے شکوہ بھرے انداز میں تیزی سے پوچھا۔

"تو اس کا مطلب ہے تم یہاں پر اپنے ماتا پتا ہی کے لئے آئے تھے؟"

"ہاں، ایسا ہی ہے۔" میں نے سچ کہہ دیا تو اس نے میرے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ کچھ دیر بعد بولی۔ "میں جانتی ہوں، اتنی جلدی، اتنا تلپٹ کر دینے والا، کوئی مجرمانہ ذہنیت والا بندہ نہیں ہو سکتا۔ تم ایک مقصد لے کر یہ سب کر رہے تھے۔ خیر، میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں۔"

اس نے کہا اور میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"رانی جی، تم نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا، کیا ہمارا تعلق اب نہیں رہا۔" میں نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ اس نے ایک سسکاری لی، پھر آگے بڑھ کر میرے ساتھ لگتے ہوئے بولی

"نہیں ویر سنگھ جی، زندگی میں سارے مرد دیکھے ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں تم پر دل ٹھہر سا گیا تھا، خیر، تم جاؤ اپنا فرض نبھاؤ۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ تب میں نے کہا۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔"

"میں دل و جان سے حاضر ہوں، بولو کیا کرنا ہے، بتاؤ۔" اس نے بڑے مان سے کہا۔

"ابھی کچھ دیر میں بتاتا ہوں۔" میں نے کہا اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ان پر بوسہ دے دیا۔ اس میں سوائے عقیدت کے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ چھوڑے اور کاریڈور سے نکلتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆
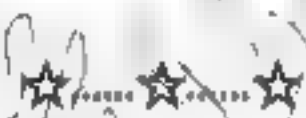
ہیلی کاپٹر شہر میں موجود ایک کھیل کے میدان میں اتر چکا تھا۔ مجھے مخصوص نمبر سے کال آگئی تھی۔ اس کے باوجود چاچا عبدالمجید نے بھی مجھے فون کر کے بتا دیا تھا۔ میں نے ایک فور وہیل لی اور اپنی رہائش گاہ پر آگیا۔ رجو ڈاکٹر صاحب اور بیگم صاحبہ کو لے کر نیچے آچکی تھی۔ میں نے ان دونوں کو پچھلی نشست پر بٹھا کر رجو سے کہا۔

"ڈرائیو کرو۔"

میں نے کہا تو وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اور گیئر لگا کر فور وہیل بڑھا دی۔ میں نے اسے پورچ میں لے جانے کو کہا۔ اس نے وہاں لے جا کر فور وہیل کھڑی کر دی۔ تبھی لاؤنج کے

داخلی دروازے سے رانی بھاگ وتی اور بڑی بی باہر آ گئیں۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا، پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"یہ ہیں تمہارے ماتا پتا؟"

"ہاں، یہی ہیں۔" میں نے کہا تو رانی نے انہیں دیکھ کر نمسکار کہا۔ انہوں نے بھی آگے سے ہاتھ جوڑ دیئے۔ بڑی بی نے بھی ایسا ہی کیا۔ تب رانی نے بڑے دھیمے انداز میں پوچھا۔

"اب مجھے بتاؤ تمہیں جانا کہاں ہے؟"

"یہاں سے تین کلومیٹر دور جو کھیل کا میدان ہے، وہاں پر اس وقت شہر کے تمام آفیسرز اور پولیس کمشنر موجود ہے۔ بس وہیں تک جانا ہے۔" میں نے کہا تو وہ حیرت سے بولی۔

"اگر اتنے حکام ہیں تو مجھے سکون ہے کیوں نہیں......"

"اس بارے تمہیں پتہ چل جائے گا۔" میں نے کہا تو وہ خاموش ہو گئی تو میں نے بڑی بی سے کہا۔

"معاف کرنا آپ کو کشٹ دیا، بس اپنے بیٹے کو سمجھا دینا۔"

"جاؤ بیٹا، بھگوان تمہاری رکھشا کرے۔" اس نے کہا تو میں نے رانی کی جانب دیکھا، اس کی آنکھیں نم تھیں۔ میں نے اپنی انگلی سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"زندگی رہی تو اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔"

"جاؤ، مجھے بہلاؤ مت۔ میں چاہوں گی کہ تم کبھی لوٹ کر واپس نہ آؤ، میں سمجھوں گی اک خواب دیکھا تھا۔" اس نے کہا اور میرا ہاتھ نرمی سے جھٹک دیا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور فور وہیل میں بیٹھ گیا۔ رتنو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ میرے اشارے پر وہ چل دی۔ آہنی گیٹ سے نکلنے کے بعد رانی بھاگ وتی کا بنگلہ دھیرے دھیرے نگاہوں

سے اوجھل ہو گیا۔

تین کلومیٹر کا یہ راستہ ہی دراصل خطرناک ترین تھا۔ اس راستے میں ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تقریباً دس منٹ میں یہ راستہ کٹ گیا۔

اس کھیل کے میدان میں کافی ساری پولیس نفری لگی ہوئی تھی۔ ایک بار تو مجھے لگا کہ جیسے ہمارا یہاں سے نکلنا ناممکن ہو گا۔ لیکن ہمیں کسی نے نہیں روکا، میں اس مخصوص نمبر پر مسلسل رابطے میں تھا۔

میں کھیل کے میدان کے اندر جا پہنچا تھا۔ وہاں عارضی لائٹ لگائی ہوئی تھی جس کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ فوروہیل سے ہیلی کاپٹر کا یہ سفر ایک پل صراط کی مانند تھا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ ادھر گرد کون، کہاں، کتنے لوگ کھڑے ہیں۔ سامنے ایک لمبے قد کا جوان کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا، جس پر گہرے نیلے رنگ کی ٹائی سج رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں ہیں ڈاکٹر صاحب؟"

"گاڑی میں ہیں۔" میں نے کہا تو اتنے میں رجو اتر آئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور ڈاکٹر صاحب اور بیگم کو باہر نکال لیا۔ وہ جوان انہیں لے کر تیزی سے ہیلی کاپٹر کی جانب بڑھا۔

میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور فوروہیل سے باہر نکل آیا۔ باہر رجو کھڑی تھی۔ میں نے اسے گلے لگاتے ہوئے ہولے سے اس کی گردن پر ہونٹ رکھ دیے۔ وہ پوری جان سے لرز گئی۔ تب میں نے کہا۔

"رجو، بہت جلد ملاقات ہو گی۔"

"بس اپنا خیال رکھنا۔" اس نے کہا اور مجھے چھوڑ دیا۔ میں تیزی سے مڑا اور ہیلی کاپٹر کی

جانب بڑھ گیا۔ میں جیسے ہی بیٹھا، ہیلی کاپٹر اسٹارٹ ہو گیا۔ ہم پانچ لوگ تھے۔ ڈاکٹر صاحب، بیگم صاحبہ، نوجوان، پائلٹ اور میں۔ جیسے ہی ہیلی کاپٹر زمین کو چھوڑ کر ہوا میں بلند ہوا تو میں نے نوجوان سے کہا۔

"تھوڑا سا آگے جائیں گے تو رستے میں دریائے کھاری آتا ہے۔ میں نے وہیں تک آپ سب کے ساتھ جانا ہے۔"

"کیوں......؟" نوجوان کی بجائے ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"مجھے یہاں ابھی کئی کام سمیٹنے ہیں، آپ جائیں، اس وقت آپ محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں بیٹا، ایسا نہ کرو، بس بہت ہو گیا۔" ڈاکٹر صاحب نے اصرار بھرے انداز میں کہا تو میں نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"کہا نا ابھی بہت سارے کام ادھورے ہیں، اگر زندگی رہی تو آپ سے مل لوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے پائلٹ سے کہا، "ذرا سا غوطہ دینا تاکہ میں چھلانگ لگا سکوں۔"

"مجھے تو وہ دکھائی دے رہا ہے۔" اس نے سامنے ایک لکیر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بس وہیں۔" میں نے کہا اور گیٹ کے پاس چلا گیا۔

"بیٹا اب بھی رُک جاؤ۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"مجھے روکیں مت، بس دعا دیں۔" میں نے کہا تبھی پائلٹ کی آواز ابھری۔

"تین......"

اس کے ساتھ ہی اس نے غوطہ لگایا تو میں نے گیٹ کھولا۔

"دو......"

میں نے بیگ کو کاندھوں پر لیا اور کودنے کے لئے تیار ہو گیا۔

"ایک......"

میں نے نیچے جھانکا تو لکیر نزدیک آ رہی تھی۔

"ڈن......"

میں نے چھلانگ لگا دی۔

میں ہوا میں تیرتا ہوا تیزی سے نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے صرف ہیلی کاپٹر کی آواز معدوم ہوتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ اچانک ایک دھچکا لگا اور میں پانی میں گرتا چلا گیا۔

پانی اتنی زیادہ گہرائی میں نہیں تھا۔ ایک بار تو مجھے لگا کہ میں اس پانی میں ہی کہیں دفن ہو جاؤں گا۔ سینے میں سانس کی گھٹن ہونے لگی تھی۔ میں کب تک سانس روک سکتا تھا۔ میں دوبارہ پانی کی سطح پر آیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں دوبارہ زندہ ہو گیا ہوں۔ میں نے تیزی سے سانس بحال کیا اور پھر تیرتا ہوا دریا کنارے کی جانب بڑھ گیا۔

کافی دیر تک تیرتے رہنے کے بعد میں دریا کنارے آ لگا۔ میں دریا سے باہر نکلا، بیگ اتار کر ایک جانب رکھا اور کنارے پر لیٹ گیا۔ میں بہت زیادہ تھک چکا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ کتنی ہی دیر تک میرا سانس بحال نہ ہو سکا۔ چاندنی رات میں آس پاس کی جھاڑیوں اور درختوں کے ہیولے بڑے خوفناک لگ رہے تھے۔ میں اس وقت تک وہاں پڑا رہا جب تک میری توانائی بحال نہیں ہو گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے بیگ میں سے سیل فون نکالا، جو میں نے بہت احتیاط سے پلاسٹک کے لفافے میں بند کیا تھا۔ میں نے وہ پلاسٹک اتارا اور فون کو دوبارہ آن کیا۔ اس کی اسکرین روشن ہو گئی۔

میں جگو دادا کے نمبر ملائے۔ کچھ ہی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ اس نے ہیلو کہا تو میں نے پوچھا۔

”کہاں ہو تم لوگ؟“

”میں پل کے پاس ہوں۔ تم کہاں ہو؟“ اس نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے خود معلوم نہیں، میں سمت کا تعین کر کے تم سے دوبارہ رابطہ کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے فون میں موجود کمپاس کی مدد سے سمت کا تعین کیا اور دریا کنارے چل پڑا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ چلتے رہنے کے بعد مجھے پل کے آثار دکھائی دینے لگے۔ میں نے فون پر جگو دادا سے رابطہ کر لیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی تگ و دو کے بعد مجھے وہ سڑک کنارے گاڑی لئے دکھائی دے گیا۔ اس کے ساتھ ایک ڈرائیور اور مزید ساتھی تھا۔ میں اس کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا تو گاڑی چل دی۔ وہ میرے لئے خشک کپڑے لے کر آیا تھا۔ میں نے جب وہ پہن لئے تو مجھے سکون آگیا۔ تبھی میں نے پوچھا۔

”سناؤ، قیدیوں کا کیا بنا؟“

”میں نے بہت شور مچایا تو وہ انہیں ہسپتال لے جانے پر راضی ہو گئے۔ وہ انہیں ہسپتال لے بھی گئے لیکن اس کے بعد یوں ماحول بنا دیا جیسے کرفیو لگ گیا ہو، کوئی بھی اندر نہیں جا سکتا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”تم کیا سمجھتے ہو، ایسا کیوں ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں جب وہاں پہاڑی کے پاس سڑک پر پہنچا تو بم دھماکے ہو چکے تھے۔ ادھر اُدھر سے کافی سارے لوگ جمع تھے۔ میں نے ان قیدیوں سے ہمدردی جتاتے ہوئے انہیں حوصلہ دیا۔ تب ان سے پوچھا بھی کہ وہ کہاں کے ہیں۔ ان میں سے کچھ بھارتی تھے، زیادہ وہ ان میں دوسرے ملکوں کے لوگ تھے۔“ جگو دادا نے کافی حیرت سے مجھے بتایا۔

”اور وہ سب غیر قانونی انداز میں پکڑے ہوئے تھے۔ ایسے قید خانے کہیں اور بھی لازمی ہوں گے۔ ان میں اگر کوئی مر بھی جائے تو کوئی الزام نہیں آتا۔ ایسا وہ تنظیمیں کرتی ہیں جو ریاست کے ساتھ مل کر دوسرے ملکوں میں کارروائیاں کررہی ہوتی ہیں۔“ میں نے اسے بتایا

”تبھی وہاں ہسپتال میں کرفیو لگ گیا تھا۔ بس وہی خبریں چل سکی تھیں جو پولیس وغیرہ کے پہنچنے سے قبل انہوں نے بنائی تھیں، پھر یہ خبریں بھی ٹی وی سے غائب ہو گئیں۔ یوں جیسے کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا۔“ جگو دادا نے مجھے بتایا۔

”ریاستی اداروں نے سنبھال لیا نا انہیں۔“ میں نے کہا اور چند لمحوں بعد میں نے پوچھا

”کیا خیال ہے جگو دادا، شہر سنبھال لو گے؟“

”ہاں، کیوں نہیں۔ ایک وقت تھا، میں نے اس شہر پر راج کیا ہوا ہے۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا، جس میں حسرت بھی تھی، توجہ بھی تھا اور امید بھی تھی۔

”پرتاب سنگھ کی قوت اب وہ نہیں رہے گی، شہر پر راج کرنے میں تجھے ریاستی اداروں کے ساتھ ملنا ہوگا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں بس اب پرتاب سنگھ کے لوگوں سے تھوڑی بہت جنگ تو ہوگی، انہیں صاف کرنے میں تھوڑا وقت تو لگے گا۔“ اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا تو میں سمجھاتے ہوئے بولا۔

”دیکھ جگو دادا، تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ، جو اپنے مالک کے بڑے وفادار ہوتے ہیں، جو اپنی جان پر بھی کھیل کر مالک کے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی آٹے میں نمک کے برابر اور بہت مشکل لوگ ہوتے ہیں، دوسرے وہ جو صرف طاقت کے ساتھ ہوتے ہیں، انہیں جب یقین ہو جاتا ہے کہ طاقت اب کسی دوسرے پلڑے میں ہے تو وہ آسانی سے ادھر لڑھک جاتے ہیں۔ انہیں صرف اپنے مفاد سے غرض ہوتی ہے۔ اور تیسرے

وہ جو اپنے مالک سے دل ہی دل میں غصہ رکھتے ہیں لیکن طاقت کی وجہ سے کچھ کر نہیں پا رہے ہوتے، جیسے ہی انہیں کسی دوسری جانب طاقت دکھائی دیتی ہے وہ خاموشی سے اس جانب ہو جاتے ہیں، ایسے ہی لوگ غدار ہوتے ہیں۔ جنگ اس طرح لڑنا کہ لوگوں پر اپنی طاقت کی دھاک بٹھانا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میرا خیال ہے پرتاب سنگھ تو اب منظر سے ہٹ جائے گا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، وہ ایک سیاست دان کے طور پر سامنے رہے گا، ہاں کچھ دیر کے لئے اسے منظر سے ہٹایا جائے گا، لیکن تم فکر نہ کرو، ہم اسے خود منظر سے ہٹائیں گے۔" میں نے کہا تو سوچتے ہوئے بولا۔

"ہاں اب اسے ہٹانا ہی پڑے گا۔"

"گوپال داس کا کیا کیا تم نے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ مردہ گھوڑا تھا، بس اس کا سودا کر لیا، دو کروڑ دیا اس کے بیٹوں نے اور میں نے اسے دے دیا۔"

"اچھا کیا، اب دھیان رکھنا، وہ چار کروڑ کے چکر میں رہیں گے۔" میں نے کہا تو جگو دادا کسمسا کر رہ گیا۔ ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ پھر وہ اپنے بارے میں، اپنے ماضی کے بارے میں اور اس وقت اس کے پاس کیا کچھ تھا، اس بارے مجھے بتاتا چلا گیا۔ میں چپ چاپ سنتا گیا۔

اس وقت صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے جب ہم دوبارہ شہر میں داخل ہوئے۔ شہر میں ایک سناٹا تھا۔ یا شاید مجھے ہی لگا تھا۔ جگو دادا نے ڈرائیور کو سمجھا دیا کہ وہ رانی بھاگ وتی کے بنگلے کی پچھلی جانب چلے۔ تبھی میں نے رتنو کو فون کر دیا۔ بیل جا رہی تھی، کچھ ہی دیر بعد

اس کی خمار آلود آواز سنائی دی۔ ”ہاں پہنچ گئے ہو دلی؟“

”نہیں، دلی نہیں بلکہ تیرے دل کے قریب ہوں۔“ میں نے کہا تو اس نے انتہائی غصے میں اکتاتے ہوئے کہا۔

”مذاق مت کرو، بولو فون کیوں کیا؟“

”پچھلا دروازہ کھولو، میں باہر کھڑا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”پھر وہی مذاق......“ اس نے اکتاہٹ سے کہا۔

”میں کہہ رہا ہوں نا، چپ چاپ، خاموشی سے آؤ میں باہر ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جیسے ہی گاڑی رکی، دروازہ کھل گیا۔ میں تیزی سے دروازے میں چلا گیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ رتنو میری طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے میں کوئی سچ مچ کا انسان نہیں کوئی جن بھوت ہوں۔

”زیادہ حیران مت ہو...... یہاں سے چلو، کوئی دیکھ بھی سکتا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بے یقینی سے واپس پلٹ گئی۔ وہ تیز تیز قدموں سے میرے آگے چلتی چلی گئی۔

ہم رہائش گاہ کے لاؤنج میں پہنچے تو رتنو میری طرف یوں دیکھنے لگی تھی، جیسے میں اب تک اسے دھوکا ہی لگ رہا ہوں۔ میں نے اسے پکڑا اور اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ وہ کافی دیر تک میرے ساتھ لگی لرزتی رہی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ رو رہی ہو۔ میں نے اسے الگ کیا تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

”یہ برسات کیوں رتنو؟“

”مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تم ہمیں یوں چھوڑ کر جا سکتے ہو۔ میرا یقین سچا نکلا۔“ اس نے

اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"آؤ بیٹھو۔" میں نے اسے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی

"نہیں تم فریش ہو جاؤ، میں تمہیں کپڑے دیتی ہوں۔ میں ناشتہ بنا لوں، پھر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

"تم مجھے یہ بتاؤ، پرتاب سنگھ نے بڑی بی......"

"نہیں، ابھی تک نہیں آیا؟"

"تم تو یہاں تھیں اور......" میں نے شک بھرے لہجے میں پوچھا۔

"رانی نے مجھے خود کہا تھا کہ اگر وہ آیا تو مجھے کال کر دے گی۔" رجنو نے بتایا تو میں نے تیزی سے کہا۔

"تم رانی کو کال کر کے پوچھو، میرے خیال میں پرتاب سنگھ کو اب تک آ جانا چاہیے تھا۔"

"میں پتہ کرتی ہوں۔" اس نے کہا اور فون نمبر پش کرنے لگی، کچھ ہی دیر بعد رابطہ ہو گیا تو اس نے پوچھا، "رانی جی سب خیریت ہے نا؟"

"کیوں کیا ہوا؟" اس نے پوچھا تو رجنو نے تیزی سے کہا۔

"بس مجھے وہم سا ہو رہا تھا کہ کہیں پرتاب سنگھ نہ آیا ہو۔"

"نہیں، وہ کچھ دیر بعد آئے گا، جب ماتا جی بیدار ہو جائیں گی۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے فون کیا تھا۔"

"مجھے لگتا ہے آپ سوئی نہیں؟" رجنو نے پوچھا۔

"بس نیند نہیں آئی، اب فریش ہو کر میں ماتا جی کے بیدار ہونے کا انتظار کر رہی ہوں۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے، مجھے کال کر دیں جب......" اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ رانی نے فون بند کر دیا۔

"لگتا ہے رانی پریشان ہے۔" میں نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا۔

"ہاں، جس طرح میرا دل ٹوٹ گیا تھا تمہارے جانے سے اسی طرح، اس نے بھی جو سوچا تھا وہ نہ ہوا۔ اس کا دل بھی تو ٹوٹا ہوگا نا۔" ریتو نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو میں لمحہ بھر کو سوچا اور پھر پوچھا۔

"اگر تم کہو تو میں رانی کو حوصلہ دے دوں؟"

"میرے خیال میں یہ ٹھیک رہے گا۔ ابھی دن نہیں چڑھا، تم خاموشی سے بنگلے میں جا سکو گے، میں دیکھتی ہوں کوئی راستے میں ہے تو نہیں۔" اس نے کہا اور باہر کی جانب چل دی۔ میں نے بیگ وہیں رکھا اور پلٹ کر اس کے پیچھے نکلتا چلا گیا۔

ریتو میرے ساتھ لاؤنج تک آ گئی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ پلٹ کر واپس رہائش گاہ تک چلی گئی۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا رانی بھاگ وتی کے کمرے کے سامنے جا رکا۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔ میں نے ہلکی سی دستک دی پھر دروازے کو اندر کی جانب دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے بیڈ پر رانی بیٹھی ہوئی۔ اس نے جب مجھے دیکھا تو اس کی نگاہیں پھیل گئیں۔ وہ میری طرف یوں دیکھنے لگی تھی جیسے کسی اجنبی کو دیکھتے ہیں۔ پھر وہ اضطراری انداز میں اٹھ کر بیڈ سے اتر آئی۔ وہ میرے اس قدر قریب آ گئی کہ اس کے بدن کی مہک نے مجھے مسحور کر دیا۔ تبھی اس نے سرسراتے ہوئے پوچھا۔

"تم گئے نہیں؟"

"رانی، تمہیں چھوڑ کر کون کافر جا سکتا ہے۔" میں نے کہا تو اس نے انتہائی جذباتی انداز

میں گلے لگا لیا۔ وہ مجھے بھینچ رہی پھر الگ ہو کر بولی۔

”یقین نہیں آرہا۔“

”یقین کر لو اور اسے خفیہ رکھنا ہے، صرف تمہیں اور رینو کو معلوم ہے۔“

”میں اب تمہیں چھپا کر ہی رکھوں گی۔“ اس نے کہا اور پھر دروازہ بند کر کے لاک کر دیا۔ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بیڈ تک لے جا کر بولی۔ ”تھوڑا آرام کر لو“ کمرے میں اندھیرا کر کے رانی خود بھی بیڈ پر بیٹھی، پھر میرے پہلو میں لیٹ گئی۔ وہ میری گردن، بازو اور سینے پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ مجھے بہت سکون محسوس ہوا۔ میں نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ کچھ دیر بعد ہمارے درمیان تمام تکلفات دور ہو گئے۔

میں گہری نیند میں تھا۔ اچانک مجھے لگا جیسے میرے جسم پر کچھ رینگ رہا ہے، میں ایک دم سے بیدار ہو گیا۔ کمرے میں اجالا پھیلا ہوا تھا اور میرے سامنے رینو تھی۔ اس کے چہرے پر مسکان تھی۔

”اٹھو فریش ہو جاؤ، ابھی تھوڑی دیر میں پرتاب سنگھ اپنی ماتا جی کو لینے آرہا ہے۔“ اس نے ہولے سے کہا۔

”رانی کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ماتا جی کے کمرے میں ہیں۔“ اس نے بتایا تو میں اٹھ گیا۔ باتھ روم میں میرے لئے کپڑے موجود تھے۔ مجھے رینو پر بے حد پیار آنے لگا تھا۔ وہ کس قدر مجھے سمجھنے لگی تھی۔

میں ایک ایسی جگہ کھڑا تھا، جہاں سے میں لاؤنج کا منظر پوری طرح دیکھ سکتا تھا۔ میں ان سب سے پہلے نیچے آ کر وہاں کھڑا ہو گیا تھا۔ رینو لاؤنج میں کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد رانی بھاگ وتی اور بڑی بی سیڑھیاں اتر کر نیچے لاؤنج میں آ گئی تھیں۔ ایسے میں پورچ کی طرف سے

گاڑی رکنے کی آواز آئی، اس کے تھوڑی دیر بعد پرتاب سنگھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا یوں اندر داخل ہوا جیسے کوئی فاتح اس جگہ پر آئے جسے اس نے مفتوح کر لیا ہوتا ہے۔ رانی بھاگ وتی اسی طرح صوفے پر بیٹھی رہی۔ وہ اس کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔ تبھی پرتاب سنگھ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم جب اس قابل ہو جاؤ کہ خود شکار کر سکو، تب میری طرف اپنے تیر چلانا، مانگی ہوئی تلواریں، واپس لے لی جاتی ہیں۔"

"تم اتنا تکبر مت دکھاؤ مجھے، یہ میں ہی ہوں جس نے تجھے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔" رانی نے کرجتے ہوئے کہا تو ایک خوشگوار احساس میرے اندر اتر گیا۔ میرے ہونے سے وہ اس قدر حوصلہ پکڑے گی، یہ مجھے اندازہ نہیں تھا۔ پرتاب سنگھ اس کی طرف دیکھ رہا تھا، پھر اسی طنزیہ لہجے میں بولا۔

"وہ جس کے بل بوتے پر تم نے جو کیا سو کیا، اب تم وہی رانی ہو، اپنی اوقات میں رہو اور مجھ سے تمیز سے بات کرو۔"

"تم بھی وہ پرتاب سنگھ نہیں ہو، تم اب زمین پر رینگنے والے کیڑے ہو، وہ تمہیں ایسا بنا کر گیا ہے۔ میں جو چاہوں اب تیرے ساتھ کر سکتی ہوں۔ تم بھی اب اپنی اوقات میں رہ کر بات کرو۔" اس نے غضب ناک انداز میں کہا۔

"میں اچھے دنوں کی خیرات کے طور پر تمہیں کچھ نہیں کہہ رہا، ورنہ......" وہ کہتے کہتے رک گیا تو رانی نے کہا۔

"تم کچھ نہیں کر سکتے ہو، ہاں اگر کرنا چاہو تو تمہیں اجازت ہے۔"

"چلو، دیکھ لوں گا میں تمہیں۔" یہ کہہ کر اس نے بڑی بی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"

چلیں ماتا جی۔"

"پہلے، میرے پاؤں پڑو، گھٹنے ٹیک کر مجھ سے التجا کرو، پھر لے جانا۔" رانی نے تحکمانہ انداز میں کہا تو پرتاب سنگھ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر ہنستے ہوئے بولا۔

"دن میں خواب مت دیکھ بھاگ وتی، تم میرے غصے کو جانتی ہو، اب ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو......"

"کیا ہو گا، تم مجھے مار دو گے، قتل کر دو گے میرا، چل یہ بھی کر کے دیکھو، ہاتھ لگاؤ اپنی ماں کو، میں راجپوت کی بیٹی نہ ہوئی اگر یہیں تم دونوں کو قتل نہ کیا۔" رانی نے غضب ناک لہجے میں کہا تو پرتاب سنگھ لمحہ بھر کو حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے ایک طویل سانس لیا پھر رانی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"رانی جی مجھے معاف کر دو، میرے ماتا جی مجھے دان کر دو۔"

"اب اس التجا کو یاد بھی رکھنا......" رانی نے کہا اور اٹھ کر بڑی بی کی طرف چل دی۔ وہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی، اسے نمسکار کیا اور جانے کا اشارہ کر دیا۔ بڑی بی نے اسے ایک بار دیکھا اور باہر کی جانب چل دی۔ تبھی رانی بھاگ وتی نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

"اب اگر میری زمین جائداد پر خود ہی قبضہ چھوڑ دو گے تو معافی رہے گی، اگر آج شام تک قبضہ نہ چھوڑا، تو یہ معافی ختم ہو جائے گی۔"

آواز کی بازگشت گونج کر رہ گئی۔ پرتاب سنگھ نے باہر جاتے ہوئے رک کر اس کی بات سنی، پھر اپنی ماں کو لیتا ہوا باہر کی جانب چل دیا۔ اس نے اپنی ماں کو گاڑی میں بٹھایا، پھر اس کے ساتھ بیٹھا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ رتنو نے پورچ میں جا کر سب گارڈز کو اپنی ڈیوٹی پر

بھیج دیا۔ جب رہائش گاہ کی طرف جانے والے راستے میں کوئی نہ رہا تو اس نے مجھے نکلنے کا اشارہ کیا۔ میں وہاں سے رہائش گاہ تک جا پہنچا۔ اب وہی میرا ہیڈ کوارٹر تھا۔

میں بیڈ روم میں آ کر بڑے سکون سے لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد رتو بھی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے مگ تھے۔ اس نے ایک مگ میری جانب بڑھایا اور اپنا سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میں اٹھا اور بیڈ پر آلتی پالتی مارتے ہوئے بیٹھ گیا۔ میں نے مگ لیا اور سپ لے کر کہا۔

"رتو، جگو دادا کو بس حوصلے کی ضرورت تھی، دیکھو، شہر میں کیسا بھونچال لایا ہوا ہے اس نے۔" میں نے کہا اور چائے کا سپ لے لیا۔

"اس کے لئے تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اس کا سر اپنی ران پر رکھتے ہوئے بڑے ہی جذباتی لہجے میں بولا۔

"رتو، تم وہ ہو جس کا جتنی بار بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔"

"میں اچھی لگتی ہوں نا؟" اس نے پوچھا۔

"بہت زیادہ۔" میں نے کہا تو ہنستے ہوئے بولی۔

"پھر چائے پیو اور مجھے بھی پینے دو۔"

اس کے یوں کہنے پر میں قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ میں بیڈ روم میں پڑا جگو دادا سے رابطے میں رہا۔ شہر بھر میں اس نے اپنے بندے پھیلا دیئے تھے۔ جہاں بھی پتہ چلتا کہ یہاں کوئی سلسلہ پرتاب سنگھ کا ہے، وہ وہیں دھاوا بول دیتے۔ دونوں طرف پانچ بندے قتل ہو چکے تھے اور کافی سارے لوگ زخمی تھے۔ شہر میں کہرام برپا تھا۔ جس پر پولیس نے قابو پا لیا تھا۔ جگو دادا کو اتنی زیادہ کامیابی حاصل

نہیں کر پایا تھا لیکن وہ خوش تھا، اس نے اپنے ہونے کا احساس دے دیا تھا۔

ایسے میں چاچا عبدالمجید کا فون آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب اور بیگم صاحبہ وطن پہنچ کر محفوظ مقام پر پہنچ گئے تھے۔ میں نے شکر ادا کیا کہ جس مقصد کے لئے میں یہاں تک آیا تھا وہ پورا ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے وہیں رہ جانے کی وجہ پوچھنے لگے تو میں نے پھر کسی وقت بتانے کا کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ کیونکہ اب جو میں نے ہدف بنایا تھا وہ بالکل میرا اپنا ذاتی تھا۔ جب تک میرے سامنے کوئی منظر واضح نہیں ہو جاتا تھا، میں انہیں کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔

☆......☆......☆

رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا، جب میں پچھلے دروازے سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ جگو دادا میرے انتظار میں تھا۔ میرے بیٹھتے ہی گاڑی چل دی۔ ڈرائیور کے ساتھ ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ ہم پچھلی نشست پر تھے۔ جگو دادا نے میری طرف ایک قیمتی پسٹل بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ دیکھو، کیسا ہے؟''

میں نے اندر کی لائیٹ جلائی، اسے غور سے دیکھا، پھر لائیٹ بند کر کے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا ہے۔''

''یہ اس کے لئے کچھ فالتو میگزین۔'' اس نے میگزین میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو میں نے اسے پکڑ لئے، پھر انہیں محسوس کر کے اپنی جیکٹ میں رکھ لئے۔

''تمہیں یقین ہے کہ وہ وہاں پر پہنچ چکا ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے لوگوں کے مطابق تو ایسا ہی ہے۔ یہ پکی خبر ہے کہ ان کی میٹنگ ہونے والی ہے۔'' جگو دادا نے کہا۔

”اگر ایسا ہے تو سمجھو آج کے بعد تمہارا راج ہوگا اس شہر پر۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا تو وہ خاموش رہا۔

ڈرائیور بڑی سڑک پر گاڑی بھگائے چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس نے رفتار کم کی اور دائیں جانب مڑ کر ایک چھوٹی سڑک پر آ گیا۔ ذرا سا آگے گئے تو میری نگاہ بائیں جانب جھیل پر پڑی۔ مجھے یاد آ گیا۔ یہ تو وہی جھیل تھی جو تیمور سے ملتے وقت مجھے دکھائی دی تھی۔ میرے ذہن میں شہر کی لوکیشن تھی، اسی مناسبت سے میں سمجھ گیا کہ آگے تھوڑی سی آبادی ہوگی اور پھر کھیت شروع ہو جائیں گے۔ کافی آگے جا کر ڈرائیور پھر دائیں جانب ہی مڑ گیا۔ یہ راستہ بھی جھیل کے ساتھ ساتھ ہی جا رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا آگے جا کر رک گیا۔ تبھی جگو دادا نے کہا۔

”وہ بائیں جانب تین منزلہ بلڈنگ دیکھ رہے ہو نا۔“

”ہاں، دیکھ رہا ہوں۔“

”اسی میں پرتاب سنگھ اور اس کے ساتھی جمع ہو رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”یہ پتہ کرو کہ وہ پہنچ چکے ہیں یا آنے والے ہیں؟“ میں نے دھیمے سے کہا تو اس نے اپنا فون نکال لیا۔ کچھ دیر بعد رابطہ ہو جانے پر اس نے کسی سے پوچھا، جواب سننے کے بعد اس نے فون کان سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”پرتاب سنگھ ابھی نہیں پہنچا۔“

”تو ایسا نہ کریں اسے اس بلڈنگ کے باہر ہی دیکھ لیں۔“ میں نے ہر طرف کا جائزہ لے کر سکون سے کہا۔

”وہ کیسے؟“ اس نے پوچھا تو میں اسے سمجھانے لگا۔ باقی لوگ بھی میری بات سن رہے تھے۔ میں ابھی انہیں سمجھا ہی رہا تھا کہ ایک گاڑی تیزی کے ساتھ ہمارے قریب سے گزری۔

آگے بیٹھے ہوئے نوجوان نے کہا۔

"پرتاپ کی گاڑی......"

اسی لمحے ڈرائیور نے گاڑی بڑھا دی۔ جب تک پرتاپ سنگھ والی گاڑی اس بلڈنگ کے پاس جا کر رکی۔ تب تک ہم بھی پہنچ گئے تھے۔ پرتاپ سنگھ نے گاڑی سے باہر قدم نکالا ہی تھا کہ ہم تینوں گاڑی سے باہر آ گئے۔ اسکی گاڑی کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ وہ اندر کی جانب قدم بڑھانے والا تھا کہ ہم نے فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی میں پوری قوت سے آگے کی جانب بھاگا۔ میں اسے اس بلڈنگ میں داخل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ فائرنگ اتنی شدید تھی کہ اسکی گاڑی سے کوئی بھی نہیں نکل سکا۔ مجھے بس یہی ڈر تھا کہ اندر بیٹھے کوئی نہ کوئی فائر کرے گا۔ وہ میں نے جگو دادا پہ چھوڑا اور خود دروازے کے سامنے جا پہنچا۔ وہ میری جانب حیرت سے دیکھ رہا تھا، اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تم یہاں......"

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ جاتے ہی اسے گردن سے پکڑا اور پسٹل اس کی کنپٹی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی سی بات کرنی ہے چلو گے یا یہیں مرو گے؟"

میں اسے مزاحمت کا وقت نہیں دینا چاہتا تھا، میں نے اسے گھسیٹا اور اپنی ڈھال بنا لیا۔ پھر الٹے قدموں اسے لانے لگا، وہ میرے ساتھ چلتا چلا آیا۔ میں نے اسے گاڑی میں پھینکا تو جگو دادا بھی دوسری جانب سے آن بیٹھا۔ ڈرائیور نے کمال مہارت سے گاڑی پیچھے لی اور پھر چیختے ہوئے ٹائروں کے ساتھ یوٹرن لے کر گاڑی بھگا دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، ایک گاڑی ہمارے پیچھے لگ چکی تھیں۔ اس میں سے مسلسل فائرنگ ہونے لگی تھی۔

”انہیں سمجھاؤ، یہ تمہاری موت چاہتے ہیں۔“ میں نے پرتاب سنگھ سے کہا جو میرے اور جگو دادا کے درمیان پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔

”سر سمجھانے کی ضرورت نہیں، میں انہیں دیکھ لیتا ہوں۔“ ڈرائیور نے کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ وہ انتہائی خطرناک رفتار سے کار چلائے جا رہا تھا، وہ چھوٹی سڑک کا پہلا موڑ مڑا تو پھر رفتار تیز کر دی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ لمحوں میں بڑی سڑک تک آ گیا ہو۔ پیچھے آنے والی کار نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

وہ ایک گنجان آباد علاقہ تھا۔ وہاں پرانے طرز کے بڑے بڑے گھر تھے۔ انہیں میں سے ایک گھر کے سامنے اس کی گاڑی رُکی تو گیٹ کھل گیا۔ ڈرائیور گاڑی سمیت اندر چلا تھا۔ وہ ڈیوڑھی سے ہوتا ہوا صحن پار کر کے برآمدے کے پاس جا کر رک گیا۔ برآمدے میں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہمارے نکلتے ہی نوجوان نے پرتاب سنگھ کو باہر نکالا اور اندر کی جانب لے کر چل دیا۔

وہ ایک پرانا سا بوسیدہ کمرہ تھا جس کا فرش اکھڑا ہوا تھا۔ اس میں ایک پیلا بلب روشن تھا جس کی روشنی ہانپ رہی تھی۔ پرتاب سنگھ کو ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بٹھا کر نوجوان باہر چلا گیا تھا۔ ایسی ہی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ جگو دادا اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ میں کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر بڑے سکون سے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب اور بیگم صاحبہ کو تم نے قید کیوں کیا تھا؟“

”کاہے بگا ہے، لوگ یوں قید خانے میں رکھنے کے لئے میرے پاس بھیج دیئے جاتے رہے ہیں اور میں انہیں قید خانے میں رکھوا دیتا تھا، ایسے ہی یہ لوگ بھی آ گئے۔“ اس نے سکون سے جواب دیا۔

"کس نے بھجوائے تھے؟" میں نے پوچھا۔
"تمہارا یہ سوال بے وقوفانہ ہے۔ جو تم پوچھنا چاہتے ، اس بارے تمہیں کبھی بھی پتہ نہیں چل سکتا۔" اس نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔
"لیکن مجھے پتہ لگانا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو ہنس دیا پھر بولا۔
"تم بے وقوفی والی باتیں کر رہے ہو، جب ایک بہت بڑے نیٹ ورک میں کام ہوتا ہے تو سب کے بارے میں پتہ نہیں ہوتا۔ کون، کہاں پر کیسے کام کر رہا ہے۔ تم نے جو انجانے میں زیرو میں کارروائیاں کر کے کامیابی حاصل کی ہے نا، یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں، یہ تو ان تنظیموں کے لئے کھیلنے والی بات ہے جنہیں چلانے والے عالمی سٹیج پر بیٹھے ہوئے ہیں۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا تو میں نے پھر سکون سے پوچھا۔
"چلو وہ لوگ ہی بتا دو۔ یا ان کی نشاندہی کر دو، جنہوں نے تم تک ان دو لوگوں کو بھیجا تھا۔ باقی میں جانو میرا کام۔"
"میں اب بھی تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ ایسی آگ سے مت کھیلو، جس میں تمہاری خاک بھی اُڑ جائے۔" اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔
"یار مجھے نصیحت نہ کرو بلکہ وہ بتانے کی کوشش کرو، جو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں۔ میں جو تم سے بڑے سکون سے بات کر رہا ہوں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم مجھے ڈرانا شروع کر دو۔ مجھے دوسرا طریقہ آزمانے پر مجبور نہ کرو۔" میں نے سرد سے لہجے میں کہا تو پھر اسی اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔
"جاؤ ریاست کے گلے پڑو پھر جا کر، اس سے پوچھو انہوں نے ایسا کیوں کیا؟"
"تمہارا مطلب ہے کہ یہ سب ریاست نے کیا۔ انہیں قید کرنے کا حکم ریاست کی طرف

سے تمہیں ملا تھا؟“ میں نے پوچھا۔
”ہاں، ایسا ہی ہے۔“ اس نے کہا۔
”اچھا چل یہ بتاؤ، یہ کلیان جی والا کیا معاملہ ہے، تم یہاں کے کلیان جی ہو تو تمہارا اس نیٹ ورک سے بھی تعلق ہے، کیا تم جسے ریاست کہہ رہے ہو، یہ کلیان جی ہے؟“ میں نے کہا تو وہ ایک بار چونکا، چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔
”یہی سمجھ لو، اس کی ایک ذیلی تنظیم ہے۔“ اس نے اشارے میں کہا تو میں سمجھ گیا۔ جس طرح مختلف ملکوں میں خفیہ ایجنسیاں اپنی طرف سے مختلف تنظیمیں کھڑی کر کے اپنے مقاصد حاصل کرتی ہیں، وہ کلیان جی بھی ایک ایسی ہی تنظیم ہو سکتی تھی۔ میں کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا
”یہ کام کلیان جی تنظیم کا ہے یا ریاست کا؟“ میں نے پوچھا۔
”تم جو مرضی کر لو، میرا یہی جواب ہے۔ تم کبھی بھی ان تک نہیں پہنچ سکتے۔ انہیں چھوڑو، میرے ساتھ جو طے کرنا ہے کرو۔ تم رانی بھاگ وتی کے وفادار ہو، اس کے لئے جو چاہتے ہو، مجھے بتاؤ۔“
”تم رانی کی بات مت کرو، وہ اب ماضی ہو چکی، جتنا کام میں نے اس سے لینا تھا لے لیا۔ جو میں پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ خاموش رہا، میں نے چند لمحوں بعد اسے پھر کہا وہ تب بھی خاموش رہا تو میں اٹھ گیا۔ میرا ابھی خیال تھا کہ اب اسے دوسرے طریقے سے سمجھاتا ہوں۔ میں ابھی کھڑا ہی ہوا تھا کہ جگو دادا کا فون بج اٹھا۔ اس نے فون نکال کر اسکرین پر دیکھا اور پھر کال ریسیو کرتے ہوئے اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری جانب سے کسی نے گمبھیر لہجے میں کہا۔
”جگو دادا، تم چاروں طرف سے گھیرے جا چکے ہو، یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اس لئے چپ چاپ پرتاپ سنگھ جی کو لے کر باہر نکل آؤ، تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"تم کون ہو اور یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"اوئے، تمیز سے بات کر، میں تیرا باپ بات کر رہا ہوں۔ اور سن، وہ ایجنٹ، جو تیرے ساتھ تھا، وہ ہمیں زندہ چاہئے۔ ہمیں پرتاپ سنگھ کی اتنی پرواہ نہیں ہو گی جتنی اس ایجنٹ کی ہے۔ امید ہے تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے۔ فوراً باہر نکل آؤ۔"

میں اس کے لفظ سن رہا تھا۔ میں نے جگو دادا کو فون بند کر دینے کے لئے کہا تو اس نے کال بند کر دی تبھی پرتاپ سنگھ نے زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"بے چارا ویر سنگھ۔ آ گئے نا میرے جال میں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے صبح اس وقت شک ہو گیا تھا جب بھاگ وتی بڑے اونچے سروں میں ڈائیلاگ بول رہی تھی۔ وہ ایسا بول ہی نہیں سکتی تھی۔ مجھے شک ہی نہیں یقین ہو گیا تھا کہ تم یہیں کہیں ہو۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، پھر میرے سامنے تن کر بولتا چلا گیا، "جیسے بھی ہوا، میں ماتا جی کو لے کر نکل گیا۔ پھر دوپہر تک میرے ذرائع نے مجھے کنفرم کر دیا کہ تم دِلّی کے سفارت خانے میں نہیں پہنچے ہو۔ تب مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ تم یہیں ہو۔ یہ جو سارا دن جگو دادا نے مارا ماری کی ہے۔ اس کی بھی ہمت نہیں تھی کہ میرے سامنے سر اٹھا سکے۔ تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ فساد کی جڑ کو ہی ختم کر دوں۔ اور اب...... تم میرے جال میں پھنس چکے ہو۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور جگو دادا کی طرف دیکھ کر کہنے لگا، "تمہارے رابطے میرے لوگوں میں ہو سکتے ہیں تو جگو داد تمہارے ہاں میرے رابطے نہیں ہو سکتے۔ چند لوگوں کی مبہم اطلاع پر تم نے اتنا بڑا رسک لے لیا، مجھے اغواء کرنے کا سوچا تم لوگوں نے۔ اب بھگتنا تو پڑے گا نا۔"

"پرتاب سنگھ، لاشیں بولتی نہیں ہیں۔ سوچ کچھ دیر بعد تم بولنے کے قابل نہیں رہو گے۔" جگو دادا نے پسٹل نکالتے ہوئے کہا۔

"نہ میری جان نہ، میرے مرنے یا نہ مرنے سے اب کوئی فرق نہیں پڑنے والا، فرق تو یہ پڑنا ہے کہ تم ملک کے لئے غدار ہو چکے ہو۔ تم نے ایک دشمن ملک کے بندے کو پناہ دے رکھی ہے۔ یہ دیر سنگھ نہیں ہے، بلکہ ایک مسلمان خفیہ ایجنٹ ہے۔ جسے مارنا اب مجھ پر فرض ہو چکا ہے۔ میں مر بھی گیا تو کوئی بات نہیں لیکن میرے مرنے کے بعد تم اور رانی بھاگ وتی غدار کہلاؤ گے اس کی سزا تو تم لوگوں کو ملے گی۔"

"تم بکواس کر رہے ہو؟" جگو دادا نے کہا۔

"نہیں، میں بکواس نہیں کر رہا، بلکہ تم غدار بننے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس وقت رانی بھاگ وتی کو بھی پکڑ لیا ہوگا۔ ہاں تم اگر بچنا چاہتے ہو تو اسے باہر آئے ہوئے لوگوں کے حوالے کر دو، بچ جاؤ گے، یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔" پرتاب سنگھ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو میں نے جگو دادا کے چہرے پر پسینہ اترتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سوچتے ہوئے میری جانب یوں دیکھا جیسے تذبذب کی کیفیت میں۔ تب پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں کہاں پر غلطی کر گیا ہوں کہ یہ لوگ مجھ تک آن پہنچے ہیں۔

میرے سامنے پرتاب سنگھ کھڑا مسکرا رہا تھا اور جگو دادا کی سوچ وہی تھی جس کے بارے میں اسے میں نے سمجھایا کہ لوگ طاقت کی طرف جھک جاتے ہیں۔

❁......❁......❁

(قسط نمبر: 7)

پرتاب سنگھ میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میرے دائیں طرف جگو دادا مجھے گھور رہا تھا۔ سارا کھیل جگو دادا کے سر پر تھا۔ وہ جو فیصلہ کرتا، حالات اسی طرح بدل جانے تھے۔ میں تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اگر دادا میرے خلاف چلا جاتا ہے تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟

"بول جگو کیا فیصلہ کرتا ہے؟" پرتاب سنگھ کی بھاری آواز گونجی تو جگو نے یوں اسے دیکھا جیسے کسی گہری سوچ سے بیدار ہو گیا ہو۔ وہ آہستہ قدموں سے آگے بڑھا اور پرتاب سنگھ کے بالکل سامنے جا کر کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

"میرے دو جوان بیٹے مارے ہے تم نے، یاد ہے نا تمہیں؟"

"میں مانتا ہوں پر یہ وقت......" اس نے کہنا چاہا تو جگو دادا نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا۔

"وہی وقت میں اب تک اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھر رہا ہوں بے غیرت۔ تب سے اب تک میں تم سے انتقام لینے کا ہی سوچا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی سوچ نہیں آئی، میں نے سوچوں ہی سوچوں میں نجانے کتنی بار تیرے بیٹے کو مارا ہے۔ تم مجھے ڈراتے ہو کہ مجھے غدار کہہ دیا جائے گا۔"

"مگر تم اب بچ نہیں سکتے، مجھے اپنی موت کی کوئی فکر نہیں" پرتاب سنگھ نے کہا تو جگو دادا بولا۔

"تجھے ابھی مارنا کس نے ہے، ابھی تو تیرے سامنے تیرے بیٹے کو میں نے مارنا ہے۔ پھر تجھے پتہ چلے گا، بیٹے کی موت کا دکھ کیا ہوتا ہے۔"

"دادا، جو کرنا ہے کرو، یہ نہ ہو کہ باہر کے لوگ اندر آ جائیں۔" میں نے اسے یاد دلایا تو وہ بولا۔

"یہ بھڑ دے ہمیں، ہمارے ہی گھر میں ماریں گے، ایسا انہوں نے سوچا بھی کیسے۔ ابھی بتاتا ہوں انہیں۔"

"کچھ کرنا ہے، بتانا نہیں انہیں۔" میں نے اسے یاد دلایا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے پرتاب سنگھ کو کالر سے پکڑا اور باہر کی جانب دھکا دیا، پھر مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے اسے دھکے دے کر باہر نکالنے لگا۔ دائیں جانب چند کمرے تھے، جن کے ساتھ ہی اوپر کی جانب سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ وہ ہمیں ایک کمرے میں لے گیا۔ ساتھ چلتے ہوئے اس نے مجھ سے پسٹل لے لیا تھا۔ جیسے ہی ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے گھما کر پسٹل پرتاب سنگھ کے سر پر مارا، وہ لڑکھڑا گیا، اگلے چند لمحوں میں وہ فرش پر گر گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

"یہ کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ سامنے کی دیوار میں ایک الماری تھی۔ اس کے پٹ سیاہ لکڑی کے تھے۔ اس نے تیزی سے وہ پٹ کھولے، اندر کی طرف ہاتھ ڈال کر اس نے ایک خاص جگہ پر دباؤ دیا تو اندر ایک ریک گھوم گیا۔ سامنے اندھیری غار سی دکھائی دی۔ وہ کوئی خفیہ راستہ تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں رہو تھوڑی دیر، پھر بتاتا ہوں کیا کرنا ہے۔ اسے اپنے ساتھ اندر رکھو، میں سب کو مطمئن کر کے آتا ہوں۔"

"یہاں سے باہر......" میں نے پوچھنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"ادھر کمرے میں بھی آ سکتے ہو اور یہ راستہ باہر ایک دوسرے مکان میں کھلتا ہے، وہ مکان

بھی اپنا ہے، وہاں سے جدھر چاہو نکل سکتے ہیں۔ لیکن ابھی پرتاپ سنگھ کو نہیں مارنا۔"

"ٹھیک ہے......" میں نے کہا اور اس کی ٹانگوں کی طرف سے پکڑا، جگو دادا نے اس کے بازو پکڑے اور اس غار نما راستے میں ڈال دیا۔ میں بھی اس غار نما راستے میں چلا گیا تو دادا نے وہ الماری بند کر دی۔ اندر گھپ اندھیرا چھا گیا۔ گرمی کے ساتھ ساتھ کافی گھٹن بھی تھی۔ دونوں طرف کے سارے در بند تھے۔ میں نے فون نکال کر اس کی بیٹری روشن کر لی۔ بے ہوش پرتاپ سنگھ مجھ سے کچھ فاصلے پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ مجھے وہاں کھڑے دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ جگو دادا کا فون آ گیا۔ میں نے کال رسیو کی تو وہ تیزی سے بولا۔

"اس لیے کال کی ہے کہ تم باہر کی باتوں کو سنتے رہو، اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو اسی راستے سے باہر نکل جانا، پرتاپ سنگھ کو یہیں چھوڑ دینا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا تو جگو دادا کی آواز ختم ہو گئی لیکن کال چلتی رہی۔ شاید وہ چلتا ہوا باہر برآمدے میں آ گیا تھا۔ اس نے کسی سے کہا۔

"گیٹ کھول کر دیکھو، کون ہے باہر......؟"

کچھ دیر تک یونہی بھاگ دوڑ کی آوازیں آتی رہیں۔ گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور پھر کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"کہاں ہے پرتاپ سنگھ اور وہ دشمن ملک کا غدار؟"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ بلکہ میں کہوں تم غلط جگہ پر آ گئے ہو۔" جگو دادا کی آواز ابھری۔

"نہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے اور نہ میں غلط جگہ پر آیا ہوں۔"

"تو پھر دیکھ لو، ایک ایک انچ کی تلاشی لے لو۔" جگو دادا نے کہا۔

"تم نے انہیں بھگا دیا ہو گا؟" وہ آواز ابھری تو جگو دادا نے غصے میں کہا۔

"دیکھو میں سکون سے اپنے گھر کی تلاشی دے رہا ہوں اور تم پھیلتے جا رہے ہو۔ سیدھے مجھے پکڑ کر لے جانا چاہتے ہو تو لے جاؤ۔"

"چلو تلاشی لو۔" وہ آواز ابھری۔

پھر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ کہیں کہیں، کسی طرف سے، کسی کے بولنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آتی رہیں۔ اس غار نما راستے میں گھٹن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے وہاں پر سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔ ایسے میں پرتاب سنگھ نے کروٹ لی، وہ شاید ہوش میں آ رہا تھا۔ میرے لئے مشکل ہو گیا کہ خود اچھی طرح سانس لوں، یا اسے پھر سے بے ہوش کروں۔ چند منٹ یونہی گزر گئے تو پرتاب سنگھ ہوش میں آ گیا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو میں نے پوری قوت سے ایک گھونسہ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ چیخ کر پیچھے کی جانب گرا۔ وہ راستہ اتنا بڑا تھا کہ پورے قد سے کھڑا ہوا جا سکے۔ مجھے ڈر یہی تھا کہ پرتاب سنگھ اونچی آواز میں چیخنا شروع نہ کر دے۔ میں نے فون اپنے کان سے لگایا ہوا تھا لیکن اس میں کوئی واضح آواز سنائی نہیں دے رہی تھی کہ جس سے مجھے اندازہ ہو جاتا کہ باہر کیا چل رہا ہے۔

گھٹن زیادہ بڑھنے لگی تو میں نے وہاں سے نکل جانے کا سوچا۔ پرتاب سنگھ فرش پر پڑا تھا۔ وہ کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ میں اس کو مگو میں تھا کہ اسے بھی ساتھ کھینچ کر لے جاؤں یا پھر اکیلا ہی باہر جانے کی کوشش کروں۔ میں اگر چھوڑ کر جاتا تو لازمی بات تھی کہ وہ چیخنے لگتا۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ جگو دادا کی آواز ابھری۔

"ہاں ہو گئی تم لوگوں کی تسلی؟"

"دیکھ جگو، ہم غلط نہیں آئے۔ وہ یہیں کہیں ہے۔ سیدھی طرح بتا دے ورنہ تجھے ہمارے ساتھ جانا پڑے گا۔" وہی آواز ابھری۔

”تم آئے ہی اسی لئے ہو کہ مجھ پر الزام دھرو اور ساتھ لے جاؤ، چلو لے چلو، پھر مجھ پر کوئی الزام مت دھرنا کہ کون، کہاں قتل ہو گیا۔“جگو دادا نے پوری بدمعاشی دکھاتے ہوئے دھمکی دے دی۔

”اگر مجھے پتہ......“

”اگر مگر مت کرو، اب اور کیا کروں جو تجھے یقین آجائے؟“جگو نے کہا۔

”ابھی جاتا ہوں لیکن میری نظر تم پر رہے گی۔نہیں چھوڑوں گا میں تمہیں۔“اس آواز نے دھمکی دی۔

”او لڑکے، یہ جائیں تو گیٹ لگا دینا۔“جگو دادا نے مزید بات نہ کرنے کے لئے کہا۔اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا۔وہ شاید برآمدے میں کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔تقریباً دو منٹ بعد اس نے کہا۔

”ویر سنگھ، ہوش میں ہو نا؟“

”ہاں ہوش میں ہوں لیکن جلدی بے ہوش ہو جاؤں گا۔“میں نے بہ مشکل کہا تو وہ بولا۔

”بس ابھی آیا۔“اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

الماری کھلتے ہی تازہ ہوا کے جھونکے سے میری سانس بحال ہونے لگی۔ایسے میں جگو دادا بھی اندر آ گیا۔اس نے آتے ہی کہا۔

”دوسرے مکان میں جاتے ہیں، وہاں جا کر سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔“

”جو کرنا ہے جلدی کرو۔“میں نے کہا تو وہ غار نما راستے میں آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔کچھ ہی دیر بعد ہوا کا جھونکا تیز ہوتا گیا تو میں سمجھ گیا کہ ادھر کا دروازہ بھی کھل گیا ہے۔جگو دادا واپس آیا، اس نے پھر پرتاب سنگھ کو کاندھوں سے پکڑا تو میں نے ٹانگوں سے پکڑ لیا۔ہم اسے

گھسیٹتے ہوئے دوسرے مکان میں لے گئے۔اسے فرش تک لاتے ہوئے ہم ہانپنے لگے تھے۔ ایک تو پرتاب سنگھ کا وزن زیادہ تھا دوسرا اس غار نما راستے میں ہوا کا دباؤ بہت کم تھا۔

"جگو دادا، مجھے لگتا ہے کہ اب اس پرتاب سنگھ سے جان چھڑانا پڑے گی، ورنہ یہ تیرے لئے عذاب بن جائے گا۔" میں نے پھولے ہوئے سانس میں کہا تو وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔"

"تو چل پھر دیر نہ کر، سوچ اس کا کیا کرنا ہے۔" میں نے کہا تو وہ بولا۔

"لیکن پہلے سوچنے والی بات ایک اور بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"تیرے لئے محفوظ ٹھکانے کی، اب تم رانی بھاگ وتی کے پاس نہیں جاسکتے ہو۔" اس نے دھیمے سے کہا تو مجھے لگا کہ ایسا ہی ہے۔ میرے خیال میں ریاست کے لوگ متحرک ہو گئے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے رانی بھاگ وتی کو پکڑ ہی لیا ہو۔ میرا من چاہ رہا تھا کہ میں رتنو کو فون کروں، تبھی میں پوچھا۔

"تیرے پاس ہے کوئی ٹھکانہ......؟"

"ہاں ہے، اگر تجھے یہاں سے نکلنا بھی پڑے تو کوئی تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔"

"چل ٹھیک ہے۔ پہلے اسے ہوش میں لا۔" میں نے کہا۔

"ہوش میں کیا لانا، ٹھوک دے اسے۔" جگو دادا نے نفرت سے کہا۔

"ابھی نہیں، ابھی تھوڑی دیر ٹھہر۔"

یہ کہتے ہوئے میں پرتاب سنگھ کو ہوش میں لانے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے

آنکھیں کھولیں اور ہونقوں کی مانند دیکھا، پھر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے کہا۔

"دیکھ، مجھے قتل کرے گا تو باہر آئے لوگ تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے تم اور جگو دادا دونوں ہی...."

"چھوڑو ان باتوں کو، میرے اور جگو دادا کے درمیان ایک بات طے ہو گئی ہے، اگر تم سچ بولو گے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا اور اس کے حوالے کر کے چلا جاؤں گا۔ اگر تم نے جھوٹ بولا تو میں تجھے ابھی مار دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے پسٹل اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ اپنے سامنے موت دیکھ کر مضبوط اعصاب والا بچنے کی کوشش تو کرتا ہے۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر دھیرے سے بولا۔

"پوچھو کیا پوچھنا ہے؟"

"وہی، تجھے کس نے کہا تھا ڈاکٹر صاحب کو قید خانے میں ڈالنے کے لئے، بس یہی بتا دو۔" میں نے پوچھا اور پسٹل کی نال اس کے ماتھے پر رکھ دی۔ وہ کسمسا کر رہ گیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

"سارے راجستھان کا بڑا جے پور میں رہتا ہے۔ مجھے جو بھی کرنا ہوتا ہے، اسی کے کہنے پر کرتا ہوں۔ اوپر کیا معاملات ہوتے ہیں، مجھے کوئی پتہ نہیں۔"

"کیا وہ بھی کلیان جی ہے یا......"

"وہ سب کچھ ہے۔" اس نے بتایا۔

"کیا نام ہے اس کا؟"

"ناگیشور۔" اس نے سرسراتے ہوئے کہا تو میں نے پسٹل کی نال اس کے ماتھے سے ہٹا لی۔ اس نے ایک طویل سانس لیا تو میں اس کے قریب سے اٹھ گیا۔ تبھی جگو دادا نے کہا۔

”کچھ دیر ٹھہر، میں گاڑی کا بندوبست کر کے آتا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے وہ باہر کی جانب چلا گیا۔ میرے سامنے پرتاپ سنگھ بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں سوچنے لگا، جب میں اس شہر میں آیا تھا تو اس کا کتنا خوف تھا ہر طرف، اب بھی ہوگا، لیکن یہ میرے سامنے بے بس پڑا تھا۔ یہ ایک مہرہ تھا۔ شاطر تو نجانے کہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد دروازے ہی سے جگو دادا نے ہانک لگائی۔

”چلو آؤ نکلو باہر۔“

میں اٹھا تو میرے ساتھ پرتاپ سنگھ بھی اٹھ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ میں نے بھی دل میں ٹھان لی تھی کہ جگو اس کے بارے میں جو بھی فیصلہ کرے، وہ جانے۔ صحن کے آخر میں ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ چند لوگ ایک جانب بنے برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے۔ پرتاپ سنگھ حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ یہ سب الٹ کیسے گیا۔ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ ایسے میں پرتاپ سنگھ اچانک زمین پر گر گیا۔ میں نے تیزی سے دیکھا، جگو دادا نے اس کے گلے میں رسی ڈالی ہوئی تھی۔ وہ اس قدر نفرت سے اس رسی کو کس رہا تھا کہ اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔ پہلی بار اتنی نفرت میں نے اس کے چہرے پر دیکھی تھی۔

پرتاپ سنگھ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کی زبان باہر نکلی ہوئی اور آنکھیں باہر آ چکی تھیں۔ وہ ایڑیاں رگڑ رہا تھا کچھ دیر بعد وہ ساکت ہو گیا۔ جگو دادا نے اسے چھوڑا تو اس کا پسینہ بہہ رہا تھا۔ اسی اثناء میں دو لڑکے بھاگتے ہوئے آئے، انہوں نے کار کی ڈگی کھولی اور لاش اس میں رکھ کر بند کر دی۔ جگو دادا پچھلی نشست پر آ بیٹھا، ایک نوجوان اس کے ساتھ بیٹھا تو ڈرائیور نے کار بڑھا دی۔ اس وقت تک ایک لڑکے نے گیٹ کھول دیا تھا۔

اس گنجان آباد علاقے سے نکلتے ہوئے ہمیں کچھ وقت لگا، پھر جیسے ہی بڑی شاہراہ پر کار

آئی، ڈرائیور نے اسے بھگا دیا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ کار بھاگتی رہی، ہم میں سے کوئی نہیں بولا تھا، کار میں سکوت طاری تھا۔ ایک جگہ کافی سارے درخت تھے۔ وہیں جگو دادا نے کار روکنے کا کہا۔ کار ایک جانب رک گئی۔ ڈرائیور اور لڑکا باہر نکلے، انہوں نے لاش نکالی اور سڑک کنارے پھینک دی۔ پھر وہ اسی طرح واپس آ بیٹھے۔ ڈرائیور نے کار بڑھا دی۔

☆......☆......☆

رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ کار ایک پہاڑی سلسلے کے ساتھ رکوا دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جگو دادا نے مجھے باہر نکلنے کو کہا۔ میں کار سے اترا تو مجھے ہوا میں نمی کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک سمت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چلو......'' میں اس کے ساتھ چلنے لگا تو وہ کہتا چلا گیا۔ ''یہاں اوپر ایک سادھو مائی رہتی ہے۔ وہ سادھو کیا ہے پوری چڑیل ہے۔ دیکھنے میں تو ایسے ہی سادھو بنی ہوئی ہے لیکن بڑا مال ہے اس کے پاس، کئی دھندے چل رہے ہیں اس کے۔ پر ہمیں اس کے دھندوں سے کیا لینا دینا، تم اس کے پاس رہو۔ وہ تمہیں یہاں سے بڑے آرام کے ساتھ وہاں پہنچا دے گی جہاں تم جانا چاہو گے۔'' اس نے کہا۔

''وہ کیسے......؟''

''اس کے پاس سو طریقے ہیں۔ یہاں پر کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ بس جتنا وقت تو نے یہاں گزارنا ہے، ان کی طرح کپڑے پہننا ہوں گے تمہیں، یا جیسے بھی وہ تمہیں کہے۔''

''کیا اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، مطلب یہ کسی دوسرے سے رقم......''

''اوئے ویر سنگھ، اس کا میرے ساتھ رقم کا مال کا تعلق نہیں ہے۔ یہ کبھی میری جگر ہوا کرتی تھی۔ مرتی تھی مجھ پر۔ بڑا شاندار وقت دیکھا ہے ہم نے۔ یہ تو پرتاب سنگھ کی وجہ سے سب

کمپیٹ ہو گیا۔" اس نے حسرت سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا پھر تیزی سے بولا، "دیکھو جگو، میں نے ریتو کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ اسے ایک شاندار زندگی کی سہولیات دوں گا، یہ وعدہ پورا کر دینا۔ مجھے تم سے اور کچھ نہیں چاہئے۔"

"ہو گیا سمجھو" اس نے کہا تو ہم میں خاموشی چھا گئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے سے زیادہ اوپر چڑھتے ہوئے ہم ایک ایسی جگہ آ گئے جہاں گھاس پھونس کی جھونپڑیاں بنی ہوئیں تھیں۔ کئی جگہ پر لکڑیاں جلا کر الاؤ لگایا گیا ہوا تھا۔ کوئی الاؤ جل رہا تھا کوئی بجھ گیا تھا۔ اس کے اردگرد گیروے رنگ کے کپڑے پہنے کئی سادھو لمبے لیٹے ہوئے تھے، کوئی بیٹھے تھے اور کوئی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ کئی سارے گیروے رنگ کے تکونے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ جگو دادا ان کے درمیان میں سے چلتا ہوا ایک غار کے دہانے کے سامنے جا رکا۔ باہر دو سادھو بیٹھے ہوئے تھے۔ غور سے دیکھنے پر ہی سمجھ میں آتا تھا کہ وہ سیکورٹی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے غور سے جگو دادا کو دیکھا، پھر بولا۔

"ماتا جی اندر ہی ہیں، جاؤ۔"

"اسے پتہ تھا کہ ہم آ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے فون کیا تھا۔"

ہم اندر چلے گئے۔ وہاں ایک کونے میں کئی سارے دیئے روشن تھے۔ میرے سامنے ایک ادھیڑ عمر عورت دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کا سر گنجا تھا۔ جس پر اس نے ایک دھجی اوڑھی ہوئی تھی۔ اوپری بدن پر ایک بڑی سی چادر ڈالی ہوئی تھی جس میں اس کے موٹے موٹے بازو کاندھوں سمیت ننگے تھے۔ اس کی کمر سے لے کر بغلیں تک دکھائی دے رہی

تھیں۔اس کا بھاری سینہ بڑھے ہوئے پیٹ کے اوپر یوں پڑا تھا جیسے یہ پیٹ بڑھا ہی بھاری سینے کو سنبھالنے کے لئے ہے۔گول چہرے والی،جس پر موٹے نین نقش تھے ہماری جانب بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔

"آؤ جگدیش بیٹھو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔وہاں گھاس پھونس ہی تھی، ہم وہاں پر بیٹھ گئے۔وہ میری جانب دیکھ رہی تھی۔کچھ دیر بعد بولی۔

"یہی ہے وہ،جس نے پرتاپ سنگھ کو زمین سے لگا دیا؟"

"ہاں یہی ہے۔" جگو نے ہولے سے کہا۔

"اب وہ ہے..؟"اس نے ہولے سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے ہنکارا بھرنے کے سے انداز میں کہا تو وہ ایک دم سے خوش ہو گئی،پھر خوشگوار لہجے میں بولی:

"چل اچھا ہوا سالے نے مال بڑا مہنگا کر دیا تھا۔اب تو عام ملے گا نا۔"

"تیرے لئے تو جتنا چاہئے ملے گا،مفت ملے گا۔" جگو نے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔پھر اپنے سامنے پڑی ہوئی مٹی کی سلفی اٹھا کر اس میں آگ لگائی تو غار چرس کے دھوئیں سے بھر گئی۔اس نے دونوں ہاتھ کو جوڑ کر سلفی پکڑی،پھر ایک طویل کش لے دھواں چھوڑ کر بولی۔

"کیا چاہتا ہے؟"

"جے پور،وہاں کوئی محفوظ ترین ٹھکانہ۔" جگو نے کہا۔

"ہو جائے گا۔" اس نے کہا۔

"چل پھر میں چلتا ہوں۔" جگو نے اٹھتے ہوئے کہا پھر میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور باہر نکلتا چلا گیا۔

سادھومائی نے سلفی میں سے ایک کش لیا اور میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"پیئے گا؟"

"نہیں، میں نہیں پیتا۔" میں نے سکون سے کہا۔

"چل پھر، ایسا کر وہ کونے میں دو چادریں پڑی ہیں، ایک باندھ لے اور دوسری اوپر لے لے اور آجا میرے پاس، یہاں آکر سکون سے سوجا۔"

میں اٹھا اور میں نے کونے میں پڑی کافی ساری چادروں میں سے دو چادریں لیں وہیں ایک باندھ لی دوسری میں نے اوپر لے لی۔ میرے پاس پسٹل، میگزین اور سیل فون ہی تھا۔ وہ میں نے نیفے میں رکھ لئے۔ میرے کپڑے وہیں پڑے تھے۔

"اپنے ان کپڑوں کو چادروں کے پیچھے کر دو۔" سادھومائی نے کہا تو میں نے ویسا ہی کر دیا۔ پھر اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ ایک جانب لٹا لیا۔ پھر وہ سلفی پیتی رہی اور مجھے نجانے کب نیند آگئی۔

میری آنکھ کھلی تو غار میں ملگجا اندھیرا تھا۔ مگر دہانے پر مجھے لگا جیسے پورا دن ہی گزر گیا ہو۔ میں یہی سوچتے ہوئے اٹھ بیٹھا کہ پتہ نہیں سادھومائی کہاں ہو گی۔ میں کچھ دیر بیٹھا رہا پھر اٹھ کر باہر جانے لگا تو دہانے پر دو سادھو بیٹھے ہوئے دکھائی دیے۔ ان دونوں نے اپنے بدن پر بھوبھل (راکھ) ملی ہوئی تھی۔ گلے میں کینٹھے اور مالائیں تھیں۔ وہ یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے کسی مزار کے باہر مجاور بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک کی مجھ پر نگاہ پڑی تو اس نے فوراً اٹھ کر مجھ سے کہا۔

"آؤ آگے آجاؤ۔"

میں اس کے پاس چلا گیا تو اس نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھو سامنے، وہ آبشار ہے نا، وہاں جا کر نہا دھو آؤ۔"

"لیکن تم لوگوں نے یہ بھوجل لی ہوئی ہے؟" میں نے دھیمے سے پوچھا۔

"ہمیں چھوڑو، تم جاؤ۔" اس نے کہا تو میں سر ہلاتا ہوا چل دیا۔

تھوڑی سی مشقت کے بعد میں آبشار تک پہنچ گیا۔ وہاں سے کوئی اتنا زیادہ پانی نہیں آتا تھا۔ ایک نالا سا تھا، جس میں سے پانی نجانے کہاں سے گرتا تھا۔ وہ پانی ٹھنڈا اور شفاف تھا۔ میں نے اوپری چادر میں پسٹل، میگزین اور سیل فون اکٹھا کر کے رکھا اور دھوتی باندھے نہانے لگا۔ میں پوری طرح فریش ہو چکا تھا۔ میں نے گیلی چادر ہاتھوں میں لی اور خشک چادر باندھ کر واپس اسی غار میں آ گیا۔ میں نے گیلی چادر کو باہر ہی پھیلا دیا، اندر آ کر ایک مزید خشک چادر لے لی۔ میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ایک سادھو پتل کے بڑے سے تھال میں میرے لئے کھانا لے کر آ گیا۔

وہ کھانا بھی عجیب تھا۔ اس میں ایک جانب سالن پڑا ہوا تھا تو دوسری جانب مٹھائی کے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے۔ کہیں حلوہ تھا، تو کہیں پاپڑیاں اور پھل رکھے ہوئے تھے وہ ایک یادگار کھانا تھا، جس کا لطف آ گیا۔ میں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ کچھ دیر بعد وہی سادھو واپس آیا تو اس نے ایک سیاہ رنگ کی مالا میرے گلے میں پہنا دی۔ تبھی میں نے پوچھا۔

"سادھو مائی کہاں ہیں؟"

"وہ اپنے استھان پر ہیں۔" اس نے کہا اور پتل کا تھال اٹھا کر چلا گیا۔ میں کچھ دیر تک وہیں پڑا رہا پھر اٹھ کر غار سے باہر آ گیا۔ وہ دونوں سادھو اب بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں آگے بڑھ گیا۔ باہر کا ماحول بہت اچھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہر طرف سادھوؤں کی ٹولیاں بیٹھی ہوئیں تھیں۔ ایک اونچی سی جگہ پر سادھو

مائی برا جمان تھی۔ وہ اس وقت بدن پر بھبھوت ملے ہوئے ایک چٹائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ماتھے پر بڑا سا قشقہ تھا۔ اس نے اپنے سامنے ترشول گاڑا ہوا تھا۔ جس کے ساتھ ایک ڈمرو بندھا ہوا تھا۔ وہ خود کو شیو کا پجاری ظاہر کر رہی تھی۔ اس کے ارد گرد کئی سارے درشنک بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک کو اپنے پاس بلاتی جاتی، ان پر جنتر منتر پڑھتی، مور پنکھ ان پر پھیرتی اور چیخ چیخ کر انہیں آشیر واد دے رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ سب ڈرامہ ہے لیکن لوگوں کا اس پر اعتقاد تھا تو اتنی دور شہر سے باہر آتے تھے۔ ہو سکتا ہے دوسرے شہروں سے بھی چل کر آتے ہوں۔ اس کا کاروبار تھا چل رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر یہ تماشا دیکھتا رہا پھر ایک ویرانے کی جانب بڑھ گیا۔

وہ پہاڑی کا ایک کنارا تھا، جس کے آگے کافی سارا نشیب تھا۔ ارد گرد درخت اُگے ہوئے تھے۔ راجستھان کے ساتھ ہی صحرا کا تصور ابھرتا ہے، جبکہ یہ علاقہ بھی راجستھان ہی میں پڑتا تھا۔ لیکن یہ جنوب کی طرف آخری سرے پر تھا۔ یہیں سے پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں کہاں موجود تھا، ہو سکتا تھا کہ یہ وہی علاقہ ہو جہاں قید خانہ تھا۔ اس وقت میرا من چاہ رہا تھا کہ میں رجو کو فون کروں۔ میں اس کا حال جاننا چاہ رہا تھا لیکن ایک بار اسے فون کر لیا اور اس پر کوئی افتاد ہوئی تو میں سب کچھ چھوڑ کر اس کی مدد کے لئے جانے پر مجبور ہو جاتا۔ میں نے اُسے ایک دم سے نظر انداز کر دیا۔ میں نے فون نکالا اور چاچا عبدالمجید کو فون کر دیا۔ رابطہ ہو جاتے ہی میں نے اسے اپنی لوکیشن بتائی اور پھر نا گیشور کے بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا۔

"مجھے تھوڑا وقت دو، میں اس کے بارے معلومات تمہیں دیتا ہوں۔"

"اب مجھے یہ نہیں معلوم کہ میں کب تک جے پور پہنچتا ہوں۔" میں نے بتایا تو انہوں نے کہا۔

"تم اپنے بارے میں بتا دینا، میں دیکھ لوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی الوداعی باتوں کے بعد کال ختم ہو گئی۔ میں کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔

شام ڈھل رہی تھی جب میں دوبارہ غار کی جانب آ گیا۔ سادھو مائی واپس غار میں آ چکی تھی۔ اس کے سیوک اسے دبا رہے تھے۔ وہ یوں لیٹی ہوئی تھی جیسے بہت تھک گئی ہو۔ اس نے میری جانب اتنی توجہ نہیں کی۔ میں کونے میں لگ کر بیٹھا رہا۔ ایک سیوک نے غار کے کونے میں دیئے روشن کر دیئے تھے۔ سیوکوں کے دبانے کا عمل اس وقت تک رہا جب تک بھوجن نہیں آ گیا۔ سادھو مائی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہمارے پاس دو تھالیاں آئی تھیں، ایک انہوں نے میرے سامنے رکھ دی اور ایک سادھو مائی کے سامنے۔ اس میں وہی کچھ تھا جو شام کے وقت مجھے دیا گیا تھا۔

سادھو مائی نے پیٹ بھر کر کھایا۔ اس دوران اس نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ کھا چکی تو ایک سیوک نے سلفی میں کالی ساری چرس رکھی اور سادھو مائی کی جانب بڑھا دی۔ اس نے وہ سلفی پکڑی، اسے آگ دکھائی اور پھر گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے میری جانب دیکھ کر بولی۔

"تم باہر آئے تو دور دور رہے، میرے پاس کیوں نہیں آئے۔"

"یہی ڈر تھا کہ کہیں درشکوں میں کوئی ایسا ویسا بندہ نہ ہو جس کی وجہ سے میں پہچان لیا جاؤں اور کوئی نئی مصیبت نہ پڑ جائے۔" میں نے دھیمے سے انداز میں کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے، محتاط رہنا اچھا ہوتا ہے۔"

"لوگ وہاں تھے بھی تو بہت۔" میں نے یونہی بات بڑھائی۔

"ہاں، بہت آتے ہیں، بڑے مسئلے ہیں لوگوں کے۔" اس نے آنکھیں بند کیے بڑے سرور میں کہا۔

"ان کے مسئلے حل ہوتے ہوں گے تو لوگ آتے ہیں۔" میں نے جان بوجھ کر کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی، پھر بولی۔

"او ظالم، اتنے ان کے مسئلے ہوتے نہیں جتنے ہم پیدا کر دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک کش لیا پھر گہری سنجیدگی سے بولی "اس عوام پر نا، خوف طاری ہے۔ ہر طرح کا خوف۔ ہر بندہ نجانے کتنا خوف اٹھائے پھرتا ہے۔ اس خوف کا اتنا بوجھ ہے کہ اسے سمجھ ہی نہیں آتا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ وہ ہمارے پاس آتا ہے کہ اس کا خوف ختم ہو جائے۔ لیکن ہم اسے مزید خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہی خوف ان سے مال نکلواتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں، جب ان پر خوف زیادہ طاری ہو گیا تو......" میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

"اچھا بھلا بندہ جب یہ کہے گا کہ مجھ پر جادو ہو گیا ہے تو ہم نے اس کا جادو ختم کرنا ہے نا، جادو کے خاتمے کے لئے جاپ تو ہمیں ہی کرنا ہے۔ ہم اسے یہی خوف دیں گے کہ اگر اس دوران ہماری موت ہو گئی، یا تمہاری موت ہو گئی تو پھر......؟ بس پھر یہیں سے بات بنتی ہے۔ وہ جادو ختم کرانے کے چکر میں مال ہمارے سامنے ڈھیر کر دیتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد اس کے دماغ سے یہ بات نکال دی جاتی ہے کہ اس پر جادو تھا۔ اسے یقین دلا دیا جاتا ہے کہ اس پر جادو ختم ہو گیا ہے۔" اس نے کہا اور سلفی سے مزید گہرا کش لے کر سلفی کو جھاڑ دیا۔ اس پر نشہ طاری ہو چکا تھا۔ مجھے ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ اس کا بزنس سیکرٹ کیا ہے۔ میں نے اپنے مطلب کی بات پوچھی۔

"میں جے پور کب تک جا پاؤں گا؟"

"چلیں جائیں گے جلدی کا ہے کی ہے، تم سو جاؤ۔" اس نے کہا تو میں دیوار کے ساتھ لگ کر لیٹ گیا۔

میں کافی دیر تک لیٹا رہا، مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ جبکہ سادھو مائی خراٹے لے رہی تھی۔ میں لیٹے لیٹے تھک گیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اٹھ کر باہر چلا جاؤں۔ وہیں کسی کھلی فضا میں سانس لوں۔ مگر میں خود پر جبر کئے پڑا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت سادھو مائی کی خوشنودی بہت ضروری ہے، ورنہ میں بہت ساری مشکلات میں آ سکتا تھا۔ شاید وہ یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ میں کس حد تک اس کی بات مانتا ہوں۔ یہی سوچتے ہوئے میری کب آنکھ لگ گئی۔

کوئی شور تھا جس کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، سادھو مائی اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ پتہ نہیں باہر گیا تھا، جبکہ شور باہر ہی سے آ رہا تھا۔ میں نے جب غور کیا تو وہ سنکھ بجنے کی آوازیں تھیں۔ سادھو مائی کے سیوک صبح ہو جانے پر سنکھ بجا رہے تھے۔ میں پھر سے لیٹ گیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد سادھو مائی اندر آئی تو اس نے مجھے جاگتا ہوا پا کر بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"تیار ہو جاؤ، تھوڑی دیر بعد ہم جے پور کے لئے نکلیں گے۔"

"جی بہتر......" میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور اٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب غار کے باہر شور بڑھنے لگا تو سادھو مائی اٹھ کر باہر کی جانب چل دی۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ باہر سادھوں مائی کے بہت سارے سیوک موجود تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تکونے گیروے رنگ کے جھنڈے تھے، کچھ ڈھول اور سنکھ بجا رہے تھے۔ سادھو مائی کے سیوکوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ ان کے جلو میں چلنے لگی۔ یونہی شور میں چلتے ہوئے ہم نیچے سڑک تک آ گئے۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ سڑک پر ایک بس کھڑی تھی۔

آدھے سے زیادہ سیوک بس میں سوار ہو گئے۔ میں سادھو مائی کے ساتھ ہی بس میں سوار ہو گیا تھا۔ چند سیوک باقی بچے جو پیچھے ہی کھڑے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد بس چل دی۔

☆......☆....☆

تقریباً پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد جے پور شہر کی آبادی شروع ہو گئی۔ میں سیوکوں کے ساتھ پچھلی سیٹوں پر بیٹھا خاموشی سے سفر کرتا رہا تھا۔ رستے میں کہیں بھی کسی نے اس بس کو چیک نہیں کیا۔ کہیں پر کوئی ناکہ تھا بھی تو سادھوؤں کی بس دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ بس شہر کے اندر ایک بڑی ساری عمارت کے سامنے جارکی۔ بڑا سارا آہنی گیٹ کھل گیا تھا تو بس اس گیٹ میں داخل ہو گئی۔ سارے سیوک بیٹھے رہے جب تک سادھو مائی نہیں اتر گئی۔ اس کے بعد ہم بھی اتر گئے۔ ہم سب سادھو مائی کے پیچھے پیچھے اندر چلے گئے۔ میں نے بس سے اتر کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ بڑے بڑے سبز لان کے درمیان سڑک تھی۔ سڑک سے آگے پرانی طرز کی دومنزلہ عمارت تھی۔ پورچ کے بعد دائیں بائیں ستونوں کے پیچھے برآمدہ دکھائی دے رہا تھا۔ کافی دور تک چاردیواری تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یا تو یہ عمارت کسی راجہ مہاراجہ کی چھوڑی ہوئی ہے یا پھر کسی انگریز کی چھوڑی ہوئی جائیداد پر قبضہ کیا ہوا ہے۔

سادھو مائی اندر جا چکی تھی۔ بہت سارے سادھو سر جھکائے عمارت کی پچھلی جانب جا چکے تھے۔ میرے ساتھ وہی دو سادھو کھڑے تھے جو غار کے باہر مجاوروں کی مانند موجود رہتے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور پچھلی جانب چل دیئے۔ وہاں کافی سارے کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلے گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ سامنے فرش پر میٹرس لگا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''پدھاریں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر بولا،

”کوئی سیوا ہو تو یہ بٹن دبادیں۔ کوئی نہ کوئی آجائے گی۔“

”دھن واد۔“ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا تو وہ کسی مشینی انداز میں واپس پلٹ گیا۔ میں نے سکون کا ایک طویل سانس لیا اور وہیں لیٹ گیا۔

سہ پہر تک میں لیٹ لیٹ کر تھک چکا تھا۔ میں نہا چکا تھا۔ کمرے کی الماری میں پڑی صاف دھلی ہوئی دو چادریں نکال کر باندھ چکا تھا۔ مجھے اس ماحول سے وحشت ہونے لگی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں قید ہو کر رہ گیا ہوں۔ ایسے میں دروازے پر دستک ہوئی، وہی ادھیڑ عمر سادھو اندر آ گیا، اس نے مجھے نمسکار کیا اور پھر بڑے رسان سے بولا۔

”ماتا جی یاد کر رہی ہیں آپ کو۔“

”چلو۔“ میں نے کہا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔

عمارت کے اندر کا ماحول بڑا خاموش تھا۔ ایک راہداری سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا، ہال میں کافی ساری مختلف عمر کی عورتیں ایک ترتیب میں بیٹھی ہوئیں تھیں۔ انہوں نے گیروے رنگ کی وہی دو چادریں پہنی ہوئیں تھیں۔ چند عورتوں کے سر پر بال نہیں تھے۔ زیادہ تر کے بال تھے۔ وہ سادھو مجھے ایک کمرے کے سامنے پہنچا کر واپس پلٹ گیا۔

سادھو مائی کمرے میں میز پر اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کافی فریش دکھائی دے رہی تھی۔ شاید نہا دھو کر بیٹھی تھی۔ میں اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو اس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کیسا لگ رہا ہے؟“

”وحشت ہو رہی ہے۔“ میں نے صاف کہہ دیا۔

”وہ کیوں؟“ اس نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے لگ رہا ہے جیسے میرے ہاتھ پاؤں بندھ گئے ہیں اور میں بے کار پڑا ہوں۔"

"ارے چار دن یہاں سکون سے گزار لے، پھر ایسی موج تمہیں کہاں سے ملے گی، کہیں میرا یار مجھے یہ نہ کہے کہ اس کے دوست کی سیوا نہیں کی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"یہ آشرم ہے، میں نے تمہیں بتایا، مجھ سے پہلے ایک سادھو نے بنایا تھا، بہت اچھا بندہ تھا، میں اسکے بہت قریب ہو گئی، بس پھر وہ بے چارہ مر گیا، اس کی جگہ میں آ بیٹھی۔" اس نے کہا تو میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"اور اگر تم مر جاؤ تو تمہاری جگہ کوئی آ کر بیٹھ جائے گا۔"

"بالکل، مجھے یہ بھی یقین ہے کئی میرے مرنے کی تمنا لئے پھر رہے ہوں گے، یا ان عورتوں میں کئی اپنے آپ کو میری جگہ دیکھ رہی ہوں گی۔" اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جب یہاں اتنا بڑا سیٹ اپ ہے تو پھر وہ ویران پہاڑی......؟" میں نے تجسس سے پوچھا تو وہ مسکرا کر بولی۔

"ارے یہاں کہاں اتنا مال ملتا ہے۔ یہاں کے مال سے تو یہاں کا خرچ پورا نہیں ہوتا۔ وہ پہاڑی کوئی ایک ٹھکانہ نہیں ہے۔ بہت ساری جگہیں ہیں، جہاں میں جاتی ہوں۔ مال تو وہاں سے اکٹھا ہوتا ہے۔ کئی دھندے چلتے ہیں وہاں پر۔"

"اچھا وہ تو سب ٹھیک ہے، اب مجھے اجازت دو، میں نکلتا ہوں یہاں سے۔" میں نے پرسکون انداز میں کہا۔

"پر تو جائے گا کہاں؟" اس نے پوچھا۔

"کہیں بھی، جہاں سانپ وہاں جوگی۔" میں نے گول مول بات کی تو وہ ہنستے ہوئے بولی

"ایسے بات مت کر بچوا۔ جوگی ایسے ہی جے پور میں نہیں آیا۔ مجھے بول، تجھے اسی خاص بندے تک پہنچا دوں گی۔"

"اگر وہ تیرا دوست ہوا، بہت طاقتور ہوا تب بھی؟" میں نے پوچھا تو اس نے ایک طویل سانس لی پھر دکھی لہجے میں بولی۔

"اس دنیا میں کوئی دوست کوئی دشمن نہیں ہوتا، بس مفاد ہوتا ہے۔ جس سے فائدہ مل گیا وہ دوست جس سے نہیں ملا وہ دشمن۔"

"ہاں یہ تو ہے، لیکن کچھ باتیں فائدے نقصان سے بھی بڑھ کر ہوتی ہیں۔" میں نے پرسکون انداز میں کہا تو میری جانب دیکھ کر بولی۔

"فائدہ کسی نہ کسی کا ہو رہا ہوتا، کوئی بھی شعبہ ہو، چاہے وہ جرم کی دنیا ہو، ٹھگی چوری چکاری فراڈ جو بھی ہو، حتیٰ کہ یہ میرا کام بھی، جہاں جتنی کامیابی ہوتی ہے، وہاں اتنے ہی حاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ یا تو ان کی جگہ لینا چاہتے ہیں، یا پھر اسے ختم کر دینے کے درپے ہوتے ہیں۔ تو بتا، میں اس کے مخالف بندے کے پاس تجھے پہنچا دوں گی۔"

"ابھی مجھے کوئی پتہ نہیں۔" میں نے مترنم لہجے میں کہا۔

"تو پھر تب تک یہیں پڑا رہ۔ جب جہاں جانا ہو مجھے بتا دینا۔" اس نے سکون سے کہا۔

"نہیں، تمہارے ہاں سکون ہے جو مجھے بالکل پسند نہیں، مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں یہاں رہا تو جم جاؤں گا۔" میں نے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ پھر بولی۔

"میں سمجھ گئی ہوں۔ آج رات ہی تجھے بھیج دوں گی۔"

"دھنے واد......" میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو اس نے مجھے جانے کا اشارہ کر دیا۔

میں اٹھا اور باہر آ گیا۔

میں واپس کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ مجھے جے پور کے بارے میں بالکل پتہ نہیں تھا۔ مجھے یہاں کسی نہ کسی کی مدد درکار تھی۔ سادھو مائی نے کوئی نئی بات نہیں کی تھی کہ جس بندے تک میں نے پہنچنا تھا، اس کے کسی مخالف کے پاس ہی مجھے ہونا چاہیے تھا۔ ایسا شروع سے چلتا آ رہا تھا۔ دشمن جب بھی وار کرتا ہے، ایسے ہی کرتا ہے۔ وہ پہلے معاشرے کے ناراض لوگوں کو ہی اپنے حصار میں لیتا ہے اور پھر ان کے سہارے انتشار پیدا کرتا ہے۔ میں انہیں سوچوں میں گم تھا کہ چاچا عبدالمجید کا فون آ گیا۔

''میں تو چاہتا تھا کہ تم واپس آ جاتے تمہارا مشن مکمل ہو گیا تھا لیکن اب تم اصرار کر رہے ہو تو سنو۔ تمہیں ناگیشور کے بارے میں غلط بتایا گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ انڈر ورلڈ مافیا سے جڑا ہوا ہے۔ لیکن اس کا کلیان جی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تو پھر یہاں پر کون ہے جس نے......؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ درست ہے کہ وہ شخص یہیں اسی شہر میں رہتا ہے جو کلیان جی بھی ہے اور ریاست کا ایجنٹ بھی۔ پوری کوشش کے بعد بھی ابھی تک اس شخص کا حتمی نام سامنے نہیں آ سکا ہے جس کے بارے میں یقین سے کہا جا سکے۔'' چاچا عبدالمجید نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تجھے ایک نمبر بھیجتا ہوں۔ اس پر کال کرو۔ وہ سب تمہیں سمجھا دے گا۔ وہ وہاں پہ ہمارا سب سے بااعتماد ویلپر سیل ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''اوکے۔'' میں نے کہا اور پھر کال ختم ہو گئی۔

شام ہو گئی تھی۔ میں آشرم کے پورچ میں تھا۔ میرے تن پر وہی دو گیروے رنگ کی چادریں تھیں۔ میرے ساتھ ایک اور سادھو کھڑا تھا۔ ایسے میں ایک کار کمرے کے سامنے

آ رکی۔ ہم دونوں اس میں بیٹھے تو کار چل دی۔ کچھ دیر سفر کرتے رہنے کے بعد وہ ایک پوش علاقے میں آ گیا۔ وہاں ایک گھر کے سامنے کار رُک گئی۔ کچھ دیر بعد گیٹ کھلا اور ہم کار سمیت اندر چلے گئے۔

ہم کار سے اتر کر اندر چلے گئے۔ وہ جدید قسم کا سیلون تھا۔ وہاں کئی لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ ایک نوجوان کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہم سب سے ہاتھ ملایا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

”ویلکم، آ ئیں۔“

وہ ہمیں لیتا ہوا ایک کمرے میں آ گیا۔ سادھو اور ڈرائیور ایک جانب بیٹھ گئے۔ تب اس نوجوان نے کہا۔

”آئیں سب سے پہلے میں آپ کا حلیہ ٹھیک کرتا ہوں۔“

میں آئینے کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تو خود ہی کو پہچان نہیں پایا۔ وہ میرا حلیہ بدلنے لگا۔

میرے بدن پر جدید تراش کا مہنگا سوٹ تھا۔ مہنگا جوتا، ایک ہاتھ میں گھڑی اور دوسرے میں بریسلیٹ تھا۔ یہ سب سادھو مائی کی طرف سے تھا۔ میں اپنا پسٹل، میگزین اور سیل فون سنبھال چکا تھا۔ میں جب تک تیار ہوا، سادھو اور ڈرائیور وہاں سے جا چکے تھے۔ میں نے وہیں سے اس نمبر پر کال کی جو چاچا عبدالمجید نے مجھے بھیجا تھا۔ وہ میرے ہی انتظار میں تھا۔ اس نے مجھے سمجھا دیا کہ میں اس تک کیسے پہنچ سکتا ہوں۔

وہ ایک چھوٹی سی گلی تھی جو اوپر کی طرف اٹھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے ایک طرف مکان تھے اور دوسری طرف ڈھلوان تھی جس کی نشاندہی ایک لوہے کا جنگلا لگا کر کی گئی تھی۔ اس نے

اپنے مکان کی جو نشانی بتائی تھی، وہ پوری گلی میں ایک ہی تھا، جس کے آگے سیڑھیاں تھیں۔ وہ گلی کے بالکل آخر میں تھا۔ میں نے ٹیکسی کو وہیں رکوا دیا۔ میں نے اسے ادائیگی کی تو وہ آگے بڑھ گیا۔ میں نے ایک طویل سانس لیا اور اس مکان پر نگاہ ڈالی۔ میں نے چند قدم بھرے اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا دروازے تک آن پہنچا۔ دستک کے جواب میں تھوڑی دیر بعد ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کا قد لمبا تھا، گٹھا ہوا بدن، اس نے ٹی شرٹ اور شارٹس پہنے ہوئے تھے۔ سر کے بال کھچڑی اور کلین شیو تھا۔ اس نے گہری نگاہ سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔

"مجھے شریدھر سے ملنا ہے، ابھی ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔"

"میں ہی ہوں، تم ویر سنگھ ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، میں ویر سنگھ ہوں۔" میں نے کہا تو اس نے پھر سے مجھے گہری نگاہ سے دیکھا اور اندر جانے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

چھوٹے سے لاؤنج میں بڑے بڑے صوفے دھرے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کچن کی جانب بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سوڈے کی بوتل تھی۔ اس نے میرے سامنے رکھی اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں کبھی کبھی یہاں اکیلے رہنے کے لئے آتا ہوں۔ میری فیملی یہاں نہیں ہے، وہ مستقل لندن میں رہتے ہیں۔ تم اگر یہاں رہنا چاہو تو بڑے آرام سے یہاں رہ سکتے ہو۔"

"مجھے یہاں رہنا نہیں، کام ختم کرتے ہی چلے جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"جس کام کے لئے تم یہاں آئے ہو نا، وہ کام ملے گا تو کرو گے نا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا، پھر لمحہ بھر رک کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "خیر، تم یہ سوڈا انجوائے کرو، میں تیار ہو کر آتا ہوں، ڈنر باہر ہی کریں گے۔"

وہ تیار ہو کر آ گیا۔ اس نے بھی بہترین تراش کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہم باہر گلی میں آ گئے۔ اس نے ساتھ والے گھر کا گیٹ کھولا جہاں ایک قیمتی کار کھڑی تھی۔ اس نے وہ نکالی، گیٹ کو تالا لگایا اور مجھے ساتھ میں بٹھا کر چل دیا۔ وہ مجھے اس شہر کے بارے میں بتانے لگا۔ یہ ایسے ہی معلومات تھیں جیسے کسی ٹورسٹ کو دی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ایک مہنگے ریستوران میں آ گئے۔ اس نے ہال میں بیٹھنا پسند نہیں کیا بلکہ اس کے عقب میں ایک بڑے سارے سبزہ زار میں کرسیاں اور میز لگے ہوئے تھے۔ ہر طرف بڑی رنگینی تھی۔ وہاں سجاوٹ کا خاص اہتمام کیا ہوا تھا۔ ایک ملگجی سی روشنی والے گوشے میں چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم ان پر جا بیٹھے۔ اس نے بیٹھتے ہی کہا۔

"دنیا بھر میں جہاں بھی کوئی مافیا یا انڈر ورلڈ کام کرتا ہے نا، اس کا مقصد صرف اور صرف فائدہ ہے۔ وہاں انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اگر تم کسی کے لئے گولی اٹھائے پھرتے ہو نا تو ایک گولی تمہارے لئے بھی کوئی لئے پھرتا ہے۔ وہی کامیاب ہے جس نے پہلے گولی چلا دی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"جدید ٹیکنالوجی نے ان مافیاز اور انڈر ورلڈ کو مزید مضبوط کر دیا ہوا ہے۔ یہ اس سے زیادہ کام لے رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"اسی وجہ سے ان کی جڑیں زیادہ پھیل رہی ہیں۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ میری بات نظر انداز کرتا ہوا بولا۔

"ہر شہر کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اسی طرح وہاں پر کام کرنے کے لئے طریقہ بھی تھوڑا مختلف ہوتا ہے۔ تم آج آئے ہو، کل چلے جاؤ گے یا ممکن کہیں کوئی تمہاری لاش اٹھا کر ٹھکانے لگا

دے گا۔ ہم لمبا کھیل کھیلتے ہیں۔"

"کیسا لمبا کھیل......؟" میں نے پوچھا۔

"اس شہر میں بساط بچھی ہوئی ہے۔ کھیلنے والے کئی شاطر ہیں۔ جو اپنے مہرے بناتے ہیں، ان کے ذریعے چال چلتے ہیں۔ یہ ہر شاطر پر منحصر ہے کہ وہ اپنے مہرے کیسے بناتا ہے۔" اس نے کہا تو یوں لگا جیسے میں کسی پاگل کے پاس بیٹھا ہوا ہوں اور وہ صرف باتیں کرتا جاتا ہے۔ اگر چاچا عبدالمجید نے اس سے ملنے کے لئے نہ کہا ہوتا تو میں اس کے بارے میں کوئی دوسرا فیصلہ کر چکا ہوتا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے کہا، "خیر، ایک دو دن میں تمہارے کام کا پتہ چل جائے گا۔ پھر تم جو چاہو گے وہی ہوگا۔ لیکن آج میں تمہیں اپنے ہی گھڑے ہوئے ایک مہرے سے ملوانا چاہتا ہوں۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے یونہی بات بڑھانے کے پوچھا تو وہ کہتا چلا گیا۔

"ایک برس پہلے اس کا باپ قتل ہو گیا تھا۔ وہ بڑا بے ضرر آدمی تھا بس اپنے بزنس سے اسے غرض تھی۔ وہ اس شہر میں گولڈ کا بہت بڑا بیوپاری تھا۔ اس لڑکے نے وراثت میں ایک بڑا مضبوط بزنس پایا۔ اس نے خود کو اجاڑا نہیں، بلکہ نئے سرے سے اپنا گولڈ کا بزنس شروع کیا، ساتھ میں منی ایکس چینج اور اب ہوٹل انڈسٹری میں قدم رکھنے جا رہا ہے۔"

"تم نے اسے اپنا مہرہ......" میں نے کہنا چاہا مگر وہ میری بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"وہ اپنے باپ کے قاتلوں کی تلاش میں تھا، ہم نے اس کے باپ کا قاتل ڈھونڈ دیا۔ قاتل خود اس شہر کا بڑا بزنس مین ہے۔ یہی گولڈ اور ہوٹلنگ میں اس کی ساکھ ہے۔ یہ لڑکا شیو نرائن اب اس کے مقابلے میں آ گیا ہے۔ خود کیا آیا ہے ہم اسے لے آئے ہیں۔ جہاں تک مجھے شک ہے، شیو نرائن کے باپ کا قاتل وہ بزنس مین ہی تمہارا مطلوبہ شخص ہو سکتا ہے۔"

"تاکیشیور......؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، وہ نہیں ہے، وہ تو بہت چھوٹا سا ڈرگ ڈیلر ہے۔ جس نے بھی تمہیں اس کی راہ پر ڈالا ہے، اس نے جھوٹ بولا ہے۔ وہ اتنا بڑا کام نہیں کر سکتا۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"وہ قاتل بزنس مین کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صرف دو گھنٹے، یہاں جو ہم بیٹھے ہیں، تو صرف اسی لئے۔ شام تک جو معلومات ملی تھیں، وہ میں نے تمہیں بتا دیں۔ اب بس تصدیق باقی ہے۔ ہمارے یہاں بیٹھے ہی کنفرم ہو جائے گا تو میں تمہیں شیو نرائن سے ملوا دوں گا، پھر تم جتنی جلدی چاہو، اپنا کام ختم کر سکتے ہو۔" اس نے کہا تو مجھے اس کے بارے میں اپنی رائے بدلنی پڑی۔

وہاں کی مقامی ڈشز میں وہی بڑا مصالحہ دار چٹ پٹا کھانا تھا۔ کھانے کے دوران وہ پھر سے شہر کے بارے میں بتاتا رہا اور میں سنتا رہا۔ اس دوران اس نے اپنا فون اپنے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ڈنر کے بعد ہم بل کے انتظار میں تھے کہ اس کے سیل فون کی اسکرین روشن ہو گئی۔ کوئی میسج آیا تھا۔ اس نے سکون سے وہ میسج دیکھا اور پھر بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"میرا شک درست نکلا، وہی ہے ستیہ رام......"

"یہ وہی ہے قاتل؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں وہی ہے، اس نے شہر کی سیاست اور بزنس پر پوری گرفت کی ہوئی ہے۔ مجھے شک تو تھا کہ یہ کسی انڈر ورلڈ کے بغیر نہیں چل سکتا، مگر آج پتہ چل گیا کہ یہ خود مافیا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"پھر شیو نرائن، اس کے سامنے کس طرح ٹھہرا ہوا ہے؟" میں نے ایک نئے پہلو سے

بات کرنا چاہی۔

"وہ اب ستیہ رام کے مخالفین میں سے ہے لیکن ابھی کچھ بھی نہیں کر پا رہا ہے۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

وہ خاموش ہو گیا تھا۔ شاید اس پر سوچیں حاوی ہو گئی تھیں۔ اس نے تیزی سے خود میسج کیا، جس کا فوراً ہی جواب آ گیا۔ اس دوران بل آ گیا تو اس نے بل دیا، پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

"آؤ چلیں۔"

ہم دونوں چلتے ہوئے ریستوران سے باہر آ گئے۔ ہم پارکنگ تک گئے، وہاں سے کار لی اور پھر انجانی راہ پر چل نکلے۔ اس بار شریدھر خاموش تھا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہم واپس اسی گھر میں آ گئے۔

"کیا ہم نے شیو نرائن سے نہیں ملنا تھا؟" میں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پوچھا تو اس نے کہا۔

"میرا نہیں خیال اب اس سے ملنا ضروری ہے۔" میں خاموش ہو گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور ہم لاؤنج میں جا پہنچے۔ وہاں وہ چند منٹ کھڑا سوچتا رہا پھر بولا، "تم ایزی ہو جاؤ، پھر ہم بات کرتے ہیں۔ آؤ تمہیں کمرہ دکھاؤں۔"

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

کچھ دیر بعد ہم پھر سے لاؤنج میں آ بیٹھے تھے۔ ہمارے درمیان دو کافی کے مگ پڑے ہوئے تھے۔ وہ کافی پیے جا رہا تھا اور خاموش تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ کافی دیر بعد اس نے لب کھولے۔

"شیو نرائن پہلے ہی ستیہ رام کی نگاہوں میں ہے۔ جیسے ہی تم اس سے ملتے، تم بھی نگاہوں

میں آجاتے۔ ستیہ رام کا نیٹ ورک بہت تیز اور پھیلا ہوا ہے۔ بچو پھر تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔"

"لیکن کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہے نا۔" میں نے کہا۔

"مشکل یہ ہے میری جان کہ اتنا بڑا نیٹ ورک توڑنا، اس میں سے ستیہ رام تک پہنچنا کسی ایک بندے کا کام نہیں۔ اس کے لئے ایک طویل پلاننگ کی ضرورت ہے۔" اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"تو پھر کیا کرنا ہوگا؟" میں نے پوچھا

"کچھ بھی نہیں، کافی پیئو، اور اپنے کمرے میں جا کر سکون کرو۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ کوئی راہ تو نکلے گی۔" اس نے کہا اور مگ اٹھا کر ایک بڑا سا گھونٹ بھر لیا۔

☆......☆......☆

دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ میں اور شریدھر کافی دیر پہلے گھر سے نکلے تھے۔ ٹریفک بھی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ وہ بڑے سکون سے ڈرائیونگ کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کار کے اندر پرانے گانوں کی ہلکی ہلکی آواز پھیلی ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے راستے کو دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ کوئی بات نہیں کر رہا تھا اور میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ ایک کراس پر دائیں جانب مڑتے ہوئے اس نے گانے کی آواز کم کی اور بولا۔

"ہم جہاں پر جا رہے ہیں، وہ جگت پورہ کا علاقہ کہلاتا ہے۔ وہاں پر بنگلے ہیں۔ کوئی زمانہ تھا یہ جے پور کا سب سے پوش علاقہ مانا جاتا تھا، ویسے تو آج بھی ہے۔ وہاں میری ایک بہت پرانی جاننے والی رہتی ہے۔ ہم نے ایک دور اکٹھے گزرا ہے۔ سیدھی بات کہوں وہ ایک کال گرل تھی۔ چونکہ پڑھی لکھی تھی اس لئے بہت دیکھ بھال کر کسی کو اپنا گاہک بناتی تھی اور جب تک وہ اسے افورڈ کر سکتا، اس کے ساتھ رہتی۔"

"اب کیا کرتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہی دھندہ، چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے تو نہیں جاتا۔ دراصل اس کے بنگلے کے قریب ایک کالج ہے۔ وہاں بہتری لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں۔ اس نے اپنا بنگلہ ہاسٹل قسم کا بنایا ہوا ہے۔ وہ لڑکیاں پھنستی ہیں جو کسی نہ کسی طریقے سے یہ دھندہ کرتی ہیں لیکن بڑے اعلیٰ انداز میں، شہر کے خاص لوگوں کے لئے، باہر سے عیاشی کے لئے آئے لوگوں کے لئے۔" اس نے مزہ لیتے ہوئے بتایا تو میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تو ہم وہاں کیا لینے جا رہے ہیں؟"

"ہاں، یہ سوال، اسی سوال کے لئے میں نے یہ ساری تمہید باندھی تھی۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوا پھر کہتا چلا گیا۔ "وہاں پر ایک لڑکی رہتی ہے، اس کے پاس، یہی کوئی بیس بائیس عمر رہی ہوگی اس کی۔ وہ دھندہ نہیں کرتی، بس اس کے پاس رہتی ہے۔ مجھے یا پھر ایک مزید بندے کو پتہ ہے کہ وہ کیا کرتی ہے۔ بہت اچھی اور بڑے کام کی ہے وہ لڑکی، بس دو خامیاں ہیں اس میں۔ ایک تو بہت موڈی ہے، دوسرا بڑی جنونی ہے۔" شریدھر یہ کہہ کر خاموش ہو گیا تو میں نے پوچھا۔

"ہم نے اس سے کیا کام لینا ہے؟"

"وہیں چل کر بتاتا ہوں، اگر مان گئی تو بڑی آسانیاں ہو جائیں گی۔" اس نے خوشگوار انداز میں کہا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔ میں خاموش ہو گیا۔

شریدھر ایک بڑی سڑک سے اتر مندر کے ساتھ جاتی ہوئی چھوٹی سڑک پر آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی بڑے بڑے پرانی طرز کے بنگلے تھے۔ ان میں کئی ایک رہائش کے علاوہ دوسرے کمرشل مقاصد کے لئے بھی استعمال ہو رہے تھے۔ وہ بنگلے کے سامنے رک گیا۔ گیٹ وغیرہ

کھلنے اور عمارت تک جانے میں کافی وقت لگ گیا۔ اس نے کار ایک طرف لگائی اور اندر چل دیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ وہ بڑے سارے لاؤنج میں آ گیا۔ سامنے ایک ادھیڑ عمر موٹی سی عورت کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ نیند سے جاگی ہے۔ اس نے ہلکے ہرے رنگ کی قمیص اور سفید شلوار پہنی ہوئی تھی۔ وہ دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے شرید عمر کو دیکھ کر ہنستے ہوئے آگے بڑھی۔ وہ بڑی گرم جوشی سے اس کے ساتھ گلے ملی، پھر اپنے بال ٹھیک کرتے ہوئے میری جانب دیکھا۔

"بہت پیارا دوست ہے، ویر سنگھ۔"

"اوہ۔" اس نے کہا اور میری جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اے اتنی صبح آ گیا، خیر تو ہے؟"

"تیرے لئے تو ابھی رات ہے، خیر، تو نے سونا ہے تو سو جا، پر مجھے تو بملا سے ملنا ہے، کہاں ہے وہ۔" شرید عمر نے کہا تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اپنے کمرے میں ہوگی۔"

"اسے ہم دونوں کے بارے میں بتاؤ، کچھ باتیں کرنے ہیں۔" اس نے کہا تو اس عورت نے اپنا سیل فون سیدھا کرتے ہوئے پوچھا۔

"ناشتہ کرے گا؟"

"وہ تو کروں گا۔" شرید عمر نے کہا تو وہ فون پر رابطہ کرتے ہوئے کسی سے بات کرنے لگی۔ یہ اتنی آہستہ گفتگو تھی کہ میں سن نہیں پایا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آؤ، وہ کمرے ہی میں ہے۔"

اوپری منزل کے ایک کمرے کے سامنے جا کر اس نے دستک دی اور پھر دروازے کو دبا دیا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں اے سی کے باعث خاصی خنکی تھی۔ سامنے بڑا سا بیڈ پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک میز، جس کے اوپر لیپ ٹاپ دھرا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ایک پتلی سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلی نگاہ میں اس کی آنکھوں پر لگی عینک ہی دکھائی دی تھی۔ اس کے گیسو اس کی کمر تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے منی ٹی شرٹ اور شارٹس پہنے ہوئے تھے۔ اس نے پیروں میں کچھ نہیں پہنا ہوا تھا۔ اس کا قد اتنا لمبا نہیں تھا۔

اس نے شرید مرے سے ہاتھ ملاتے ہوئے حال احوال پوچھا، مگر مجھ سے ہاتھ ملایا تو عورت نے بھلا سے پوچھا۔

"کچھ کھایا پیا بھی ہے کہ نہیں صبح سے۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"چل میں بھیجتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ واپس چلی گئی۔ ہم تینوں بیڈ پر آ کر بیٹھ گئے۔ وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے شرید مر کی طرف دیکھ کر بولی۔

"خیر ہے انکل، اتنی صبح اور وہ بھی بنا اطلاع کے؟"

"بھلا، کچھ کام ہی ایسا آن پڑا ہے تم سے۔"

"شرید مر جی آپ کہو، اگر میں کر سکی تو......" اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"وہ تو تم کر سکتی ہو۔ بس تمہارے انکار سے ڈر لگتا ہے۔"

"ارے نہیں، آپ بتائیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا پھر ایک دم سے چونکتے ہوئے

بولی، ”کہیں وہ ستیہ رام کے بارے میں تو نہیں؟“

”ہاں وہی ہے۔“ شرید ھر نے تیزی سے کہا۔

”کیا کرنا ہے اب اس کا؟“ اس نے پوچھا۔

”اس کی تمام اپ ڈیٹ معلومات۔“ اس نے کہا۔

”وہ تو مل جائیں گی، یہ کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں۔“ اس نے عینک میں سے جھانکتے ہوئے کہا تبھی شرید ھر بولا۔

”لیکن اس کے ساتھ جو شیو نرائن کے بارے میں بتایا تھا، وہ کام کہاں تک پہنچا؟“

”وہ بھی سب میرے سامنے ہے۔ اس کا سب کچھ۔“ اس نے بتایا۔

”بس ان دونوں کے درمیان کنفیوژن ڈالنی ہے۔“ اس نے تیزی سے اپنا مقصد بتا دیا۔ تو بملا چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔

”ہو جائے گا۔“

”ویش گڈ۔“ شرید ھر نے خوش ہوتے ہوئے کہا پھر سکون سے بولا، ”ابھی صرف معلومات چاہئیں۔ کون سی کنفیوژن، کب ڈالنی، یہ میں تمہیں بتاتا رہوں گا۔“

”اوکے انکل۔“ اس نے کہا تو شرید ھر نے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ بملا نے کوئی بات کیے بنا وہ گڈی اٹھائی اور اسے لیپ ٹاپ والے میز پر اچھال دی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے آفر قبول کر لی تھی۔

کھانے پینے کے بعد بملا اپنا لیپ ٹاپ بیڈ پر لے آئی۔ میں اور شرید ھر اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ اس نے اپنے سامنے لیپ ٹاپ رکھ لیا۔ پھر اس نے ہمیں وہ سب معلومات دیں جو اس نے اب تک حاصل کی تھیں۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ ہمارے کسی کام آ سکتی ہیں۔

شرید عمر کیا سوچ رہا تھا، میں اس بارے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ہم کچھ دیر وہیں بیٹھے رہے۔ پھر شرید عمر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ چاہو تو گپ شپ لگا لو، میں ذرا نیچے ......" یہ کہتے ہوئے وہ ہنس دیا تو بملا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"آپ بھی پرانی یادیں تازہ کرلیں۔"

"کافی سمجھدار ہو۔" اس نے کہا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ میں سمجھ گیا تھا، شرید عمر یہ چاہتا تھا کہ میں بملا کے ساتھ بے تکلف ہو جاؤں۔ اسی لئے اس نے ہمیں تنہائی میں وقت دیا۔ ظاہر ہے، اس موڈی اور جنونی لڑکی سے کام نکلوانا آسان نہیں تھا۔ ایسے لوگ صرف پیار بھرے لفظوں سے پگھلتے ہیں۔ میں اور بملا بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔

دوپہر کے بعد جب ہماری واپسی ہوئی تو میں نے شرید عمر سے پوچھا۔

"ستیہ رام اور شیو نرائن کے درمیان اگر جنگ چھڑتی ہے تو دونوں طرف الرٹ ہو جائیں گے۔ تب زیادہ مشکل ہو جائے گا۔"

"مجھے لوہا گرم کرنے دو۔ جس وقت چوٹ لگانا ہوگی تمہیں بتا دوں گا۔" اس نے کہا تو میں خاموش ہو گیا۔

☆......☆......☆

شام ڈھل رہی تھی۔ میں لاؤنج کی کھڑکی سے ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ آسمان نارنجی رنگ کا ہو رہا تھا اور بادلوں کی ٹکڑیوں اور درختوں میں گم ہوتا ہوا سورج مغربی افق میں کہیں غائب ہونے جا رہا تھا۔ مجھے نجانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں شرید عمر کے پاس آکر پھنس گیا ہوں۔ وہ نجانے کیا سوچ کر اپنی چال چل رہا تھا۔ وہ شاید کھیل رہا تھا۔ لیکن

میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگائی ہوئی تھی۔ مجھے کسی کے کھیل سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے بس ستیہ رام سے انتقام لینا تھا۔ بس اس میں اتنی سی خواہش تھی کہ اس کے بڑوں کو معلوم ہو جائے کہ اگر وہ کسی پر ہاتھ ڈالتے ہیں تو ان کی گردن اتارنے والے موجود ہیں۔ میری سب سے بڑی خامی یہی تھی کہ میں اس شہر کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ دوسرا میرے ساتھ تیمور جیسے جانثار دوست نہیں تھے ورنہ اب تک میں ستیہ پال کے ساتھ دو دو ہاتھ کر چکا ہوتا۔ اتنا بڑا میدان جس میں قدم قدم پر موت کھڑی انتظار کر رہی تھی، میں اس میں اکیلا کھڑا تھا۔

"ہیلو ویر سنگھ......" نسوانی آواز پر میں چونکا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو بملا میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ عینک کے پیچھے سے بڑے اشتیاق کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے پتلے پتلے لپ اسٹک لگے ہونٹوں پر بڑی معصومانہ سی مسکان مچل رہی تھی۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس نے دوپہر کی نسبت خاصے معقول کپڑے پہن رکھے تھے۔ سیاہ تنگ پتلون کے اوپر سفید سلیولیس ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں موٹے موتیوں والی سیاہ مالا تھی۔ اس نے درمیان سے مانگ نکال کر گیسو کھلے چھوڑ رکھے تھے۔

اس نے ایک ہاتھ میں اپنے لیپ ٹاپ سینے سے لگایا ہوا تھا، دوسرا ہاتھ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی، "کیسے ہو؟"

"میں تو ٹھیک ہوں تم سناؤ۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کے ہاتھ میں خاصی گرم جوشی تھی۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ صوفے پر رکھا اور وہیں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"بڑے اداس لگ رہے ہو، خیریت تو ہے نا؟"

"بس ویسے ہی۔ اکیلا تھا نا، شریدھر تو اپنے کاموں میں مصروف رہتا ہے۔" میں نے

یونہی بہانہ گھڑ دیا۔
"میں آ گئی ہوں نا، اب تمہاری تنہائی دور ہو جائے گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو مجھے عجیب سا لگا۔ میں اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کے لئے مڑا اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔
"اچھا ایسا کرو، بیٹھو نہیں، بس جلدی سے تیار ہو جاؤ، میں تمہیں بے پور گھما دوں۔" اس نے شوخی سے کہا۔ اتنے میں شریدہ مر لاؤنج میں آ گیا۔ اس نے بملا کو دیکھا تو پر جوش انداز میں بولا۔
"ارے واہ، میرے گھر میں تو رونق اتر آئی ہے۔"
"میں نے سوچا، تھوڑا انجوائے لینا چاہئے۔ بہت دنوں بعد میرا من چاہا کہ تھوڑا گھوموں پھروں، تھوڑی مستی کروں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"ہاں نا، بھی کرو مستی، ویر سنگھ ہے نا۔" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔
"اسے ہی لینے آئی تھی۔" اس نے کہا تو شریدہ مر نے میری طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا۔
"ہاں بھئی تیار ہو جاؤ۔"
میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے تیار ہونے میں تھوڑا وقت لگا۔ واپس آیا تو شریدہ مر پورے انہاک کے ساتھ لیپ ٹاپ اسکرین پر دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے کچھ سمجھا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی نگاہوں میں ستائشی احساس ابھر آیا۔ اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور مجھے تھماتے ہوئے بولی۔
"یہ اپنے کمرے میں رکھ دو۔"

میں اس کا لیپ ٹاپ کمرے میں رکھ آیا۔ شریدھر کچن میں تھا، وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ میں اس کے ساتھ گلی میں آ گیا۔ سیڑھیوں کے ساتھ ہی ایک قیمتی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تو میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی بڑھائی اور مین سڑک پر لا کر بولی

''ویر سنگھ، میں یہ گاڑی مانگ کر نہیں لائی، یہ میری اپنی گاڑی ہے۔ پچھلے برس ہی نیا ماڈل لیا ہے۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ ہنس کر بولی۔

''میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ میں کوئی ایسی سٹوڈنٹ نہیں، پیسہ جس کا پرابلم ہو، میرا صرف ایک ہی پرابلم ہے اپنے پسند کے لوگوں کے ساتھ اچھا وقت گزارنا، اپنی مرضی سے۔''

''اوہ، تو میں تمہیں پسند آ گیا ہوں۔'' میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کسی حد تک، میں جانتی ہوں تمہارا ساتھ ایک خواب کی مانند ہے۔ ایک دو دن میں تم اس دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جاؤ گے۔ پھر تمہاری ضرورت ہے کہ میری ہاں میں ہاں ملاؤ گے۔ سو میں اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ وقت گزار سکوں گی۔''

''اس کا مطلب ہے تم میری مجبوری کا فائدہ اٹھانا چاہتی ہو؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آف کورس۔'' اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ پیار عشق، محبت یہ سب بیکار کی باتیں لگتی ہیں، اور ویسے ہیں بھی۔ میں جب چاہتی ہوں اپنی مرضی کا انجوائے کرتی ہوں۔ عام لڑکیوں کی طرح میں لڑکوں کے والٹ کی طرف نہیں دیکھتی، بلکہ اپنا پرس استعمال کرتی ہوں۔ کسی پسند کے لڑکے پر دل کھول کر خرچ کرنا ہی مجھے مست کر دیتا ہے۔'' اس نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

”اوکے، جیسا تم چاہو۔“ میں نے کہا تو اس نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کسی حد تک تمہارا کام میں نے کر دیا ہے۔ صبح تک اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ سامنے آئے گا۔“

”وہ کیسے...... کیسا نتیجہ......؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”یہ سمجھانا مشکل ہے، واپسی پر سمجھاؤں گی۔ باقی رہا کیسا نتیجہ، یہ صبح پتہ چلے گا، تب تک سب بھول جاؤ۔ صرف مستی کا سوچو۔“ اس نے خمار آلود لہجے میں کہا اور نگاہیں سڑک پر لگا دیں۔ مجھے بھی تجسس ہو گیا کہ اس سوڈی اور جنونی لڑکی کے ساتھ گزارا ہوا وقت کیسا ہو گا۔

بملا ایک پر رونق علاقے میں آ گئی۔ ہر طرف نیون سائین چمک رہے تھے۔ گاڑیاں، لوگ، رونق ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

”بڑی رونق ہے یہاں پر......“

”یہ راجی پارک کا علاقہ ہے۔ یہاں زیادہ تر ریستوران اور پب ہیں۔ ایک دو کیسینو بھی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ لمحہ بھر کے لئے رکی پھر مجھ سے بولی، ”اگر کوئی ہتھیار ہے تو یہیں گاڑی میں رکھ دو۔“

”ہے تو سہی لیکن......“ میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

”کوئی بات نہیں، رکھو اور چلو۔“

میں نے پسٹل اور میگزین نکال کر ڈیش بورڈ میں رکھ دیئے۔

میں اور بملا ایک پب میں چلے گئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی اسے جانتی تھی۔ اس نے ایک شوخ مسکراہٹ میری طرف پھینکی اور ہم اندر چلے گئے۔ تیز میوزک کے ساتھ لڑکے لڑکیاں

مستی میں ناچ رہے تھے۔ ایک جانب میز اور صوفے لگے ہوئے تھے۔ کئی جام لنڈھا رہے تھے اور کئی شیشہ پی رہے تھے۔ ہر کوئی اپنی مستی میں گم تھا۔ بملا میرے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے میرے سینے تک آ رہی تھی۔ اس نے دھیرے سے میری کمر میں ہاتھ ڈالا اور ایک صوفے کی جانب بڑھ گئی۔ وہاں بیٹھتے ہی میں نے کہا۔

"بملا، میں شراب نہیں پیتا، تم جو چاہو۔"

"او کے کوئی بات نہیں۔" اس نے کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس کے پاس ایک پتلی سی مختصر لباس والی لڑکی آ گئی۔ ابھی اس کے ساتھ کچھ باتیں ہی کی تھیں کہ ایک جوڑا اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ پہلے لڑکی نے میرے کاندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بملا، اپنے پارٹنر سے کہو میرے ساتھ ڈانس کرے۔"

"ہاں کیوں نہیں، جاؤ ڈارلنگ......" اس نے بڑے سوقیانہ انداز میں کہا تو ایک دم سے میرا دماغ سلگ اٹھا، پھر اگلے ہی لمحے میں نے سوچا یہ سب ایک کھیل ہے، دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ میں نے غصہ دماغ سے نکال دیا اور اس لڑکی کے ساتھ وہاں تک چل دیا جہاں لڑکے اور لڑکیاں مستی میں ناچ رہے تھے۔ میں اس کے ساتھ ناچنے لگا۔ وہ میرے ساتھ چپک گئی تھی۔ اس نے پی بھی ہوئی تھی لیکن اس کا انداز جارحانہ نہیں تھا۔ وہ بڑے نرم انداز میں میرے ساتھ محو رقص تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ وہ میرے سینے پر اپنا چہرہ دھیرے دھیرے رگڑنے لگی پھر آہستہ سے بولی۔

"سیانے کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔" اس کے یوں کہنے پر میں چونکا، اس نے اپنا چہرہ میرے سینے سے نہیں ہٹایا بلکہ کہتی چلی گئی۔ "سیانے یہ بھی کہتے ہیں کہ جلد بازی نہیں

کرنی چاہیے۔ جب تک ٹارگٹ پوری طرح نشانے پر نہ آ جائے، گولی چلانا خطرناک ہوتا ہے۔ اس لئے ایک یا دو دن بملا کے ساتھ انجوائے کرو۔"

یہ کہتے ہی اس نے اپنا سر میرے سینے پر سے اٹھا لیا۔ تبھی میں نے اسے بھینچتے ہوئے اس کی گردن کے پاس اپنا چہرہ لے کر پوچھا۔ "یہ سب کیسے ہوگا؟"

"کہا نا صبر کرو، بملا اکیلی نہیں ہے......" اس نے کہا اور مجھ سے الگ ہو گئی۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھا جہاں ہلکی سی مسکان تھی۔ میں نے اس کی طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا تو وہ مجھے اپنے ساتھ لیتی ہوئی بملا کے پاس لے گئی، جہاں اس کے دوسرے دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے شراب کے گلاس پڑے تھے۔ بملا نے ایک گلاس میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے وہ گلاس پکڑا، پینے سے پہلے سونگھا تو وہ جام سوڈا ہی تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ کر سوڈا پیتا رہا۔ اس کے دوست اٹھ گئے تھے۔ وہ میرے ساتھ یوں لگ کر بیٹھ گئی تھی جیسے مجھ ہی میں کھوئی ہوئی ہو۔

"میسج مل گیا تمہیں؟"

"ہاں۔" میں نے بتایا۔

"یہ اس لئے کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ میں اکیلی نہیں ہوں، بس انجوائے کرو۔" اس نے کہا اور اپنی بانہیں میرے گلے میں حمائل کر دیں۔ میں نے بھی اسے بھینچ لیا۔

ہم وہاں سے نکلے تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ بملا نے پی تو تھی لیکن اتنے نشے میں نہیں تھی کہ خود کو سنبھال ہی نہ سکے۔ وہ سرور میں تھی۔ اس نے گاڑی نکالی اور ریستوران کے آگے جا رکی۔ وہاں سے اس نے کھانا پیک کروایا اور پھر ہم واپس چل دیئے۔

☆......☆......☆

دوپہر کے بعد میری آنکھ کھلی تو بملا میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھی ہوئی لیپ ٹاپ میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے وہی منی ٹی شرٹ اور شارٹس پہنے ہوئے تھے، اپنے گیسو، اکھٹے کر کے جوڑے میں باندھے ہوئے تھے، چہرہ میک سے بے نیاز تھا اور وہ پوری محویت سے اسکرین پر دیکھ رہی تھی۔ میرے کروٹ لیتے ہی اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ پھر اس نے لیپ ٹاپ میرے پیٹ پر رکھا پھر اپنا سر میرے کاندھے پر رکھتے ہوئے بولی۔

"لو یہ دیکھو، کام شروع ہو گیا۔"

"کیا ہوا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"شیو نرائن کا وہ ہوٹل جو ستیہ رام بننے نہیں دے رہا تھا۔ رات اس پر کچھ لوگوں نے حملہ کیا۔ وہاں پر موجود شیو نرائن کے تین لوگ مارے گئے۔ کافی سارے زخمی ہوئے ہیں۔ جو اس وقت ہسپتال میں پڑے ہیں۔"

"اوہ بے چارے بے گناہ لوگ......" میں نے افسوس کرتے ہوئے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر چند لمحے ٹھہر کر بولی۔

"یہ وہ کرائے کے غنڈے اور بد معاش تھے جو یہاں کی حفاظت کے لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی مقابلہ کیا۔"

"اوکے۔" میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

"بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی، علی الصبح ستیہ رام کی کیمیکل فیکٹری میں آگ لگا دی گئی ہے۔ آگ بہت تیز تھی جو ابھی تک نہیں بجھ سکی ہے۔ یہ دیکھو۔"

یہ کہتے ہی اس نے ایک لائیو ٹی وی چلا دیا۔ وہاں آگ بجھائی جا رہی تھی۔ لوگوں کا شور تھا۔ اسکرا اپنی طرف سے وجوہات پر بات کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ تبھی وہ بولی

"تم نے سنجے رام کو دیکھا ہوا ہے؟"

"نہیں تو......" میں نے کہا۔

"یہ لو، دیکھو۔" اس نے کہا اور ایک ویڈیو تلاش کر کے چلا دی۔ وہ چھوٹے کالوں، گول چہرے والا موٹا سا تھا۔ اس کے سر کے بال سفید تھے۔ ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ موٹی گردن، آنکھیں گنجی ہونٹ موٹے اور بیٹھا ہوا ناک تھا۔ وہ سفید کرتا پہنے ہوئے پھنسی ہوئی آواز میں بات کر رہا تھا۔

"اب شیو نرائن بھی دیکھ لو۔" یہ کہہ کر اس نے ایک دوسری ویڈیو چلا دی۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان کھڑا تھا۔ اس کے نقوش تیکھے تھے۔ اس کے لمبے بال تھے، کلین شیو اور بہترین تراش کا سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ وہ کسی کو انٹرویو دے رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے جنگ چھڑ گئی ہے؟" میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

"ہاں، کسی بھی وقت تم نے اپنا وار کرنا ہے، یہ وقت بہت قریب آنے والا ہے۔ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا اور اپنی انگلی سے میرے ہونٹوں کو سہلانے لگی۔ کچھ لمحے یونہی رہنے کے بعد بولی، "اٹھو فریش ہو جاؤ، کچھ کھاتے پیتے ہیں پھر کہیں سیر کے لئے نکلتے ہیں۔"

"شریدھر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ صبح ہی کہیں نکل گیا تھا۔" اس نے بتایا اور مجھ سے الگ ہو گئی۔

ہم لاؤنج میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے جب شریدھر آیا۔ اس کے چہرے پہ مسکان تھی۔ وہ خوش تھا اس نے آتے ہی کہا۔

"کمال کر دیا بلا تم نے۔"

"ابھی کچھ اور ہوگا۔" اس نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور ہاتھ ہلاتا ہوا اندر کی جانب چلا گیا۔

شریدھر کے ہاں سے نکلتے ہوئے ہمیں سہ پہر ہو گئی۔ بملا نے سفید پتلون کے ساتھ سیاہ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس نے چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ کر لیا تھا۔ سیاہ مالا اس کے گلے ہی میں تھی۔ اس نے ہلکے سے لیدر والے سلیپر پہنے ہوئے تھے۔ حالانکہ اسے میرے ساتھ ہیل والے جوتے پہننے چاہئیں تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھے اور چل دیئے۔ میں نے اس سے بالکل بھی نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے۔

اس نے گاڑی میں میوزک لگایا ہوا تھا جو دھیمی آواز میں تھا۔ کچھ دیر تک چلتے رہنے کے بعد بولی۔

"شہر میں ابھی افراتفری نہیں ہوگی، حالات کنٹرول کر لئے گئے ہیں۔"

"تم کیا چاہتی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو امن چاہتی ہوں۔" اس نے کہا پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔" یہ جو اب تک کہیں جلوس نہیں نکلا، کہیں مزید توڑ پھوڑ نہیں ہوئی، اس کا مطلب ہے، دونوں طرف سے سیز فائر ہو چکا ہے یا پھر کسی نئی جنگ کی تیاری ہے۔"

"تمہاری اطلاعات کیا کہتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تک تو امن ہے، اب دیکھتے ہیں۔" اس نے کہا اور پرسکون سی رفتار سے چلتی چلی گئی۔ وہ کافی دیر تک چلتی رہی پھر ایک جھیل کنارے آ گئی۔ اس نے گاڑی ایک طرف پارک کی۔ ہم چلتے ہوئے اس جھیل کے کنارے آ گئے۔ ممکن ہے کسی وقت وہاں جھیل کا کنارہ اس قابل ہو کہ لوگ پکنک کے لئے آتے ہوں گے لیکن اس وقت وہاں کچرا اور گند پھیلا ہوا تھا۔ جھیل کے درمیان پرانے وقتوں کی کوئی عمارت بنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر

ایک چھوٹی سی محراب نما برجی تھی۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ وہاں پر مزید کافی سارے لوگ تھے۔ ایک خاص قسم کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ بہر حال یہ بو ایسی تھی جسے برداشت کیا جا سکتا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھے یہاں کیوں لے کر آئی تھی۔ وہ کافی دیر تک جھیل کو دیکھتی رہی، پھر اپنی عینک کو درست کرتے ہوئے بولی

"اپنے پیچھے مڑ کر دیکھو، تمہیں ایک چار منزلہ عمارت دکھائی دے گی، پیلے رنگ کی ہے۔"

اس کے کہنے پر میں مڑا اور سامنے دیکھنے لگا۔ ایک بڑی ساری عمارت تھی، جس پر محراب بنے ہوئے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کوئی سرکاری عمارت ہوتی ہے۔ وہ سبز درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔"

"یہ فائیو سٹار ہوٹل ہے۔ اس کے سامنے تو یہ شاہراہ ہے لیکن اس کے عقب میں ایک طرف نشیب ہے۔ اور اس کے آگے پہاڑی سلسلہ۔ ایک طرف سڑک ہے اور تقریباً ایک کلو میٹر تک آبادی ہے اور اس سے آگے پہاڑی سلسلہ ہے۔"

"تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہو؟"

"اس لیے کہ آج اس ہوٹل میں ستیہ رام کی آمد ہوگی۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی، "میری اب تک کی یہ اطلاع ہے کہ ستیہ رام اور شیو نرائن کے درمیان صلح کروائی جا رہی ہے۔ یہ صلح کروانے والے ظاہر ہے ان سے زیادہ بڑے لوگ ہیں۔"

"تمہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ وہ یہیں آئیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"ان لوگوں سے جب بھی میٹنگ ہوتی ہے، اسی ہوٹل میں ہوتی ہے۔ میں کچھ مزید باتیں بتا کر تمہیں نفسیاتی دباؤ میں نہیں دینا چاہتی۔" اس نے دھیمے سے انداز میں کہا۔

"تم بتا دو، میرے دباؤ کی پرواہ مت کرو۔" میں نے سکون سے کہا۔

"تو پھر سنو، صلح کروانے والے وہی لوگ ہیں جنہوں نے کلیان جی بنائی ہوئی ہے۔ یہ ریاست کے لوگ ہیں۔ اور یہ علاقہ بھوآری کا ہے۔"

"اوہ......" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ وہ خاموش رہی اس نے کسی قسم کا ردعمل نہیں دیا۔

"میں نے تمہارے لئے اتنا کر دیا ہے کہ اس ہوٹل میں ایک کمرہ بک ہے، دوسری منزل پر ہوگا۔ وہی رات والی لڑکی سوہنیتا وہاں موجود ہے۔ کچھ دیر میں دو لڑکے بھی وہیں آ جائیں گے۔ وہ رابطے میں تو ہوں گے لیکن سامنے نہیں آئیں گے۔ میں تمہیں پورچ میں اتار کر آ جاؤں گی۔"

"تم میرے ساتھ......" میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

"میں کسی کیمرے کے سامنے نہیں آنا چاہتی۔ وہ سوہنیتا کی بات کچھ اور ہے۔ وہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی اگر ہم مل سکے تو......" اس نے صاف لفظوں میں کہا اور چل دی۔

میں نے ایک طویل سانس لیا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ گاڑی میں بیٹھ کر جب وہ چلنے لگی تو بملا نے کہا۔

"اپنا پسٹل ڈیش بورڈ میں چھوڑ دو۔ اسکریننگ میں آ جائے گا۔"

"تو پھر میں کیا کروں گا۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"سوہنیتا۔ لے جا چکی ہے۔ اس سے مل جائے گا۔" اس نے کہا اور گیئر لگا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ مجھے پورچ میں چھوڑ کر جا چکی تھی۔

میں لاؤنج میں پہنچا ہی تھا کہ میری نگاہ سوہنیا پر پڑی۔ وہ میری طرف یوں بڑھی جیسے ہم برسوں کے بچھڑے ہوئے ہوں۔ وہ مجھے لیتی ہوئی لفٹ کی طرف لے گئی۔ وہاں سے وہ سیدھی ایک کمرے میں جا پہنچی۔ میں نے کھڑکی کھول کر دیکھا، وہ ہوٹل کا عقبی حصہ تھا۔ نیچے لان تھا، جس کے آخر میں جالی نما باؤنڈری لگی ہوئی تھی۔ اس کے آگے نشیب تھا۔ کھڑکی میں سے ہوا تیز آ رہی تھی جو کمرے میں لگے اے سی کی خنکی کو ختم کر رہی تھی، میں نے اسے بند کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سوہنیا میری طرف دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ہم نے ڈنر ہال کے ایک گوشے میں کیا، جہاں سے باہر لان دکھائی دے رہا تھا۔ سوہنیا اپنے بارے میں مجھے بہت کچھ بتا چکی تھی۔ اسی ستیہ رام نے اس کے گھر کو آگ لگائی تھی۔ اگرچہ اس میں سبھی بچ گئے تھے صرف زخمی ہوئے تھے لیکن اس کی ماں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گئی تھی۔ ستیہ رام وہاں کی زمین خرید چکا تھا۔ سوہنیا کا باپ اور اس کے ساتھ کچھ لوگ اڑے ہوئے تھے۔ سوہنیا کا باپ ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھا اس لئے اس نے ارد گرد کئی محکموں میں درخواستیں دے رکھی تھیں۔ باقی لوگ اس کے پیچھے تھے۔ ایک بار جب بہت ہی تنگ کر دینے والی انتہا ہوئی تو وہ خود ستیہ رام کے آفس چلی گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے وقت لیا اور جا کر اس سے التجا کی کہ جیسے ہی ان سے کچھ بن پڑا وہ یہاں سے چلے جائیں گے لیکن انہیں تنگ نہ کیا جائے۔ جس پر سوہنیا کو دھکے دے کر آفس سے نکال دیا۔ آخرکار ستیہ رام کے غنڈوں کا وہ مقابلہ نہیں کر پائے، انہیں وہاں سے جانا پڑا۔

غربت، ذلت اور انتقام نے سوہنیا کو جرم کے راستے پر چلا دیا۔ وہ اسی خفیہ نیٹ ورک کا حصہ بن گئی، جس کا ساتھ بھلا دے رہی تھی۔ سوہنیا کے لئے انتقام کا یہ سنہرا موقعہ تھا۔ اس نے

میرا ساتھ دینے کے لیے سب کچھ تج دیا۔

میرا ساتھ دینے میں اسے آسانی بھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ستیہ رام کی مہینے دو مہینے بعد اسی ہوٹل میں میٹنگ ہوتی ہے۔ اس نے بہت سوچ کر یہاں پر ایک لڑکا ویٹر لگوا دیا۔ اس لڑکے کو اس نے ہر طرح سے اپنا گرویدہ کر رکھا تھا۔ اگرچہ وہ لڑکا اچھے گھر کا تھا اور ہوٹل انڈسٹری میں بہت آگے جانا چاہتا تھا لیکن اس کی مدد کے نام پر وہ اسے تھوڑی بہت رقم دیتی رہتی تھی۔ یوں ستیہ رام کے بارے میں جو ذرائع اسے معلومات دیتے، ویٹر سے اسے تصدیق ہو جاتی تھی۔ اس نے ویٹر کو پوری طرح استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے پہلے ہی ایک بیگ اس کے ذریعے ہوٹل پہنچا دیا۔ پھر آن لائین کمرہ بک کر لیا گیا، جس کی ادائیگی بھی کر دی گئی۔ وہ بیگ کمرے میں پہنچ گیا، جس میں پسٹل، میگزین، سائلنسر تھے۔ اس کے ساتھ ایک دستی بم بھی اس بیگ میں رکھا ہوا تھا۔ لڑکے کو پتہ ہی نہیں تھا کہ اس بیگ میں کیا ہے۔ سوہنیا کا خیال تھا کہ کوئی بھی اسلحہ کسی وقت بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

ڈنر کے بعد ہم لان میں ٹہلتے ہوئے جالی والی باؤنڈری کے پاس جا ٹھہرے جہاں سے نشیب شروع ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک گھومتی ہوئی سڑک بھی تھی جو آبادی کی طرف جا رہی تھی۔

”سوہنیا، یہ ایک جیسے دو بلڈنگیں ہیں، اب نجانے وہ کس بلڈنگ کے کس کمرے میں آتا ہے۔“

”اس کی فکر مت کرو، وہ ہمیں سامنے والی بلڈنگ میں آتے ہیں اور ہمیشہ دوسری منزل کے چوتھے کمرے میں میٹنگ کرتے ہیں۔ یہ مخصوص ہے۔ ہوٹل والوں نے میٹنگ کے لیے یہی کمرہ مختص کیا ہوا ہے۔ وہ لوگ بھی جو ایسی ہی خفیہ میٹنگ کرتے ہیں انہیں بھی یہی کمرہ دیتے ہیں۔“ اس نے کہا اور پھر کھڑکیوں کا حساب لگا کر یہ اشارہ کرتے مجھے سمجھانے لگی۔

"لیکن اگر یہ......" میں نے پوچھنا چاہا تو وہ بولی۔

"دیکھو، جب وہ یہاں آجائیں گے اور ان کے کمرے کا پتہ چل جائے گا تو میں یہاں سے جاؤں گی۔"

"جو کچھ بھی کرنا ہے مجھے اکیلے کرنا ہوگا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"بالکل، کیونکہ جب تک تم کچھ کرو گے میں چیک آؤٹ کر جاؤں گی تا کہ اگر مجھ پر کوئی بات آئے بھی تو میں کوئی جواز دے سکوں۔" اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔" میں نے کاندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ مجھے واپس کمرے میں نہیں جانا تھا۔ سائلنسر لگا پسٹل میرے پاس تھا۔ ایک دستی بم میری جیب میں تھا۔ جو کارروائی بھی کرنا تھی یہیں سے کرنا تھی۔

ہم وہیں پر کھڑے بھی باتیں کر رہے تھے۔ ممکن ہے ہمیں دیکھنے والے یہیں سمجھیں کہ ہم نجانے کن رومانوی باتوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک بینچ پر آبیٹھے۔ وہ مجھے اپنے بارے میں بتاتی رہی۔ میں بھی اسے اپنے بارے میں جھوٹ سچ کہتا رہا۔

ہمیں وہاں بیٹھے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ ایسے میں سونیا کا فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر دیکھا تو مجھے واضح طور پر اس کے بدن میں لرزش محسوس ہوئی۔ اس نے تیزی سے کہا۔

"وہ آگئے ہیں۔ دوسری منزل کے اسی کمرے میں ہیں۔"

"یہاں سے دیکھو، کون سا بنتا ہے؟" میں نے کہا تو اس نے پھر سے مجھے سمجھایا۔ پھر بولی

"لو میں اب نکلتی ہوں، اب تم جانو اور تمہارا کام۔"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا، اٹھی اور بڑے سکون سے چلتی ہوئی اس لان سے نکل گئی۔ میں

اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میں کچھ دیر تک ارد گرد کا جائزہ لیتا رہا، کھڑکی تک پہنچ جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن کھڑکی کھولنا ہی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ جب تک میں کھڑکی کھولتا، تب تک مجھ پر فائر ہو سکتا تھا۔ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ان کے آنے کے بعد اس عقب میں کوئی گارڈ تو نہیں آیا، ایسا نہ ہو کہ جیسے ہی میں کھڑکی تک پہنچوں، کوئی مجھے نشانہ بنا دے۔ میں نے چند لمحے سوچا، پھر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ رسک بہر حال مجھے لینا پڑے گا۔ زمین سے کھڑکی تک پہنچنے میں مجھے ایک منٹ سے بھی کم وقت چاہیے تھا۔ کھڑکی کھولنا اگلا مرحلہ تھا، اس پر کچھ نہ کچھ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی، اپنی قوت کو جمع کیا، ہتھیار چیک کر کے سکون سے چلتا ہوا عمارت کے پاس جانے لگا۔

میں قدم بڑھاتا جا رہا تھا اور میرے خون کی گردش تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ میں عمارت کے بالکل پاس چلا گیا۔ ایک لمحہ کو ادھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک ہی جست میں پہلے کمرے کی کھڑکی پر تھا، اس پر قدم رکھتے ہی میں نے دوسری کھڑکی پکڑ کر اس کے ساتھ بنے ہوئے شیڈ پر چلا گیا۔ میں نے ایک نگاہ دیکھا تین افراد اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سرعت کے ساتھ پسٹل نکالا اور اس کا دستہ شیشے پر دے مارا۔ ایک چھناکے سے شیشہ ٹوٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے میں نے زور لگا کر کنڈی کھولی تو میرا ہاتھ لہولہان ہو گیا۔ کھڑکی کھلتے ہی میں اندر تھا۔ میں حیران تھا کہ کسی نے کوئی ہتھیار نہیں نکالا۔ یہ رسک تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ایسی میٹنگ جس میں طرفین پر اعتماد نہ ہو، وہاں ہتھیار بھی کہیں لائے جاتے تھے۔ صلح کروانے والا ہمیشہ یہ خیال رکھتا ہے کہ ایسا کچھ نہ ہو۔ میں جب اندر کود رہا تھا، اسی لمحے باہر جانے والے دروازہ کے پاس جا کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تھا، وہ تینوں مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے ان پر پسٹل تانے ہوئے، دروازے کی چٹخنی لگا دی

تھی۔ میں ستیہ رام اور شیو نرائن کو پہچان چکا تھا، تیسرا میرے لئے اجنبی تھا۔

"کون ہو تم؟" تیسرے نے پوچھا۔

"آسمان سے ٹپکی ہوئی مصیبت......"

"تم یہاں......؟" تیسرے شخص نے کہا۔

"میں باہر سے فائر کر سکتا تھا لیکن ایسا نہیں کیا، مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں تم......" میں نے کہنا چاہا تو وہ حیرت سے میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"تو پھر تمہارا یوں آنا، کس لئے؟"

"تم اور شیو نرائن ایک طرف ہو جاؤ، مجھے ستیہ رام سے ایک بات کہنی ہے۔" میں نے کہا تو ستیہ رام نے اعتماد سے کہا۔

"مجھ سے...... بولو، کیا کہتے ہو؟"

"تم نے ڈاکٹر کامران ملک اور ڈاکٹر فائزہ ملک کو کس کے کہنے پر اغوا کرایا تھا؟" میں نے کہا ہی تھا کہ تیسرے شخص کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"او وہ تم ہو......؟"

"ہاں، میں ہی ہوں۔ بولو؟"

"اچھا ہوا تم خود ہی چل کر یہاں آ گئے ہو، سنو ہم نے اسے اغوا کیا تھا، دشمن ملک، بس دشمن ملک ہے۔" اس نے غراتے ہوئے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ میں سمجھ گیا وہ اب مجھ پر حملہ کرنے کو تیار ہو چکا ہے اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"تو پھر سنو، ہم زندہ ہیں اور گھس کر واپس بھی لے جا چکے ہیں۔" یہ کہتے ہی میں نے ستیہ رام پر فائر کر دیا۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی، وہ چکرا کر گر گیا۔ میں نے پسٹل اس تیسرے کی

جانب کر دیا۔ اب وہ میرے نشانے پر تھا۔ میرے اندر غصے کی لہر سر اٹھانے لگی میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا، "میں تمہیں زندہ چھوڑنا چاہتا تھا لیکن تو نہیں چاہتا۔"

لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ میں نے اس پر دو فائر کئے۔ اس دوران میں پیچھے ہٹتا ہوا کھڑکی تک چلا گیا۔ جب تک میں باہر نکلا تب تک میں نے دستی بم نکال کر اس کی پن نکالی۔ اس دوران میں نے شیو نرائن کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور بم اندر پھینک دیا۔

پہلی کھڑکی پر آ کر میں نے چھلانگ لگائی اور پوری قوت سے جالی والی باؤنڈری کی جانب بھاگ پڑا۔ میں جانتا تھا کہ ٹھیک پانچ سیکنڈ بعد بم پھٹ جائے گا۔ شیو نرائن کا کیا بنتا، یہ اس کی مستعدی اور حاضر دماغی پر تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بچ جائے اور میرا پیغام ریاستی ادارے کے بڑوں تک پہنچا دے۔ میں نے دستی بم اس لئے پھینکا تھا کہ لازمی بات ہے اس کھڑکی سے مجھ پر فائر ہونا تھے۔ اگر وہاں سے مجھ پر فائر ہوتا تو میں کسی صورت نہیں بچ سکتا تھا۔ کم از کم کچھ وقت کے لئے وہاں سے کوئی بھی فائر نہ کر سکتا۔ جب تک کوئی صورت حال سمجھتا، میں نکل چکا ہوتا۔

میں نے دو قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ میں بھاگتے ہوئے لڑکھڑا گیا۔ ہو سکتا تھا کہ میں گر جاتا، لیکن ایک تو مجھے دھماکے کا خود انتظار تھا، دوسرا میں انتہائی کم وقت میں وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ جب تک میں جالی والی باؤنڈری تک پہنچا، میرے پیچھے چیخ و پکار مچ چکی تھی۔

میں نے اپنے پیچھے نہیں دیکھا اور نہ ہی مجھے کچھ دیکھنے کی ضرورت تھی۔ میں نے جالی والی باؤنڈری کو پار کر لیا۔ دوسری جانب نشیب تھا، میں نے پاؤں ٹکانے کی بہت کوشش کی لیکن نہ جما سکا۔ میں تھوڑی دور تک گھسٹتا چلا گیا۔ جیسے ہی میں ایک کھڈے کی وجہ سے رُکا، میں اٹھا اور

تیزی سے قدم جماتا ہوا نیچے کی طرف جانے لگا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے میں نشیب میں دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کہ کہاں پر کیا ہے؟

میں یہ نفسیات سمجھ رہا تھا کہ ہر بندہ یہ سوچے گا کہ میں سڑک تک چلا جاؤں۔ میرے پاس صرف یہی فوقیت تھی کہ میں ایک دومنٹ تک سیدھے وہاں تک جا سکتا تھا۔ مجھے پکڑنے اگر کوئی آتا بھی تو اسے چند منٹ لگ سکتے تھے۔ اگر کوئی کسی کو فون کال پر بھی سمجھاتا تو بھی چند منٹ لگنا تھے۔ اب یہ میری قسمت تھی کہ سڑک پر جاتے ہی اگر مجھے وہاں سے بھاگنے کے لئے کوئی شے مل جاتی تو میرے بچنے کے چانس تھے، ورنہ میں اسی سڑک کی بھل بھلیوں میں کھو جانے والا تھا۔

میں نے سڑک پر پہنچتے ہی اپنا پسٹل شرٹ کے پیچھے اڑس لیا۔ میرا بایاں بازو خون میں لت پت تھا۔ میں اپنا زخم بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔ اس وقت جلن کا احساس بھی بہت کم تھا، میری ساری توجہ وہاں سے نکل جانے کی طرف تھی۔ میں سڑک پر پہنچا ہی تھا ایک کار زن سے میرے پاس آ کر رکی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اسے میں دیکھ نہیں پایا تھا کہ بھلا کی تیز آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”ارے بیٹھ......“

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو بھلا کی جھلک مجھے نظر آئی جب تک اس نے گالی دیتے ہوئے کہا۔

”......بیٹھ جا......“

میں نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ تیزی سے چل دی۔ ذرا سا فاصلہ طے کر کے اس نے مجھ سے کہا۔

"فوراً اپنی شرٹ بدل لو، ہتھیار پیچھے رکھ لو، اگر ضرورت پڑی تو ڈیش بورڈ میں پڑا ہے پسٹل......"

"شرٹ......؟" میں نے پوچھا

"دیکھو پڑی ہوگی شرٹ۔" اس نے کہا تو میں نے دیکھا، سیٹ پر کچھ ڈبے پڑے ہوئے تھے۔ اس میں ایک کھولا تو میرے سائز کی شرٹ پڑی تھی۔ میں نے اپنی شرٹ اتارتے ہوئے پوچھا۔

"کب خریدی تم نے؟"

"ابھی چپ کر جاؤ، مجھے ان گلی محلوں سے نکلنے دو۔"

میں نے تیزی سے شرٹ بدلی، اپنی خون آلود شرٹ کو نیچے دبایا اور بملا سے کہا۔

"تم گاڑی مجھے دو۔"

"تجھے راستوں کا کیا پتہ ہے۔"

"تم بتاتی جانا۔" میں نے کہا تو اس نے ایک چھوٹے سے کراس پر گاڑی روک دی۔ میں سرعت کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور پھر میں چلتا چلا گیا۔ اس فائیو سٹار ہوٹل سے جگت پورہ کا علاقہ کوئی بیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، عام حالات میں اگر میں جاتا تو ایک گھنٹہ لگتا، لیکن میں نے چالیس منٹ میں وہ سفر طے کر لیا۔

میں بملا کے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ تب میں نے اپنا بازو دیکھا کافی بڑا زخم تھا۔ میں چند منٹ اسے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ میں نے اپنا بازو دھویا، تب شدید جلن ہونے لگی، میں وہاں کوئی دوا دیکھنے لگا۔ ایسے میں بملا کمرے میں داخل ہوئی، اس کے ہاتھ میں فسٹ ایڈ بکس تھا۔ اس نے مجھے باتھ روم میں دیکھا تو بولی۔

"اوکے تم نہا لو پہلے، میں بعد میں ڈریسنگ کر دوں گی۔"

میں نے سر ہلاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

☆......☆......☆

"اس وقت سوہنیا پتہ نہیں کہاں ہو گی؟" میں نے چائے کا خالی کپ ایک جانب رکھتے ہوئے یونہی پوچھا۔

"وہ اس وقت سفر میں ہو گی، وہ یہ شہر چھوڑ چکی ہے، اب وہ یہاں نہیں آئے گی۔" ہملا نے بڑے سکون سے بتایا۔

"وہ کیوں؟ کیا وہ......" میں نے پوچھنا چاہا تو وہ بولی۔

"اسے یقین ہے کہ اس قتل کی اعلیٰ سطح پر تفتیش ہو گی۔ ریاستی ادارے کوئی معمولی تو نہیں ہیں، وہ اس کا کھوج نکال لیں گے۔ اس کا وہی ویٹر دوست اسے پھنسا دے گا، اسے تو پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے، وہ تو سب بتا دے گا۔ وہ روپوش رہے گی یا پھر کسی دوسرے دیش چلی جائے گی۔" ہملا نے یوں کہا جیسے وہ ایک عام سی بات بتا رہی ہے۔

"ہملا، یہ تم نے سب کیسے کیا؟"

میرے کہنے پر اس نے میرے چہرے پر دیکھا، پھر بڑے آزردہ سے لہجے میں بولی۔

"تم نے کیا لینا ہے پوچھ کے، تمہارا کام ہو گیا اور اب تم چلے جاؤ گے۔"

"یہ بات تو سچ ہے کہ میں نے چلے جانا ہے، لیکن یہ سب......" یہ کہتے ہوئے میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر کہتی چلی گئی۔

"یہ جو دنیا، ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کو بڑا محفوظ سمجھتی ہے نا، ایسا نہیں ہے، اس کا نفسیات سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ وہ ہے دوسروں کو نیچا دکھانا، ہو سکتا ہے میں غلط ہوں، ایسا نہ ہو لیکن میں نے

اسی نہج پر کام کیا۔ کہنے کو بڑی آزادی ہے لیکن سبھی کسی نہ کسی حد تک اس کے غلام ہیں۔ یہاں غلط فہمی کو بڑی جلدی فروغ دیا جا سکتا ہے۔ بڑی معمولی سی مثال ہے، جیسے سوشل میڈیا پر اسکرین شارٹ لگا دینا، کسی ویڈیو کو وائرل کر دینا۔ یہ ایک تفصیل طلب بات ہے، جو ایسے سمجھ نہیں آتی۔"

"تھوڑا سمجھاؤ نا۔" میں نے کہا۔

"دیکھو، کمپیوٹر بنا ہی اس لئے تھا کہ دشمن پر پورے نشانے سے بم گرایا جا سکے۔ اس ایجاد کی بنیاد ہی میں منفی سوچ ہے۔ یہ تو دنیا اس پر مثبت سوچ لے آئی۔ جس کی بنیاد میں فساد ہو، اس سے خیر کی توقع کیا کی جا سکتی ہے۔" بملا نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو اچانک مجھے خیال آیا تبھی میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بملا، تمہاری گاڑی پورچ تک گئی تھی، ظاہر ہے وہاں پر کیمرے تو لگے ہوں گے۔ اس سے میں بھی اترا تھا، میں......" میں نے کہنا چاہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ان کیمروں سے میں تمہاری تصویر تو نکال نہیں سکتی۔ ہاں، ایک جگہ سے کوشش کی گئی ہے کہ ان کے کمپیوٹر کو ہیک کر لیا جائے اور وہ پوری فلم ختم کر دی جائے، اب پتہ نہیں کامیابی ہوئی ہے کہ نہیں۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں ممکن ہے، جب سے اس ہوٹل کو ٹارگٹ کیا ہوا تھا، تب سے ان کے کمپیوٹر ہماری نگاہ میں تھے۔"

"اور تمہاری گاڑی، اگر وہ ریکارڈ اس میں رہ گیا تو......؟" میں نے پوچھا۔

"گاڑی تو چلے بھی گئی، اس کا رنگ اور نجانے کیا کچھ تبدیل کر دیا جائے گا، پہلے بھی تو

ایسے ہی میرے پاس آئی تھی۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ یہ بھلا کوئی عام سی لڑکی نہیں ایک خطرناک بلا کا نام ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا تبھی میں نے کہا۔

"تم تو الوداع کر کے چلی گئی تھی، پھر وہاں کیوں رہی؟"

"ارے میرے راجہ، میں تمہیں کہتی کہ میں یہیں ہوں تو ذرا تمہارے دماغ میں میرے بارے میں رہتا۔ جبکہ میں جانتی تھی کہ سوہنیا نے جو تمہیں فرار کا راستہ دکھایا ہے، اس کے علاوہ تم کہیں سے نکل ہی نہیں سکتے۔ تمہیں کسی دوسرے راستے کا پتہ ہی نہیں تھا، اس لئے میں تمہارا پیچھا انتظار کر رہی تھی۔"

"اتنا وقت کہاں گزارا؟"

"مختلف سٹورز پر خریداری کرتے ہوئے۔ میں نے سارا وقت وہیں گزرا، یہاں تک کہ سوہنیا نے مجھے کال کر کے بتا دیا کہ وہ نکلنے لگی ہے۔"

میں اس کی طرف دیکھنے لگا تھا اور وہ بڑے پیار سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس لڑکی کا دماغ کیسا تھا۔ مجھے اب تک اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تبھی میں نے اپنے لہجے میں ملائمت گھولتے ہوئے پوچھا۔

"اب میں یہاں سے کیسے نکلوں گا؟"

"کم از کم ایک دو دن تو یہیں پڑے رہنا پڑے گا۔ شہر میں ہر طرف ناکے ہوں گے۔ ایسے موقعوں پر پولیس کی عیاشی ہو جاتی ہے۔ وہ عام لوگوں کو تنگ کر کے بہت لوٹتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔ "یہیں پڑے رہو، تمہارا کیا جاتا ہے۔"

"تم پر بھی کوئی افتاد پڑ سکتی ہے؟" میں نے اسے ڈرانا چاہا۔

"تم سے بڑی افتاد بھی کوئی ہو سکتی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا پھر چند لمحوں بعد وہ سنجیدگی

سے بولی، ”میں جانتی ہوں کہ تم وہ نہیں ہو، جو تم نے اپنے بارے میں بتایا، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم ہندو نہیں ہو، تم ویر سنگھ نہیں ہو۔ تمہارا اسٹائل بتا رہا ہے کہ تم کوئی تربیت یافتہ ہو۔ وقت آنے پر تم مجھے بھی قتل کر کے جا سکتے ہوں۔ میں ایک ایسے انسان کے پہلو میں پڑی ہو جو خطرے کی صورت میں مجھ پر بھی رحم نہیں کرے گا لیکن، میں تمہارے منہ سے کوئی سچائی نہیں جاننا چاہتی، بس یہ رات اور ایک دن مجھے دے دو، پھر تم جہاں چاہو گے میں تمہیں چھوڑ دوں گی......وعدہ......“ اس نے کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے یہ رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔ تبھی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”ٹھیک ہے، میں یہیں ہوں۔“

میرے یوں کہنے پر اس کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں تک خوش دکھائی دینے لگیں۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”آؤ دیکھیں اب تک کیا بنا ان کا؟“

وہ مختلف چینل اور سائٹس پر جاتی رہی۔ کچھ سوشل میڈیا کے لوگوں اور گروپوں کو دیکھتی رہی۔ ان سب سے یہی پتہ چلا کہ ستیہ رام اور تیسرا شخص بری طرح قتل ہوئے ہیں۔ شیو نرائن باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن انتہائی زخمی ہو جانے کی وجہ سے ہسپتال میں پڑا تھا۔ اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ابھی تک میرا پیغام ریاستی ادارے تک نہیں پہنچا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہی وہ موقعہ تھا کہ میں فرار ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی ریاستی اداروں کو پتہ چلتا، ایک ایسا ان دیکھا جال میرے گرد پھیل جانے والا تھا کہ میں چاہتے ہوئے بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ کچھ دیر پہلے کیا گیا بھلا سے وعدہ اور یہ معلومات مجھے چکرا دینے کے لئے کافی تھیں۔

ہے پور میرے لئے اجنبی ہو چکا تھا۔ شریدھر کا فون بند جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے فون ہی کہیں پھینک دیا ہو۔ اسے ایسا کرنا بھی چاہئے تھا۔ اس نے تو یہاں شہر میں رہنا تھا۔ سادھو مائی کا نمبر میرے پاس محفوظ تھا لیکن ان حالات میں اس سے رابطہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بلاشبہ وہ جان گئی ہو گی کہ میں یہاں اس شہر میں کیا کرنے آیا تھا۔ جگو دادا اور پرتاپ سنگھ والے معاملے کے بعد ستیہ رام والے واقعہ تک پہنچ جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اگر کوئی عام قتل ہوتا تو شاید وہ خاموش رہتی۔ لیکن اس میں ایک ریاستی ادارے کا بندہ بھی قتل ہوا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ایسے حالات میں کسی قاتل کو اپنے ہاں پناہ دینے کا مطلب اپنے اور اپنے سارے "سیٹ اپ" کو داؤ پر لگا دینے والی بات تھی۔ ممکن ہے وہ مجھے اپنے پاس رکھ کر خاموشی سے ان کے حوالے کر دیتی تاکہ اپنی ساکھ کو مزید مضبوط بنا کر رکھ سکے۔ اس کے پاس واپس جانا انتہائی خطرناک تھا۔ ان دونوں کے علاوہ شہر میں میرا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ تیسری بملا تھی، جس کے پاس ٹھہرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کوئی بھی کڑی ریاستی اداروں کو یہاں تک پہنچا سکتی تھی۔ وہ بھی کچھ عرصے کے لئے یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔

میں یہاں جہاز کا سفر نہیں کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے اس کے لئے کچھ نہ کچھ تو شناخت چاہئے ہوتی ہے جو اس وقت میرے پاس نہیں تھی۔ کسی بھی کار سے سفر کرنا بھی ایک رسک تھا۔ شہر بھر میں ناکوں کے علاوہ کسی بھی جگہ میں شک کی زد میں آسکتا تھا۔ میں خود کو ان کی جگہ رکھ کر سوچ رہا تھا۔ ٹرین کا سفر کافی حد تک محفوظ ہو سکتا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ مجھے جانا کہاں ہے؟

میں ساری رات یہی سوچتا رہا۔ بملا میرے ساتھ بڑی سکون سے سوتی رہی تھی، میں کبھی سو جاتا اور کبھی اچانک میری آنکھ کھل جاتی۔ عجیب و غریب اور نہ سمجھ میں آنے والے ڈراؤنے خواب مجھے جگا دیتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب میرے دماغ کے کرشمے ہیں۔ میرے ارد

گرد بہت سارا خطرہ تھا۔ اس خطرے سے نکلنا ہی اب سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ بملا نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بولی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہی ان دنوں کے حالات کے بارے میں۔" میں نے کہا۔

"دیکھو ایسا کرتے ہیں، دو چار دن کے لئے میرے آبائی گاؤں جاتے ہیں، جب یہ معاملہ ......"

"وہاں بہت تھوڑے لوگ ہوں گے، گاؤں میں ایک اجنبی شخص جلد پہچانا جاتا ہے۔ جہاں ہجوم ہو، وہاں گم ہو جانے میں آسانی ہوتی ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"بالکل، ایسا ہی ہے۔ میں اپنے چند دوستوں کا اکٹھا کرتی ہوں، کسی جگہ تور پر نکلتے ہیں۔ تم جہاں چاہو نکل جانا اور میں چند دن بعد واپس آ جاؤں گی۔"

"کتنی دیر میں اکٹھا کر پاؤ گی، کیونکہ صبح ہوتے ہی یہاں احتجاج اور نہ جانے کیا کیا چلنے لگے گا۔" میں نے اس سے کہا تو وہ لمحہ بھر سوچنے کے بعد بولی۔

"تم سکون سے کچھ دیر کے لئے سو جاؤ، میں کرتی ہوں کچھ۔"

"اوکے۔" میں نے کہا اور کروٹ بدل لی۔ میں خود بھی اس کیفیت سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

دوپہر ہو چکی تھی۔ شہر میں کرفیو کا سماں تھا۔ کئی جگہ توڑ پھوڑ ہو چکی تھی۔ میں اور بملا صبح ہی ایک لڑکی کے اپارٹمنٹ میں آ گئے تھے۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے ریلوے اسٹیشن نزدیک تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کو ریلوے اسٹیشن پر ہی پہنچنے کا کہا تھا۔ میں ایک کمرے میں پڑا رہا اور وہ

دونوں اپنے دوستوں سے رابطے میں رہیں۔جیسے ہی سب پہنچ گئے،اس نے مجھے چلنے کو کہا۔ میں تیار تھا۔میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور ان کے ساتھ چل دیا۔

ہم بلڈنگ سے نکل کر سڑک پر آ کھڑے ہو گئے۔میں نے قمیص شلوار پہنی ہوئی تھی،جس سے میرے بازو کا زخم چھپ چکا تھا۔میری جیب میں کچھ روپے،سیل فون اور پسٹل تھا۔میں نہیں جانتا تھا کہ آگے کیا ہونے والا تھا۔ہم کسی ٹیکسی کی تلاش میں ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد ایک ٹیکسی ہمارے پاس آ کر رک گئی۔تقریباً پانچ سات منٹ کے سفر کے بعد ہم ریلوے اسٹیشن جا پہنچے۔

ریلوے اسٹیشن پر کافی رش تھا۔یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سارا شہر ہی یہاں اُمنڈ آیا ہو۔یہ شہر کے حالات خراب ہونے کی وجہ تھی یا پھر ایسا معمول تھا،جو بھی تھا یہ ہمارے فائدے میں تھا۔اگرچہ وہاں واک گیٹ لگے ہوئے تھے۔لیکن کوئی ان کی پروا نہیں کر رہا تھا۔میں نے اسے غنیمت جانا اور واک گیٹ سے الگ ہو کر گزر گیا۔بملا اور لڑکی واک گیٹ سے گزر گئیں۔ہم پلیٹ فارم پر آ گئے۔

بملا کے سارے دوست اکٹھے ہونے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگے تھے۔ہم کل سات تھے،جن میں چار لڑکیاں اور تین لڑکے تھے۔ایک لڑکا جو سب سے پہلے وہاں پہنچا تھا،اس نے ٹکٹ خرید لئے تھے۔اسی دوران ٹرین آ گئی۔لوگوں کا رش ایک دم سے بڑھ گیا۔میں خاموشی سے ان کے ساتھ چلتا چلا جا رہا تھا۔میرا دھیان ارد گرد زیادہ تھا۔چند لوگوں پر مجھے شک گزرا جیسے وہ وہاں پر خاص ڈیوٹی کر رہے ہو۔میں نے اسے اپنا وہم سمجھا۔ہم نے بھی اپنے اپنے بیگ اٹھائے اور ٹرین میں سوار ہو گئے۔وہ ایک سلیپر تھا،جس میں خاصی خنکی تھی۔

ابھی میں سب سے اجنبی تھا۔سو خاموشی سے سفر شروع ہو گیا۔تب میں نے بملا سے پوچھا۔

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"جیسلمیر......" اس نے ایک ہی لفظ کہا تو میرے چونک گیا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ وہ شہر میرے لئے کیسا ہو سکتا تھا۔ میں نے بڑے سکون سے پوچھا۔

"کتنا سفر ہوگا، مطلب کتنے گھنٹے کا؟"

"یہی کوئی بارہ تیرہ گھنٹے لگیں گے۔" اس نے کہا اور باقی دوستوں سے مخاطب ہو گئی۔ اس نے بڑی دھیمی آواز میں میرا تعارف کرایا اور آنکھ دبا کر بولی، "میرا نیا بوائے فرینڈ۔"

اس نے کہا تو دبی دبی آوازیں ابھریں۔

"اچھا ہے...... ہینڈسم ہے...... واؤ...... تبھی کہوں اچانک پروگرام...... چلو تمہارے ساتھ ہمارے بھی مزے...... ان دنوں میں تو اچھا ہی تھا......"

میں کافی حد تک دباؤ میں آ گیا تھا۔ ایک تو اس شہر سے نکلنا، دوسرا خیریت سے سفر گزر جانے کی خواہش اور تیسرا ابھر سے جیسلمیر...... میں انہیں بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ وہاں پہلے ہی ہم ایک داستان چھوڑ آئے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا، یہاں سے نکل جائیں، پھر باقی بعد میں سوچا جا سکتا ہے۔

"اے بھلا، وہاں پر بکنگ کرا لی ہے نا کسی ہوٹل ول کی؟" ایک لڑکے نے پوچھا تو وہ بولی۔

"ہاں نا، سب کے لئے الگ الگ کمرہ، ایک بچی گی وہ میرے ساتھ رہ لے گی بے چاری۔" اس نے کہا تو ایک دم سے قہقہہ لگ گیا۔ میں بس مجبوری میں دھیرے سے مسکرا ہی سکا تھا۔

☆......☆......☆

جیسلمیر ریلوے اسٹیشن پر اترے تو آدھی رات سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم جے پور

سے بھی نکل آئے تھے اور راستے میں بھی تقریباً کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس وقت ہم بیکانیر سے آگے نکل آئے تھے۔ ہمارے سلیپر میں باتیں بڑے زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ چار لوگ تاش کھیل رہے تھے، تب ایک ادھیڑ عمری خاتون ہمارے پاس آ گئی۔ اس نے بہانہ یہی بنایا تھا کہ وہ بھول کر آ گئی ہے لیکن میرے سمیت سبھی سمجھتے تھے کہ یہ بھول کر آنے والی عورتیں کیسی ہوتی ہیں۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے بیٹھی رہی پھر تھوڑے بہت سفر کے بارے میں ان کے بارے میں سوال جواب کر کے اٹھ گئی تھی۔ بلاشبہ وہ ڈیوٹی پر تھی۔ اسے جہاں بھی شک ہوتا، وہ رپورٹ کرتی۔ اس کے جانے کے بعد میں الرٹ ہو گیا تھا۔ لیکن جیسلمیر آنے تک کچھ نہیں ہوا تھا۔ یہاں سے نکلنا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ میں جان بوجھ کر لوگوں کے رش میں آ گیا۔ ممکر داک گیٹ سے الگ ہو کر نکلتا چلا گیا۔ باقی میرے ساتھ آ گئے۔ ایک ہائی ایس ویں ہمارے لئے ہوٹل کی طرف سے آئی ہوئی تھی۔ ہم اس میں بیٹھے اور چل دیئے۔

ہم ابھی راستے ہی میں تھے کہ چاچا صد اجید کا فون آ گیا۔ میں نے کال رسیو کی اور بہت محتاط انداز میں بات کی۔

''کہاں ہو تم اس وقت......؟''

''جیسلمیر......'' میں نے کہا تو وہ بولے۔

''اوہ، وہاں کیا کر رہے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''بس آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکنے جا رہا ہوں۔'' میں نے گول مول سی بات کی جسے وہ فوراً سمجھ گئے۔ تبھی انہوں نے کہا۔

''اچھا، جیسے ہی ذرا سکون ملے، مجھے بتانا، میں تم سے ایک اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

ہم ہوٹل پہنچ گئے تھے۔ وہ ہوٹل کبھی شہر سے باہر تھا۔ اب وہ آبادی میں آچکا تھا۔ اگر کہا جائے تو وہ شہر سے چار پانچ کلومیٹر باہر ہی تھا۔ وہ سب عیش کرنے آئے ہوئے تھے۔ اتنا سفر ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ ہمیں کمرے مل گئے۔

سامان رکھنے کے بعد جب فریش ہو چکے تو کھانے کے لئے لان میں جا بیٹھے۔ کھانے میں ابھی دیر تھی۔ میں اٹھ کر سوئمنگ پول کی جانب بڑھ گیا۔ اگرچہ وہاں چند لوگ نہا رہے تھے لیکن ان کا شور نہیں تھا۔ میں ایک اندھیرے گوشے میں جا بیٹھا۔ تبھی میں نے چاچا عبدالمجید کو کال کر دی۔ کال رسیو کرتے ہی انہوں نے کہا۔

"چلو یہ اچھا ہوا، تم جیسلمیر آ گئے۔ جب تم یہاں تھے، تب ان دنوں ایک بات سامنے آئی تھی مسنگ پرسن والی، وہ ندیم ڈاڈھا یا تھا جس نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ مسنگ پرسن ہے؟"

"ہاں بالکل مجھے یاد ہے وہ ندیم ڈاڈھا یا ہی تھا۔"

"ہاں تب سے ہم نے یہاں ایک پراجیکٹ شروع کیا، دیکھیں تو سہی یہاں کتنے مسنگ پرسن ہیں اور وہ کیا کر رہے ہیں۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ چلا ہے کہ یہاں ایک اکیڈمی نما ایک تربیت گاہ ہے۔ جہاں صرف اور صرف پاکستان مخالف ذہن سازی کی جاتی ہے۔ یہاں پر چونکہ ٹورسٹ زیادہ آتے ہیں تو کئی غیر ملکی بھی انہیں تربیت دے رہے ہیں۔ یہ سب ہمارے وطن کے خلاف کام کرنے والے ہیں۔ چاہے وہ وطن واپس آجائیں یا باہر ہی بیٹھے رہیں۔"

"یہ پراجیکٹ کہاں تک پہنچا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے، اسے ختم کرنا ہے، اس کے لئے چند لوگ یہیں جیسلمیر پہنچ رہے ہیں۔ پہلے

شاید دو چار دن لگ جاتے لیکن اب ایک دو دن ہی میں آ جائیں گے۔ اگر تم چاہو تو......؟"
انہوں نے کہا تو میں تڑپ اٹھا، میں نے تیزی سے کہا۔
"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟"
"نہیں، کوئی ایسی بات نہیں ہے، میں دراصل تمہارے لئے کچھ دوسرا سوچ رہا تھا، اس سارے مشن میں جس تنظیم نے کام کیا تھا وہ کلیان جی ہے اور تم سمجھتے ہو کہ ستیہ رام ختم ہو گیا تو اس کا بڑا بھی ختم ہو گیا؟"
"نہیں یہ تو پورے بھارت میں پھیلی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔
"نہیں یہ اطلاع بالکل غلط ہے۔ یہ صرف راجستھان تک محدود ہے اور وہ بھی چند شہروں میں اس کا پورا کھوج نکل آیا ہے۔" انہوں نے بتایا۔
"اصل کہانی کیا ہے؟" میں نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔
"اس کا بڑا، کلیان آنند اس وقت نیپال میں بیٹھا ہے۔ اس کا تعلق اودے پور ہی سے ہے۔ وہ ایک بہت بڑا مجرم تھا۔ خود ریاست اس سے تنگ تھی۔ اس نے ریاست سے کچھ دو کچھ لو پہ ڈیل کر لی۔ وہ ڈیل یہ تھی کہ اپنے کام کے ساتھ وہ ریاست کا کام بھی کرے گا، وہ یہاں سے نکل کر نیپال چلا گیا۔ وہ دونوں جگہوں پر اپنا نیٹ ورک بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔"
"اوہ، تو وہ نیپال میں ہے؟ کیا وہاں اس کا پتہ چل گیا ہے کہاں ہے؟" میں نے سرسراتے ہوئے کہا۔
"ابھی اس میں کامیابی نہیں ہوئی، میں نے تمہیں اس لئے بتایا ہے کہ اپنے ذہن پر یہ کلیان جی والا بوجھ ختم کر دو۔ کیونکہ یہاں جتنے بھی کلیان جی مارو گے، اتنے مزید پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔" انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا تو میں نے تیزی سے پوچھا۔

”اور اگر اسی سانپ کا سر کچل دیا جائے تو......؟“

”پھر یہی ہو سکتا ہے کہ ان کا نیٹ ورک ٹوٹ جائے۔“ انہوں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”کیا میں بتایا جا سکتا ہوں؟“ میں نے دبے دبے جوش سے پوچھا۔

”اگر تم چاہو تو یہ مشن تمہارا منتظر ہے۔“ انہوں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”یہ مشن میں ہی نپٹاؤں گا۔“ میں نے ایک عزم سے کہا۔

”تو ٹھیک ہے، یہاں پر اکیڈمی والا کام ختم کرو، کل تک کچھ لوگ تمہیں رپورٹ کریں گے۔“ انہوں نے کہا۔

”میں انتظار کروں گا۔“ میں نے کہا تو انہوں نے کال ختم کر دی۔ میں جس طرح اس پر غور کرتا چلا جا رہا تھا، میرے اندر کی کیفیت بدلتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے فون جیب میں رکھا اور بملا کے پاس آ گیا۔ وہ سب کھانے میں مصروف تھے۔

☆......☆......☆

دن کافی چڑھ آیا تھا۔ ہم اسی قلعے کے سامنے تھے جہاں اودھے رام کے کہنے پر میں نے ایک قتل کیا تھا۔ اسی قلعے میں وہ ریزارٹ تھا۔ ایک دم ہی سے مجھے مادھو کر یاد آ گیا۔ اس بے چارے کا پتہ نہیں کیا بنا ہوگا۔ اس نے آخری وقت تک میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اس کی یاد کی اوٹ میں مانسی جھانکنے لگی۔ وہ سانولی سی لڑکی نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔ میں ان کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ بملا نے میرے بازو میں ہاتھ ڈال دیا۔

”کہاں کھوئے ہوئے ہو؟“

”یہی سوچ رہا ہوں کہ یہ قلعہ بنانے والے لوگ کیسے تھے؟ اس وقت کیا ماحول ہوگا جب یہ قلعہ بنا تھا۔ زندگی کیسی ہوتی ہوگی؟“ میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وہ جیسی بھی ہوگی، ہمیں اس سے کیا، اس وقت کا سوچو جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔
انجوائے کرو۔" اس نے میرے ساتھ لگتے ہوئے کہا۔

"ویسے بھلا، تمہیں اپنی اس اکیلی دوست کا کچھ خیال نہیں، کس طرح تنہا ہے۔ کتنی
پریشان سی لگ رہی ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"اب اس کا دوست نہیں آیا تو میں کیا کروں۔ اگر تمہیں اتنا ہی خیال ہے تو تم دے دو
اسے وقت......" اس نے طنزیہ انداز میں کہا تو میں قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

ہمارے ایک ساتھی نے ٹکٹ خرید لئے تھے اور ہم اندر جانے کو تیار تھے۔ کچھ ساتھی اندر چلے
بھی گئے تھے کہ دو لوگ ہمارے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں مقامی لگتے تھے۔ انہوں
نے مقامی لباس کی بجائے، بڑی نفیس شرٹ اور پتلون پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ انہوں نے
ٹائی بھی لگائی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک پتلے سے لمبے آدمی نے انگریزی میں پوچھا۔

"ہیلو، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں۔"

"جے پور، ہم جے پور سے آئے ہیں۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا، میں سمجھ گیا تھا کہ وہ
کوئی فورسز کا بندہ ہے اور اسے ہم پر شک پڑ گیا ہے۔

"وہاں کس جگہ سے؟" اس نے میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جگت پورہ سے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"یہاں کہاں ٹھہرے ہیں؟" اس نے پھر میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا تو
میں نے ہوٹل کا نام بتا دیا۔ وہ سر ہلاتا ہوا شکریہ کہہ کر چلا گیا۔ دوسرا بھی اس کے پیچھے بڑھ گیا۔
میں اس طریقہ سے پوری طرح واقف تھا۔ اگر کسی پر یوں شک پڑ جائے تو اس سے سوال کیے
جاتے ہیں، سوال کرنے اور جواب لینے کے دوران چہرہ، آواز اور لہجہ دیکھا جاتا ہے۔ کبھی

تینوں شک کو یقین میں بدلتے ہیں۔ شک پھر بھی انہیں رہتا ہے کیونکہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ شک ہوا کیوں؟ کافی آگے جا کر ہم ایک ٹولی میں ہو گئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ہمیں دیکھا جا رہا ہو گا۔ اس دوران بسلا نے ہولے سے پوچھا۔

”یہ کس وجہ سے سوال کر رہا تھا؟“

”اسے کوئی شک ہو گیا ہو گا۔ تم اپنی باڈی لینگویج سے ان کے شک کو یقین میں مت بدلنا۔“ میں نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوکے، میں سمجھ گئی۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

میں فطری طور پر یہ سمجھنے لگا تھا کہ اگر مجھے یہاں سے فرار بھی ہونا پڑے تو میں یہاں سے کس طرح نکلوں گا۔ میں نے بسلا سے ہاتھ چھڑا لیا تو اس نے مجھے دیکھا، پھر دھیرے سے بولی۔

”کوئی خطرہ ہے کیا؟“

”مجھے لگتا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلانے لگی۔ میں غیر محسوس انداز میں ادھر اُدھر کا جائزہ لینے لگا۔ مگر مجھے کوئی ایسا بندہ دکھائی نہیں دیا جس نے ہم پر نگاہ رکھی ہوئی ہو۔ لیکن میرے اندر بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ ایسا یونہی نہیں ہوتا تھا۔ کوئی خطرہ تھا میرے آس پاس۔ میں نے بسلا سے کہا۔

”میں اگر اچانک گم ہو جاؤں تو پریشان مت ہونا، اپنے ساتھیوں کے ساتھ سکون سے واپس ہوٹل چلی جانا، میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔“

”اوکے، میں سمجھتی ہوں۔“ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا اور پھر میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی۔ انہی لمحات میں ایک نوجوان لڑکا ہمارے دائیں سے نکلتا ہوا سامنے آ گیا۔ اس نے آتے ہی بڑے ادب سے پوچھا۔

"ہیلو، میں ایک اچھا گائیڈ ہوں، اس پورے قلعے کے علاوہ پورے شہر کے بارے میں ذرا ذرا سی بات جانتا ہوں۔ میں ایسے علاقوں سے بھی واقفیت رکھتا ہوں کو عام سیاحوں کی نگاہوں سے اوجھل رہ جاتے ہیں۔ اگر آپ میری خدمات سے استفادہ کریں گے تو بہت زیادہ انجوائے کریں گے۔"

"شکریہ اپنے بارے میں بتانے کا لیکن ہمیں کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں، ہم خود ہی انجوائے کرلیں گے۔" بھلا نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"میم نے تمہیں کہہ دیا سو اب جاؤ۔"

وہ چند لمحے ہمیں دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ میں نے اس پر نگاہ رکھی کہ وہ کسی دوسرے کو بھی اپنی خدمات پیش کرتا ہے یا صرف ہمارے لئے ہی آیا تھا۔ اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب وہ لوگوں کی بھیڑ میں اچانک گم ہو گیا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور سمجھ گیا۔ مجھ پر شک تو انہیں ہو ہی گیا تھا اب وہ مختلف حیلوں سے مجھے پریشان کرنا چاہتے تھے کہ اگر میں بھڑک اٹھتا ہوں، یا کچھ بھی ایسا ویسا کرتا ہوں تو وہ مجھ پر ہاتھ ڈال سکیں یا پھر چھوڑ دیں۔

ہم کافی دیر تک گھومنے کے بعد کھانے کی ایک جگہ پر آبیٹھے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے اپنے چاروں طرف نگاہ رکھی۔ کوئی بھی قریب مجھے دکھائی نہیں دیا۔ وہیں بیٹھے مجھے کال آگئی۔ وہ عرفان حمید تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی جیسلمیر پہنچا تھا۔ وہ ایک مقامی کے گھر پر آچکا تھا، وہیں سے اس نے مجھے کال کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے وہ ٹھکانہ بتا دیا جہاں ہم مل سکتے تھے۔ وہ وقت آگیا تھا جب میں نے بھلا سے الگ ہونا تھا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور

واش روم کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے وہاں زیادہ وقت نہیں لگایا، باہر نکلا اور بجائے ہملا کی طرف جانے کے، وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

میں قلعے سے نکل کر سڑک پر آ گیا تھا۔ سڑک کی دوسری جانب پولیس اسٹیشن تھا۔ میں نے بڑے سکون سے ایک ٹیکسی والے سے بات کی اور چل پڑا۔ عرفان نے مجھے جس ٹھکانے کے بارے میں بتایا تھا، میں اس سے تھوڑے فاصلے پر اتر گیا۔ مجھے یہی خطرہ تھا کہ میرا تعاقب نہ کیا جا رہا ہو۔ میں نے ادائیگی کی اور پیدل چلنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک ادھر ادھر پھر کر میں نے یقین کر لیا کہ کوئی میرا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔ تب میں اس ٹھکانے کی جانب چل دیا۔

شہر کی اندرون گلیوں میں وہ ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ جہاں نچلے درجے کے لوگ کھا پی رہے تھے۔ ایک شور مچا ہوا تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ بازار نما اس گلی میں کافی بھیڑ تھی۔ میں نے جاتے ہی چائے کا آرڈر دے دیا۔ میرے سامنے عرفان بیٹھا ہوا تھا۔ اسنے مجھے دیکھ لیا، نگاہوں ہی نگاہوں میں سلام دعا بھی ہو گئی۔ تب اس نے مجھے میسج کر دیا۔

”اتنی احتیاط کیوں؟“

”نجانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔“ میں نے جواباً میسج کر دیا۔ تب اس نے میسج کیا۔

”کوئی بات نہیں، میں دیکھتا ہوں تم اسی سڑک پر سیدھے چلتے جاؤ، میں تمہارے پیچھے ہوں۔“

میں نے بڑے سکون سے چائے پی، اس دوران میں نے دیکھا، کوئی ایسا بندہ نہیں آ کر بیٹھا جسے میں مشکوک کہہ سکتا تھا۔ اس ریستوران سے پہلے میں نکلا، پھر میرے پیچھے ہی عرفان نکل پڑا۔ تھوڑی دیر بھول بھلیوں میں رہتے ہوئے ہم ایک پرانے سے مکان میں آ گئے۔ وہ بڑا

تنگ سا پرانا مکان تھا۔ اس کی دیواروں سے پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ سیلن زدہ سا تھا جس میں تھوڑی بدبو اٹھ رہی تھی۔ وہ مجھے لیتا ہوا ایک کمرے میں چلا گیا۔ وہاں زمین پر میٹرس بچھے ہوئے تھے۔ وہ مقامی میزبان وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ملا، پھر باہر نکل گیا۔ ہم دونوں وہاں بیٹھ گئے۔

"میں نے آتے ہی اس اکیڈمی کو باہر سے دیکھا ہے، اس کی پوری لوکیشن میں نے ریکارڈ کرلی ہے۔" اس نے مجھے بتاتے ہوئے فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے اس میں موجود چند ویڈیوز کو دیکھا۔ وہ شہر کے پوش علاقے میں بڑا سا را تین منزلہ بنگلہ تھا۔ وہ بالکل کونے میں تھا جہاں اسے دو سڑکیں لگتی تھیں۔ اس کے سامنے ایک چھوٹا سا پارک تھا۔ دیکھنے میں وہ کافی خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس کی پارکنگ میں چند موٹر سائیکلیں اور کچھ کاریں کھڑی تھیں۔ باہر گیٹ پر ایک گارڈ کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں اسلحہ کی بجائے ڈنڈا تھا۔ اگرچہ لوکیشن کی معلومات تھی لیکن اندر کیا تھا، اس بارے جاننا بہت ضروری تھا۔ اسی دوران مقامی میزبان ٹھنڈا لے آیا۔ اس نے بھی ہماری تھوڑی باتیں سن لی تھیں۔ اس لیے وہ بولا۔

"میرے خیال میں شام سے پہلے پہلے سب آجائیں گے، تب ہمارا ایک دوست بھی آجائے گا، جو وہاں پر تربیت حاصل کر رہا ہے۔ وہ سب کچھ بتا دے گا۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" میں نے کہا اور ٹھنڈا پینے لگا۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ اسی دوران ہملا کا فون آگیا۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ تم لوگ انجوائے کرو، میں کسی بھی وقت ان سے آملوں گا۔ وہ بڑے آرام سے مان گئی۔

سہ پہر ہوگئی تھی۔ ہمارے دو ساتھی مزید آگئے تھے۔ ہم بیٹھے یونہی گپ شپ کر رہے تھے کہ وہ مقامی بھی آگیا، جو وہاں پر تربیت لے رہا تھا۔ کچھ دیر باتوں کے بعد اس نے کہا۔

"میرے خیال میں تو اتنی تام جھام کی ضرورت نہیں تھی، اس ادارے ہی کو ختم کرنا ہے تو ایک چھوٹے بم کی ضرورت ہے۔ وہ تو میں بھی لگا سکتا ہوں، یا کوئی بھی......"

"ادارے عمارتوں سے نہیں بنتے، ایک عمارت ختم ہو گی تو دوسری بن جائے گی، چند کروڑ کا ہی نقصان ہو گا نا، ایسے کاموں میں چند کروڑ کا ضائع ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا

"میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ واقعی اتنے تام جھام کی ضرورت نہیں، پتہ نہیں کیوں یہ مشن دے دیا گیا ہے۔" میں نے ایک خیال کے تحت اپنی سوچ کو اپنے تک محدود رکھا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر پوچھا، "تم تھوڑا تفصیل سے بتاؤ گے، اندر ہے کیا؟"

وہ تفصیل سے بتانے لگا۔ اسے تینوں منزلوں کے بارے میں پوری پوری جانکاری تھی۔ اس نے اپنی جیب سے چند کاغذ نکالے، ان پر پورا نقشہ بنا ہوا تھا۔ وہ انگلی رکھ کر ہمیں سمجھانے لگا۔ میں سمجھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں پلان بنتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

رات کا پہلا پہر تھا۔ ہم نے اس اکیڈمی سے تھوڑے فاصلے پر فور وہیل رکوا دی تھی۔ وہ مقامی میزبان گاڑی چلا کر یہاں تک آیا تھا۔ میں نے عرفان حمید کو سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ انہوں نے تھوڑی دیر بعد فور وہیل سے نکلنا تھا۔ میں بڑے سکون سے چلتا ہوا اکیڈمی کے سامنے گیا۔ اس کا دروازہ لگا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں وہ مقامی بتا چکا تھا کہ رات کے وقت اس کے دروازے لگ جاتے ہیں۔ میں سائیڈ والی دیوار کے ساتھ آ گیا۔ دور گلی کے سرے پر لگے کھمبے پر بلب روشن تھا۔ پوری گلی سنسان تھی۔ میں نے اپنی جیب سے نائیلون کی

رسی نکالی، اس کے ساتھ کنڈی جوڑی اور دیوار پر لگی لوہے کی سلاخوں میں پھنسا دی۔ اسے کھینچ کر دیکھا، مضبوط پاتے ہی میں رسی کے سہارے اوپر چڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے رسی اندر کی اور نیچے آ گیا۔

میں جانتا تھا کہ جس طرح کی وہ اکیڈمی ہے، وہاں پر کیمرے ضرور لگے ہوں گے، ممکن ہے ان پر کوئی دھیان دیئے بھی بیٹھا ہو۔ یہ سب میں نے ذہن میں رکھ کر پلان کیا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ہوتا ہوا، پہلی منزل کے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے گیلری میں ایک سیکورٹی گارڈ بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔ میرا اور اس کا فاصلہ پچاس فٹ سے زیادہ نہیں تھا، میں نے ایک لمحہ سکون کیا، اپنا پسٹل نکال کر سیفٹی کیچ ہٹایا اور پھر انتہائی سرعت سے بھاگتے ہوئے اس پر جا پڑا۔ وہ اچانک افتاد پر سنبھل بھی نہیں سکا۔ میں نے جاتے ہی پسٹل کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ اس نے مزاحمت کرنا چاہی لیکن میں نے اسے موقعہ ہی نہیں دیا۔ وہ بے جان سا ہو کر فرش پر لیٹ گیا۔ میں نے اسے ایک طرف کیا، اندر سے گیٹ کھولا اور پھر انتہائی تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ عرفان حمید اور ایک ساتھی باہر کھڑے تھے۔

میں انتہائی تیزی سے تیسری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد میرے سامنے چار دروازے تھے۔ ان میں سے ایک دروازہ وہاں کے باس کا تھا۔ میں نے اس دروازے کو دبایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر ہلکی ہلکی موسیقی چل رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر پتلا سا، سانولے رنگ کا، جس نے اپنے بال رنگے ہوئے تھے۔ ٹی شرٹ اور شارٹس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایسی ہی ایک ادھیڑ عمر، سفیدی فربہ مائل عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بھی ٹی شرٹ اور شارٹس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان بوتل کھلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں بیٹھے پی رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کے ساتھ ہی ایک لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا۔ اس کی اسکرین روشن تھی۔ وہ اس پر بڑے

غور سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے درمیان خاموشی حائل تھی لیکن جیسے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی، عورت ایک دم سے چیخ پڑی، پھر گھگیاتے ہوئے بولی۔

"وہ.... وہ.... دیکھو......"

اس ادھیڑ عمر نے میری جانب مڑ کر دیکھا، اس کے چہرے پر حیرت جمی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا، میں ان کے پاس پڑی تیسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ عورت کچھ زیادہ ہی گھبرا گئی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر بڑے سکون سے کہا۔

"میم......ریلیکس...... آپ اپنا شغل جاری رکھیں، مجھے ان سے بات کرنی ہے۔"

"کیا بات کرنی ہے تم نے مجھ سے، یہ کوئی طریقہ ہے یوں اندر آنے کا، تم اندر آئے کیسے؟" اس نے ادھیڑ عمر نے تحکمانہ انداز میں کہا تو میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ اکیڈمی آپ چلا رہے ہیں؟"

"ہاں، میں چلا رہا ہوں۔" اس نے اکڑتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہاں کیا پڑھاتے ہیں آپ؟" میں نے پھر سکون سے پوچھا۔

"یہی منیجمنٹ......" اس نے اس بار تھوڑا تسلی سے جواب دیا تو میں اٹھا اور میں نے گھما کر تھپڑ اس کے منہ پر مارا، وہ چکرا کر گر گیا، قریب بیٹھی عورت کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سچ بولو۔"

"کون ہو تم؟" اس نے فرش پر پڑے ہوئے شک بھرے انداز میں پوچھا تو میں نے سکون سے کہا۔

"جو پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ۔"

"اگر تم سچ جان کر آئے ہو تو وہی جو تمہیں پتہ ہے۔" اس نے کہا تو میں کھڑا ہو گیا، وہ سمجھ گیا کہ میں کیا کروں گا، اس لئے جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا، "میں بتاتا ہوں۔"

"جلدی بتاؤ، میرے پاس وقت کم ہے۔" میں نے کہا تو وہ کہتا چلا گیا۔

"تم جانتے ہو گے کہ جس طرح روس کا انقلاب سینما سے آیا، اسی طرح اب سوشل میڈیا سے ایک ذہنی انقلاب لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تھوڑے عرصے بعد یہ سوشل میڈیا ہر بندے کی رسائی میں آ جائے گا۔ بس ہم اس کے لئے کچھ خاص لوگوں کو تربیت دے رہے ہیں۔"

"کس قسم کی تربیت...... لوگوں کو ذہنی غلام بنانے کی...... لوگوں کو اپنے ہی ملک کے خلاف بھڑکانے کی...... فحاشی پھیلانے کی...... انتشار پھیلانے کی...... مذہب سے دور کرنے کی...... کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے حد درجہ جذباتی انداز میں کہا تو وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"میں تو کچھ بھی نہیں کر رہا، یہ ہر ملک کر رہا ہے۔ آنے والے وقت کے لئے۔ یہ ففتھ جنریشن وار ہے۔"

"اوکے......" یہ کہہ کر میں اٹھا اور اس لیپ ٹاپ کو اٹھایا تو مجھے لگا، اس کی جان نکل گئی ہے۔ میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور اس سے پوچھا۔

"اب تک جتنے لوگوں کو تم نے تربیت دی ہے، ان کی لسٹ کہاں ہے؟"

"وہ میرے پاس نہیں ہوتی۔" اس نے کہا تو میں نے پسٹل سیدھا کیا اور اس کی طرف تان کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو پروفیسر، میرے ساتھ تعاون کرو گے تو کچھ نہیں کہوں گا، چپ چاپ واپس چلا

جاؤں گا، ورنہ میں نے انگلی کا اشارہ کرنا ہے اور تم اس دنیا سے چلے جاؤ گے، اس کے ساتھ ہی تمہاری فتھ جنریشن وار بھی۔"

"بتا دو نا سب......" وہ عورت چیختے ہوئے بولی۔

لیپ ٹاپ اٹھانے کے بعد میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ جو کچھ بھی تھا، اسی میں تھا۔ میں بس وہاں سے اٹھنے کو تھا۔ میں نے جیب سے سائلنسر نکالا، پسٹل کے آگے لگا کر نال اس کی جانب سیدھی کر دی۔ وہ سمجھ گیا کہ میں اسے ضرور ماروں گا۔ اس لئے وہ نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ اسے پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ میں نے اس کی حالت دیکھ کر لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور اس کے ماتھے پر نال رکھ کر فائر کر دیا۔ پھر اس عورت کی جانب مڑا تو وہ بھی نیم بے ہوش ہو گئی۔ میں نے نال اس کے ماتھے پر رکھ کر کہا۔

"سوری میم......"

اس کے ساتھ ہی ٹرائیگر دبا دیا۔ وہ بھی ایک جانب لڑھک گئی۔ میں نے لیپ ٹاپ اپنی شرٹ کے اندر رکھا جو بہت مشکل سے آیا۔ مجھے لگا جیسے شرٹ پھٹ جائے گی۔ میں باہر آ گیا۔ ساتھ والے کمرے میں دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ عرفان حمید نے سب کو کور کیا ہوا تھا اور وہاں پر موجود دو مرد اور ایک عورت دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔

"یار ان کا کیا قصور ہے، انہیں کام کرنے دو۔"

"میں نے تو بس ایویں انہیں کور کیا ہوا تھا کہ شور نہ مچائیں۔" اس نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔

"بس اب چلیں۔" میں نے کہا تو وہ تیزی سے باہر کی جانب آیا۔ میں نے ان سب کی

طرف دیکھ کر کہا "اچھے بچوں کی طرح سکون سے بیٹھنا، ورنہ تم بھی اپنے باس کی طرح اس دنیا سے چلے جاؤ گے۔"

انہیں مجھ پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے دروازہ بند کیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ گیا۔ میرے دو ساتھی اپنا کام کر چکے تھے۔ ہم گیٹ سے نکلے اور بڑے اطمینان سے فور ویل میں جا بیٹھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی فور ویل چل پڑی۔ ہم زیادہ سے زیادہ سو میٹر تک گئے ہوں گے، پہلے ایک دھماکا ہوا۔ جس کا ارتعاش اتنا زیادہ نہیں تھا، اس کے بعد دوسرا دھماکا ہوا، جس کی لرزش ہم نے بھی محسوس کی۔ ہم تیز رفتاری سے نکلتے چلے گئے۔

ایک کراس پر میں اور ایک مقامی اُتر گئے۔ ہم واپس اس گنجان آبادی میں نہیں جانا چاہتے تھے۔ اس مقامی نے پارکنگ میں سے کار نکالی۔ میں اسکے ساتھ بیٹھا اور چل دیا۔ اس کا گھر موہن گڑھ روڈ کی نئی آبادی والے علاقے میں تھا۔ اس نے باہر سے تالا کھولا، اور پھر کار سمیت اندر چلا گیا۔ اس کی فیملی سوئی ہوئی تھی۔ وہ مجھے لئے اوپر منزل پر چلا گیا۔ وہ دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ اس نے ایک کھولا تو کافی حد تک ٹھیک تھا۔ تاہم وہاں گرمی تھی۔ اس نے میرے لئے چائے بنائی، میرے پاس کپ دھرا، ایک پانی کی بوتل رکھی اور نیچے چلا گیا۔

صبح کا نیلگوں احساس بیدار ہو گیا تھا۔ میں اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اگرچہ میں کوئی ہیکر نہیں تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ کسی بھی کمپیوٹر سے اس کا ڈیٹا کیسے ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے۔ اس لیپ ٹاپ تک ان لوگوں نے فوراً رسائی حاصل کر لی جو اسی کام کے لئے مامور تھے۔ دو سے تین گھنٹوں میں انہوں نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ اب وہ لیپ ٹاپ میرے لئے بے کار تھا۔ اسے کہیں بھی پھینکا جا سکتا تھا۔

☆......☆......☆

صبح کی دھوپ اتنی زیادہ نہیں پھیلی تھی۔ اس وقت بملا اپنے دوستوں کے ساتھ صحرا میں اونٹ کی سواری کر رہی تھی۔ اس کے اکاؤنٹ میں ایک کثیر رقم آ چکی تھی۔ جس کا اسے پتہ چل گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی اور مجھے فوراً اپنے پاس پہنچ جانے پر اصرار کر رہی تھی۔ میں اب کھلے میں پھرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں اوپری منزل پر بیٹھا ہوا کئی سوچیں سوچ رہا تھا۔ مجھے چاچا عبدالمجید کے فون کا انتظار تھا۔ رات اس سے طویل بات ہوئی تھی، جس میں اس نے مجھے ابھی وہیں رکنے کے لئے کہا تھا۔ انہوں نے مجھے ندیم ڈانڈیا کو چیک کرنے کے لئے کہا تھا۔ اس کے بارے میں اطلاع یہ تھی کہ وہ ایک کھیپ لے کر بارڈر پار کرنا چاہتا ہے۔ وہ کھیپ ان لوگوں کی تھی جو کیڈٹ می سے تربیت پا چکے تھے۔ ابھی کے ایک دو دن میں نکلنا تھا۔ یہ یقین کرنا تھا کہ وہ نکلا ہے یا نہیں؟ اگر نکل گیا ہے تو اس کے ساتھ بارڈر پار کر جاؤں یا پھر رکا ہوا ہے تو اس کے ساتھ نکلنے کی کوشش کروں۔ میں ان کی بات سمجھ گیا تھا۔

میں ایک چارپائی پر پڑا تھا۔ گرمی کا احساس تھوڑا بڑھ گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سیدھے ندیم ڈانڈیا سے رابطہ کروں۔ میں نے اس کا نمبر اپنے میل اکاؤنٹ میں محفوظ کر لیا تھا جہاں پہلے سے بہت سارے نمبر درج تھے۔ میں نے اس کا نمبر دیکھنا شروع کر دیا۔ ان میں مانسی کا نمبر بھی تھا۔ اس وقت مجھے شدت سے مانسی یاد آ گئی۔ وہ سانولی سی پتلی سی نازک سی حسینہ۔ آخری ملاقات میں اس نے ندیم ڈانڈیا سے چھپا کر اپنا نمبر میری جیب میں رکھا تھا جو میں نے محفوظ کر لیا تھا۔ میں نے سوچا، کیوں نا مانسی ہی سے ندیم ڈانڈیا کے بارے میں معلومات لے لی جائیں۔

مجھے یہ ڈر نہیں تھا کہ تیمور کے دیئے ہوئے اس فون سے میری لوکیشن کا پتہ چل جائے گا،

بس دل یونہی دھڑکا تھا کہ کہیں وہ نمبر بند نہ ہو یا کسی دوسرے کے پاس نہ ہو۔ میں نمبر پش کر چکا تھا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد کال ریسیو کر لی گئی۔ دوسری طرف سے دھیمی سی نسوانی آواز ابھری تب میں نے پوچھا۔

"ماںسی بات کر رہی ہو۔"

"تم......علی زین......کہاں ہو؟" ماںسی نے میری آواز سنتے ہی ہذیانی انداز میں کہا تو بہت عرصے بعد اپنا اصلی نام سن کر مجھے ایک گونہ سکون محسوس ہوا۔ اس سے یہ تصدیق بھی ہو گئی کہ وہ اب تک مجھے یاد رکھے ہوئے تھے۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ میں اسے کتنی شدت سے یاد تھا۔ میں خیالوں میں گم تھا کہ اس کی آواز ابھری "تم خاموش کیوں ہو بولتے کیوں نہیں......؟"

"ہاں ہاں، میں بات کر رہا ہوں، کہاں ہو تم؟"

"میں بہت مشکل میں ہوں۔ اس وقت میں ہسپتال میں پڑی ہوں۔" اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

"کیوں کیا ہوا تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں پوچھنے کا فائدہ، شاید میری قسمت ہی ایسی ہے۔" اس نے روہانسا انداز میں کہا تو میں نے اسے پچکارتے ہوئے پوچھا۔

"بولو، بتاؤ مجھے، تمہیں ہوا کیا ہے۔ مجھے بتاؤ میں تمہارے کیسے کام آ سکتا ہوں، جلدی بولو۔"

"میرے پاس علاج تک کے پیسے نہیں ہیں، مجھ پر اس ندیم ڈانڈیا نے بہت ظلم کیا، اس نے میرا بازو توڑ دیا۔ بس ایک بار میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا، وہ شراب کے

نشے میں تھا، اس نے بہت مارا مجھے اور اب......" وہ کہتے ہوئے رو دی تو مجھے بہت دکھ ہوا۔

"اچھا، تم فکر نہ کرو، مجھے بتاؤ، تم کس ہسپتال میں ہو؟" میں نے پوچھا تو وہ مجھے بتانے لگی

، پھر میں نے پوچھا، "کیا ڈاشڈیا کا وہی نمبر ہے جو اس کے پاس تھا؟"

"ہاں وہی ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا وہ کہیں ہے تمہارے پاس؟" میں نے پوچھا۔

"نن......نہیں تو......" اس نے تیزی سے جواب دیا۔

"کیا اس نے تمہارا پتہ نہیں کیا، وہ تمہارا خیال نہیں رکھتا، وہ یہاں اسی شہر میں بھی ہے یا کہیں دلعان ہو گیا ہے؟" میں نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے تو وہ چند لمحوں بعد یوں بولی جیسے سوچ کر بات کر رہی ہو۔

"وہ کہیں کہیں ہے، میرے پاس نہیں آتا۔ ناراض ہے نا مجھ سے۔"

"اوکے، میں ایک دن بعد تم تک پہنچ جاؤں گا۔" میں نے اسے کہا۔

"ایک دن، مطلب تم یہاں نہیں ہو شہر میں؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"نہیں، میں اس وقت اودھے پور میں ہوں، یہاں پھنسا ہوا ہوں، شاید آج شام تک یہاں سے نکلوں۔" میں نے کہا۔

"وہاں کہاں پھنسے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ایک شخص کے پاس ہوں، اس نے وعدہ کیا ہے کہ آج رات، مجھے کسی ٹرین یا گاڑی میں بٹھا دے گا۔ بس میرے وہاں سے نکلنے کی دیر ہے، میں سیدھا تم تک پہنچ جاؤں گا۔" میں نے یونہی بات بنا دی۔ کیونکہ ہم نے کبھی سیدھی بات نہیں کرنی ہوتی۔

"کیا تمہارے پاس اتنے پیسے ہیں کہ مجھے علاج کے لئے کچھ دے سکو؟" اس نے

حسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔
”ارے مانسی، کیا بات کرتی ہو۔ میں خود تمہارا علاج کرواؤں گا، اس کے لئے مجھے چاہئے دِلّی جانا پڑے، تم فکر نہ کرو، میں کل صبح تک تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے ایک بار پھر اس سے ہسپتال کا پوچھ لیا۔ اس نے مجھے بتایا تو میں نے اسے ذہن نشین کر لیا۔ اس بار جب اس نے ہسپتال کا نام بتایا تو مجھے لگا جیسے پہلے اس نے کوئی اور ہسپتال بتایا تھا۔ اگرچہ میں شہر سے واقف نہیں تھا لیکن بتاتے ہوئے نام بھول جاؤں، ایسا ہوا نہیں تھا۔ میرا ذہن مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اس وقت میں مانسی سے بات کر ہی رہا تھا کہ وہ مقامی آ گیا۔ میں نے اس سے پھر بات کرنے کا کہا اور کال بند کر دی۔

مقامی میرے کال ختم کرنے کے انتظار میں تھا۔ اس نے بتایا کہ میرے رہنے کے لئے ایک اچھا ٹھکانہ بنا دیا گیا ہے۔ شاید چند دن مجھے وہیں رہنا پڑے۔ میں اٹھا اور اسے لیپ ٹاپ ضائع کر دینے کی تاکید کر دی۔ ہم اس نئی آبادی سے نکل کر موہن گڑھ روڈ پر آئے تو شہر کا موسم بہت خوشگوار تھا۔

میرا دماغ الجھا ہوا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ مانسی نے مجھ سے سچ بولا تھا یا جھوٹ؟ اگر اس نے جھوٹ بولا تھا تو کیوں بولا؟ اس نے ندیم ڈاڈیا کے بارے میں بھی کوئی واضح بات نہیں بتائی تھی۔ تبھی میں نے سوچا، کیوں نا مانسی کے بارے میں یقین کر لیا جائے۔ اگر وہ واقعی اسی ہسپتال میں ہے تو وہ سچ بول رہی تھی اور اگر وہ اس وقت ہسپتال میں نہیں ہے تو پھر جھوٹ۔ یہ جھوٹ سچ کا نتارا کر لینے کے بعد پھر سوچا جائے گا کہ کیا ہوتا ہے؟

میں نے گاڑی چلاتے ہوئے مقامی سے کہا کہ وہ ہسپتال چلے۔ اس نے میری بات مان لی اور اس طرف جانے لگا۔ میں نے راستے میں اسے سمجھایا کہ کیا کرنا ہے۔ اس نے کار ہسپتال

کی پارکنگ میں روک دی۔ وہ ایک نجی ہسپتال تھا۔ میں بھی کار سے اترا اور ایک طرف لان میں جا بیٹھا۔ کھڑی کار میں بیٹھے ہوئے بندے کو ہر کوئی دیکھتا ہے۔ مقامی کو اچھی طرح دیکھنے اور مانسی کو تلاش کرنے میں تھوڑا بہت تو وقت لگنا تھا۔ میں ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے لوگوں کو آتا جاتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ مقامی واپس آ گیا۔ اس نے واپس آکر میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ مانسی وہاں پر نہیں تھی۔ کوئی بھی نوجوان عورت بڑی وارڈ میں نہیں تھی جس کا بازو ٹوٹا ہوا ہو۔ اس نے ایک ویڈیو بھی بنالی تھی۔ میں نے وہ ویڈیو دیکھی اور پھر پوچھا۔

"کیا تم نے ادھر ادھر بھی دیکھا؟"

"میں نے ایکسرے کے روم تک نہیں چھوڑا۔ میں وارڈ میں بیٹھا رہا ہوں، کوئی بیڈ خالی نہیں تھا، خالی ہوتا تو......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اوکے......" میں نے کہا اور سیل فون نکال کر مانسی کو فون کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کال رسیو کر لی۔ تبھی میں نے کہا۔

"دیکھو، وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے، میں نے اس سے بات کی ہے۔ اسے کہا ہے کہ تمہیں تھوڑی رقم دے آئے۔"

"وہ کب آئے گا؟" اس نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہی کوئی آدھے گھنٹے میں تم تک پہنچ جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس سے ہسپتال کے نام کی دوبارہ تصدیق کر لی۔ اس نے بتایا تو میں نے پھر پوچھا، "کس وارڈ میں ہو کون سا کمرہ ہے؟"

"وہ مجھے کہاں تلاش کرے گا، وہ جب آئے تو میں اسے مل لوں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے، وہ آدھے گھنٹے میں پہنچ جائے گا۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اب مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔ میرے دل میں جو ہمدردی جاگی تھی وہ بالکل ختم ہو گئی تھی۔ میرے ذہن میں یہی سوال تھا کہ وہ مجھے ٹریپ کیوں کرنا چاہ رہی ہے؟ کیوں جھوٹ بولا ہے اس نے؟ آدھے گھنٹے بعد سب واضح ہو جانے والا تھا۔ میں نے اس مقامی کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

تقریباً بیس منٹ گزرے ہوں گے۔ ایک کار تیزی سے پارکنگ میں آ رکی۔ اس میں سے پہلے ندیم ڈاڈھا نکلا، پھر دوسری جانب سے مانسی برآمد ہوئی۔ وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہسپتال کے اندر چلے گئے۔ میں نے مقامی کو ان کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ ان کے پیچھے چلا گیا۔ میں سلگتے ہوئے دماغ کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے کوئی سرا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ کیوں بول رہے تھے۔ اگر مانسی اکیلی آتی تو شاید میں سمجھتا کہ وہ کس وجہ سے مجھے فریب کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ تو ندیم ڈاڈھا بھی تھا۔ ضرور کچھ ایسا ہے جو کم از کم میرے حق میں بہتر نہیں ہے۔ انہی لمحات میں عرفان حمید کا فون آ گیا۔ میرے ہیلو کہنے پر اس نے پوچھا۔

"او یار کہاں رہ گئے ہو تم لوگ......"

"بس یار، ایک اچانک افتاد میں پھنس گیا ہوں؟" میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"خیر تو ہے نا، ہماری ضرورت ہے تو بتاؤ؟"

"یار مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا، اگر تم لوگوں کا باہر نکلنا رسک نہیں ہے تو آ جاؤ؟" میں نے کہا

"رسک ہو نہ ہو، اگر تمہیں مدد چاہیے تو بتاؤ۔" اس نے پوچھا۔

”آجاؤ، کسی مقامی کو ساتھ ضرور لے لینا۔“ میں نے کہا اور ہسپتال کا بتا کر فون بند کر دیا۔ وہ کسی بھی مقامی کے ذریعے وہاں تک دس بیس منٹ میں پہنچ سکتا تھا۔ میں باہر ٹہلتے ہوئے انتظار کرنے لگا۔

کافی دیر بعد مجھے اندر سے مقامی نے فون کیا۔

”ہاں بولو کیا بات ہے؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”اس عورت کو کچھ بھی نہیں ہوا، یہاں اس نے کسی سے بات کی ہے اور اس کے پٹی کروا رہا ہے۔ میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔“

”چلو واپس آجاؤ۔“ میں نے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے اس سارے معاملے کا ہرگز ندیم ڈاڈیا ہی لگ رہا تھا۔ مجھے یاد پڑ رہا تھا کہ اس نے مجھے کانتی سے بھی متعارف کروایا تھا، جس نے ریتا اور ششما کو اغوا کیا تھا۔ بعد میں وہ بھی کچھ اور ہی نکلی تھی۔ میرے خیال میں وہ مانسی کو استعمال کر کے کوئی کھیل کھیلنا چاہ رہا تھا۔ میں جس قدر بھی اس کے بارے میں سوچتا، مجھے اس کا کردار مشکوک دکھائی دینے لگتا تھا۔

آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ عرفان حمید ہسپتال کے باہر آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ساتھی اور ایک مقامی تھا۔ وہ ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے وہ مجھے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے فون پر ہی مجھ سے ساری روداد سن لی تھی۔ تبھی اس نے کہا۔

”میں یہیں ہوں، تم فکر نہ کرو، میں تمہارے کور پہ ہوں۔“

عرفان حمید کے کور پر ہونے کی وجہ سے میں مطمئن ہو گیا تھا۔ شاید اس سے پہلے وہ کچھ نہ سوچا جو اس کے آنے سے میں سوچنے لگ گیا تھا۔ شاید پہلے میں انہیں چھیڑے بغیر ویسے ہی واپس چلا جاتا۔ لیکن اب میں نے ندیم ڈاڈیا ہی کو اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے چاہا کہ

سارے خلجان ہی دور کرلوں۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ مانسی کا فون آ گیا۔

"وہ تمہارا دوست ابھی تک پہنچا نہیں ہسپتال؟" اس نے کہا۔

"وہ تو تمہیں تلاش کر رہا ہے لیکن تم کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں اپنے وارڈ سے باہر ہوں جہاں کافی سارے مریض بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں انہی کے پاس ہوں۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے وہ تم تک پہنچ جاتا ہے۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے مقامی کو آگے کر دیا اور خود پیچھے ہو گیا۔ مقامی داخلی دروازے سے اندر چلا گیا۔ ندیم ڈانڈیا اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مقامی نے جا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر مانسی کی جانب بڑھ گیا۔ ندیم ڈانڈیا کی پوری توجہ اس پر تھی۔ مقامی جیب سے رقم نکال رہا تھا۔ میں انہی لمحات میں ان کے ارد گرد کسی کو دیکھتا رہا کہ ان کے کور پر تو کوئی نہیں ہے۔ مجھے کوئی خاص بندہ دکھائی نہیں دیا۔ مقامی نے مانسی کو رقم دی اور واپس پلٹ گیا۔ میں وہاں سے ہٹا اور پارکنگ میں آ گیا۔ میرے پیچھے ہی مقامی پہنچ گیا تھا۔ میں نے عرفان حمید کو کال کر دی اور اسے بتا دیا۔ وہ اپنی فور وہیل لے کر پارکنگ میں آ گئے۔ وہ میرے نزدیک ہو گئے تھے۔

"تم اپنی کار نکال کر سیدھی کر لو فور وہیل میں مہمان لے جائیں گے۔" میں نے مقامی سے کہا تو وہ سمجھ گیا۔ ہم نے عرفان کے ساتھ سب طے کر لیا تھا کہ کس نے کس گاڑی میں جانا ہے۔

کچھ دیر بعد مانسی اور ندیم ڈانڈیا تیزی سے باہر نکلتے آ رہے تھے۔ ندیم نے فون کان سے لگایا ہوا تھا۔ پارکنگ میں آ کر اس نے فون کان سے ہٹایا اور اپنی کار کی جانب بڑھا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس کی کمر پر پسٹل کی نال رکھ دی۔ وہ تڑپ کر مڑا تو مجھے دیکھ کر سہم گیا۔

’’چلو اس سامنے والی فور وہیل میں......‘‘ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

اس وقت تک میرے ساتھی نے مانسی کے بھی پسٹل رکھ دیا تھا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ سیدھی فور وہیل میں جا بیٹھی۔ ندیم ڈانڈیا نے تھوڑا کسمسانے کی کوشش کی تو میں نے پسٹل کا دباؤ بڑھاتے ہوئے سختی سے کہا۔

’’یہیں پر مرنا ہے تمہیں؟‘‘

میری آواز سنتے ہی اس نے مزاحمت نہیں کی، وہ بھی فور وہیل میں جا بیٹھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی فور وہیل زن سے نکل پڑی۔

☆......☆......☆

وہ ایک حویلی نما عمارت تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اپنے شوق میں پرانے طرز پر وہ عمارت بنوائی ہو۔ ممکن ہے یہ کسی نے ہوٹل بنانے کا سوچا ہو اور پھر اس نے اسے ویسے ہی چھوڑ دیا ہو۔ مجھے اس کی بناوٹ کچھ ایسے ہی لگی تھی۔ اس میں کافی سارے کمرے تھے۔ اوپر کی منزل کے لئے لاؤنج ہی سے سیڑھیاں چڑھتی تھیں۔ ہم ان دونوں کو لے کر اوپر پہنچ گئے۔ ایک کمرہ کافی حد تک صاف تھا۔ اس میں ایک بیڈ بھی پڑا ہوا تھا۔ میں اور عرفان ان دونوں کو وہاں لے گئے۔ میں نے مانسی کی طرف دیکھا وہ کافی خوف زدہ تھی۔ میں نے چند لمحے سوچا اور عرفان سے کہا۔

’’اس لڑکی کو دوسرے کمرے میں لے جا، اس سے بعد میں بات کرتا ہوں، پہلے اس سے باتیں ہو جائیں۔‘‘

’’میرے یوں کہنے پر مانسی نے میری طرف یوں بے چارگی سے دیکھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ میں نے اس کی کیفیت کو نظر انداز کر دیا۔ عرفان اسے لے کر باہر نکل

گیا۔ تب میں نے ندیم ڈانڈیا کی طرف دیکھا اور بڑے سکون سے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟"

"ہاں میں جانتا ہوں۔" اس کے لہجے میں کافی حد تک گرمی تھی۔

"اور تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ مجھ سے جھوٹ بولو گے تو تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ تم مجھے قتل کر دو گے لیکن یہ یاد رکھنا علی زین، میرے قتل کے بعد تم بالکل بھی نہیں بچ پاؤ گے۔"

"میری چھوڑو، تم اپنی کہو......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو طنزیہ انداز میں بولا۔

"تم اپنی ہیرو گیری میں بہت بڑی غلطی کر چکے ہو، تم کیا سمجھتے ہو مجھے اغوا کر لو گے تو میں تمہارے سامنے فرفر سبق پڑھنا شروع کر دوں گا، تم ایسا کرو، مجھے مارو، پیٹو، مجھ پر تشدد کرو۔ اگر ہمت ہے تو مجھ سے کوئی بھی بات اگلوا لو۔"

"نہیں میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا، لیکن تم خود بولو گے۔" میں نے سرد سے لہجے میں کہا۔

"نہ علی زین نہ...... ممکن ہے تم نے بہت کچھ کیا ہو، تم نے بڑی کامیابیاں بھی دیکھی ہوں لیکن مجھے اغوا کرنے کی تم غلطی کر چکے ہو۔" اس نے پھر کہا تو مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا۔ میں اس کی جانب بڑھا اور بڑے سکون سے بولا۔

"کہو میں نے کیا غلطی کر لی؟"

"ابھی کچھ دیر بعد پتہ چل جائے گا، دور کا پتہ کھیلا ہے میں نے۔ جب تک تمہیں سمجھ آئے گا، تم اس دنیا میں بھی نہیں ہو گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میرے اندر کی کیفیت

بدلنے لگی، میں نے بہت سارے لوگوں کو بلوایا تھا، لیکن یہ ندیم ڈانڈیا مجھے ذرا بھی پکڑائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ایک لمحہ کے لئے سوچا اور اس سے پوچھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں، بس مجھ پر تشدد کرو، مجھ سے کچھ معلومات اگلوانے کی کوشش کرو، وہ بھی ناکام کوشش......" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تو مجھے سمجھ آگئی۔ وہ مجھے غصہ دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بڑے سے بڑا بہادر بھی موت کو سامنے دیکھ کر یوں بات نہیں کرتا، جب تک اسے کسی طرف سے کوئی اعتماد حاصل نہ ہو۔ ضرور اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی سہارا ضرور ہے۔ یا شاید وہ مجھے بچہ سمجھتا ہوا، میرے ساتھ ہی کھیل رہا تھا۔

"تم نے ماسی کو چارہ بنا کر اچھا نہیں کیا۔ مجھے لگتا ہے تم کہیں نہ کہیں مجھے دھوکا دینے کی کوشش میں ہو۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اگر تم تشدد ہی سہنا چاہتے ہو تو وہ تمہاری مرضی۔" میں نے کہا اور باہر نکل گیا۔ میں ابھی باہر ہی نکلا تھا کہ عرفان آتا ہوا دکھائی دیا، اس کے چہرے پر پریشانی بکھری ہوئی تھی، اس نے جلدی سے میرے پاس آکر کہا۔

"جلدی جاؤ اور اس لڑکی کی بات سنو۔"

"خیر ہے، کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"تم جاؤ جلدی...... میں اسے دیکھتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اسے صرف دیکھنا نہیں، اس کے تھوڑے پیچ بھی کسنے ہیں، مرتا ہے تو مر جائے، ساتھ کسی کو لے لو۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

میں اس کمرے میں پہنچا تو فرش پر بیٹھی ہوئی ماسی تیزی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"علی زین، جتنی جلدی ہو سکتا ہے یہاں سے نکل جاؤ۔ تم گھیرے میں آ چکے ہو۔"

"میں کس طرح مان لوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ وقت ایسا نہیں ہے۔ تم میری بات مانو، ہمیں چاہے قتل کر کے یہاں سے نکل جاؤ، مگر جلدی نکل جاؤ۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"تم اگر مجھے کچھ بتاؤ گی تو میں نکلوں گا۔" میں نے سکون سے کہا۔

"دیکھو، یہ جو ندیم ڈانڈیا ہے، یہ اس وقت کسی بہت بڑی گیم میں ہے۔ یہ کئی دن سے تمہیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے کسی نے بہت بڑی آفر کی ہے۔ یہ دو دن سے اس بندے سے مل رہا تھا، جس کا رابطہ تمہارے دیش میں کسی بڑے کے ساتھ ہے۔ یہ تمہیں ہر حال میں پکڑوانا چاہتا ہے۔"

"پھر تم اس کا ساتھ کیوں دے رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تین دن سے اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے، اس نے پتہ نہیں مجھے کیا کیا سمجھایا ہے۔ یہ جانتا تھا کہ تم مجھے کال کرو گے۔" اس نے تیزی سے کہا تو مجھے کچھ کچھ کھیل سمجھ میں آنے لگا، تب میں نے پوچھا۔

"کیا یہ کل سے مجھے تلاش کرنے میں تیز ہوا ہے یا پہلوں سے؟"

"کل سے...... یہ یہاں کی فورسز سے بھی رابطے میں ہے۔ انہیں شک ہے کہ تم کل سے اس شہر میں ہو۔ آج ہی اس نے تمہاری تصویریں انہیں دی ہیں، تاکہ وہ تمہیں شہر بھر میں تلاش کر کے پکڑ سکیں۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا تو میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا یہ تصویریں تمہارے سامنے دی ہیں؟"

"ہاں، کہا نا تین دن سے......" لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ میرا فون بج اٹھا۔ اس پر

نمبر کافی حد تک اجنبی تھے۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز نے بڑی ترنگ میں ہیلو کہا۔ وہ میرے لئے اجنبی آواز تھی۔

"کون بات کر رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ارے اتنی جلدی مجھے بھول گئے، ابھی اتنا سے تو نہیں ہوا جب تم میرے سامنے کھڑے مجھ سے تنہائی میں وقت مانگ رہے تھے۔ میں نے تمہیں وقت دے بھی دیا تھا لیکن تم ہی وقت نہ لے سکے۔"

"سیدھی طرح بات کرو، کون ہو تم......" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"ارے ظالم، میں وہی ہوں جسے تم نے زندگی دان میں دے کر بڑا ظلم کیا، میں مر جاتی تو آج تمہیں گھیرے یوں تو نہ آ رہی ہوتی۔"

اس نے کہا تو مجھے شک پڑ گیا پھر بھی میں نے پوچھا۔ "کون ہو تم......؟"

"اپنی پوجا کو بھول گئے۔ ارے ہم تو آج تک تمہیں نہیں بھولے۔" اس نے ایک سسکاری لیتے ہوئے کہا۔

"اوہ...... پوجا، کیا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری جان لینا چاہتی ہوں۔ بس تھوڑی سی دیر، پہنچ رہی ہوں تمہارے پاس......" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں ایک دم سناٹے میں آ گیا۔ تو گویا انہوں نے اپنا وار کر گیا تھا۔ تیمور کے دیئے ہوئے اس خاص نمبر پر پوجا کا فون آ جانا ہی اس خطرے کی علامت تھی کہ جو کچھ پوجا کہہ رہی تھی، وہ سچ کہہ رہی تھی۔ بلاشبہ انہوں نے مجھے گھیر لیا تھا۔

⁂......⁂......⁂

(قسط نمبر:8)

میں پریشان اس لئے نہیں تھا کہ میں گھیرے میں آ چکا ہوں بلکہ میں الجھن کا شکار ہو گیا کہ پوجا نے مجھ تک رسائی کیسے حاصل کر لی؟ میرے پاس جو خاص سیل فون تھا، اس پر پوجا کی کال آنا، کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہاں موجود لوگوں میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ چل رہی تھی۔ کوئی نہ کوئی خریدا جا چکا تھا یا انجانے میں معلومات دے چکا تھا۔

یہ انتہائی خطرناک صورت حال تھی۔ مانسی نے تھوڑی دیر پہلے جو کچھ مجھے بتایا تھا، وہ سچ ثابت ہو گیا تھا۔ ندیم ڈانڈیا ہی وہ فرد تھا جس نے سازش کی تھی اور میں اب گھیرے میں تھا۔ میرا نہیں خیال کہ وہ خود اتنی ہمت کر سکتا تھا۔ بلاشبہ اس کے پیچھے طاقتور لوگ تھے۔ لمحوں کی اس سوچ نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ پوجا اکیلی ہو۔ اس کے ساتھ پولیس اور خفیہ فورسز کا ہونا لازمی تھا۔ ان کا اس بلڈنگ کی طرف آنا اور پھر پوجا کا دھمکی لگا کر، بتا کر آنا یہ واضح کر رہا تھا کہ وہ پوری طاقت کے ساتھ آ رہے تھے۔ میرے پاس ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں اس متوقع گھیرے سے اسی صورت میں نکل سکتا تھا اگر مجھے یہ پتہ چل جاتا کہ پوجا مجھ سے کتنے فاصلے پر ہے؟ یہ تو محض خیال ہی تھا، مجھے بہر حال وہاں سے نکلنا تھا۔ چاہے اس کے بارے میں کوئی معلومات نہ بھی ملتیں۔ میں کمرے سے نکلا اور تیزی سے عرفان والے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اور اس کا ایک ساتھی، ندیم ڈانڈیا کو مار مار کر ادھ موا کر چکے تھے۔ وہ ڈھیٹ فرش پر پڑا تشدد سہہ رہا تھا۔

”عرفان ذرا باہر آؤ۔“ میں نے تیزی سے کہا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ شاید

میرے لہجے میں کوئی بات تھی۔ وہ تیزی سے باہر آ گیا۔

”خیریت......؟“ اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں دھیمی آواز میں تیزی سے بولا۔

”یہاں کی فورسز ہمیں گھیرے میں لینے والی ہیں، چند منٹ ہیں ہمارے پاس، شاید وہ بھی نہیں، نکلو یہاں سے۔“

”اوہ، یہ تو غلط ہو گیا، نکلیں پھر......؟“ اس نے باہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک مخصوص آواز نکالی۔ اس کی ٹیم کے سارے لوگ فوراً اس تک آ پہنچے۔ وہ سب نیچے جانے لگے۔ میرا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ میں ندیم ڈاڈیا کو یوں چھوڑ کر جاؤں، اس سے بہت کچھ پوچھنا تھا۔ میں اسے زندہ بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مانسی کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ میں نے ایک لمحہ کو سوچا اور اسے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے ندیم ڈاڈیا والے کمرے میں بڑھ گیا۔ وہ فرش پر پڑا تھا۔ میں نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

”تم نے جو کرنا تھا کر لیا، مجھے سب مانسی نے بتا دیا ہے۔ اب تیری ضرورت نہیں رہی۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے پسٹل نکالا تو وہ تیزی سے بولا۔

”تمہیں کچھ بھی نہیں پتہ، تم اس شہر سے نہیں نکل سکتے۔“

میں نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے پسٹل اس کے ماتھے پر رکھا اور فائر کر دیا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت جمی رہ گئی۔ میں نے مزید وقت ضائع نہیں کیا۔ میں نے مانسی کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر نکل کر نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں اترنے لگا۔ اسی دوران میرا سیل فون بجا، اجنبی نمبر تھے۔ میں نے سیڑھیاں اترتے ہوئے کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو، علی زین۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ آواز مجھے جانی پہچانی لگی۔ تبھی میں نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"کون بات کر رہا ہے؟"

"میں بختاور بات کر رہا ہوں، پہچانا مجھے......؟" اس نے دھیمی آواز میں تیزی سے کہا۔

"بولو......" میں نے پہچانتے ہوئے محتاط لہجے میں کہا۔

"تمہارے پاس چند منٹ ہیں نکلنے کے لئے، فوراً نکلو، میں کچھ دیر بعد تفصیل بتاتا ہوں" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں ایسی کال پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ بختاور ہی ہو سکتا ہے۔ آواز بدلی بھی جا سکتی تھی۔ میں نے کال بارے عرفان کو بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

وہ سب نیچے کمرے کے پاس جمع ہو چکے تھے۔ وہاں بلڈنگ کے چوکیدار کو باندھا جا رہا تھا۔ وہ خوشی سے خود کو بندھوا رہا تھا۔

"اسے یہیں بے ہوش کر کے لاؤنج میں چھوڑ دینا ہے تاکہ اس پر کوئی حرف نہ آئے۔" عرفان نے میری آنکھوں میں تجسس دیکھ کر کہا۔ دونوں مقامی لوگوں کے ساتھ باقی سب کمرے میں سے باہر کی جانب جا رہے تھے۔ چوکیدار کو وہیں چھوڑا اور ہم بھی ان کے پیچھے چلے گئے۔

اگلے دو منٹ میں ہم اپنی گاڑیاں نکال چکے تھے۔ ہمارے ساتھ بانی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ بلڈنگ کے سامنے سڑک بڑی تھی لیکن اتنی مصروف نہیں تھی۔ اکا دکا گاڑی گزر رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں میرے دماغ میں یہ بات چلنے لگی تھی کہ دیکھوں تو سہی، پوجا وہاں پر آتی ہے یا نہیں؟ بختاور کو کیسے پتہ کہ میں کہیں پھنسا ہوا ہوں اور مجھے وہاں سے نکل جانا چاہئے؟ کیا وہ

پوجا کے ساتھ ہے؟ اگر وہ پوجا کے ساتھ ہے تو میرے ساتھ ہمدردی کیوں جتا رہا تھا؟ ایسے ہی کئی سوال میرے دماغ میں ابھرنے لگے۔

عرفان دوسری گاڑی میں تھا۔ میں اس وقت تک مقامی ہی کی کار میں تھا۔ میں نے عرفان کو فون کر کے گاڑی روکنے کو کہا۔ وہ رک گیا تو میں نے ماننی کو اس مقامی کے ساتھ بٹھا کر واپس گھر کی جانب بھیج دیا تا کہ وہ محفوظ ہو جائے اور خود عرفان کے ساتھ آ بیٹھا۔ تبھی میں نے اس سے اپنے دماغ میں آنے والے سوالوں کے بارے میں کہا تو عرفان سوچتے ہوئے بولا۔ ''ویسے دیکھنا تو چاہئے۔ اگر وہ وہاں پر آتی ہے اور کن لوگوں کے ساتھ آتی ہے تب کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جائے گا۔''

''پھر واپس مڑیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ممکن ہے کہ گاڑی کہیں پر کسی نے دیکھی ہو، ہو سکتا ہے ہم گھیرے میں آ جائیں، ہم ایسا کرتے ہیں، آگے کہیں سے کوئی ٹیکسی لے کر یہاں واپس آتے ہیں۔'' عرفان نے جواباً کہا تو پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک ساتھی نے تیزی سے کہا۔

''میرے خیال میں آپ دونوں مت جائیں۔ کوئی ایک آدھ جا کر سارا تماشا دیکھ لے۔ اس طرح اگر فورسز کے ساتھ سامنا ہو گیا تو بہت کچھ گڑبڑ ہو سکتا ہے۔ باقی تم دونوں کی مرضی ہے۔''

''یار یہ کہتا تو ٹھیک ہے۔'' عرفان نے سوچتے ہوئے کہا تو میں نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''چل ٹھیک ہے تم ہی دیکھ آؤ۔''

''میں دیکھ آتا ہوں۔'' اس نے کہا تو ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ اگلے کراس تک

پہنچنے میں چند منٹ لگے۔ وہ کار سے اتر گیا۔ ایک مقامی ہمیں لیتا ہوا اس ٹھکانے کی جانب بڑھ گیا جہاں عرفان لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔

ہم ابھی اتنی زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ یہی کوئی دس منٹ کا راستہ ہی طے کیا ہوگا کہ اس کی کال عرفان حمید کو آ گئی۔ اس نے کال ریسیو کر کے اسپیکر آن کر دیا۔ تبھی اس کی حیرت بھری آواز ابھری۔

”ارے بچ گئے ہم......“

”کیا ہوا؟“ عرفان نے تیزی سے پوچھا۔

”یہاں تو بھیڑ لگ گئی ہے۔ کوئی دس پندرہ گاڑیاں ہیں، ان میں بہت سارے لوگ ہیں۔ وہ اس طرح اندر داخل ہو رہے ہیں جیسے کوئی بہت بڑا کمانڈو ایکشن کرنے جا رہے ہوں۔“ اس نے تیزی سے یوں کہا جیسے اس کی حیرت ابھی تک کم نہ ہوئی ہو۔

”مطلب کافی بھاری اٹیک ہے۔“ عرفان نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

”بالکل، میں نے تصویریں اور ویڈیو بنا لئے ہیں آ کر دکھاتا ہوں۔“ اس نے کہا تو عرفان بولا۔

”بس جو دیکھنا تھا، دیکھ لیا، اب نکلو وہاں سے......“

”اوکے، میں آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور کال ختم کر دی۔ میں تیزی سے سوچ رہا تھا۔ جب تک میں فورسز کی نگاہوں سے اوجھل تھا، تب تک کوئی بھی کاروائی کرنا آسان تھا۔ اسے آسان ان لفظوں میں کہا جا سکتا تھا کہ مقامی طور پر ایک بیک گراؤنڈ تیار ملتا تھا۔ وہ لوگ پوری طرح مدد کرتے تھے اور سب ہو جاتا تھا۔ لیکن اب وہی مقامی لوگ میرے دشمن بن چکے تھے۔ ندیم ڈانڈیا، جس نے مجھے ایک راہ دکھائی تھی، وہی ایک بڑی سازش میں شریک تھا۔ اس سازش کے ڈانڈے کہاں ملتے تھے، اس بارے مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔ تیمور کا فون ٹریس

کر لینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ چاچا عبدالمجید تک رسائی کر گئے تھے۔ درمیان میں کوئی ایسا رازدار تھا جس نے غداری کی تھی۔ وہ کون تھا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے جیسلمیر آنے کا فورسز کو شک ہو گیا تھا۔ جے پور میں ہونے والا ہنگامہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہی تو فورسز کا کام ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی ہنگامے کی بُو سونگھ لیں۔ اسے ہونے ہی نہ دیں یا پھر ہنگامہ کرنے والے تک رسائی کر لیں۔ میں جے پور سے یہاں تک پہنچ تو گیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ سب کس طرح الرٹ تھے۔ اگر میرے ساتھ بملا نہ ہوتی، اس کے دوست میرے ساتھ فورسز کی نگاہوں میں دھول نہ جھونکتے تو میں اب تک پکڑا گیا ہوتا۔ اب جو ماسی نے بتایا تھا کہ میری تصویریں فورسز تک پہنچ گئی ہیں۔ ایسی صورت حال میں یہاں شہر میں رہنا انتہائی مشکل تھا۔

منطقی دلائل اور زمینی حقائق یہی بتا رہے تھے کہ مجھے پہلی فرصت میں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ لیکن نجانے کیوں میری ضد مجھے مجبور کر رہی تھی کہ اس بندے کو تلاش کروں جس نے ڈاڈیا کے ذریعے چاچا عبدالمجید تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ انہیں تو پتہ نہیں تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے، انہوں نے جو فیصلہ بھی لینا تھا یہاں سے بھیجی گئی اطلاعات پر ہدایت دینا تھی۔ ایک بھی غلط فیصلہ، بہت سارے لوگوں کی زندگی کا فیصلہ کر دینے والا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" عرفان نے میری مسلسل خاموشی کی وجہ سے پوچھا تو میں نے سچ بتا دیا۔ تب اس نے تیزی سے کہا۔ "دیکھو، ایسے وقت میں جبکہ فورسز تمہارے پیچھے لگ چکی ہیں، تمہیں فوراً زیر زمین چلے جانا چاہئے۔ جس طرح بھی ہو سکے، اس شہر سے نکل جاؤ، تمہیں پتہ ہے اس شہر پر فورسز کا اثر زیادہ ہے۔"

"ایک بات اور......" پیچھے بیٹھے ایک ساتھی نے کہا، "شہر کی حد تک تو پولیس ہے، خفیہ بھی

ہو گئی لیکن شہر سے باہر آ رہی ہے۔‘‘

اگرچہ مجھے اس بات کا پہلے ہی سے علم تھا لیکن اس کے یاد دلانے پر میں از سر نو سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے وقتی طور پر سب کچھ ذہن سے نکال دیا۔ میں پرسکون ہو کر سوچنا چاہتا تھا۔

عرفان حمید مجھے مقامی کے ساتھ ایک ویران سڑک پر چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم جب ٹھکانے کی جانب بڑھے تب تک مانسی بھی قریب آ گئی تھی۔ مقامی نے دوسرے مقامی کو فون کر کے بتا دیا تھا۔ ہم نے اس کا انتظار کیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک چھوٹی سی کار پر ہم تک آن پہنچے۔ اس نے مانسی کو اتارا اور آگے بڑھ گیا۔ ہم تینوں سڑک پر کھڑے تھے۔ سڑک کے پار ایک گندے پانی کا جوہڑ تھا۔ اس کے آگے سڑک اور پھر آبادی تھی۔ شاید وہ قدیم شہر کا کوئی حصہ تھا۔ وہ مقامی ہمیں اس طرف پیدل لے کر چل پڑا۔

وہ ایک پرانا سا تین منزلہ گھر تھا۔ وہاں پر ایک فیملی پہلے ہی سے رہائش پذیر تھی۔ بلاشبہ ان سے پہلے ہی بات ہو چکی تھی۔ ہمیں فوراً ہی تیسری منزل تک پہنچا دیا گیا۔ وہاں دو کمرے تھے۔ ایک کچن اور باتھ روم چھت کے دوسرے سرے پر تھا۔ درمیان میں کافی کھلا صحن تھا۔ منڈیر کے ساتھ کھڑا ہو کر دیکھا جائے تو بس گھر ہی گھر دکھائی دیتے تھے۔

میں فریش ہو کر بیڈ روم میں آیا تو اے سی کی خنک ہوا نے پرسکون سا کر دیا۔ مانسی فریش ہونے چلی گئی تو میں نے چاچا عبدالمجید کو فون کر دیا۔ میری آواز سنتے ہی بولے۔

’’پریشان نہیں ہونا، میں صورت حال سمجھ گیا ہوں۔‘‘

’’وہ کون ہو سکتا ہے؟‘‘ میں نے ان سے پوچھا۔

’’تم اس پر سوچنا ہی چھوڑ دو، اب یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے، تم جہاں بھی ہو، وہاں سکون کرو۔ شام تک بہت سارا منظر واضح ہو جائے گا۔‘‘ انہوں نے سکون بھرے انداز میں کہا۔

”جی بالکل ٹھیک ہے۔ میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔“ میں نے کہا تو انہوں نے
چند الوداعی باتوں کے بعد کال ختم کر دی۔
ماننی فریش ہو کر آ گئی تھی۔ وہ میرے سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کے بال بھیگے ہوئے تھے۔
وہ ان میں کنگھی کرنے لگی۔ میں اسے غور سے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کبھی میری طرف دیکھتی
اور کبھی نگاہیں چرا جاتی۔ تبھی اس نے ہلکی سی مسکان کے ساتھ مجھ سے کہا۔
”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“
”کچھ بھی نہیں، شاید یہ دیکھ رہا ہوں کہ ماننی بدلی نہیں۔“ میں نے گہرے انداز میں کہا۔
”میں اب بدل بھی نہیں سکتی۔ میں اس زندگی سے اکتا چکی ہوں۔ ہر وقت موت کا خوف
سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ میرا کوئی مقصد نہیں ہے جینے کا، بس دوسروں کے لئے جیے جا رہی
ہوں۔“ اس نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا اور گہری سانس لے کر کنگھا ایک طرف رکھ دیا۔
”ایسا کیوں؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔
”یار یہ عورت ہونا بھی عجیب بات ہے۔ جس پہ مرتی ہے اسی کو مارنے کا سوچنے لگتی
ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ لمحہ بھر کو رکی پھر تجسس سے پوچھا، ”تم نے مجھ پہ اعتماد کر لیا؟ میں نے
جو کہا وہ سچ مان لیا، ایسا کیوں؟“
”یہی سوال اگر میں تم سے کروں تو؟“ میں نے جواب دینے کی بجائے، اسی سے سوال کر
دیا تو وہ یوں مجھے دیکھنے لگی جیسے اسے کوئی جواب سوجھ ہی نہ رہا ہو۔ وہ یونہی چند لمحے بیٹھی مجھے
خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی رہی، پھر بولی۔
”شاید اس وجہ سے کہ تم نے میرے عورت ہونے کا فائدہ نہیں اٹھایا، حالانکہ میں نے
بہت کوشش کی، تمہیں اس راہ پر لے آؤں۔“

"مانسی زندگی میں بہت سارے لوگ ملتے ہیں، ایسے بھی جو لمحوں میں حواسوں پر چھا جائیں، مگر ایسا نہیں ہوتا کہ ان کے لئے اپنا آپ ختم کر دیا جائے۔" میں نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"تم کچھ بھی کہہ لو، مگر ایک مجبوری ایسی ہے جو ہمیں بہت کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اور وہ ہے غربت۔" یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا، پھر وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی،

"میں ایک ہوٹل میں ریسپشنسٹ تھی۔ لوگوں کو دیکھتی تھی کہ وہ اپنا کتنا سرمایہ یونہی فضول ضائع کر دیتے ہیں، کیوں کرتے ہیں اتنی عیاشی۔ کمرے کے اتنے روپے خرچ کر دیتے تھے، جو میں ایک ماہ میں کماتی تھی۔ میں بہت فضول سوچنے لگی تھی۔ صرف روپیہ کمانے کی خاطر۔ انہی دنوں ندیم ڈانڈیا مجھ سے آن ملا، ہماری دوستی بڑھتی گئی اور پھر میں اس کے ساتھ ہی رہنے لگی۔"

"تمہارے گھر والے......" میں نے پوچھنا چاہا تو وہ دکھ سے بولی۔

"انہیں بس رقم سے غرض تھی، وہ انہیں مل جاتی تھی۔ انہیں کیا میں کہیں پر ریسپشنسٹ ہوں یا کسی کی رکھیل۔"

"تو ندیم ڈانڈیا نے......" میں نے پوچھنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

"اس کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے کیا کچھ کیا، یہ میں ہی جانتی ہوں، وہ خود تک محدود رکھتا تو شاید میں اس کے ساتھ ہی رہتی لیکن اس نے مجھے بانٹنا شروع کر دیا۔ صرف اپنے فائدے کے لئے، کسی کے بھی آگے چارے کے طور پر ڈال دیتا...... میں اکتا گئی اس سے۔ تم آئے تو مجھے لگا شاید مجھے فرار کا کوئی راستہ مل جائے گا۔ میں اس کی دنیا سے نکل کر گم ہو جانا چاہتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں تب بھی جانتی تھی کہ وہ تجھے استعمال کرنے کی فکر میں ہے۔

میں چاہتے ہوئے بھی تمہیں کچھ نہ بتا سکی۔"

"اب تم زندہ بچ گئی ہو، تم سے پوچھا تو جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"میں یہ بہانہ بھی بنا سکتی ہوں کہ میں بھاگ گئی تھی، ان کے ہاتھ نہیں آ سکی تھی، جب وہ بھاگے تو میں بھی نکل گئی، کچھ بھی......" اس نے عام سے لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

"تمہیں ڈانڈیا کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں؟"

"بالکل بھی نہیں، بلکہ میں خود کو آزاد محسوس کر رہی ہوں۔" اس نے تیزی سے جواب دیا تو میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس وقت تم خود کو میری قید میں محسوس نہیں کر رہی ہو؟"

"تمہاری قید میں جبر نہیں ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں تو پتہ ہے کہ میں کسی بھی وقت یہاں سے نکل جاؤں گا۔ پھر تم کہاں جاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں۔ یہیں رہوں گی کوئی دوسرا مجھے رکھیل بنا لے گا اور بس۔" اس نے تلخی سے کہا، پھر سر اٹھا کر بولی۔ "تم نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ میں نے ڈانڈیا کے بارے......"

"مانسی، وہ مر گیا، اب اس کا ذکر فضول ہے۔ وہ جس بندے کے ساتھ مل کر کوئی گیم کرنا چاہتا تھا، اس کے بارے میں شام تک پتہ چل جائے گا۔ اور پھر مجھے اس گیم کے بارے میں بھی پتہ نہیں کرنا ہے، کیونکہ مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں کرنا ہے۔ سو میں اس کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہتا۔" میں نے بڑے سکون سے کہا تو وہ حیرت سے میرے چہرے پر دیکھنے لگی۔

"میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ تم مجھے اس لئے اپنے ساتھ لے کر آئے ہو کہ تم ایک ایک بات پوچھو گے اور میں......" اس نے کہنا چاہا تو میں بولا۔

”نہیں، میں تمہیں اپنے ساتھ نہ لاتا تو اب تک تم قتل ہو چکی ہوتی، جس طرح ندیم کو مارا، تمہیں بھی ختم کر دیا گیا ہوتا۔ میں نہ مارتا، میرا کوئی بھی ساتھی تجھے مار دیتا۔ لیکن میں تمہیں کیوں ماروں، کوئی وجہ ....؟“

اوہ......“ اس کے منہ سے بے ساختہ ہنکارا نکلا پھر لمحہ بھر ٹھہر کر بولی، ” کچھ باتیں ایسی ہیں جو تمہارے کام آسکتی ہیں۔“

” کہنے میں کیا حرج ہے۔ باتیں ہی ہیں کرتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ مجھے بہت کچھ بتاتی چلی گئی۔ ندیم ڈاڈیا یہاں پر کیا کرتا تھا، کن لوگوں سے روابط تھے۔ اس کا باقی گینگ کیا کر رہا تھا۔ میں چپ چاپ سنتا رہا۔ اسی دوران میرا اسیل فون بج اٹھا۔ وہ اجنبی نمبر تھے۔ میں نے کال رسیو کرلی تو دوسری جانب جنادر تھا۔ چند باتوں کے بعد اس نے کہا۔

” مجھے خوشی ہوئی تم انہیں کہیں ملے ہو۔ یہ سمجھو تمہاری خوش قسمتی تھی، ورنہ اب تک بہت کچھ ہو جاتا۔“

” یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

” تم جہاں پر تھے، وہ ایک ہوٹل بننے جا رہا ہے۔ شاید تم نہیں جانتے، اس عمارت کے مالک کا شہر کے اندر ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ اس کا بھی وہی نام ہے جو اس نے نئے ہوٹل کا رکھنا تھا۔ ہسپتال ہی سے تم لوگوں کا تعاقب کرنے والے نے ہوٹل کا نام بتا دیا۔ اس نے جو بتایا ہوگا سو بتایا ہوگا لیکن یہ سیدھے شہر والے ہوٹل پر جا پہنچے۔ وہیں سے میں نے تمہیں فون کیا تھا۔“ اس نے سمجھاتے ہوئے بتایا تو میں نے پوچھا۔

” اگر وہ طاقت کے نشے میں مجھے نہ للکارتی تو شاید وہ یہاں تک پہنچ جاتی۔ پھر بھی تم مجھے بتاتے؟“

"مجھے تمہارا نمبر لینے میں وقت لگ گیا تھا۔ خیر تمہارا لہجہ مجھے بتا رہا ہے کہ تم مجھ پر اعتبار نہیں کر رہے ہو، تو کوئی بات نہیں تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ اب شاید میں تمہیں دوبارہ فون نہ کروں، بس ایک بات کہنا چاہتا ہوں، اگر تم مان لو تو۔"

"وہ کیا......؟" میں نے پوچھا۔

"جتنی جلدی ہو سکے اس شہر سے نکل جاؤ۔ جس طرح ایک سانپ کے لئے کئی جوگی اکٹھے ہو جاتے ہیں اسی طرح تمہیں تلاش کرنے کو نجانے کون کون یہاں پہنچ چکا ہے۔ آگے تمہاری مرضی۔" اس نے جذباتی سے لہجے میں کہا تو میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"وہ کہاں ہے مرشن نے......؟"

"وہ یہیں ہے، اس کے بارے سب بتا سکتا ہوں لیکن چھوڑو، جو کہا ہے، اس کے بارے میں سوچو۔" اس نے کہا تو میں بولا۔

"تمہارا بہت شکریہ۔"

میرے یوں کہنے پر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر فون کال بند کر دی۔ میں نے فون جیب میں ڈال لیا تو میرے سامنے بیٹھی ماسی نے کہا۔

"اس کی دھیمی دھیمی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی، وہ جو کوئی بھی تھا، سچ کہہ رہا ہے۔ اب تم اس شہر میں نہیں رہ پاؤ گے۔"

"یار ابھی تو سونے دو، پھر سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔" میں نے کہا اور بیڈ پر پھیل کر لیٹ گیا۔ ماسی اٹھی اور تکیہ اٹھا کر قالین پر لیٹ گئی۔

☆......☆......☆

آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے۔ میں صحن میں کھڑا اردگرد کے برقی قمقموں کو دیکھ رہا

تھا۔ تھمی ہوئی ہوا دوبارہ چل پڑی تھی۔ میں پوری طرح سو نہیں پایا تھا۔ مجھے مانسی پر بالکل بھی اعتماد نہیں تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کرتی ہے۔ لیکن میرا شک یونہی ثابت ہوا۔ وہ گہری نیند سوئی رہی۔ میں شام ڈھلے اٹھ کر ٹہلنے لگا تھا۔ میں سوچنے لگا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ لیکن میری سوچوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ مجھے چاچا عبدالمجید کے فون کا انتظار تھا۔

ساری دنیا میری دشمن تھی یا پھر کوئی بھی میرا دشمن نہیں تھا۔ میں ایک ناپائیدار زندگی کو لے کر بھاگ رہا تھا۔ ایک معمولی سی گولی میری زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ میں اگر آگ اور خون کے دریا میں سے نکل کر یہاں کھڑا سانسیں لے رہا تھا تو آئندہ آنے والوں دنوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کب، کہاں اور کیسے میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ میں انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ میری کاندھوں پر نرم سا لمس محسوس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، مانسی میرے پیچھے کھڑی تھی۔

”تم نے پریشان نہیں ہونا، اس شہر سے باہر میں تمہیں لے کر جاؤں گی، چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔“

”میں شہر سے باہر جانے پر پریشان نہیں ہوں، میں یہ سوچ رہا ہوں، آخر یہ زندگی ہے کیا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو قہقہہ لگا کر ہنس دی پھر اپنی ہنسی ہونٹوں میں دباتے ہوئے بولی۔

”وہی جو تم پر گزر رہی ہے۔“

اس کی بات پر میں بھی مسکرا دیا پھر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا

”تم ٹھیک کہتی ہو، ہر کسی کے لئے وہی زندگی ہے جو اسے گزار رہا ہے۔“

لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ مقامی چھت پر آنے والی سیڑھیوں کے دروازے میں نمودار

ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کا ٹفن تھا۔

کھانے کے دوران اس نے شہر کے حالات بارے بتانا شروع کر دیا۔ اگر چہ شہر میں بالکل سکون ہو چکا تھا لیکن میری اور مجھ جیسے کئی لوگوں کی تلاش جاری تھی۔ اس نے مجھے یہ عندیہ بھی دیا تھا کہ بہت جلد وہ مجھے اس شہر سے نکال دیں گے۔ کوئی بہت ہی قابل اعتماد بندہ تلاش کیا جا رہا ہے۔ ایسی ہی باتوں کے بعد وہ جانے لگا تو مانسی ایک دم سے جانے کو تیار ہو گئی۔

''تم کہاں جا رہی ہو؟''

''مجھے خود نہیں معلوم۔'' اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی تم......'' میں نے پوچھنا چاہا تو وہ بولی۔

''مجھے تم سے جدا ہونا تو ہے، کل نہیں تو آج، اگر زندگی رہی تو پھر کبھی مل لوں گی۔'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے اپنا سیل فون نمبر دے دو۔'' اس نے کہا تو مقامی بولا۔

''میں تمہیں دے دوں گا۔''

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر میرے گلے لگ گئی۔ اس کی سانسیں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ چند لمحے یونہی میرے ساتھ لپٹی رہی، پھر تیزی سے واپس پلٹ کر سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ مقامی اس کے پیچھے چلا گیا۔ ایک دم سے چھت پر سناٹا طاری ہو گیا۔

اس سناٹے کو سیل فون کی بیل نے توڑا۔ اسکرین پر اجنبی نمبر جگمگا رہے تھے۔ میں نے کال رسیو کی تو دوسری جانب ہیلو کی آواز ابھری۔

میں پہچان گیا کہ وہ پوجا تھی۔ میری آواز سنتے ہی وہ بولی۔

”بہت خوش قسمت ہو تم، بس ایک دو منٹ کی دیر ہوئی اور تم نکل گئے، ایسی بھی کیا جلدی تھی؟“

”مجھے تو کوئی جلدی نہیں تھی، میں تو اس وقت تک وہاں رہا ہوں، جب تک تم مایوسی زدہ چہرہ لیے وہاں سے نکلی تھی۔ ویسے ڈاڈیا کی لاش کا تحفہ تمہیں کیسا لگا؟“ میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”اس کے ساتھ جو لڑکی تھی، وہ کہاں ہے؟“ اس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔

”میں نہیں جانتا وہ کہاں ہے۔ ممکن ہے وہ بھی میرے ساتھیوں نے مار دی ہو، کیا اس کی لاش نہیں ملی؟“ میں نے پوچھا۔

”تم اگر وہاں تھے تو تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ اس کی لاش ملی تھی یا نہیں۔“ پوجا نے میری بات پکڑنا چاہی۔

”مجھے تو صرف تم سے غرض تھی، تمہیں دوبارہ دیکھا تو بڑا دل کیا تمہیں ملنے کو، ویسے کب مل رہی ہو تم مجھے تنہائی میں؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ میری ہنسی کی آواز میں اس نے کچھ کہنا چاہا تو میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”ٹھہرو، میں تمہیں بتاتا ہوں تم کیسی لگ رہی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے تصویروں اور ویڈیو میں دکھائی دینے والی پوجا کے کپڑوں سے لے کر گاڑی تک کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ تبھی وہ غراتے ہوئے بولی۔

”اگر مرد ہوتے تو میرے سامنے آتے، پھر میں بتاتی کہ......“

”مجھے بھی اتنی جلدی نہیں ہے، میں تم سے ملوں گا ضرور، تم سے ملے بنا اس شہر سے جانے والا نہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تو آؤ نا، آج رات ہی ملتے ہیں۔ جگہ بتاؤ میں پہنچ جاتی ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”ارے میری جان، اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی تم اور تیرے کلیان جی، مجھے تلاش تو کر لو، جب تھک جاؤ، ہار جاؤ، ہلکان ہو جاؤ تو مجھے بتانا، میں تم تک پہنچ جاؤں گا، ابھی کچھ دن مجھے مزے تو لینے دو۔“ میں نے بھرپور لہجے میں کہا تا کہ وہ یہی سمجھے کہ میں کہیں عیاشی میں وقت گزار رہا ہوں۔

”میں تمہیں وقت صرف اس لئے دے رہی ہوں کہ......“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے جھڑکتے ہوئے کہا۔

”جسٹ شٹ اپ، تم مجھے وقت دینے والی نہیں، میں تمہیں وقت دے رہا ہوں۔ چند گھنٹوں کا وقت......“

”میں انتظار کر رہی ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں اس گفتگو کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ وہ نہ صرف مجھے بھڑکا رہی تھی بلکہ میری لوکیشن تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ کال کے دوران احساس ہو رہا تھا کہ کوئی درمیان میں آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے فون جیب میں ڈالا اور چلتا ہوا منڈیر تک جا پہنچا۔ نیچے سٹریٹ لائیٹ میں پیلی سی ویران گلی دکھائی دے رہی تھی۔ مانسی اور مقامی جا چکے تھے۔ میں چند منٹ گزار رہا اور پھر پلٹ کر صحن میں آ گیا۔ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے اچانک مجھے خیال آیا۔ کیا میں پوجا یا بختاور کی لوکیشن تلاش کر سکتا ہوں؟ اس خیال کے آتے ہی میں نے بھلا کو فون کر دیا۔ اس نے کال رسیو کی تو دوسری طرف سے میوزک کا شور تھا۔

"ہائے میری جان کہاں ہو؟" بملا نے شوخی سے پوچھا۔

"بس کہیں پھنس گیا ہوں یار۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"مجھے بتاؤ، میں نکال لاتی ہوں۔" وہ پھر اسی شوخی سے بولی۔

"اس وقت کیا کر رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بس آج ہمارے ٹور کا آخری ڈنر ہے۔ سامنے کچھ عورتیں ڈانس کر رہی ہیں۔ کچھ دیر بعد اٹھیں گے اور ریلوے اسٹیشن جا پہنچیں گے، پھر جے پور نکل جانا ہے۔" اس نے تفصیل بتا دی پھر فوراً ہی پوچھا، "کوئی کام؟"

"یار ایک دو فون ہیں ان کی لوکیشن تلاش کرنا تھی۔"

"تم مجھے نمبر بھیجو، میں ابھی تلاش کر دیتی ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"ٹھیک ہے بھیجتا ہوں۔" میں نے کہا اور کال بند کر کے میں نے وہ پوجا اور بھاوڑے کے نمبر اسے بھیج دیئے۔

ماحول میں بالکل سناٹا نہیں تھا۔ وہی جو شہر کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے وہ ہر جانب پھیلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں کسی گاڑی کا شور ہوتا اور پھر معدوم ہو جاتا۔ مجھے سب یہی کہہ رہے تھے کہ میں یہاں اس شہر سے نکل جاؤں۔ میں تو ارد گرد کے علاقے اور راستوں سے بھی واقف نہیں تھا۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ میں اگر شہر سے نکل بھی پڑوں تو مجھے کدھر جانا ہوگا۔ میں ابھی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ چاچا عبدالمجید کی کال تھی۔ میں نے کال رسیو کی، حال احوال کے بعد انہوں نے کہا۔

"تم نے جوان کی اکیڈمی ختم کی ہے، وہ ان کا بہت بھاری نقصان ہوا ہے۔ اس سے جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں وہ بہت خوفناک ہیں۔ خیر، اس کا بندوبست تو ہم کر لیں گے۔ لیکن

ان کے ہاں تربیت لینے والی ایک بڑی تعداد ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ ان کے یہاں جو رابطے ہیں، ان کی پوری معلومات ہے اس میں۔ بلاشبہ یہ ایک بڑا کام تھا۔ وہ لوگ یہ برداشت نہیں کر پا رہے ہیں، انہیں پھر سے محنت کرنی پڑے گی۔ سو اب وہ ایسے لوگوں کی تلاش میں ہیں جو یہاں کسی بھی طرح کارروائیاں کر رہے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے دوسرے شہروں سے بھی قابل لوگ منگوا لئے ہیں۔ میرے خیال میں اب تمہیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

"جی بالکل ٹھیک ہے۔ میں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ایسے ہی نکلو گے تو کہیں نہ کہیں پھنس جاؤ گے۔ تمہیں بہت محتاط انداز میں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

"میں کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں نے تمہارے لئے بندوبست کیا ہے۔ ایک نمبر تمہیں بھیج رہا ہوں۔ کچھ دیر بعد اسی نمبر سے تمہیں کال آئے گی۔ تم اس کے ساتھ نکل جانا، باقی وہ تمہیں خود سمجھا دے گا۔"

"جی ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہیں جتنا بھی غصہ دلانے کی کوشش کی جائے، کسی بھی طرح یہاں رک کر مقابلہ کرنے پر اُکسائے جائے، کسی کی بھی نہیں ماننا، وہ شخص جو تمہیں کہے، اسی پر عمل کرنا۔" انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا پھر کچھ ضروری ہدایات کے بعد انہوں نے کال ختم کر دی۔ وہ میری نفسیات سے واقف تھے۔ اسی لئے مجھے یہ ہدایت دینا مناسب سمجھا تھا۔

☆......☆......☆

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ میں پتلی سی سڑک کے کنارے چلتا چلا جا رہا تھا۔ میرے پاس ایک سیل فون اور جیب میں چند روپوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اکا دکا گاڑیاں میرے قریب سے گزرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ مجھے فون کال کا انتظار تھا، جس کے بعد ہی مجھے اس گاڑی کے بارے میں پتہ چلنا تھا، جس نے مجھے پک کرنا تھا۔ میں تقریباً ڈیڑھ کلو میٹر سے بھی زیادہ پیدل چل چکا تھا۔ لیکن ابھی تک کوئی کال نہیں آئی تھی۔ میرے سامنے ایک کراس آگیا۔ ابھی میں اپنے تئیں یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ مجھے کس جانب سڑک پر چلنا چاہئے، میرا سیل فون بج اٹھا۔ میں نے کال رسیو کی تو ایک اجنبی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ مقامی زبان میں مجھے سمجھا رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ اسی کراس میں کھڑا تھا۔ اگلے دو منٹ بعد میں اس تک پہنچ گیا۔ وہ چھریرے بدن والا ایک ادھیڑ عمر تھا۔ اس نے کرتا دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ وہ مہنگی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا تو وہ چل پڑا۔ ذرا سا آگے جا کر اس نے کہا۔

”دیکھ بھائیا...... یہ تیری اور میری پہلی اور آخری ملاقات ہے۔ تم میرا کام کر دو، میں تمہیں بارڈر تک پہنچانے کا وعدہ کرتا ہوں۔ پوری ذمہ داری سے وہاں تک پہنچا دوں گا، آگے تم جانو اور تمہارا کام۔“

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک راکشش کو ختم کرنا ہے۔“ اس نے کہا تو اس کے لہجے میں نفرت امڈ پڑی تھی۔ تبھی میں نے پوچھا۔

”کہاں ملے گا وہ؟“

”وہ اس وقت شہر سے باہر ایک جگہ پر ہے۔ میں تمہیں ایک جگہ لے جاتا ہوں۔ وہاں

سے دو لوگ تمہارے ساتھ ہوں گے۔ وہ تمہیں وہاں تک پہنچا دیں گے۔ وہ ہر طرح سے تمہارا ساتھ بھی دیں گے۔ پھر بارڈر تک وہی تمہیں پہنچائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ سامنے سڑک پر دیکھنے لگا۔ اس نے فور وہیل کی رفتار بڑھا دی تھی۔

وہ شہر کا گنجان آباد علاقہ تھا۔ بازاروں میں تو رونق تھی لیکن گلیاں سنسان ہو رہی تھیں۔ ایک جگہ پہنچ کر اس نے فون کیا۔ کچھ ہی دیر بعد دو نوجوان سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ آتے ہی خاموشی سے پچھلی نشست پر بیٹھ گئے تو وہ چل دیا۔ وہ شخص مجھے بڑا پراسرار سا لگ رہا تھا۔ وہ اسی خاموشی میں گنجان آباد علاقے سے نکل کر ایک پوش علاقے میں آ گیا۔ وہاں ایک طرف سڑک کے ساتھ کافی سارے درخت تھے۔ وہیں رک کر پچھلی نشست پر بیٹھے ایک نوجوان سے بولا۔

"لے بھائیا..... اب تو نکل۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ سے اتر گیا۔ اترتے ہی وہ سڑک کے ساتھ درختوں کی جانب بڑھ گیا۔ وہ نوجوان ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور تیزی سے چل دیا۔ یہاں تک کہ ہم ایک ویرانے میں آ گئے۔ وہاں کچی چار دیواری والا کھلا سا مکان تھا۔ ہم اس میں جا رکے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہم ایک کمرے میں جا پہنچے۔

"میں شندے ہوں۔"

"میں ویرات ہوں۔"

"میں ویر سنگھ۔" میں نے اپنا تعارف کرایا تو شندے نے کہا۔

"یہاں سے ایک کلومیٹر آگے، ایک ڈیرہ ہے۔ وہاں پر شہر سے آئے کچھ لوگ عیاشی کر

رہے ہیں۔ان میں وہی مطلوبہ شخص بھی ہے، جسے ہم نے ختم کرنا ہے۔“ اس نے سمجھایا تو نجانے مجھے یہ کیوں لگا کہ یہ شندے یہاں کا مقامی نہیں ہے۔اس کا لہجہ اس کی چغلی کھا رہا تھا۔ یہ موقعہ نہیں تھا کہ میں اس بارے کوئی استفسار کروں،۔میں نے اسے نظر انداز کیا اور اسے سے پوچھا۔

”کیا تم نے وہ جگہ دیکھی ہے؟“

”ہاں ایسی ہی جیسی یہ جگہ،بس اس میں چند کمرے زیادہ ہیں۔اس وقت صحن میں ناچ گانا شروع ہے۔یہی وقت ہے انہیں ٹارگٹ کرنے کا۔“ اس نے بتایا تو وہ بات بولا۔

”تو پھر ہمیں نکلنا چاہئے۔“

”کار میں ہر طرح کا اسلحہ ہے۔وہ لے لیں اور خیال رہے اگر ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تو واپس یہیں آنا ہے۔“ شندے نے کہا۔

”اور اگر یہاں تک نہ پہنچ پائے تو.....“میں نے پوچھا۔

”صبح ہونے تک انتظار کیا جائے گا،پھر نہیں۔“ اس نے صاف کہہ دیا تو مجھے تھوڑا عجیب سا لگا۔میں نے خود کو سمجھایا اور واپس کار تک آ پہنچے۔پچھلی نشست کے نیچے پسٹل، گن اور ہینڈ گرنیڈ پڑے ہوئے تھے۔ہم نے وہ سب نکال کر رکھا اور پھر نکل پڑے۔

تقریباً ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکے تو دائیں جانب ذرا سے فاصلے پر چار دیواری میں سے روشنی اوپر کو اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔یہی ہماری مطلوبہ جگہ تھی۔سڑک کے قریب تھوڑے سے درخت تھے۔ہم نے کار وہیں کھڑی کی۔کچھ دیر تک ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لیتے رہے۔میرا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے سیکورٹی اس حد تک پھیلائی ہوئی ہو باہر بھی لوگ موجود ہوں۔پہلی نگاہ میں تو کوئی ایسا دکھائی نہیں دیا۔ہم نے ہتھیار سنبھالے اور ممکن حد تک چھپتے

ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ ہم اس چار دیواری سے چند میٹر کے فاصلے تک جا پہنچے۔اس چاردیواری کے اندر سے کوئی مقامی گیت اسپیکر سے اپنی آواز پھیلائے ہوئے تھا۔ اس کے ساتھ ہائے ہاؤ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔شندے مجھے سمجھانے لگا کہ ہمیں ایک کس طرح کرنا ہے۔ویریات بھی یہ سب سن رہا تھا۔اصل ٹارگٹ ایک ہی شخص تھا۔

''نہیں شندے، یوں نہیں ہوگا جیسے تم کہہ رہے ہو۔''میں نے سب سن کر کہا تو اس نے تیزی سے پوچھا۔

''تو پھر کیسے ہوگا؟''

''یہاں ایک کی دو ہی صورتیں ہیں، یہاں اندھا دھند فائر کیا جائے، اس میں اگر وہ مطلوبہ بندہ مر گیا تو مر گیا، رسک ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہمارے لئے بھی بہت بڑا رسک ہو گا۔کسی کی گولی بھی ہمیں چاٹ سکتی ہے۔''

''اور دوسرا......؟''اس نے پوچھا۔

''میں اور تم اس دیوار سے اوپر چڑھتے ہیں۔ایک خاص بندے کو نشانہ بناتے ہیں اور واپس پلٹتے ہیں۔''میں نے کہا۔

''تو کیا وہ لوگ ہمیں واپس کار تک پہنچ جانے دیں گے؟''اس نے پوچھا تو میں نے کہا۔

''یہ ویریات کس لئے ہے، یہ کور دے گا۔''

''چل ٹھیک ہے، دیوار سے ایک کرتے ہیں، پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''اس نے کہا تو ہم دیوار کے ایک طرف چل پڑے۔انہی لمحات میں میرا فون بج اٹھا۔میں نے ایک بار تو یہی سوچا کہ کال نہ لوں۔پھر اسکرین پر دیکھا تو وہ بختاور تھا۔میں نے شندے سے ذرا ہٹ کر کال رسیو کر لی۔دوسری جانب سے بختاور نے متر شح لہجے میں کہا۔

”کہاں ہو تم......؟“

”میں کہیں بھی......“ میں نے کہنا چاہا تو تیزی سے بولا۔

”میں بتاتا ہوں تم کہاں ہو، ایک ویرانے میں، جہاں ناچ گانا ہو رہا ہے، وہاں کسی کو قتل کرنے پہنچ چکے ہو، یہی نا۔“

”ہاں مگر تمہیں کیسے......“ میں نے کہنا چاہا تو میری بات کاٹتے ہوئے دیوانہ وار بولا۔

”خدا کے لئے کچھ مت کرنا، یہاں سے نکل جاؤ، ایک لمحہ میں۔ تم گھیرے میں آ چکے ہو۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”سڑک کی طرف مت جانا۔ یہیں کہیں ویرانے میں نکل جاؤ، میں بعد میں بتاتا ہوں۔ نکل جاؤ بس۔“ بختاور چیخ رہا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ نجانے کیوں میرے دل نے اس کی آواز پر سکون محسوس کیا تھا۔ میرا من کہہ رہا تھا کہ اس کی بات مان لوں۔ میں نے شندے کی جانب دیکھ کر کہا۔

”تم دیوار پر چڑھو، میں تمہیں کور دیتا ہوں۔“

وہ دیوار پر چڑھنے کے لئے مناسب جگہ دیکھنے لگا۔ میں ہولے سے پیچھے ہٹا اور پھر ایک دم سے اندھیرے میں دوڑ لگا دی۔ اس وقت میرے دماغ میں یہ بالکل نہیں تھا کہ میں اچھا کر رہا ہوں یا غلط، بس مجھے بختاور کی آواز میں جو دردمندی تھی، اس نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کافی دور جانے کے بعد میں نے اپنی سانس بحال کرنے کے لئے رکا اور ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھ کر میں نے اس چار دیواری کی جانب دیکھا تو ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کئی گاڑیاں وہاں کھڑی تھیں۔ وہاں پر کئی لوگ پھیلے ہوئے تھے۔ بلاشبہ شندے اور

ویرات گھیرے میں آچکے تھے۔
میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چاچا عبدالمجید کا ریفرنس مجھ سے دھوکا کر جائے گا۔ وہ چھریرے بدن والا مجھے خود موت کے منہ میں دھکیل کر گیا تھا۔ اس نے مجھے ایسی جگہ بھیجا تھا جہاں میں بڑے آرام کے ساتھ گھیرے میں آ سکتا تھا۔ میں اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اگر بختاور کی فون کال نہ آتی تو میں گھیرا جا چکا تھا۔ اس چھریرے بدن والے نے شنددے اور ویرات کی قربانی دے دی تھی۔ میرے اندر اٹھنے والی غصے کی لہر نے مجھے پاگل سا کر دیا تھا۔ میں اب وہاں زیادہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ مجھے وہاں سے نکلنا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان کے پاس گاڑیاں ہیں، وہ اسی صحرا میں پھیل کر مجھے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں اٹھا اور اندازے سے بڑھتا چلا گیا۔
میں اپنے بارے میں جانتا تھا، میں رات بھر بھی سفر کرتا رہتا تو میں تھکنے والا نہیں تھا لیکن انسانی بدن کی ایک حد ہوتی ہے۔ میرے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ لیکن ایک امید تھی کہ بختاور مجھ سے رابطہ ضرور کرے گا۔ میں ابھی تھوڑے سے فاصلے پر آگے بڑھا تھا کہ چاچا عبدالمجید کا فون آ گیا۔ ان کی روہانسی سی آواز نکلی۔
”تم ٹھیک ہو پتر......“
”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا میں انہیں مزید دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تبھی وہ بولے۔
”اس نے ہمیں دھوکا دے دیا۔ اس چار دیواری کے اندر وہ لوگ تھے، جو اکیڈمی سے تربیت لے کر اب واپس پلٹ رہے تھے۔ وہ انہیں تمہارے ہاتھ سے مروا کر، خود تجھے فورسز کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ مگر تمہاری قسمت تم بچ گئے۔ اس نے ڈبل کراس کیا ہے۔ تم پریشان

نہیں ہونا، میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"میں جانتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ ہیں، میں پریشان نہیں ہوں۔"

"تم اپنا خیال رکھنا، میں کرتا ہوں کچھ۔" یہ کہتے ہی انہوں نے فون بند کر دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وقت وہ نہیں رہا جو پہلے تھا، اب بہت کچھ بدل گیا تھا۔ مقامی سورسز بھی دھوکا دینے لگے تھے۔

یہ سب گڈ مڈ ہو گیا تھا۔ وہ اگر ریاست کے ساتھ تھا تو اسے ان تربیت یافتہ لوگوں کو نہیں مروانا چاہیے تھا۔ انہیں پوری حفاظت کے ساتھ بارڈر پار کروانا تھا۔ یہ سب اس کی ریاست کے لئے کام کرنے والے تھے۔ دوسری طرف وہ مجھے پکڑوانا چاہتا تھا۔ اگر اس نے مجھے ہی پکڑوانا تھا تو میں خالی ہاتھ اس کے ساتھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تو شدت پسندوں اور دہشت گردوں کے ساتھ مجھے پکڑوا سکتا تھا۔ شہر میں مجھے گھیرا جا سکتا تھا۔ وہ مجھے یہاں لا کر ہی کیوں پکڑوانا چاہتا تھا؟ یہ دو متضاد باتیں تھیں، جس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس نے دھوکا دیا تھا تو اس کے انجام سے بھی باخبر تھا۔ ایسا اس نے کیوں کیا؟ یہ ڈبل کراس کیسا تھا؟ میں باوجود مغز ماری کے اس وقت نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ وقت تو ایسا تھا کہ مجھے خود کو کسی محفوظ مقام تک لے جانا تھا۔

میرے چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ میرے پاؤں کے نیچے صحرا تھا۔ کوئی سمت متعین نہیں تھی کہ میں کس طرف جا رہا ہوں لیکن میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں ایک محفوظ جگہ پر رک گیا۔ میں نے کوشش کر کے اپنی لوکیشن دیکھنا چاہی، مگر مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے سڑک کا تو پتہ چل رہا تھا لیکن خود کہاں ہوں، مجھے سفر کس طرف کرنا ہے، اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں نے زیادہ دیر فون استعمال نہیں کیا اور اٹھ کر چل پڑا۔ میں چلتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک میرا فون بج اٹھا۔ دوسری جانب بھلا تھی۔ میں نے کال

ریسیو کرتے ہوئے ہیلو کہا تو وہ چونک کر بولی۔

”تم ٹھیک تو ہو وریٹ......؟“

”نہیں، میں ٹھیک نہیں ہوں، میں صحرا میں کہیں پھنس گیا ہوں۔“ میں نے اسے بتایا تو وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

”ابھی تم......“ اس نے کہنا چاہا پھر بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی، ”دیکھو، تم گھبرانا نہیں، میں کچھ سوچتی ہوں۔“

”شاید تم مجھ تک نہ پہنچ پاؤ، تم اس وقت......“ میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

”یہ ٹھیک ہے کہ میں ٹرین میں ہوں۔ واپس جا رہی ہوں۔ میں خود تم تک نہیں پہنچ سکتی ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو، مجھے تھوڑا وقت دو۔ میں کرتی ہوں کچھ۔“ اس نے تیزی سے کہا تو میں بولا۔

”میرے فون سے تمہیں کچھ پتہ نہیں چلے گا کہ میں کہاں ہوں۔“

”تم خود تو مجھے اپنی لوکیشن بھیج سکتے ہو نا۔ اگر بھیج سکتے ہو تو میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔ دیکھو، اگر تم مجھ سے بات کر سکتے ہو تو تم مجھے لوکیشن بھیج سکتے ہو؟“ اس نے مجھے ٹھہر ٹھہر کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں بھیج سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تو جلدی کرو، مجھے لوکیشن بھیجو، میں تمہیں گائیڈ کرتی ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے اسے لوکیشن بھیج دی۔ وہ میرے ساتھ لائین پر ہی تھی۔ کچھ دیر بعد بولی، ”دیکھو، تم کسی بھی طرف تھوڑا سا چلو۔“ میں سامنے کی جانب چل پڑا۔ میں کوئی چالیس پچاس قدم چلا تھا کہ اس نے کہا، ”نہیں رک جاؤ۔“ میں وہیں پر رک گیا تو وہ مجھے سمجھانے لگی۔

میں جس سڑک سے اس چار دیواری تک پہنچا تھا، وہ رام گڑھ روڈ تھا۔ وہ میرے عقب میں تھا۔ مجھ سے دو کلو میٹر کے فاصلے پر ایک مندر تھا۔ اگر میں وہاں تک پہنچ پاتا ہوں تو وہیں سے ایک سڑک نکل کر واپس جیسلمیر تک جاتی تھی اور وہی سڑک مجھے بھولا ئی تک لے جا سکتی تھی۔ اس نے مجھے دائیں بائیں کا سب سمجھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے سمجھایا کہ میں کیا کر سکتا ہوں کہ میں سیدھے مندر تک ہی پہنچوں۔

"کیا اب تمہیں ضرورت ہے کہ میں تمہیں پوجا کی لوکیشن دوں؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی نہیں، ابھی میں کسی ٹھکانے پر پہنچوں گا تو پھر تازہ لوکیشن لوں گا اگر ضرورت ہوئی تو۔" میں نے کہا تو وہ بولی۔

"ایک بات بتا دوں دونوں نمبرز کی لوکیشن ایک ہی ہے۔"

"میرا ابھی اندازہ تھا۔ خیر تم ان پر نگاہ رکھنا۔ میں مندر تک پہنچ کر تمہیں بتاتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ بولی۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

میں نے بملا سے بات ختم کر کے فون جیب میں ڈالا اور تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

☆......☆......☆

اندھیرے میں مندر کا ہیولا میرے سامنے تھا۔ اندر کہیں چراغ جل رہے تھے۔ جن کی روشنی پھوٹ کر باہر آ رہی تھی۔ مندر سے ہٹ کر چند جھونپڑیوں کی طرز پر بنے ہوئے گھر تھے جن کی چار دیواری نہیں تھی۔ مجھے صرف ایک ہی خطرہ تھا کہ وہاں موجود کتے بھونک کر میری آمد سے وہاں کے لوگوں کو مطلع نہ کر دیں۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کوئی بھی، کسی طرف سے بھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز نہیں آئی تھی۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا مندر کی

سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں نے جان بوجھ کر پسٹل نہیں پکڑا تھا، پہلی نگاہ میں پسٹل دیکھ کر خوف زدہ ہونے والا غلط تاثر لے جاتا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر بیٹھ گیا۔ آگے چبوترہ تھا، جس کے اندر ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ اسی میں مورتیاں دکھائی دے رہی تھیں، جن کے سامنے چراغ روشن تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کن کی مورتیاں تھیں اور وہ کس طرح کے بھگوان کی پوجا کرتے تھے۔ میں اگر انہیں اپنے بارے میں ویر سنگھ بتاتا تو لازمی طور پر مجھے ان مورتیوں کے بارے میں پتہ ہونا چاہیے تھا۔ میں انہی باتوں میں الجھا ہوا تھا لیکن لاشعوری طور پر پانی کی تلاش میں تھا کہ کہیں مجھے پانی دکھائی دے جائے تو میں اپنی پیاس بجھالوں۔ انہی لمحات میں مجھے یوں لگا جیسے سیڑھیوں کے پاس کسی نے سرگوشی کی ہے۔ میں فوراً خود میں سمٹ کر ایک ستون کے ساتھ لگ گیا۔ میں نے پوری کوشش کر کے اس طرف دیکھنا چاہا۔

سیڑھیوں کے ساتھ ایک جوان سال لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے پاس اوپری دھڑ سے ننگا، دھوتی پہنے ایک پجاری کھڑا تھا۔ اس نے لڑکی کو اپنی بانہوں میں لیا ہوا تھا۔ لڑکی بڑے آرام سے اس کی بانہوں کے حصار میں تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر یونہی کھڑے رہے پھر لڑکی اس سے الگ ہو کر بڑے آرام سے چلتی ہوئی ایک جانب بڑھ گئی۔ وہ چلتی چلی جا رہی تھی۔ وہاں اندھیرا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کسی جھونپڑی نما گھر میں چلی گئی ہوگی۔ مجھے نگاہیں لگانے میں بڑی مشکل ہوئی تھی۔ جب اندھیرے میں مزید دکھائی نہیں دیا تو میں نے اس پجاری کی طرف توجہ کی وہ اب تک وہیں کھڑا تھا۔ میں کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچتے رہا کہ میں اس سے کیا فائدے لے سکتا ہوں۔ اچانک وہ دیوار کے ساتھ کھڑے کھڑے غائب ہو گیا۔ میں چونک گیا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ میں ابھی اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ نیچے کہیں چارپائی گھسٹنے کی آواز آئی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ نیچے کوئی کمرہ ہو سکتا ہے۔ اب وہ پجاری سونے

کا اہتمام کر رہا ہوگا۔ میں سیڑھیوں سے اترا، اندازے سے اس طرف بڑھا تو میرے سامنے کمرہ تھا۔ جس میں ایک دیا روشن تھا۔ میں بلا جھجک اندر چلا گیا۔ ایک دم سے مجھے اپنے سامنے پا کر وہ پجاری چونک کر اٹھا۔ اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں تھیں۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کک...... کون ہو تم......؟"

"ڈرو مت، میں تمہیں کچھ نہیں کہنے والا۔" میں نے کہا۔

"پھر بھی تم کون ہو اور یہاں کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"دیکھو پجاری جی، میں ایک مسافر ہوں اور راستہ بھٹک گیا ہوں۔" میں نے کہا اور اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ قریب ہی ایک صراحی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا تو اس میں پانی تھا۔ میں نے پجاری کی طرف دیکھ کر پوچھا، "اس میں پانی پینے والا ہے؟"

"ہاں، میں اسی سے پیتا ہوں۔" اس نے کہا تو قریب ہی پڑا ایک پیتل کا پیالہ اٹھا کر میں نے اسے آدھا کیا اور پجاری کی جانب بڑھا دیا۔ وہ میرے اس عمل سے سمجھ گیا تھا کہ میں یقین کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے وہ پیالہ منہ کو لگا کر پانی پی لیا، تب میں نے صراحی اٹھائی اور منہ کو لگالی۔ میں جی بھر کر پانی پیا اور صراحی وہیں رکھ دی جہاں سے اٹھائی تھی۔ پجاری کے منہ سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ اس نے پوچھا۔

"تم نے جانا کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں، میں جیسلمیر سے بھولائی کی طرف جا رہا تھا۔ کچھ دوست تھے ہم، بس ان سے جھگڑا ہو گیا تو انہوں نے راستے میں اتار دیا۔ بس پھر......" میں نے یونہی ایک بات گھڑ دی۔

اگر تم نے بھولائی جانا ہے تو پیدل صبح تک بھی نہیں پہنچ پاؤ گے۔ کار میں سیدھے سیدھے

سڑک سے جاؤ تو دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔" پجاری نے کہا، اس کا اعتماد بحال ہو چکا تھا۔

"پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں اب صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔" اس نے کہا۔

"صبح تک......؟" میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

"ہاں، صبح سویرے ہی یہاں اردگرد کی بستیوں سے لوگ پوجا کے لئے یہاں آتے ہیں۔ ان میں سے کسی کے ساتھ میں تجھے بھولائی جانے والی سڑک تک پہنچا دوں گا۔" اس نے تفصیل سے بتایا۔

"اب یہاں بستی میں......" میں نے پوچھنا چاہا تو وہ بولا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ ہماری بستی خالی ہے۔" اس نے کہا۔

"اور وہ لڑکی......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ لڑکی یہاں سے تین کلو میٹر کے فاصلے پر موجود بستی سے اونٹ پر آئی تھی، وہ محبت کرتی ہے مجھ سے، ہم بہت جلد بھاگ جانے والے ہیں۔" اس نے صاف لفظوں میں بتا دیا تاکہ مجھے کوئی شک نہ رہے۔

"پجاری جی مجھے آپ کی محبت سے کوئی لینا دینا نہیں، مجھے بس بھولائی پہنچنا ہے، کیسے پہنچوں بس۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"کہا نا صبح تک انتظار کرو۔" اس نے اکتاہٹ سے کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ تبھی میں نے پوچھا۔

"یہاں اگر کوئی نہیں رہتا تو پھر یہ جھونپڑیاں، یہ گھر......؟"

"یہ مندر کے لئے لوگوں نے بنا چھوڑے ہیں، لوگ یہاں پر ٹھہر جاتے ہیں۔ کئی کئی دن

بھی ٹھہرتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہیں تھوڑے سے فاصلے پر ایک بستی ہے، وہیں کا ہوں، کبھی یہاں رک جاتا ہوں کبھی چلا جاتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"کس پر جاتے ہو؟" میں مطلب کی بات پر اتر آیا۔ وہ بھی سمجھ گیا۔ اس کے چہرے پر تردد اتر آیا۔ اس نے دھیمے سے کہا۔

"کوئی نہ کوئی مجھے چھوڑ دیتا ہے، لے جاتا ہے، لے آتا ہے۔"

"اوہ......!" میرے منہ سے بے ساختہ ہنکارا نکل گیا۔ مجھے اب ہر حال میں یہ چند گھنٹے اسی مندر میں گزارنا تھے۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر چارپائی سے اٹھتے ہوئے پجاری سے کہا، "میں یہاں مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوں، تم سکون سے سو جاؤ۔ تم صبح مجھے کسی کے ساتھ بھیج دینا۔"

میں کمرے سے باہر آ گیا۔ پھر آہستہ قدموں سے چلتا ہوا سیڑھیوں پر آن بیٹھا۔ کچھ دیر بیٹھے رہنے کے بعد میں نے بسلا کو فون کیا۔ اس نے پہلی بیل پر ہی فون اٹھا لیا۔ میرے ہیلو کے جواب میں بولی۔

"میں دیکھ رہی ہوں تم اس مندر کے پاس ہو۔"

"میں اس مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوں۔" میں نے خوشگوار انداز میں کہا۔

"اوہ......تو وہاں کوئی نہیں ہے۔" اس نے پوچھا تو میں نے اختصار سے بتا کر کہا۔

"تم سکون سے سفر کرو، میں اب دیکھ لوں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"کاش میں سفر نہ کرتی، اگر وہاں ہوتی تو اب تک......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس

کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”تم فکر نہ کرنا، میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں وہیں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں یہاں سے پیدل نکل پڑوں؟ دن نکلنے تک کسی نہ کسی بستی میں پہنچ جاؤں گا۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ لوگ مجھ سے کیا سلوک کرتے ہیں۔ یہ سلوک اچھا بھی ہو سکتا تھا اور برا بھی۔

مجھے عجیب برے برے خیال آنے لگے تھے۔ میں اس کیفیت سے بچنا چاہتا تھا۔ ایسے میں میرا فون بج اٹھا۔ دوسری جانب بھنڈاور تھا۔

”کہاں ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”میں ایک مندر کے پاس ہوں۔“ میں نے اسے سچ بتا دیا۔

”وہ جگہ محفوظ تو ہے نا؟“ اس نے پوچھا۔

”میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ میں نے کہا۔

”او کے۔ تم کسی طرح رام گڑھ روڈ تک واپس پہنچو، کہیں بھی، کسی بھی جگہ، وہاں آ کر مجھے بتا دینا۔ میں سب سنبھال لوں گا۔“ اس نے کہا۔

”او کے، میں کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔

میں سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا اکتا گیا تھا۔ پجاری نے کہا تھا کہ سامنے جو گھر ہیں وہ لوگوں کے رہنے کے لئے ہیں اور اس وقت خالی ہیں، میں ان کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے ہی میں ایک جھونپڑی کے قریب گیا، میری نگاہ دو چارپائیوں پر پڑی۔ ان پر دو لوگ سو رہے تھے۔ ایک پر وہی لڑکی تھی جسے کچھ دیر پہلے میں نے پجاری کے ساتھ دیکھا تھا۔ دوسرا کوئی مرد تھا۔ اس کا مطلب ہے اس نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ یہ سوچ کر میں جیسے ہی پلٹا، وہ پجاری میرے سامنے

کھڑا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے مجھ پر پسٹل تانے ہوئے تھا۔ میں نے ایک دم سے خوف زدہ ہو جانے کی اداکاری کی۔ میں نے ڈرے ہوئے انداز میں کہا۔

”پپ ....پجاری جی.... یہ کیا ....کر رہے ہیں۔“

”تم نے سیڑھیوں پر بیٹھنا تھا، یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس نے کڑک دار لہجے میں پوچھا۔

”تم نے کہا تھا کہ خالی ہیں تو میں نے سوچا تھوڑی دیر سو لوں۔“ میں نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔ ان باتوں سے وہ لڑکی جاگ گئی۔ لیکن مرد یونہی سویا رہا تھا۔ وہ لڑکی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”چل بھاگ یہاں سے۔ اگر پلٹ کر بھی دیکھا تو گولی مار دوں گا۔“

”پجاری جی، میں کہاں جاؤں گا، صبح تک رہنے دیں، میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں اس کی طرف بڑھا اور پاؤں میں پڑنے کے لئے جھکا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں اسے دھوکا دے رہا ہوں؟ بلکہ مجھے دھمکا رہا تھا۔ اس نے فائر نہیں کیا، میں اس کے پاؤں تک جھک چکا تھا۔ مجھے اتنا ہی چاہئے تھا، میں نے ایک ہاتھ اس کے پسٹل پر ڈالا اور دوسرا پنڈلی پر ڈال دیا۔ اگلے ہی لمحے اس کا پسٹل میرے ہاتھ میں تھا اور وہ ریت پر گرا پڑا تھا۔ میں نے ذرا بھی تردد نہیں کیا اور ٹرائیگر دبا دیا۔ نال سے شعلہ نکلا، ایک دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی پجاری کی چیخ بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی لڑکی کی چیخ ابھری۔ میں نے ایک جست بھری اور لڑکی کو پکڑ کر کہا۔

”خاموش......“

وہ چپ کر گئی۔ پجاری کی دبی دبی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ نجانے اس کے فائر کہاں لگا تھا۔ چارپائی پر پڑا ہوا مرد اسی طرح بے ہوش تھا۔ میں لڑکی کو پکڑ کر پجاری کے پاس لے گیا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ میں نے نال اس کے ماتھے پر رکھ دی اور غراتے ہوئے پوچھا۔

"کون لوگ ہو تم؟"

"یہ پجاری ہے، میں یہاں اس کے پاس آئی ہوں، وہ میرا شوہر ہے، وہ نشے میں سویا ہوا ہے۔"

"کس چیز پر آئے ہو تم لوگ؟"

"اونٹ پر......" لڑکی نے تیزی سے کہا۔

"کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ پیچھے بندھا ہوا۔" لڑکی نے بتایا تو میں نے پجاری کے سر پر فائر کر دیا۔ اس کی ہچکی نکلی اور وہ اس جہان سے کوچ کر گیا۔ میں نے لڑکی سے زیادہ بات نہیں کی۔ اسکے ساتھ اونٹ تک پہنچا۔ لڑکی کو آگے بٹھایا اور اس پر سوار ہو کر چل دیا۔ مجھے ان کے تعلق سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ اگر پجاری جھوٹ نہ بولتا اور مجھ پر پسٹل نہ تانتا تو شاید میں وہی کرتا جو اس نے کہا تھا۔

لڑکی اونٹ بھگائے چلی جا رہی تھی۔ اب پتہ نہیں وہ مجھے کہاں لے کر جاتی۔ لیکن پہلو سے لگی پسٹل کی نال سے امید تو یہی تھی کہ وہ مجھے دھوکا نہیں دینے والی تھی۔

☆......☆......☆

میں رام گڑھ روڈ پر سڑک سے ہٹ کر کھڑا تھا۔ وہ لڑکی واپس جا چکی تھی۔ صبح ہونے کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ میں نے بختاور کو فون کر کے بہت بڑا رسک لے لیا تھا۔ میں اتنا سمجھ چکا تھا کہ بختاور کی اتنی معلومات یونہی نہیں تھی۔ وہ ان لوگوں کے بالکل قریب تھا جو مجھے تلاش کر رہے تھے۔ اس نے اب تک جو مجھے بچانے کی کوشش کی تھی اور اس کی اطلاع پر ہی میں بچا تھا، کیا اب بھی وہ مجھے دھوکا دے سکتا تھا؟ کیا وہ مجھے گھیرنے کے لئے ایسا کر رہا تھا؟ یا اسے میری فکر تھی۔ میں دو بار گھیرے میں آ چکا تھا اور دونوں بار اسی نے مجھے اس گھیرے سے نکالا تھا۔

مقامی سورس دھوکا دے چکے تھے۔ جو کچھ بھی تھا، میں اب فیصلہ کن انداز میں سوچ رہا تھا۔

میرا سیل فون بجا تو وہ مجھے احساس ہو گیا کہ بختاور کہیں قریب ہی ہے۔ میں نے کال رسیو کی تو اس نے مجھے اپنی گاڑی کے بارے میں بتایا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ سڑک پر نمودار ہو گیا۔ اس نے گاڑی روک دی۔ میں نے جی کڑا کیا اور اس کی کار کے قریب جا پہنچا۔ وہ گاڑی میں اکیلا ہی تھا۔ میں اس کے ساتھ جا بیٹھا۔ وہ مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے کسی انہونی شے کو دیکھ رہا ہو۔ وہ ایک دم سے ہنس دیا۔ پھر گاڑی بڑھا کر ہنستے ہوئے بولا۔

"یار کمال شے ہو تم بھی......"

"ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"قسمت، بلاشبہ قسمت تمہارا ساتھ دے رہی ہے۔ ورنہ جتنی کوشش وہ لوگ تمہیں پکڑنے کے لئے کر رہے ہیں، ایسا تو پاتال سے بندہ نکال کر لے آئیں۔" اس نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔

"ایسا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تقریباً بیس سے پچیس لوگوں کی ایک ٹیم ہے مختلف فورسز سے، جو تمہیں تلاش کر رہی ہے۔ پوجا کو تو انہوں نے اس لئے ساتھ رکھا ہوا ہے وہ تمہیں اچھی طرح پہچانتی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

"اور تم ان کے ساتھ......؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ تم میرے علاقے سے ہو اور میں تمہیں پکڑنے میں مدد دے سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"تو اب مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بارڈر کی طرف، اب دیکھیں وہاں تک جا سکتے ہیں یا نہیں۔ میں بھاگ آیا ہوں۔" اس نے سکون سے کہا۔

"مطلب اب ہم جیسلمیر کی طرف نہیں جا رہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، ہم بھولائی تک جائیں گے، پھر اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" اس نے بتایا

"لیکن میں اس بندے کو نہیں چھوڑنا چاہتا جس نے مجھے رات یہاں تک پہنچایا تھا۔ اس نے ڈبل کراس......" میں نے جذباتی انداز میں کہنا چاہا تو وہ بڑے سکون سے بولا۔

"وہ رات ہی قتل ہو گیا تھا۔"

"کس نے قتل کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب......؟" میں حیرت زدہ رہ گیا۔

"وہ شندے اور ویرات کے ساتھ تمہیں بھیج کر سیدھا اس میم کے پاس آیا تھا، جو تمہیں پکڑنا چاہتی تھی۔ اس نے تمہارے بارے میں جب بتایا تو میں نے تمہیں اطلاع دی۔ میں نے اسی وقت اس میم کو چھوڑنے کے ساتھ ساتھ اسے بھی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور پھر میں نے اسے مار دیا اور اب یہاں ہوں تیرے ساتھ۔"

اس نے یوں روداد سنائی جیسے بازار سے کوئی شے خرید کر لائے جانے کے بارے میں بتایا جا رہا ہو۔ تبھی میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ وہاں موجود تربیت یافتہ لوگوں کو کیوں مروانا چاہتا تھا؟ وہ تو......؟"

"ان لوگوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ جن لوگوں نے یہاں سے تربیت لی ہے، وہ کوئی نان اسٹیٹ ایکٹرز نہیں بلکہ فورسز ہی کے بھیجے ہوئے لوگ ہیں۔ وہ یہاں سے سیکھ کر جائیں گے تو

اس کا الٹ کریں گے۔ وہ انہیں یہیں ختم کر دینا چاہتے تھے۔" بختاور نے بتایا تو مجھے حیرت نہیں افسوس ہوا۔

"یہ ایک دم سے سب کچھ گڑبڑ کیوں ہو گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری وجہ سے......؟" اس نے سکون سے کہا۔

"تم نے اکیڈمی کو ختم کیا، وہاں سے ڈیٹا بھیجا، اتنے بندے بے نقاب ہوئے ہیں کہ یقین نہیں آ رہا۔ جتنے لوگ یہاں کرپٹ اور لالچی ہیں، ہمارے ہاں بھی اتنے ہی ہیں۔ اسی طرح وہاں بھی سورس ہیں۔ ایک ہلچل مچ گئی ہوئی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" اس نے وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

"اب وہ لوگ کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ لوگ بکھر گئے ہیں، کچھ پکڑے گئے ہیں۔ ان کا مجھے بہت افسوس ہے۔ اب وہ جیلوں میں اذیت کاٹیں گے۔" بختاور نے دکھ سے کہا۔

"کاش میں ایک بار پوجا سے مل سکتا۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"ہاں اس سے ملنا بنتا ہے، وہ تمہارے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ شاید کسی ہتک کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے سر جھٹکا اور تیزی سے بولا "اب پیچھے کی چھوڑو، اب صرف اس پر دھیان دو کہ بارڈر کیسے پار کرنا ہے؟"

"اب جب چل ہی پڑے ہیں تو دیکھ لیں گے۔" میں نے کہا اور سیٹ سے ٹیک لگا دی۔

وہ گاڑی بھگائے چلا جا رہا تھا۔ تبھی اچانک میرے ذہن میں آیا تو میں نے تیزی سے کہا۔

"تم ایک بڑی مصیبت اپنے ساتھ لئے پھرتے ہو۔"

"وہ کیا......؟" اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تمہارا سیل فون، اس سے کوئی بھی تیری لوکیشن دیکھ سکتا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ کھل کر ہنس دیا۔ پھر بولا۔

”تم نے شاید سیل فون نمبر پر غور نہیں کیا۔ میرے پاس سب نیا ہے۔ وہ فون میرے کمرے میں پڑا۔ میں اپنے کمرے میں آرام کر رہا ہوں۔“

”اوہ......“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور پھر اطمینان سے ٹیک لگالی۔

بھولائی سے کافی پہلے دائیں جانب ایک کچا راستہ جا رہا تھا۔ کہیں کہیں جھونپڑے دکھائی دینے لگے تھے۔ بیچ صحرا میں ایک قدرتی جھیل دیکھ کر ایک خوشگوار احساس میرے من میں اتر گیا۔ اسی جھیل سے تھوڑے فاصلے پر ایک بڑا سا جھونپڑا تھا۔ وہ کار اس طرف لے گیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دیکھا، جھونپڑے کے ساتھ ہی کچا کمرہ بنا ہوا تھا۔ وہیں ایک باڑہ تھا جس میں کافی سارے مویشی تھے۔ بختاور نے کار وہیں درختوں کے نیچے روک دی لیکن ہیڈ لائٹس آف نہیں کیں۔ بختاور کار سے اترا اور ہیڈ لائٹس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مجھے لگا جیسے وہ کسی کو اپنا آپ دکھانا چاہتا ہو، چند لمحوں بعد ہی جھونپڑے میں سے ایک لمبا تڑنگا نوجوان باہر نکلا۔ وہ بختاور سے گلے ملا، گرم جوشی سے مصافحہ کیا، پھر میرے ساتھ بھی اس نے ایسا ہی رویہ دکھایا، ہم جھونپڑے میں جا پہنچے۔ جہاں چراغ کی روشنی تھی۔ وہاں چارپائیوں پر بیٹھے تو اس نے بختاور سے پوچھا۔

”تم تو کل آنے والے تھے؟“

”بس آج نکلنا پڑا۔“ اس نے دھیمے سے کہا۔

”اس کا تو ذکر نہیں کیا تم نے؟“ اس نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کہانا اب مجبوری بن گئی ہے۔ تم فکر نہ کرو۔“

بختاور نے کہا تو وہ سر ہلانے لگا جیسے وہ بات سمجھ گیا ہو۔

"تم لوگ بیٹھو، میں تمہارے کھانے پینے کا بندوبست کروں۔" اس نے کہا اور اٹھنے لگا۔ تبھی بختاور نے تیزی سے کہا۔

"کھانے کو چھوڑو، آگے بات کرو۔"

"دیکھو، دن نکلنے میں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ ہے۔ اور ڈیوٹی ختم ہوتی ہے دو گھنٹے بعد، اگر ہم سورج نکلنے تک وہاں پہنچ جاتے ہیں تو......" اس نوجوان نے کہا تو بختاور بولا۔

"تم بات کرو یار، ہم آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ ورنہ پھر کل تک انتظار کرنا پڑے گا۔" یہ کہتے ہوئے بختاور نے اندر کی جیب سے سونے کے تین بسکٹ نکالے اور اس کے سامنے رکھ دیئے پھر بولا۔ "تھوڑا ایکشن ہے جو گاڑی میں پڑا ہے۔"

"او کے میں بات کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے فون نکال کر نمبر ملایا اور کسی کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ اس کے سامنے سونے کے بسکٹ پڑے ہیں۔ بات کر کے اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چلو۔"

اگلے چند منٹ میں ہم وہاں سے نکل پڑے۔

☆......☆......☆

بھولائی سے بارڈر تک کے سفر میں مجھے پتہ چلا کہ اس نوجوان کی منگیتر بارڈر فورس میں ملازم تھی۔ وہ دونوں نچلی ذات سے تھے۔ آنکھ کھلتے ہی انہوں نے غربت کی انتہا دیکھی تھی۔ ان کے پرکھوں پر تو علم حاصل کرنا ویسے ہی جرم تھا۔ نہ وہ مذہبی تعلیم حاصل کر سکتے تھے اور نہ ہی دنیاوی۔ کسی طرح ان کے گاؤں میں سکول بن گیا تو یہ بھی تھوڑا بہت پڑھ گئے۔ دونوں میٹرک کر چکے تو اس نوجوان نے آگے کالج میں داخلہ لے لیا۔

انہی دنوں بارڈر فورس میں لڑکیوں کو بھرتی کیا جانا لگا۔ ان ویرانوں میں نوکری انہی لڑکیوں نے قبول کی جو غربت کی لکیر سے بھی کہیں نیچے تھیں۔ کچھ عرصہ ملازمت میں ان لڑکی پر یہ راز کھلا کہ ان لڑکیوں کی بھرتی صرف اور صرف عیاشی کے لئے کی گئی ہے۔ ماحول ہی کچھ ایسا بنا دیا گیا کہ ان میں سے کوئی لڑکی بچ نہیں سکتی تھی۔ غریب لڑکیوں نے اس ماحول کو قبول تو کر لیا لیکن ان کے اندر ایک خوف پیدا ہو گیا۔ شاید وہ گھرداری کی زندگی کبھی نہ پا سکیں گی۔ اس تنخواہ میں وہ ساری زندگی ان ویرانوں میں خوار ہوتی رہیں گی۔ اسی خوف نے بغاوت کو جنم دیا۔

بارڈر کے دونوں طرف غیر قانونی دھندا کرنے والے کوئی نہ کوئی راہ نکالنے کی کوشش میں تھے۔ انہوں نے یہیں سے راہ نکالی۔ انہیں دولت کی چکا چوند دکھائی۔ تب لوہے کی باڑ کسی کام کی نہ رہی۔ مال کے ساتھ ساتھ لوگ بھی ادھر سے ادھر جانے لگے۔ انہی لڑکیوں نے اپنے اپنے گروپ بنا لئے۔ جن کا مقصد صرف ایک ہی تھا۔ دولت بناؤ اور نوکری چھوڑ کر اپنا گھر بسالو۔ کئی لڑکیاں یہ نوکری چھوڑ گئیں اور ان کی جگہ لینے کو نئی لڑکیاں آ گئی۔ آفیسرز کی اور عام بارڈر فورس کی عیاشی کا سامان بنتا گیا۔ نوجوان کی منگیتر نے اسے سب بتا دیا۔ تب غربت سے نکلنے کے لئے اس نے بھی یہی راستہ اختیار کیا۔ ہم دونوں کو بارڈر پار کرانے میں تین سونے کے بسکٹ، کیش اور یہ گاڑی ان کی تھی۔

اس وقت دن نکلنے سے پہلے کا نیلگوں سماں تھا جب ہم سیاہ گیٹ سے نکل کر دوسری جانب جا پہنچے تھے۔ یہی زیرو لائین تھی جہاں پر کسی طرف سے بھی آنے والی گولی ہمیں چاٹ سکتی تھی۔ وہ تھوڑا سا سفر ہمیں کسی پل صراط سے کم نہیں لگا تھا۔ زمین کا یہ ٹکڑا کس قدر خطرناک تھا اس کا احساس پوری طرح ہو گیا تھا۔

دن چڑھ آیا تھا۔ تیز دھوپ میں دور دور تک کوئی سائبان نہیں تھا۔ یہ گریٹر چولستان کا وہ علاقہ تھا جہاں تک جانے کے لئے ہزار بندوبست کئے جاتے تھے۔ یہاں درخت کوئی نہیں تھا ہاں مگر جھاڑیاں اور کہیں کہیں گھاس ضرور تھی۔ ہمیں شام تک کی پیاس کی فکر نہیں تھی۔ اس نوجوان نے پانی کی چند بوتلیں ہمیں دے دی تھیں۔ بھوک نے اپنا احساس دلانا شروع کر دیا تھا، لیکن ہم چلتے چلے جا رہے تھے۔ بارڈر سے پہلے میں نے اپنے اور بختاور کے بارے میں بتا دیا تھا۔ یہ ایک امید تھی کہ شاید ہم تک کوئی پہنچ جائے۔ اس وقت ہمارے فون بند تھے۔ وہاں کوئی نیٹ ورک نہیں تھا۔ ہمیں ایک سمت دے دی گئی ہوئی تھی کہ ایک احاطہ ہے۔ وہاں تک پہنچ جاؤ۔ ہمارے فون اب صرف کمپاس کا کام دے رہے تھے۔ بیٹری بھی بہت کم رہ گئی تھی۔ مگر ہم چلتے چلے جا رہے تھے۔ دوپہر ہونے سے پہلے ہمیں وہ احاطہ دکھائی دے گیا۔ ہم اس تک جا پہنچے۔ وہ ویران چار دیواری تھی۔ اس میں کوئی نہیں تھا۔ ہم محتاط انداز میں اندر چلے گئے۔ سامنے ایک کمرہ تھا۔ اس میں چار پائیاں دھری ہوئی تھیں۔ مجھے سمجھ آ رہی تھی کہ وہ احاطہ کس مقصد کے لئے بنایا گیا ہوگا۔

ہم سہ پہر تک وہیں پڑے رہے۔ شاید اس دوران ہم سو بھی گئے تھے۔ سہ پہر کے وقت احاطے کے باہر تھوڑی ہلچل محسوس ہوئی۔ اس وقت ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا جب ہم نے چند اونٹ دیکھے۔ دو سار بان انہیں ریت پر بٹھا رہے تھے۔ ہم ان تک جا پہنچے۔ انہوں نے ہمیں بسکٹ اور مشروب دیئے جو ہم نے اونٹوں پر بیٹھ کر ہی کھائے۔ ہمارا سفر شروع ہو گیا تھا۔

رات کا دوسرا پہر ختم ہونے کو تھا جب ہم بستی چراغ شاہ کے قریب سے گزرے۔ کتوں کی فطرت ہے کہ وہ بھونکتے ہیں۔ انہوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ہم بستی سے گزر گئے تو سکون ہو گیا۔ بستی کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک دم سے نفرت میرے اندر سما

گئی تھی۔ پیروزاں وہ عورت تھی، جس نے میرے سر کی قیمت پچاس لاکھ رکھی تھی۔ میرا دل تو چاہا کہ ابھی اونٹ سے اتروں اور سیدھا اس کے گھر تک جا پہنچوں۔ لیکن میں نے خود پر جبر کیا۔ اب میں آ گیا تھا۔ اب اسے ہی نہیں کئی ساروں کو ختم کرنا تھا۔ وہ جو اس دھرتی کا ناسور تھے۔ اس وقت ہماری منزل بختاور کی بستی تھی۔ جو بستی کامن کے نام سے مشہور تھی۔

☆......☆......☆

میری آنکھ کھلی تو دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ بہت عرصہ بعد میں اتنی گہری نیند سویا تھا۔ میں کسلمندی سے چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا کہ بختاور آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے تھے۔ اس نے آتے ہی کہا۔

”چل جلدی سے نہا لے، میں تیرے لئے کھانا لے کر آتا ہوں۔“

میں اٹھا اور پھر جب فریش ہو کر واپس کمرے میں آیا تو سامنے کھانا پڑا ہوا تھا۔ میں نے جی بھر کے کھایا۔ بختاور نے برتن اٹھوا دیئے اور میرے سامنے کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”علی زین، ہم یہاں تک آ گئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تیرے دل میں کیا ہے۔ اب تیرا ارادہ کیا ہے؟ تجھے کہاں جانا ہے؟ میں کچھ نہیں جانتا لیکن میں تمہیں اپنے دل کی بات بتا دینا چاہتا ہوں۔“

”ایسی کون سی بات ہے بختاور؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”تجھے شاید میری باتیں اچھی نہ لگیں لیکن میری بات غور سے سن لینا۔“ اس نے پھر جھجکتے ہوئے کہا۔

”یار تم کہو، میں سن رہا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”تم جانتے ہو کہ ہمارے اور میرن شاہ کے درمیان دشمنی چلتی آ رہی ہے۔ دکھ یہ ہے کہ

اس کے نوکر چاکر مرتے رہے اور وہ ہمارے بھائی بند مارتا رہا۔ میرے باپ نے مجھے بچانے کی خاطر مجھے اس بستی سے دور رکھا۔ اسی وجہ سے میں راجستھان جا نکلا تھا۔ تم نے میرن شاہ کو مار دیا، جس نفرت سے مارا، اس میں کچھ ایسا تھا کہ پورا علاقہ چونک گیا۔ ہر کسی کے لب پر یہی سوال تھا کہ تم کون ہو؟ سانول جان گیا تھا کہ تم کون ہو؟ شاید تمہارا بچپن یہیں کہیں گزرا ہے۔ خیر وہ تم بتانا چاہو تو ٹھیک ورنہ میں کوئی دوسری بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"بولو، میں سن رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"چند دن پہلے ہیرو ڈاں نے میرا چچا زاد مروا دیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ مجھے لگا یہ رو دے گا۔ میں خاموش رہا تو اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا، "مجھے وہیں جیسلمیر میں یہ اطلاع مل گئی تھی۔ مجھے بہت دکھ تھا، میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اُڑ کر یہاں اپنی بستی میں آ جاؤں۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس ہیرو ڈاں خاندان کو ختم کرنا ہے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ پھر میں نے واپسی کے لئے کوشش کرنا شروع کر دی۔ انہی دنوں مجھے پتہ چلا کہ تم جیسلمیر میں آ گئے ہو۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا تھا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"مجھ سے رابطہ کیا گیا تھا۔ مجھے کئی ساری تصویریں دکھا کر پوچھا گیا کہ ان میں سے علی زین کون ہے۔ ان میں تمہاری ایک تصویر تھی۔ میں نے بتا دیا۔ انہوں نے مجھے اس ٹیم میں شامل کر لیا جو تمہیں پکڑنے والے تھے۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں ہر حال میں بچاؤں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم نے میرن شاہ کو بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ ندیم ڈانڈیا تمہیں پکڑوانا چاہتا تھا۔ میں چونکہ

اس کے ساتھ تھا۔ اس لئے ان کے اندر تک رسائی کر گیا تھا۔ تمہیں بچا کر لانے کے لئے میں نے سب کچھ کیا۔ میرا صرف اور صرف مقصد ایک ہی تھا کہ تمہیں یہاں لے کر آتا۔"

"ایسا کیوں بختاور......؟" میں نے تصدیق کے لئے پوچھا، سمجھ تو میں گیا تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔

"اس پیروزاں کو ختم کرنا۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے رُکا پھر کہتا چلا گیا۔ "میں جانتا ہوں کہ ہم نے بڑی کوشش کی کسی طرح یہ خاندان ختم ہو جائے لیکن ہم انہیں ختم نہیں کر سکے بلکہ اپنے بہت سارے بندے مروا بیٹھے ہیں۔ پہلے وہ دونوں بہن بھائی پورے علاقے پر حکمرانی کرتے تھے۔ تم نے ایک کو مار کر آدھا ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ اب زخمی شیرنی بن گئی ہے۔"

"زخمی شیرنی مطلب......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"پہلے جہاں اس کے بھائی کا فائدہ ہوتا تھا وہاں رخ نہیں کرتی تھی، اب وہ پورے علاقے کی مالک بننے کی کوشش میں ہے۔ اس کے پیچھے بہت سارے لوگ ہیں۔ اس نے علاقے میں ظلم کی انتہا کر دی ہے۔ اس نے تمہاری مدد کی وجہ سے ز تو بھوہڑ کو بھی قتل کروا دیا ہے۔"

"اوہ، یہ تو بڑا ظلم کیا ہے اس نے۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، دکھ کی ایک لہر میرے اندر سرایت کر گئی تھی۔ تبھی اچانک مجھے خیال آیا تو میں نے تیزی سے پوچھا۔ "وہ یار سانول کو تو......"

"مجھے اس کے بارے میں نہیں پتہ، اب آگے تو بستی بہادر خان جا کر پتہ کرتے ہیں۔" وہ دھیمی سی آواز میں بولا۔

"تم فکر نہ کرو بختاور، پیروزاں کے پیچھے کوئی بھی ہو، اب وہ مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جانے

والی، اسے ختم کرنا میری زندگی کا مقصد ہے۔"

"ہاں، اب یہ کھیل ختم ہونا چاہئے۔" اس نے نفرت سے یوں کہا جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔ تبھی میں نے پوچھا

"چاچا سائیں اب تک نہیں ملے؟"

"وہ رات دوسری بستی میں گئے تھے، وہاں ایک پنچائت تھی۔ کچھ دیر میں آ جاتے ہیں، انہیں اطلاع مل گئی ہے۔" اس نے کہا۔

دوپہر ہو گئی تھی جب چاچا سائیں واپس آیا۔ وہ ہمیں یوں اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ میں نے ان سے ساتھ بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔

"لے چاچا تیرے ساتھ جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا، تیرا بیٹا لے آیا ہوں۔ بلکہ یہ مجھے یہاں لے آیا ہے۔"

"بڑی خوشی ہوئی یار، تم دونوں آ گئے ہو۔" انہوں نے سامنے چارپائی پر بیٹھے ہوئے کہا تو سانول کے بارے میں پوچھا۔

"وہ ہے، اسے کچھ نہیں ہوا لیکن اس علاقے میں نہیں ہے۔ تمہارے جاتے ہی وہ یہاں سے نکل کر رحیم یار خان کے علاقے میں چلا گیا تھا۔ مجھے پتہ ہے، میں اسے اطلاع بھجوا تا ہوں۔" اس نے خوشگوار انداز میں کہا۔

"اب بتا، یہ پیروزاں کر کیا رہی ہے؟" بختاور نے پوچھا۔

"کرنا کیا ہے۔ وہ چند دن ادھر رہتی ہے، پھر بہاول پور چلی جاتی ہے۔ وہاں میرن شاہ کے بچے ہیں۔ اماں سیدن بھی ادھر چلی گئی ہے۔ وہ مستقل ادھر رہتی ہے۔ منشی مہر خان کو ادھر دیکھ بھال کے لئے چھوڑا ہوا ہے۔ جب پیروزاں یہاں آتی ہے تو کوئی نہ کوئی قتل ضرور ہوتا

ہے۔اس نے اپنے ساتھ بڑے بدمعاش اور غنڈے رکھ چھوڑے ہیں۔" چاچا سائیں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔اس کے لہجے میں بے انتہا بے بسی تھی۔

"کچھ نہیں ہوتا، میں دیکھ لوں گا سب۔ان دنوں وہ آئی ہوئی ہے یا وہیں بہاول پور میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کل تک تو نہیں تھی۔اب دیکھیں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اب اگر وہ آگئی تو......" یہ کہتے ہوئے میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔بختاور نے میرے چہرے کی طرف دیکھا تو میں نے اس سے کہا،"چل یار،کوئی تھوڑی بہت ہلچل کرتے ہیں۔پتہ تو کریں کہ وہ یہاں ہے بھی یا نہیں؟"

"چل پھر۔" اس نے کہا تو ہم اٹھ گئے۔

سہ پہر ہو رہی تھی جب ہم بستی چراغ شاہ جا پہنچے۔وہ ببول کا درخت تنہا کھڑا تھا،جس کے نیچے سانول اپنے ریوڑ کے ساتھ ہوتا تھا۔مجھے یوں لگا جیسے وہ درخت بھی اداس ہو گیا ہو۔سامنے ہی پھاٹک تھا۔بختاور نے پھاٹک کے سامنے جا کر بائیک روک دی۔میں نے اتر کر اپنا پسٹل نکال کر ہاتھ میں لیا اور پھاٹک کھول دیا۔سامنے چارپائیوں پر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ان کے درمیان منشی مہر خان بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ایک طرف چند گاڑیاں کھڑی تھیں۔مجھے یوں پھاٹک کے درمیان کھڑا دیکھ کر منشی مہر خان جہاں تھا وہیں ساکت ہو گیا۔وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے میری طرف دیکھا۔ہر بندے کی نگاہ پہلے میرے چہرے پر پڑتی پھر میرے ہاتھ میں پکڑے پسٹل پر آ کر رک جاتی۔بختاور بھی بائیک سے اتر آیا تھا۔وہ میرے کور پر تھا۔میں آگے بڑھتا ہوا ان کے پاس جا پہنچا۔کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اٹھ کر میرا سامنا کرتا۔بختاور تھوڑا پیچھے رک گیا۔

''آ.....آؤ.....علی زین.....بیٹھو۔'' منشی مہر خان نے اُٹھتے ہوئے کہا تو وہاں پر بیٹھے ہوئے کئی لوگ چونک گئے۔شاید ان میں سے کچھ لوگوں نے مجھے پہلی بار دیکھا تھا۔فوراً ہی ایک چارپائی خالی کر دی گئی۔

''میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا منشی، بلاؤ اپنی مالکن پیروزاں کو، اسے بتاؤ کہ میں ملنے آیا ہوں۔''

''وہ تو یہاں نہیں ہے، بہاول پور ہیں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''چلو پھر، اسے فون کر کے بتاؤ، میں آگیا ہوں اور اس سے ملنا چاہ رہا ہوں۔'' میں نے سکون سے کہا۔

شعوری اور لاشعوری طور پر میری ہر بندے پر نگاہ تھی اور میں حد درجہ محتاط تھا۔وہ جو وہاں نئے چہرے تھے، وہ وہی تھے جن کے بارے میں چاچا سائیں نے کہا تھا کہ انہوں نے اپنے ساتھ بدمعاش اور غنڈے رکھ چھوڑے ہیں۔

''میں ابھی فون کر دیتا ہوں۔'' منشی نے جیب سے فون نکالتے ہوئے کہا۔

''ہاں کرو۔'' میں نے کہا تو وہ نمبر پش کرنے لگا۔اسی دوران تھوڑا پیچھے ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ نیفے کی جانب بڑھایا، پھر انتہائی سرعت سے دیسی ساخت کا پسٹل نکالا ہی تھا کہ میں نے اسے پسٹل سیدھا کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔میں نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے، ایک اس کے ہاتھ پر لگا، دوسرا اس کے کاندھے پر۔اس کا پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں دور جا پڑا۔

ایک دم سے سارا سکون غارت ہو گیا تھا۔بختاور نے پسٹل تان لیا تھا۔منشی کے حواس اُڑ گئے تھے۔اس کا نمبر مل گیا تھا۔وہ بدحواسی میں بولا۔

”بی بی سکین، وہ۔۔۔۔۔۔علی زین آ گیا ہے۔۔۔۔۔۔جی جی وہ سکیں ڈیرے پہ ہے۔۔۔۔۔۔میرے سامنے کھڑا ہے۔۔۔۔۔۔آپ کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔۔۔۔۔۔جی ٹھیک۔۔۔۔۔۔کہہ دیتا ہوں۔۔۔۔۔۔جی جی۔ٹھیک۔۔۔۔۔۔“یہ کہتے ہی اس نے فون ایک طرف رکھ دیا پھر بولا،”سائیں، وہ بی بی سکین کہہ رہی ہیں کہ میں نے خود اس سے ملنا ہے۔میں آ رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور تڑپتے ہوئے اس نوجوان کو دیکھا جو فائر کھا کر زمین پہ لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔میں نے سب کی طرف دیکھا اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا،”میری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔لیکن جو میری راہ میں آئے گا، میں معاف نہیں کرتا۔اگر کسی نے میرے راستے میں آنا ہے تو بہت سوچ سمجھ کر آئے۔“

میرے یوں کہنے پر کوئی بھی نہیں بولا۔وہ سب وہیں ساکت بیٹھے رہے۔بس اسی نوجوان کی چیخیں بلند ہوتی رہیں، کسی نے اٹھ کر اسے دیکھا بھی نہیں۔میں نے منشی مہر خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ان میں سے کس گاڑی کی چابی تمہارے پاس ہے؟“

”میں دیتا ہوں۔“اس نے جیب سے چابی نکالی اور میری جانب اچھالتے ہوئے کہا،”یہ لال جیپ۔۔۔۔۔۔“

میں نے چابی پکڑی، الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور جیپ تک جا پہنچا۔ بختاور کسی منجھے ہوئے شوٹر کی طرح میرے کور پر تھا۔میں نے جیپ نکالی تو وہ پھاٹک تک جا پہنچا۔میں پھاٹک سے نکلا تو وہ سوار ہو کر میرے آگے چل پڑا تھا۔میں وہاں سے نکل کر بستی کا مسن کی جانب چل دیا۔ میں نے جو پیغام دینا تھا وہ دے دیا تھا۔

☆......☆......☆

رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ میں اور بختاور بستی کا مسن کے باہر کوپے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہی چاچا سائیں اٹھ کر گیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ سانول کو پیغام بھیج دیا ہے۔ وہ ایک دو دن میں آ جائے گا۔ میں نے اسے احتیاط سے جانے کو کہا تھا۔ کوپے میں بستی کے بھی چند لوگ بیٹھے تھے، وہ بھی اٹھ کر جا چکے تھے۔ ایسے میں بختاور کا کزن محمد بخش آ گیا۔ وہ شہر سے نئے سم کارڈ لے کر آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر میرا کسی سے رابطہ ہی نہیں تھا۔ بختاور نے اپنے اور میرے فون کے سم کارڈ بدل دیئے۔ اب میں رابطہ کر سکتا تھا۔ بختاور اسے گھر تک چھوڑنے گیا تو میں نے چاچا عبدالمجید سے رابطہ کر لیا۔ میری آواز سنتے ہی وہ خوشگوار لہجے میں بولے۔

"یار، وہاں کیا کر رہے ہو اب، آ جاؤ یہاں پر کوئی تمہارا شدت سے انتظار کر رہا ہے۔"

"نہیں، یہاں ابھی بہت سارا حساب باقی ہے؟" میں نے کہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں نفرت در آئی تھی۔

"تم چھوڑو، یہ سب۔ بعد میں دیکھ لیں گے۔ بابا خیر دین اور ساوری تجھے بہت یاد کرتے ہیں۔ بڑی دعائیں کرتے ہیں تمہارے لئے۔" انہوں نے شفقت بھرے انداز میں کہا تو میں نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ کو پتہ ہے، میں بچپن سے کیا سوچ رہا ہوں۔"

"یار، اور بہت سارے طریقے ہیں نا، ہم وہ......" انہوں نے کہنا چاہا تو میں نے پہلی بار ان کی بات نہ مانتے ہوئے ضدی لہجے میں کہا۔

"میں نے صرف ایک ہی طریقہ سوچا ہوا ہے۔ میں وہی کروں گا تو مجھے سکون نصیب ہوگا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" انہوں نے فوراً ہی میری بات مان لی۔ پھر لمحہ بھر رک کر بولے۔"

کہو تو آفتاب کو بھیج دوں۔ وہ لوگ پہلے بھی تمہارے کام آئے تھے۔“

”جی بالکل بھیج دیں۔ اس بار میں نے بہت زیادہ صفائی کرنی ہے۔“ میں نے کہا تو وہ مجھے سمجھانے لگے۔ ان کے پاس کافی ساری اطلاعات تھیں۔ مجھے ایک طرح سے راہ مل گئی کہ مجھے کیا کرنا تھا۔ کچھ دیر باتوں کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

میں کوپے میں اکیلا تھا۔ ڈیرے سے چھین کر لائی ہوئی جیپ باہر کھڑی تھی۔ میں نے بات کر کے فون جیب میں رکھا ہی تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے سناٹے کو چیرتی ہوئی گاڑیوں کی آواز کہیں قریب ہی سے آئی ہے۔ میں ایک دم سے چوکنا ہو گیا۔ میں نے پسٹل کو پکڑا اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد کوپے کے سامنے چند پولیس کی گاڑیاں آرکیں۔ میں سمجھ گیا کہ ڈیرے پر جا کر جیپ چھین کر لانے اور دھمکی دینے کا یہ ردعمل ہے۔ میں نے پسٹل کو چھپایا اور دیکھنے لگا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔

گاڑیاں رکنے کے بعد فوراً ہی کوئی اندر نہیں آیا۔ بلکہ کوپے کے صحن سے باہر ہی کھڑے رہے۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ ایک آفیسر گاڑی سے اترا۔ اس کے ساتھ دو لوگ آگے بڑھے۔ باقی گارڈ پیچھے ہی کھڑے رہے۔ وہ کسی دوسری جانب دیکھ رہے تھے۔ شاید سامنے سے کوئی آرہا تھا۔ اس کے انتظار میں تھے۔ تبھی سامنے چاچا سائیں آگیا۔ آفیسر نے اس سے ہاتھ ملایا اور اندر کی جانب آگئے۔ آفیسر نے دور ہی سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس سے مصافحہ کیا تو وہ ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پھر میری جانب دیکھ کر بولا۔

”تم ہی علی زین ہو نا؟“

”ہاں، میں ہی ہوں۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”دیکھو، تم پر میرن شاہ کے قتل کا الزام ہے۔ اس وقت ہم تمہیں گرفتار کرنے نہیں آئے

لیکن میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”بولو۔“ میں نے کہا۔

”دیکھو، میرن شاہ کے قتل کو لے کر مجھ پر بہت دباؤ ہے۔ مجھ سے پہلا آفیسر ٹرانسفر ہو چکا ہے۔ آج شام سے جو بھی فون آیا ہے وہ اس معاملے کو لے کر تھا۔ اب صرف دو صورتیں ہیں۔“ اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بولو کون سی صورتیں؟“ میں نے پوچھا

”تم گرفتاری دے دو، میں جانتا ہوں، تم زیادہ دیر اندر نہیں رہ سکتے لیکن جو مجھ پر دباؤ ہے وہ ختم ہو جائے گا۔“

”اور دوسری صورت......؟“ میں نے پوچھا۔

”تم یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں بھی چلے جاؤ۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”دیکھو آفیسر، میں یہاں کسی سے بھی لڑنے نہیں آیا، نہ ہی مجھے صفائیاں دینے کی ضرورت ہے۔ تم نے چند دن پہلے ہونے والے قتل کی ایف آئی آر تک نہیں لکھی، وہ کس کا دباؤ تھا؟“ میں نے کہا تو وہ بڑے تحمل سے بولا۔

”جب تم اس سسٹم کو سمجھتے ہو تو......“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمہیں کون دباؤ میں لا رہا ہے، وہ سارا دباؤ میں خود لے لوں گا۔ تم درمیان میں سے ہٹ جاؤ۔“

”میری نوکری کا مسئلہ ہے میں......“ اس نے پھر کہنا چاہا تو میں نے کہا۔

”اس علاقے میں کیا نہیں ہو رہا ہے۔ جو طاقت والے ہیں، وہ کسی کو بھی قتل کر دیں، کسی کا

بھی حق مار لیں، کسی کا بھی گھر اجاڑ دیں، وہ مسئلہ نہیں ہے، نوکری کرنی ہے تو ان مظلوموں کی آواز بنو۔ انہیں انصاف دلاؤ، یا پھر جو دوسری صورت میں نے کہی ہے، وہ کرو۔ مجھے نام بتاؤ، میں خود دیکھ لوں گا اسے۔"

"میں چاہتا تھا کہ ہم بات چیت سے اس مسئلے کو حل کر لیں، وہ زیادہ بہتر ہوگا۔ میں صبح تک انتظار کروں گا۔" اس نے حتمی انداز میں کہا۔

"یعنی میں گرفتاری دے دوں یا پھر یہاں سے چلا جاؤں؟" میں نے تصدیق کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہا ہے میں نے۔ یہی مجھے اوپر سے حکم ملا ہے۔" اس نے صاف کہہ دیا تو مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا۔ میں اسے کوئی تلخ بات کہنا چاہ رہا تھا کہ خیال آیا اسے جو بھی کہہ لوں یہ اس وقت ایک روبوٹ کی مانند ہے۔ اسے کوئی اثر نہیں ہونے والا، سو میں نے حتمی انداز میں کہا۔

"تم اپنا کام کرو، میں اپنا کام کروں گا۔"

"میں نے کہہ دیا، باقی تمہاری مرضی۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"تم ایسا کرو، چھٹیوں پر چلے جاؤ، ورنہ تمہارا کام بہت بڑھ جائے گا۔"

میرے یوں کہنے پر اس نے چونک کر میری جانب دیکھا، پھر اپنی پتلون ٹھیک کرتا ہوا باہر کی جانب چل پڑا۔ چاچا سائیں اس کے ساتھ باہر تک گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی گاڑیوں سمیت واپس جا چکا تھا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ یہ صرف پیروزاں کی طاقت نہیں تھی۔ یہ اس کے ساتھ جڑے لوگوں کی طاقت بول رہی تھی۔ یہ جو سمجھانے کا پرسکون انداز تھا، اس کے پیچھے طوفان تھا۔ میں چاہتا تھا

کہ یہ طوفان اٹھے۔ جیسے ہی گاڑیوں کا سناٹا ختم ہوا۔ بختاور تیزی سے کوپے کے صحن پر نمودار ہوا اور پھر میری جانب بڑھتے ہوئے غصے میں بولا۔

”دیکھا، پیروزاں نے خود سامنا کرنے کی بجائے قانون کا سہارا لیا، یہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہے۔ ہماری ایف آئی آر نہیں کٹتی اور یہ......“

وہ کہنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے اشارے سے روک دیا۔ وہ میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا تو میں نے سکون سے کہا۔

”وہ جو مرضی کرتی رہے، لیکن......ہم نے اپنی مرضی کرنی ہے۔“

”کیا کہہ رہا تھا وہ......؟“

”چھوڑ اسے، تم کہاں تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں کسی بھی متوقع حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے بندے لگا رہا تھا۔“ اس نے کہا تو میں چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اپنا بچاؤ کرنا لازمی ہے لیکن ہمارا طریقہ کچھ دوسرا ہوگا۔ انہیں یہ سمجھا دو کہ اپنا دفاع کر لیں، باقی اب ہم نے یہاں نہیں رہنا۔ جہاں ہم ہوں گے وہیں خطرہ زیادہ ہوگا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ روہی بہت بڑی ہے۔ ہم سما جائیں گے اس میں۔“ اس نے میری بات سمجھتے ہوئے کہا۔

”چل پھر نکل، جیپ نہیں اونٹ نکال، ہمیں بستی سے باہر رہ کر پہرا دینا ہوگا، اگر وہ ذرا سی بھی سمجھ رکھتے ہیں تو آج رات حملہ ضرور کریں گے، اگر وہ آج رات حملہ نہ کر سکے تو سمجھو وہ ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ میں نے کہا تو اس نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تم کس بنا پر کہہ سکتے ہو؟“

”اس لئے کہ وہ ہمیں مار کر صبح پولیس کے کریڈٹ میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ خبر بھی ہوگی کہ رات اشتہاریوں سے پولیس مقابلہ ہوا اور......“ میں کہتے ہوئے رک گیا تو اسے میری بات کی سمجھ آگئی۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

”مطلب یہ پیروزاں اس طرح بھی وار کر سکتی ہے۔“

”کوئی بھی سامنے آتا ہے، اس کے پیچھے تو پیروزاں ہی ہوگی نا۔“ میں نے کہا تو میری بات سمجھتے ہوئے سر ہلانے لگا پھر تیزی سے پلٹ گیا۔

بختاور نے بستی کے چند نوجوانوں کو پہرے پر لگایا اور خود دو اونٹ لے کر آگیا۔ ہمارے پاس پسٹل کے علاوہ کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ پیروزاں سمیت اس کے سارے حواری الرٹ تھے۔ پولیس کا میرے پاس آنے کا مطلب ہی یہی تھا کہ مجھے وارننگ دی جائے۔ یہ رات بہت اہم تھی۔ اس رات وہ مجھے ختم کرنے کی بھرپور کوشش کر سکتے تھے۔ ورنہ ان کے خیال میں اگلے دن سے پولیس نے تو میرے پیچھے لگ ہی جانا تھا۔

میں اور بختاور بستی سے ذرا ہٹ کر ایک ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم یہاں تین اطراف سے تو نگاہ رکھ سکتے تھے لیکن بستی کی پچھلی طرف نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہاں نگاہ رکھنے کے لئے دو نوجوان بٹھا دیئے گئے تھے۔ بختاور مجھے جیسلمیر کی باتیں بتاتا رہا۔ اسے علم تھا کہ کلیان جی نام سے وہاں پر کون کام کر رہا تھا۔ دراصل وہاں کی فورسز اتنی ایکٹو نہیں تھیں جتنی یہ کلیان جی کے لوگ مجھے تلاش کرنے میں سرگرمیاں دکھا رہے تھے۔ پوجا بھی انہی کا حصہ تھی۔ وہ صرف اس لئے ان کے ساتھ تھی کہ اس نے مجھے دیکھا ہوا تھا۔ جیسے جیسے وہ مجھے وہاں کی باتیں بتاتا جا رہا تھا میرا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی اڑ کر وہاں چلا جاؤں، جو بھی کلیان جی میرے دشمن ہو رہے تھے انہیں ختم کر دوں۔ مگر اب ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔

اس وقت رات کا دوسرا پہر ختم ہونے کو تھا، جب بستی کے دائیں جانب مجھے کچھ سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے غور کیا تو مجھے لگا جیسے دور سے گاڑیاں آ رہی ہیں۔ ان کی ہیڈ لائیٹس بند تھیں۔ صحرا کے سناٹے میں وہ آوازیں آہستہ آہستہ واضح ہونے لگیں۔ بختاور پوری طرح الرٹ ہو چکا تھا۔ اس نے بستی میں موجود نوجوانوں کو اطلاع کر دی۔ میں جانتا تھا کہ ان میں چند لوگوں کے پاس گنیں ہیں اور شاید ایک آدھ کے پاس پسٹل ہوگا۔ جبکہ آنے والوں کے پاس ممکن ہے کوئی جدید اسلحہ ہے۔ یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنے لوگ ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے اگر وہ زیادہ ہوئے تو ان کے پاس اتنا زیادہ ہی اسلحہ ہوگا۔ ایک بستی پر حملہ کرنے کے لئے وہ تھوڑے سے تو نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے بختاور سے یہی بات کہی تو وہ پریشان ہوتا ہوا بولا۔

”ہاں یہ بات تو ہے۔ پر اب کیا کیا جائے؟“

”مگر میں نے سوچ لیا ہے کہ اب کیا کرنا ہے۔ تمہیں تھوڑی سی ہمت دکھانا ہوگی۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

”اب ہمت وہمت کی بات نہیں ہے، جلدی بول کرنا کیا ہے۔“ اس نے پریشانی میں کہا تو میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”جہاں وہ لوگ اپنی گاڑیاں کھڑی کریں، ہمیں وہاں تک جانا ہے۔ تھوڑا گھوم کر پیچھے سے۔“ میں نے اتنا کہا ہی تھا وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں سمجھ گیا، چل نکل۔“

جس وقت وہ اونٹوں تک پہنچا، اس وقت تک اس نے بستی میں موجود ایک نوجوان کو سمجھا دیا کہ انہوں نے کب کیا کرنا ہے۔ اس نے اپنا سیل فون جیب میں رکھا اور اونٹ پر سوار ہو گیا۔ میں اس سے پہلے ہی اونٹ لے کر چل دیا تھا۔ ہم ان سے کافی فاصلے پر تھے۔ ہمیں بس

ان کا احساس ہی تھا۔ ہم اونٹ بھگاتے ہوئے گاڑیوں کے پیچھے آئے تو وہ کافی سارے لوگ بستی کی جانب چل پڑے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ پچیس سے تیس تک تو ہوں گے۔

ہم نے فوری طور پر ان کی طرف توجہ نہیں دینا تھی۔ ہم نے اونٹ چھوڑے اور انتہائی محتاط انداز میں گاڑیوں کے پاس جانے لگے۔ ہوسکتا تھا کہ گاڑیوں کے پاس کوئی ڈرائیور قسم کے لوگ ہوں۔ میں نے بختاور کو اپنے کور پر بٹھایا اور خود رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں ایک گاڑی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ وہ تقریباً سات سے آٹھ گاڑیاں تھیں۔ میں ان کے درمیان چلا گیا۔ گرم گاڑیوں کی تپش مجھے اذیت دے رہی تھی۔ میں چند لمحے ریت پر پڑا کسی بندے کے ہونے کا احساس کرنے لگا۔

اچانک ایک گاڑی کے کھٹکے کی آواز آئی اور ایک شخص اتر کر ذرا فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔ اس نے سگریٹ جلایا تو میں نے دیا سلائی کے کوندے میں ایک مزید شخص کو دیکھا۔ اس نے بھی سگریٹ جلائی اور باتیں کرنے لگے۔ اگلے دو منٹ تک مجھے احساس ہو گیا کہ وہ دو ہی ہیں وہاں پر۔ باقی سب جا چکے تھے۔ میرے پاس ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں اٹھا اور رینگتا ہوا ان کے بالکل قریب جا پہنچا۔ میں ان کی باتیں سن سکتا تھا۔ وہ بستی پر حملے ہی کے حوالے سے باتیں کر رہے تھے۔

میرے ذہن میں تھا کہ گاڑیوں میں اسلحہ ہو سکتا ہے لیکن یہ وقت نہیں تھا کہ میں تلاشی لیتا۔ اتنی دیر میں وہ بستی پر حملہ کر سکتے تھے۔ میں نے چند لمحے سوچا، ان میں سے ایک کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا، جیسے ہی اس کی چیخ بلند ہوئی، اسی لمحے میں نے دوسرے پر بھی فائر کر دیا۔ وہ بھی چیخ مارتا ہوا گر گیا تھا۔ وہ دونوں ریت پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ اب میرے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔ اتنی دیر میں بختاور نے گاڑیوں کی ٹینکیوں پر فائر کرنے شروع کر دیئے۔ پیٹرول کی

بوچھل رہی تھی۔ بختاور نے پورا میگزین ہی ان گاڑیوں پر جھونک دیا تھا۔ جب تک میں نے ایک شخص کی جیب سے ماچس تلاش کی اس وقت تک بختاور نے ایک گاڑی کا بونٹ اٹھایا، اس کی بیٹری کا تار اکھاڑ لیا تھا۔ اسے شاید علم نہیں تھا کہ میں ماچس حاصل کر چکا ہوں۔ اس کے ذہن میں یہی تھا کہ بیٹری سے شرارے پیدا کرتے ہیں۔

"بختاور ٹھہرو، ماچس ہے۔"

اس نے یہ نہیں پوچھا کہ کہاں سے، تب تک وہ بیٹری کی تار جوڑ چکا تھا، ایک دم سے شرارے ابھرے، میں نے دیا سلائی جلا کر پھینک دی۔ گاڑیوں میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ہم پوری قوت سے بھاگنے لگے۔ ہم ممکن حد تک ان گاڑیوں سے دور ہو جانا چاہتے تھے۔

ہم اونٹوں تک جا پہنچے تھے۔ ہماری کوشش تھی کہ اندھیرے میں ہو کر بستی کی جانب چل پڑیں۔ اسی لمحے بستی کی طرف سے فائر ہونے لگے۔ پھر اچانک ہی دونوں طرف سے فائر ہونے لگے۔ جلتی ہوئی گاڑیاں میلوں دور سے دیکھی جا سکتی تھیں۔ حملہ آوروں کا مورال گرانے کے لئے یہی ایک منظر کافی تھا۔ ہماری پوری کوشش یہی تھی کہ ان کے عقب سے فائر ہو جائیں تاکہ وہ یہی سمجھیں کہ پیچھے سے لوگ پہنچ گئے ہیں۔ ہمارا اور ان کا فاصلہ تھوڑا زیادہ تھا۔ ہم اونٹ بھگائے جا رہے تھے۔ وہ لوگ ابھی تک بستی سے باہر تھے۔ اس کا اندازہ اسلحہ سے نکلنے والے فائر سے ہو رہا تھا۔ کسی بھی گن سے نکلنے والا شعلہ، فائر کرنے والے کی جگہ کا تعین کر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ لوگ میری رینج میں آئے، میں نے اونٹ کھڑا کر دیا۔ میرے لئے اب اوٹ میرا اونٹ ہی تھا۔ میں نے تاک کر نشانہ لیا، اور پھر فائر کرتا چلا گیا۔ کئی چیخیں بلند ہوتی گئیں۔ بختاور نے نیا میگزین چڑھا لیا تھا اور وہ بھی وقفے وقفے سے فائر کر رہا تھا۔

صحرا فائرنگ کی آوازوں سے گونج اٹھا تھا۔ کچھ فاصلے پر جلتی ہوئی گاڑیاں عجیب خوف

ناک سماں پیدا کر رہی تھیں۔ بستی میں جتنے بھی فائر کرنے والے تھے وہ سب اوٹ میں تھے جبکہ حملہ آور بالکل کھلے صحرا میں تھے۔ انھیں صرف اندھیرے کا فائدہ تھا۔ میرے پاس دو ہی میگزین تھے، دوسرے میگزین میں چند گولیاں رہ گئیں تھیں۔ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا، کوئی گاڑی پھٹ گئی تھی۔ سناٹے میں یہ دھماکہ دل دہلا دینے والا تھا۔ بلاشبہ اس کی آواز بہت دور دور تک گئی ہوگی۔ حملہ آوروں کی گاڑیاں تباہ ہو چکی تھیں، انھیں سامنے سے بھی مزاحمت تھی۔ ہماری طرف سے بھی ہونے والے فائر انھیں خوف زدہ کر رہے تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ان میں کوئی زخمی نہ ہوا ہو۔ یہ سارا ماحول انھیں بھاگنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ ہماری مجبوری یہ تھی کہ اندھیرے میں ہم دیکھ نہیں سکتے تھے۔

انہی لمحات میں ایک شخص دوڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ میں چاہتا تو اسے نشانہ بنا سکتا تھا۔ وہ وہیں گر سکتا تھا، اسے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اونٹ کا اس وقت پتہ چلا جب وہ بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ میں اوٹ میں تھا، اس لئے وہ مجھے نہیں دیکھ پایا تھا، وہ میری بالکل قریب پہنچ گیا، میں اٹھا اور پوری قوت سے اس کے سینے پر گھونسہ مارا وہ دہرا ہوتا ہوا گر گیا۔ میں نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔ میں نے اندازے سے اس کے سر پر ٹھوکر ماری تھی جو اس کے منہ پر لگی۔ میں ڈگمگا گیا۔ اس نے مجھے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھائے تو ہم گتھم گتھا ہو گئے۔ وہ مجھ پر حاوی ہونے کی پوری کوشش میں تھا کہ بختاور نمودار ہوا، اس نے پوری قوت سے پسٹل کا دستہ اس کے سر پر مارا، وہ ایک دم سے بے دم ہو گیا۔ وہ چکرایا اور ریت پر گر گیا۔ بختاور نے پسٹل سیدھا کیا تاکہ اس پر فائر کر سکے، میں نے فوراً روک دیا۔

”نہ...... نہ بختاور نہ...... اسے مارنا مت......“

”کیوں......؟“ اس نے غصے میں کہا۔

"یہ ثبوت ہے ہمارے پاس، کجاوے میں دیکھو کوئی رسی ہے۔" میں نے کہا تو وہ میری بات سمجھ گیا۔ وہ کجاوے میں سے رسی تلاش کر کے لے آیا، میں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اسے وہیں ریت پہ پڑا رہنے دیا۔

مجھے اندازہ تھا کہ کوئی مزید بھی ادھر آئے گا۔ ہم محتاط ہو کر بیٹھ گئے۔ کافی وقت گزر جانے کے باوجود کوئی نہیں آیا۔ سامنے فائرنگ رک چکی تھی۔ کسی طرف سے بھی کوئی فائر نہیں ہو رہا تھا۔ یہ زیادہ خطرناک صورت حال بن چکی تھی۔ کون، کب، کس طرف سے سامنے آ جائے، یہ بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔ ہم انتہائی چوکنا ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔ تبھی میں نے بختاور سے کہا۔

"بستی میں فون کر کے پوچھو، کیا صورت حال ہے؟"

میرے کہنے پر اس نے جیب سے فون نکالا اور نمبر ملانے لگا۔ اس نے اسپیکر آن کر دیا تھا۔ دوسری طرف سے کسی نوجوان نے فون ریسیو کرتے ہی ہیلو کہا تو بختاور نے پوچھا۔

"کیا صورت حال ہے؟"

"سامنے سے کوئی فائر نہیں کر رہا، بستی میں کسی کو داخل نہیں ہونے دیا۔" اس نے تیزی سے بتایا۔

"کوئی نقصان......" اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں نہیں......کوئی نہیں، سب ٹھیک ہیں۔" اس نے عزم بھرے لہجے میں کہا پھر لمحہ بھر بعد بولا، "یہ سامنے آگ کیسی تھی؟"

"تفصیل سے آ کر بتاتا ہوں۔ بس تم ہوشیار رہنا، وہ لوگ بھاگ گئے ہیں، ہو سکتا ہے دوبارہ اکٹھے ہو کر حملہ کریں۔"

"ہماری فکر مت کرو۔ بستی کا ہر بندہ جاگ رہا ہے۔ وہ بستی میں نہیں آ سکتے اب۔ جس کی

موت آئی ہو گی وہی آگے آئے گا۔" اس نے جرات سے کہا تو بختاور نے فون بند کر دیا۔ مجھے
ان کا حوصلہ اچھا لگا تھا۔

"خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں، یہی خاموشی خطرناک ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے ارد گرد نگاہ ڈالی۔ مجھے
اندھیرے میں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ تبھی میں نے اس سے کہا، "میرا خیال ہے اب چلیں،
یہاں ٹھہرنا اب ٹھیک نہیں۔"

"اس کا کیا کرنا ہے؟" اس نے اپنے سامنے پڑے بے ہوش شخص کی طرف اشارہ کر کے
کہا تو میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اسے ہوش میں لا اور باندھ اسے اونٹ کے ساتھ۔"

وہ اسے ہوش میں لانے لگا اور میں نے اپنے اونٹ کے کجاوے سے رسی تلاش کر لی۔ کچھ
دیر بعد وہ ہوش میں آ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگنے لگا تو میں نے اس کی گردن پکڑ لی، پھر سرد
سے لہجے میں کہا۔

"مرنا ہے یا ہمارے ساتھ چلنا ہے؟"

"کک...... کہاں لے جاؤ گے؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کہیں تو لے جائیں گے۔" میں نے کہا تو بختاور اس کے ہاتھ باندھ کر اونٹ سے
باندھنے لگا۔

کچھ دیر بعد ہم چل پڑے۔ اس شخص کو ہمارے ساتھ بھاگنا پڑ رہا تھا۔ ہم گھوم کر بستی میں
آ گئے۔ تب تک وہ بے حال ہو چکا تھا۔ ایک طرح سے گھسٹ رہا تھا۔ میں نے اپنے اونٹ کو
بٹھایا اور خود نیچے آ گیا۔ بختاور آگے بڑھ گیا۔ بلا شبہ وہ اپنے نوجوانوں میں جانا چاہتا تھا۔

وہ بندھا ہوا شخص بے حال ہو رہا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ کوپے میں لے آیا۔ وہاں صراحی سے پانی پیالے میں ڈال کر اسے دیا۔ وہ بندھے ہاتھوں سے پینے لگا۔ وہ پانی پی چکا تو میں نے اس سے کہا۔

"کون ہو تم اور کس نے بھیجا ہے تمہیں؟"

"مجھے معاف کر دو، میں تو جی جندوڈے کا نوکر ہوں۔ اس نے مجھے بھیجا تھا ان لوگوں کے ساتھ، میں تو ہتھیار چلانا بھی نہیں جانتا۔" اس نے انتہائی بے چارگی سے کہا۔

"جندوڈا...... یہ کون ہے؟" میں نے بڑے سکون سے پوچھا۔

"کیا تم نہیں جانتے ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں، میں تو نہیں جانتا۔" میں نے کہا تو یوں ہو گیا جیسے اس کی جان ہی نکل گئی ہو۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے بتائے گا اور میں جندوڈا کی دہشت میں آجاؤں گا۔ مگر میں واقعی ہی اسے نہیں جانتا تھا۔

"کتنے لوگ آئے تھے یہاں پر؟" میں نے پوچھا۔

"بیس پچیس تو تھے۔" اس نے بتایا۔

"اتنے تھوڑے تو نہ بتا یار، کم از کم چالیس لوگ تھے۔" میں نے جان بوجھ کر کہا تو وہ یوں سر ہلانے لگا جیسے بات اس کی سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔ اتنے میں چاچا سائیں وہیں آ گیا۔ اس نے اس بندے کو غور سے دیکھا، پھر وہی سوال کر دیا جو میں نے کیا تھا۔ اس نے بھی وہی جواب دیا تو وہ چونک کر یوں بولا جیسے تھے ہی سے اکھڑ گیا ہو۔

"جندوڈا اتنا بڑا اختندہ ہو گیا ہے کہ وہ ہماری بستی پر دھاوا بولے، وہ خود آیا ہے ادھر......"

"نہیں، وہ نہیں آیا، وہ ابھی ڈیرے پر تھا۔" اس نے کہا۔

''کون ہے یہ چندوڈا......؟'' میں نے پوچھا۔

''ہے تو یہ چھوٹا سا زمیندار، تھوڑی سی زمین ہے، لیکن مویشی کافی ہیں اس کے۔ بدمعاش قسم کا بندہ ہے۔ یہ اسمگلنگ کے کیس میں دو برس پہلے اندر ہو گیا تھا۔ مل ملا کر کیس ختم کروالیا ہے تو اب یہاں آ کر بدمعاشی کر رہا ہے۔''

''وہ ایویں تو نہیں بدمعاشی کر رہا، اس کے پیچھے کوئی تو ہوگا۔'' میں نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا۔

''پیروڈاں کے سوا کون ہو سکتا ہے۔'' اس کے والد نے کہا۔

''چل دیکھ لیتے ہیں، یہ اگر سچ نہیں بتائے گا تو صبح اسے مار کر چندوڈا کے پاس بھیج دیں گے اس کی لاش۔'' میں نے اسے دھمکاتے ہوئے کہا۔ اس کی شکل دیکھ کر بھی لگ رہا تھا کہ جیسے وہ خوف زدہ ہو لیکن مجھے نجانے کیوں وہ کوئی گہری شے لگ رہا تھا۔

ساری رات یونہی گزر گئی۔ پوری بستی جاگتی رہی۔ عورتیں کیا تو جوان لڑکے لڑکیاں تک۔ ظاہر ہے جب کوئی افتاد پڑ جائے تو کون سو سکتا ہے۔ اردگرد کی بستیوں میں بھی پتہ چل گیا تھا۔ بستی بہادر خان سے بھی بہت سارے لوگ آ گئے تھے۔ اب مجھے فکر نہیں تھی۔ اتنے لوگ ہو گئے تھے کہ وہ حملہ آوروں کو سنبھال سکتے تھے۔

☆......☆......☆

دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ بستی کے باہر سے تین لاشیں ملی تھیں۔ ان میں ایک پہچان لیا گیا تھا، باقی دو کو نہیں پہچانا جا سکا تھا۔ ممکن ہے کوئی زخمی بھی ہوئے ہوں، وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں رات ہی بستی بہادر خان آ چکا تھا۔ بختاور نے پولیس کو بلوا لیا تھا۔ انہیں یہی بتانا تھا کہ میں رات ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔

میں ساری رات جاگتا رہا تھا۔ تھوڑی دیر نیند لینے کی وجہ سے کافی حد تک تازہ دم ہو گیا تھا۔ میں کوٹھڑی میں بیٹھا ہوا ابھی حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ساتول آ گیا۔ وہ بڑے والہانہ انداز میں مجھے ملا۔ وہ کافی دیر تک مجھے حال احوال بتاتا رہا۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ جب وہ کہہ چکا تو میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"دیکھ ساتول، تجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ہتھیاروں والی یہ جنگ نہیں لڑ سکتے ہو لیکن تم کچھ دوسرا تو کر ہی سکتے ہو۔"

"بولو، جو کہو، وہ میں کرنے کو تیار ہوں۔"

"دشمن کے بارے میں جتنی معلومات تمہارے پاس ہوں گی، جنگ جیتنے کے چانس اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ بھروسے والے لوگوں کو ساتھ ملاؤ اور دشمنوں کے بارے میں جو بھی معلوم ہوتا ہے وہ بتاؤ، یہ کام کوئی دوسرا کر بھی لے گا تو مجھے اس پر بھروسہ نہیں ہوگا، تمہیں صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے تم پر پورا اعتبار ہے۔"

میرے یوں کہنے پر وہ میرے چہرے پر حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر رونے لگا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ رو کیوں رہا ہے۔ تاہم میں نے اسے رونے دیا۔ آنسو یونہی نہیں بہا کرتے، ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور پھر روہانسا لہجے میں بولا۔

"میری جان بھی قربان ہے تم پر۔ یہ جو بیروزاں ڈانگ اس علاقے پر مسلط ہے، اسے اب نہیں رہنا چاہئے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" میں نے کہا اور پھر اسے سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ وہ میری بات سنتا رہا۔ میں کہہ چکا تو وہ بولا۔

"میں سمجھ گیا، اب تم بے فکر ہو جاؤ۔"

ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ چاچا سائیں آ گیا۔ وہ میرے سامنے والی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تم میرا خیال ہے جندوڈا کے بارے میں نہیں جانتے ہو؟"

"ہاں، جب میں یہاں آیا تھا تو اس کا نام کہیں نہیں سنا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں بتاتا ہوں تمہیں۔" چاچا سائیں نے کہا اور پھر لمحہ بھر رُک کر کہتا چلا گیا، "چند برس پہلے یہ جب نیا نیا جوان ہوا تھا تو اس کی پہلی لڑائی، رَنّو بھوہڑ سے ہوئی تھی۔ نیا خون تھا، اس نے کافی نقصان کیا تھا اس کا۔ دوسری بار جب اس کا سامنا رَنّو بھوہڑ سے ہوا تو اس نے کافی ٹھکائی کی تھی جندوڈا کی۔ وہ رَنّو بھوہڑ کو ہی اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ بھی علاقے میں اپنی دھاک بٹھانے لگا تو پھر طاقتیں اس کی پشت پر آ گئیں۔ ان میں سب سے زیادہ جس نے اسے ہلا شیری دی تھی ان میں یہ پیروزاں ہی تھی۔ اسی نے جندوڈا کو اسمگلنگ کے کام پر لگایا۔ اس کی پشت پناہی ہوئی تو پیسہ بھی آنے لگا۔ اس کے ساتھ لوگ بھی جڑتے گئے اور اس کا حوصلہ بڑھتا گیا۔ اس نے علاقے پر اپنی دھاک بٹھانے کے لئے کئی قتل بھی کیے۔ ہر بار وہ بچتا چلا گیا۔"

"اسے کسی نے نہیں پکڑا؟ کسی نے اسکا سامنا نہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"جو بھی اس کا سامنا کرتا تھا، اس کا نقصان ہو جاتا تھا۔ پیروزاں خود تو سامنے نہیں آتی تھی نہ میرن شاہ۔ وہ ایسے ہی لوگوں سے کام لیتے تھے۔ یہ جو بختاور کا ایک بھائی پیروزاں نے مروایا تھا، اسی جندوڈا نے مارا تھا۔" چاچا سائیں نے دکھی لہجے میں کہا۔

"پھر یہ پکڑا کیسے گیا؟" میں نے پوچھا۔

”اسے میرن شاہ ہی نے پکڑوایا تھا۔جب کوئی سانڈ پاگل ہو جائے تو اس کا علاج بھی کیا جاتا ہے۔اسے تھوڑا عرصہ جیل میں رکھا گیا تا کہ اس کی عقل ٹھکانے آ جائے۔بلکہ میرن شاہ نے کیا، کچھ دوسرے لوگوں کو وہ پسند نہیں تھا۔“ چاچا سائیں نے بتایا۔

”دوسرے کچھ لوگ......؟“میں نے پوچھا۔

”وہ جو پیچھے بیٹھے سارا کھیل، کھیل رہے ہیں۔یہ ان کی بات بھی کم ماننے لگا تھا۔من مانی زیادہ کرتا تھا۔جیل میں رکھ کر اس کا علاج کیا گیا۔“انہوں نے بتایا۔

”اب کیوں لایا گیا ہے؟ اب ٹھیک ہو گیا ہے؟ لگتا تو نہیں؟“ میں نے پوچھا تو انہوں نے بتایا۔

”میرن شاہ کے قتل کے بعد پیروزاں کا ایک ہی دشمن تھا اور وہ تھا زخو بھوہڑ...... پیروزاں کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ اس نے تمہاری مدد کی ہے۔اس کا سامنا یہی جندوڈا کر سکتا تھا۔اس نے ضمانت پر رہا کروا کر یہاں علاقے میں اس کی واپسی ممکن بنا دی۔اس نے آتے ہی پہلا یہ کام کیا کہ زخو بھوہڑ کے پیچھے پڑ گیا اور آخر کار اسے قتل کر دیا۔اب وہی پیروزاں اس سے کام لے رہی ہے تا کہ علاقے میں اپنی ساکھ بنا کر رکھے۔“چاچا سائیں نے بتایا تو مجھے ساری بات سمجھ آ گئی۔

”تو اس کا مطلب یہ ہوا چاچا سائیں کہ پہلے اس جندوڈا سے نمٹا جائے، باقی پھر بعد میں دیکھ لیں گے۔“میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

”اب تم دیکھ لو کرنا کیا ہے پیروزاں تو اس کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔“انہوں نے کہا۔ دوسرے لفظوں میں وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ پہلے جندوڈا کا پتہ صاف کیا جائے۔ورنہ وہ کسی نہ کسی طرح سے پیروزاں کے ساتھ کھڑا رہے گا اور ہمارا نقصان کرتا رہے گا۔رات جو کچھ اس

نے کیا تھا، وہ معافی کے لائق نہیں تھا۔ اسکی تو بہر حال اسے سزا ملنی چاہیے تھی۔

میرے سامنے اب صرف پیروزاں نہیں تھی۔ اس نے اپنے سامنے جندوڈا کی صورت میں ایک دیوار کھڑی کر دی تھی۔ اب یہ دیوار کیسی ثابت ہوتی ہے، یہی مجھے دیکھنا تھا۔ میں پہلے کچھ ہٹ کر سوچا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اس مرکز ہی کو فنا کر دیا جائے۔ جہاں سے ان سب کو قوت ملتی ہے۔ لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ راستہ صاف کرنے سے پہلے راہ کے کتوں سے نپٹنا بہت ضروری تھا۔ میں نے چاچا سائیں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"مجھے پیروزاں کے بارے میں بتا سکتے ہیں، وہ آئی ہے یا نہیں؟"

"ابھی تک تو نہیں آئی۔" انہوں نے بتایا۔

"ٹھیک ہے، اب میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا اور سوچنے لگا۔

☆......☆......☆

میں کمرے میں تنہا تھا۔ مجھے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ پولیس آ کر چلی گئی ہے۔ اس نے لاشیں اپنے قبضے میں کر لی ہیں۔ جندوڈا شہر گیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ بستی کے کافی سارے لوگ تھے۔ میں نے نیٹ سائیٹ پر اپنے محفوظ خانے سے پیروزاں کا سیل فون نمبر لیا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اب بھی اس کا وہی نمبر ہو سکتا ہے۔ لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے کال ملا دی۔ وہ فون رسیو نہیں کر رہی تھی۔ اس کے پاس تو نئے نمبر ہی جا رہے تھے۔ پہلی کوشش ناکام گئی۔ دوسری کوشش کی تو اس نے فون رسیو کر لیا۔ میں اس کے ہیلو کہنے ہی سے اسے پہچان گیا تھا۔ تبھی میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"کیسی ہو پیروزاں جی، میں علی زین بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ، یہ تم ہو۔" اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں ہی ہوں۔ سنا ہے تم کل رات روہی واپس آ رہی تھی اب تک آ ئی نہیں ہو؟"

میں نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

"میں کسی کی پابند تھوڑی ہوں، جب میرا دل کرے گا، میں آ جاؤں گی۔" اس نے کافی حد تک نخوت سے کہا تھا۔

"اگر پابند نہیں ہو تو میں تمہیں پابند کر لیتا ہوں، آنا تو پڑے گا تمہیں۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو بھڑک گئی۔ اس لئے تیز لہجے میں بولی۔

"تم خود کو کیا سمجھتے ہو، میں نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ میں نے خود تمہیں اپنے ہاتھوں سے اسی طرح جلا کر مارنا ہے جس طرح تم نے میرے بھائی کو مارا ہے۔ میں تمہیں چھوڑنے والی نہیں۔"

"تو کیا شہر میں بیٹھی پھونکوں سے مجھے جلا دو گی؟" میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا

"رات تم بچ گئے ہو۔ تمہاری قسمت اچھی تھی۔ پہلے بھی تم یہاں سے بھاگ گئے تو بچ گئے ہو۔ اب میں تمہیں یہاں سے نکلنے نہیں دوں گی۔ تجھے خود جلانا ہے میں نے......" آخری لفظ کہتے ہوئے وہ پھٹ پڑی تھی

"آ جاؤ نا پھر روہی میں۔ یہیں آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو، تمہارے یہ بیچے ہوئے وحشی درندے میرا راستہ روک لیں گے۔ تم نے رات ایویں ہی لوگوں کو مروا دیا۔" میں نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

"میں تمہیں عبرت کا نشان بنا دوں گی سمجھے۔ تم روہی سے نکلنا چاہو بھی تو نہیں نکل سکتے ہو۔" یہ اس نے مجھے دھمکی نہیں دی تھی بلکہ اس نے یہ ترپ کا پتہ پھینکا تھا۔ وہ جان لینا چاہتی تھی کہ میں کہاں ہوں۔ تبھی میں نے بڑے سکون سے کہا۔

”میں تو آج صبح ہی سے بہاول پور میں آیا بیٹھا ہوں۔تم نہ آؤ روہی میں، میں تو تمہیں لینے آسکتا ہوں نا۔کہو وہیں ہو اپنی کوٹھی میں۔“

میرے یوں کہنے پر وہ گڑبڑا گئی تھی۔اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا، پھر شاید سنبھل گئی تھی اس لئے بولی۔

”اتنی اونچی اڑان مت اڑو، پہلے......“

”تمہارے لئے اچھا ہے نا، مجھے وہیں مار دینا۔بولو، کب آؤں؟“میں نے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔

میں پروزاں سے بات کر کے سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ سے خوف زدہ ہے۔وہ فوری طور پر کبھی بھی روہی نہیں آئے گی۔مجھے خود بہاول پور جا کر اسے لانا پڑے گا۔میں سوچنے لگا کون ایسا ہو سکتا ہے جو مجھے اس کے بارے میں خبر دے سکے۔مجھے اس کی نگرانی پر کسی نہ کسی کو لگانا ہو گا۔

مجھے زمان مونل یاد آ رہا تھا۔وہ بہت چلتا پرزہ قسم کا بندہ تھا۔زکو بھوہڑ اور دوسرے لوگوں سے وہی رابطہ کرواتا تھا۔جب میں یہاں سے نکلا تھا، تب وہ زخمی تھا۔اب پتہ نہیں وہ کیسا ہو گا۔میں نے اس کا نمبر تلاش کیا تو مجھے مل گیا۔میں نے کال ملا دی۔کچھ دیر بعد وہ لائن پر تھا۔وہ مجھے پہچان چکا تھا۔

”کب آئے ہو؟“اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تمہیں نہیں معلوم؟“میں نے جان بوجھ کر پوچھا تو اس کی کھسیانی ہنسی کی آواز آئی۔پھر لمحہ بھر بعد بولا۔

”کل جو کچھ ڈیرے پر ہوا، میں سمجھتا ہوں وہ تمہاری غلطی تھی، کیا ضرورت تھی وہاں جانے کی۔وہ سب لوگ الرٹ ہو گئے ہیں۔منشی مہر خان تمہیں مارنے کی پوری تیاریوں میں ہے۔“

”وہ تو رات ایک کوشش کر چکے ہیں۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”وہ بہت کمینہ شخص ہے جندوڈا۔ اسے رات بہت بھاری نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے یوں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے خیال میں تو یہ تھا کہ بس جائے گا اور......“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ، پیروزاں کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”کس بارے میں؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”میں نے اس تک پہنچنا ہے۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”اوہ......مم......میں کیا بتا سکتا ہوں۔“ اس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

”دیکھو زمان، تم جانتے ہو کہ اب کیا ہوگا، میں......“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے تیزی سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”دیکھ، میں تیری یہاں ڈیرے کی حد تک مدد کر سکتا ہوں، جو چاہو گے، جیسا چاہو گے، ویسا ہی کروں گا لیکن اگر تم اس کے بارے میں کہو تو میری وہاں تک رسائی نہیں ہے۔ میں کچھ نہیں کر پاؤں گا۔“ اس نے کہا تو مجھے اس کے لہجے میں خوف پھیلا ہوا محسوس ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بہت محتاط ہے۔ ایسے لوگ سب سے تعلق نبھانے کی کوشش میں ہوتے ہیں لیکن ہمیشہ طاقتور کا ساتھ دیتے ہیں۔ میں نے اس سے مزید بات نہیں کی۔ چند الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

میں یہاں کے سارے ماحول کو سمجھ گیا تھا۔ کچھ بھی تھا، پیروزاں یہاں پر اپنا سکہ جما چکی تھی۔ جندوڈا جیسا شخص وہ اپنے قابو میں کر چکی تھی۔ جس طرح رات اس نے حملہ کیا تھا، اس سے پیروزاں سے وفاداری کا پتہ چلتا تھا۔ ظاہر ہے علاقے میں کئی بستیاں ان کے زیر سایہ ہو

گئی ہوں گی۔ سوائے ان بستیوں کے جن کے ساتھ ان کی دشمنی چل رہی تھی، جیسے بستی کامن اور بستی بہادر خان۔ ان سب سے بات کر کے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

میں نے سوچ لیا تھا۔

سہ پہر کے بعد کہیں جا کر بجتا ور واپس لوٹا۔ وہ سیدھا میرے پاس ہی آ گیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"خیر ہے کیا ہوا؟"

"یار کتنا ظلم کرتے ہیں یہ لوگ، حملہ ہم پر ہوا، لیکن تھانے دار ہم پر ہی پرچہ دینے کی بات کر رہا ہے۔" اس نے جلے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہوا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پولیس آئی تھی نا یہاں پر، ہم بھی ان کے ساتھ ہی چوکی چلے گئے۔ وہاں جاتے ہی ہمیں ایک نئی کہانی کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے بتایا کہ ہماری گائیں چوری ہو گئی تھیں اور ہمیں بستی کامن کے لوگوں پر شبہ تھا۔ ہم وہاں صرف اس لئے گئے تھے کہ ان سے بات چیت کر کے، انہیں سمجھا بجھا کر گائیں واپس لے لی جائیں لیکن آگے سے فائر ہونا شروع ہو گیا۔"

"یہ کہانی کس نے سنائی؟" میں نے پوچھا۔

"چوکی انچارج نے، جسے تھانے دار ہی کہیں گے نا۔" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کوئی مدعی سامنے نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں تھا، لاشیں انہوں نے ہسپتال بھجوا دی تھیں، وہیں سے ان کے وارث لے گئے۔ مجھے اندازہ ہے کہ وہ ہمیں قتل میں ہی نہیں گائے چوری میں بھی پھنسائیں گے۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔ بس شام پڑنے دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆......☆......☆

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ میں نے سرخ جیپ نکال لی تھی۔ میرے ساتھ بختاور بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت جیپ میں کافی سارا اسلحہ موجود تھا۔ سہ پہر کے وقت شعیب کے ساتھ جہانگیر، آفتاب اور مدثر پہنچ چکے تھے۔ اب ہمارے سامنے غنڈوں کی جتنی بڑی تعداد بھی ہوتی، ہم ان کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ اس وقت وہ دو گاڑیوں میں چل دیئے تھے۔ ان کے ساتھ بستی سے نوجوان بھی تھے۔ جبکہ میں اور بختاور ایک ہی گاڑی میں تھے۔ ہمارا رخ پیروزاں کا ڈیرہ تھا۔ جہاں پر منشی مہر خان ہمارے لئے نئی پلاننگ ترتیب دے رہا تھا۔

میں ڈیرے پر بہت دن رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ کس طرف سے کیسے جایا جا سکتا تھا۔ میرا شعیب لوگوں سے مسلسل رابطہ تھا۔ میں انہیں تھوڑا بریف بھی کر چکا تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ آگے جو صورت حال بنتی وہ ہم اسی وقت فیصلہ کر سکتے تھے۔

ہم بالکل عام راستے ہی سے بستی چراغ شاہ پہنچے تھے۔ اگر کوئی گاڑیوں کو دیکھتا تو اسے شک نہیں ہونا تھا۔ اگر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتے تو شک ہو جانا لازمی تھا۔ ہم نے گاڑیاں بستی چراغ شاہ ہی میں روک دیں۔ میں اور بختاور بستی کے درمیان میں سے ہوتے ہوئے ڈیرے کی شمالی طرف جا پہنچے۔ جس کے آگے باڑہ تھا اور پھر ڈیرے کی دیوار تھی۔ باقی لوگ دائیں بائیں چلے گئے تھے۔ جنوبی جانب ان کا گھر تھا۔ رابطہ ہو جانے کی وجہ سے ہمیں پتہ چل گیا کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پہنچ چکے ہیں۔ میں باڑے کے درمیان سے گزر کر جا سکتا

تھا۔ وہاں کے کتے مجھ سے مانوسیت رکھتے تھے۔ مجھے بختاور کے لئے ڈر تھا کہ اسے کتے نہ پڑ جائیں، دوسرا وہاں کوئی بندہ موجود نہ ہو، ورنہ خواہ مخواہ اُلجھنا پڑتا۔ ہمیں کتے تو نہیں پڑے لیکن ایک بوڑھا چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی خبردار ہو گیا۔ وہ لاٹھی اٹھا کر کھڑا ہوا تو میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچا، وہ مجھے پہچان گیا۔ وہ بجائے سہم جانے کے اونچی آواز میں کسی کو پکارنے لگا۔ ابھی اس نے منہ کھولا ہی تھا، اس کی آواز ذرا سی نکلی تھی کہ بختاور نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھا اور اسے گھماتا ہوا چارپائی پر جا گرا۔ بوڑھا زور آزمائی کرنے کی کوشش کرنے لگا، جبکہ ہمارے پاس ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ بختاور کو غصہ آیا، اس نے زوردار گھونسہ اس کے سر پر مارا، بوڑھا چکرایا اور چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔

میں نے اس جگہ کو دیکھا، جہاں سے میں نے چڑھنا تھا۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں سے کچا کمرہ شروع ہوتا تھا۔ میرا پلان یہ تھا کہ دیوار پر چڑھ کر اوپر چھت پر چلا جاؤں۔ میں نے ایک جست لگائی اور دیوار پر چڑھ گیا۔ اسی لیے بختاور بھی دیوار پر تھا۔ تاکہ اگر کسی کو پتہ چل جائے تو وہ مجھے کور دے سکے۔ میں چھت پر کود گیا تھا۔ یہاں اندھیرا تھا اور وہ سب بیٹری کی روشنی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سب کو پتہ چل گیا کہ میں چھت پر ہوں۔ بختاور کمرے کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہاں اندھیرا تھا، پہلی نگاہ میں پتہ نہیں لگتا تھا۔ میں چھت پر چلتا ہوا بالکل اس جگہ پر پہنچ گیا، جس کے نیچے مہر خان بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اس کے سامنے کوئی بیس کے قریب لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب اس کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”جس طرح اس نے میرن شاہ سائیں کو قتل کر دیا، اسی طرح وہ پیروزاں سگھن کو بھی قتل کر دینا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر تم لوگ کیا کرو گے، وہ تم لوگوں کو بھی یہاں سے بھگا دے گا۔ ہو سکتا تم میں سے کئی لوگوں کو قتل بھی کر دے۔ تم لوگوں کی لڑکیاں چھین لے۔ یہ تو بی بی

سکھن ہے جو تم لوگوں کو اپنے گلے سے لگا کر بیٹھی ہوئی ہے۔اب ہم نے یہ انتظار نہیں کرنا کہ وہ ہم پر حملہ کرنے آ جائے بلکہ ہم نے خود اپنی لڑائی لڑنی ہے۔''

''پر منشی جی، وہ چند وڈا ابھی تو گیا تھا اس سے لڑنے کے لئے، اس کے تو تین بندے مار دیئے اس نے۔ایک بندہ قیدی بھی بنا لیا تھا۔اتنی گاڑیاں......'' ایک بندے نے بات کرنا چاہی تو منشی نے فوراً اس کی بات اچک کر کہا۔

''دیکھو کون کسی کی لڑائی لڑتا ہے۔وہ تو خود نہیں گیا لڑنے، اپنے بندوں کو بھیج دیا۔بی بی سکھن اس سے بہت ناراض ہے۔یہ لڑائی تو ہم نے اپنی لڑنی ہے۔میں خود ہوں گا تم سب کے ساتھ سب سے آگے۔''

''ابھی نکلنا ہے۔جس کے پاس جو اسلحہ ہے وہ نکال لائے، سب پھاٹک پر جمع ہوں گے۔اور ہاں، جس بندے کی گولی سے وہ مرا، اسے دس گائیں انعام میں دی جائیں گی۔جو اس لڑائی میں لڑا اسے ایک گائے تو ملے گی۔'' منشی مہر خان نے لالچ دینے کی حد کر دی۔اب میں اس کی مزید بکواس نہیں سن سکتا تھا۔میں نے پسٹل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور تاک کر نشانہ بنا دیا۔گولی اس کی گردن سے نکلتی ہوئی اس کا سینہ چیر گئی۔وہ منہ کے بل گر گیا، ایک لمحہ تو لوگوں کو سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ ہو کیا گیا۔

''خبردار کوئی ہلا تو......'' میں نے سخت لہجے میں کہا، وہ سب اپنی جگہ بیٹھے رہے۔میں انہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔تبھی میں نے اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ سے کھڑے ہو کر کہا، ''جسے زندگی چاہئے وہ ایسے ہی بیٹھا رہے، جس نے بھی حرکت کی وہ اپنی موت کا خود ذمے دار ہوگا۔'' وہ سکون سے بیٹھے رہے، ان کے سامنے وہ شخص تڑپ رہا تھا جو کچھ دیر پہلے لڑائی کی باتیں کر رہا تھا۔کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ اسے تھام لے۔تبھی میں نے کہا، ''یہ تم لوگوں کو گائے

دینے کا لالچ دے رہا تھا، جاؤ، باڑے سے جا کر جتنی گائیں لے جا سکتے ہو لے جاؤ، یہ آج سے بستی چراغ شاہ کے لوگوں کی ہیں۔“ میں یہ کہہ کر خاموش ہو گیا، کوئی بھی نہیں بولا تو میں نے کہا۔

”میں تمہارا دشمن نہیں ہوں، تمہیں ان جاگیرداروں کی غلامی سے نکالنے آیا ہوں۔ کیا تم ان کے ظلم نہیں جانتے ہو؟“ یہ کہہ کر میں چند لمحوں کے لئے خاموش ہوا تو کسی نے بھی کوئی بات نہیں کی تب میں نے کہا، ”ہاں میں نے میرن شاہ کو مارا ہے اب فیروزاں کو بھی ماروں گا کیونکہ میری ان کے ساتھ دشمنی ہے لیکن تمہاری میرے ساتھ کیا دشمنی ہے؟ سن لو، اور دوسرے لوگوں کو بھی بتا دو، اگر کسی نے، کسی بھی بستی کے کسی بندے نے بستی بہادر خان کا یا بستی کا من کے کسی بندے کو نقصان پہنچایا تو اس کے ساتھ بھی دشمنی شروع ہو جائے گی۔ اگر کسی کی میرے ساتھ دشمنی ہے یا وہ مجھ سے دشمنی چاہتا ہے تو وہ یہیں بیٹھا رہے، ورنہ یہاں سے باہر نکل جائے۔ جو یہاں رہا میری اس کے ساتھ دشمنی ہو گی۔“

میں نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ کئی لوگ ایک دم سے اٹھے اور باہر کی جانب تیز تیز جانے لگے۔ دیکھا دیکھی سب باہر چلے گئے۔ میں نے شعیب کو صورت حال بتائی۔ اس نے کہا۔

”بستی سے گاڑیاں منگوا لیں؟“

”نہیں، ابھی نہیں، دیکھیں یہ لوگ کیا کرتے ہیں، اگر انہوں نے گاڑیوں کو نقصان نہ پہنچایا تو سمجھو، وہ ہم سے نہیں لڑیں گے۔“

”اور اگر گاڑیاں توڑ ڈالیں تو......“ اس نے کہا۔

”تو پھر ہمیں بہت الگ سے سوچنا ہو گا۔“ میں نے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔ پتہ نہیں اسے میرا اعتماد سمجھ آیا تھا کہ نہیں۔ میں کافی دیر تک چھت پر رہا۔ بختاور وہیں دیوار پر بیٹھا

رہا۔ شعیب لوگوں نے جا کر اپنی گاڑیاں بستی سے لے لی تھیں۔ کسی نے بھی ان کا سامنا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اپنی گاڑیاں نکال کر ڈیرے کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ وہاں بستی کا کوئی آدمی بھی نہیں رہا تھا سب اپنے اپنے گھروں میں جا چھپے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر جانب سکون چھا گیا ہو۔ منشی مہر خاں کی لاش ڈیرے کے کچے فرش پر پڑی تھی، وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ میں چھت پر سے نیچے اترا اور ڈیرے میں آ گیا۔ بختاور بھی دیوار سے اتر آیا تھا۔ ہم دونوں وہاں سے پھاٹک تک گئے پھر وہاں سے نکل کر شعیب کے پاس جا پہنچے۔

میں نے اپنا سیل فون نکالا اور پیروزاں کو کال کر دی۔ وہ شاید میری ہی کال کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلی ہی بیل پر فون ریسیو کر لیا۔

''تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو؟'' اس نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک تب ہوگا، جب گولی میرے آر پار ہو جائے گی۔ وہ تیرا منشی میرے قتل کے لئے لوگوں کو لے کر نکل رہا تھا اور میں اسے کچھ بھی نہ کہوں۔'' میں نے انتہائی کرخت لہجے میں کہا۔

''اس کے قتل کی قیمت تجھے چکانا پڑے گی۔'' اس نے غصے میں کہا۔

''پتہ نہیں کس کا ادھار کون لئے پھرتا ہے، پر خوشی ہوئی، تمہیں اس کے قتل کی اطلاع مل گئی ہے۔'' میں نے سفاکانہ لہجے میں کہا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم یہ سب کیوں کر رہے ہو۔ لیکن......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''لیکن تم اتنی ڈھیٹ ہو کہ سمجھ کے بھی نہیں سمجھ رہی ہو۔ آ دتا آتی کیوں نہیں ہو۔ اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لو مجھ سے میں تمہارے گھر میں کھڑا ہوں۔ ابھی چاہوں تو تیرے گھر کو

آگ لگادوں۔ مگر ابھی لگاؤں گا نہیں، لگاؤں گا آگ لگاؤں گا لیکن اس وقت جب تم اس میں ہوگی تب...... تم جوڈا کورانی بنی ہوئی ہونا، میں تمہیں تمہاری اوقات بتاتا ہوں۔" میں حد درجہ جذباتی ہوکر کہتا چلا گیا تھا۔ وہ خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ پھر نفرت سے بولی۔

"مگر میں تمہارے بارے میں کچھ دوسرا سوچ رہی ہوں۔ میں تمہیں گولی نہیں ماروں گی، اس طرح تم جلدی مر جاؤ گے، میں تمہیں سسکا سسکا کر ماروں گی۔"

"تو ہوں نا میں یہاں، آؤ، بھیجو اپنے اس غنڈے جند وڈا کو، میں اسے بھی دیکھ لوں یا پھر پولیس کو بھیج دو۔ جسے مرضی بھیجو لیکن یہ جان لو اب تمہیں میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

"میں کہتی ہوں تم بچ جاؤ۔ چلے جاؤ یہاں سے۔" اس نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا تو میں نے کہا۔

"لڑائی تیری اور میری ہے۔ اب اگر کسی بھی بستی کے کسی بندے کو کوئی نقصان پہنچایا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ سمجھ لو۔" لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ اس نے فون بند کر دیا۔

میں کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ کسی طرف سے کوئی آدمی سامنے نہیں آیا۔ رات کا دوسرا پہر بھی گزر جانے کو تھا۔ جب ہم وہاں سے پلٹ کر بستی بہادر خان آ گئے۔ میں نے جو روہی میں پیغام دینا تھا وہ دے دیا تھا۔

☆......☆......☆

رات بھر خاموشی رہی تھی۔ ایک سناٹا تھا جو طاری ہو گیا تھا۔ ایسے سناٹے بہت خطرناک ثابت ہوا کرتے ہیں۔ منشی مہر خان کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کے خاندان کی طرف سے بھی کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ پولیس آئی تھی، اس کی نعش اٹھا کر لے گئی تھی۔ مجھے یہ کوئی اطلاع نہیں تھی کہ مجھ پر کوئی پرچہ کٹا تھا یا نہیں لیکن مجھے یہ پورا یقین تھا کہ اس قتل کی آڑ

لے کر بڑے پیمانے پر پکڑ دھکڑ ہونے والی تھی۔ بستی کے لوگوں کو پکڑ کر، انہیں ذلیل کر کے، ان کی عورتوں کو بے عزت کر کے ایک طرح سے وہاں کے حاکموں کی خوشنودی حاصل کی جاتی تھی۔ مجھے نجانے یہ گمان کیوں ہونے لگا تھا کہ پیروزاں اور اس کی پشت پر موجود لوگ اب بھی ہتھکنڈہ آزمائیں گے۔ مجھ پر جو گزر جاتا مجھے وہ قبول تھا لیکن بستی کے لوگوں پر ظلم میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے صرف ایک ہی صورت میں روکا جا سکتا تھا کہ وہ لوگ پولیس کو استعمال نہ کریں۔ ورنہ ایک نیا محاذ کھل جاتا تھا۔

صبح کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ بختاور نے مجھے سو جانے کا موقع دے دیا تھا۔ بستی کے نوجوان پہرے پر تھے۔ میں فریش ہو کر کوپے میں بیٹھا ہوا تھا کہ چاچا سائیں آ گیا۔ اس نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”یار، دو بندے ایک پیغام لے کر آئے ہیں۔“

”کون لوگ ہیں اور کس کا پیغام ہے؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”سردار نور حیات کے لوگ ہیں، کہہ رہے ہیں وہ لوگ ہم سے بات چیت کرنے کے لئے آنا چاہتے ہیں۔“ انہوں نے کہا تو میں چونک گیا۔ یہ لوگ اب دوسرے حربے پر اتر آئے تھے۔ جب سامنے سے جنگ نہ جیتی جائے تو پھر آمنے سامنے بیٹھ کر اپنی بات منوائی جاتی ہے۔ میں یہ حربہ سمجھ گیا تھا۔ اس لئے ان سے پوچھا۔

”تو پھر کیا چاہتے ہیں آپ؟“

”ظاہر ہے اب سردار کی بات تو سننی پڑے گی، آخر علاقے میں بھی تو رہنا ہے۔“ انہوں نے بے بسی سے کہا۔

”تو ٹھیک ہے آپ کریں بات۔“ میں نے کہا تو وہ بولے۔

”میں سمجھ رہا ہوں کہ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ ہم سے کیا منوانا چاہئیں گے۔ سو دیکھیں وہ کیا بات کرتے ہیں۔“

میں خاموش رہا تو وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ میں روہی کی صورت حال کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ لوگ آپس میں جتنا مرضی لڑتے رہیں، لیکن جب کسی ایک پر کوئی غالب آنے لگتا ہے تو سب اکٹھے ہو جاتے ہیں، اسی میں ان کی بقا ہے۔ وہ سب پیروزاں کو بچانا چاہتے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا، روہی میں موجود یہ چھوٹے چھوٹے حاکم اپنے مفاد کے لئے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو یہ چھوٹے چھوٹے حاکم کس بڑے حاکم کے مفاد کے لئے ہمہ وقت اکٹھے ہو سکتے تھے۔

جندوڈا نے انجانے میں بہت بڑا نقصان اٹھایا تھا۔ جس طرح مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ میں اس کا اتنا نقصان کر سکتا ہوں، اسے بھی یقیناً پتہ نہیں ہوگا کہ اتنا نقصان ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے زعم میں مجھ پر چڑھ دوڑا تھا۔ لیکن اب باوجود للکارنے کے وہ میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو تھی۔ اگر اسے یہ تھوڑا بہت بھی یقین ہوتا کہ وہ مجھ پر حاوی ہو سکتا ہے تو وہ ضرور سامنا کرتا۔ سردار نور حیات کے اچانک درمیان میں پڑنے سے ہونا یہی تھا کہ لڑائی رُک جاتی۔ پیروزاں روہی میں تو آنے والی نہیں تھی۔ فوری طور پر لڑائی رکنے کے بعد وہ مجھے کسی نہ کسی طرح رام کرنے کی کوشش کرتے۔ اس کے بعد جب بھی انہیں موقع ملتا وہ اپنا کام کر جاتے۔ اگر وہ یوں لوگوں کو معاف کرتے رہتے تو ان کی حاکمیت کبھی برقرار نہ رہ پاتی۔ وہ اب ہاتھوں میں پھانسنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔

میں گوپے میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ بختاور آ گیا۔ اس کا چہرہ غصے میں تمتما رہا تھا۔ وہ خاموشی سے آ کر سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا تو میں نے پوچھا۔

”کیا بات ہے، اس قدر غصے میں کیوں ہو؟“

”یار جب ہمارے لوگ قتل ہو رہے تھے، ہم پر چڑھائی کر کے ہمیں ہی کچلا جا رہا تھا، اس وقت یہ سردار نور حیات کہاں تھا؟“ اس نے ایک دم سے پھٹتے ہوئے کہا۔

”بات تو ٹھیک ہے۔“ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

”تم جانتے ہو کہ اب کیا ہوگا؟“ اس نے پوچھا۔

”میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں یہی میں سوچ رہا تھا۔“ میں نے اسے بتایا تو اسی غصے میں بولا۔

”میرے خیال میں اس کے آنے سے پہلے پہلے کوئی نہ کوئی کام ایسا کر دیا جائے کہ وہ اس قابل ہی نہ رہے کہ ہم سے بات کرے۔“

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔“ میں نے پھر اس کی ہاں میں ہاں ملا دی تو اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

”کیوں نا جندوڈا کا پتہ صاف کر دیا جائے۔“

”نہیں، وہ کوئی اتنی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ تو ایک مہرہ ہے، پٹ بھی جائے گا تو ان لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔“ میں نے پرسکون انداز میں کہا تو اس نے جھنجلاتے ہوئے پوچھا

”تو پھر کیا کریں؟“

”کیوں نا ہم اسے اٹھا لیں، جو ان سب کی ماں ہے؟“ میں نے تجویز دی تو اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارا مطلب ہے پیرزادہ کو اٹھا لیا جائے؟“

”نہیں، ان سب کے پیچھے شہر کا بڑا بزنس مین چوہدری آصف حمید ہے۔ میں بہت پہلے

ایک بار اس سے مل چکا ہوں۔ وہی پیروزاں کے پیچھے ہے۔ اگر اس کی اصل طاقت ہی ختم کر دی جائے تو......" میں نے کہا تو تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ چل اسی کا کچھ کرتے ہیں۔"

"چل نکل پھر، یہاں کسی کو بھنک بھی نہ لگے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ گیا۔

میں اب یہ قصہ ہی ختم کر دینا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ چوہدری آصف پر ہاتھ ڈالنے سے بہت کچھ گڑ بڑ ہو سکتا تھا لیکن اب مجھے پروا نہیں تھی۔ میں نے جیپ لی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بختاور بیٹھ گیا۔ ہم سیدھے شعیب لوگوں کے پاس جا پہنچے۔ انھیں اپنے پلان کے بارے میں بتایا تو وہ تیار ہو گئے۔ انہوں نے تو وہی کرنا تھا جو ہم چاہتے۔ ہم چپ چاپ بستی بہادر خان سے نکل پڑے۔

☆......☆......☆

بہاول پور شہر تک پہنچنے میں ہمیں تین گھنٹے لگ گئے۔ وہاں مقامی طور پر ایک ہی بندہ ہمیں کام کا ملا تھا۔ جس نے چوہدری آصف کے بارے میں ہمیں معلومات دیں۔ تین گھنٹوں میں وہ صرف اتنا ہی معلوم کر پایا تھا کہ اس کا گھر کہاں پر ہے، کتنے بجے وہ گھر سے نکل کر اپنے آفس جاتا ہے اور اس کی واپسی کتنے بجے ہوتی ہے۔ اس کا آفس اندر سے کس طرح کا ہے، اس کی سیکورٹی کیسی ہے یہ معلوم نہ کر سکا۔ سب سے بڑھ کر ہمارے پاس کوئی ایسا سیف ہاؤس نہیں تھا جہاں پر ہم چوہدری آصف کو رکھ سکتے۔ میری اس علاقے میں اتنی واقفیت نہیں تھی، اس لئے میں کچھ نہیں سوچ پا رہا تھا۔ بختاور کے جاننے والوں میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا، جس کے پاس ہم اسے لے جا کر رکھ سکتے۔ لیکن پھر بھی ہم شہر پہنچ گئے۔

ہم تین گاڑیوں پر تھے۔ ایک فاصلہ رکھ کر ہم چلتے چلے جا رہے تھے۔ اس کا آفس ماڈل

ٹاؤن جیسے پرسکون علاقے میں تھا۔ وہ وہیں سے اپنے بزنس کو دیکھتا تھا، وہیں پر سیاسی مشاورت چلتی تھی۔ وہیں پر وہ پورے علاقے کے لوگوں کے لئے حکم نامے جاری کرتا تھا۔ ہمیں معلومات دینے والے نے یہ بتادیا تھا کہ وہ اس وقت اپنے آفس میں موجود ہے۔

ہم ایک ریستوران میں جا پہنچے۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے کھانے پینے کا آڈر دیا اور ساری صورت حال سامنے رکھ کر پلان کرنے لگے۔ ہمارے لئے وہی مسائل تھے جو میں سوچ چکا تھا۔ سب کچھ سننے کے بعد اچانک مدثر نے کہا۔

"یار اتنا پریشان ہونے کی ضرورت کیا ہے۔ اسے اٹھانا ہے تو بس اٹھالو، ہم اسے روہی ہی لے جاتے ہیں، اگر ادھر نہیں جانا تو یہاں ساتھ ہی دریا ہے، وہیں کہیں چھپنے کی جگہ مل جائے گی۔ ہم نے کون سا وہاں کئی دن گزارنے ہیں، بات تو دو چار پہروں کی ہے نا۔"

بات تو اس کی ٹھیک تھی۔ جب اسے اٹھانا ہی ہے تو اٹھا لیتے ہیں، پھر دیکھا جائے گا کیا ہوتا ہے۔ میں نے اس کی بات مانتے ہوئے اگلا پلان بھی طے کر دیا۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے دوپہر ہو چکی تھی۔ ہم وہاں سے اٹھے اور ماڈل ٹاؤن کی جانب چل پڑے۔ ان چاروں نے ہمارے کور پر ہی رہنا تھا۔ ایک گاڑی مدثر کو دے دی گئی۔ اس نے رہنا تو ہمارے ساتھ تھا لیکن ہم سے اس طرح دور رہنا تھا کہ ہمارا ساتھی نہ لگے اور ہمیں اردگرد کی خبریں بھی دے سکے۔ یہ بہت ضروری تھا۔

ہم ماڈل ٹاؤن پہنچ گئے تھے۔ اس کا آفس ایک شاندار کوٹھی میں بنا ہوا تھا۔ میں نے گاڑی باہر ہی روک دی۔ گاڑی میں آفتاب بیٹھا تھا۔ گیٹ سے پورچ دکھائی دے رہا تھا جہاں ایک مہنگی اور شاندار گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ گیٹ پر سیکورٹی والا کھڑا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتا ہی الرٹ ہو گیا۔ سجاد نے بڑے نرم لہجے میں اس سے کہا۔

"یار ہمیں چوہدری صاحب سے ملنا ہے۔"

"کوئی ٹائم وغیرہ لیا ہوا ہے کہ نہیں؟" اس نے بارعب انداز میں پوچھا۔

"نہیں ٹائم تو نہیں لیا۔ مگر ہمارا اس سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔" اس نے پھر اسی نرم لہجے میں کہا۔

"دیکھو، ان کے نکلنے کا وقت ہو گیا ہے۔ ان کی گاڑی پورچ میں لگ چکی ہے۔ وہ اپنے دفتر سے نکلتے ہی ہوں گے۔"

"چل یار ہمیں اندر تو جانے دے۔ یہیں روک لیا ہے۔ ہم پورچ ہی میں مل لیں گے۔ اگر وہ دفتر میں لے جانا چاہیں گے تو لے جائیں گے۔"

بختاور اس سے باتیں کر رہا تھا۔ جبکہ میں وہاں کے ماحول جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں اتنی زیادہ سیکورٹی نہیں تھی۔ گیٹ پر ایک آدمی تھا جس سے بختاور باتیں کر رہا تھا۔ اندر پورچ میں ایک نمائشی قسم کا سیکورٹی والا کھڑا تھا۔ اب یہ اندازہ نہیں تھا کہ چوہدری آصف کے ساتھ کتنے لوگ ہو سکتے تھے۔ گیٹ والے نے ہمارے اندر جانے کا راستہ دے دیا تھا۔ ہم چہل قدمی کے سے انداز میں پورچ کے قریب جا پہنچے۔ انہی لمحات میں چوہدری آصف اندر سے نکلا۔ اس کے ساتھ ایک ہی شخص تھا، جو بلاشبہ اس کا ڈرائیور تھا۔ وہ تیزی سے گاڑی کی جانب چلا گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ اپنی سیکورٹی سے اتنا غافل کیسے ہو گیا ہوا تھا۔

چوہدری آصف کی جیسے ہی ہم پر نگاہ پڑی وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ شاید وہ ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا یا پہچان کر ڈرامہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جو بھی تھا، میں اس کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے میرے ساتھ مصافحہ کیا تو میں نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا بلکہ مضبوطی سے اس کا ہاتھ دباتے

ہوئے پوچھا۔ "چوہدری پہچانا مجھے......؟"

"نہیں، میں اب تک تمہیں نہیں پہچان پایا ہوں۔"

"اور مجھے بھی نہیں پہچانا؟" بختاور نے اس کے ساتھ کھڑا ہوتے ہوئے دبی دبی نفرت سے پوچھا۔

"تم بھی میرے دھیان میں نہیں آرہے ہو، کون ہو تم لوگ؟" اس نے آخری لفظ کہتے ہوئے اپنا لہجہ ذرا سخت کر لیا۔ تبھی میں نے کہا۔

"میں ایک بار پروزاں مائی کے ساتھ تم سے ملا تھا۔"

میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے چونک گیا۔ بلاشبہ اس کے چہرے پر خوف ہویدا ہو گیا تھا۔ اس نے گہری نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم روہی سے ہو، مطلب علی......"

"ہاں میں علی ہوں اور یہ بختاور ہے۔" میں نے کہا تو وہ فوراً ہی خود کو سنبھالتا ہوا بولا۔

"اوہ......آؤ، آفس میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

"ابھی تم گھر جا رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، گھر ہی جا رہا تھا۔" اس نے کافی حد تک گھبراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر چلو گھر ہی چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، تھوڑی باتیں کرنا تھی تم سے۔" میں نے سرد سے لہجے میں کہا

"نن......نہیں......یہیں، آفس میں بیٹھتے ہیں۔" اس نے مڑتے ہوئے کہا۔

"دیکھ چوہدری ہمیں مجبور نہ کر۔ تیرے گھر تک جاتے ہماری بات پوری ہو جانی ہے۔ یہاں بیٹھ کر وقت ضائع نہ کر۔" اس نے کہا تو بختاور نے اس کی گاڑی کا دروازہ کھولا اور اگلی

نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ چوہدری نے کہا تو میں نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے سرگوشی میں کہا، "ایویں خواہ مخواہ یہیں تماشا بن جائے گا۔ چند باتیں کرنی ہیں اور بات ختم۔"

چوہدری آصف نے سر جھکایا اور پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا تو ڈرائیور نے کار بڑھا دی۔ تب تک میں بڑے آرام سے اپنا پسٹل نکال چکا تھا۔ جس کی خبر چوہدری کو نہیں۔ دفتر سے نکلتے ہی اس نے کہا۔

"بولو کیا بات کرنی ہے۔"

"یار کتنے نالائق قسم کے بندے ہو، ذرا سی بھی غیرت نہیں تمہیں، ہم تمہارے مہمان ہیں، تمہارے گھر جا رہے ہیں، وہاں جا کر کوئی چائے وائے پئیں گے، پھر بات کرتے ہیں۔ سنا ہے تمہارے بچے بڑے پیارے ہیں۔" میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے لرز کر رہ گیا۔ جرم کی دنیا میں کوئی کتنا بھی پھنے خان ہوتا ہے، جب موت کو سامنے دیکھتا ہے تو لرز ہی جاتا ہے۔ ڈرتے وہ نہیں جو کسی مقصد اور لگن کے ساتھ سرفروش نکلے ہوں۔ اور پھر جب بات اپنے پیاروں تک آ جائے تو بڑے بڑے دل والے کمزور پڑ جاتے ہیں۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھ ہی لیا تو میں نے کہا۔

"اپنے بچوں پر بات آئی ہے نا تو کلیجہ منہ کو آ گیا ہے۔ جب تیری آشیرواد سے روہی میں بچے مر رہے ہیں۔ نوجوان قتل ہو رہے ہیں، اسمگلنگ کا دھندہ عروج پر پہنچا ہوا ہے۔ ان کا کیا قصور ہے۔ وہ کسی کی اولاد نہیں۔" میرے یوں کہنے پر اس نے کافی حد تک اعتماد سے کہا۔

"میں نہیں کروں گا تو کوئی دوسرا کرے گا۔ میں تو کسی کے پاس نہیں جاتا، خود لوگ چل کر مجھ سے مدد مانگنے آتے ہیں۔ میں اکیلا نہیں کرتا، یہ باتیں انہیں سناؤ، جو یہ سب کرتے ہیں۔"

"بکواس، گاڑی اب گھر کی طرف نہیں جائے گی، ڈرائیور کو سمجھا دو۔ نہیں تو اسے اگلے

جہان پہنچا دو۔" میں نے کہا تو بختاور نے پسٹل ڈرائیور کی کمر پر رکھ دیا۔ کار کو معمولی سا جھٹکا لگا اور پھر جیسے تیرنے لگی۔ تبھی چوہدری نے بڑے حوصلے اور اعتماد سے کہا۔

"تمہیں میرا اغوا بہت مہنگا پڑے گا۔ اپنی بات کہو اور یہاں اتر جاؤ۔ تم جو چاہتے ہو میں وہی کر دوں گا۔"

"تم بیٹھ کر بات کرنے کا آپشن گنوا چکے ہو۔ تمہارے مرنے کے بعد، میں خود سب دیکھ لوں گا۔" میں نے جان بوجھ کر نفسیاتی دباؤ دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ جس کا خاطر خواہ اثر ہوا، اس نے تیزی سے کہا۔

"مجھے بتاؤ، تمہارا مطالبہ کیا ہے؟"

"کیا تم نہیں جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"وہی پیروازں والا، اگر یہ بات ہے تو سمجھو ابھی اور اسی وقت سے میں اس کے ساتھ نہیں ہوں، تم جو چاہو سو اس کے ساتھ کرو۔ میں کوئی دخل اندازی نہیں کروں گا۔"

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ میں چاہتا تھا کہ ہم جتنی جلدی ہو سکے شہر سے نکل جائیں۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ ڈرائیور ہمیں کس جانب لے کر جا رہا ہے۔ بختاور اس کی راہنمائی کر رہا تھا۔ شہر سے نکلتے ہی ریلوے لائین پار کی پھر تھوڑا سفر کرنے کے بعد نہر آگئی۔ وہ نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ یہاں تک کے نہر کے دائیں جانب اس قدر گھنے درخت آگئے جیسے جنگل کا سماں ہو۔ میں نے وہاں رُک جانے کا کہا۔ ڈرائیور کو بختاور نے باہر نکال کر باندھ دیا اور میں نے چوہدری آصف کو باہر نکال کر ایک درخت کے پیچھے لے آیا۔ بختاور نے کار ایک جھاڑی کے ساتھ لگا دی۔ اس کام سے فراغت کے بعد میں نے اردگرد نگاہ کی، دور نہر کنارے مجھے اپنی گاڑی دکھائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سب میرے کور پر ہیں۔

”ہاں اب بولو، سب کچھ بتا کر مرنے سے بچنا چاہتے ہو یا بنا بتائے مرنا پسند کرو گے؟“ میں نے پسٹل کی نال سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، تم جو چاہتے ہو، میں وہ کرنے کو تیار ہوں۔ یہاں تک کہ تم پوری روہی پر اپنا اختیار چاہتے ہو تو میں تمہاری راہ میں نہیں آؤں گا۔ پیروزاں تو ایک معمولی بات ہے۔“ اس نے پہلی بار سمجھداری سے بات کی تھی۔

”دیکھو چوہدری، تمہارے مرنے کے بعد مجھے تھوڑی مشکل تو ہو گی، لیکن میں خود بھی روہی پر قابض ہو سکتا ہوں۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو۔ لیکن......“

”تم جو کہو، میں کر دیتا ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”یہ سردار نور حیات کو تم نے وہاں بھیجا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آں ہاں...... میں نے ہی بھیجا ہے۔“ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا چاہتے تھے تم اسے وہاں بھیج کر؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی کہ بس اب نہیں لڑنا۔“ اس نے کہا۔

”لیکن جندوڈا وہیں رہے خشندہ بن کر، پیروزاں یہاں شہر میں چھپ کر رہے، تیرا کام چلتا رہے، بندے چاہے مرتے رہیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے تم بتا دو کیا چاہتے ہو، میں وہی کر لیتا ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”تو چلو، ملاؤ کال پیروزاں سے اسے پہنچاؤ، روہی میں۔ اگر وہ وہاں چلی گئی تو سمجھو ہماری تمہاری دشمنی ختم۔“ میں نے کہا۔

”میرے یوں کہنے پر وہ کبھی بھی روہی میں نہیں جائے گی، آج ہی میری اس سے بات ہوئی ہے، میں نے خود اسے روکا تھا کہ تم نہ جاؤ، میں سب سنبھال لوں گا، مجھے آج شام تک کا

وقت دو، میں اسے خود لے کر روہی پہنچ جاؤں گا، یہ میرا وعدہ رہا۔'' اس نے ملائمیت سے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا، میرا سیل فون بج اٹھا۔ دوسری جانب چاچا عبدالمجید تھے۔ میرے ہیلو کہتے ہی انہوں نے کہا۔

''تم نے چوہدری آصف کو اغوا کیا ہے؟''

انہیں کیسے پتہ، یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی، کسی نہ کسی نے انہیں بتا دیا ہوگا۔ لیکن جس طرح اور جس لہجے میں انہوں نے پوچھا تھا، یہ میرے لئے اچنبھے کی بات تھی۔ اس لئے میں نے چوہدری آصف سے ذرا دور جا کر کافی سنبھل کر کہا۔

''جی، میں نے اسے ہی اغوا کیا ہے۔''

''کیا کرنا چاہتے ہو اسے مارنا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ہاں، تھوڑا بہت پوچھ......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولے۔

''نہیں، اسے کچھ نہیں کہنا، بس اسے چھوڑ دو۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ، وہ تو......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے۔

''میں جو کہہ رہا ہوں، چھوڑ دو اسے۔ اس کے ساتھ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ، اگر تم نے ذرا سا بھی وقت ضائع کیا تو پولیس تمہیں چاروں طرف سے گھیر لے گی، پھر تم سے نکلا نہیں جائے گا۔''

''میں سمجھا نہیں، یہ بندہ اور پولیس، اتنی جلدی؟'' میں چکرا کر رہ گیا۔

''ساری باتیں بعد میں پتہ چل جائیں گی، تم اسے یہیں چھوڑ کر نکل جاؤ۔'' انہوں نے سخت لہجے میں کہا تو میں نے کہا۔

"جی ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا ہی تھا کہ انہوں نے فون بند کر دیا۔ میرے دل میں سخت ملال تھا۔ پہلی بار میں کسی بندے کو پکڑ کر اسے مارنا چاہتا تھا کہ مجھے روک دیا گیا تھا۔ حالانکہ اس کے بارے میں پتہ تھا کہ وہ کس قدر جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتا تھا۔ میں نے چوہدری آصف کی طرف دیکھا اور پسٹل کی نال اس کے ماتھے پر رکھ دی۔ اس کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔ تبھی میں نے کہا۔

"تم جانتے ہوئے کہ ایک لمحہ لگے گا اور تم اس دنیا سے پار ہو جاؤ گے؟"

"میں جب کہہ رہا ہوں کہ میں تعاون کروں گا پھر بھی تم؟" اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

"چل ٹھیک ہے۔ میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن چند باتیں۔" میں نے پسٹل ہٹاتے ہوئے کہا۔

"بولو، اس نے تیزی سے کہا۔

"رات تک پیروزاں روہی میں پہنچ جانی چاہیے اور نور حیات ادھر کا رُخ نہ کرے۔ چندو ڈاسے میں خود نپٹ لوں گا۔" میں نے کہا۔

"ہو جائے گا۔" اس نے تیزی سے کہا تو میں پیچھے ہٹ گیا۔ وہ پجیرو کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ میں پلٹا اور رور کھڑے بختاور کو آواز دی۔ وہ میرے قریب آ گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"چل نکل، اس نے وعدہ کر لیا ہے، اگر اپنے وعدے سے پھرا تو دوبارہ دیکھ لیں گے۔"

"یار مارا سے، اس نے......" بختاور نے بھناتے ہوئے کہا۔

"نہیں اب وعدہ کر لیا ہے۔" میں نے کہا اور چوہدری آصف کی کار کی جانب بڑھ گیا۔

میں چاہتا تھا کہ اس کی کار کہیں قریب ہی چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس روہی نکل جاؤں گا۔ میں ابھی کار کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اسی لمحے آفتاب کی کال آ گئی۔ میں نے کال رسیو کرتے ہوئے ہیلو کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"علی نکلو، پولیس کی بھاری نفری......"

"کس طرف سے......" میں نے پوچھا۔

"یہ میری طرف سے۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"تم لوگ بچ کر نکل جاؤ روہی، ہم بھی آنے کی کوشش کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا ہی تھا کہ میں نے فون بند کیا، بختاور کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف جنگل میں نکل گیا۔

میں ابھی تھوڑا سا آگے گیا تھا کہ اچانک فائر ہوا، جس نے جنگل کا سناٹا چیر کر رکھ دیا۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا، میں آگے بڑھ گیا، میں اب بھاگ نہیں رہا تھا بہت محتاط انداز میں آگے بڑھ رہا تھا کہ یکلخت فائرنگ کی آواز سے جنگل گونج اٹھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ پولیس اچانک کس طرف سے آ گئی ہے۔ اتنی زوردار فائرنگ کہاں ہو رہی ہے؟

(قسط نمبر:9)

فائرنگ کی سمت کا واضح اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے چاروں طرف سے گولیاں چل رہی ہیں۔ بختاور نے ہاتھ چھڑا لیا تھا۔ اسے بھاگنے میں دقت ہو رہی تھی۔ میں اس کا ہاتھ چھوڑ کر اندھا دھند بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ میرے پیچھے بختاور بھی اتنی ہی تیزی سے آ رہا تھا۔ انہی درختوں کے ایک گھنے جھنڈ کے درمیان کچے کمروں کے کچھ کھنڈرات دکھائی دیئے۔ ان کمروں کے آگے صحن تھا اور چھوٹی چھوٹی چار دیواری گری ہوئی تھی۔ ممکن ہے وہاں کبھی کسی کی رہائش رہی ہو گی، لیکن اس وقت ان کمروں کی حالت مخدوش تھی۔ میں نے ایک لمحہ کو سوچا اور ان کھنڈرات کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔ اگلے چند لمحوں میں بختاور بھی میرے پیچھے آ گیا۔ میری طرح اس کا سانس بھی تیز تھا۔ فائرنگ اب کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔ اکا دکا فائر ہو رہا تھا۔

”یہ فائرنگ...... کہاں سے...... ہو رہی ہے؟“ بختاور نے تیز سانسوں کے درمیان پوچھا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہی تو میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سنو، غور سے یہ فائرنگ کہاں ہو رہی ہے؟“ میں نے کہا تو وہ ذرا سا سر جھکا کر اندازہ لگانے لگا۔ میں نے بھی غور کیا تو یہ فائرنگ نہر کی طرف سے ہو رہی تھی، جہاں ہمارے دوست موجود تھے۔ میں ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ کہیں یہ فائرنگ کا تبادلہ ان کے اور پولیس کے درمیان تو نہیں ہوا؟ میں نے تیزی سے سیل فون نکال کر شعیب کو فون کیا۔ اس نے فوراً ہی میری کال ریسیو کر لی تو میں نے پوچھا۔

"تم نے فائرنگ کی آواز......"

"یہ صرف آواز نہیں تھی، ہمارے اور پولیس کے درمیان فائرنگ ہو رہی تھی۔ پہل انہوں نے کی تھی۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"انہوں نے...... پر کیوں؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"وہ ہمیں گھیرنا چاہ رہے تھے یا پھر ڈرانا چاہتے تھے۔ ہم سے کافی دور تھے کہ انہوں نے وہیں سے فائرنگ شروع کر دی۔ ہم نے بھی راستہ بنانے کے لئے جواباً فائر کھول دیا۔" اس نے اسی لہجے میں بتایا۔

"اب کیا......" میں نے پوچھنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں، ہم نکل گئے ہیں۔ آفتاب اور مدثر دوسری گاڑی میں تھے، میرا رابطہ ہوا ہے ان کے ساتھ، وہ بھی نکل گئے ہیں۔ تم بتاؤ کہاں ہو؟"

"میں اور بختاور بھی ایک محفوظ جگہ پر ہیں۔" میں نے بتایا۔

"اور وہ جو بندہ اٹھایا تھا کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یار وہ بڑی عجیب بات ہوئی ہے، چاچا عبدالمجید نے اسے چھوڑ دینے کو کہا ہے۔ سو میں نے چھوڑ دیا۔" میں نے بتایا تو اس نے تیزی سے پوچھا۔

"کوئی بات ہو گی تو کہا ہے۔ خیر، تم بتاؤ، اب کیا کرنا ہے؟"

"مجھے اندازہ نہیں کہ ہم کہاں ہیں، لیکن......" میں نے کہنا چاہا تو بختاور نے کہا۔

"مجھے سب راستوں کا پتہ ہے۔"

"اوکے تم نکلو، میں اور بختاور آتے ہیں۔" میں نے کہا تو شعیب نے اوکے کہہ کر فون بند کر دیا۔

کسی بھی قسم کی کوئی ہلچل نہیں تھی۔ ابھی تک سناٹا تھا۔ سردار نور حیات کی طرف سے ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔

☆......☆......☆

دن ڈھل کر رات میں بدل گیا تھا۔ بستی بہادر خان میں کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ چوہدری آصف نے اپنا ایک وعدہ تو پورا کر دیا تھا۔ اب وہ پیروزاں کو کب اور کیسے یہاں لاتا ہے؟ یہی دیکھنا تھا۔ مجھے نہیں یقین تھا کہ چوہدری آصف آج رات ہی اسے یہاں بھیج سکے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ فوراً سمجھ جائے گی۔ پیروزاں کو یہ پورا یقین تھا کہ وہ جب بھی یہاں آئی ماری جائے گی۔ میری اور اس کی دشمنی کوئی ایک دن کی بات تو نہیں تھی۔ وہ اس لئے اچھی طرح جانتی تھی کہ میں نے میرن شاہ کو اس نفرت سے کیوں قتل کیا تھا۔ میں کوٹھے میں بیٹھا اسی بارے سوچ رہا تھا۔ ایسے میں بختاور میرے پاس آ گیا۔ وہ چارپائی پر بیٹھ کر تشویش سے بولا۔

"سردار نور حیات تو نہیں آیا، چوہدری نے یہ وعدہ تو پورا کر لیا، لیکن پیروزاں نہیں آئے گی، یہ مجھے یقین ہو گیا ہے۔"

"کیسے ہو گیا یقین؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی مجھے بستی چراغ شاہ سے ساتول نے فون کیا ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ پیروزاں کے گھر والے ڈیرے پر جیسے کوئی فوج جمع ہو رہی ہے۔ وہاں پر نجانے کتنی گاڑیاں آ گئی ہیں۔ کتنے لوگ آ گئے ہیں۔"

"ساتول کہاں ہے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"میں نے اسے کہا ہے کہ فوراً وہاں سے نکل آئے، ممکن ہے وہ لوگ اسے نقصان

پہنچا ئیں۔ وہ آتا ہی ہوگا۔“

”ہاں اسے آجانا چاہیے۔“ میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا، میرا گمان ٹھیک تھا کہ پیروزاں نہیں آنے والی۔ شاید چوہدری آصف نے اسے روہی بھیجا چاہا ہوگا اور وہ اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ حالات کو نہ سمجھ سکتی۔ اس نے حالات کو سمجھا اور بجائے سمجھوتہ کے لئے کوئی راہ نکالنے کے مقابلے کو ترجیح دے دی تھی۔ اتنی تعداد میں لوگوں کو اکٹھا کر لینے کا مقصد جنگ کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟

ایک دوسری سوچ بھی میرے دماغ میں آنے لگی تھی، پیروزاں نے روہی میں آنے کا فیصلہ کر لیا ہوگا، جس کی وجہ سے اس نے اتنے زیادہ لوگ بھیج دیئے تھے۔ ایسی صورت میں بھی سوائے ٹکراؤ کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ میرے لئے دونوں صورتوں ہی میں جنگ تھی۔ مجھے بہر حال پیروزاں سے انتقام لینا تھا، وہ چاہے اپنے اردگرد جتنے مرضی حصار باندھ لیتی۔

ابھی تک ساتول بستی نہیں پہنچا تھا۔ شعیب لوگ بھی اپنے اپنے ٹھکانوں پر تھے۔ میرے دماغ میں کوئی ایسی ترکیب نہیں آرہی تھی کہ پیروزاں کے بارے میں معلوم کر سکوں۔ وہ کیا کرنا چاہتی ہے؟ میں یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ روہی میں ہے یا نہیں؟ میری پریشانی اپنے بارے میں بالکل نہیں تھی، مجھے ڈر تھا کہ پیروزاں اپنی طاقت کا استعمال اس بستی پر نہ کر دے، جیسا کہ اس نے جندوڈا کی صورت میں کر دیا تھا۔ اگر میری وجہ سے یہاں کسی ایک بندے کا بھی نقصان ہو جاتا تو میں اس کا ذمے دار خود کو سمجھتا۔ حالانکہ ان کی اپنی دشمنی چل رہی تھی۔

بختاور نے شعیب لوگوں کو بھی بتا دیا تھا کہ پیروزاں کے ڈیرے پر کیا چل رہا ہے، اس وجہ سے وہ چاروں میرے پاس آگئے۔ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد شعیب نے کہا۔

”یار اصل مسئلہ کیا ہے؟ یہی نا کہ پیروزاں کو ٹھکانے لگانا ہے تو چلتے ہیں واپس بہاول پور اور......“

”ایسا ہوتا تو میں کب کا اسے ٹھکانے لگا چکا ہوتا، میں ان کی حاکمیت اس روحی سے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ سب کو پتہ چل جائے۔“ میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

”تو پھر، اسے اٹھا کر یہاں لے آتے ہیں، ہم نے وہ آصف چوہدری پر یونہی وقت ضائع کر دیا، سیدھے پیروزاں کو یہاں لے آتے۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں چاہتا کہ وہ مظلوم بنے، لوگوں کو بھی پتہ چلنا چاہئے کہ وہ ظالم تھی اور اسے اس کی سزا ملی ہے۔“ میں نے کہا تو مدثر بولا۔

”انتظار کرتے ہیں، کسی بھی طرح کی اگر کوئی چھیڑ خانی کی انہوں نے تو پھر معافی نہیں۔“

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے وہ اتنے بندے دکھا کر شاید وہ ہمیں ڈرانا چاہتی ہے۔“ آفتاب نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے طرف دیکھا اور پھر بڑے سکون سے کہا۔

”تم لوگ اس کی فطرت سے واقف نہیں ہو، میں جانتا ہوں۔ وہ بنیادی طور پر سازشی ذہن کی عورت ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی جال بننے کے چکر میں ہو گی۔ اتنے بندے لانے کا مقصد یقیناً جنگ ہی ہے۔ اس کے پیچھے کیا ہو سکتا ہے، وہ سوچو۔“

”یار علی یہ تم کن نفسیاتی چکروں میں پڑے ہوئے ہو، اگر نفسیات ہی کی بات ہے نا تو اتنے لوگوں کا اکٹھا ان کا خوف ظاہر کر رہا ہے۔“ جہانگیر نے طنزیہ انداز میں کہا، لمحہ بھر رکنے کے بعد بولا۔ ”کتنے لوگ ہوں گے ان میں لڑنے والے، کیا تم نہیں جانتے ہو، ہجوم نہیں لڑا کرتا۔“

جہانگیر نے بڑے پتے کی بات کی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ جو کچھ میں سوچ رہا تھا، وہ ایک دم سے میرے دماغ سے معدوم ہو گیا۔ وہ غبار جو میرے ذہن پر چھا گیا تھا

ایک دم سے صاف ہو گیا۔

”بس تو پھر، انتظار کرو، جیسے ہی وہ کوئی پیش قدمی کریں، کسی قسم کی بھی کوئی چھیڑ خانی کریں، انہیں معاف نہ کیا جائے۔“ شعیب نے حتمی لہجے میں کہا ہی تھا کہ بختاور کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر دیکھتے ہوئے کہا

”کوئی نیا ہی نمبر ہے، رب خیر ہی کرے۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے کال رسیو کر لی۔ پھر دوسری جانب سے وہ سنتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی لمحہ بہ لمحہ اس کا چہرہ غصے میں بگڑتا چلا گیا، پھر اچانک اس نے دھاڑتے ہوئے کہا، ”اوئے، اگر اسے کچھ ہوا، اسے خراش تک بھی آئی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

یہ لفظ سنتے ہی میری اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گیا۔ کال ختم ہو گئی تھی۔ اس نے فون کان سے ہٹایا تو میں نے پوچھا۔

”کیا ہوا؟“

”چندواڑا نے اپنے سانول کو اغوا کر لیا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ اگر ہمت ہے تو مجھ سے لے کر دکھاؤ۔“

یہ بات سنتے ہی ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ وہی ہوا جو چند لمحے پہلے میرے ذہن میں آیا تھا۔ انہوں نے وار کر دیا تھا۔

”اس سے یہ تو پوچھتا تھا کہ کہاں ہے وہ؟“

”چندواڑا کے ڈیرے پر۔“ اس نے ہولے سے کہا۔

”اس نے بہت سوچ سمجھ کر ہمیں للکارا ہے۔ وہ ہمارا انتظار کر رہا ہوگا، کیا خیال ہے؟“ میں نے سب کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”اس میں خیال ہونے یا نہ ہونے کی کیا بات ہے۔ سانول کو لانا ہے تو بس لانا ہے، اس نے للکارا ہے تو اسے جواب دینا تو بنتا ہے نا۔“ شعیب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو چلو پھر.....“ میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے ایک پلان بنایا اور چھ کے چھ تیار ہو کر دو گاڑیوں میں بیٹھے بستی بہادر خان سے باہر تھے۔ ہمارے ساتھ کچھ دوسرے نوجوان بھی آنا چاہ رہے تھے لیکن ہم نے سب کو روک دیا۔ میں نے ان سے یہی کہا کہ وہ بالکل ہوشیار ہو کر اپنی بستی کی حفاظت کریں۔ ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔ بختاور نے چاچا سائیں کو ساری بات بتادی تھی اور انہیں سمجھا بھی دیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔

میں، آفتاب اور مدثر ایک گاڑی میں تھے اور بختاور، جہانگیر اور شعیب دوسری گاڑی میں۔ ہم نے بڑی تیزی سے گاڑیاں نکالی تھیں۔ ہمارا انداز یوں تھا کہ جیسے ہم بستی بہادر خان سے فرار ہو رہے ہیں۔ ہمارا رخ بھی شہر جانے والے راستے کی طرف تھا۔ جو بلاشبہ چندوڈا کے مخالف سمت میں تھا۔ ایسا ہم نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ تاثر یہی دینا تھا کہ جیسے ہم بھاگ گئے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ دشمن کے بارے میں خبر اور معلومات رکھنے کا مطلب آپ آدھی سے زیادہ جنگ جیت گئے ہیں۔ جو لوگ سانول کے بارے میں یہ جانتے ہیں کہ وہ بستی چراغ شاہ سے بستی بہادر خان آ رہا ہے تو کیا وہ ہماری ٹوہ میں نہیں ہوں گے؟

کوئی پانچ سات کلومیٹر تک جا کر ہم نے گاڑیاں روک دیں۔ کچھ ہی فاصلے پر چند گھر تھے۔ وہ بختاور کے رشتے داروں کے گھر تھے۔ بختاور اترا اور ان گھروں کی سمت چل پڑا۔ اس کے ساتھ جہانگیر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے پیچھے پانچ اونٹ تھے۔ ہم نے گاڑیوں میں جیکٹ لے کر پہنے۔ اس میں اپنی اپنی پسند کا اسلحہ لیا اور اونٹوں پر سوار ہو گئے۔

ایک گاڑی وہیں کھڑی رہتا تھی اور دوسری مدثر نے ہم سے کافی فاصلہ رکھ کر لاتا تھی۔

ہمیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ ہم کافی وقت گزر لینا چاہتے تھے۔ اس لئے ایک لمبا چکر کاٹ کر چلتے چلے گئے۔ ہم نے راستے میں ایک ٹیلے پر بیٹھ کر کافی دیر تک وقت گزار لیا تھا۔ جندوڈا کے ڈیرے سے کوئی دو ڈھائی کلومیٹر کے فاصلے پر جب ہم پہنچے تو رات کا آخرہ پہر شروع ہونے کو تھا۔ اس وقت ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا جب ہم پانچوں جندوڈا کے ڈیرے کی جانب چل دیئے۔ ڈیرے میں ایک بلب روشن تھا جو ایک بانس کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ اس کی روشنی ڈیرے کے باہر کی جانب پھیل رہی تھی۔ وہ بلب اتنا طاقتور نہیں تھا کہ اس کی روشنی دور تک جاتی، تو وہ ڈیرے کی چاردیواری سے کوئی پانچ دس فٹ کے فاصلے کو روشن کر رہی تھی۔ بلاشبہ وہ کسی بیٹری پر لگایا ہوا تھا۔ ورنہ جنریٹر ہوتا تو اس کی آواز آ رہی ہوتی۔ تھوڑے سے فاصلے پر پہنچ کر ہم اونٹوں سے اُتر آئے۔ ہم نے ایک دوسرے سے رابطہ کے لئے رسیور سیٹ کر لئے۔ تبھی میں نے چاردیواری کے ساتھ جہاں اندھیرا تھا اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں اس طرف سے دیکھتا ہوں۔"

میں نے اپنا پسٹل ہاتھ میں لیا اور تیزی سے محتاط انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں لمحہ بہ لمحہ چاردیواری کے قریب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے صرف ایک ہی ڈر تھا کہ ڈیرے کے کچے کمروں کی چھت پر کوئی موجود نہ ہو، اگر کوئی وہاں ہوا تو وہ مجھے آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ وہ تھوڑا سا فاصلہ میں نے انتہائی سرعت سے پار کیا اور کچی چاردیواری کے ساتھ جا لگا۔ میں نے اپنے دوستوں کو بتا دیا کہ میں چاردیواری تک پہنچ چکا ہوں۔ وہ دیوار کوئی دس فٹ کی تھی۔ پرانی ہونے کے باعث اس میں تھوڑی تھوڑی درزیں تھیں۔ میں ان میں انگلیاں پھنساتا ہوا اوپر

چڑھ گیا۔ اندر کا ماحول ویسا ہی تھا جو ڈیروں کا ہوتا ہے۔ ڈیرے کے صحن میں کئی چار پائیوں پر لوگ سوئے ہوئے تھے۔ ممکن ہے ان میں بھی کوئی جاگ رہے ہوں۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ مویشی بیٹھے ہوئے تھے۔ برآمدے میں ایک چھوٹا بلب روشن تھا۔ وہاں چند چار پائیاں پڑی ہوئیں تھیں، جن پر کچھ لوگ لیٹے ہوئے تھے، کچھ جاگ رہے تھے۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میرا پاؤں کسی نے کھینچا ہو۔ میں نے فوراً اپنا پاؤں اوپر کیا تو ایک کتا میرے پاؤں کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ یہ تو شکر ہوا میرے لانگ بوٹ تھے جو میں عام طور پر پہنتا تھا، ورنہ وہ میرا پاؤں چیر دیتا۔ وہ ان کتوں میں سے تھا جو بھونکتے نہیں بلکہ سیدھا شکار کو دبوچتے ہیں۔ میں نے پاؤں کا جھٹکا تو وہ نیچے گر پڑا۔ تبھی وہ زوردار آواز میں بھونکا۔ وہاں کے مکین کتے کو جانتے تھے، وہ اسی لمحے یوں الرٹ ہوئے، جیسے انہیں کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس وقت تک میں پچھلے کمروں کی چھت پر جا چکا تھا۔

"کیا ہوا؟" جہانگیر کی آواز میرے کان میں گونجی تو میں نے اسے صورت حال بتا دی۔ جو بلاشبہ سب نے سن لی تھی۔

"بندے کتنے ہیں؟" شعیب نے پوچھا۔

"یہی کوئی پندرہ سے بیس ہوں گے۔" میں نے کہا تو وہ بولا۔

"اپنا دھیان رکھنا، ہم آئے۔"

میرے کانوں میں ان کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ جبکہ نیچے کتا مسلسل بھونکے جا رہا تھا۔ اگر مجھے کتے کی بھنک پہلے پڑ جاتی تو میں اسے گولی مار دیتا۔ کم از کم وہ میری نشاندہی تو نہ کر سکتا۔ وہ سب لوگ صحن میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی اسلحہ تھا۔ ان سب کو شک ہو گیا تھا کہ کوئی نہ کوئی اوپر چھت پر ہے۔

"کون ہے اوپر، سامنے آ، ورنہ گولی ماردیں گے۔" نیچے سے آواز آئی تو میں بالکل چھت کے ساتھ چپک گیا۔ وہ جتنی مرضی فائرنگ کر لیتے، یہاں سے مجھ پر فائر نہیں ہو سکتا تھا یہاں تک کہ کوئی چھت پر آ کر فائر نہ کرتا۔ میرے چاروں ساتھی تیزی سے چاردیواری کی جانب بڑھ رہے تھے۔ بس چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تھا، پھر یکے بعد دیگرے وہ دیواروں پر چڑھ آئے۔ تبھی میں نے اوپر سے یکے بعد دیگرے فائر کرنا شروع کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے فائر ہونے لگے۔ ایسا صرف آدھے منٹ کے لگ بھگ ہوا۔ لیکن صحن میں کہرام مچ گیا تھا۔ سامنے سے فائرنگ ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ایسی چیخ و پکار ہوئی کہ صحن میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ سب برآمدے کی جانب بھاگے تھے۔

بجا ور ہمت کر کے صحن میں اتر آیا تھا۔ اس نے لکڑی کا پھاٹک کھول دیا۔ پھر اگلے ہی لمحے پھاٹک سے باہر کی جانب بھاگ گیا۔ برآمدے سے کئی فائر ہوئے تھے۔ صحن میں پڑے لوگ چیخ رہے تھے۔ ان کی آہ و بکا نے ماحول کو بے حد خوفناک بنا دیا ہوا تھا۔ اس قدر فائرنگ کی آواز سے مویشی بھی ڈکارنے لگے تھے، بکریاں خوف زدہ آواز میں منمنا رہی تھیں۔ اچانک میں نے دیکھا، دیوار پر کوئی سایہ لہرایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چمکیلی آنکھیں ابھریں اور معدوم ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا۔ وہ کتا دیوار پر چڑھ کر مجھ تک آ پہنچا تھا۔ میں نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر اس پر فائر کر دیا۔ وہ کراہتا ہوا وہیں چھت پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ وہ کتا وفاداری میں مر گیا تھا۔

"کون ہو تم لوگ......؟" نیچے سے کسی نے پکارا۔ مگر کوئی ایسا بے وقوف نہیں تھا کہ اسے جواب دیتا، وہ آواز کی سمت فوراً فائر کر سکتے تھے۔

"میں انہیں پکا جواب دوں؟" آفتاب نے کہا۔

"ہاں دے دو۔" شعیب نے کہا۔

"کیا کرنے لگے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بس ایک ہینڈ گرینیڈ اندر پھینکنا ہے، پھر دیکھتے ہیں کیا کرتے ہیں۔" اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور پھر انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد دھپ کی ہلکی سی آواز برآمدے کے پاس ابھری اور پھر ایک دھماکہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی پھر کہرام مچ گیا۔ چیخ و پکار، آہ و بکا، اور شور کی آوازیں پھیل گئیں۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں فون کر دینا چاہئے۔" بختاور کی آواز ابھری۔

"ہاں کر دو، یہی مناسب موقعہ ہے۔" شعیب نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی دوستوں کی طرف سے خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد بختاور فون کر رہا تھا۔ وہ جندوڈا کو سمجھا رہا تھا کہ تم چاروں طرف سے گھیرے جا چکے ہو، ابھی جو کچھ ہوا، یہ محض وارننگ ہے۔ سانول تو ایک اکیلا مرے گا لیکن یہاں کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ اگر خود کو اور اپنے لوگوں کو بچانا چاہتے ہو تو سانول کو لے کر باہر آ جاؤ۔ وہ معلوم نہیں کیا جواب دے رہا تھا۔ کچھ منٹ بات کر کے بختاور نے کہا۔ "وہ مان نہیں رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ تم لوگ چلے جاؤ، وہ خود سانول کو چھوڑ دے گا۔"

"یار مجھے کانفرنس کال میں لو، میں اس سے بات کرتا ہوں۔" میں زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا تو میں نے بختاور کو فون کر دیا۔ کچھ لمحوں بعد جندوڈا بھی لائن پر تھا۔

"جندوڈا! تم نے مرنا ہے، یا زندہ رہنا ہے؟" میں نے پوچھا تو وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

"ہر کسی نے مرنا ہے، تم بھی ابھی مر سکتے ہو۔"

”چلو، پھر تیار ہو جاؤ، سانول کو مار کر باہر صحن میں پھینک دو، پھر میں دیکھتا ہوں، تم میں سے کون بچ کر جاتا ہے۔“ میں نے غصے میں کہا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”تم سانول کو اونٹ پر بٹھا کر جانے دو، میں وعدہ کرتا ہوں، ایک فائر کیے بغیر واپس چلا جاؤں گا۔ ہم پھر کسی دوسرے موقع پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ جائیں گے۔ اگر تم میرا سامنا کرنے کی خواہش رکھتے ہو تو۔“ میں نے اسی طرح غصے میں کہا تو ایک لمحہ کو سناٹا چھا گیا۔ لیکن صحن میں ہونے والی چیخ و پکار فون سے بھی آ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے، میں سانول کو باہر بھیجتا ہوں لیکن اپنے وعدے پر قائم رہنا۔“ اس نے کہا۔

”میں نے کہہ دیا سو کہہ دیا، صرف دو منٹ ہیں تیرے پاس۔“ میں نے جواباً کہا اور فون بند کر دیا۔ ہم سب الرٹ ہو گئے تھے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔

اگلے دو منٹ میں سانول صحن میں آ گیا۔ مدھم سی روشنی میں وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہیں ایک اونٹ تھا، سانول اس پر بیٹھ گیا۔ پھر اونٹ کو کھڑا کر کے وہ پھاٹک کی جانب چل دیا۔

”بختاور، دیکھو سانول آ رہا ہے، اسے سنبھالو۔“

”ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔

”دیکھنا، وہ ٹھیک ہے نا، کوئی ......“ میں کوئی مزید لفظ نہیں کہہ سکا۔ چند منٹ بعد اس کی آواز گونجی،

”سانول ٹھیک ہے۔“

”او کے، کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا،

”چلیں واپس۔“ شعیب نے کہا تو میں رینگتے ہوئے کچے کمرے کی پشت پر چلا گیا۔ وہ

کوئی دس بارہ فٹ کا رہا ہوگا، میں اس کے ساتھ لٹکا اور پھر ہاتھ چھوڑ دیئے۔ کچا کمرہ اور نیچے ریت ہونے کے باعث مجھے کچھ نہیں ہوا، میں تیزی سے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

☆......☆......☆

ہم فوری طور پر بستی بہادر خان کی جانب نہیں گئے۔ بلکہ سیدھا اسی بستی کی جانب بڑھے جہاں سے ہم نے اونٹ لئے تھے۔ وہاں ہم نے اونٹ واپس کئے اور گاڑیاں لے کر بستی بہادر خان کی طرف چل پڑے۔ میرا دماغ یہ بات مان ہی نہیں رہا تھا کہ جندوڈا نے اپنا نقصان کروا کر ساتول کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ اس کا دوسری بار نقصان ہوا تھا اور اس کے ساتھ جو ہزیمت اس نے اٹھائی تھی، اس کا بدلہ لینا بنتا تھا۔ زخمی شیر ہو یا زخمی سانپ، وہ پلٹ کر بدلہ ضرور لیتا ہے۔ یہی بات میں نے اپنے ساتھ بیٹھے شعیب سے کی تو اس نے سوچتے ہوئے کہا

"ایسا ہو سکتا ہے، دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہئے۔"

"میں اگر اس کی جگہ ہوتا تو لازمی پیچھا کرتا۔" میں نے کہا تو شعیب نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر تیزی سے بولا۔

"اوئے، وہ پیروزاں کے ڈیرے والے لوگ، وہ تم بھول رہے ہو، وہ ڈیرہ کس جانب ہے؟"

"ہم گھیرے جا سکتے ہیں۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

یہ سوچ آتے ہی میں ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ تبھی شعیب نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں پرسکون رہوں۔

ہم اس وقت دو گاڑیوں میں تھے۔ ہمارے گاڑی آگے تھی۔ شعیب نے گاڑی کا رخ موڑ لیا۔ تبھی پیچھے سے آفتاب نے فون کر کے پوچھا۔

”او خیر ہے، کدھر جا رہے ہو؟“

”ابھی ہم بستی بہادر خان نہیں جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”کیوں.... ؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا۔

”ہم تھوڑی دیر ان ٹیلوں پر بیٹھیں گے، گپ شپ کریں گے، پھر بستی میں جائیں گے۔“ میں نے کہا ہی تھا کہ وہ بولا۔

”یہ واہیات خیال کس کا ہے؟“

”میرا......“ میں نے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے بولا،

”مجھے تم سے ہی ایسی امید تھی چلو ٹھیک ہے۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ ایک بڑے سارے ٹیلے کے پیچھے کافی ساری جھاڑیاں تھیں۔ میں نے گاڑی ان کے درمیان میں لگا دی کہ پہلی نگاہ میں وہ دکھائی نہ دے۔ دوسری گاڑی بھی وہیں لگا کر ہم سکون سے ٹیلے پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔

رات میں صحرا کا سناٹا بھی بڑا عجیب ہوتا ہے، اگر کوئی رومانوی جوڑا ہو تو بڑا رومان پرور بن جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اگر چاندنی ہو تو اس رومان میں پاگل پن کی حد تک خمار بڑھ جاتا ہے۔ ایسے ہی اگر کوئی خطرہ ہو تو خوف ناکی اور وحشت زیادہ بڑھ جاتی ہے، چاندنی ہو تو دوسروں کی نگاہ میں آجانے کا ڈر پاگل پن کی حد تک پریشانی بڑھا دیتا ہے۔

ہم دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا خیال انہیں بتا دیا تو شعیب نے رسان سے کہا:

”دیکھو، ہم نے تو انہیں کچھ نہیں کہا تھا نا، انہوں نے خود سانول کو پکڑا بھی اور پھر ہمیں للکارا بھی۔ اب سانول کو واپس تو لانا تھا۔ وہ لے آئے ہم۔ اب اگر وہ ہم پر کسی طرح بھی

چڑھائی کرتے ہیں، ہمیں دفاع تو کرنا ہے، چاہے جیسے بھی کریں۔ اس لئے ابھی سے مت سوچو۔“

”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، لیکن الرٹ بھی تو رہنا چاہئے۔“ آفتاب نے کہا تو وہ بولا۔

”یار بات سن، یہ الرٹ تو ہم ہر وقت رہتے ہیں، چاہے سوئے ہوئے بھی ہوں۔ ہم سوچتے کچھ ہیں مگر ہو کچھ جاتا ہے۔“

”اس صحرا میں ہمارے چاروں طرف دشمن ہیں، کسی طرف سے بھی کچھ ہو سکتا ہے۔“ مدثر نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

”تو بس پھر سوچنا کس لئے، اگر انہوں نے حملہ کیا تو پھر دیکھا جائے گا۔“ شعیب نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو ہم نے وہ موضوع ہی چھوڑ دیا۔

رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ سب ٹیلے پر تھے۔ کبھی یوں لیٹے ہوئے تھے جیسے کسی آرام دہ بیڈ پر پڑے ہوئے ہوں۔ میں اور شعیب تھوڑے فاصلے پر بیٹھے یہی سوچ رہے تھے کہ دوراں کو یہاں لانے کے لئے کچھ کیا جائے یا پھر شہر جا کر ہی اسے اٹھایا جائے۔ ایسے میں کوئی دو کلومیٹر کے فاصلے پر چند گاڑیاں تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دیں۔ اب وہ نجانے کون تھے لیکن ہم پوری طرح چوکنا ہو گئے۔ شعیب نے ساتھیوں کو بتایا تو وہ سب اٹھ کر بیٹھ گئے۔ وہ گاڑیاں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ میں نے غور کیا، یہ کوئی عام راستہ نہیں تھا جس پر گاڑیاں بھگائے چلے آ رہے تھے۔ صحرا میں لوگ راستے کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ عام طور پر وہی راستہ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ اس طرح عام راستے سے ہٹ کر ہماری طرف ہی کیوں آ رہے ہیں؟

میرے اندازے کے مطابق، وہ چار پانچ گاڑیاں تھیں۔ وہ ذرا سا ٹیڑھا رخ لئے ہوئے

تھیں۔ اگر وہ اسی طرح چلتی رہتیں تو وہ ہمارے قریب سے گزر کر جا سکتی تھیں۔ اس دوران شعیب کو نجانے کیا سوجھی، اس نے تین لوگوں کو سامنے والے ٹیلے پر چلے جانے کو کہا۔ ان کی جیکٹوں میں ہر طرح کا اسلحہ تھا، جیسے ہمارے پاس تھا۔ ان میں مدثر کے پاس گن تھی۔ وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے سامنے والے ٹیلے پر چڑھ گئے۔ ذرا سی دیر میں وہ اندھیرے کا حصہ بن گئے تھے۔ لیکن ہم سب ایک دوسرے کے رابطے میں تھے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ اگر وہ ہمارے دونوں ٹیلوں کے درمیان سے گزر جاتے تو ہم نے انھیں چھیڑنا بھی نہیں تھا۔ ہاں اگر وہ ارد گرد کہیں رک کر ہم پر حملہ کرتے تو ہم نے جواب دینا تھا۔ کیونکہ ہمیں یہ تو پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ ہماری نگاہیں ان گاڑیوں پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ چلتے ہوئے آئے اور یوں ہمارے سامنے رک گئے کہ جیسے انھیں ہمارے یہاں ہونے کا یقین ہو گیا ہو۔ مدثر لوگ ہمارے دائیں جانب تھے، جب کہ وہ لوگ بالکل سامنے آ رکے تھے۔ وہ اس گزرگاہ پر نہیں آئے تھے، جس پر ہم توقع کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسری سمت پر رک گئے تھے۔

وہ پانچ گاڑیاں تھیں۔ ان میں سوار کتنے تھے یہ اندازہ بالکل نہیں تھا۔ انھیں وہاں رکے ہوئے پانچ سے سات منٹ گزر گئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی باہر نہیں نکلا تھا۔ صرف ایک گاڑی کی ہیڈ لائیٹ روشن تھی باقی نے لائیٹس بجھا لی تھیں، بس انڈیکیٹر روشن تھے۔

ہم بت بنے انھیں دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ ان کی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہو رہی تھی۔ اسی دوران اچانک سانول کا فون بج اٹھا۔ ہمیں لگا جیسے ہمارے درمیان کہیں بم پھٹ گیا ہو۔ یہ آواز ہماری نشاندہی کے لئے کافی تھی۔ سانول نے بڑی تیزی سے فون نکالا تو میں نے جھپٹ کر کال رسیو کر لی، بیل بجنا تو بند ہو گئی تھی۔ دوسری طرف سے کوئی اجنبی بول رہا

''یہ علی زین تمہیں خود یہاں بستی چراغ شاہ چھوڑ گیا تھا یا تم اکیلے آئے ہو؟ میں نے کوئی کار جیپ تو نہیں دیکھی نہ کوئی آواز آئی؟''

''وہ مجھے بستی سے کافی فاصلے پر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔'' سانول نے جواب دیا تو اس نے تیزی سے پوچھا۔

''یار یہ جتوڑا نے اچھا نہیں کیا تمہیں پکڑ کر، لڑائی اس کی علی زین کے ساتھ ہے اور پکڑا تمہیں؟''

''چل کوئی بات نہیں، میں بھی اس سے بدلہ لوں گا۔ یہ تھوڑا ہے اس کے بندے بھی مرے ہوں گے، زخمی بھی ہوئے۔'' سانول نے کہا۔

''یہ تو صبح پتہ چلے گا کہ کیا ہوا، خیر تم آرام کرو۔ میں صبح آؤں گا تمہارے پاس۔'' اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا اور کال بند کر دی۔ سانول نے فون کان سے ہٹایا۔ کال بند ہونے کا یقین کر کے اس نے فون کی کال ختم کی اور میری طرف دیکھنے لگا۔

''تمہیں سمجھ آ رہی ہے یہ کیا ہے؟'' شعیب نے دھیمے سے پوچھا۔

''سمجھ رہا ہوں، یہ سانول کا فون ٹریس کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ اب سمجھ جاؤ، ان کے پاس بھی جدید آلات ہیں۔ لازمی طور پر باہر سے بندے ان میں موجود ہیں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''کیا اب بیٹھے رہیں گے؟'' دوسرے ٹیلے پر موجود آفتاب کی آواز گونجی۔

''کھڑے رہیں، ہمارا کیا لیتے ہیں۔'' جہانگیر کی آواز آئی۔

''دیکھو، یہ کیا کرتے ہیں۔ اگر یہ اسلحہ لے کر نکلیں تو اس وقت تک کچھ نہیں کرنا جب تک کہ وہ ہمیں نشانہ نہ بنائیں، اگر......'' شعیب نے کہنا چاہا تو جہانگیر کی اکتاہٹ بھری آواز گونجی

"اوہ سمجھ گئے یار۔"

سب خاموش ہو گئے تھے۔ سامنے گاڑیاں اسٹارٹ کھڑی تھیں۔ حیرت ناک بات یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی نہیں نکلا تھا۔ جیسے انہیں یقین ہو کہ ہم یہیں کہیں آس پاس ہیں۔

"مجھے لگتا ہے، گاڑیوں سے کچھ لوگ اتر کر ہمیں ارد گرد تلاش ضرور کر رہے ہوں گے۔"

اچانک آفتاب نے کہا تو مجھے خیال آیا، ہم تو گاڑیوں کا ایک طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ ممکن ہے وہ دوسری طرف سے نکل کر ٹیلوں میں نکل گئے ہوں۔ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ گاڑیوں میں سے کوئی نہیں نکلا؟

"انہیں کیا پتہ ہم اس طرف ہیں اور انہیں دوسری جانب ہی نکلنا ہے۔ کوئی نہیں نکلا ابھی تک۔" جہانگیر کی آواز گونجی۔

انہیں وہاں کھڑے چند منٹ سے بھی زیادہ ہو گئے تھے۔ تبھی اچانک مجھے خیال آیا تو میں سانول کو سمجھانے لگا کہ وہ دوبارہ وڈو کو کال کرکے کیا کہے۔ سانول نے کال ملا دی۔ دوسری جانب سے اس نے کال ریسیو کر لی، تبھی سانول بولا۔

"یار، مجھے بڑا خوف آ رہا ہے، تم اگر نہیں سوئے ہو تو میرے پاس آ جاؤ یار، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"ابھی تم کہہ رہے تھے کہ میں نہ آؤں۔" اس نے اکتاہٹ سے کہا۔

"نہیں یار، ادھر آ گپ شپ کرتے ہیں تو...... اگر تم نہیں آ سکتے تو میں تمہاری طرف آ جاؤں؟" سانول نے پوچھا

"دیکھ یہاں تیرے دشمن ہیں۔ مجھے اب تک یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ علی زین تمہیں وہاں بستی میں کیوں چھوڑ گیا ہے؟ تم گھر رہو، میں آتا ہوں۔" اس نے کہا تو اپنی ہی بات میں بہت

بڑی غلطی کر گیا۔ اس نے لفظ 'وہاں' استعمال کر لیا تھا، ایک بار اس نے یہاں کہا اور دوسری بار وہاں، اس کا مطلب تھا کہ وہ یہاں ہمارے سامنے تھا۔ میں نے سانول کو فون بند کر دینے کا اشارہ کیا۔

"چل ٹھیک ہے آ جا۔" سانول نے کہا اور فون بند کر دیا۔

دو منٹ نہیں گزرے ہوں گے، گاڑیاں چل پڑیں۔ مجھے اگلی صورت حال کی بھی سمجھ آ گئی کہ کیا ہوگا۔ وہ گاڑیاں ہم سے کافی دور جا چکی تھیں، تبھی میں نے سانول کو سمجھایا کہ اب کس طرح کا فون آئے گا۔

ہم سب انتظار کرنے لگے۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ گاڑیاں تو نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں لیکن ڈلّو کا پھر فون آ گیا۔ اس نے بڑے غصے میں کہا۔

"سانول تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو، تم تو اپنے گھر پر ہی نہیں ہو۔ میں تمہارے گھر کے سامنے کھڑا ہوں۔"

"اگر یہی بات میں تم سے کہوں تو......؟" سانول نے کہا۔

"کیا مطلب......؟" اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے آنے میں اتنی دیر کر دی تو میں نے سوچا تمہاری طرف آ جاؤں، بھوک بھی لگی ہوئی ہے، بھابی کہتی ہے کہ تم رات سے ہی نہیں ہو گھر پر۔" سانول نے کہا، اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا سانول نے غصے میں کہا، "تم جھوٹ بول رہے ہو اور الزام مجھے دیتے ہو، اب اگر تم نے مجھے فون کیا تو...... مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، میں نے سانول سے پوچھا کہ اس کا کوئی قابل اعتبار

دوست ہے؟

”ہاں ہے، بولو؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”اسے کہو، ڈِٹو کو دیکھے، اس کی نگرانی کرے، صبح اسے ہر حال میں اٹھانا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ انہی گاڑیوں میں تھا۔“ میں نے یقین سے کہا۔

”میں ابھی اس کے ذمے لگاتا ہوں، وہ جان پر بھی کھیل کر ڈِٹو کے بارے میں بتائے گا۔“ سانول نے کہا اور فون نکال کر نمبر ملانے لگا۔

میری تشویش بڑھ گئی تھی۔ لوکیشن پر آنے کا مطلب یہی تھا کہ پیروزاں نے میرے مقابلے پر تربیت یافتہ لوگ بھیج دیئے تھے۔ کیا پیروزاں کی رسائی اس حد تک ہو گئی ہے کہ وہ اپنے ساتھ تربیت یافتہ لوگ رکھ سکے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا، جس سے پریشانی بڑھ گئی تھی۔ مجھے لگا پیروزاں تک پہنچنے کا فاصلہ بڑھ گیا ہے۔ اس نے جو دیوار اپنے اردگرد کھڑی کر لی تھی، اسے توڑنے میں وقت تو لگنا تھا۔

دن نکلنے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ جب سانول کے دوست کا فون آ گیا۔ اس نے وہی بتایا جو میرے ذہن میں تھا۔ کچھ دیر پہلے پیروزاں کے ڈیرے پر گاڑیاں آئیں تھیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد ڈِٹو ڈیرے سے نکلا تھا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا تھا۔

یہ آنکھ مچولی بڑی اعصاب شکن تھی لیکن اس میں بہت کچھ واضح ہو گیا تھا۔ پیروزاں نے یونہی چوہدری آصف کی بات نہیں مانی ہو گی۔ وہ میرے انتقام میں یا اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی۔

میری آنکھ کھلی تو دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ جہانگیر دوسری چارپائی پر پڑا تھا، باقی لوگ دوسرے ٹھکانے پر تھے۔ میں یونہی کسلمندی سے چارپائی پر پڑا ہوا تھا کہ بختاور کوپے میں

آ گیا۔ اس نے پہلے تو ہمیں یوں پڑے دیکھ کر واپس پلٹ جانا چاہا پھر مجھے جاگتا ہوا دیکھ کر میرے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"تم اتنی جلدی جاگ گئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، مجھے بابا نے جگالیا تھا۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"خیر تھی، کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"نہیں کوئی خاص نہیں، بس وہ ڈِٹو کو پکڑ کر لائے ہیں۔ سویا پڑا تھا گھر میں سے لے آئے ہیں اسے۔" اس نے بتایا۔

"کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم فریش ہو جاؤ، ناشتہ کرلو، پھر لاتا ہوں۔" اس نے کہا اور پھر اٹھ کر باہر کی جانب چلا گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ڈِٹو میرے سامنے تھا۔ ابھی تک اسے یہ بالکل نہیں بتایا گیا تھا کہ اسے کیوں لایا گیا ہے۔ جیسے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تھی، وہ تب سے خوف زدہ تھا۔ میں کچھ دیر تک خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر سرد سے لہجے میں پوچھا۔

"ڈِٹو، تم کس طرح مرنا پسند کرو گے؟"

"میں...... مرنا...... کیا ہو گیا...... مم...... میرا قصور......" وہ ایک دم سے ہکلاتے ہوئے بولا۔

"دیکھا، اب بھی میرے سامنے جھوٹ بول رہے ہو، میں جانتا ہوں کہ تم نے سچ تو بتانا نہیں، وفاداری نبھاتے ہوئے مرجانا قبول کرلینا ہے۔ اس لئے ہی میں نے سیدھے بھی پوچھ لیا کہ تم کس طرح مرنا پسند کرو گے؟" میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے سخت لہجے

میں کہا تو وہ ایک دم سے گھبرا گیا، پھر سید ھا میرے پاؤں پڑتے ہوئے گھبرا کر بولا۔

"جو پوچھو گے بتاؤں گا۔بس مجھے مارنا نہیں، وہ بھی مجھے ماردیں گے۔"

"چلو ابھی پتہ چل جاتا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے لمحہ بھر رک کر پوچھا، "رات تم کہاں تھے؟"

"وہ لوگ مجھے کئی دنوں سے استعمال کر رہے ہیں، رات بھی میں ان کے ساتھ روہی میں پھرتا رہا ہوں۔انہیں شک تھا کہ سانول تم لوگوں کے ساتھ ہے، وہ اس کے فون سے اسے تلاش کر رہے تھے۔وہ ایک جگہ پہنچ گئے تھے۔لیکن انہیں وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔" وہ فر فر بتانے لگا۔

"تم نے جو سانول سے کہا وہ سب جھوٹ تھا؟" میں نے پوچھا

"جی، سب جھوٹ تھا، وہ صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ ہے کہاں۔" اس نے تیزی سے بتایا۔

"جب وہ پہنچ گئے تھے کسی جگہ تب پھر انہوں نے سانول کو پکڑا نہیں؟" میں نے پھر دہرا کر سوال پوچھا۔

"وہ ایک جگہ رک گئے تھے۔ان کا بندہ انہیں کہہ رہا تھا کہ سانول یہیں کہیں ہے۔لیکن وہاں کچھ تھا ہی نہیں، اس لئے وہ واپس مڑ گئے۔" اس نے بتایا تو میں نے چند لمحے اس کے چہرے پر دیکھتے رہنے کے بعد پوچھا۔

"سانول کو اغواہ کروانے کے عوض انہوں نے تمہیں کیا دیا؟"

"رقم دی تھی جی، میں نے تو صرف انہیں اتنا بتایا تھا کہ وہ بستی بہادر خان جا رہا ہے۔یہی انہوں نے پوچھا تھا۔" اس نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

"کون لوگ ہیں وہاں پر......؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں جی، باہر سے آئے ہیں دو بندے، وہ بنگا راجستانی کے ساتھ آئے ہیں۔ وہی سب پر حکم چلاتے ہیں۔ باقی سترہ بندے ہیں، جو یہیں کہیں کے ہیں۔"

"بنگا راجستانی، وہی، جو زُلّو بھوبڑ کے ساتھ تھا؟"

"ہاں جی ہاں جی وہی، وہ تمہارے بڑا اخلاف ہے۔" اس نے بتایا۔

"ان کے پاس کوئی مشینیں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کیا کیا ہے ان کے پاس، اسلحہ بڑا ہے ان کے پاس۔" اس نے بتایا تو مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

"وہ دو بندے بارڈر پار سے آئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی، وہ بھی راجستانی لگتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"تمہیں پتہ ہے نا ساول کو انہوں نے مار دینا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اب...... میں کیا......" وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"اب تم ایسے کرو، جاؤ، میں تمہیں کچھ نہیں کہتا، وہاں جو چاہو جھوٹ سچ بول دو، میں تمہیں مارتا نہیں۔ لیکن آئندہ......" میں نے کہنا چاہا تو وہ سیدھا میرے پاؤں پڑ گیا۔ اسے مارنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے اسے جانے دیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ پیر وڑائں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ بنگا راجستانی جو کل تک اس کا بھی دشمن تھا، وہ سب اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا، جب قسمت یاوری کرتی ہے یا پھر بہت زیادہ حوصلہ۔ میں نے سب کچھ حالات پر چھوڑ دیا۔

☆......☆......☆

دوپہر ہو چکی تھی۔ میرے پاس پیروزاں کے ڈیرے کی کافی ساری معلومات آ چکی تھی۔ ڈوّ نے جو کچھ بتایا تھا وہ درست ثابت ہوا۔ ندیم ڈانڈیا گینگ کے لوگ جیسلمیر سے یہاں تک آن پہنچے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ ندیم ڈانڈیا کی محبت میں یہاں تک نہیں آئے تھے۔ انہیں یہاں بھیجا گیا تھا۔ انہیں کس نے بھیجا تھا، اس بارے ابھی کوئی نام سامنے نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ نام زیادہ دیر تک اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کی راہنمائی بنکا راٹھسانی نے کی تھی۔ وہ تب سے یہیں تھا، جب میرا اور اس کا سامنا ہوا تھا۔ انہوں نے کافی سارے مقامی غنڈے اور جرائم پیشہ افراد کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ بظاہر وہ پیروزاں کی مدد کو یہاں آگئے تھے لیکن اصل میں وہ سب میرے خون کے پیاسے تھے۔

میں چاہتا تو چاچا عبدالمجید سے مدد لے سکتا تھا لیکن میں نے انہیں جان بوجھ کر فون نہیں کیا۔ ایسے وقت میں جبکہ میں چوہدری آصف کو ختم کر دینے لگا تھا اسے کیوں میرے ہاتھ سے بچایا گیا؟ یہ میری سوچ تھی کہ اگر اسے بروقت ختم کر دیا جاتا تو روہی میں کسی کی جرأت نہیں تھی کہ وہ سامنا کر سکے۔ یہاں پر اگر پولیس گردی بھی ہوئی تھی تو وہ چوہدری آصف کی وجہ سے۔ روہی میں ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک جو چھوٹے چھوٹے جرائم پیشہ نام نہاد حاکم بنے ہوئے تھے۔ ان کی سرپرستی کرنے کے لئے وہ شہر میں بیٹھا تھا۔ اس کا تو اتنا ہی قصور ناقابل معافی تھا کہ وہ لوگوں پر ظلم کرنے والوں کی پشت پناہی کرتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ چاچا عبدالمجید نے ایسا کیوں کیا تھا؟ ظاہر ہے چوہدری آصف سے ان کا کوئی مفاد وابستہ ہوگا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن چاچا یہ چاہتے تھے کہ میں پیروزاں کو بھول کر واپس لاہور چلا جاؤں۔ میں ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں اب اس عورت کو معافی نہیں دے سکتا تھا۔ ہو سکتا ان کے خیال میں یہ بھی ہو کہ میں ان کی بہت دفعہ حکم عدولی بھی کر

چکا ہوں۔ وہ مجھے بہت دفعہ واپس آنے کا کہتے رہے لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی۔ وہ مجھے بتانا چاہتے تھے، یہ احساس دلانا چاہتے تھے وہ میرے بارے میں پل پل کی خبر رکھتے ہیں اور چاہئیں تو مجھے کچھ بھی نہ کرنے دیں۔ سو اس سے پہلے کہ وہ مجھے کوئی مدد دینے سے انکار کر دیں۔ شعیب لوگوں کو واپس بلا لیں، میں نے اس سے بات ہی نہیں کی۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ انہوں نے مجھے کال نہیں کی تھی۔ میں نے اسے بھی حالات کی ستم ظریفی سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔

میں اسی سوچ بچار میں پڑا رہا، نجانے کہاں کے قلابے کہاں ملا دیئے۔ سوتے، جاگتے اور سوچتے ہوئے سہ پہر ہو گئی۔ میں اٹھا اور شعیب لوگوں کے پاس چلا گیا۔ وہ ایک کچا گھر تھا، جس میں تین چار کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ بھی برآمدے میں بیٹھے گپیں لگا رہے تھے۔ بختاور بھی وہیں تھا۔ میں نے جاتے ہی انہیں پیر وڈاں کے ڈیرے کی وہ صورت حال جو مجھے معلوم ہوئی تھی انہیں بتا دی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ میں جب کہہ چکا تو شعیب بولا۔

"حالات تو اچھے خاصے گمبھیر ہو گئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ اتنے ہی طاقت ور ہیں، تو اب تک ہم پر حملہ کیوں نہیں کر سکے؟"

"رات وہ ہمیں تلاش کرنے نکلے تو تھے۔ اگر ہم انہیں مل جاتے تو کیا وہ ہمیں معاف کرتے؟" یہ کہہ کر میں نے اس کے چہرے پر دیکھا، پھر لمحہ بھر رک کر بولا، "یا یہیں بستی سے انہیں یہ خبر مل جاتی کہ ہم بستی میں ہیں تو وہ ہم پر چڑھ دوڑتے۔ کچھ ہے جس کی وجہ سے وہ ابھی رُکے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیے؟" بختاور نے کہا۔

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا، کیونکہ میں براہ راست ان سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ ان کا کیا ارادہ ہے۔ اب تک وہ اگر میرے ساتھ تھے تو

ابھی چاچا عبدالمجید کی ہدایت تھی تو وہ میرے ساتھ تھے۔ اگر ابھی انہیں ایک فون کال بھی مل جاتی کہ وہ واپس آجائیں تو انہوں نے مجھ سے پوچھنا بھی نہیں تھا اور وہ واپس چلے جاتے۔ مجھے یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اگر یہ شعیب لوگ واپس چلے گئے تو پھر میں اور بجناور رہ جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہم پر کوئی بھی افتاد پڑتی تو ہم نے اس کا سامنا کرنا تھا، ہم پیچھے ہٹنے والے تو نہیں تھے۔ شعیب لوگوں کے ساتھ یہ آسرا تھا کہ وہ تربیت یافتہ لوگ تھے اور لڑنے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ اب ہمارا سامنا بھی ایسے لوگوں سے تھا جو لڑنے کا فن جانتے تھے۔ حالات اس نہج پر آگئے تھے کہ ہمیں دشمن کو ہر حال میں ختم کرنا تھا، دوسری صورت میں ہمیں ختم ہو جانا تھا۔

''یار علی، تم گھبراؤ مت، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اگر وہ کچھ نہیں کر رہے تو ہمیں بھی خاموش نہیں بیٹھنا چاہئے۔'' آفتاب نے حوصلہ مند لہجے میں کہا۔

''اس سے پہلے کہ وہ ہم پر حملہ کریں، اگر وہ ہماری رینج میں آجاتے ہیں تو ہم انہیں ختم کر دیتے ہیں۔'' جہانگیر نے سرد لہجے میں کہا۔

''اب تو بنتا ہے یار، کوئی بارڈر پار سے آکر ہمیں ہی مارنا چاہتا ہو، اسے تو بچ کر نہیں جانا چاہئے۔'' مدثر نے کہا تو سب نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بڑا اہم نکتہ کہہ دیا تھا۔

''بجناور، تم بستی چراغ شاہ کی ساری معلومات لو، اگر ہم ان پر حملہ کر سکتے ہیں تو ٹھیک ورنہ وہ جو دو بارڈر پار سے آئے ہیں، پہلے انہیں ہی دیکھ لیا جائے۔ کیا خیال ہے؟'' شعیب نے ایک دم سے کہا تو سب نے اس کی تائید کر دی۔ پھر وہیں بیٹھے باتیں کرتے، کھانا کھاتے ہوئے شام ڈھل گئی۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ میں اور آفتاب کوپے کی طرف جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ ایسے میں بختاور کا فون بجا۔ اس نے اسکرین پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''باباسائیں کا فون ہے۔'' میں رُک گیا۔ ہم سب بختاور کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتا رہا، پھر سیل فون بند کرتے ہوئے غصے میں بولا۔ ''باباسائیں کو ابھی جندوڈا کا فون آیا تھا۔ وہ دھمکی دے رہا تھا کہ وہ آج رات بستی بہادر خان کو گھیرے گا۔ اگر باباسائیں ہم دونوں کو ان کے حوالے کر دیتا ہے تو پھر نہیں۔''

''کیا جندوڈا اب مذاق بھی کرنے لگا ہے؟'' شعیب نے غصے میں کہا۔

''شعیب تم سمجھو، یہ مذاق نہیں، سازش ہے۔ وہ کہتا کچھ اور کرتا کچھ اور چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس کچھ سازشی ذہن والے آ گئے ہیں۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ سوچنے لگا۔

''اور وہ اتنا پاگل بھی نہیں ہوسکتا کہ سیدھے دھمکی لگائے۔ وہ اب اتنی قوت نہیں رکھتا کہ ہم سے لڑ سکے وہ اپنا بہت نقصان کروا چکا ہے۔ اس کے پیچھے بیٹھے لوگوں نے اسے تحفظ دیا ہے تو اب اسے ہی سامنے کر کے......'' شعیب نے سمجھانا چاہا تو آفتاب اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''او یار، تم لوگ یہیں بیٹھے باتیں بنا رہے ہو، پاگل کتے کا صرف ایک ہی علاج ہے اسے مار دو۔''

اس نے کہا تو سب نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا، تبھی شعیب نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار، کب تک سامنے کرنے کا انتظار کیا جائے گا، جو کرنا ہے کر دو۔''

''لیکن احتیاط سے......'' میں نے کہا۔

''اس بستی سے باہر نکلیں پھر سوچتے ہیں کیا کرنا ہے، چلو۔'' آفتاب نے کہا، وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم بستی سے باہر آ چکے تھے۔

☆......☆......☆

ہم بستی چراغ شاہ سے تھوڑی دور پہنچ چکے تھے۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہم نے گاڑیاں جھاڑیوں میں کھڑی کر دیں۔ ہم تین تین کی ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ ہم نے یہ طے کر لیا تھا کہ جو کچھ بھی ہو جائے، آج ہی روزاں کے ڈیرے پر دھاوا بولنا ہے۔ وہاں کیا ہوتا ہے یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ جوڑ لیا تھا۔ ڈیرے کے بالکل سامنے ایک اونچا ٹیلہ تھا۔ جس پر سے سارا ڈیرہ تو نہیں دیکھا جا سکتا تھا لیکن تھوڑا بہت اندر کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ میرا خیال یہی تھا کہ وہاں تک پہنچیں اور پھر ڈیرے کا اندازہ کر کے الگ الگ ہو جائیں۔ ہمارا مقصد وہاں دھاوا بولنا تھا، بس مار دو اور بھاگو۔ اس طرح انہیں اپنی دھمکی کا جواب مل جاتا۔

سانول نے ایک آدمی ڈیرے پر بھیجا تھا۔ مگر اس نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اگر خود گیا ہوتا تو بہتر معلومات مل سکتی تھیں۔ ہم اندھیرے میں بڑی احتیاط کے ساتھ اس ٹیلے پر لیٹ چکے تھے۔ ہمارا اور ڈیرے کا فاصلہ یہی کوئی آدھا کلومیٹر ہوگا۔ ڈیرے کے اندر روشنی تھی۔ ہم ابھی اندازہ لگا ہی رہے تھے کہ ایک دم سے اندر روشنی زیادہ ہو گئی۔ پھر اس سے زیادہ روشنی ہو گئی۔ اگلے چند منٹ میں پھاٹک کھلا اور یکے بعد دیگرے تین گاڑیاں باہر نکل آئیں۔ ان کے رخ کا اندازہ کرتے ہی بختاور نے بے ساختہ کہا۔

''یہ کیا، یہ تو واقعی ہی......''

"ٹھہرو، میں انہیں گھیرتا ہوں۔" میں نے کہا اور اپنا سیل فون نکال کر چندوڈا کو کال کر دی۔ دوسری یا تیسری بیل پر اس نے کال ریسیو کر لی۔ اس کی آواز سن کر میں نے کہا۔

"چندوڈا، تم نے چاچا سائیں کو فون کر کے دھمکی دی ہے کہ......" میں نے کہنا چاہا تو اس نے فوراً حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں، کہا ہے اور سن لو، اب تمہیں ہم سے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

"اتنا بڑا بول نہیں بولتے میری جان، میں تو خود تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے بھی حقارت ہی سے کہا میرا پورا دھیان کال کے پس منظر میں ابھرنے والی آوازوں پر تھا۔

"تو پھر یوں فون کیوں کیا؟" وہ غصے میں بولا۔

"صرف تمہیں یہ بتانے کے لئے مجھے علم ہو چکا ہے کہ ڈیرے سے گاڑیاں نکل چکی ہیں۔ اگر تم ان گاڑیوں میں ہو، اور میری طرف ہی آ رہے ہو تو میں تمہارا استقبال بستی سے باہر کروں گا۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا تو اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ معلومات تم مجھے کیوں دے رہے ہو؟"

"صرف اس لئے کہ تم دھمکی لگا کر آ رہے ہو۔ میں بھی تمہیں پہلے بتا دوں کہ میں تمہارا منتظر ہوں۔ اب دلیری دکھاؤ اور فوراً مجھ تک پہنچو۔" میں نے کہا ہی تھا وہ خاموش ہو گیا۔ میری نگاہ ان گاڑیوں پر تھی، وہ بستی چراغ شاہ پار کر چکی تھیں۔ میں فون کان سے لگائے بیٹھا چندوڈا کی آواز کا منتظر تھا۔ وہ کسی سے بات کر رہا تھا، پھر چند لمحے بعد اس کی آواز ابھری۔

"انتظار کر، میں آ رہا ہوں۔"

"مجھے اپنا منتظر پاؤ گے۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

یہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ گاڑی میں تھا۔ ڈیرے پر کون تھا، یہ جاننا بھی بہت ضروری تھا۔

”وہ بستی بہادر خان ہی جا رہا ہے۔“ میں نے کہا تو کئی آوازیں ابھریں۔

”چلو ان کا پیچھا کریں۔“

”کیا پہلے ڈیرے میں ......“ میں نے کہا تو شعیب بولا۔

”ہاں ڈیرے پر بھی، اب نکلو، وقت نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور ہم ٹیلے سے اٹھ کر اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگنے لگے۔ ہمیں گاڑیوں تک پہنچنے میں تقریباً پانچ منٹ لگے تھے اور پھر وہاں سے ڈیرے پر پہنچتے ہوئے دس منٹ ہو گئے۔ سانول نے جو بندہ ڈیرے پر بھیجا تھا، اس نے اب تک کوئی پتہ نہیں دیا تھا۔ ٹیلے سے ڈیرے تک شعیب نے ایک پلان دے دیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ کیا کرنا ہے۔ میری گاڑی آگے تھی اور شعیب میرے پیچھے۔ دونوں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بند تھیں۔ ڈیرے کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ میں نے تیزی سے گاڑی اندر داخل کی تو میرے پیچھے بیٹھے مدثر اور جہانگیر اپنی گنوں سے فائرنگ کرنے لگے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سامنے چارپائیوں پر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ہی ایسا شخص تھا، جس نے پتلون اور شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر اوٹ میں ہوتے ہوئے پسٹل نکال چکا تھا لیکن میں نے اسے تاک کے نشانے پر لیا تھا۔ میں نے دھیان یہ رکھا تھا کہ وہ فوری طور پر مرنے نہ پائے۔ وہاں چیخ و پکار مچ گئی تھی۔ کوئی چارپائی کے نیچے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا، کوئی دیوار پھاندنے کے چکر میں گر پڑا تھا۔ دو چار ایسے تھے جو رہائشی حصے کے چھوٹے دروازے سے جانا چاہتے تھے لیکن انہیں بھی نشانہ بنا لیا گیا تھا۔

فائرنگ کا یہ سلسلہ دو منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ ان کے گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ہم یوں بھی ڈیرے پر حملہ کر سکتے ہیں۔ یکلخت خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ میں حیران تھا کہ سامنے سے کسی دوسرے نے فائر کیوں نہیں کیا تھا۔ میں گاڑی بڑھا کر آگے چارپائیوں تک لے گیا۔

میں گاڑی سے اترا، مجھے علم تھا کہ میرے کور پر دو لوگ ہیں۔ میں سیدھا اس پتلون والے کے پاس گیا، اس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ میں نے اسے گردن سے پکڑا اور گھسیٹ کر گاڑی کے پاس لے آیا۔ میں نے اس کے چہرے کو سیدھا کر کے پوچھا۔

”بول، مرنا ہے یا زندہ رہنا ہے؟“

”کون...... ہو...... تم؟“ اس نے سوال کیا۔

”وہی جسے تم مارنے راجھستان سے یہاں آئے ہو۔“ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا تو چونک گیا۔ مجھے جواب مل چکا تھا کہ وہ کون ہے، میں نے اس کی جیب میں سے سیل فون نکالا اور کہا، ”اپنے لوگوں کو بتا دو۔“

”تم...... بچو گے...... نہیں۔“ اس نے کہا تو میں نے پسٹل سیدھا کر کے نال اس کے ماتھے پر رکھ دی، پھر بولا۔

”تم نہیں تو میں بتا دوں گا۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے فائر کر دیا، وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ چونکہ ہمارے پاس وقت نہیں تھا اس لئے میں نے وہاں پر چیختے سسکتے ہوئے لوگوں سے اونچی آواز میں کہا۔

”اب تک جو ہونا تھا وہ ہو گیا، اب جو بھی اس ڈیرے پر ہمارے خلاف اکٹھا ہوگا، وہ ہمارا دشمن ہم سے بچ نہیں پائے گا۔ وہ چاہے کوئی بھی ہو۔“

یہ کہتے ہی میں واپس گاڑی میں بیٹھا اور تیزی سے نکلتا چلا گیا۔

میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ان تک ہماری اس کارروائی کی اطلاع پہنچ جاتی ہے۔ لیکن میں مطمئن تھا، دشمن پر خوف طاری ہو جانے کا مطلب آدھی جنگ جیت لینے کے مترادف تھا۔

ہماری پوری کوشش تھی کہ ہم جلد از جلد بستی بہادر خان تک پہنچ جائیں۔ بختاور نے چاچا

سائیں کو سب بتا دیا تھا۔ وہ لوگ ان کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھے۔ بختاور نے چاچا سائیں سے مسلسل رابطہ رکھا ہوا تھا۔ اس وقت ہم بستی کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے، ہماری رفتار تھوڑی زیادہ تھی۔ گاڑی کی روشنی بھی دھیمی تھی۔ میں محتاط انداز میں جا رہا تھا کہ اچانک ہماری گاڑی پر برسٹ پڑا۔ ایک لمحے سے بھی کم وقت میں سمجھ آ گئی کہ وہ ہماری گھات لگائے بیٹھے ہیں۔

''حملہ ہو گیا ہے۔'' میں نے تیزی سے کہا، اس کا مطلب تھا کہ پیچھے والے بھی جان جائیں۔ میری تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر تھی، اس لئے یہ دھیان نہیں دے پایا کہ یہ برسٹ آیا کس طرف سے تھا۔ میں رکا نہیں بلکہ تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ تبھی پیچھے سے فائر ہونے لگے۔ اچانک میری نگاہ دائیں جانب ٹیلے پر پڑی، نال سے نکلتا ہوا شعلہ ان کی نشاندہی کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اوپر ٹیلے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں وہاں رکا نہیں کیونکہ وہاں رکنے کا مطلب تھا کہ خود کو موت کے حوالے کر دیا جائے۔ میرا اندازہ تھا کہ جس رفتار سے میں چل رہا تھا، آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں ہم ان کی رینج سے باہر جا سکتے تھے۔ اس لئے میں ان کی رینج سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ میں ڈرائیو کرتا رہا، میرے پیچھے بیٹھے مدثر اور جہانگیر اپنی گنوں سے فائر کرتے چلے جا رہے تھے۔ فائرنگ کا یہ تبادلہ بڑا شدید تھا۔ میں جانتا تھا کہ جب تک ہم گاڑی میں ہیں، ہم ان گولیوں سے محفوظ ہیں۔ اگرچہ ہماری گاڑیاں کوئی بلٹ پروف نہیں تھیں، لیکن پھر بھی کافی حد تک محفوظ ہی تھیں۔ مجھے ڈر صرف یہی تھا کہ اگر ٹائر برسٹ ہو گیا تو پھر ہمیں مجبوری میں رکنا پڑے گا۔

''آفتاب، تم محفوظ ہو؟'' میں نے چیختے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ہاں، سب ٹھیک...... بس نکلو......'' اس نے تیزی سے کہا۔

ہم آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں کافی دور آ گئے تھے۔ ان کی طرف سے اب بھی فائر ہو رہا تھا لیکن ہم نے فائر بند کر دیا تھا۔ میں اپنے گاڑی کو ایک ٹیلے کی اوٹ میں لے گیا۔ رکتے ہی ہم گاڑیوں سے اترے اور جھاڑیوں میں سے ہوتے ہوئے ٹیلے پر چڑھ گئے۔ شعیب بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر پہنچ گیا تھا۔

''اب دیکھتے ہیں یہ کیا کرتے ہیں؟'' جہانگیر کی آواز ابھری۔

''پہلے یہ دیکھ لو اچھی طرح ان سب کی پوزیشن کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ایک ایک گولی حساب سے خرچیں گے جناب، فکر نہ کرو۔'' مدثر چہکا تو ایک دم سے فضا میں تناؤ کم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

''یار ہم یہاں اور وہ کچھ بستی میں نہ پہنچ گئے ہوں؟'' جہانگیر نے خیال ظاہر کیا تو بختاور کی فوراً آواز آ گئی۔

''نہیں نہیں، وہ ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں۔ گئے بھی چلے تو وہ سنبھال لیں گے، تم ان کی فکر کرو۔''

''او کے، سامنے دیکھو۔'' شعیب نے کہا۔

اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کی گاڑیاں تک نگاہ سے اوجھل تھیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان کی گاڑیاں وہاں پر نہیں تھیں۔ جس طرح ہم چھپ کر ان کے لئے گھات لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ بھی انہی ٹیلوں پر موجود تھے۔ وہ فائرنگ کر کے بھاگے نہیں تھے یہیں کہیں تھے۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اگر وہ بھاگے ہوتے تو ان کی گاڑیوں کی آواز ضرور سنائی دیتی۔

مجھے یہ خیال آنے لگا کہ اگر ایک بندہ دور دور سے ہوتا ہوا، ایک چکر لگا لے تو ان کے

بارے میں پتہ چل سکتا ہے کہ وہ کہاں ہیں، ان کی پوزیشن کیا ہے، یہ بھی اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ کتنے لوگ ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں چونک گیا، ممکن ہے یہی حربہ وہ ہمارے ساتھ بھی آزما سکتے ہیں۔ میں نے فوراً سب سے خیال شیئر کیا تو وہ چوکنا ہو گئے۔ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے مدثر نے پیچھے کی طرف نگاہ رکھ لی۔ ممکن ہے کوئی ہمارے عقب سے ہی نہ دھاوا بول دے۔ جہانگیر نے یہ صلاح دی کہ ابھی خاموشی سے بیٹھے رہو اور دشمن کے اعصاب دیکھو۔ وہ خود ہی اپنا آپ ظاہر کر دے گا۔ سب ہی کو اس کا خیال پسند آیا تھا۔ واقعتاً یہ اعصاب ہی کی جنگ تھی۔ ہمیں تو پتہ تھا کہ انہوں نے کہاں گھات لگائی ہوئی ہے۔ انہوں نے ہم پر فائرنگ کر کے اپنی نشاندہی کر دی تھی۔ لیکن ہم تو ان کے سامنے سے گزر کر گئے تھے اور پھر اچانک غائب ہو گئے۔ یہ پریشانی ان پر مسلط ہو سکتی تھی۔

دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر گیا تھا۔ سامنے سے کوئی ایسی حرکت نہیں ہوئی تھی جس سے ان کے بارے میں پتہ چلتا۔ یہاں تک کہ میرے دماغ میں یہ سوچ آنے لگی کہ کہیں وہ سب فرار تو نہیں ہو گئے۔ اس سوچ کے ساتھ ہی خیال ابھرا کہ اگر میں ایسا سوچ سکتا ہوں تو کیا وہ ایسا نہیں سوچ سکتے؟؟ ابھی مزید انتظار کرنا ہوگا۔ ایسے میں بختاور کی آواز گونجی۔

”شعیب اگر کہو تو میں ساتھ والے ٹیلے پر جا کر انہیں دیکھوں؟“

”رسک ہے یار۔“ وہ فوراً بولا۔

”لیکن یوں پڑے رہنے سے......“ اس نے کہنا چاہا تو آفتاب نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا

”صبر میاں صبر.... آخر دن بھی تو نکلنا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ اس وقت تک یہاں بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ سمجھو کہ وہ زیادہ لوگ ہیں۔“

”کہہ تم ٹھیک رہے ہو۔“ جہانگیر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"بالفرض محال اگر ہمیں ان کی گاڑی جاتی ہوئی دکھائی دی تو ہم کیا کریں گے؟" مدثر نے سوچتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں، یار زیادہ سے زیادہ فائر کر سکتے ہیں، جس سے ہماری پوزیشن انہیں سمجھ میں آ جائے گی۔ گاڑی کا تو کچھ نہیں ہوگا۔" جہانگیر نے کہا۔

"دستی بم بھی ان تک نہیں پہنچ سکتا۔" مدثر بولا۔

"ریت پر دستی بم پڑا تو شاید اتنا موثر نہ ہو اگر سیدھا گاڑیوں پر پڑے تو انہیں نقصان ہو سکتا ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"کاش اس وقت میرے پاس بندوقہ ہوتی تو......" جہانگیر نے کہا۔

"اس کاش کو چھوڑو، ہمیں وقت نہ کچھ تو کرنا ہوگا، ایسا نہ ہو کہ ہم یہاں پڑے رہیں اور وہ یہاں سے چلے بھی جائیں۔" مدثر نے کہا۔

"مطلب، کیا کرنا ہوگا؟" شعیب نے پوچھا۔

"میری بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا، وہ اگر ہمارے بھی سامنے گاڑیوں میں بیٹھ کر نکل پڑے تو ہم کیا کریں گے؟ پھر بھی تو فائرنگ آگے جا کر کرنی ہے۔ کیوں نہ......" اس نے کہنا چاہا تو بختاور بولا۔

"چل ہم دونوں آگے بڑھتے ہیں۔"

"چل......" وہ فوراً تیار ہو گیا۔

وہ دونوں اپنے اپنے ٹیلے سے نیچے اترے۔ بختاور وہیں کھڑا رہا، یہاں تک کہ مدثر اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے ہم سب کے دائیں جانب ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ یہ انہوں نے تیسرا ٹھکانہ بنانا چاہا تھا۔ ہر ٹیلے پر دو دو بیٹھے ہوئے تھے۔ ہماری تمام تر توجہ ان کی

طرف تھی۔ وہ جیسے ہی سرے پر پہنچے، بختاور کی دبی دبی آواز گونجی۔

"میں اپنے سامنے، بالکل سامنے ان کی تینوں گاڑیاں دیکھ رہا ہوں۔"

"اوہ......" تقریباً سب کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"بختاور، تم ذرا سا صبر کرو، ہم آ رہے ہیں۔" میں نے کہا اور تیزی سے اٹھ کر ٹیلے سے اترنے لگا۔ جہانگیر میرے پیچھے آنے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم سارے اسی ایک ٹیلے پر موجود تھے۔ سامنے پوری طرح گاڑیاں دکھائی نہیں دے رہی تھیں، بلکہ ایک گاڑی کے اندر ننھا سا بلب روشن تھا۔ وہ انہوں نے جان بوجھ کر روشن رکھا تھا یا پھر وہ بھول گئے تھے۔

"اب ہمیں دن کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر......" شعیب کہتے کہتے رک گیا۔ پھر وہ اپنا پلان بتانے لگا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہم چپ سادھے سنتے رہے۔ جب اس نے ڈن کیا تو مدثر اور آفتاب ٹیلے کی پچھلی طرف اترنے لگے۔ انہوں نے اپنی گاڑیوں تک جانا تھا۔ مجھے اور بختاور کو ٹیلے کے سامنے کی طرف سے رینگ کر اترنا تھا۔ جیسے ہی وہ دونوں گاڑیوں تک پہنچے، میں اور بختاور ٹیلے کے سامنے سے اترنے لگے۔ ہم بہت محتاط تھے۔ ہمارے عقب میں شعیب اور جہانگیر کور پر تھے۔ تقریباً تہائی کلومیٹر کا فاصلہ ہم نے آدھے گھنٹے میں طے کیا۔

ہم گاڑیوں سے دس بارہ فٹ کے پاس پہنچے تھے کہ ہمیں ہوا کے دوش پر باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ کافی سارے لوگ تھے۔ اتنے لوگ بڑی مشکل سے خاموش رہ سکتے تھے۔ مجھے ان کی سمت کا اندازہ ہو رہا تھا لیکن میں ان پر فائرنگ نہیں کر سکتا تھا ورنہ سارا کھیل ہی بگڑ جاتا۔ ہم نے یہ دس بارہ فٹ کا فاصلہ انتہائی احتیاط سے عبور کیا تھا۔ تینوں گاڑیاں ساتھ ساتھ

ہی کھڑی تھیں۔ میں نے ہولے سے کہا۔

''میں گاڑیوں کے پاس پاس پہنچ چکا ہوں۔ بختاور......''

''میں تیار......'' اس نے کہا تو میں نے جیب میں پڑا دستی بم نکالا، بلاشبہ بختاور نے بھی نکال لیا ہوگا۔ تبھی میں نے کہا۔

''ایک......دو......اور تین......''

میں کھڑا ہوا، دستی بم کی پن کھولی اور اسے گاڑی میں اچھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں جتنی تیزی سے ہو سکتا تھا میں مخالف سمت میں بھاگا۔ میں تھوڑے سے فاصلے پر ہی تھا کہ زوردار دھماکا ہوا، اس کے ساتھ ہی دوسرا دھماکا ہو گیا۔ میں اس دھماکوں کے اثر کی وجہ سے منہ کے بل گرا۔ لیکن اگلے ہی لمحے میں اٹھا اور تیزی سے بھاگنے لگا۔ اسی وقت فائرنگ شروع ہو گئی۔ میرا نہیں خیال کی دو گاڑیوں کے دھماکے میں تیسری گاڑی نہ جلتی۔ روشنی ہوئی ہوگی، لوگ گاڑیوں کی جانب بھاگے ہوں گے تو شعیب کو روشنی میں لوگ دکھائی دے گئے تھے۔ اس نے بھی فائرنگ کرنا شروع کر دی تھی۔ یہ فائرنگ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ منٹ ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

میں بھاگتا ہوا ٹیلے کے پاس پہنچ چکا تھا۔ دونوں گاڑیاں وہاں تک آ چکی تھیں۔ میں ان میں بیٹھ گیا تو سامنے سے بختاور بھی بھاگ کر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اوپر سے شعیب اور جہانگیر بھی آ گئے، ہم گاڑیوں میں بیٹھے اور ایک طرف نکل پڑے، ہم ابھی تھوڑا سا چلے تھے کہ ہیڈ لائیٹس کی روشنی میں کچھ لوگ بھاگتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جیسے ہی ان پر روشنی پڑی، وہ دیوانہ وار بھاگنے لگے۔ ہماری گاڑیوں میں سے ان پر فائرنگ ہونے لگی۔ کوئی گر گیا، کوئی بھاگ رہا تھا، کوئی دائیں بائیں ہو گیا۔

میں جانتا تھا کہ بہت سارے لوگ جھاڑیوں میں چھپ گئے ہوں گے۔ ہم تھوڑی دیر تک وہاں پھرتے رہے۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں سے ہم پر فائرنگ ہوگی۔ ہماری جلتی ہوئی ہیڈ لائٹس ہماری نشان دہی کر رہی تھیں۔ میں بھی اس خدشے کے بارے میں جانتے تھے۔ اچانک شعیب نے کہا۔

"علی، کیا خیال ہے، ہم کیوں نا سیدھے بستی چراغ شاہ جائیں اور پیروزاں کے ڈیرے پر قبضہ کرلیں؟"

"بہت اچھے......" میں نے کہا۔

"لیکن پہلے ان کی گھات ضرور لگائیں۔ انہوں نے واپس وہیں جانا ہے۔" بختاور نے کہا

"چل ٹھیک ہے نکلو، ادھر باقی میں بتاتا ہوں۔" میں نے کہا تو گاڑیاں اس جانب مڑ گئیں۔ ہم نے ہیڈ لائٹس بند کر دیں تھیں۔ اس میں تیز ڈرائیونگ تو نہیں ہو سکتی تھی لیکن اس طرح محفوظ رہا جا سکتا تھا۔

اس وقت رات کا آخری پہر چل رہا تھا، جب ہم بستی چراغ شاہ کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اس بار ہمارا ٹھکانہ وہی ٹیلہ تھا، جس پر ہم رات کے پہلے پہر بیٹھے رہے تھے۔ ہمیں یہ انتظار تھا کہ وہ لوگ واپس کب آتے ہیں۔

ہم وہاں بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ ڈیرے میں کسی قسم کی کوئی ہلچل نہیں تھی۔ تبھی مجھے خیال آیا سانول سے تو پوچھوں کہ کیا ہوا تھا؟

میں نے اسے فون ملایا، اس نے فوراً کال رسیو کر لی۔

"بول، پیروزاں کے ڈیرے پر......"

"کم از کم دس بندے زخمی ہوئے ہیں، ایک راجستانی بھی مارا گیا ہے۔ اس کی لاش پہلے

تو وہاں پڑی رہی پھر اسے کچھ لوگ لے گئے ہیں؟"

"کچھ لوگ لے گئے ہیں مطلب کون لوگ تھے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"میرے خیال میں ..... اور سنا بھی میں نے یہی ہے کہ وہ لوگ سردار نور حیات کے لوگ تھے۔ دن چڑھے پتہ چل جائے گا کہ وہ لوگ وہیں کے تھے یا نہیں۔" اس نے تفصیل سے بتا دیا۔

"تو سردار نور حیات انہیں پناہ دے رہا ہے۔" میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تو وہ بولا۔

"اس سے تو صاف ظاہر ہے۔"

"چل تو ایسا کر، یہ دیکھ ڈیرے پر کون کون ہے؟" میں نے اسے کہا۔

"ابھی دس منٹ پہلے میں وہاں سے آیا ہوں، وہاں کوئی نہیں ہے، سب دہشت کے مارے بھاگ گئے ہیں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"وہاں کے نوکر چاکر......؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی وہاں نہیں ہیں، سب بھاگ گئے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"ممکن ہے ان دس منٹوں میں کوئی وہاں پر آ گیا ہو، تم جاؤ وہاں پر اور اچھی طرح دیکھ کر بتاؤ" میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا تو وہ جانے کے تیار ہو گیا۔ میں نے کال بند کر کے فون جیب میں ڈال لیا۔ مجھے پہلے سانول کا اور پھر ان سب کا انتظار تھا کہ وہ کب آتے ہیں۔

☆......☆......☆

روشنی پھیل چکی تھی۔ ہم ٹیلے پر بیٹھے تھے۔ سانول نے ڈیرے میں جا کر بتا دیا تھا کہ وہاں پر کوئی بھی نہیں ہے۔ اب وہ ڈیرے میں ہی ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے جند وڈا، بگا

راجستھانی، اور دوسرے راجستھانی کا انتظار تھا کہ وہ کب ڈیرے پر آتے ہیں۔ لیکن روشنی پھیل جانے تک کوئی نہیں آیا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کوئی نہیں آئے گا۔" شعیب نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

"تو چلو پھر، اسی ڈیرے پر چلتے ہیں۔" میں نے کہا

"چل یار، اب تو بھوک بھی بڑی لگ گئی ہے۔" جہانگیر نے کہا تو ہم ٹیلے سے اتر کر گاڑیوں تک جا پہنچے۔ کچھ دیر بعد ہم ڈیرے پر تھے۔ وہاں جاتے ہی عجیب سی بے چینی نے مجھے گھیر لیا تھا۔ وہ جو میرن شاہ خاندان کے لئے میرے اندر پھیلی ہوئی نفرت تھی، وہ اپنا احساس دلانے لگی تھی۔

بختاور کا بستی بہادر خان سے مسلسل رابطہ تھا۔ اس نے وہاں کہہ دیا کہ ہمارے لئے کھانا بھیج دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں ہم تک کھانا پہنچ سکتا تھا۔ ہم ریت سے اَٹے ہوئے تھے۔ اس لئے ساتھ میں کپڑے بھی منگوا لئے۔ چاچا سائیں نے کہلا بھیجا کہ تھوڑی دیر میں سب کچھ پہنچ جاتا ہے۔ میں رہائشی حصے کی دیوار میں لگے چھوٹے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس تک گیا، اسے کھولا اور اس کے اندر چلا گیا۔ پورا گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک ایک کمرہ دیکھ کر اپنی تسلی کی۔ ممکن ہے، وہاں کوئی چھپا بیٹھا ہوا۔ اپنی پوری تسلی کر لینے کے بعد مجھے وہاں پر موجود مویشیوں کا خیال آیا۔ وہ بے چارے پتہ نہیں کب کے بھوکے ہوں گے۔

میں نے سانول کو بلا لیا۔ کچھ دیر بعد وہ آیا تو میں نے اسے ان مویشیوں کا کچھ کرنے کو کہا۔

"میں جاتا ہوں بستی میں، کچھ لوگوں کو لاتا ہوں۔ وہ انہیں چرانے کے لئے باہر لے جائیں گے۔"

"اور جن کا دودھ دھونا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں سب کر لیتا ہوں تم پریشان نہ ہو۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ رہائشی حصے کی طرف کا پھاٹک کھلا اور اس میں سے ایک گاڑی اندر آ گئی۔ میں اوٹ میں ہو گیا۔ وہ گاڑی صحن میں آ رکی تھی۔ اس میں سے بستی بہادر خان کے دو جوان نکلے۔ ایک کے ہاتھ میں کپڑوں کی گٹھڑی تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں کھانا بندھا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے ہی جب ساوری اتری تو میں حیران رہ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے تو میرا دماغ گھوم کر رہ گیا، یہ یہاں پر کیوں ہے؟

ساوری متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا تو وہ تقریباً بھاگتے ہوئے میرے سینے سے آ لگی۔ وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی تھی۔ میں بے حد پریشان ہو گیا۔ میں نے اسے چاچا عبدالمجید کے پاس بھیجا تھا۔ انہوں نے اب اسے واپس بھیج دیا، کیا اس میں بھی کوئی پیغام تھا؟ ایسے حالات میں اسے بھیج دینے کا مقصد کیا تھا؟ کیا بابا خیر دین بھی آ گیا یا اکیلی ساوری ہی آ گئی ہے؟ یہ سوچتے ہوئے میں نے اسے خود سے الگ کر کے پوچھا۔

"میں نے تمہیں وہاں اس لئے بھیجا تھا کہ تم اور بابا خیر دین محفوظ رہو، تم نے مجھے صرف ایک بات بتانی ہے اور وہ بھی سچ ......" میرے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ ساوری نے چونک کر میری طرف دیکھا، اس نے اپنی بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون سی بات......؟"

"انہوں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے یا ...." میں نے پوچھنا چاہا تو وہ میرا عندیہ سمجھ کر تیزی سے بولی۔

"نہیں......نہیں، میں خود آئی ہوں۔ بابا نہیں آیا، چاچا نے اسے آنے ہی نہیں دیا، وہ بیمار

ہے وہاں؟"

"تمہیں پتہ ہے کہ یہاں آگ لگی ہوئی ہے، میں چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں پھر بھی انہوں نے تمہیں آنے دیا؟" میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"میں خود ضد کر کے آئی ہوں۔" اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"کیوں آئی ہو؟" میں نے سختی سے پوچھا۔

"میں وہاں تڑپ رہی تھی۔" اس نے ہولے سے کہا،

"وہ تمہارے ساتھ اچھا سلوک......" میں نے کہنا چاہا تو اس نے تیزی سے کہا۔

"انہوں نے مجھے بیٹی بنا کر رکھا اور بیٹی کا ہی مان دیا ہے۔ میرا بہت خیال رکھا۔ لیکن تم یہاں ...... میں برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ تم یہ ساری دشمنیاں چھوڑو، اور چلو واپس۔" ساوری نے روہانسا ہو کر کہا تو میں ایک لمحے کے لئے چکرا کر رہ گیا۔ کیا ساوری بھی یہاں کسی مقصد ہی کے لئے آئی ہے؟ اسے بھی اس لئے بھیجا گیا کہ میں سب کچھ چھوڑ کر واپس چلا جاؤں؟ کیا چاچا عبدالمجید یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی قسم سے باز آ جاؤں؟ سوالوں کا ایک سلسلہ تھا جو دراز ہوتا جا رہا تھا۔

"یہ کپڑے ......" ایک نوجوان نے پوچھا تو مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے ساوری کی طرف دیکھا۔ وہ حسرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے نظرانداز کر دیا۔ اس نے پلٹ کر نوجوان کی طرف دیکھا اور بولی۔

"یہ کپڑے اور کھانا ادھر ہی رکھ دو، انہیں کہو کہ پہلے ایک ایک کر کے نہا لیں، پھر کھانا کھا لیں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نوجوان نے کہا اور دیوار والے دروازے سے باہر چلا گیا۔ میں

برآمدے میں پڑی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ساوری نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

ساوری ان چند دنوں ہی میں بے حد نکھر گئی تھی۔ سرخ گال، گلابی ہونٹ، بھاری پلکوں میں بھیگی آنکھیں، شفاف جلد، سلیقے سے سنوارے ہوئے گیسو، بھاری چوٹی اس کی کمر پر جھول رہی تھی۔ جدید تراش کا لباس اس کے بدن پر خوب جچ رہا تھا۔ میں اس میں کھو گیا تھا۔ مجھے وہ چھوٹی سی بچی یاد آنے لگی جو اپنے بھولپن میں بتاشے اور کھانے چھپا کر میرے لئے لاتی تھی۔ کیا اس کے دل میں میرے لئے اب بھی محبت ہے۔ کیا وہ مجھے وہی علی سمجھ کر محبت کر رہی ہے یا کسی دوسرے کو؟ کیا میں اسے یاد ہوں گا؟ کیا اب بھی وہ میری محبت میں یہاں تک آ گئی ہے یا......؟ میں اس سے آگے نہیں سوچ پایا۔ کون کس وقت کب بدل جائے، یہ کہا تو نہیں جا سکتا تھا۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، ان کے لئے دل مانتا ہی نہیں۔ وہ اگر دھوکا بھی دے جائیں تو دکھ نہیں ہوتا۔

سب باری باری کھانا کھا چکے تو اس نے میرے سامنے کھانا لا رکھا۔ پھر خود میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کھانا کھا لو، پھر بات کرتے ہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میرے ساتھ بیٹھی خاموشی سے کھاتی رہی۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ میرے سامنے تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے قدرت نے تپتی ہوئی زمین پر بارش برسا دی ہو۔

میں نے سب کو سو جانے کے لئے کہا تو وہ سب رہائشی حصے میں آ کر سو گئے۔ ان کی نگرانی کے لئے دونوں نوجوان تھے۔ جبکہ میں اور ساوری برآمدے میں آ بیٹھے تھے۔ میں چارپائی پر

بیٹھا تھا اور وہ موڑھا ڈالے میرے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ وہ خاموش تھی، جیسے کوئی بات کرنے کا سرا تلاش کرنا چاہتی ہو۔

"ساوری، تم کیا چاہتی ہو؟"

"بتایا تو ہے۔" اس نے تیزی سے کہا پھر لمحہ بھر خاموش رہ کر سکون سے بولی، "ہو سکتا ہے پیروزاں کو یہاں لا کر مارنے کی تمہاری ضد پوری نہ ہو۔"

"میں سمجھا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھو، میرن شاہ نے بہت پہلے جب بہاول پور میں اپنا بڑا سارا گھر بنایا تھا، اس کے فوراً بعد اس نے لندن میں بھی اپنی جائیداد بنائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے بچے وہاں جا کر پڑھیں گے۔ کیونکہ اس کی بیوی وہاں کی شہریت رکھتی ہے۔ میرن شاہ قتل کے بعد وہ اپنے بچوں اور اماں سگین کو لے کر وہاں چلی گئی ہے۔ اسے ڈر تھا کہ تم انہیں بھی قتل نہ کر دو۔"

"مجھے ان سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ میں انہیں......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات قطع کرتے ہوئے بولی۔

"میں یہ اس لئے بتا رہی ہو کہ پیروزاں بھی وہاں چلی جائے گی۔" اس نے کہا تو میرے اندر سنسنی پھیل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے مزید دور ہو گئی ہے۔ میں نے بہت بڑی غلطی کی تھی کہ پیروزاں کو چھوڑ کر چوہدری آصف کو پکڑ لیا تھا۔ روہی میں لا کر مارنے کی بجائے، وہیں اسے ختم کر دیتا۔

"تو کیا وہ چلی گئی ہے؟" میں نے مایوسی سے پوچھا۔

"نہیں، وہ ابھی گئی نہیں ہے۔ وہ ابھی تک وہیں اپنے بہاولپور والے بنگلے ہی میں ہے۔" ساوری نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

”اوہ، تو اس کا مطلب ہے کہ آج رات ہی......“ میں نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”میں بھی چاہتی ہوں کہ وہ قتل ہو جائے۔“ ساوری نے ایک دم سے کہا، پھر تیزی سے بولی، ”مگر وہ اب ہاتھ نہیں آنے والی۔“

”ایک طرف تم کہہ رہی ہو کہ وہ بنگلے پر ہے اور پھر کہتی ہو کہ وہ ہاتھ نہیں آنے والی، تم مجھے الجھا کیوں رہی ہو؟“ میں نے سختی سے کہا۔

”بنگلے میں ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ وہیں رہتی ہے۔ یہ بھی جان لو کہ وہ تم سے خوف زدہ نہیں۔ اسے سردار نور حیات نے سہارا دیا ہوا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”ہاں یہ تو مجھے پتہ چل گیا ہے۔ میرے دشمن اس وقت اسی کے پاس ہو سکتے ہیں۔ یہ مجھے یقین ہے۔“ میں نے کہا۔

”تمہیں یہاں الجھانے کے دو مقصد ہیں۔ پیروزاں کے ابھی تک کاغذات پورے نہ ہونے کی وجہ سے ویزہ نہیں مل رہا۔ لیکن امکان ہے کہ وہ مل جائیں گے۔ جب تک وہ تمہیں یہاں اُلجھائے رہیں گے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ اگر اس دوران تم قتل ہو جاؤ تو پھر سارے معاملے ہی حل ہو جاتے ہیں، پھر اس نے کہیں نہیں جانا۔“ اس نے مجھے تفصیل سے بتایا تو میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ ساری باتیں تمہیں کہاں سے پتہ چلی ہیں؟“

”رجاں مائی..... میرے بچپن کی سہیلی، جو پہلے میرن شاہ کے بچوں کی نوکرانی تھی اور اب پیروزاں کی نوکرانی بن گئی ہے، جسے وہ کبھی بھی پسند نہیں کرتی تھی۔“ اس نے بڑے سکون سے کہا۔

"تمہارا اس سے رابطہ......"

"فون پر ہوتا ہے۔ یہاں ہوتے ہوئے بھی اکثر اس سے بات کر لیا کرتی تھی۔ اب تو ہوتی رہتی ہے۔" اس نے بتایا۔

"ساوری، میں نے جس وقت کے لئے ساری زندگی انتظار کیا، میں اسے اپنے ہاتھ سے نہیں نکلنے دوں گا۔ اب وہ جہاں بھی ہے، میں اسے نکال لوں گا، میں اسے چھوڑنے والا نہیں۔ میں آج اور ابھی نکلوں گا۔" میں نے کہا اور بے چینی سے پہلو بدل لیا۔ وہ خاموش رہی تو میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا،" تم واپس چاچا کے پاس چلی جاؤ، مجھے امید ہے وہ تمہارا تحفظ کریں گے۔"

"تم اپنی ضد پر کیوں آڑے ہوئے ہو۔ وہ جشن ختم ہو چکی ہے۔ چند دن یا شاید دو چار دن، وہ یہاں رہے گی ہی نہیں۔ پھر کیا کرو گے، کیا لندن جاؤ گے، وہاں سے روہی لاؤ گے؟" وہ پرسکون انداز میں بولی

"ساوری، کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ یہ صرف میری ضد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں جانتی ہوں تم کون ہو؟" اس نے ہولے سے بڑی محبت سے کہا تو میں چونک گیا، پھر حیرت سے پوچھا۔

"کس نے بتایا؟"

"جس دن تم پہلی بار یہاں آئے تھے، بابا نے اسی دن تمہیں پہچان لیا تھا۔ باقی چاچا عبدالمجید نے مجھے بتا دیا۔" اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اور تم، کیا تم نے مجھے پہچانا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"ہاں، اس دن مجھے شک ہوا جب پہلی بار تمہیں دیکھا اور یقین اس دن ہوا جب میں نے

تمہیں تھپڑ مارا تھا۔" اس نے کہا اور بھیگی پلکوں سے میری طرف دیکھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں اندر سے بھر گیا تھا۔

"ساوری، میں جو زندگی گزار رہا ہوں، مجھے نہیں پتہ اگلے چند لمحے بھی ہیں میرے پاس کہ نہیں۔ اس لئے میں کوئی ایسی حسرت لے کر نہیں مرنا چاہتا جو میری دسترس میں بھی ہو اور میں اسے پوری نہ کر پاؤں۔" میں نے اسے کہہ تو دیا لیکن مجھے اپنے لفظوں پر خود یقین نہیں تھا۔ مجھے خود احساس ہو گیا کہ میرے لفظ ہی نہیں میرا لہجہ بھی کھوکھلا ہے۔ وہ میری بات سن کر تھوڑی دیر تک خاموش رہی۔ پھر بڑے روہانسا لہجے میں بولی۔

"سب کچھ ہاتھ نہیں آتا علی، زندگی......"

"مجھے یہ فلسفہ سمجھ نہیں آتا۔ میں بھگوڑا کر کے نہیں، دلیری سے مرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسا کوئی سبق مت سمجھانا۔" میں نے تلخی سے کہا اور اٹھ کر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے، ابھی تم جاؤ بستی، مجھے وقت ملا تو میں ملنے آ جاؤں گا۔ کوشش کرو کہ واپس چاچا عبدالمجید کے پاس چلی جاؤ۔"

میں اسے برآمدے میں بیٹھی چھوڑ کر ڈیرے کی طرف جانے لگا تو اس نے ہولے سے کہا

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے چلی جاؤں؟" اس نے نگاہیں بھر کے میری طرف دیکھا۔ شاید عورت کی ایسی ہی ادائیں مرد کو مار دیتی ہیں۔ وہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اپنے دل کی سنے یا دماغ کی۔ میں چند لمحے چپ رہا، پھر بڑے پیار سے بولا۔

"دیکھو ساوری، تم نہیں جانتی ہو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ لیکن یہ تم جانتی ہو کہ تیرے اور میرے درمیان ایک ایسی نفرت زدہ ان دیکھی دیوار ہے، جب تک میں وہ گرا نہیں سکا، تب تک میں اپنی محبت کو نہیں پا سکتا۔"

"میں جانتی ہوں علی، تم جس کے لئے یہاں اتنی قتل وغارت گری میں الجھے ہوئے ہو، وہ تو......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ جہاں بھی جائے گی، میں اس کے پیچھے جاؤں گا۔ یہاں تک کہ اسے یا مجھے موت آجائے۔"

میں کہہ رہا تھا اور وہ میرے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ نجانے کتنے رنگ آکر گزر گئے۔ میں جانتا تھا کہ اس کے من میں پتہ نہیں کیسے کیسے طوفان اٹھ رہے تھے۔ مگر وہ میری راہ نہیں روک سکتے تھے۔ ہمارے درمیان خاموشی آن ٹھہری تھی۔ ایک ایسا سناٹا جس میں سوچیں تک گونجنے لگتی ہیں۔

"تمہارے پاس کتنا اسلحہ ہے؟" اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تمہارے پاس اتنا اسلحہ ہے کہ ان سے لڑتے رہو۔" اس نے حتمی لہجے میں پوچھا۔

"میرے پاس جتنا اسلحہ تھا، میں لڑا ہوں، اور جتنا ہے اس سے لڑتا رہوں گا۔" میں نے کہا پھر چونکتے ہوئے پوچھا، "لیکن تم نے یہ سوال کیوں کیا؟"

"آؤ، میرے ساتھ۔" اس نے کہا اور اماں سکینہ کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ میں چند لمحے کھڑا رہا اور پھر اس کے پیچھے چل پڑا۔

کمرے کے درمیان میں اماں سکینہ کا نواڑی پلنگ پڑا ہوا تھا۔ ایک دو کرسیاں تھیں، لکڑی کے بڑے بڑے صندوق تھے۔ یا پھر اس کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ ساوری نے جاتے ہی ایک لکڑی کی الماری کھولی۔ اس کے اندر خانے بنے ہوئے تھے۔ اس نے اسے گھمایا تو وہاں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ وہ مجھے اشارہ کر کے اندر کی جانب اتر گئی۔

میں سمجھ تو گیا تھا کہ نیچے تہ خانہ ہو سکتا ہے۔ ایسا تہ خانہ ہونا کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ مگر میں ساوری کے پراسرار رویے کو دیکھ کر متجسس ہو گیا تھا۔ میں لاشعوری طور پر محتاط تھا مگر ساوری کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے سیڑھیاں اترنے لگا۔ میرے سامنے ایک کھلا سارا کمرہ تھا اور وہاں پڑا اسلحہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"کیا اتنا اسلحہ......؟"

"ان اسلحہ بیچنے والوں کو اسلحہ چلانا نہیں آیا ورنہ یہاں کے سب سے بڑے حاکم یہی ہوتے۔" ساوری نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں بچپن سے دیکھ رہی ہوں، انہوں نے منشیات کے علاوہ اسلحہ بیچنے کا کام بھی کیا ہے اور میرن شاہ اپنی موت تک کرتا رہا ہے۔ اس تہ خانے کے اوپر سٹور ہے۔ وہ جان بوجھ کر بے کار چیزیں پھینکی ہوئی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "وہ دیکھو، وہاں بھی سیڑھیاں اترتی ہیں۔ تھوڑا بہت مال یہاں سے جاتا تھا اور زیادہ مال وہاں سے۔ یہ مال رکھا بھی یہیں سے جاتا رہا ہے۔" اس نے کہا تو میں وہاں پڑے اسلحہ کی جانب بڑھا۔ غیر ملکی گنیں، پسٹل، بلٹس، دستی بم، راکٹ لانچر وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ دونوں بہن بھائی، کس طرح انسانی خون سے دولت بنانے کی چکر میں تھے۔

"یہی ہے یا کسی دوسری جگہ بھی......" میں نے پوچھا۔

"نہیں، یہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر بعد حیرت بھرے لہجے میں بولی، "کیا یہ تھوڑا ہے؟"

"نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا، میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ مال اس نے گھر ہی میں رکھا ہوا

تھا، کہیں دوسری جگہ ٹھکانہ نہیں بنایا؟“

”یہ کون سا ان کا گھر تھا، ان کی آدھی سے زیادہ زندگی، شہر میں یا پھر دوسرے ملکوں میں گزری ہے۔ میرن شاہ نہ مرتا تو ایک دو برس بعد وہ لندن ہوتا۔ پھر یہاں اس کے کارندے ہی ہوتے۔“ اس نے کہا۔

”اچھا چل آ، اوپر چلیں۔“ میں نے کہا۔

”کیوں یہ تنہائی تمہیں بری لگتی ہے۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”اوپر بھی تنہائی ہی ہے۔ وہاں بیٹھ کے باتیں کرتے ہیں۔“ میں نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تو ایک ادا سے اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اوپر چلی گئی۔

اماں سکینہ کے کمرے میں آ کر میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ پلنگ پر نیم دراز ہو گئی۔ تبھی میں نے یونہی پوچھا۔

”یہ تم نے مجھے اسلحہ دکھایا، کہیں کوئی نوٹ نہیں پڑے ان کے؟“

”پڑے ہوں گے۔ وہ میں نے ابھی دیکھے نہیں، اسلحہ کی ضرورت تھی سو میں نے وہی دیکھا اور پھر تمہیں بتا دیا۔“

”تمہیں کیسے پتہ مجھے اسلحہ کی ضرورت ہے؟“ میں نے خوشگوار لہجے میں پوچھا تو وہ سخت لہجے میں یوں بولی جیسے اس کے اندر کہیں کوئی نفرت پل رہی تھی۔

”کیونکہ اب میں بھی تمہارے ساتھ مل کر لڑنا چاہتی ہوں۔“

”میں تو اس لئے..... “ میں نے کہنا چاہا تو وہ تڑپ کر بولی۔

”چھوڑو، پھر کبھی بات کریں گے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی۔ اس نے ایک صندوق کو دیکھا، اسے تالا لگا ہوا تھا، پھر دوسرے کو

دیکھا، اسے بھی تالا تھا۔ وہ باہر گئی اور ہتھوڑا لے آئی، میں نے بھی تالے توڑ دیئے۔ ایک صندوق میں سے کافی ساری رقم ملی۔

"میرے خیال میں یہ کافی ہے۔" ساوری کہتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"کافی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے ابھی تلاشی نہیں لی، مزید بھی ملے گا کچھ نہ کچھ۔"

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ باہر سے شعیب کی آواز آئی۔ اس نے مجھے پکارا تھا۔ میں نے جواباً اسے بلایا تو چند لمحے بعد وہ آ گیا۔ اس نے ساوری کو میرے پاس بیٹھے دیکھا تو پہلے جھجکا، پھر نروس ہوتا ہوا بولا۔

"تم دکھائی نہیں دیئے تھے نا تو میں نے آواز دے دی کہ کہاں ہو تم۔ چلتا ہوں، تم لگاؤ گپ شپ۔"

"میں خود تمہارے پاس آنے والا تھا۔ ایک بہت بڑی خوشخبری ہے۔" میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا......؟" اس نے پوچھا تو میں نے سامنے الماری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا

"اسے کھولو اور نیچے جا کر دیکھو۔"

میرے یوں کہنے پر اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا، پھر الماری کھولی۔ میں اسے بتاتا رہا، وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے چہرے پر خوشگوار حیرت پھیلی ہوئی تھی۔

"مجھے یہی ڈر تھا کہ ہمارے پاس سب کچھ بہت تھوڑا ہے لیکن اب......"

"لڑکوں کو لگا کر اسلحہ بستی بہادر خان کے نوجوانوں کو دے دو۔ اپنی گاڑیاں بھر لو، اب جس

کا جتنا دل چاہے ہمارے ساتھ کھیل لے۔" میں نے کہا تو کوئی جواب دیئے بغیر وہ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ ساوری واپس بستی بہادر خان نہیں گئی تھی۔ بختاور خود اسلحہ لے کر گیا تھا۔ باقی سب جاگ گئے تھے اور وہ خوش تھے کہ انہیں اتنا اسلحہ مل گیا۔ تبھی جہانگیر نے کہا۔

"ساوری بہن، اس خوشی کے موقع پر چائے ہی پلا دو۔"

"بیٹھو، میں بناتی ہوں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہم ڈیرے پر جا رہے ہیں، وہیں بھیج دینا۔" اس نے کہا اور سب ڈیرے پر چلے گئے۔ ساوری کچن میں چلی گئی۔ میں برآمدے میں بیٹھا رہا۔ وہیں بیٹھے اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے اس پر تھوڑا غور کیا تو مجھے لگا کہ اگر کوشش کی جائے تو شاید ایسا ہو جائے۔ میں نے سیل فون نکالا اور زمان سوہل کو فون کر دیا۔ حال احوال کے بعد میں نے پوچھا۔

"کہاں ہو؟"

"ادھر گھر میں پڑا ہوں۔" وہ اکتائے ہوئے انداز میں بولا۔

"تمہیں ہوا کیا ہے، خیر تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں یار، کبھی جندوڈا سے یاری باشی تھی، اسے اب تک بھگتا رہا ہوں۔ میں تو عذاب میں آ گیا ہوں۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"ہوا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں یاد ہے جن لوگوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا، میں تو مر ہی گیا تھا اگر تم نے مجھے نہ بچایا ہوتا۔" اس نے کہا۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔" میں نے کہا تو بولا۔

"تم نے پوچھا تھا، انہوں نے کیوں حملہ کیا تو میں نے کہا پھر بتاؤں گا۔"

"ہاں تم نے نہیں بتایا تھا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"وہ اسی جندوڈا کی وجہ سے میرے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ ان حملہ آوروں کی ایک بہن تھی، جندوڈا اسے اٹھا کر لے گیا۔ بس پھر وہ ہم دونوں کی وجہ سے مر گئی تھی۔" اس نے شرمندہ لہجے میں بتایا۔

"مطلب وہ تم دونوں کی بے غیرتی کی بھینٹ چڑھ گئی۔"

"بس ایسے ہی سمجھ لو۔" اس نے پھر شرمندہ لہجے میں کہا۔

"اب کیا مسئلہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہی، وہ دونوں مجھے مارنا چاہتے ہیں۔ وہ میری بستی بھی آ گئے تھے۔ میں ان سے بچ نہیں پا رہا، میرا گھر سے نکلنا محال ہو گیا ہے۔ یہاں کسی کو بتاتا ہوں تو میری اپنی ذلالت ہے۔ کیا منہ دکھاؤں گا کسی کو۔ جندوڈا سے کہہ رہا ہوں، مجھے ان سے نجات دلواؤ، مگر وہ اپنی جان بچانے کی فکر میں ہے، میری بات ہی نہیں سن رہا۔" اس نے شرمندہ اور شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں شاید، اب وہ تمہاری مدد نہیں کر پائے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، میں جانتا ہوں، میں نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ تمہارے سامنے مت آئے مگر وہ سمجھا ہی نہیں۔" اس نے کہا۔

"کیا اس نے تمہیں میرے بارے میں نہیں بتایا؟" میں نے پوچھا۔

"بتاتا رہتا ہے، لیکن فون پر اتنی بات نہیں ہوتی۔ ہماری ملاقات نہیں ہو پائی۔" اس نے

کہا پھر فوراً ہی بولا۔ ”اچھا خیر تم بتاؤ، فون کس لئے کیا تھا۔“
”زمان، میں جانتا ہوں تم کتنے کھرے اور کام کے بندے ہو۔ کیا تم جندوڈا کو بچانا چاہو گے؟“ میں نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
”یہ تو وہ جانتا ہے کہ وہ بچنا چاہتا ہے یا نہیں۔“ اس نے محتاط انداز میں کہا۔
”دیکھو، یہ میں آفر کر رہا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے بچنا چاہتا ہے تو وہ راشحانی جو اس کے پاس آیا ہوا ہے وہ مجھے دے دے، یہ ڈیل سمجھو، اس کے عوض میں رقم بھی دے دوں گا۔“
”ایک منٹ...... تم پھر جندوڈا کو مارو گے تو نہیں؟“ اس نے پوچھا۔
”میری پہلے بھی اس کے ساتھ کیا دشمنی ہے۔ وہ تو خود بیروزاں کا باڈی گارڈ بنا ہوا ہے، وہ عورت، جو خود کسی کی نہیں۔“ میں نے تلخی سے کہا۔
”اگر تم اسے چھوڑ دو تو میں بات کر کے دیکھ لیتا ہوں۔“ اس نے کہا۔
”ظاہر ہے وہ راستے میں نہیں آئے گا تو میں اسے کچھ نہیں کہوں گا۔“ میں نے اسے یقین دہانی کرواتے ہوئے کہا۔
”میں بات کر لیتا ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔
”میں جانتا ہوں وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ سردار نور حیات کی پناہ میں ہے۔ ممکن ہے اسے یہ خمار بھی ہو، سمجھا دینا اسے۔ میرے لئے وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔“ میں نے اسے سمجھایا۔
”ٹھیک ہے، میں بات کرتا ہوں۔“ اس نے کہا۔
”بات کرا اور مجھے بتا، دونوں سکون سے رہو گے۔“ میں نے کہا۔ مجھے یقین تھا کہ میری بات میں چھپی ہوئی دھمکی وہ بخوبی سمجھ جائے گا۔ میں نے الوداعی بات کی اور کال ختم کر دی۔

ایسی ڈیل میں نے پہلی بار نہیں کی تھی۔ جرم کی اس دنیا میں ایسا چلتا رہتا ہے۔ مجرم کبھی کسی کا نہ دوست ہوتا ہے نا دشمن، اسے محض اپنے فائدے سے غرض ہوتی ہے۔ باقی معاملات میں جہاں ضد اور انا آڑے آجائے، وہاں حالات کچھ دوسرے ہوتے ہیں۔

ساوری چائے بنا کر لے آئی تھی۔ اس نے دو مگ میرے سامنے رکھے اور پھر ڈرے اسی دروازے سے آواز دے کر ڈرے انہیں تھما دی جس میں مگ رکھے ہوئے تھے۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ تو میں نے سپ لیتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ سوچا جا سکتا تھا کہ دشمن کے گھر میں بیٹھ کر یوں عیاشی کی جائے۔"

"ایسا ہو گیا ہے نا؟" اس نے ایک ادا سے۔

"ہاں، ہو تو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا، چاچا سائیں کا فون آگیا۔ میں نے کال رسیو کرتے ہوئے پوچھا۔

"چاچا سائیں خیریت تو ہے نا۔"

"او ہاں یار خیریت ہی ہے۔ بستی کے نوجوان تیرے قبضے پر بہت خوش ہیں۔ ایک بار تو فائرنگ سے ساری بستی ہلا دی۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں ہتھیار چیک بھی تو کرنے تھے۔" میں نے بات بتا دی۔

"وہ یار میں نے فون اس لیے کیا ہے کہ وہ سردار نور حیات پھر کہہ رہا کہ وہ پنچائت لے کر آنا چاہتا ہے۔" انہوں نے پریشان لہجے میں کہا۔

"تو لے آئے، تب اور بات تھی، اب دوسری بات ہے۔" میں نے کہا۔

"ایسا کیا ہو گیا؟" انہوں نے پوچھا۔

"سیدھی سی بات ہے، تب وہ سارے مل کر ہم سے اپنی بات منوانا چاہتے تھے۔ اب ہم

اس پوزیشن میں ہیں کہ اپنی بات منوا سکیں۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو انہوں نے پوچھا۔

"تو پھر میں کہہ دوں، وہ آج شام ہی آنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں کہہ دیں۔" میں نے کہا تو انہوں نے کال ختم کر دی۔

میں نے ساوری کو بتایا تو اس نے پوچھا۔

"وہ لڑائی ختم کرنے کا کہیں گے، تم ختم کر دینا، باقی ہم دیکھ لیں گے۔"

"وہاں دیکھیں گے کیا بنتا ہے۔" میں نے کہا اور چائے پینے لگا۔ مجھے اب زمان مونل کے فون کا انتظار تھا۔

☆......☆......☆

میں بستی بہادر خان کی طرف گاڑی بھگائے چلا جا رہا تھا۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر ساوری بیٹھی ہوئی تھی۔ بستی میں پنچائت بج گئی تھی۔ چاچا سائیں نے مجھے فوراً پہنچنے کا کہا تھا۔ میں جانتا کہ میں دشمن کی نگاہ میں ہوں گا کہ میں اکیلا بستی کی طرف جا رہا ہوں۔ میرے اس تھوڑے سے سفر سے اندازہ ہو جانے والا تھا کہ دشمن کی نیت کیا ہے۔ میں بستی کے قریب پہنچا تھا کہ زمان مونل کا فون آ گیا۔

"ہاں بول، ہاں یا ناں؟"

"بات تو ہاں میں ہے، لیکن یہ سب ہو گا کیسے، وہ یہ پوچھ رہا ہے، اسے یقین نہیں آ رہا کہ تم ایسا کہو گے۔" وہ الجھتے ہوئے بولا۔

"تو اس کی ہاں پوچھ، باقی میں دیکھ لوں گا۔" میں نے کہا۔

"اس کی سمجھو ہاں ہی ہے۔" زمان نے محتاط انداز میں کہا۔

”ایسے نہیں زمان، ابھی پنچائت ہونے والی ہے، اس میں بہت ساری باتیں ہوں گی۔ چند وڈا کی ہاں اور ناں پر ہی میں بات کروں گا۔ اگلے دس منٹ میں مجھے بتادے، اس کے بعد فون نہیں کرنا۔“ میں نے سختی سے کہا اور کال بند کر دی۔

بستی کے نوجوان میرے انتظار میں تھے۔ میں نے ایک نوجوان کو گاڑی دے دی۔ وہ ساوری کو گھر لے گیا۔ میں سیدھا گوپے میں چلا گیا۔

وہاں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سردار نور حیات، علاقے کے تین معزز لوگ، چاچا سائیں اور پولیس کا ایک اعلیٰ افسر بھی موجود تھا۔ میں سب کو سلام کر کے ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ سردار نور حیات مسلسل میری جانب دیکھے چلا جا رہا تھا۔ میں نے اس کی نگاہوں کو نظر انداز کر دیا۔ میں نے بیٹھ کر سب کی طرف دیکھا تو ایک شخص نے کہا۔

”لو جی سردار جی کریں بات شروع۔“

اس کے یوں کہنے پر سردار نور حیات نے کھنکار کر جیسے گلہ صاف کیا اور پھر بڑے ہی تلے انداز میں بولا۔

”میرے خیال میں لمبی چوڑی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں، عرض صرف یہ کرنی ہے کہ جب سے یہ نوجوان یہاں روہی میں آیا ہے، تب سے یہاں کا امن برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ پہلے یہ آیا تو میرن شاہ کا قتل ہو گیا۔ وہاں پر موجود بہت سے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نوجوان نے اسے قتل کیا۔ اس کے ایک دو دن بعد یہ غائب ہو گیا۔ میں خاموش رہا۔ اب یہ پھر دوبارہ آگیا ہے۔ اب سنا ہے کہ یہ نوجوان میرن شاہ کی بہن چندوڈاں کو قتل کرنے کی کوشش میں ہے۔ یہاں تک کہ آج اس نے ان کے گھر اور ڈیرے پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ اتنی دیدہ دلیری اور غنڈہ گردی کیوں؟“

وہ کہہ کر خاموش ہو گیا تو کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ تبھی چاچا سائیں نے بڑے اعتماد اور متانت سے کہا۔

"یہ نوجوان تو آیا ہی انہی کے پاس تھا۔ اُن کا، اس سے کیا اختلاف ہوا، ہم نہیں جانتے۔ اس بے چارے نے تو ہمیں ان غنڈے بدمعاشوں سے بچایا ہے جو ہمیں قتل کرنے آئے تھے۔"

"دیکھو جی، جرم کہاں نہیں ہوتے۔ لیکن اس کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ پنچایت ہے، تھانہ کچہری ہے۔ اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ ہتھیار اٹھا کر تباہی مچانا شروع کر دی جائے۔" ایک دوسرے شخص نے سردار نور حیات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ تبھی اس افسر نے موڑھے پہ پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا، ہم اس بحث میں نہیں پڑتے، یہ پچھلی باتیں کریں گے تو بات طول پکڑے گی۔ اس وقت جو کرنا ہے اس پہ بات ہونی چاہئے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہاں امن ہو جائے۔ کوئی کسی کو کچھ نہ کہے۔ کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہو، یہی دو حرفی بات ہے۔"

افسر نے اپنی بات کہہ دی تو سردار نور حیات نے میری طرف دیکھا اور بڑے رعب سے پوچھا۔

"ہاں بھئی نوجوان، کیا کہتے ہو تم؟"

"میں نے کہنا نہیں تم لوگوں سے پوچھنا ہے۔" میں نے سکون سے کہا۔

"کیا پوچھنا ہے؟" سردار نور حیات نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا امن کی یہ ذمہ داری صرف مجھ پر عائد ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تو اور کیا، جب سے تم یہاں پر آئے ہو، ایک فساد کھڑا ہو گیا ہے۔ کتنے لوگ مر گئے، اس

میں تمہارا نہیں تو اور کس کا قصور ہے؟" سردار نے دبے دبے غصے میں کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارا قصور ہے سردار۔ تم جو غنڈے، بدمعاشوں، قاتلوں، اشتہاریوں کے ساتھ ساتھ بارڈر پار کے ایجنٹوں کو پناہ دیتے ہو، ان کی پشت پناہی کرتے ہو، کیا اس سے امن ہوتا ہے یا تمہارے کالے دھندے چلتے ہیں۔"

"بکواس کر رہے ہو تم، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" اس نے ہتھے سے اکھڑتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہمنوا اونچی اونچی آواز میں بولنے لگے۔ میں سب کی خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ کہہ چکے تو میں بولا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو سردار، اب ثبوت کی پٹاری کھولنا پڑے گی؟"

"یار چھوڑو اس بات کو، مدعے کی بات کرو۔" افسر نے تیزی سے کہا۔

"اصلی بات اگر امن قائم کرنا ہے تو بولو، کیا کرنا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"تم اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو، تم نے میران شاہ کا قتل کیا ہے؟" سردار نے تیزی سے کہا۔

"اس کے علاوہ ہر بندے کو خون معاف ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں معاف کیوں، جو مجرم ہوگا اسے پکڑا جائے گا؟" اس نے تیزی سے ہی جواب دیا تو میں بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تو سردار جی، پہلے خود کو قانون کے حوالے کرو، اسلحہ، منشیات اسمگل کرنے، ایجنٹوں کو پناہ دینے اور وہ قتل جس پر تم پکڑے نہیں گئے۔ آؤ ہم دونوں ہی خود کو قانون کے حوالے کرتے ہیں۔"

''یار جو ہو گیا سو ہو گیا۔'' افسر نے جھنجھلاتے ہوئے کہا پھر لمحہ بھر رک کر بولا، ''سردار صاحب، ہم سب جانتے ہیں کون کیا ہے۔ سیدھی بات کریں، آپ کیا چاہتے ہیں۔ کچھ ماننا پڑے گا تو ہی منوانا ہو گا۔''

''چلو تم ہی کوئی فیصلہ کرو۔'' سردار نور حیات نے کہا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ جس طمطراق سے آیا تھا، وہ ختم ہو چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اپنی اس بے عزتی کا وہ بدلہ کیسے لے گا، مگر مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میں خود چاہتا تھا کہ وہ میری طرف منہ کرے۔ تبھی افسر نے میری طرف رخ کر کے پوچھا

''تم بتاؤ یار، تم کیا چاہتے ہو؟''

''کوئی بھی کسی پر نہ حملہ کرے۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''تم جو پیروزاں مائی کے قتل کا ارادہ لئے پھرتے ہو، وہ ختم ہے نا، اب اسے کچھ نہیں کہو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر وہ روہی میں نہیں آئی تو میرا ارادہ ختم سمجھو۔'' میں نے کہا۔

''اس کی کیا ضمانت ہے۔'' سردار نے تیزی سے پوچھا۔

''اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ مجھ پر حملہ نہیں کرے گی یا کروائے گی یا روہی نہیں آئے گی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کی ضمانت میں دیتا ہوں۔'' سردار نے کہا۔

''تمہاری ضمانت قبول نہیں سردار، تم خود پارٹی ہو۔'' میں نے کہا۔

''تم کس پر مطمئن ہوتے ہو؟'' افسر نے پوچھا۔

''اگر تم سب میرا اطمینان چاہتے ہو، اگر یہاں مستقل امن چاہتے ہو تو اس کا صرف ایک

حل ہے میرے پاس۔" میں نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا......؟" افسر نے پوچھا۔

"پیروزاں اپنی یہاں روہی کی ساری جائیداد سے دستبردار ہو جائے۔ نہ اس کا یہاں کچھ ہوگا، اور نہ وہ یہاں آئے گی۔" میں نے حتمی انداز میں کہا تو سب میری طرف دیکھنے لگے۔ میں بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا سردار نور حیات جتنا مرضی پیروزاں کا خیر خواہ تھا، اس کی راہ سے ایک بہت بڑا حریف صاف ہو رہا تھا۔ میری توقع کے مطابق وہ بولا۔

"اس کے عوض تم کیا ضمانت دو گے؟"

"میں خود کو قانون کے حوالے کر دوں گا۔" میں نے اطمینان سے کہا تو سب نے میری طرف دیکھا، جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

"ڈن ہو گیا؟" افسر نے بھی حتمی انداز میں کہا۔

"لیکن یہ تو پوچھو، وہ دستبردار کیسے ہوگی؟" ایک شخص نے پوچھا۔

"ہاں یہ بتاؤ۔" افسر نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"وہ اپنی ساری جائیداد اپنی ہی نوکرانی ساوری کے نام کر دے گی۔" یہ کہہ کر میں نے سب کا ردعمل دیکھا، پھر سکون سے بولا، "آپ جس دن یہ کاغذات لے کر آ جاؤ گے، میں اسی وقت آپ کے ساتھ چل دوں گا۔ چاہے ہتھکڑی لگانا یا نہ لگانا۔"

"میرا خیال ہے سردار صاحب، یہ فیصلہ معقول ہے۔ مان لینا چاہئے۔" افسر نے سر ہلاتے ہوئے کہا

"میں پیروزاں مائی سے پوچھ لوں۔" سردار نور حیات نے سوچتے ہوئے کہا تو میں نے افسر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"اور اگر وہ نہ مانی تو......؟"

"پھر میرا خیال ہے قانون کو حرکت میں آنا ہوگا، جو بھی اس کی زد میں آئے گا، وہ پکڑا جائے گا۔" افسر نے حتمی لہجے میں کہا۔

"بالکل، میں بھی گرفتاری دے دوں گا، اگر وہ غنڈے، قاتل، ایجنٹ بھی گرفتار ہوں گے، ان کی پشت پناہی کرنے والے بھی۔" میں نے سخت انداز میں کہا تو سردار نور حیات نے میری طرف غور سے دیکھا۔

"ہاں یہ تو ہوگا۔ چاہے وہ کوئی جتنا خود کو معزز سمجھتا ہو۔" افسر نے کہا۔

"مزید کوئی بات؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں تم جاسکتے ہو۔" اس نے متانت سے کہا تو میں اٹھ کر چاچا سائیں کے گھر کی طرف چل دیا۔

ساوری بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کوپے میں ہونے والی پنچائت کے بارے میں پوچھا تو میں نے سب بتا دیا، تب وہ حیرت سے بولی۔

"پیروزاں کی یہاں کون سی جائیداد ہے، یہاں تو کسی کی بھی جائیداد نہیں، سرکاری اراضی ہے، جس کا قبضہ ہوا اسی کا۔ وہ تو فوراً ہاں کر دے گی، پہلے بھی اسے کون سا چاہئے تھا، وہ سب چھوڑ کر جا رہی ہے۔"

"مجھے سب معلوم ہے ساوری، میں صرف سردار نور حیات کو یہ جتانا چاہتا ہوں کہ اس کا بھی یہاں کچھ نہیں، میں جب چاہے اس سے چھین لوں، اس وقت میری دشمن پیروزاں نہیں، نور حیات ہے۔ جو اپنے پردوں کے پیچھے میرے دشمن چھپائے بیٹھا ہے۔" میں نے کہا تو ساوری مجھے دیکھتی رہ گئی۔ پھر الجھے ہوئے انداز میں بولی۔

"مجھے اب بھی سمجھ میں نہیں آیا، وہ اگر ہاں کہہ دیتی ہے تو تم گرفتار......"

"یہی تو بات ہے، نہ جائیداد کے کاغذ ہوں گے، نہ وہ اس سے کوئی مطالبہ کر سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ تیرا ہے ساوری، اب تم یہاں رہو۔" میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا جہاں الجھن پھیلی ہوئی تھی۔

شام ڈھل رہی تھی جب ہم بستی چراغ شاہ کی طرف چل پڑے۔ اس بار ہمارے ساتھ کچھ نوجوان بھی تھے۔ شعیب اور جہانگیر سب کے لئے دبنے کی جگہ بنا رہے تھے۔ سانول بھی ان کے پاس تھا۔

رات کا کھانا کھا کر میں چھت پر چلا گیا تھا۔ دن بھر سب نے سیکورٹی کے طور پر ہر شے کو دیکھا بھالا تھا۔ کسی بھی متوقع حملے کے لئے ہم سب پوری طرح تیار تھے۔ چھت پر ہلکا اندھیرا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ کچھ دیر بعد ساوری میرے پاس آ گئی۔

"تم کیوں آ گئی ہو، اتنا مشکل تو ہے یہاں چڑھنا۔"

"لکڑیوں کی سیڑھی ہے، تم آج چڑھے ہو، میں بچپن سے یہاں ہوں، سمجھے تم۔" اس نے شوخی سے کہا۔

"یہاں کوئی منڈیر نہیں ہے، سمجھو کھلی فضا میں ہیں، یہاں محفوظ......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"میں تم سے ایک بات کرنے آئی ہوں۔"

"بولو، میں سن رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"پیروزاں تو یہاں نہیں رہے گی، رحماں مائی وہاں بہاول پور میں رہے گی، اس کا کوئی نہیں ہے۔" وہ دردمندی سے بولی۔

"تم ہونا اس کی۔" میں نے کہا۔

"میں تو ہوں ہی، وہ بہت دکھی ہو رہی ہے، بس دن کاٹ رہی ہے، آج بھی پروزاں نے اسے مارا ہے۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر اپنا غصہ نوکروں پر نکالتی ہے۔" ساوری نے دکھی لہجے میں کہا۔

"رجماں سے کہو یہاں آجائے، کوئی لے آتا ہے اسے۔" میں نے کہا تو اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں ایک خیال ابھرا، میں نے چند لمحے سوچا اور پھر ساوری سے کہا۔ "اسے کہو، چند دن محض چند دن وہاں رہے۔ وہ ہمیں پروزاں کے بارے میں بتاتی رہے۔"

ساوری میری بات سمجھ گئی تھی۔ اس نے فوراً مجھے کہا۔

"میں تو پہلے ہی سے کہہ رہی ہوں کہ وہ میرے پاس آجائے، لیکن وہ نکلنا نہیں چاہ رہی تھی، ڈرتی تھی، اب اس کا خوف بہت حد تک ختم ہو گیا ہے۔ اب اسے پروزاں کی پرواہ نہیں، اس تنہائی سے ڈر رہی ہے جو شہر رہ کر ہو گی۔ کون ہے وہاں اس کا؟"

"بس اسے یہی دلاسا دو، کہ جیسے ہی پروزاں یہاں سے چلی گئی، میں اسے لے آؤں گی۔ باقی تم سمجھ سکتی ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔" میں نے اسے کہا تو وہ دھیمے سے لہجے میں بولی۔

"میں سمجھ گئی۔"

"اچھا اب چل نیچے، یہاں رہ کر میرا مذاق نہ بنوا دینا کہ چھپ سے ملے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ چونچ لڑائے بیٹھے ہیں۔" میں نے اس کی ناک پکڑتے ہوئے کہا تو وہ اپنی ناک چھڑوائے بغیر بولی۔

"تم چاہتے ہو کہ میں چلی جاؤں۔"

"نہیں۔" میں نے پیار سے کہا تو وہ میرے سینے سے لگ گئی۔

رات کا پہلا پہر ختم ہو چکا تھا۔ میں اور شعیب نے جیپ میں ڈیرے کے چاروں طرف کا چکر لگا کر ڈیرے سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ ہم کافی دیر سے پنچائت پر ہی بات کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کا بھی خیال تھا کہ پیر وڈاں سب کچھ دینے پر راضی ہو جائے گی۔ اس کے بعد سردار نور حیات بھی زور لگائے گا کہ مجھے گرفتار کر لیا جائے۔ ہم انہی باتوں میں معروف تھے کہ زمان موہل کا فون آ گیا۔

''ہاں بولو......'' میں نے کہا۔

''وہ مان گیا ہے۔'' اس نے دبے دبے جوش سے کہا۔

''ٹھیک ہے، کوئی شرط شرائط؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر تم اس پر ہاتھ رکھو، اسے دوبارہ گرفتار نہ ہونے دو تو وہ سب کچھ کرنے کے لئے راضی ہے۔'' زمان موہل نے کہا۔

''زمان ایک بات پوچھوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بولو۔'' اس نے کہا۔

''وہ اتنی جلدی راضی کیسے ہو گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''سچ کہوں تو پنچائت کے بعد پولیس افسر سردار کے ساتھ ہی اس کے گھر گیا تھا۔ وہاں بڑی بحث ہوئی۔ آفیسر کا یہی کہنا تھا کہ وہ ان تینوں کے ساتھ جتنے بھی اشتہاری اس کے پاس ہیں دے دیں۔ اس کی بھنک اس کے کانوں تک بھی پہنچ گئی ہے۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔

''وہ ایجنٹ کو کس طرح میرے حوالے کرے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تم خود بتاؤ گے تاکہ دھوکے وغیرہ کا کوئی بھی رسک نہ رہے۔'' زمان موہل نے کہا تو چند لمحے سوچنے کے بعد میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔ میں بتاتا ہوں۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

رات گہری ہو گئی تھی۔ میں شعیب اور جہانگیر تینوں ایک ٹیلے پر کھڑے اندھیرے ہی کا حصہ لگ رہے تھے۔ ہم نے اپنی جیپ جھاڑیوں میں چھپا دی ہوئی تھی۔ ہمارا تینوں کا ایک دوسرے سے رابطہ تھا۔ میرا دھیان اس طرف تھا جہاں سے میری توقع کے مطابق جندوڈا نے اس ایجنٹ کو لے کر آنا تھا۔ دیئے گئے وقت میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ میرے اندر بے چینی اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ اچانک جہانگیر کی آواز آئی۔

"وہ دیکھو، دائیں طرف۔"

میں نے اس جانب دیکھا تو ایک جیپ آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی ہیڈ لائٹس بند تھیں۔ لیکن نیچے دو چھوٹی لائٹس جل رہی تھیں۔ زمان سوہل نے یہی نشانی بتائی تھی۔ میں تیار ہو گیا۔ بلاشبہ میرے دوسرے ساتھی بھی الرٹ ہو چکے تھے۔ اب ہم نے انہیں گھیرنا تھا۔ ہم تیزی سے نیچے اترے۔ جہانگیر جیپ لینے چلا گیا۔ ممکن ہے اگر کوئی بھاگتا تو اس کا پیچھا کیا جا سکے۔ میں اس راستے کے پاس آ کر ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا جبکہ شعیب دوسری طرف ایک جھاڑی میں چھپ گیا۔ جہاں سے ان کی جیپ نے گزرنا تھا۔ جیپ ہم سے چند گز کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے اس کی رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی۔ میں نے اپنے پسٹل کا سیفٹی کیچ اتارا اور تیار ہو گیا۔ وہ جیپ ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر جیسے ہی سامنے آئی۔ میں نے اس کے اگلے ٹائروں میں فائر کر دیا۔ جیپ چند گز آگے گئی تو شعیب نے اس کے پچھلے ٹائروں میں فائر جھونک دیئے۔ درمیان میں لمحوں کا وقفہ اس لئے رکھا کہ کوئی فائر ہمارے نہ لگ جائے۔ جیپ کے دونوں ٹائر پھٹ گئے تھے۔ میں بھاگ کر جیپ

کے آگے چلا گیا، جبکہ شعیب پیچھے ہی رہا۔ جیپ لڑکھڑاتے ہوئے رک گئی تھی۔ اندر سے کوئی نہیں نکلا تھا۔ تبھی پیچھے سے شعیب نے للکارتے ہوئے کہا۔

''اندر جو کوئی بھی ہے باہر نکل آئے۔''

اس نے کہا ہی تھا کہ دو فائر جیپ میں سے نکلے۔ انہوں نے آواز پر فائر کر دیا تھا۔ جیسے ہی فائر نکلے تھے، جواباً میں نے بھی فائر کر دیئے۔ اسی دوران میں نے شعیب سے پوچھا۔

''تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے اطمینان سے کہا تو جہانگیر کی آواز آئی۔

''میں جیپ لے کر سامنے آ رہا ہوں۔''

یہ سنتے ہی میں اوٹ میں ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے سامنے سے جیپ آ گئی جس کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جہانگیر نے آتے ہوئے کئی فائر کر ڈالے۔ اس دوران میں نے اور شعیب نے بھی فائر کر دیئے۔ جیسے ہی ہماری طرف سے فائرنگ کا وقفہ ہوا۔ ایک شخص اترا، اس نے سر پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ وہ چیخ رہا تھا۔

''فائر مت کرنا...... فائر مت کرنا۔''

میں اس کی آواز پہچان گیا تھا۔ وہ جندوڈا تھا۔

''اور کتنے لوگ ہیں تیرے ساتھ......؟'' میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

''ہم تین آدمی ہیں...... ہمیں مارنا مت......'' اس نے تیزی سے کہا۔

''ٹھیک ہے سب باہر آ جاؤ۔'' میں نے کہا اور اپنی جگہ چھوڑ کر ہٹ گیا۔

میرے کہنے کے دو منٹ بعد تک کوئی باہر نہیں نکلا۔ مجھے شک ہونے لگا تھا۔ میں اس آپشن پر سوچنے لگا کہ سامنے سے کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ میں جانتا تھا کہ سامنے جو شخص

ہے وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ تبھی میری نگاہ جیپ کے تباہ ٹائر کے عقب میں پڑی۔ کوئی رینگ کر وہاں سے اتر رہا تھا۔ وہاں چونکہ ہلکی سی روشنی تھی، اس لئے فوری طور پر پتہ نہیں چل رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی کوشش کی داد دی۔ میں نے شعیب کو اس رینگتے ہوئے شخص کے بارے میں بتایا، تبھی اس نے کہا۔

"جیسے ہی وہ باہر نکلے اسے پکڑ لو۔ میں جیپ کے قریب جا رہا ہوں۔"

میں نے اس رینگتے ہوئے شخص کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب پوری طرح نکل چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ رینگتا ہوا اندھیرے میں جا رہا تھا کہ میں نے چند گز کا فاصلہ انتہائی سرعت سے عبور کیا اور اس پر جا پڑا۔ وہ میری آمد کا احساس کر چکا تھا، وہ ریت پر لیٹا ہوا پلٹا اور اس نے پسٹل سیدھا کر لیا، تب تک میں اس پر جا پڑا تھا۔ اس نے فائر کر دیا تھا جو ہوا میں کہیں گم ہو چکا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں پسٹل تھا میں نے نال اس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بس، اب نہیں......" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ سے پسٹل پکڑ لیا۔ اسی دوران شعیب جیپ کے نزدیک پہنچ کر اندر بیٹھے ہوئے شخص کو باہر نکال چکا تھا۔ اس کی آواز گونج رہی تھی۔

"چلو، اگر کوئی گڑبڑ کی تو......"

کچھ لمحوں بعد وہ اسے روشنی کے سامنے لے آیا۔ میں بکار راجستانی کو پہچان گیا تھا۔ میں نے بھی نیچے پڑے ہوئے شخص کو اٹھایا اور روشنی میں لے آیا۔ وہیں قریب ہی چندو ڈا کھڑا تھا۔ ایسے میں جہانگیر بھاگتا ہوا آیا، اس نے باری باری دونوں کو باندھا اور انہیں گھسیٹ کر اپنی جیپ میں ڈالنے لگا۔

چندو ڈا میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے تصدیق کے لئے پوچھا۔

"تم ہو چندوڑا......"

"ہاں، میں ہوں۔" اس نے مختصر کہا تو میں نے اپنی جیکٹ کی جیب سے دو گڈیاں بڑے نوٹوں کی نکالیں اور اس کی طرف بڑھا کر کہا۔

"چند دن کے لئے یہاں سے غائب ہو جاؤ۔ کوئی بھی رابطہ کرے تو یہی کہنا کہ تم بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور سر جھکا کر ایک جانب اندھیرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا، اس لئے فوراً ہی وہاں سے ہٹ گیا۔ میں فوراً پلٹا اور اپنی جیپ میں جا کر بیٹھ گیا۔ جہانگیر نے جیپ بڑھا دی۔

ہم ڈیرے پر پہنچ گئے تھے۔ وہ دونوں بندھے ہوئے میرے سامنے کچے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے بگا راجستانی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تم تو میرے خواہ مخواہ ہی دشمن بن گئے ہو۔ اور تیرا باپ، وہ بھی مجھے مارنے کا خواہش مند تھا، پر سلام ہے اس راجستانی عورت کو، جس نے اپنے اصول کی خاطر مجھے تمہارے باپ کو نہیں دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تیرے اور تیرے باپ کا قصور نہیں، تم دونوں کے جینیک میں کوئی مسئلہ ہے۔"

"ہم اگر دشمنی کرتے ہیں تو پوری کرتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"چل وقت ضائع نہ کر، اپنی آخری خواہش بتا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں اپنے دشمن کا یہ بھی احسان نہیں لینا چاہتا۔" اس نے کہا تو میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"لگتا ہے تم ہندی فلمیں زیادہ دیکھتے ہو۔ تمہارا ڈائیلاگ اچھا ہے، مگر مجھے اس میں کوئی حقیقت نہیں لگتی۔"

"تمہاری بھول ہے۔" اس نے کہا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑا، اس کی ہتھیلی کو اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر ایک جھٹکا دے دیا۔ اس کی انگلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اس کے منہ سے چیخ بلند ہوئی۔ وہ تڑپ کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ وہ تکلیف برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا دوسرا ہاتھ پکڑا۔ وہ چیخنے لگا۔

"نہیں، مجھے مت مارو......"

"اپنے باپ سے بات کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"اس حالت میں نہیں۔" اس نے کہا تو میں نے اس کی جیب سے اس کا سیل فون نکال لیا۔ پھر اس کے سامنے بیٹھ کر پوچھا۔

"بتا تیرے باپ کا نمبر کیا ہے؟"

"چھوڑ دے۔ نہ کر......" اس نے چیختے ہوئے کہا تو میں نے گھما کے ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے میں وہ نمبر نہیں نکال پاؤں گا۔" میں نے کہا اور نمبر دیکھنے لگا۔ ایک جگہ "باپو" لکھا ہوا تھا، وہ نمبر بھی بارڈر پار کا تھا۔ میں نے کال ملا دی۔ وہ دوسرا میری جانب دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ مجھے سمجھ رہا تھا۔ کال مل گئی تھی۔ میں نے اسپیکر آن کر دیا۔

"بول...... ارے بولتا کیوں نہیں......" اس کا باپ چیخ رہا تھا۔ بگا راجستھانی نے اپنی آواز دبالی تھی۔ تبھی میں نے کہا۔

"تیرا بیٹا تم سے خود بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"تم کون ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے اسے پکڑ لیا ہے، ابھی صرف اس کی انگلیاں توڑی ہیں، کچھ دیر میں گردن میں

توڑ دوں گا۔“ میں نے سفاک انداز میں کہا۔

”کون ہو تم......؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”وہی جسے بختاور لے گیا تھا، جسے ایک تیرے ہی علاقے کی عورت نے تجھے نہیں دیا تھا۔“ میں نے اُسے یاد کراتے ہوئے کہا

”اوہ یہ تم ہو......“ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا پھر تیزی سے بولا۔“ ایک بار میرے بیٹے سے میری بات کروا دو۔“

”وہ سن رہا ہے۔“ میں نے کہا تو چیخ کر اسے بات کرنے کو کہنے لگا۔ تبھی بگا راجستانی نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

”ہاں، میں پکڑا گیا۔“

”تو دھیرج رکھ میں بات کرتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”کیا بات کرے گا تو......؟“ میں نے کہا۔

”اسے مار مت، جو لینا ہے وہ لے لے، بول کیا مانگتا ہے، میں وہ تمہیں دوں گا؟“ اس نے پوچھا۔

”چل پھر ایسا کر، اسی عورت کے پاس جا، جس نے میری حفاظت کی تھی، اس کی منت کر معافی مانگ اور اسے اتنے روپے دے کر آ کہ وہ خوش ہو جائے۔ تیرا اور میرا معاہدہ صرف دو گھنٹے تک ہے، تب تک میں اسے ماروں گا نہیں۔“ میں نے ٹھہر ٹھہر کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”میں دو گھنٹے سے پہلے فون کرتا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔ بگا راجستانی میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کر دی ہو۔ اس کے چہرے پر کافی حد تک اطمینان پھیل گیا تھا۔ میں نے اسے لے جانے کا اشارہ کیا اور اس ایجنٹ کے

پاس چلا گیا جو تھوڑے سے فاصلے پر بندھا پڑا تھا۔ میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"میں نہیں پوچھوں گا تمہارا نام کیا ہے، کوئی بھی ہو، رہو گے تو میرے دشمن ہی نا۔ ہاں اتنا ضرور پوچھوں گا، تمہیں کوئی مجھ سے ذاتی دشمنی ہے؟"

"نہیں، مجھے تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"تو پھر بارڈر پار کر کے، یہاں میری دشمنی میں کیوں آئے ہو؟" میں نے سکون بھرے لہجے میں پوچھا تو وہ خاموش رہا۔ میں اس کے چہرے پر دیکھتا رہا، جہاں سختی آ گئی تھی۔ بلاشبہ وہ بہت کچھ سوچ رہا تھا، تبھی میں نے کہا، "تم کوئی ایسے تربیت یافتہ ایجنٹ نہیں ہو جو اکیلا ہی سو پر بھاری ہوتا ہے، تم تو بازو چلتی عورتوں سے پیسے چھیننے والے غنڈے موالی کی طرح لگتے ہو۔ اس لئے زیادہ نخرے مت دکھاؤ، جو پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ۔ خاموش رہو گے تو تیرا انگ انگ بولنے لگے گا۔"

"تم جانتے ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔" اس نے کہا۔

"وہی تو، وہی تو جاننا چاہتا ہوں، تیرے منہ سے سننا چاہتا ہوں بھڑوے، بول......"
میں نے سختی سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"ہمیں پوجا نے یہاں بھیجا تھا۔"

"اوہ...... پوجا، کلیان جی والی، بہت اچھا کیا اس نے تیرے جیسے موالیوں کو یہاں بھیج کر۔" میں نے حقارت سے کہا پھر اس کے چہرے پر دیکھ کر بولا، "چل، لگا فون اپنی پوجا کو ذرا میں بھی اس سے بات کر لوں۔"

میرے یوں کہنے پر اس نے اپنی جیب سے فون نکالا، نمبر پش کئے اور کال ملنے کا انتظار کر

نے لگا۔ میں نے فون اس سے پکڑ لیا اور اس کا اسپیکر آن کر دیا۔ کچھ دیر بعد پوجا کی آواز گونجی
''ارے پوجا، کیسی ہے تو......'' میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔
''کون بات کر رہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''ارے اتنی جلدی بھول بھی گئی، ابھی چند دن پہلے تو مجھے تنہائی میں وقت دینے کو مچل رہی تھی۔ میں نے......'' میں کہہ رہا تھا کہ وہ حیرت سے بولی۔
''ویر سنگھ تم......؟''
''اتنی پریشان کیوں ہو پوجا جی؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔
''مطلب ہمارا دوسرا آدمی بھی تمہارے قبضے میں ہے۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہاں بیٹھی تڑپ گئی ہو۔
''ہاں پہلے کو میں نے مار دیا تھا۔'' میں نے سکون سے یوں کہا جیسے کوئی مکھی مار دی گئی ہو۔
تب وہ تیزی سے بولی۔
''میں جانتی ہوں، تم اسے بھی مار دو گے۔ مگر یہ یاد رکھو میں......''
''چھوڑو مستقبل کی باتیں، سنو مجھے تم سے ایک شکوہ ہے۔''
''کیسا شکوہ......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔
''یہ تم نے کیا غنڈے موالی، تھرڈ کلاس قسم کے لوگ بھیجے ہیں، کوئی کام کا بندہ بھیجتی، پتہ چلتا کہ کلیان جی والوں نے اپنا کوئی تربیت یافتہ بندہ بھیجا ہے۔ یا پھر تم خود ہی آ جاتی، یہاں بڑی تنہائی ہے۔'' میں نے طنزیہ کہا۔
''بہت جلد میں تم تک پہنچ جانے والی ہوں۔'' اس نے غصے میں کہا۔
''میں تمہارا انتظار کروں گا تم یہاں مکمل تنہائی پاؤ گی۔'' میں نے اس کا مذاق اڑاتے

ہوئے کہا تو وہ دھاڑی۔

"بکواس بند کرو، اسے چھوڑ دو۔ میں سب بھول جاؤں گی۔"

"چلو چھوڑ دیا، لیکن میرے پاس آنا مت بھولنا۔" میں نے کہا۔

"تم اس لئے وہاں بیٹھے بکواس کر رہے ہو کہ ہم نے تمہیں اہمیت نہیں دی تھی۔ اگر ہمیں پتہ ہوتا کہ تم اس قدر خطرناک ہو تو میں تمہیں گولی مار دیتی۔" اس نے حقارت سے کہا۔

"تمہارا حسن کیا گولی سے کم ہے پوجا، ہم تو گھائل ہو گئے۔ اب بتاؤ، کیا کرنا ہے اس کا، مار دوں، یا چھوڑ دوں۔" میں نے پوچھا۔

"چھوڑ دو، اور بتاؤ اس کے عوض کیا چاہتے ہو؟" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے پوچھا تو میں انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"ظاہر ہے اس غنڈے موالی کے لئے تم راکیش ورما کو تو مارنے سے رہی۔ ہمارے کچھ لوگ تمہاری طرف پھنسے ہوئے ہیں، انہیں بارڈر تک بھیج دو، میں اسے ہی نہیں کچھ دوسرے لوگ بھی بارڈر سے بھیج دوں گا۔ ورنہ آج کے بعد میرا ایک ہی ہدف ہوگا کہ بارڈر سے ادھر آیا ہوا ہر بندہ اُڑا دوں۔"

"کون سے لوگ پھنسے ہوئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"وہی جو اکیڈمی میں تھے۔ اپنے بڑوں سے بات کرو۔ صرف دو گھنٹے ہیں تمہارے پاس۔" میں نے کہا۔

"میں ابھی تمہیں بتاتی ہوں۔" اس نے کہا اور کال بند کر دی۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو شعیب میری طرف دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یار، تم دوسروں کا اتنا خیال رکھتے ہو، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

"کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اسے گلے لگا لیا۔ پھر میں نے بختاور سے کہا۔ "یار ان دونوں کو پانی پلا دو، کچھ کھانے کو دو۔ یہ اگلے دو گھنٹوں تک ہمارے مہمان ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" بختاور نے کہا اور اٹھ کر صراحی کی جانب بڑھا۔

میں اٹھ کر رہائشی حصے میں آ گیا۔ صحن میں کچھ نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ ساوری اماں سکینہ کے کمرے میں تھی۔ وہ پلنگ پر بیٹھی جاگ رہی تھی۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ میں نے اسی پولیس افسر کا فون ملایا جو شام کے وقت پنچائت میں تھا۔ کچھ دیر بعد ہی اس نے کال رسیو کر لی۔

"ہاں بولو جی......" اس نے خمار آلود آواز میں کہا۔

"وہی تین جنہوں نے سردار نور حیات کے ہاں پناہ لی ہوئی تھی، جن کا ذکر شام کے وقت بھی ہوا تھا۔" میں نے اسے بتایا۔

"ہاں، کیا ہوا؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"انہوں نے ہم پر حملہ کیا، ایک بھاگ گیا اور دو میرے قبضے میں ہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"رئیلی......" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ میرے ڈیرے پر ہیں، آ کر لے جا سکتے ہیں تو ٹھیک، ورنہ مجھے بتائیں میں انہیں گولی مار دوں، وہ دونوں ہارڈر ہار رہے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"نہیں نہیں، انہیں کچھ نہ کہنا، میں پہنچتا ہوں۔ وہ ہمارے لئے بڑے قیمتی ہوں گے۔"

"بس پھر آ جائیں۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور ساوری کے چہرے پر دیکھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر یونہی دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔

"اب پنچائت والی بات تو نہ رہی نا؟"

"نہیں، وہ اپنی جگہ موجود ہے۔ بات تو پیروزاں کی ہوئی تھی۔" میں نے کہا تو وہ دھیمے سے بولی۔

"پھر یہ کیوں......؟"

"ان کے ساتھ جو بھی ہو، ان کے بارے میں تو نور حیات مانا ہی نہیں تھا، یہی اس کی کمزوری تھی۔ لیکن انہیں چھوڑ دینے کا مطلب تھا کہ ایک خوف ہم پر مسلط رہتا۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"تم نے جو کیا اچھا کیا۔ مگر یہ یاد رکھنا، اب یہاں پر تمہارا سب سے بڑا دشمن سردار نور حیات ہی ہوگا۔ وہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکے گا کہ......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑا، پھر اسے دونوں ہاتھوں میں لے کر سہلاتے ہوئے کہا۔

"تم نے پریشان نہیں ہونا، ایسے دشمن تو ہماری قسمت میں لکھ دیئے گئے ہوئے ہیں نا، جہاں سانپ ہوگا، وہاں مارخور تو ہوگا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کی پریشان آنکھوں میں دیکھا پھر نرمی سے بولا، "تم ایسا کرو، سکون سے سو جاؤ، تاکہ صبح مجھے پراٹھے بنا کر کھلاؤ۔ بہت عرصہ ہو گیا، مکھن والے پراٹھے نہیں کھائے، ساتھ میں لسی ہوگی نا۔"

اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔"

”میں کچھ دیر تمہارے پاس……“

”مجھے سونا ہے۔“ اس نے کہا اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر باہر چل دیا۔

میں ڈیرے پر آ گیا تھا۔ ابھی ڈیڑھ گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ بگا راجستانی کا فون بج اٹھا، میں نے کال رسیو کی تو میری توقع کے مطابق اسی کا باپ تھا۔

”ہاں لے بات کر اس سے……“ اس کے باپ نے کہا اور چند لمحوں بعد ایک خمار آلود نسوانی آواز ابھری، ”تم ٹھیک ہو نا؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ اس کی آواز سنتے ہی میں جذباتی ہو گیا تھا۔

”حیرت ہے تم نے مجھے یاد رکھا۔“ اس کے لہجے میں حیرانگی چھلک رہی تھی۔ میں لمحہ بھر خاموش رہا، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”میں احسان کرنے والوں کو اور دھوکا دینے والوں کو کبھی نہیں بھولتا۔ بول، تم سے اس نے معافی مانگی؟“

”ہاں معافی مانگ لی، روپے بھی دیے ہیں۔“ اس نے خوش ہوتے ہوئے بتایا۔

”تم خوش ہو نا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں میں خوش ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”چل، اب میں اس کے بیٹے کو چھوڑ دوں گا، بتا دے اسے۔“ میں نے کہا تو اس نے فون واپس دیتے ہوئے یہ بات بھی کہہ دی۔ اگلے چند لمحوں بعد اس کے باپ سے بات کر کے میں نے فون بگا کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

”چل، میں نے تمہیں چھوڑ دیا، ماروں گا نہیں۔“

وہ شرمندہ سا میری طرف دیکھنے لگا تھا۔ میں نے اسے کمرے میں بند کر دینے کو کہا۔

مجھے گمان تھا کہ پوجا کا فون بالکل بھی نہیں آئے گا۔ اگر آ بھی جاتا تو وہ جانیں اور وہ لوگ جانیں جن سے وہ متعلق تھے۔ ہم سب وہاں پر گپ شپ لگانے لگے۔ یہاں تک کہ صبح کی نیلگوں روشنی پھیل گئی تھی۔ ایسے میں پولیس افسر کی کال آ گئی۔

"ہم لوگ پہنچنے والے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ تک، وہ دونوں ہیں نا ادھر؟" اس نے تصدیق کی۔

"ہاں موجود ہیں۔" میں نے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔

ڈیرے کے ارد گرد بھاری پولیس فورس آ گئی تھی۔ صرف میں وہاں کھڑا تھا، باقی سب رہائشی حصے میں تھے۔ وہ کسی بھی غیر متوقع حالات کے لئے تیار تھے۔ لیکن پولیس آفیسر نے اپنا وعدہ نبھایا، اس نے کسی کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، ان دونوں کو اٹھایا اور اگلے پانچ منٹ میں وہ واپس پلٹ گئے۔ کچھ دیر بعد ہر طرف سکون چھا گیا۔

☆......☆......☆

اس وقت ساوری آٹا گوندھ رہی تھی۔ سانول نے دودھ کا بھرا ہوا کین لا کر رکھ دیا تھا۔ ساتھ میں بستی چراغ شاہ سے دو تین عورتیں بھی لے آیا تھا۔ گھر کا ایک ایسا ماحول بن چکا تھا، جیسے یہاں کبھی کوئی ایک فائر بھی نہ ہوا۔ نیلگوں روشنی ختم ہو گئی تھی۔ سورج نکل آیا تھا۔ میں صحن میں بچھی چارپائی پر فریش ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ ایسے میں میرا فون بج اٹھا۔ میں نے چوہدری آصف کا نمبر دیکھا تو مجھے لگا، جیسے اسے ساری خبر ہو گئی ہو۔ میں نے کال رسیو کی تو اس نے بڑے خوشگوار موڈ میں کہا۔

"اچھا کیا تم نے پولیس کی مدد کی۔"

"کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟" میں نے پوچھا تو وہ بولا۔
"یہی تو کہہ رہا ہوں کہ اچھا کیا۔ پتہ ہے اس کا اثر کیا ہوا ہے؟"
"کیسا اثر......؟" میں نے پوچھا۔
"نور حیات روہی سے بھاگ کر شہر آ گیا ہے۔ کہنے کو تو وہ پیروزاں سے بات کرنے آیا ہے لیکن یہاں کچھ اور ہی چل رہا ہے۔" اس نے بتایا۔
"کیا چل رہا ہے؟" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔
"دیکھو جلی، تم نے چاہے مجھے اغوا کیا، چاہے کسی کے کہنے پر مجھے چھوڑا لیکن چھوڑ دیا۔ تم چاہتے تو مجھے قتل کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے میں نے تمہیں نقصان بھی تو پہنچایا تھا۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہتا ہوا خاموش ہو گیا پھر لمحہ بھر بعد بولا، "تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں تمہارے احسان کا بدلہ دے دوں۔"
"کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔
"تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پیروزاں آج گیارہ بجے کے قریب یہاں سے فلائی کر جائے گی۔ شاید وہ پھر کبھی ہاتھ نہ آئے۔" اس نے کہا تو میرے اندر سنسنی پھیل گئی۔
"گیارہ بجے کی فلائیٹ ہے؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں، اکلوتا فوکر جہاز اسی وقت جاتا ہے۔" اس نے بتایا۔
"اوہ......" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔
"تمہارے پاس تقریباً چار گھنٹے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اگر تم اس دوران کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔" اس نے وہ بات کہہ دی جس کے لئے اس نے فون کیا تھا۔
"ٹھیک ہے۔ میں بعد میں بات کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور کال بند کر دی۔ میں تیزی

سے کچن میں گیا۔ ساوری آٹا گوندھ چکی تھی۔ میں نے اسے بلایا تو پریشان سی اٹھ کر باہر آ گئی۔ میں نے اسے فون کال بارے بتایا۔

"مجھے اندازہ تھا وہ ایسے ہی کرے گی۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"تم فوراً رحاں مائی سے پوچھو، اس اطلاع کی تصدیق کرو، فوراً۔"

"ابھی کرتی ہوں۔" اس نے کہا اور تیزی سے اماں سکینہ والے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میں نے بختاور کو فون کر دیا۔ اسے ساری صورتحال بتا کر کہا۔

"ہو سکتا ہے ہم ابھی نکلیں۔"

"لیکن ہم سارے نہیں جا سکتے۔" اس نے کہا۔

"جو بھی کرنا ہے، جس نے بھی جانا ہے، فوراً تیاری کرو، ہمیں ابھی نکلنا ہے۔" میں نے تیزی سے کہا اور کال بند کر دی۔

میں ساوری کے پیچھے ہی اماں سکینہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ رحاں مائی سے بات سن رہی تھی۔ وہ بات سن چکی تو فون بند کر کے بولی۔

"یہ اطلاع سچ ہے۔"

"وہ اس وقت کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو رحاں کو بھی نہیں پتہ۔" اس نے کہا تو میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"چل کوئی بات نہیں، میں دیکھتا ہوں۔"

"کیا تم جا رہے ہو؟" ساوری نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، میں ابھی نکل رہا ہوں۔" میں نے اسے بتایا۔

"تو پھر مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ تم کیا کروگی وہاں جا کر؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں رہی تو میرے لئے خطرہ ہے، وہاں تمہارے ساتھ ہوں گی تو......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے ٹوک دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خواہ مخواہ بہانہ بنا رہی ہے۔

"ساوری یہاں تمہیں کیا خطرہ ہے؟ سب ہیں نا یہاں پر۔ وہاں جا کر تم کیا کر سکتی ہو؟"

"میں تمہارے ساتھ رہی تو رحماں مائی سے رابطہ رکھوں گی۔ اگر پیروزاں نکلی تو مجھے رحماں مائی کو اپنے ساتھ لانا ہے، میں اسے بہاول پور نہیں چھوڑ سکتی۔" اس نے تیزی سے دلیل دی تو میں نے ایک لمحہ کے لئے سوچا اور اسے چلنے کو کہا۔

اگلے دس منٹ میں ہم بستی چراغ شاہ سے نکل چکے تھے۔ ہم دو گاڑیوں میں تھے۔ میرے ساتھ ساوری اور جہانگیر تھے، دوسری گاڑی میں بجنا ور، شعیب اور مدثر تھا۔

جہانگیر ممکن حد تک تیز رفتاری سے گاڑی بھگائے چلا جا رہا تھا۔ ہم تین گھنٹوں میں شہر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ بجنا ور ائیر پورٹ کے پورے علاقے کو جانتا تھا۔ وہ ہمیں بستیوں کے درمیان سے نہر کنارے چلتے ایسے راستوں سے لے گیا، جہاں صرف ایک چیک پوسٹ ہمارے راستے میں آئی تھی۔ ہمارے پاس ایک ایک پسٹل تھا، جسے ہم نے بڑی خوبی سے چھپایا ہوا تھا۔ تھوڑی سی چیکنگ کے بعد ہمیں جانے دیا گیا تھا۔

صحرا کے درمیان میں بنے ہوئے ویران ائیر پورٹ کی پارکنگ میں ہم نے گاڑیاں کھڑی کیں اور ایک شیڈ کے نیچے آ کر کھڑے ہو گئے۔ ظاہر ہے ہمیں کسی کا انتظار تھا۔ ہمیں وہاں آئے دس پندرہ منٹ ہو گئے تھے۔ پارکنگ میں صرف دو گاڑیاں آئی تھیں۔ ان میں پیروزاں نہیں تھی۔

"ممکن ہے وہ پہلے آ چکی ہو اور بورڈنگ لے کر بیٹھ بھی چکی ہو۔" جہانگیر نے اپنا خیال

ظاہر کیا تو ساوری نے تیزی سے کہا۔
"نہیں ایسا نہیں ہے۔ وہ ابھی تک ائیر پورٹ تک نہیں پہنچی ہے۔"
"تمہیں اتنا یقین کیسے ہے؟" میں نے پوچھا۔
"میں نے رحماں مائی سے کہا ہے کہ جیسے ہی پیروزاں ائیر پورٹ جائے تو مجھے فون کر دے، میں آ کر اسے لے جاؤں گی۔" ساوری نے بتایا۔
"ہو سکتا وہ......" میں کہنے ہی والا تھا کہ ساوری کا فون بج اٹھا۔ اس نے تیزی سے کال رسیو کر لی۔
"ہاں بول رحماں......" یہ کہہ کر وہ سننے لگی۔ پھر بولی، "ٹھیک ہے تم سامان باندھ لو، میں ابھی آدھے گھنٹے میں تمہیں لے لیتی ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے فون بند کیا اور میری طرف دیکھ کر بولی، "وہ دس پندرہ منٹ پہلے نکلی ہے۔"
"اور راستہ آدھے گھنٹے کا ہے۔" بجناور نے کہا۔
"بس پھر، مزید دس پندرہ منٹ انتظار کرو۔" جہانگیر نے کہا۔
میں اور ساوری ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے، یوں جیسے فوراً ہم پر نگاہ نہ پڑے۔ خوف زدہ بندے کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ وہ چاروں طرف سے چوکنا ہوتا ہے۔ اس نے پارکنگ کی طرف آنا ہی نہیں تھا۔ اسے گاڑی نے ائیر پورٹ کی عمارت کے بالکل سامنے اتارنا تھا جہاں سے اس نے اندر چلے جانا تھا۔ ہم پارکنگ میں اس لئے کھڑے تھے کہ فوراً گاڑی لے جا سکیں۔ بجناور کے ساتھ باقی لوگ اس طرح وہاں پھیل گئے تھے۔ جیسے ہی پیروزاں کی گاڑی وہاں آئے، وہ اپنی کارروائی کر ڈالیں۔
ہم سب جانتے تھے کہ یہاں ہر طرف فورسز ہیں۔ اگر تھوڑا سا بھی کسی کو شک ہو گیا تو پھر

ہمیں ہر طرف سے گھیرا جا سکتا تھا۔ میں نے ہر طرف کا جائزہ لے لیا تھا۔ میں نے خیالوں ہی خیالوں میں دو تین آپشن پر غور کیا اور ساوری کو وہیں چھوڑ کر ائیر پورٹ عمارت کے اندر چلا گیا۔ میں نے مدثر کو فون کر کے سمجھا دیا کہ کیا کروں تو اس نے کیا کرنا ہے۔

میں اور بختاور اوٹ میں کھڑے بظاہر باتیں کر رہے تھے لیکن ہماری نگاہ ہر آنے والی گاڑی پر تھی۔ تبھی ایک فور وہیل تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دی۔ وہ جیسے ہی آ کر رکی۔ بختاور نے ڈرائیور کو پہچانتے ہوئے بے ساختہ کہا۔

"وہ آ گئی۔"

ہم تیزی سے باہر کی جانب آئے۔ تب تک ڈرائیور اپنا دروازہ کھول کر نیچے اتر چکا تھا۔ شاید اس نے سامان اتارنا تھا۔ جیسے ہی وہ مڑا، بختاور نے سامنے سے آ کر انتہائی سرعت سے چھلانگ ماری اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تب تک میں نے پچھلا دروازہ کھولا۔ اندر پیروزاں پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے پسٹل اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ ڈرائیور نے یہ سب دیکھ لیا تھا۔ تبھی بختاور نے اس پر پسٹل تانتے ہوئے کہا۔

"پیچھے بیٹھو ورنہ ادھر سے گولی آ کر تمہیں لگ سکتی ہے۔"

وہ سمجھدار تھا، وہ پیروزاں کے دوسری جانب آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دروازہ بند بھی نہیں کیا تھا کہ بختاور نے فور وہیل ایک دم سے بڑھا دی۔

پیروزاں میرے ساتھ سہمی ہوئی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ سب کو پتہ چل گیا تھا کہ ہم پیروزاں کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ بھی ہمارے پیچھے آنے لگے۔ میں نے ایک ہی گاڑی دیکھی تھی۔ ممکن ہے دوسری گاڑی اس کے پیچھے آ رہی ہو۔ بختاور نے ائیر پورٹ کی حدود سے نکلنا تھا اس لئے رفتار نارمل کر لی، ایک ہی چیک

پوسٹ تھی۔ وہ جانے والے کو اتنا زیادہ نہیں دیکھ رہے تھے۔ ہم بغیر چیک ہوئے وہاں سے نکل پڑے۔ ابھی تھوڑا دور ہی گئے تھے کہ پیروزاں کراہی۔

”علی ...تم میری بات......“

”بول کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مم...... میں...... نے سارے...... کاغذ...... نورحیات...... کو دے دیئے ہیں۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”ہمیں کاغذوں کا کیا کرنا ہے، جب تک سارا کچھ ساوری کے نام نہیں ہو جاتا۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔

”وہ...... اس نے وعدہ کیا تھا...... کہ سب کچھ...... نام کروا...... دے گا۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”تیرے دستخط جب تک نہیں ہوں گے ایسا کیسے ممکن ہے میری جان۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”وہ پاور آف اٹارنی......“ اس نے کہنا چاہا تو میں دھاڑتے ہوئے بولا۔

”بھاڑ میں گئی تیری اٹارنی، سن میری بات......“ میں نے کہا تو وہ میری جانب دہشت سے دیکھنے لگی۔ میں نے سکون سے کہا۔ ”بستی چراغ شاہ جاتے ہیں، وہاں بیٹھ کر بات کریں گے۔ اس دوران اگر تھوڑی بہت بھی تیری طرف سے بے غیرتی ہوئی تو میں اسی وقت تمہیں مار دوں گا۔“

”یہ ڈرائیور کو بھی چیک کر اس کے پاس اسلحہ تو نہیں ہے۔“ بختاور نے میری توجہ ڈرائیور کی طرف کراتے ہوئے کہا۔

''نن....... نہیں، میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ تیزی سے اپنی صفائی دینے لگا تو میں نے بختاور سے کہا۔

''اگر اس ڈرائیور نے کچھ بھی کیا تو مرے گی پیروزاں ہی۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا تو وہ مزید سہم گئی۔

''نہیں یار، اتار اسے، یہ خرابی کر سکتا ہے۔'' اس نے کہا اور فور وہیل روک دی۔ ہم اس وقت ویران صحرا سے گزر رہے تھے۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''اسے اتارو نہیں، اسے دیکھ لو۔'' میں نے صلاح دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اتارو۔'' اس نے نجانے کیوں ضد کر لی۔

وہ ڈرائیور نیچے اتر گیا۔ اتنے میں پیچھے والی گاڑی بھی پہنچ گئی۔ انہوں نے اسے سنبھال لیا۔ بختاور پھر سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور فور وہیل بھگا دی۔ سامنے دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''ہاں اب بولو، تم کس طرح مرنا پسند کرو گی؟'' میں نے پیروزاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے جھک کر میرے پاؤں پکڑ لئے، پھر روتے ہوئے بولی۔

''دیکھ، میں تیرا مقابلہ نہیں کر سکتی، میں اسی لئے باہر چلے جانا چاہتی تھی۔ میرا سب کچھ لے لو، مجھے یہاں سے جانے دو۔''

''وہ ظلم، جو تم نے کئے، اس کا کیا ہوگا، میں تو معاف کر دوں گا، لیکن وہ لوگ کیسے معاف کریں گے۔'' میں نے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے بختاور کے بھائی کو مروایا تھا۔

وہ تمام راستے روتی رہی۔ اس کی حالت ایسے تھی جیسے کسی مجرم کو پھانسی کے تختے تک لے

جایا جاتا ہے۔ وہ کراہتی رہی، روتی رہی۔ وہ جتنا بھی ایسا کچھ کر رہی تھی، میری آنکھوں کے سامنے وہ بچپن میں دیکھے شعلے آ رہے تھے۔ میری ماں ایک طرف پڑی ہوئی تھی، اس کی سانسیں ختم ہو چکی تھیں۔ اسی عورت نے اسے مارا تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ میرن شاہ کی شکایت لے کر گئی تھی۔ شکائت یہ تھی کہ اس نے اس کی جوان سال بیٹی کو اپنی ڈیرے پر لے جا کر اس کا ریپ کر دیا تھا۔ بجائے اس کی شکایت سننے کے، اسی بیرو زاں نے میری ماں کو ڈنڈوں سے مار مار کر گھر سے بھگا دیا۔ میں نے اپنی بہن کا بدلہ تو لے لیا تھا، لیکن میری ماں کی لاش اب بھی مجھ سے سوال کرتی تھی کہ اس کا بدلہ میں نے اب تک کیوں نہیں لیا تھا۔

میں اپنے باپ کا احسان مند تھا کہ اس نے مجھے بھاگ جانے کو کہا تھا۔ وہ خود شعلوں میں جل رہا تھا، ہمارے گھر کو آگ لگا دی گئی تھی۔ میں بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ میرے اندر اگر زمانے سے لڑنے کی ہمت آئی تھی تو ان شعلوں کی وجہ سے، اس بھڑکتی ہوئی آگ کو میں کبھی بھی نہیں بھلا پایا تھا۔ میں کچھ عرصہ تک رویا تھا۔ اسی زمانے نے مجھے اپنی ٹھوکر پر رکھا تھا، لیکن پھر میں نے آنسو پی لئے، انہی آنسوؤں کو میں نے اپنی طاقت بنا لیا۔ میں زمانے کے ساتھ لڑنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں تو ساری زندگی آگ میں جل کر یہاں تک پہنچ گیا تھا، کیا ہر کوئی اس طرح ان بے غیرت حکمرانوں سے بدلہ لے سکتا ہے؟ کیڑے مکوڑوں جیسی زندگی گزارنے والے لوگ خود قصوروار ہیں جن کی وجہ سے یہ ان کے حاکم بن جاتے ہیں۔

ایک دم سے بریک چرچرائے، میں چونک کر اپنے خیالوں سے باہر نکل آیا۔ دائیں طرف سے سڑک پر ایک گائے آ گئی تھی۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"دھیان سے بختاور......"

"تم بھی دھیان کرو، کہیں یہ تمہارا پسٹل ہی نہ چھین لے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں

سنبھل گیا۔

ہم بستی چراغ شاہ پہنچ گئے تھے۔ ڈیرے کے باہر لوگ اکٹھے ہو گئے ہوئے تھے۔ چاچا سائیں کو بھی خبر ہو گئی تھی۔ وہ بھی ڈیرے پر پہنچ چکا تھا۔ بختاور نے ڈیرے کے اندر لے جا کر گاڑی کھڑی کر دی۔ پیروزاں فوراً جیل سے نیچے اتری تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ ایک چارپائی پر ڈھے سی گئی۔ وہ ہونقوں کی مانند ہر طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔ وہ کبھی میری طرف دیکھتی اور کبھی ڈیرے کی طرف۔

''تم وہ ڈائن ہو، جس نے میرے دو بھائی کھائے ہیں، جانتی ہو نا۔'' بختاور نے انتہائی غصے میں کہا۔ وہ خاموشی سے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ اتنے میں دوسری گاڑی ڈیرے میں داخل ہوئی۔ اس میں سے مہر جہانگیر کے ساتھ ڈرائیور نکلا۔

''ساوری کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ پچھلی گاڑی میں ہو گی۔'' جہانگیر نے یونہی کہا۔

''اور پچھلی گاڑی کہاں ہے؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''میں نے دیکھی تو نہیں۔'' جہانگیر نے کہا تو ایک دم سے بے چینی میرے اندر پھیل گئی۔ ساوری کو اتنی دیر کیوں ہو گئی؟ وہ کہاں گئی؟ اگر وہ رحماں مائی کو لینے گئی تھی تو اب تک واپس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں نے تیزی سے فون نکالا، ساوری کے نمبر ملائے اور کال کر دی۔ دوسری طرف بیل گئی تو اس نے کال رسیو کر لی۔

''کہاں ہو تم؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''میں بس تھوڑی دیر میں پہنچ جاؤں گی۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''کہاں ہو تم؟'' میں دھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"میں رحماں کو لینے چلی گئی تھی، وہ میرے ساتھ ہے، بس میں پہنچ رہی ہوں۔" میں نے سنا تو انہیں لمحات میں ایک دم سے میرے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اگرچہ میں پیروزاں کو اب کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا، لیکن اس کے ساتھ کھیل تو سکتا تھا۔ تبھی میں نے افسوس ناک انداز میں بختاور کی طرف دیکھتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

"ساوری کو نور حیات کے لوگوں نے اغوا کر لیا ہے۔"

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ چاچا سائیں نے یوں مجھے دیکھا جیسے میں نے کوئی انہونی کہہ دی ہو۔

"اوہ مجھ سے غلطی ہو گئی میں ساتھ نہیں گیا۔" جہانگیر نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا تو بختاور نے پوچھا۔

"کیا کہتے ہیں؟"

"کہہ رہے ہیں کہ ساوری کو لے جانا ہے تو پیروزاں واپس کر دو۔"

"اوہ..... ساری محنت اکارت گئی۔" بختاور نے بے بسی سے کہا تو پیروزاں اٹھی اور تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ہم سب کی طرف دیکھا اور حقارت بھرے لہجے میں بولی۔

"اگر تم مجھے مارو گے تو وہ ساوری کو مار دیں گے، ایسا ہی ہے نا؟"

"ہاں، وہ یہی کہہ رہے ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"چلو پھر چھوڑ آؤ مجھے ان کے پاس، تیری تو ساری محنت بے کار گئی۔" اس نے اسی حقارت بھرے لہجے میں یوں کہا جیسے مجھے گالی دے رہی ہو۔

"بول علی، اب ساوری کو بچانا ہے یا اس پیروزاں کو ختم کرنا ہے؟" بختاور نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ وہ فیصلے کا سارا بوجھ مجھ پر ڈالنا چاہ رہا تھا۔ ظاہر ہے جس کے سامنے اس کے

بھائیوں کی قاتل کھڑی ہو، اور اس سے بدلا لینا بھی کوئی مشکل نہ ہو، جسے وہ سسکا کر مار بھی سکتا ہوں، اس کی حالت کو میں سمجھ سکتا تھا۔ ساوری اس کے لئے ایک نوکرانی کی حیثیت رکھتی تھی۔ ساوری کے بدلے میں ایک نوکرانی کو قربان کر دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بختاور کے یوں پوچھنے پر، مجھ سے فیصلہ لینے پر میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ کم از کم خود غرض نہیں ہے۔ تبھی میں نے بے بسی سے کہا۔

"بختاور...... میں نے ساوری کو بچانا ہے۔"

میرے یوں کہنے پر اس نے لمحے میں فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"چل پھر، اسے دے کر ساوری کو لے آتے ہیں۔"

بختاور کے لہجے میں ایسی بے بسی تھی جیسے کوئی جیتی ہوئی بازی اچانک ہار جانے پر ہوتی ہے۔ اسکی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں لیکن میرے فیصلے کے آگے اس نے سر جھکا دیا تھا۔ اپنے بھائیوں کے قاتل کو چھوڑ رہا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب بختاور کی عزت میرے دل میں گھر کر گئی۔ ہمارے سامنے پروزاں تنی ہوئی کھڑی تھی۔ اس نے سب کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھا اور پھر چاچا سائیں کے سامنے آ کر ہتک آمیز لہجے میں بولی۔

"دوستی اپنے جیسوں کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے، سردار تو پھر سردار ہی ہوتے ہیں نا، دشمنی بھی اپنے برابر والوں کے ساتھ کی جاتی ہے۔ تم جیسے لوگوں کی دشمنی ہم جیسے سرداروں کے ساتھ بالکل نہیں جچتی۔ میں واپس آؤں گی، یاد رکھنا۔" یہ کہہ کر اس نے ڈیرے پر موجود ہر شخص کو فاتحانہ انداز سے دیکھا اور بڑے کروفر سے فور وہیل میں بیٹھ گئی۔

میں دیکھ رہا تھا، پروزاں نے کس طرح گرگٹ کی مانند رنگ بدلا تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر بھی اس کے اندر سے خباثت نہیں گئی تھی۔

بختاور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، میں پیروزاں کے ساتھ بیٹھنے لگا تو اس نے کہا۔" آگے بیٹھ ......"

"وہاں، میرا ایک دوست بیٹھے گا۔"

"نہیں، تیرے اور بختاور کے سوا کوئی نہیں جائے گا۔" اس نے تنک کر کہا۔

"دیکھ پیروزاں یہ زیادتی ہے۔ وہاں زیادہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔" میں نے لجالت سے کہا۔

"نہیں، صرف تم اور بختاور، باقی سب یہیں۔" اس نے تحکمانہ انداز میں کہا تو میں آگے بیٹھ گیا۔ بختاور نے فوروہیل آگے بڑھا لی۔ وہ تیزی سے چل پڑا۔ جیسے ہی ہم بستی سے ذرا دور ہوئے۔ پیروزاں نے اپنا سیل فون نکال لیا۔ میں نے بختاور سے فوروہیل روکنے کو کہا۔ اس نے فوروہیل روک دی۔ میں اتر کے پیچھے آیا اور اس کا سیل فون چھین لیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" میں نے وحشت زدہ لہجے میں کہا تو وہ میری طرف دیکھتی رہ گئی۔ بختاور نے فوروہیل بڑھا دی۔ میں نے اپنا سیل فون نکالا اور ساوری کا نمبر ملا کر پوچھا۔

"کہاں ہو؟"

اس نے مجھے وہ جگہ بتائی جہاں وہ اس وقت تھی۔

"وہاں رک جاؤ، میں آ رہا ہوں۔" میں نے سکون سے کہا۔

میرے یوں کہنے پر پیروزاں بے تاب ہو گئی۔ اس نے گھبراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور سہمے ہوئے انداز میں بولی۔

"یہ تم کس سے بات کر رہے تھے؟"

"ساوری سے......" میں نے سکون سے کہا تو بختاور نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔

"وہ تو......" پیروزاں بس اتنا ہی کہہ سکی پھر سیٹ پر یوں ڈھ گئی جیسے موت کو اپنے سامنے دیکھ لیا ہو۔ وہ مجھ سے مزید کچھ پوچھ نہ سکی۔ اگلے دس منٹ تک میں وہاں پہنچ گیا۔ شعیب گاڑی سے باہر نکل کر کھڑا ہوا تھا۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی ساوری بھی گاڑی سے باہر آ گئی۔ رحماں اندر ہی بیٹھی رہی تھی۔ پیروزاں انہیں یوں سامنے دیکھ کر حیرت سے پاگل ہو گئی تھی۔

"یہ کیا......؟" اس کے منہ سے خوف زدہ انداز میں نکلا تو میں نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

"سردار تو پھر سردار ہی ہوتے ہیں نا۔"

"چل باہر نکل۔" بختاور نے یوں کہا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ اسے ساری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا۔ پیروزاں سیٹ پر پھیل گئی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا کہے۔ بختاور نے اسے بازو سے پکڑا اور کھینچ کر گاڑی سے باہر نکالا۔

ہر طرف ویرانہ تھا۔ دور دور تک صحرا پھیلا ہوا تھا۔ تیز ہوا گونج رہی تھی۔ بڑی چھوٹی جھاڑیاں دیوانہ وار ہلتے ہوئے ماحول کو مزید خوفناک بنا رہی تھیں۔ میرے، ساوری اور بختاور کے سامنے پیروزاں مجرموں کی مانند کھڑی تھی۔ میں چند لمحے اس کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ مجھے اس پر ذرا بھی رحم نہیں آ رہا تھا۔ تبھی میں نے کہا۔

"معافی مت مانگو پیروزاں، ......تم اپنی فطرت میں بہت غلیظ ہو، شاید میں تمہیں معاف کر دیتا، مگر تم تو سردار ہو۔ سرداروں کی طرح مرو۔"

”میں کبھی تمہارے سامنے نہیں آؤں گی۔ میں روہی کو بھول جاؤں گی۔“ اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

”اگر چند منٹ پہلے تم ایسی بات کرتی، ذرا سا بھی رحم دکھاتی تو شاید میں تمہیں عورت سمجھ کر معاف کر دیتا۔ لیکن تم وہ سانپ ہو، جس کی فطرت میں بس ڈسنا ہی ہے۔ میں تمہیں ابھی موقعہ دوں تو تم مجھے مار دو۔“

”نہیں میں ایسا نہیں کروں گی...... بس آخری بار معاف کر دو۔“ اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں وہاں ڈیرے پر بھی مار سکتا تھا۔ تاکہ بستی والے تمہیں مرتا ہوا دیکھیں، لیکن...... میں یہاں تمہیں اس لیے لے آیا ہوں کہ دنیا کی نگاہ میں تم واپس جا چکی ہو۔ تمہیں ساوری کے عوض چھوڑا گیا ہے۔ تم پر تیرا قتل نہیں پڑنے والا۔ یہاں پر تمہاری لاش صحرا کے جانوریوں کھا جائیں گے کہ تمہارا وجود ہی مٹ جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے پسٹل سیدھا کر کے سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ انہی لمحات میں ساوری نے اپنا ہاتھ میرے پسٹل پر رکھ دیا۔ میں نے وحشیانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

(قسط نمبر:10)

"ساوری یہ کیا کر رہی ہو؟" مجھ سے پہلے ہی بختاور چیخ اٹھا۔ ساوری نے بختاور کے چیخنے کی پروا نہیں کی بلکہ بڑے ہی سرد لہجے میں کہا۔

"اسے تم نہیں مار سکتے، اسے میں ماروں گی، یہ میری ماں کی قاتل ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"پوچھو اس ڈائن سے...... میری ماں کو اس نے سسکا سسکا کر مارا تھا۔ میری ماں کا قصور صرف اتنا تھا، اس نے انجانے میں میرن شاہ کو بتا دیا تھا کہ یہ کس یار کے ساتھ رات گزار کر آئی ہے۔" اس نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔ میں نے پہلی بار ساوری کو وحشت ناک انداز میں دیکھا تھا۔ تبھی میں نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

"کیا تم نے کبھی کوئی قتل کیا ہے؟"

"نہیں، لیکن آج کروں گی۔" اس نے ہذیانی انداز میں کہا اور پسٹل میرے ہاتھ سے لے لیا۔

"نہ ساوری نہ...... مجھے مت مار...... مجھے جانے دے۔" پیروزاں اپنے سامنے کھڑی موت دیکھ کر لرزنے لگی تھی۔ تبھی وہ نفرت سے بولی۔

"ایسا ہی میری ماں نے کہا تھا، یاد ہے نا تمہیں؟"

"رُک جا ساوری......" اچانک بختاور نے کہا۔

"اب کیا ہوا؟" میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

"اسے بستی والوں کے سامنے لے جا کر مارنا چاہئے، پتہ تو چلے کہ یہ ڈائن مر گئی ہے۔

یہاں ویرانے میں مار دینے کا فائدہ؟" بختاور نے نفرت سے کہا۔ میں جانتا تھا اس کے اندر انتقام کی آگ کس قدر بھڑک رہی تھی۔

"چل جیسے تم چاہو۔" میں نے ایک دم سے کہا تو ساوری نے آگے بڑھ کر اسے چوٹی سے پکڑ لیا۔ پروزاں کی آنکھوں میں حیرت زدہ وحشت تھی۔

"ابھی رحماں کو تو نے مارا ہے نا، چل رحماں، مار اسے۔" ساوری نے ہذیانی انداز میں کہا تو رحماں مائی نے نفرت سے کہا۔

"میرے ہاتھ گندے ہو جائیں گے۔"

"چل بختاور اب دیر نہ کر۔" شعیب نے کہا تو میں بڑھا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ ساوری نے پروزاں کو چوٹی سے پکڑا ہوا تھا، وہ اسے اسی طرح ہی گاڑی تک لے آئی۔ ہمارے بیٹھتے ہی بختاور نے گاڑی بڑھا دی۔

ہم بستی چراغ شاہ پہنچے تو ڈیرے کے باہر بہت سارے لوگ جمع تھے۔ ساوری گاڑی سے اتری اور پھر اس نے رحماں مائی کو اتارا جو رو رہی تھی۔ ہر کوئی حیرت سے ساوری کو دیکھ رہا تھا۔ شاید انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ جسے پروزاں نے اغوا کر لیا ہو، وہ بچ کیسے گئی۔ میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا، اب بستی کے لوگوں کو یہ احساس ہو گیا کہ میں ساوری کو کتنا چاہتا ہوں۔ پروزاں جیسی دشمن کو چھوڑ کر میں نے ساوری کو بچا لیا تھا۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میں گاڑی سے اتر کر چند قدم بڑھا تو سانول نے ساوری کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے افسوس سے کہا۔

"کوئی بات نہیں علی زین...... ہم پروزاں کو پھر دیکھ لیں گے۔ ساوری بچ گئی، یہی بڑی بات ہے۔"

"نہیں ساتول، تم غلط سمجھے ہو، ہم پیروزاں کو بھی اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔"

ساتول نے حیرت سے گاڑی کی طرف دیکھا، بختاور گاڑی سے اتر چکا تھا۔ اس نے پیروزاں کا ہاتھ پکڑا اور نیچے اتار لیا۔ سب بستی والے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ پیروزاں اسی ڈیرے میں ایک مجرم کی مانند کھڑی تھی جہاں وہ کبھی حکم دیا کرتی تھی۔ جہاں اس نے کئی قتل کئے تھے، جہاں اس کی حکومت چلتی تھی۔ جہاں وہ راج کرتی تھی۔

پھر جیسے سب پر سکوت طاری ہو گیا۔ ساوری نے پسٹل سیدھا کیا اور غضب ناک انداز میں بولی۔

"یہی جگہ ہے نا پیروزاں، جہاں تو نے میری ماں کو مارا تھا؟"

پیروزاں کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ وہ موت کو دیکھ کر ساکت ہو چکی تھی۔ وہ جب کچھ نہ بولی تو اس نے سامنے کھڑی پیروزاں پر کئی فائر کر دیئے۔ فائر کی آواز میں کئی حیرت زدہ آوازیں ابھری تھیں۔ وہ تڑپ کر نیچے گری اور تڑپتی رہی۔ میں نے چند لمحے اسے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھوں کے سامنے جلنے والے شعلے مدھم پڑتے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں پیروزاں کی روح اس کا جسم چھوڑ چکی تھی۔

"اب کیا کرنا ہے اس کا؟" بختاور نے مجھے بازو سے پکڑ کر پوچھا تو مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور دھیمے سے کہا۔

"جو تیرا دل چاہے کر۔"

"اب یہ مر گئی ہے، اب دشمنی ختم، اس کا کفن دفن کر دو۔" ایک بزرگ بندے نے مشورہ دیا تو بختاور نے تیزی سے کہا۔

"چل بابا تو ہی کر دے۔"

ساوری اب تک ساکت کھڑی زمین پر بے حس و حرکت پڑی پیروزاں کی لاش کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے پکڑا، رحماں مائی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور رہائشی حصے کی طرف چل دیا۔

روہی پر رات اتر آئی تھی۔ رحماں مائی نے آتے ہی گھر سنبھال لیا تھا۔ ساوری نے اس کے ساتھ مل کر سب کو کھانا کھلایا، ساول کے ذریعے سب کو دودھ پہنچایا۔ رہائشی حصے میں یہی دو عورتیں تھیں۔ رحماں مائی سب کچھ سمیٹ کر ایک چارپائی پر جا کر لیٹ چکی تھی۔ میں رہائشی حصے میں تھا۔ ساوری میرے پاس آ کر سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ تبھی میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بستی سے کسی کو بلوا لیتی، اب یہاں تمہارے ساتھ رہتیں۔''

''مجھے کون سا ڈر لگ رہا ہے، تم سب تو ہو یہاں۔'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا تو میں دھیمے سے بولا۔

''میں ڈیرے پر جا رہا ہوں، وہیں سارے ہیں اور......''

''نہیں تم یہیں رہو گے، میں نے تم سے بات کرنی ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''کیسی بات؟ خیریت تو ہے؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''یہ رحماں مائی، اب اس دنیا میں اکیلی ہے۔ کوئی نہیں ہے اس کا۔ اب ہم ہیں سب کچھ اس کے لئے۔'' اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''ایسا کیا ہو گیا جو تم یوں کہہ رہی ہو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں چاہتی ہوں اس کی شادی کر دوں، اپنے گھر بار کی ہو جائے۔'' اس نے کہا تو میں ہنس دیا، پھر سکون سے بولا۔

"ٹھیک ہے کردو، اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت کیا ہے، کوئی لڑکا ہے تمہاری نگاہ میں؟"

"سانول ہے نا، اس کا بھی کوئی نہیں۔ سارا مال ڈنگر انہیں دے دیں گے، ہمیں کیا کرنا۔"

اس نے پورا پلان ہی میرے سامنے رکھ دیا۔

"سانول مان جائے گا، اس کی بھی مرضی جاننا......" میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی

"اسی لئے تو میں نے تم سے کہا ہے۔ اس سے بات کرو، اسے مناؤ۔ کل ہی ان کی شادی کر دیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، کل بات کروں گا۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا پھر ایک دم میرے ذہن میں سوچ لہرائی، میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا، "رجاں اور سانول کی شادی کی بڑی فکر ہے، اپنے بارے میں کیا خیال ہے، کب کرو گی شادی؟"

"جب مجھے کوئی محبت کرنے والا ملا تا تب کر لوں گی۔" اس نے نخرے سے کہا تو میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اچھا میں تم سے محبت ہی نہیں کرتا؟ میری محبت کا تمہیں احساس ہی نہیں ہے، میں تو بچپن سے......" میں نے کہنا چاہا تو وہ تنک کر بولی۔

"اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوتی نا تو اپنے بارے میں مجھے ضرور بتاتے، کئی بار میں نے تم سے پوچھا، مگر آج تک تم نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"کیا کرو گی میرے بارے میں جان کر......بس جیسا بھی ہوں تمہارے سامنے ہوں، تمہیں تھوڑا بہت تو پتہ چل ہی گیا ہے لاہور سے۔" میں نے جواب کی تفصیلات سے بچ جانے کے لئے کہا۔

"نہیں علی زین ایسے نہیں...... مجھے لاہور رہتے ہوئے جتنا بھی پتہ چلا، وہ ایک الگ بات ہے۔ مگر تم جو مجھے اپنے بارے میں نہیں بتاتے ہوئے نا خود اپنی زبانی تو مجھے لگتا ہے تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔ جس طرح عقیدت محبت کے بغیر نہیں ہو سکتی، اس طرح بھروسے بنا محبت نہیں ہو سکتی۔" اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا تو میں نے اکتائے لہجے میں کہا۔

"یہ تم کیسی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو؟"

"یہی تو باتیں ہیں کرنے والی، تم جس دن آئے تھے نا میں نے اسی دن تمہیں پہچان لیا تھا۔ کیونکہ بچپن سے لے کر اس دن تک، تم مجھے ایک دن بھی نہیں بھولے ہو۔ میں نے اسی امید پر وقت بتا دیا کہ ایک دن تم آؤ گے۔ تم آ گئے، میری محبت جیت گئی علی زین مگر تم...... تم نے خود کو چھپا کر رکھا۔ میں اور بابا اکثر یہی بات کرتے تھے۔ میرا یہی سوال ہوتا کہ تم خود کو کیوں چھپا رہے ہو، بابا یہی کہتا کوئی راز ہو گا، تم خاموش رہو، انجان بنی رہو۔ میں انجان بنی رہی۔ اس دن تو حد ہو گئی جب تم نے مجھ سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ میں چاہتی تھی تم مجھ پر کھل جاؤ، میں تمہیں بہت سارے راز بتا دیتی۔ مگر تم......" وہ کہتے ہوئے ایک دم سے خاموش ہو گئی۔

"ساوری، میں کوئی انوکھا یا الوکھا شخص نہیں ہوں، ایک عام سا انسان ہوں، یہ میری قسمت اچھی تھی جو میں آج زندہ ہوں، پتہ نہیں کس لئے زندہ ہوں، ورنہ میں تو کچھ بھی نہیں تھا اور آج بھی میرے دامن میں کچھ نہیں ہے سوائے بچپن کی چند یادوں کے جو میرا سرمایہ ہے۔ تم میری محبت ہو ساوری۔" میں نے کہا تو میرا لہجہ جذبات سے بھیگ گیا تھا۔ وہ اٹھی اور میری چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میری محبت کوئی عام لڑکیوں جیسی نہیں ہے، جس کا انجام صرف شادی ہوتا ہے۔ میں خون دینے والی ہوں، جب چاہو، جہاں چاہو، مجھے قربان کر سکتے ہو۔ ہاں مجھے یہ یقین ہو کہ

میں تم پر قربان ہوئی ہوں، اگر تم کچھ نہ بتانا چاہو تو مجھے کوئی شکوہ نہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ اس کے گیسو میرے سینے پر پھیل چکے تھے۔ میں کچھ دیر یونہی اسے محسوس کرتا رہا، پھر پر سکون لہجے میں بولا۔

"اچھا پھر سن...... میں بتاتا ہوں۔"

میں نے کہا تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

☆......☆......☆

وہ رات میرے لئے قیامت کی رات تھی۔ ایک طرف میری بہن اور دوسری جانب میری ماں کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ میرا گھر جل رہا تھا، جس کے شعلوں کی بلندی دیکھتے ہوئے میری گردن پیچھے لگ گئی تھی۔ میرا باپ چیخ چیخ کر مجھے کہہ رہا تھا کہ میں کہیں بھاگ جاؤں۔ میرے باپ کے لہجے میں نجانے ایسا کیا تھا کہ مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جب اس نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا کہ جاؤ چلے جاؤ، تو پھر میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں بستی چراغ شاہ سے نکلا اور بھاگتا چلا گیا۔ میرے گھر والوں کی چیخیں، میرے باپ کا اک دہشت بھرا لہجہ، میرا جلتے ہوئے گھر کی سرسراہٹ میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ مجھے نہ سمت کا اندازہ تھا اور نہ ہی مجھے کسی منزل کا پتہ تھا۔ میرے پاؤں کے نیچے ریت تھی اور میں اندھیرے میں بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں کتنا بھاگا ہوں گا۔ یہاں تک کہ میں دربار کے پاس جا پہنچا، میں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ میری سانس پھول چکی تھی اور میں چکرا رہا تھا۔ میں دربار کی سیڑھیاں تو چڑھ گیا لیکن صحن کے پاس ہی گر گیا۔ میں ایسا گرا کہ پھر اٹھ نہ سکا، شاید میرے چوٹ لگی تھی یا میں چکرا کر گرا تھا مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔

میری آنکھ کھلی یا جب مجھے ہوش آیا تو مجھ پر ایک بزرگ شخص جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ

میں پیالہ تھا جس سے اس نے میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تھے۔ میں اٹھ بیٹھا تو اس نے پیالہ میرے منہ کو لگایا۔ میں پانی پی گیا۔

"اور پانی پینا ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سر ہلا دیا۔ وہ قریب پڑے گھڑے سے پانی لے آیا تو میں وہ پیالہ بھی پی گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا تو میں نے سب کچھ سچ بتا دیا۔ وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر مجھے ایک کوٹھڑی میں سو جانے کے لئے کہا۔ میں صحن سے اٹھ کر کوٹھڑی میں گیا اور وہاں جا کر سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ رات کا واقعہ مجھے یاد آیا تو میری بھوک مٹ گئی۔ میرا دل چاہا کہ میں ابھی واپس جا کر اپنے باپ کی خیر خیریت دریافت کروں۔ میں اٹھا اور کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔ باہر وہی بوڑھا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور واپس جانے کا اشارہ کیا۔ میں واپس کوٹھڑی میں آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جس میں کھانا تھا۔ میرے سامنے پلیٹ رکھتے ہوئے بولا۔

"یہ کھا لو، میں پانی دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر کوٹھڑی میں پڑی صراحی سے پیالے میں پانی بھرا اور میرے قریب رکھ دیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ میں کھا چکا تو وہ بولا۔ "بیٹا، اب تیری بستی میں تمہارے لئے کچھ نہیں رہا، مجھے سب پتہ چل گیا ہے، انہوں نے تیرے باپ کو بھی مار دیا ہے۔ تم جاؤ گے وہاں تو تمہیں بھی مار دیں گے۔"

ایک دم سے میرے اندر دھواں بھر گیا۔ میں اس دنیا میں اکیلا اور بے یار و مددگار ہو گیا تھا۔ دشمنوں نے میرے سب خون کے رشتے مار دیئے تھے۔

"میں اب کہاں جاؤں گا؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تم ابھی یہیں رہو، میں کرتا ہوں تمہارے لئے کچھ۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا اور میں پھر وہیں پڑی خس کی بنی ہوئی صف پر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر گزری ہوگی، وہ بزرگ ایک شخص کے ساتھ آیا، اس نے مجھے دربار کے پچھواڑے ایک گھر میں بھیج دیا۔ وہ ایسے ہی اجڑا اجڑا سا تھا، وہاں کوئی عورت نہیں تھی۔ وہاں میں شام تک رہا۔ شام کے وقت اس بزرگ کے ساتھ ایک صاف ستھرے کپڑے پہنے شخص آیا، اس نے مجھے دیکھا اور اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر لے گیا۔ میں بہاول پور پہنچ گیا تھا۔ ان دنوں سٹلائیٹ ٹاؤن پوری طرح آباد ہو چکا تھا۔ وہیں ایک بڑا سا گھر تھا۔ اس گھر کا مالک ایک بیوروکریٹ تھا۔ اس کے دو ہی بچے تھے گڈو اور مینا۔ مجھے ان کے کاموں پر مامور کر دیا گیا۔ میں وہاں رہنے لگا۔

وہاں میرا کام یہی تھا کہ میں صبح سویرے اٹھتا، بچوں کو تیاری میں مدد دیتا، انہیں ناشتہ کرواتا، پھر جب وہ سکول چلے جاتے تو ان کے کمرے صاف کرتا، ان کے سکول سے آنے پر، ان کے جو کام ہوتے وہ کرتا رہتا۔ رات گئے سو جاتا، بس یہی زندگی تھی۔ ہاں ایک خواہش جاگ اٹھی تھی کہ جیسے یہ بچے پڑھتے ہیں، میں بھی پڑھوں، میں بھی اسکول جاؤں۔

اسی گھر کے سامنے ایک ویسا ہی بڑا سارا گھر تھا۔ اس میں ایک بوڑھی خاتون اپنی بہو کے ساتھ رہتی تھی۔ میں اکثر اس کے بھی کام کر دیا کرتا تھا۔ اس کا بیٹا رینجر میں آفیسر تھا۔ ایک بار جب وہ آیا تو اس نے میرے بارے میں پوچھا، میرے متعلق جاننے کے بعد اس نے بیوروکریٹ کو کہا کہ مجھے بھی سکول بھیجا جائے۔ کم از کم ایک ملازم کی تنخواہ جو آپ انہیں دے رہے ہیں، اس میں اسے پڑھا ہی دیں۔ بیوروکریٹ نے اس بات پر ناک بھوں تو بہت چڑھائی لیکن اس آفیسر کی بات مان گیا۔ یوں مجھے ایک سرکاری سکول میں داخلہ مل گیا۔ یہاں ماحول

ہی نیا تھا۔ میں دل لگا کر پڑھا۔ کچھ عرصے بعد بیورو کریٹ کا لاہور شہر میں تبادلہ ہو گیا۔ میں بھی ان کے ساتھ وہیں چلا گیا۔

جس طرح میں بڑا ہوتا گیا، میرے ساتھ ساتھ دو سوچیں پروان چڑھی تھیں۔ ایک تو یہ کہ آخر میرے والدین کا کیا قصور تھا جو دشمنوں نے بے دردی سے انھیں مار دیا۔ وہ منظر میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔ دوسرا میں ہمیشہ یہ سوچتا کہ میں طاقتور کیسے ہو جاؤں تاکہ میں اپنے والدین کا بدلہ لے سکوں۔ ہر آنے والا دن میری ان سوچوں کو مضبوط کرتا تھا۔

گڈو کو ہاکی کھیلنے کا شوق تھا۔ وہ میدان میں جاتا تو مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا جاتا۔ میں بھی ان کے ساتھ ہاکی کھیلنے لگا۔ میں گڈو سے کہیں زیادہ اچھی ہاکی کھیلتا تھا۔ دھیرے دھیرے کوئی میچ بھی میرے بغیر نہیں کھیلا جانے لگا۔ یوں میں زندگی کی تلخیوں، محرومیوں اور اونچ نیچ کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ میرے لئے گھر، سکول اور کھیل کا میدان ہی ساری دنیا تھی۔ گڈو کے کئی راز میں چھپا جاتا، جس کی وجہ سے میں کئی 'مراعات' حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن میں تھا اس گھر میں نوکر ہی، ایک ایسا نوکر جسے پناہ دینے کے عوض کام پر رکھا ہوا تھا اور میں اسی میں خوش تھا۔

آج میں سمجھتا ہوں، ہمارے ملک میں ہی نہیں پورے جنوبی ایشیاء میں یہی حالت ہے۔ ہم عوام یہ سمجھتے ہیں کہ ہم غلام نہیں ہیں، حالانکہ ہم سرتاپا غلام ہیں، اس لئے کہ ہم ذہنی غلام ہیں۔ ہمیں کہا یہ جاتا ہے کہ ہم آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں لیکن ایسا ہے نہیں، ہمیں آئین اور قانون بھی تھما دیا گیا لیکن پورے خطے میں بے انصافی عروج پر ہے۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جو خوف کو قانون سے بھی بالاتر سمجھتا ہے۔ روٹی کے ایک نوالے سے لیکر کپڑے پہننے والے پارچے تک ہم ان دیکھے آقا کے غلام بن چکے ہوئے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ ہی نہیں

رہے کہ ہم غلام ہیں؟

ان دنوں میں اور گڈو دسویں کا امتحان دے چکے تھے۔ ہماری آوارگی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنا سائیکل لیتا اور مجھے ساتھ لے کر شہر بھر میں آوارگی کرتا۔ میں چونکہ اس کے ساتھ ہوتا، اس لئے زیادہ پوچھ تاچھ نہیں ہوتی تھی۔ شام کے وقت ہاکی کھیلنے ضرور جاتے تھے۔ کبھی کبھی چوری چھپے سینما دیکھنے چلے جاتے، یہ ان دنوں سب سے بڑی عیاشی کے ساتھ سب سے بڑا ایڈونچر ہوا کرتا تھا۔ دنیا ہم پر کھلنے لگی تھی۔ جوں جوں ہم لاہور شہر سے واقف ہوتے جا رہے تھے، اسی طرح ہمارے اندر کسی نہ کسی ایڈونچر کا حوصلہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ انہیں دنوں وہیں کھیل کے میدان میں ایک لمبا تڑنگا شخص بھی آنے لگا تھا۔ وہ بڑے خوبصورت جسم کا مالک تھا۔ ہاکی بہت اچھی کھیلتا تھا۔ اس اسٹیڈیم میں اس کی تعیناتی حکومت کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس نے ایک بہترین ٹیم چنی اور اسے تربیت دینے لگا۔ انہیں میرے بارے میں بڑا تجسس تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ میرے بارے میں سب کچھ جان گئے۔ انہوں نے مجھ میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ میں اس وقت انہیں صرف ہاکی کا ایک کوچ ہی سمجھتا تھا۔ گڈو اس ٹیم کا حصہ نہ بن سکا لیکن میں منتخب ہو گیا۔ ان کا نام عبدالمجید تھا لیکن وہ چاچا مجید کے نام سے مشہور تھے۔

ایسے ہی ایک بار بڑے اہم ٹورنامنٹ میں ہماری ٹیم کا میچ ہوا۔ مخالف ٹیم ایک معتبر ادارے کی طرف سے تھی۔ شاید انہیں اپنے کھیل پر ناز تھا، وہ بڑے پرغرور انداز میں کھیل رہے تھے۔ ان میں دو کھلاڑی ایسے تھے جو کھیل کی اصولوں کے خلاف ورزی کر رہے تھے اور ہماری ٹیم کے دو لوگوں کو زخمی بھی کر چکے تھے۔ یہ بڑی تشویشناک بات تھی۔ ہاف ہونے پر چاچا مجید نے ہمیں اجازت دے دی کہ سامنے سے اب اگر ایسا ہو تو معاف نہیں کرنا۔ پھر یوں

ہوا کہ کھیل ختم ہونے تک میں نے ان کے تین کھلاڑی زخمی کر دیئے اور میچ بھی جیت گئے۔
میرے خیال میں بات وہیں ختم ہو جانی چاہیے تھی لیکن بات یہیں سے شروع ہو گئی۔
ٹورنامنٹ ختم ہوئے چند دن ہوئے تھے۔ میں اور گڈو سائیکل پر اسٹیڈیم جا رہے تھے کہ ہمیں چند لوگوں نے اسٹیڈیم کے باہر روک لیا۔ میں پہچان گیا کہ یہ مخالف ٹیم کے کھلاڑی ہیں۔ جب تک ہم نے سائیکل روکا، تب تک کئی ہاکی کے وار میری پیٹھ پر پڑ چکے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اگر میں نے جگرانہ دکھایا تو یہ مجھے بہت ماریں گے، ممکن ہے کہ وہ مجھے زخمی بھی کریں یا کوئی ہڈی توڑ دیں۔ گڈو لڑنے میں بالکل کورا تھا۔ وہ ڈر کر بھاگ نکلا، وہ تین چار تھے جبکہ میں اکیلا۔ ہاکی میرے ہاتھ میں بھی تھی۔ میں ان کے ساتھ لڑتا رہا۔ مجھے کافی چوٹیں آئیں، جہاں تک میں انہیں مار سکا مارا لیکن اس وقت میری بس ہو گئی جب ایک ہاکی میرے سر پر پڑی اور میں چکرا کر سڑک پر گر گیا۔
مجھے ہوش آیا تو میں ہسپتال میں تھا۔ میرا سر پھٹ گیا تھا، چھ ٹانکے لگے تھے۔ خون بہت بہہ گیا تھا۔ اس وقت میرے پاس گڈو کے ساتھ چاچا طاہر مجید تھا۔ تین دن ہسپتال رہنے کے بعد میں گھر واپس آیا تو مجھے سوائے حقارت کے کچھ بھی نہ ملا۔ ظاہر ہے میں کوئی ان کا خونی رشتے دار تو نہیں تھا، ایک نوکر ہی تھا۔ اس دن میں نے خود کو اس دنیا کا کمزور ترین اور گھٹیا شخص تصور کیا، جس کے پاس اپنے دفاع کا بھی اختیار نہیں تھا۔ حالانکہ گڈو نے سب کچھ بتا دیا تھا، پھر بھی قصور میرا ہی تھا۔ شاید وہ پہلے ہی کچھ سوچ چکے تھے، بہانہ یہی بنا اور مجھے اپنا بندوبست کر لینے کا کہہ دیا گیا۔ اس بیوروکریٹ نے مجھے بڑے سکون سے کہا تھا۔
”دیکھو علی، تم بڑے ہو گئے ہو، جب تک ہم تمہیں پال سکتے تھے، ہم نے پالا، تمہیں پڑھایا، تم پر خرچ کیا۔ تم اب اپنا کھا کما سکتے ہو۔ اب گڈو نے بھی پڑھنے کے لئے چلے جانا

ہے۔ پھر تم خودسر بھی ہوتے جا رہے ہو، میں تھانے کچہری کے چکر نہیں لگا سکتا اور ہم مزید تمہیں نہیں رکھ سکتے۔ تم ایک آدھ ہفتے میں اپنا بندوبست کہیں اور کر لو۔"

اس وقت اس گھر کے سوا میرا کوئی نہیں تھا۔ مجھے یہ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ میں کہاں جاؤں گا۔ وہ پہلی شام تھی جب میں بہت رویا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ میں اس دنیا میں اکیلا و بے یارومددگار ہوں۔ جن کی میں نے اتنا عرصہ خدمت کی، انہوں نے چند لفظ کہے اور اپنے سے بے دخل کر دیا۔ کیا یہی ہے دنیاداری؟ میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں دو دن تک اپنے سرونٹ کوارٹر سے نہ نکل سکا۔ گڈو میرے پاس آ جایا کرتا تھا۔ وہی مجھے کھانا دے جاتا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر گپ شپ کر جاتا تھا۔

وہ تیسرے دن کی شام تھی جب میں سرونٹ کوارٹر میں پڑا یہی سوچ رہا تھا کہ اب میں کہاں جاؤں گا، تب چاچا عبدالمجید مجھے ملنے آ گئے۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد میں نے اپنی پریشانی انہیں بتائی تو وہ چند لمحے سوچتے رہے پھر مسکراتے ہوئے بولے۔

"کوئی بات نہیں، تم اپنا سامان باندھ رکھنا، تمہیں رہنے کے لئے بہت اچھا ٹھکانہ مل جائے گا۔"

مجھے ان کی باتوں سے بہت حوصلہ ملا۔ مجھے اس وقت ضرورت بھی تھی۔ سو اگلے دن میں چاچا عبدالمجید کے ساتھ چل دیا۔ انہوں نے مجھے رہنے کے لئے جو گھر دیا، وہ کافی بڑا تھا۔ ایک بڑا سارا گیٹ، پھر پورچ جس میں دو تین گاڑیاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ پورچ کے سامنے ایک بڑا سارا لان تھا، جس میں رنگ برنگ پودے اور پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس کی چار دیواری بڑی ساری تھی، جس پر لوہے کی تاریں لگی ہوئی تھیں۔ داخلی دروازے کے بعد ایک بڑا سارا لاؤنج تھا۔ لیکن گھر میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اس میں کئی سارے کمرے تھے لیکن سبھی کو

تالے لگے ہوئے تھے۔ دو کمرے اور ایک لاؤنج کھلا ہوا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں یوں گھر کے اندر رہوں گا۔ میں یہی سوچ رہا تھا مجھے کوئی سرونٹ کوارٹر میں رہنے کو کمرہ مل جائے گا۔ مجھے داخلی دروازے کے ساتھ ہی ایک بہترین کمرہ دے دیا گیا، جہاں میں نے اپنا سامان رکھ لیا۔

پہلی رات ہی مجھے اس گھر میں بہت خوف محسوس ہوا۔ میں اکیلا اور اتنا بڑا گھر؟ خیر جیسے تیسے کر کے میں نے وہ رات گزاری۔ چاچا نے مجھے یہی کہا تھا کہ میں چند دن یہاں رہ لوں پھر جیسے ہی کالج کھلے وہ مجھے ایک مقامی کالج میں داخل کروا دے گا اور میں وہیں ہاسٹل میں رہوں گا۔ میرے پاس ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ کوئی تیسرا یا شاید چوتھا دن تھا، جب آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔

میں ایک دم سے سہم کر رہ گیا۔ میرے سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے باہر دو جوان کھڑے تھے۔ جن کے ہاتھوں میں گنیں پکڑی ہوئیں تھیں۔ کچھ لمحوں بعد احساس ہوا کہ دو لوگ ابھی اندر ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ بھی باہر آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں بھی ایک ایک گن تھی۔ انہوں نے بڑے سکون سے دروازہ بند کر کے اس میں چابی گھمائی اور باہر کی سمت چل دیئے۔ میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ میں اٹھ کر دیکھ لوں۔ میرے کمرے میں اندھیرا تھا۔ کھڑکی میں سے باہر پورچ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ سب ایک ویگن میں بیٹھ گئے تھے۔ ایک شخص نے باہر والا گیٹ کھولا، جب گاڑی گیٹ پار کر گئی تو اس نے گیٹ بند کیا اور باہر سے تالا لگا دیا۔ میں دھک سے رہ گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ جیسے یہ لوگ یہیں کے رہنے والے تھے۔ وہ آئے، انہوں نے اسلحہ نکالا اور چلے گئے۔

میں نے ایسا منظر پہلی بار دیکھا تھا۔ کئی خیال اور وسوسے آنے لگے۔ میں اس کمرے کی

طرف خوف ناک انداز سے دیکھ رہا تھا کہ نجانے اس کمرے میں کیا کچھ پڑا ہے۔ میں اس رات نہیں سو سکا۔ مجھے نجانے کیوں خوف آ رہا تھا اور اس خوف کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔

اگلے دن جب میں ہال کی گراؤنڈ میں چاچا عبدالمجید سے ملا تو رات والی ساری بات بتا دی۔ وہ پر سکون انداز میں سنتا رہا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''تمہیں تو کسی نے کچھ نہیں کہا نا؟''

''نہیں بالکل بھی نہیں، مجھے تو لگا جیسے انہیں میرے بارے میں پتہ ہی نہیں تھا؟'' میں نے تیزی سے کہا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے، انہیں تمہارے بارے میں پوری طرح خبر تھی۔ خیر میں تمہیں بتا دوں وہ گھر ہے ہی اس مقصد کے لئے، وہاں اسلحہ رکھا ہوا ہے۔ کبھی کبھی کسی کو لا کر بھی رکھا جاتا ہے۔ سمجھ لو کہ یہ ایک سیف ہاؤس ہے۔'' تب مجھے پہلی بار انہوں نے بتایا کہ ''سیف ہاؤس'' کیا ہوتا ہے۔ میں وہاں رہنے پر راضی نہیں تھا۔ میں دبے دبے لفظوں میں وہاں سے جانے کی بات کرنے لگا تو وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے، ''اچھا بات سن، دو چار دن میں وہاں رہنے کے لئے کوئی آ جائے گا۔ تم وہیں رہو۔ کہاں جاؤ گے؟''

''میں کہیں بھی رہ لوں گا لیکن......'' میں نے کہنا چاہا لیکن لفظوں کا کھوکھلا پن مجھے خود محسوس ہوا تھا۔ میں پندرہ برس، سولہ برس کا لڑکا، جسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا، لیکن زمانے کی رویے نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا ہوا تھا۔ اس دن پہلی بار چاچا نے بڑے جذباتی انداز میں کہا تھا۔

''مجھے نہیں پتہ تھا کہ تم اتنے ڈرپوک اور بزدل ہو گے۔ اتنے بزدل، اتنے ڈرپوک، ذرا سا اسلحہ دیکھ کر تمہارے اوسان خطا ہو گئے۔ تم اپنے ماں باپ اور بہن کا بدلہ کیسے لو گے، یوں جا

کر معافی مانگو گے ان سے، منت کرو گے ان کی، بھیک مانگو گے ان سے کہ مجھے بدلہ دے دو؟" چاچا کا لہجہ پہلی بار سخت ہوا تھا۔ اس لہجے میں حقارت ایسی تھی جسے کا ذائقہ ہی نیا تھا۔ اس حقارت میں توہین نہیں تھی۔

"میں بڑا ہو جاؤں گا تو......" میں نے کہنا چاہا تو چاچا بولے۔

"اور کتنا بڑا ہونا ہے تم نے؟ تیری عمر کے لڑکے، سامنے والے کوٹھی کا ناچ نچا دیتے ہیں۔ اور تم...... آؤ آج میں تمہیں دکھاؤں۔"

میں کچھ نہیں بولا، چپ چاپ ان کے ساتھ چل دیا۔ ان کے پاس ایک موٹر سائیکل ہوتی تھی۔ انہوں نے مجھے پیچھے بٹھایا اور مجھے لے کر ایک سینما کے باہر آ گئے۔ اس دن ہم ہاکی نہیں کھیل سکے تھے۔ میں سینما ہال کے باہر چاچا کے ساتھ کھڑا تھا۔ تبھی انہوں نے مجھے دکھایا،

"وہ سامنے دیکھو، وہ تین لڑکے کھڑے ہیں، تیری عمر کے ہیں نا؟"

"ہاں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے بہ مشکل کہا۔

"اب چپ چاپ تماشہ دیکھنا۔" انہوں نے کہا اور ایک طرف دوکان پر کھڑے ہو گئے۔ وہاں سے انہوں نے دو ٹھنڈی بوتلیں لیں، ایک مجھے دے کر ان لڑکوں کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کا انداز بڑا جارحانہ تھا۔ اس وقت ہم سوڈا پی کر خالی بوتلیں واپس رکھ چکے تھے۔ اچانک ایک طرف سے تین چار لوگ آئے اور انہوں نے آ کر ان لڑکوں کو دھکے دینا شروع کر دیئے۔

"سمجھ رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے؟" چاچا نے دھیرے سے پوچھا پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا "یہ لڑکے یہاں پر ٹکٹ بلیک کر رہے ہیں، وہ دوسرے بھی یہاں ٹکٹ بیچتے ہیں، اب دیکھنا۔"

میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ تینوں لڑکے انہیں سمجھاتے رہے۔ پھر ایک دم سے وہ

تھپڑوں اور گھونسوں پر اتر آئے۔ سامنے والے بھی انہیں مارنے لگے۔ مگر وہ چار ہونے کے باوجود انہیں زیر نہیں کر پائے۔ ان کی یہ لڑائی محض چند منٹ کی تھی، مگر وہ تینوں لڑکے اس بے جگری سے لڑے کہ چاروں حملہ آوروں کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اس لڑائی کے دو تین منٹ بعد وہ کپڑے جھاڑ کر پھر سے ٹکٹیں بیچنے لگے۔ وہ یوں تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

''دیکھا، یہ ان لڑکوں کے لئے روزانہ کا معمول ہے، کیا تم ایسے لڑ سکتے ہو؟'' چاچا نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میں ایسے نہیں لڑ سکتا۔'' میں نے تختی سے کہا۔

''اس لئے کہ تم بزدل اور ڈرپوک ہو؟'' انہوں نے طنز سے پوچھا۔

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ یہ تھوڑے سے پیسوں کے لئے لڑ رہے ہیں، میں اگر لڑا تو کسی مقصد کے لئے لڑوں گا۔'' میں نے چاچا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو انہوں نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

''کیسا مقصد، یہی، اپنے دشمنوں سے بدلہ؟''

''ہاں، اسی لئے تو کہتا ہوں میں بڑا ہو جاؤں، اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں، تب......''

میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے۔

''تب بھی بیٹا تمہیں بے خوف ہونا پڑے گا، یہ بزدلی اپنے اندر سے نکالنا پڑے گی، تمہیں خود پر بھروسہ کرنا سیکھنا ہوگا؟''

''کیسے چاچا، میں وقت کے ساتھ سیکھ جاؤں گا نا۔'' میں نے کہا۔

''میں سکھاؤں گا تمہیں، بتاؤں گا تمہیں کہ وقت کی لگام اپنے ہاتھ میں کیسے لی جاتی ہیں۔'' نجانے کس جذبے کے تحت چاچا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ پھر چند لمحے

سوچتے ہوئے بولا۔ "کل تم ہاکی کھیلنے نہیں جاؤ گے۔ کہاں جانا ہے یہ میں تمہیں بتاتا ہوں، آؤ۔"

اس شام میں اور چاچا بندر روڈ کے پاس ایک علاقے میں چلے گئے۔ ایک بڑے سارے گھر کے ساتھ کافی بڑی چار دیواری تھی۔ اس میں کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف اکھاڑہ تھا۔ وہاں اکھاڑے میں اس وقت کوئی نہیں تھا لیکن کمروں کے سامنے ایک موڑھے پر ایک ادھیڑ عمر، سرخ چہرے، صحت مند، رعب دار شخصیت والا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کئی سارے موڑھے، کرسیاں اور چارپائیاں دھری ہوئیں تھیں۔ جو سب کی سب خالی تھیں۔ وہ اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ چاچا کو دیکھتے ہوئے جیسے وہ کھل اٹھا۔ خوشی سے اٹھا اور چاچا کو گلے لگا لیا۔

"او آ بھئی مجید باؤ، کیسے ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں لالہ، تم سناؤ۔" چاچا نے گلے ملنے کے بعد کہا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لالہ نے خود بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں، سنا کیسے درشن ہو گئے تیرے؟"

"اس لڑکے کو چھوڑنے آیا ہوں۔" چاچا نے کہا تو لالہ نے پہلی بار مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر چاچا سے پوچھا۔

"خیر تو ہے نا؟"

"ہاں خیر ہی ہے۔ بس اسے تھوڑا مضبوط بنا دے۔"

چاچا نے کہا تو لالہ نے پھر میری طرف دیکھا، چند لمحے دیکھنے کے بعد تبصرہ کرتے ہوئے بولا۔

"ہڈی تو ٹھیک لگتی ہے۔"

"بس یہ اب کچھ عرصہ آپ کے پاس ہے۔" چاچا نے کہا تو لالہ فخر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے جانی، فکر نہ کر۔" پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا، "کیا نام ہے تیرا؟"

"جی علی زین۔" میں نے کہا تو وہ مسکرا دیا پھر بولا۔

"چل بیٹھ جا اُدھر۔"

انہوں نے دور پڑی ایک چارپائی کی طرف اشارہ کیا، میں وہاں جا کر بیٹھ گیا تو وہ باتوں میں مشغول ہو گئے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ چاچا میرے بارے میں بتا رہے ہوں گے۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا، پھاٹک میں سے سات آٹھ نوجوان اندر آ گئے۔ وہ سب مختلف عمر کے تھے۔ ان سب نے باری باری مجھے دیکھا، پھر کوئی کرسی پر بیٹھ گیا، کوئی موڑھے پر۔ تھوڑی سی دیر بعد چار لوگ تین پتیلے اور ایک گٹھڑی اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ انہیں دیکھتے ہی سب اٹھے اور اندر کمرے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد چاچا نے مجھے کہا۔

"علی آ بھئی۔"

میں اٹھا اور ان کے پیچھے چل دیا۔ اندر دستر خوان لگا ہوا تھا۔ ہم گنتی کے پندرہ لوگ تھے۔ گٹھڑی میں کوئی سو کے قریب نان ہوگا۔ ایک پتیلے میں پالک گوشت، دوسرے میں دال گوشت اور تیسرے میں بھنا ہوا گوشت۔ وہ رکابی یا پلیٹ کے جھنجٹ سے آزاد تھے۔ سب پتیلوں میں شروع ہو گئے۔ اس وقت پیچھے ہٹے جب سب صفایا کر دیا۔ میں حیرت سے انہیں دیکھتا رہا۔ دستر خوان اٹھایا جانے لگا تو چاچا نے کہا۔

"لے بھئی علی اب تم نے یہاں رہنا ہے۔"

"کب تک؟" میں نے پوچھا تو لالہ نے مسکراتے ہوئے بولے۔

"میں نے دیکھا ہے پتر، تم نے صرف ایک نان کھایا ہے، تم نے اُس وقت یہاں سے جانا ہے جب کم از کم پانچ سے دس نان ایک وقت میں کھاؤ۔"

اس پر چاچا ایک دم سے ہنس پڑا اور میں سوچنے لگا، ایسا بھی ہو سکتا ہے؟

میں لالہ پر حیران تھا، وہ کیسا بندہ ہے، کیسے لوگ پالے ہوئے ہیں۔ چاچا اور لالہ آپس میں باتیں کرتے رہے، کئی سارے لڑکے اٹھ کر جانے لگے۔ تبھی چاچا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"لے بھئی لالہ یہ اب تیرے حوالے، اسے سنوار دے۔"

"تو فکر ہی نہ کر۔" لالہ نے کہا تو چاچا مصافحہ کرنے کے بعد وہاں سے چلے گئے۔ میں سوچنے لگا، لالہ نے مجھے کیا سنوارنا ہے۔ میں اسی خیال میں تھا کہ لالہ نے ایک لڑکے کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسے اوپر والے کمرے میں لے جاؤ، وہیں رہنے کا بندوبست کر دو، یہ اب یہیں رہے گا۔"

اس لڑکے نے مجھے ساتھ لیا اور اوپری منزل میں موجود ایک کمرے میں لے آیا۔ وہ بڑا صاف ستھرا کمرہ تھا، وہاں تین بیڈ لگے ہوئے تھے۔ بہت اچھا ماحول تھا۔ اس نے ایک بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا نام دلبر ہے، اور وہ میرا بیڈ ہے، تم جو چاہو لے لو۔ جو کچھ بھی چاہئے مجھے بتا دینا۔"

میں نے اسے طرف دیکھا وہ مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے جتنی عمر ہی کا تھا۔ اس کی نگاہیں کافی شوخ تھیں۔

☆......☆......☆

میرا کاندھا زور سے ہلا تو میری آنکھ کھل گئی۔ دلبر مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ میں نے نیند میں ہی پوچھا۔

"اوئے کیا ہو گیا ہے؟"

"ہونا کیا ہے، چل اٹھ، نیچے چل، صبح ہو گئی ہے۔" اس نے کہا اور مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ میں نے کھڑکی کے باہر دیکھا تو نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ صبح ہونے کے آثار تھے۔ میں کسلمندی سے نیچے گیا تو وہاں کا ماحول ہی عجیب تھا۔ وہاں کے سارے لڑکے لنگوٹ باندھے جسم پر تیل ملے ورزش میں مصروف تھے۔ ان کے بدن چمک رہے تھے۔ کوئی ڈنڈ تو کوئی بیٹھکیں لگا رہا تھا۔ مجھے بھی ایک لنگوٹ دے دیا گیا۔ دلبر نے میرے بدن پر تیل لگا دیا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ لالہ وہاں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہاں پر موجود لڑکوں نے دیوار کے ساتھ لگی لاٹھیاں اٹھائیں اور سیدھے ہو گئے۔ چھ سات لڑکے لالہ کے سامنے آ گئے۔ لالہ ان کے درمیان میں گھر گیا۔ ایک لڑکے نے پوری قوت سے لاٹھی لہرائی اور لالہ کے دے ماری، لیکن یہ کیا؟ لالہ نے کمال مہارت سے نہ صرف وہ لاٹھی اپنی لاٹھی سے روک لی، بلکہ اسے گھما کر لڑکے کی پنڈلی پر لاٹھی دے ماری۔ اچانک وہ سبھی لالہ پر پل پڑے۔ صرف لاٹھیوں کی ٹھک ٹھک کی آوازیں آ رہی تھی۔ لالہ بجلی کے جیسی سرعت کے ساتھ نہ صرف لاٹھیوں کے وار بچاتا بلکہ کسی نہ کسی پر وار بھی کر دیتا۔ کمال حیرت یہ تھی کہ کسی ایک کی بھی لاٹھی لالہ کو چھو نہیں سکی۔ تقریباً پانچ سے سات منٹ تک یہ تماشہ چلتا رہا۔ پھر اچانک سب رک گئے۔ لالہ باقی کے لڑکوں کو دھیرے دھیرے سکھانے لگا، میں بھی ان میں شامل تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد لالہ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا۔ وہ مجھے نظروں ہی نظروں میں تولنے لگا۔ میرے ہاتھ میں بھی لاٹھی پکڑی ہوئی تھی۔ اچانک لالہ نے اپنی لاٹھی

گھمائی اور میری پنڈلی پر لاٹھی دے ماری، میں تکلیف سے دہرا ہوا تو میری پشت پر لاٹھی یوں پڑی جیسے کوڑا پڑتا ہے۔ میں سیدھا ہوا تو تیسری لاٹھی میرے کولہے پر پڑی۔ میں تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ لالہ ہنس دیا۔ اس نے میرے آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اپنے بدن پر تکلیف برداشت کر رہے ہو؟ کیسا ہے یہ درد؟“

”بہت زیادہ ہو رہا ہے۔“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

”ایسا ہی درد سامنے والے کو ہوتا ہے، جب تم اسے مارتے ہو۔ لیکن اگر سامنے والے کو موقع مل جائے تو ایسا ہی درد برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جب مار پڑے تو ایسا درد اور تکلیف سہنا پڑتی ہے۔“

”میں ایسا ماہر تو نہیں.....“ میں نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

”اگر ماہر نہیں ہو گے تو ایسی لاٹھیاں پڑتی ہی رہیں گی۔ بچو ان لاٹھیوں سے۔“ لالہ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

”جی بالکل ٹھیک۔“ میں نے کہتے ہوئے کہا۔

”تمہارا پہلا اور آخری سبق یہی ہے، صرف حوصلہ..... حوصلہ ہے تو تم ہو، نہیں ہے تو تم نہیں۔“ لالہ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی سمجھ گیا۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ لفظ ابھی میرے منہ ہی میں تھے کہ لالہ نے لاٹھی لہرائی، میں لمحے کے ہزارویں حصے میں وہاں سے ہٹ گیا۔ اگرچہ لاٹھی مجھے چھو گئی تھی لیکن میں بچ گیا۔ لالہ ہنس دیا۔ پھر بولا۔

”پتر، لاٹھیوں سے لڑنے اور اپنے بچاؤ کے اس فن کو بنوٹ کہتے ہیں۔ یہ ہمارے آباء کا فن ہے۔ اس فن کو سیکھنے کے بعد ہی آگے بڑھا جائے گا۔“

وہ پہلا دن تھا اور پھر کئی ہفتے گزر گئے۔ پہلے پہل میں خوف زدہ تھا، پھر مجھے بھی مزہ آنے لگا۔ وہاں بھی معمول تھا۔ منہ اندھیرے ورزش اور ہنوٹ کا فن۔ پھر ناشتہ کیا اور اپنے کمرے میں، دوپہر کے بعد کھانا اور شام تک یہی سلسلہ چلتا۔ وہاں رہتے ہوئے بس ورزش تھی اور کھانا پینا۔ میں اس چار دیواری سے نہیں نکلا، مگر کئی لڑکے دن کے وقت نکلتے اور دوپہر کے بعد آتے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا تو نہیں لیکن مجھے یہ پتہ چل گیا تھا کہ علاقے میں ان کی بدمعاشی چلتی ہے۔ پورے علاقے پر ان کا راج ہے۔

ایک دن ناشتے کے بعد جب سارے باہر جانے لگے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر چل دیئے۔ دلبر بھی ساتھ تھا۔ راستے میں مجھے اس نے بتایا۔

”پتہ ہے ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”نہیں پتہ۔“ میں نے سکون سے جواب دیا۔

”ایک فیکٹری والا بہت اچھا آدمی ہے، اچھا بندہ ہے، غریبوں کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ اچھا بندہ ہے نا اس لئے ایک سیاست دان نے اس کی فیکٹری پر قبضہ کر لیا ہے۔ پولیس بھی بیٹھی ہے، ہم وہ قبضہ لینے جا رہے ہیں۔“ دلبر نے بتایا تو مجھے اپنے ہی معاشرے کا ایک نیا رخ پتہ چلا۔

ہم وہاں پہنچے تو چند پولیس والوں کے علاوہ بیس پچیس لوگ وہاں تھے۔ ان کے پاس اچھا خاصا اسلحہ بھی تھا۔ ہم میں جو سب سے بڑا لڑکا تھا، اس نے جا کر بڑے پیار سے ایک بندے کو سمجھایا۔

”لالہ فخر کا حکم ہے، یہ جگہ چھوڑ کر چلے جاؤ، اسی میں سب کی بھلائی ہے۔“

”اور اگر ہم نہ جائیں تو......“ سامنے والے گرانڈیل بندے نے طنزیہ انداز میں کہا تو اس

نے زبانی جواب نہیں دیا بلکہ پوری قوت سے اس کے چہرے پر گھونسہ مارا، جیسے ہی اس گرانڈیل شخص کا چہرہ سیدھا ہوا اس کے منہ سے خون نکل پڑا۔ تبھی ایک ریلا فیکٹری کے کونوں کھدروں سے نکلتا چلا آیا اور ہم پر حملہ ہو گیا۔ ہمیں اس وقت پتہ چلا تھا کہ وہ لوگ کتنے ہیں۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم کون کس کے ساتھ کیسے لڑا، میرے سامنے ایک بندہ آیا تھا۔ ظاہر ہے اس وقت میں خود کو نہ بچاتا تو وہ مجھے مارتا۔ وہ ایک لوہے کا پائپ لے کر میری جانب بڑھا تھا۔ اس نے پائپ میرے مارنا چاہا، میں طرح دے گیا۔ پائپ زمین پر لگا تو میں نے پاؤں کی ٹھوکر اس کے سینے پر ماری۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ میں بچنے کی بجائے جوابی وار کروں گا۔ زندگی میں یہ میری پہلی لڑائی تھی۔ وہ الٹ کر پرے جا گرا، اس کے ہاتھ سے پائپ چھوٹ گیا۔ میں نے وہ پائپ اٹھایا اور پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور خون نکلنے لگا، وہ وہیں زمین پر سر رکھ کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ میرے سامنے دلبر لڑ رہا تھا۔ میں بھاگتا ہوا وہاں تک گیا اور مخالف کے سر پر پائپ دے مارا۔ اس کا سر بھی پھٹ گیا۔ اسی لمحے ایک فائر ہوا، جو ہمارے ہی ایک ساتھی کے لگا۔ فائر کی آواز ابھرنے کی دیر تھی، ہمارے کئی ساتھیوں نے اسلحہ نکال لیا۔ ایک دم سے فضا فائرنگ سے گونج اٹھی تھی۔

دلبر مجھے لیے ایک اوٹ میں ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ وہ تاک تاک کر نشانے لگانے لگا۔ دونوں طرف کے لوگ آڑ میں ہو کر فائرنگ کرنے لگے تھے۔ پولیس جو پہلے خاموش تماشائی تھی، وہ وہاں سے غائب ہو گئی۔ اگلے دس منٹ میں سامنے کے لوگ وہاں سے بھاگنے لگے۔ دونوں طرف کے لوگ زخمی ہو چکے تھے۔ مخالفین کا ایک بندہ مر چکا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم نے اس فیکٹری کا قبضہ لے لیا تھا۔ کچھ دیر بعد پولیس کی بھاری نفری وہاں پہنچ گئی۔ اس وقت تک ہم وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ وہ معاملہ جو بھی تھا، لیکن میرا

خوف ختم ہو چکا تھا۔ دلبر میرا بہت اچھا دوست بن گیا تھا۔ مجھے وہاں کی ہر بات بتاتا، میرے ساتھ رہتا، میری ہر طرح سے راہنمائی کرتا تھا۔اب میں باقاعدہ ان کے ساتھ کسی نہ کسی لڑائی میں شامل ہوتا تھا۔ایک بڑے لڑکے نے مجھے پسٹل چلانا سکھایا تھا لیکن میرا نشانہ بہت کچا تھا۔ میں نشانہ پکا کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ میرے دن وہاں پر بہت اچھے گزرنے لگے تھے، اچانک ایک شام چاچا عبدالمجید آ گیا۔اس کے ہاتھ میں مٹھائی کی دو بڑی بڑی ٹوکریاں تھیں۔سب کے ساتھ مجھے بھی بلایا گیا۔میرے سمیت سب کو تجسس تھا۔تب چاچا نے بتایا۔

''لو جی ہمارا علی زین میٹرک کے امتحان میں بہت اچھے نمبر لے کر پاس ہو گیا ہے، یہ مٹھائی اس خوشی میں ہے۔''

لالہ نے مجھے قریب بلایا اور گلے لگا کر کہا۔

''مبارک ہو پتر، پڑھائی نہ چھوڑنا۔''

''میں نے پڑھائی کر کے کرنا کیا ہے، بس یہ......'' میں نے کہنا چاہا تو لالہ نے سختی سے کہا

''اونہیں اوئے......ابھی تجھے بہت کچھ کرنا ہے۔اس کے لئے تیرا پڑھنا بہت ضروری ہے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' میں نے سعادت مندی سے کہا۔اس دن رات کا کھانا کھا چکے تو لالہ نے چاچا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کنجوسی کی ہے، پورے پانچ نان کھائے ہے اس علی زین نے۔''

اس پر چاچا بے اختیار ہنس دیا۔باقی سب بھی ہنسنے لگے۔اس رات میں چاچا کے ساتھ واپس اسی گھر میں آ گیا جہاں میں نے اسلحہ دیکھا تھا۔اب میرے لئے کوئی خوف نہیں تھا۔ لیکن ایک سوال ذہن میں اٹک گیا کہ اس سیف ہاؤس میں اتنا اسلحہ کس کا ہے؟ میں یہ سوال تو

نہ پوچھ سکا، ہاں مگر چند دن بعد میرا کالج میں داخلہ کروا دیا گیا۔ اسی دوپہر مجھے بتایا کہ اب میں کالج کے ہاسٹل میں رہا کروں گا۔ شام کے وقت چاچا نے مجھے ہاسٹل میں پہنچا دیا۔ سامان وغیرہ رکھنے کے بعد چاچا مجھے لے کر کینٹین کے پاس ایک لان میں جا بیٹھے۔ ویٹر کھانے پینے کی چیزیں رکھ گیا تو چاچا بولے۔

"علی زین...... یہاں تمہارے دو کام ہیں، پڑھنا ہے، اور دل لگا کر پڑھنا ہے۔ دوسرا کام جو بھی تیرے سامنے سر اٹھائے اسے دبا دینا ہے۔ ذرا بھی خوف نہیں کرنا۔"

"جی ٹھیک ہے۔" میں نے دبے دبے جوش سے کہا۔

"ابھی کچھ دیر بعد تمہیں ایک لڑکا ملنے آئے گا ظفر نام کا، ظفر موڈی کے نام سے مشہور ہے یہاں۔ میں اسے ابھی بلوا لیتا مگر وہ اس وقت ہاسٹل میں نہیں ہے۔ کچھ پوچھنا ہو تو اس سے پوچھ لینا، ورنہ اپنی مرضی کرنا۔ ذرا بھی نہیں گھبرانا، تم ہر وقت ہماری نگاہوں میں رہو گے۔"

"ٹھیک ہے چاچا۔" میں نے اعتماد سے کہا۔

"کل تمہارا پہلا دن ہوگا، خوب سنبھال کے۔" یہ کہہ کر چاچا مجھے کالج کے بارے میں سمجھانے لگا کہ کون لوگ ہیں جو یہاں پر چھائے ہوئے ہیں اور انہیں یہاں سے نکال باہر کرنا کتنا ضروری ہے۔

اسی رات ایک لمبا تڑنگا لڑکا کمرے میں آ گیا۔ آتے ہی اس نے پسٹل نکال کر میز پر رکھ دیا، پھر کرسی پر بیٹھ کر ٹانگیں میز پر رکھ لیں۔ نجانے کیوں مجھے اس کا یہ انداز اچھا نہیں لگا تھا۔ اس لئے میں نے سرد سے لہجے میں کہا۔

"یہ پسٹل واپس جیب میں ڈال لے اور سیدھا ہو کر بیٹھ۔"

میرے یوں کہنے پر اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ میرا اس کا جوڑ ہی نہیں بنتا تھا۔

میں جسم میں اس سے آدھا تھا۔ وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بڑے واہیات انداز میں بولا۔

”اور پھر بھی سٹائل ہے اپنا۔“

”تو پھرسن یہ کن ٹٹوں والا سٹائل مجھے نہیں پسند، چل سیدھا ہو کر بیٹھ۔“ میں نے کہا تو اس نے بڑے غور سے میری طرف دیکھ کر ٹانگیں سیدھی کر لیں، پھر پسٹل اٹھا کر جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔

”دیکھ جلی، ہم نے یہیں اس ہاسٹل سے اور اسی کالج سے ہی اپنا خرچہ نکالنا ہے، ان پر اگر ہمارا خوف نہ ہوا تو یہ......“

”وہی کن ٹٹا ہے نا تو۔“ میں نے کہا اور قہقہہ لگا دیا۔ میں اسے یہ جتا دینا چاہتا تھا کہ میں اس سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا ہوں۔ نہ میں نے اس کی مرضی سے چلنا ہے۔ وہ سینئر ہونے کے ناطے مجھے اپنا تابع رکھنا چاہتا تھا۔

”تم نئے ہو نا، تجھے نہیں پتہ یہاں پہ تجھے میری کتنی ضرورت پڑنی ہے۔ میں نے اپنا ایک ماحول بنایا ہوا ہے یہاں پہ۔ خوف کھاتے ہیں لڑکے مجھ سے۔ میں تجھے یہ بات سمجھا رہا ہوں، جتنا خوف ہوگا، اتنی بات مانیں گے۔ ورنہ یہ تجھے کھا جائیں گے۔“ اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لیں گے کیا ہوتا ہے، ابھی تم جاؤ۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔

”نہیں یار! تجھے کوئی کھابے شابے کھلاتے ہیں۔“ اس نے خالص غنڈوں کے سے انداز میں کہا تو میں ہنستے ہوئے بولا۔

”میں نے کھانا کھا لیا ہے، کل سہی۔“

”چل ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور میری طرف دیکھتا ہوا چلا گیا۔

اگلے دن کالج جاتے ہوئے میں خود پر جوش تھا۔ میرے لئے ایک نئی دنیا کا در کھلنے جا رہا تھا۔ میں نے بہترین شلوار قمیص پر ویسٹ کوٹ پہنا۔ تیار ہو کر چند کتابیں اٹھائیں اور کالج کی عمارت تک پہنچ گیا۔ مجھے سمجھایا تو تھا کہ کلاس روم کدھر ہیں، میں اس طرف ایک کاریڈور میں جا رہا تھا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک گروپ میرے سامنے آ گیا۔ ان میں سے ایک چلبلی سی، چشمے والی لڑکی نے رک کر بڑے سٹائل سے پوچھا۔

"نئے آئے ہو؟"

"ہاں، میرا آج پہلا دن ہے۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا تو ایک پتلا سا لڑکا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

"نواں آیاں اے سوہنیا...."

اس پر سارا گروپ خواہ مخواہ ہی ہنس دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرا مذاق اڑائیں گے، اس لئے میں نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا تو ایک لڑکے نے میرا کالر پکڑ کر کہا۔

"ایویں ہی جا رہے ہو، تھوڑی خاطر داری تو کروا کر جاؤ نا یار۔"

"کیا مطلب؟" میں نے جھٹکے سے کالر چھڑاتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ......" یہ کہہ کر اس نے اپنے گروپ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا، "کیا کریں یار اس کے ساتھ؟"

سبھی میری طرف دیکھنے لگے تو ایک لڑکی طنزیہ لہجے میں بولی۔

"دیکھو نا یہ ویسٹ کوٹ پہنا ہوا، بڑا سیاست دان ٹائپ کا بن کر آیا ہے، اس کے تھوڑی دیر کان پکڑوا دیں، پھر تھوڑی تقریر بھی سنیں۔"

اس پر سب نے قہقہہ لگا دیا۔ تبھی وہ لڑکا ہاتھ کے اشارے سے مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"چل بھئی کان پکڑ کر سوچ کیا تقریر کرنی ہے، جلدی کر۔"
"اوئے چھوڑ اس قصے کو، جانے دے مجھے۔" میں نے مسکراتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ میرے سامنے ایک بچہ ہو۔
"یہ تو ہونا ہی ہے تمہارے ساتھ، اکڑ دکھاؤ گے تو پھر کچھ خاص بھی ہو سکتا ہے، کیا سمجھے؟"
اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تو میں اس کی بات نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جیسے ہی میں نے قدم بڑھایا، مجھے پھر کالر سے پکڑ کر کھینچا گیا۔ ایک دم سے غصہ میرے دماغ میں چڑھ گیا۔ میں پلٹا، جس نے میرا کالر پکڑا ہوا تھا، میں نے گھما کر تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ چٹاخ کی آواز سے کاریڈور گونج اٹھا۔ ارد گرد کھڑے لوگ بھی متوجہ ہو گئے۔ شاید انہیں اس طرح کے ردعمل کی امید نہیں تھی۔ اگلے ہی پل لڑکیاں ایک طرف ہٹ گئیں اور چار پانچ لڑکے مجھے مارنے کے لئے لپکے۔ میں الٹے قدموں پیچھے ہٹا، وہ میرے سامنے آ گئے۔ میں نے کتابیں ایک طرف پھینک دیں اور لڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔ جس کے تھپڑ پڑا تھا، اس نے ابھر کے میرے گھونسہ مارنا چاہا، میں ایک طرف ہوا اور ایک تھپڑ مارا جو اس کی گردن پر لگا۔ وہ پانچوں مجھے مار رہے تھے اور میں اکیلا ان کا مقابلہ کر رہا تھا، نجانے کتنے لوگ یہ دیکھ رہے تھے۔ تبھی میں نے فیصلہ کن انداز میں ایک کو تاک لیا، اسے پکڑا اور اس کے سینے پر زور دار گھونسہ مارا، وہ وہیں دہرا ہو گیا۔ میں جھکا اور ایک کی ٹانگ پکڑ لی وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پایا، میں نے اسے تھوڑا سا پیچھے کیا اور پوری قوت سے ٹھوکر اس کے منہ پر ماری۔ اس دوران میرے تھپڑ گھونسے لگتے رہے، دوسرا گرا تو میں نے تیسرے کو پکڑ لیا، وہ مجھے مارنے کے لئے ہاتھ اوپر اٹھا چکا تھا۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور گھما کر اسے دیوار میں مارا، اس کا سر پھٹ گیا، میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں یہ دیکھتا کہ اس کا خون کتنا نکلا ہے، میں نے

چوتھے کو پکڑا، اسے اپنی کمر پر لاد کر فرش پر دے مارا، جیسے ہی وہ گرا میں نے اس کی پسلیوں میں پورے زور سے ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلا اٹھا۔ پانچواں یہ حشر دیکھ کر بھاگنے کے لئے پر تول رہا تھا، میں نے پیچھے سے اسے پکڑا، گھمایا اور ایک ستون میں دے مارا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ پانچوں کاریڈور میں فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ سہمی ہوئی لڑکیاں ایک طرف کھڑی یہ منظر یوں دیکھ رہی تھیں جیسے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ میں آگے بڑھا اور جس نے میرا کالر پکڑا تھا، اسے کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور بولا۔

''کیا کہا تھا تم نے؟''

''چل یار معاف کر دے۔'' اس نے شرمندگی سے کہا۔

''کان پکڑو گے تو معاف کروں گا، ہاں مگر تقریر نہیں سنوں گا۔'' میں نے کہا تو اس نے دردمندانہ انداز میں مجھے دیکھا، میں نے چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اسے چھوڑ دیا۔

میرے کپڑے پھٹ چکے تھے اور کافی ساری مار بھی پڑ چکی تھی۔ میرا جسم درد کر رہا تھا۔ اس لئے کلاس روم میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اس لئے میں واپس پلٹا اور ہاسٹل چلا گیا۔

اگلے دن جب میں کالج گیا تو کئی لڑکے گیٹ پر ہی میرے منتظر تھے۔ وہ کوئی چودہ سولہ لڑکے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا، کسی کے چین، کوئی ہاکی لئے ہوا تھا۔ مجھے اندازہ تھا ایسا ہی کچھ ہوگا۔ گیٹ سے تھوڑے فاصلے پر لالہ فخر کے ڈیرے سے آئے ہوئے میرے دوست لڑکے کھڑے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ میرا حوصلہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔ میں نے بڑے اعتماد سے گیٹ پار کرنا چاہا تو ایک نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔

''اوئے تم ہی لڑے تھے نا کل؟''

"ہاں اوئے، میں ہی لڑا تھا۔" میں نے بے باکی سے اس کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو کہنے والے نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا۔ اس وقت وہ میری جانب بڑھنے ہی والا تھا کہ ایک نوجوان سے لڑکے نے اسے روک دیا۔

"سچی بات کہوں، مجھے تیرا جواب پسند آیا، تُو کچھ بھی ہو سکتا ہو، بزدل نہیں ہو سکتا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن مجھے تم لوگ بڑے بزدل لگے ہو، ڈرپوک اور گھٹیا، صرف ایک بندے کے لئے اتنے لڑکے؟" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"بات سن شہزادے، تم ہمیں ہولا لے رہے ہو، میں اگر یہ نہ چاہوں تاکہ تم گیٹ پار کر کے اندر چلے جاؤ تو تم جا نہیں سکتے ہو۔" اس نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو میں ہنستے ہوئے پوچھا۔

"چل پھر دیکھ لیتے ہیں۔ بولو، روک سکتے ہو مجھے؟"

"لگتا ہے تم سمجھدار نہیں ہو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"سمجھدار ہوں جو تم سے اب تک سمجھانے والے انداز میں بات کر رہا ہوں، ورنہ جس طرح تم نے میرا راستہ روکا ہے، میں اب تک تمہیں اس کی سزا دے چکا ہوتا۔" میں نے رعب سے کہا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا، وہ مجھے دیکھ رہا تھا، اور میرے اتنے بڑے بول کو ہضم نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے دوست لڑکے کچھ قریب آ چکے تھے۔ وہ ہماری باتیں سن رہے تھے۔

"لگتا ہے تم نہیں مانو گے؟ چل پھر کر پار گیٹ......" اس نے شدید غصے میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور اگر میں پار کر گیا تو؟" میں نے پوچھا۔

"اب تو پار تو کر شہزادے۔" اس نے غصے میں کہا۔

"دیکھو میں پھر جب تک میں یہاں ہوں، تم لوگوں کو یہ گیٹ پار کرنے نہیں دوں گا۔"

میں نے کہا تو ایک لڑکا غصے میں میری جانب بڑھا، اس نوجوان نے روکتے ہوئے کہا۔

"چل کر پار......"

میں نے ان سب کی طرف دیکھا، اور قدم بڑھا دیئے، جیسے ہی میرا پہلا قدم اٹھا، ایک ڈنڈا میری کمر پہ پڑا۔ میں جانتا تھا کہ میرے دوست سب سنبھال لیں گے۔ گیٹ چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں گھوما اور ڈنڈا مارنے والے کی طرف دیکھا، وہ دوسری بار مجھے مارنے کے لئے ڈنڈا لہرا چکا تھا، وہ جیسے ہی میری طرف آیا، میں نے وہ ڈنڈا پکڑا اور جھٹکا دے دیا۔ ڈنڈا میرے ہاتھ میں آ گیا۔ یہ 'بنوٹ' کا ایک خاص داؤ ہے، جس کا ان بے چاروں کو کیا پتہ تھا۔ میں الٹے قدموں گیٹ کی جانب بڑھنے لگا۔ کئی سارے لڑکے میری جانب بڑھے، میں اس وقت تک گیٹ پار کر گیا تھا۔ وہ سارے میری طرف بڑھے تو میرے دوست لڑکے ان کے پیچھے آ گئے۔ پھر دو سے تین منٹ لگے۔ انہیں یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ان کے ساتھ ہو کیا گیا ہے۔ کئی لڑکوں کے سر پھٹ گئے۔ وہ خون سے لت پت بھاگتے پھر رہے تھے۔ دو تین لڑکے واقعتاً لڑائی میں ماہر تھے مگر وہ میرے دوستوں کے سامنے نہیں رک سکتے تھے، جن کا کام ہی لڑنا بھڑنا تھا۔ کچھ لڑکے بھاگ گئے اور کچھ گیٹ پر لیٹے پڑے ہوئے تھے۔ وہ جو مجھ سے بات کر رہا تھا، وہ پھٹے ہوئے سر کے ساتھ میری جانب حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور بولا۔

"بول، اب بھی جائے گا گیٹ کے اندر؟"

"تجھے میری دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"میں ویسے بھی کسی سستی شے کا قائل نہیں ہوں، ابھی بتا دو کتنی مہنگی پڑے گی ورنہ تیری ہڈی پسلی توڑ کر بتاؤں؟" میں نے غصے میں ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"تم باہر سے غنڈے بلوا کر......" اس نے کہنا چاہا تو میں غصے میں بولا۔

"یہ تو اب آتے ہی رہیں گے، اب اگر تم اگلے دو منٹ یہاں رہے تو تمہ دوسرا ہڈی توڑ راؤنڈ شروع ہو جائے گا۔" میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں خوف پھیل گیا تھا۔ میں اسی خوف کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے جھٹکا دے کر اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ وہ مڑا اور اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر وہاں سے چل پڑا۔ میں نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور ہاسٹل کی طرف چل دیا۔ میرے کپڑے پھٹ چکے تھے۔

اسی شام ظفر موفڈی میرے پاس کمرے میں آ گیا۔ اس نے دروازے میں آتے ہی زور دار انداز میں کہا۔ "او خوش کر دیا شہزادے تم نے، کمال کر دیا بھئی۔"

"کیا ہو گیا سرکار۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"پتہ ہے تم نے کسے گیٹ پر مارا ہے، زوبی کو...... کوالمنڈی کا غنڈہ ہے وہ...... اب تو دو باتیں ہی ہوں گی۔" اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"کون سی دو باتیں؟" میں نے پوچھا۔

"یا تو کل وہ بھرپور انداز میں تم پر وار کرے گا، یا پھر کبھی سامنا نہیں کرے گا، لکھوا لو مجھ سے۔" اس نے پرتجسس لہجے میں کہا۔

"چل پھر وہاں سے کاپی اٹھا اور لکھ دے۔" میں نے مذاق میں کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا تو وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

"اُو کیا بات ہے تیری شہزادے، بڑی اونچی اڑان ہے تیری۔"

"تو آگے آگے دیکھ ہوتا کیا ہے، چل چھوڑ آ کھانا کھا کر آئیں۔" میں نے کہا اور اٹھ گیا۔ وہ میرے ساتھ ہاسٹل سے نکل کر ایک ریستوران پر آ گیا۔

اگلے دن میں کالج میں تھا۔ ظفر موٹڈی کی بات میرے ذہن میں تھی۔ کالج گیٹ پر میں نے بکھر کر کھڑے اپنے دوستوں کو دیکھ لیا تھا۔ میں جب کالج کے اندر گیا تو وہ بھی آ گئے۔ میں کلاس روم کی طرف بڑھ گیا۔ پروفیسر پڑھا رہے تھے۔ میں نے باقاعدہ اجازت لی۔ اجازت ملتے ہی میں کلاس میں داخل ہوا تو سب نے مجھے یوں دیکھا، جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔

کلاس ختم ہوئی تو میں باہر کاریڈور میں آ گیا۔ سبھی مجھ سے دوستی کے خواہاں تھے۔ ان میں کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ میرے ساتھ دو چار لڑکے اور لڑکیاں چلتی رہیں اور میں ان کے ساتھ کینٹین پر آ بیٹھا۔ میرے سارے دوست جا بجا بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے بات نہیں کرنی تھی۔ اپنے کلاس فیلو کے ساتھ دوستی میری مجبوری بھی تھی۔ ہمیں وہاں بیٹھے چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ ایک لڑکی آئی، اس نے کسی دوسرے ٹیبل سے کرسی اٹھائی اور بالکل میرے سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ میں اسے پہچان گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی، جو سب سے پہلے اس کالج میں مجھ سے ہمکلام ہوئی تھی۔ جس کے بعد اک لڑائی چھڑ گئی تھی۔ وہ چشمے کے پیچھے سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"سوری......"

"کسی نئی لڑائی کی بنیاد رکھنے آ گئی ہو؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں، میں دوستی کرنے آئی ہوں، کر لو تو ٹھیک، ورنہ سوری۔" اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا تو میں ہنس دیا۔ میرے ساتھ سبھی ہنس دیئے۔

”سوری کیوں؟“ میں نے پوچھا۔
”بس ...... غلطی میری تھی، اور میرے ’جیسا بندہ‘ تمہیں سوری کہے، مجھو تو یہ بہت بڑی بات ہے۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اس کے چہرے اور سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
”بندہ...... میں سمجھا نہیں۔“
”ہاں بندہ، میں لڑکی ہونے کا مارجن نہیں لینے والی، میں ایک دوست کی حیثیت سے کہہ رہی ہوں، سمجھ میں آجائے تو بتانا، صائمہ نام ہے میرا۔“ اس نے کہا اور ایک دم سے اٹھ کر چلی گئی۔ میں سمجھ ہی نہ سکا وہ کیا شے ہے۔ خیر وہ دن خیر و عافیت سے گزار کر میں ہاسٹل چلا گیا۔
ہاسٹل تو تھا ہی کالج بھی ایک نئی دنیا تھی۔ مجھے چند دن لگے کالج اور پھر ہاسٹل کو سمجھنے میں۔ اس طرح میری زندگی میں ایک نیا دور آ گیا۔ ہر آنے والے دن میرے دوستوں اور دشمنوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ میرے ارد گرد ہر طرح کے لڑکے لڑکیاں جڑتے چلے گئے۔ میں کافی عرصہ صائمہ سے دور رہا۔ لیکن دھیرے دھیرے مجھے سمجھ آ گئی، وہ ایک عام سی لڑکی نہیں تھی۔ وہ اس گروپ کی واحد لڑکی تھی جو کالج میں آ رہی تھی۔ ورنہ مجھ سے مار کھانے والے یا تو کالج چھوڑ چکے تھے یا پھر آتے ہی نہیں تھے۔ پھر گزرتے وقت کے ساتھ وہ میرے قریب ہوتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

اس دن صائمہ مجھے اپنی نئی اور مہنگی کار پر شاہدرہ کے علاقے میں موجود جہانگیر کے مقبرے پر لے گئی۔ کچھ دیر مقبرہ پر گھومنے پھرنے کے بعد وہ ایک روش پر بیٹھ گئی۔ میں نے بھی اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
”یہاں کیوں لے آئی ہو؟“

”مجھے یہاں کا ویرانہ بہت پسند ہے۔ کچھ لوگ ہوں گے اکا دکا، ورنہ ماحول میں کتنا سکون ہے۔“

”یہ سکون وہاں کالج میں بھی بیٹھ کر لیا جا سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کالج کو چھوڑو...... یہاں کے ماحول کی سنو...... سچ پوچھو تو جب میں تمہیں وہاں دیکھتی ہوں، تمہارا وحشی پن میری نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے، میں اب بھی تم سے خوف زدہ ہوں۔“ وہ نجانے کس رو میں کہہ گئی۔

”پھر مجھ سے دوستی کیوں کی؟“ میں نے پوچھا تو وہ الجھتے ہوئے بولی۔

”علی میری ایک بات سنو...... ایک لڑکی ہونے کے ناطے میرے لئے تم میں بے انتہا کشش ہے۔ سبھی لڑکیوں میں تمہارے لئے کشش ہو گی، لیکن میں تمہارے ساتھ کچھ وقت اچھا گزارنا چاہتی ہوں، مجھے تم سے محبت بھی نہیں ہے اور نہ کوئی عشق ہے، بس تم اچھے لگتے ہو، جتنا وقت ہم یہاں اس کالج میں ہیں، میں چاہتی ہوں، ہم یہ وقت بہت اچھا گزار دیں۔“

مجھ سے اگر کوئی لڑنے کے بارے میں بات کرتا، جوڈو کے کسی پینترے کی گفتگو کرتا، کشتی کے کسی داؤ بارے بتاتا تو مجھے اس کی بڑی سمجھ آتی تھی لیکن اگر کوئی یہ عشق، محبت اور پیار وغیرہ کی باتیں کرتا تو مجھے یہ بالکل ہی فضول اور غیر منطقی سی لگتی تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ مجھے لڑکیوں سے نفرت تھی یا مجھے وہ اچھی نہیں لگتی تھیں۔ بس مجھے سمجھ نہیں آتی تھی۔

”اچھا تم اپنا وقت تو بہت اچھا گزارنا چاہتی ہو، مجھ سے پوچھا کہ میں بھی ایسا چاہتا ہوں یا نہیں؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا تو چند لمحے غور سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر بولی۔

”اب تم چاہو تو...... میرا تم پر کوئی زور تو نہیں ہے۔“

"ہاں بس یہ زور زبردستی والے جذباتی تعلق نہیں چلیں گے۔" میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔ اس دن ہم کافی وقت گزار کر ایک ریستوران میں آئے وہاں سے کھانا کھایا۔ صائمہ نے بڑے انداز سے بل دینے کی کوشش کی تو میں نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ اگرچہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن ان دنوں میں اسے بہت برا سمجھتا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے ایک عورت مجھ پر خرچ کرے، یہ میری مردانگی کی توہین تھی۔ بس ایسی ہی سوچیں تھیں۔

ایسے ہی ایک دن وہ مجھے جلو پارک کی طرف لے گئی۔ وہاں ایسا ماحول بھی ملا تھا، جہاں پر جنگل اور تنہائی بھی تھی۔ اس نے کار پارک کی اور وہیں قریب ہی ایک کپڑا بچھا کر بیٹھ گئی۔ ہمارے ارد گرد درخت تھے، سبزہ تھا، تنہائی کے ساتھ خاموشی تھی۔ وہ کھانے بھی لے کر آئی تھی۔ یونہی باتیں کرتے کھاتے پیتے کافی وقت گزر گیا۔ اس وقت وہ دونوں ہتھیلیوں سے پیچھے کی طرف ٹیک لگائے آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اسی خاموشی میں کافی وقت گزر گیا تو اچانک دھیمے سے لہجے میں بولی۔

"علی میں تم سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"بولو، ایسی کیا خاص بات ہے؟" میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"خاص نہیں، بہت ہی خاص بات ہے۔" اس نے سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ بولی، "دیکھو، بات جیسی بھی ہو، اس پر بھڑکنا مت، بلکہ غور کرنا، سوچنا میری بات پر۔"

"اچھا کہو، کیا کہتی ہو۔" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"علی، میں جانتی ہوں کہ تمہارے پاس کچھ نہیں ہے، تم اس دنیا میں اکیلے ہو، یہ تم لڑتے جھگڑتے ہو، تم میں بے انتہا حوصلہ ہے۔ لیکن کب تک؟ ایک دن تم مارے جاؤ گے، یا

تمہارے ہاتھوں کوئی قتل ہو جائے گا، پھر زندگی جیلوں میں گزرے گی، یہ حوصلہ، یہ قوت یہ سب دھوکا ہے۔ کیا فائدہ اس کا؟" اس نے کہتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تو میں نے پوری ایمانداری سے کہا۔

"میں خود نہیں جانتا صائمہ کہ اس کا نقصان ہے یا فائدہ۔"

"میں نے دیکھا ہے، نہ تم کسی سے بھتہ لیتے ہو، نہ کسی کو بلیک میل کرتے ہو، نہ کسی تنظیم کے ساتھ چلتے ہو، آخر ایسا کیوں کرتے جا رہے ہو؟" اس نے پھر گھما کر یہ سوال کیا تو میں نے ویسا ہی جواب دیا۔

"میں نہیں جانتا، شاید میں زندہ رہنا چاہتا ہوں، اس لیے۔"

"یہ دنیا ہے نا، یہ ہر کسی کو توڑ دیتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ٹوٹا ہوا ہو تو دوسرا کوئی ٹوٹا ہوا مضبوط کر دیتا ہے۔ دو ٹوٹے ہوئے مل کر مضبوط ہو سکتے ہیں۔ کیا ایسا ہے نا؟" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"صائمہ تم وہ کہو، جو کہنا چاہتی ہو، پہیلیاں نہ ڈالو۔" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو پھر سنو...... میں بھی ٹوٹی ہوئی ہوں اور تم بھی، میں تم......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"تم ٹوٹی ہوئی، میں سمجھا نہیں؟"

"چھوڑو، اس بات کو، جو میں کہہ رہی ہوں وہ سنو۔ میں اتنا پیسہ لا سکتی ہوں کہ ہم ایک بہترین زندگی گزار سکتے ہیں۔ مجھے اپنے ساتھ لو اور ہم کہیں غائب ہو جائیں۔ جہاں کم از کم چند برس ہمیں کوئی تلاش نہ کر سکے۔ یا پھر...... اپنی اپنی جگہ پر رہتے ہوئے پیسہ بنائیں، اور......" وہ کہنے لگی تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے ٹوکتے ہوئے پوچھا۔

"پہلی والی بات تو ہو نہیں سکتی، دوسری بات کے بارے میں بتاؤ، اس میں پیسہ کہاں سے

بنانا ہے۔"

"نہیں اس کالج میں ہیروئین پھیلا کر۔ بلکہ جو کوئی مانگتا ہے، اسے دیں گے۔ پیسہ

بنائیں گے۔" اس نے ایک دم سے کہہ دیا۔

"صائمہ تم نے میرے بارے میں بہت غلط اندازہ لگایا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن ایسا سب چل رہا ہے، ہمیں کرنا صرف یہ ہے کہ ان لوگوں کو بھگا کر اپنا نیٹ ورک

بنانا ہے، بس۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں صائمہ، ان لوگوں کو بھگانا ہے اور کسی کو ایسا کرنے بھی نہیں دینا۔" میں نے فیصلہ کن

انداز میں کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد بولی۔

"ابھی تم جذباتی انداز میں کہہ رہے ہو لیکن میری باتوں پر غور کرنا۔"

"اچھا کروں گا۔" میں نے اکتاہٹ سے کہا اور اسے چلنے کو کہا، میرا من اس سے اوب گیا

تھا۔ میں سمجھ گیا تھا، اس نے بھی اپنے مقصد کے لئے میرے ساتھ دوستی کی تھی۔

وقت گزرتا رہا، کالج کا ایک برس مکمل ہو گیا تھا۔ اس دوران نجانے کتنی لڑائیاں ہوئیں،

کتنے جھگڑے ہوئے، لیکن میں اور میرے ساتھ جڑنے والے لڑکے اور لڑکیوں نے کالج پر اپنا

رعب قائم کر لیا تھا۔ ہم جو چاہتے تھے وہی ہوتا تھا۔ منشیات بیچنے والوں کا ایک گروہ جو کالج

میں سرگرم تھا۔ اسے ختم کرتے ہوئے ہمیں کچھ وقت لگ گیا لیکن ہم نے کر دیا۔ اس دوران

صائمہ نے پھر ایسی کوئی بات نہیں کی۔ وہ میرے رنگ میں ڈھل گئی۔

کہتے ہیں انفارمیشن سب سے بڑی قوت ہے۔ صائمہ کہاں سے اور کیسے معلومات لاتی

تھی، میں نہیں جانتا تھا لیکن اس کی لائی ہوئی ہر خبر سو فیصد درست اور پکی ہوتی تھی۔ بہت

سارے ایسے معرکے، جن میں بظاہر ہم شکست کھا چکے ہوتے تھے، ایسی ہی اطلاع پر ہم نے جیتے۔ نجانے اُسے کیسے خبر ہو جاتی تھی کہ گوالمنڈی میں کن لوگوں کی میٹنگ ہمارے خلاف ہوئی ہے۔ کون دوسرے کالج سے بندے تیار کر رہا ہے، کس نے ہمیں گھیرنے کا پروگرام بنالیا ہے۔ اسے سب پتہ ہوتا تھا۔ وہ میری شکست نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ مجھ پر بے تحاشا پیسہ خرچ کرتی تھی۔ یوں جیسے اس کا مشغلہ ہی یہی ہو۔ میں اگر اسے روکتا تو وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ میں نے بھی اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ میرا اور اس کا تعلق بس یونہی چلتا رہا۔

کالج کے آخری دن چل رہے تھے۔ امتحان قریب آ گئے۔ میں نے کچھ بھی نہیں پڑھا تھا۔ بس وقت گزاری کی تھی۔ انہی دنوں چاچا عبدالمجید نے مجھے ایک لڑکے سے متعارف کروایا۔ چھریرے بدن کا، سرخ و سفید، درمیانہ سا قد، تیکھے نین نقش، چہرے پر سنجیدگی، داڑھی مونچھیں جیسے ابھی پھوٹ رہی تھیں اور گہری آنکھوں والا وہ لڑکا میرے پاس ہاسٹل میں آیا تھا۔

"میں ہوں شہباز وڑائچ۔" دروازے پر کھڑے اس لڑکے نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں دروازے سے ہٹتے ہوئے بولا۔

"آؤ، اندر آجاؤ۔"

وہ اندر آ کر بے تکلفی سے بستر پر بیٹھ گیا۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک دم سے ہنس دیا، پھر بولا۔

"ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟"

"میں سوچ رہا ہوں جس مقصد کے لئے آئے ہو، ہو جائے گا تم سے؟"

"مطلب تم چاچا کی صلاحیتوں پر شک کر رہے ہو؟" اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا تو میں

ہنس دیا تو خوشگوار لہجے میں تبصرہ کرتے ہوئے بولا۔

''کافی تیز لگتے ہو۔''

''کانٹو کھلنے میں اگر دیر لگتی ہے نا تو رسی کاٹ دینی چاہئے۔ مجھے بھوک لگی ہے، کھانا یہیں منگوالو۔ باہر گاڑی میں میرا بیگ پڑا ہے، وہ منگواؤ، مجھے فریش ہو کر تھوڑی دیر سونا ہے، پھر بات کریں گے۔'' اس نے یوں کہا جیسے حکم دے رہا ہو۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایسی ہی صورت حال میں کہتے ہیں نا گدھے کو باپ بنانا۔''

''جو مرضی سمجھو، جتنی خدمت کرو گے اتنا پھل پاؤ گے۔'' اس نے کہا اور جوتے اتارنے لگا۔ نجانے کیوں مجھے اس کا بے تکلفانہ انداز بے حد پسند آیا تھا۔ وہ بستر پر پھیل گیا تو میں نے کار کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

شہباز وڑائچ میری جگہ امتحان دینے آیا تھا۔ چاچا عبدالمجید نے ہی اس کا انتخاب کیا تھا۔ ظاہر ہے اس میں ایسی خوبی تھی جو اسے میرے پاس بھیجا گیا تھا۔ اس نے میرے پاس تقریباً ایک ماہ رہنا تھا۔ مجھے وہ پہلی نگاہ میں ہی اچھا لگا تھا۔ اس رات میں اسے اچھے سے ریستوران میں کھانے پر لے گیا اور جس وقت ہم واپس آئے تو وہ میرے ساتھ اس طرح گھل مل گیا تھا جیسے ہم میں نجانے کتنے برسوں کی دوستی ہے۔

شہباز میرے پاس ایک ماہ سے بھی کم وقت رہا تھا۔ اس نے وہ مرحلہ بخوبی طے کر لیا تھا جس کے لئے وہ میرے پاس آیا تھا۔ جس دن وہ واپس جانے لگا تو میں نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

''یار دل لگ گیا تھا تیرے ساتھ، کچھ دن مزید رہ جاؤ، کیا کرنا ہے جا کر؟''

"یار تم ہو خشک بندے۔ تم خود اپنی زندگی میں رنگینی نہیں لانا چاہتے ہو۔ اور سچ پوچھو تو مجھے یہ خشک زندگی پسند نہیں ہے۔" اس نے صاف لفظوں میں میرا کچا چٹھا سامنے رکھ دیا۔

"میں نے تمہیں کسی رنگینی سے روکا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم چاہو بھی تو مجھے نہیں روک سکتے۔ مگر میری چاچا سے کمٹمنٹ تھی وہ میں نے پوری کر دی۔ اب جانا ہے مجھے۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا تو میں ہنس دیا۔ پتہ نہیں وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا تھا۔ بہر حال وہ اپنی بہترین یادیں چھوڑ کر چلا گیا۔ امتحان بہت اچھا ہو گیا تھا۔ اب صرف رزلٹ کا انتظار تھا۔ وہ وقت تو گزارنا تھا۔

میں واپس چاچا عبدالمجید والے گھر آ گیا۔ میرا دن لالہ فخر کے ڈیرے پر گزرتا تھا اور شام میں اپنے گھر میں، لالہ جی کے ایک شاگرد نے جم کے ساتھ ایک شوٹنگ کلب بنا لیا تھا، میں نے وہ جوائن کر لیا۔ میرا بہت سارا وقت وہیں گزرنے لگا۔ چاچا عبدالمجید کے یہاں کچھ دن میں اکیلا رہا پھر دو تین لوگ مزید رہنے کے لیے آ گئے تھے۔ وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ ان کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ بس وہ کھاتے پیتے، سوتے اور موج مستی کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک شام ہم ریستوران سے کھانا کھا چکے تو ان میں سے ایک کے من میں نجانے کیا آئی۔

"یار آج تو گانا سننے کو من کر رہا ہے۔"

"ابے او مغل شہزادے، وہ دور گیا، جب مغنیہ نغمہ سرا ہوا کرتی تھیں۔ تم لکھنو میں نہیں لاہور میں رہتے ہو۔" دوسرے نے کہا۔

"بس سننا ہے آج، میں بڑا غمگین ہوں۔"

"کیا تمہاری معشوق نے تمہیں بھائی کہہ دیا ہے آج؟" دوسرے نے جل کر کہا، تیسرا ابھی تک خاموش تھا، دونوں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا

"چل اس چھوٹے سے پوچھتے ہیں، جو یہ کہے گا۔"

"میرا کوئی تجربہ نہیں ہے۔" میں نے تیزی سے بتایا۔

"چل پھر آج اسے تجربہ کروا دیتے ہیں۔" تیسرے نے ہنستے ہوئے کہا اور قریبی پبلک کال آفس میں چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے فون کئے اور واپس آ کر بولا۔ "چل ٹیکسی پکڑ، چلتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد ہم ٹیکسی میں بیٹھے گلبرگ تھرڈ کے علاقے کی جانب جا رہے تھے۔ کہنے کو تو طوائفیں ہیرا منڈی میں ہوتی تھیں، لیکن عرصہ ہوا، ہیرا منڈی اُجڑ چکی تھی۔ جب ہیرا منڈی اجڑی تھی، تب وہاں کی طوائفیں اپنی حیثیت کے مطابق مختلف علاقوں میں شفٹ ہو گئی تھیں۔ جو امیر تھی، وہ ڈیفنس، گلبرگ اور ماڈل ٹاؤن وغیرہ چلی گئی تھیں۔ ہم ایک مارکیٹ میں جا پہنچے۔ ایک دوکان کے سامنے ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ تیسرے شخص کے ساتھ بڑے تپاک سے ملا۔ گپ شپ ہوئی اور ہمیں لے کر وہ پیدل ہی چل پڑا۔ تھوڑی دور بنگلے شروع ہو گئے۔ وہ ہمیں ایک بنگلے میں لے گیا۔ پہلی نگاہ میں وہ ایک گھریلو سا ماحول تھا۔ تیسرا تھوڑی دیر کے لئے اس شخص کے ساتھ کہیں اندرونی کمرے میں گیا، پھر جیسے ہی لاؤنج میں آیا تو وہ ہمیں ایک بڑے سارے تہہ خانے میں لے گیا۔ جو شاید بنایا ہی اس مقصد کے لئے تھا۔ وہاں وہی پرانا ماحول تھا، جو فلموں میں دکھائی دیتا تھا۔ سازندے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے پہنچتے ہی انہوں نے بڑے خوشامدانہ انداز میں ہماری پذیرائی کی۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا، ایک موٹی سی ادھیڑ عمر عورت وہاں آ گئی۔ اس کے ساتھ دو تین لڑکیاں تھیں جنہوں نے کھانے پینے کا سامان اٹھایا تھا، وہ رکھ کر چلی گئیں۔ موٹی عورت اسی تیسرے سے باتیں کرنے لگی۔ سازندے ہلکی ہلکی موسیقی بجا رہے تھے۔ تبھی دو لڑکیاں وہاں

آگئیں۔ ان میں سے ایک کو دیکھتے ہی میں چونک گیا۔ وہ صائمہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیت اتنی گہری تھی کہ میں اسے پہچانتے ہوئے بھی شک میں پڑ گیا کہ ممکن ہے یہ کوئی اور ہو سکتی ہے۔ ایک لڑکی وہیں سازندوں کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے گانا شروع کر دیا، جبکہ صائمہ رقص بھاؤ دینے لگی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ گیت کے ساتھ موسیقی کی تان تیز ہوتی گئی۔ وہ وہی پنجابی فلمی گانے گا رہی تھیں۔ میں بجائے لطف لینے کے بے چین ہو چکا تھا۔ مجھے وہاں پر کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن جبر کیے بیٹھا رہا۔ اسی طرح دو گھنٹے گزر گئے۔

رات گئے جب ہم وہاں سے نکلے تو میرے اندر کئی سوالوں کے ساتھ دبا دبا غصہ بھی تھا۔ مجھے یاد تھا کہ صائمہ نے مجھے منشیات بیچنے کی ترغیب دی تھی۔ میں اگر کوئی آوارہ ہوتا تو شاید اس کام پر لگ جاتا، لیکن میری تربیت چاچا صبا لجید کر رہا تھا۔ ہر ویک اینڈ پر میری اس سے تفصیلی بات ہوتی تھی۔ لیکن صائمہ ایک طوائف زادی نکلے گی، مجھے یہ جان کر دکھ ہوا تھا۔ جب تک ہم گھر پہنچے، میں اسے ذہن سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ مجھے وہ پرانی یادیں آنے لگیں، وہ ساری باتیں ایک ایک کرکے ذہن میں ابھرتی رہیں۔ صائمہ کا یہ رنگ دیکھ کر مجھے ایک دھچکا سا لگا تھا۔ اس کی بہت ساری باتیں میری سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ ایک افسردگی تھی جو مجھ پر طاری ہوئی اور یہ کئی دن تک رہی۔

انہی دنوں میں دوپہر کے وقت لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا کہ فون بج اٹھا۔ میں فون تک گیا، کریڈل اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے ہلکی سی آواز ابھری۔

''صائمہ بات کر رہی ہوں۔''

''تمہیں یہاں کا نمبر کس نے دیا؟'' میں نے بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

''یہ سوال نہیں کرتے۔'' اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”او...... چلو ٹھیک ہے، یہ تو پوچھ سکتا ہوں نا کہ......“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”یہی کہ میں نے فون کیوں کیا۔ یہی نا“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی پھر بولی، ”سوچا تھا تم سے کبھی بات نہیں کروں گی، کبھی نہیں ملوں گی، مگر تمہیں دیکھا تو پھر مجھ سے رہا نہیں گیا۔“

”کہو جو کہنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”وقت بیت گیا ہے علی، اب شاید ہم نہ مل پائیں، ہاں کچھ دیر مل بیٹھ کر باتیں ہی کر سکتے ہیں۔ اور پھر وہ باتیں بھی کیا ہوں گی۔ دکھ دینے والی۔“ اس نے یوں کہا جیسے اس کے آواز میں درد بول رہا ہو۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“ میں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

”نہیں میں ایک بار تم سے ملنا چاہتی ہوں، بس ایک بار، پھر کبھی نہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”ٹھیک ہے، جب چاہو۔“ میں نے کہا تو ہمارے درمیان اگلے دن ہی کے لئے وقت اور مقام طے ہو گیا۔

میں نے مارکیٹ میں اپنی کار پارک کی اور اسی مخصوص جگہ پر جا کھڑا ہوا، جہاں ہمارے درمیان طے ہوا تھا۔ وہ ایک مہنگی کار میں وہیں آ گئی۔ وہ اکیلی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا تو اس نے کار بڑھا دی۔ ہم نہر کنارے چلتے چلے گئے۔ حال احوال کے بعد ہمارے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ کچھ دیر بعد نہر کے ساتھ بائیں جانب ایک بنگلے کے سامنے گاڑی روک کر ہارن دیا۔ لمحوں میں گیٹ کھل گیا۔ ہم گاڑی سمیت اندر چلے گئے۔ دو ملازم ہمارے انتظار میں تھے۔ رہائشی حصے کے ساتھ ایک ایسا حصہ بھی تھا جو بانسوں سے بنایا گیا تھا۔ اس نے

گاڑی پورچ میں رکی اور ہم وہیں جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر میں نے پوچھا۔

"ہاں بولو، کیا بات کرنی ہے مجھ سے؟"

"تم پوچھو گے نہیں میں......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"تم جو کچھ بھی ہو، مجھے اس سے کیا لینا دینا، تمہاری اپنی زندگی ہے۔"

"تم جانتے ہو، یہاں لاہور کی روایات میں طوائف اور پہلوان کی بڑی دوستی رہتی ہے، دونوں کی آخرت بڑی خراب ہوتی ہے۔" اس نے درد بھرے لہجے میں کہا تو میں ہنس دیا۔

"کیا تم مجھے یہی کہنے یہاں لائی ہو؟"

"نہیں، میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"تو کہو نا، میں سن رہا ہوں۔" میں نے اکتاہٹ سے کہا۔

"علی تمہیں یاد ہے، میں نے تمہیں جب بھی کوئی اطلاع دی وہ ہمیشہ درست ہوتی تھی؟" اس نے بڑے محتاط انداز میں کہا۔

"ہاں، اور مجھے ہمیشہ حیرت ہوئی تھی کہ تمہاری اطلاع درست کیسے ہوتی ہے۔" میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"اس میں کوئی حیرت والی بات نہیں ہے، طوائف کے پاس کوئی کچھ نہیں چھپا سکتا، سب ننگے ہوتے ہیں۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"اچھا کہو کیا کہنا ہے؟" میں نے پوچھا تو وہ نرم سے لہجے میں بولی۔

"میں کچھ کہنے سے اس لئے جھجک رہی ہوں کہیں تم مجھے غلط نہ سمجھو اور نہ ہی میں تمہیں الجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ علی مجھے تم سے محبت تھی اور اب بھی ہے، عورت اپنی پہلی محبت نہیں بھول سکتی۔ مجھے اس ملاقات کے بعد تمہیں نہیں ملنا ہے، بس تمہیں ایک اطلاع دینا تھی،

پھر تم جو بہتر سمجھو۔"

"تم نے جو کہنا ہے کہہ دو۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"تم جن لوگوں کے ساتھ آئے تھے، انہیں میں ہی نہیں میری ماں بھی جانتی ہے اور بہت اچھی طرح جانتی ہے۔ اب مجھے حیرت نہیں ہو رہی کہ تم کالج میں کیوں کامیاب رہے ہو، غنڈوں کے گروہوں میں کیسے تن تنہا بچ گئے ہو۔ یہ بھی مجھے اسی دن پتہ چلا، تمہارے پیچھے کون لوگ ہیں۔ علی...... یہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔ یہ مافیا ہیں مافیا......ابھی تمہارا کچھ نہیں گیا۔ ابھی تم ان میں سے نکل سکتے ہو۔ جس دن تمہارے ہاتھوں کوئی قتل ہو گیا، پھر تم کہیں کے نہیں رہو گے۔ پھر جو یہ کہیں گے، وہی کرنا پڑے گا۔" اس نے تیز تیز کہتے ہوئے اپنی بات مکمل کر کے ایک دم سے طویل سانس لیا۔

"میں تمہاری معلومات کو غلط نہیں کہوں گا۔ تم نے جو کہا، وہ بالکل درست ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تم مجھے ان سے بچانا چاہتی ہو۔ لیکن صائمہ، میں نے بچ کر جانا کہاں ہے؟ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے ایک دن مر جانا ہے، وہ تو ویسے بھی مرنا ہے۔ میرا کوئی بھی رونے والا نہیں۔"

"میں نے تمہیں بتانا تھا، بس بتا دیا، اب تم جانو اور تمہارا کام۔" اس نے دکھ سے کہا۔ کیونکہ میں نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ کچھ دیر بعد رہائشی حصے میں ہمارے لئے کھانا لگا دیا گیا۔ ہم نے وہ کھایا، وہاں اپنے بارے میں باتیں کرتے کچھ وقت گزارا اور پھر وہ مجھے وہیں ڈراپ کر کے چلی گئی۔ اس دن مجھے ایک لمحے کے لئے بھی خیال نہیں آیا تھا کہ ایسا اتفاق کیوں ہوا تھا؟ ہاں یہ میں سمجھ رہا تھا کہ صائمہ اگر دوبارہ ملی تھی تو ایسا ہونا ایک اتفاق ہی تھا۔

صائمہ نے جو بھی کہا تھا۔ وہ سچ تھا۔ میں اس کی بات سے متفق تھا یا نہیں، اس کی بات مانی

یا نہیں، لیکن میں اس کے خلوص پر شک نہیں کر سکتا تھا۔ بہ ظاہر اب ہمیں کبھی نہیں ملنا تھا۔ اب اس کی کوئی دلچسپی بھی نہیں رہی تھی میری ذات کے ساتھ۔ لیکن وہ مجھے ایک سوچ دے گئی۔ میں شام تک مختلف حوالوں سے سوچتا رہا۔ میں جب بھی کوئی فیصلہ کرنے لگتا، مجھے میرا اجڑا ہوا گھر یاد آنے لگتا، مجھے اپنی ماں کی بہن کی نعش دکھائی دینے لگتی۔ مجھے اپنے باپ کی وہ دردناک آواز سنائی دیتی، جو اس نے مجھے بچانے کے لئے چیخ چیخ کر کہی تھی۔ مجھے واپس روہی جانا تھا، اور اس قدر طاقت ور ہو کر جانا تھا کہ میں اپنا بدلہ لے سکوں۔ اس رات میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب اگر جینا ہے تو صرف اپنا بدلہ لینے کے لئے۔ اس کے بعد میں مر بھی جاؤں تو کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ صائمہ جسے مافیا کہہ رہی تھی، یہ میرے لئے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ اسی نے مجھے اتنا مضبوط کرنا تھا، ورنہ اب تک میں سمجھ گیا تھا کہ میرے معاشرے کا نظام انتہائی بوسیدہ ہی نہیں، بدبودار بھی ہے اور یہاں وہ گدھ ہیں جو لاشوں کو نوچنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ میں اپنی لاش ان کے حوالے نہیں کرنے والا تھا۔ میں نے جو فیصلہ کیا تو اس رات کے بعد ایک نیا علی زین میرے اندر جاگ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

چاچا عبدالمجید کے گھر رہتے میرا وہی معمول تھا، کھانا، پینا سونا اور ورزش کے لئے جم جانا۔ جب من کرتا، میں لالہ فخر کے ڈیرے پر چلا جاتا۔ وہاں دوستوں کے ساتھ ہوتا۔ ان کے ساتھ گھومتا پھرتا، ہوٹ کا کوئی انگ سیکھتا، اکھاڑے میں اترتا، کوئی نیا اسلحہ آ جاتا تو اسے دیکھتا، سیکھتا اور چلانے کی کوشش کرتا۔ بس ایسے ہی آوارگی میں رہا۔ صائمہ سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ میں نے رابطہ کیا۔ میں اپنے دماغ میں ایک مقصد بنا چکا تھا اور کسی بھی وقت چاچا عبدالمجید سے بات کرنے والا تھا۔ میں نے جب سے صائمہ سے بات ہونے کے بعد

انتقام لینے کا فیصلہ کیا تھا، روہی جانے کے لئے بے تاب ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے طور پر ایک پلان بھی بنا لیا تھا۔

ایک شام میں لالہ فخر کے ڈیرے سے واپس آیا تو چاچا عبدالمجید لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ اس کی شخصیت کافی رعب دار تھی۔ میں جب آیا تو وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ چائے وغیرہ پی کر وہ چلا گیا۔ تبھی چاچا نے پوچھا۔

”کیسی گزر رہی ہے آج کل؟“

”چاچا، میں روہی جانا چاہتا ہوں۔ یہی سوچ رہا ہوں۔“ میں نے ایک دم سے کہہ دیا۔ تو چاچا نے بڑے اطمینان سے میری طرف دیکھا اور ہلکا سا مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کیا کرنے جانا ہے؟“

”مجھے اپنے ان سے انتقام لینا ہے جنہوں نے میرا گھر اجاڑا ہے، مجھے یتیم کر کے دربدر کیا۔“ نجانے میرے لہجے میں کیا تھا کہ مجھے خود سے خوف آنے لگا، میری نفرت ابل پڑی تھی۔ میں خود پر قابو پانے لگا تو چاچا کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔ چند لمحوں بعد انہوں نے پوچھا۔

”کیسے کرو گے؟“

”میں جاؤں گا، اور ان کا جو ملا، اسے مار دوں گا۔“ میں نے اطمینان سے کہہ دیا تو انہوں نے پوچھا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ تم ایسا کر لو گے؟“

”ہاں میں کر لوں گا۔“ میں نے کہہ دیا۔

”دیکھو علی، میں تمہیں روک نہیں سکتا، تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو، لیکن اگر تم ناکام ہو گئے تو؟

انہوں نے تمہیں مار دیا تو؟ تیری لڑائی لڑنے یہاں سے تیرے ساتھ کوئی نہیں جائے گا۔ تمہیں اپنی جنگ اکیلے لڑنی ہے۔ فیصلے جذبات سے نہیں عقل سے کیے جاتے ہیں۔" انہوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"یہی ہوگا نا کہ میں مر جاؤں گا، تو کیا ہوا میں......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے گھمبیر لہجے میں بولے۔

"یہی جذباتی پن ہے۔" وہ چند لمحے میری جانب دیکھ کر رکے اور پھر بولے۔ "شکاری کو اس وقت میدان میں اترنا چاہئے، جب وہ شکار کرنے کے سارے ہنر جانتا ہو، جب اسے پتہ ہو کہ وہ شکار کو گھیر کر اپنی مرضی کر سکتا ہے۔ یہ لڑائی جھگڑے، مار پٹائی، یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔"

"مجھ میں حوصلہ ہے۔" میں نے پہلی بار ان سے اختلاف کیا۔

"میں مانتا ہوں، تم میں بے انتہا حوصلہ ہے، اسی بل بوتے پر تم یہاں تک ہو، ورنہ کب کے خاک ہو چکے ہوتے یا کسی ہوٹل پر برتن مانجھ رہے ہوتے۔ کسی گھر میں ملازم ہوتے یا پھر دھکے کھا رہے ہوتے۔ تیرا دشمن بہت طاقتور ہے، وحشی ہے اور ظالم ہے۔"

"تو پھر اسے ظلم کی سزا ملنی چاہئے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"میں نے کب کہا نہیں ملنی چاہئے۔ ملنی چاہئے اور ضرور ملنی چاہئے لیکن اس وقت جب تم اپنی مرضی سے اسے سزا دے سکو۔" چاچا نے سکون سے کہا۔

"یہ کب ہوگا؟" میں نے حسرت سے پوچھا۔

"یہ میں نہیں جانتا لیکن ایک بات یاد رکھو، جنگل کا بادشاہ بھی اپنے شکار پر اس وقت تک نہیں جھپٹتا، جب تک اسے پورا یقین نہ ہو کہ وہ شکار اس کی دسترس میں آ جائے گا۔ نشانہ اسی وقت لگتا ہے میرے بیٹے...... جب سامنے ہدف پوری طرح واضح ہو۔" انہوں نے شفقت

آمیز لہجے میں کہا۔

"میں خود کو تیار کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں نے کب منع کیا ہے۔ ابھی جو شخص میرے پاس بیٹھا تھا، میں نے اس سے تمہارے بارے میں بات کی ہے۔ بس ایک دو دن ہیں۔ پھر تمہیں ایک ایسے اکھاڑے میں اُتاروں گا جہاں تم کندن بن جاؤ گے۔ بس ایک بات یاد رکھنا، اپنے اندر کی آگ کو بجھنے مت دینا۔ تم نے ایک نہ ایک دن روہی واپس جانا ہے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لینا ہے، جیسے ہی وہ ہدف پر آئے تب۔" چاچا نے کہا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ میرے بارے اتنا سوچ رہے ہیں؟ میں ایک لفظ بھی مزید نہ کہہ سکا اور خاموش ہو گیا۔

دو دن بعد کیا ہوگا، یہی سوچتے ہوئے دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن چاچا عبدالمجید صبح صبح ہی آ گئے۔ مجھے جلدی سے تیار ہونے کو کہا۔ میں تیار ہو کر آیا تو ناشتے کی میز پر وہ صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا اور بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔

"یہ سرفراز صاحب ہیں، تم نے ان کے ساتھ جانا ہے۔ یہ تمہیں بھرتی کروا دیں گے۔ اب یہی تمہارا خیال رکھیں گے۔ جب بھی وقت ملے ملنے کے لئے آ جایا کرنا۔" چاچا عبدالمجید نے اطمینان سے کہا۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے پوچھا تو سرفراز صاحب بولے۔

"اب بیٹا تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، جہاں ہو گے وہی ٹھکانہ ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں مودب لہجے میں کہا تو چاچا نے ناشتہ شروع کر دیا۔

میں دو برس سخت ترین ٹریننگ میں رہا۔ وہ وقت کیسا تھا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ گرمیوں میں تپش سے پسینہ بہتا تھا تو سردیوں میں پہاڑوں کی چوٹی پر پسینہ دلایا جاتا تھا۔ وہ

دو برس میری زندگی کا اصول دور تھا۔ اگلا پورا ایک برس مختلف جنگلوں اور بیابانوں میں گزرا۔ مجھے سمجھ میں آ گیا کہ چاچا عبدالمجید کیوں چاہتا تھا کہ میں یہ ٹریننگ کروں۔ میں بدل کر رہ گیا تھا۔ نہ صرف موت کا خوف میرے اندر سے نکل گیا تھا بلکہ موت سے آنکھیں ملانے کی قوت اپنے اندر پیدا کر چکا تھا۔

ان دنوں ہم شہر میں آ گئے تھے۔ میں چاچا عبدالمجید کے پاس چند دن رہ کر واپس آیا تو مجھے یہ حکم ملا کہ میں ایک فیملی کے ساتھ رہوں۔ وہ فیملی ڈاکٹر کامران ملک اور ڈاکٹر فائزہ ملک کی تھی۔ ان کے دو بچے تھے، ایک بیٹا اور بیٹی، وہ کہیں ددھیال میں رہتے تھے، وہیں انہوں نے پرورش پائی۔ ہم ان کے پاس چھ لوگ تھے۔ مختلف اوقات میں ان کی سیکورٹی کے لئے موجود ہوتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں وہ دونوں میاں بیوی درویش قسم کے لوگ تھے۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھتے تھے۔ کھانے پینے سے لے کر پڑھنے لکھنے تک۔ وہاں رہ کر میں نے دنیا اور دنیا داری کے بارے میں پڑھا۔ زندگی ایک نئے ڈیجیٹل دور میں داخل ہونے لگی تھی۔ وہاں ہمیں اس دنیا سے بھی متعارف کروایا گیا۔ جب بھی فائزہ ملک میرے ساتھ ایک ماں جیسا سلوک کرتی تو مجھے میری ماں یاد آ جاتی، جب کامران ملک میرے ساتھ شفقت کرتے تو مجھے اپنے باپ کی آخری آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ میں وہاں ان کے پاس تقریباً چھ برس رہا۔ سو ہر آنے والا دن مجھے روہی کی یاد دلاتا۔ مجھے اپنی تربیت پر ناز ہونے لگا تھا۔ پھر ایک دن دونوں میاں بیوی کی نوکری ختم ہو گئی۔ اس لئے ہمیں بھی وہاں سے جانا پڑا۔ جس دن ہم ان سے الگ ہو رہے تھے، ہم سب یوں رو رہے تھے جیسے ہمارا اپنا کوئی بچھڑ رہا ہوں۔ ایک ایسی محبت تھی، جس کی ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ لیکن جدا ہوتے ہوئے دکھ ہو رہا تھا۔

میں واپس لاہور آ گیا۔ میرے لئے یہاں بہت کچھ تھا۔ یہاں رہ کر میں نے بہت کام

کیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ لالہ فخر کا ڈیرہ وہاں پر کیوں ہے؟ چاچا عبدالمجید آخر کون ہے؟ شہر میں اور بہت کچھ میرا منتظر تھا۔ یہاں رہتے ہوئے میں نے روہی کے بارے میں معلومات لینا شروع کر دیں۔ وہاں کون کیا کر رہا ہے؟ سرحد پار سے کیسے اور کیوں دراندازی ہو رہی ہے؟ دھیرے دھیرے مجھ پر سب کھلتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک دن مجھے پتہ چلا کہ ڈاکٹر کامران ملک اور ڈاکٹر فائزہ ملک کو بچایا سے اغوا کر لیا گیا ہے۔ زیر زمین دنیا میں یہ ایک بڑے دھماکے سے کم نہیں تھا۔ اڑتی ہوئی خبر سنائی دی کہ وہ دونوں راجستھان میں ہو سکتے ہیں؟ وہاں کیوں ہیں، اس کے پیچھے ایک طویل داستان ہے۔ خفیہ ایجنسیاں دکھاتی کچھ ہیں اور کرتی کچھ ہیں۔ بچایا سے راجستھان کا سفر کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے بہت بڑے نیٹ ورک کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن ان دونوں کی شخصیت بھی تو معمولی نہیں تھی، دوسرا یہ باور کراتا تھا کہ ہم یہ کر سکتے ہیں۔ جہاں اور بہت سارے لوگ اس کام پر لگ گئے، وہاں یہ خبر سنتے ہی میں نے اپنا پلان پیش کر دیا۔ میرے پلان کو زیادہ محفوظ بنایا گیا۔ راجستھان میں میرا داخلہ ایک مجرم کی حیثیت سے چاہئے تھا۔ اس کی بڑی وجہ مجرموں سے میل جول رکھنا تھا، انہی سے راستے ملنے کی امید تھی اور مجھے بھی یہ ہدف دے دیا گیا۔ میں اس ہدف تک پہنچ کر کامیاب لوٹا ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنے دشمن بھول جاتا۔ میں نے یہاں پر موجود اپنے ہر دشمن کو ختم کر دیا ہے۔

☆......☆......☆

مجھے اور ساودری کو صحن میں بیٹھے صبح ہو گئی تھی۔ یہ صبح کاذب تھی۔ ساودری نے آسمان پر تاروں کو دیکھا اور پھر میری جانب دیکھ کر پوچھا۔

''اب تیرا کیا ارادہ ہے؟''

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں یہاں رہتا ہوں یا چلا جاتا ہوں۔" میں نے گول مول بات کی۔ حقیقت میں مجھے بھی علم نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں میرے لئے کیا حکم پوشیدہ تھا۔ کہنے کو تو میں کہہ گیا تھا لیکن اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے اس جواب سے ساوری کو تشفی نہیں ہوئی۔ جس مقصد کے لئے اس نے سوال کیا تھا، مجھے اس کا جواب دینا تھا۔ تبھی میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔"لیکن اب جہاں میں ہوں گا، تم بھی تو وہیں ہوگی۔"

میرے یوں کہنے پر وہ بجائے خوش ہونے کے سنجیدہ ہی رہی۔ مجھے اس کی سنجیدگی سمجھ میں نہیں آئی۔

"اچھا خیر، صبح ہونے والی ہے، میں کچھ......" وہ کہتے ہوئے اٹھنے لگی تو میں نے اس کا بازو پکڑ کر بٹھا لیا، پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"بات کیا ہے ساوری؟"

"یہ جو تم نے آخری بات کی ہے نا، یہ جھوٹ ہے۔ میں جھوٹی باتوں پر کوئی امید نہیں باندھ سکتی۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔ ایک طرح سے اس کی بات بالکل درست تھی۔ میں اگر اسے اپنے ساتھ لاہور بھی لے جاتا تو مجھے کون سا اس کے ساتھ رہنا تھا۔ میں کہیں بھی جا سکتا تھا۔ یہاں بھی اپنی مرضی سے نہیں رہ سکتا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے پیار سے بولا۔

"ہونا وہی ہے جو رب کو منظور ہے، دل چھوٹا نہ کر، بس ہنستی مسکراتی رہا کر۔"

"ہونہہ، ہنستی مسکراتی۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھ گئی۔ اسے صحن میں پھرتا دیکھ کر رجاں مائی اٹھ کر صحن میں آ گئی۔ دونوں اپنے کام کاج میں لگ گئیں اور میں اٹھ کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ جہاں کبھی میرن شاہ رہا کرتا تھا۔

اس شام میں ڈیرے پر بیٹھا ہوا تھا۔ بختاور میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سنا کیا خبریں ہیں اردگرد کی؟''

''بالکل خاموشی ہے۔ نور حیات تو شہر میں ہے۔ اس کے بندوں کو بھی سانپ سونگھ گیا ہے۔ کسی نے بات تک نہیں کی۔ کوئی بندہ نہیں آیا فیروز اس کے جنازے پر۔'' اس نے اطمینان سے بتایا۔

''تم گئے تھے جنازے پر؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں گیا تھا۔ دشمن کا جنازہ پڑھنا بھی عجیب سرور دیتا ہے۔'' اس کے لہجے میں اب بھی نفرت چھلک رہی تھی، وہ لمحہ بھر خاموش رہا پھر بولا، ''میں دیکھنا چاہتا تھا جی، کون کون آتا ہے اس کے جنازے پر۔ خیر، وہ گیا اگلے جہان، اب اس کا ذکر ہی کیا کرنا۔''

''اب ایک کام کرنا ہے بختاور۔'' میں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''کیسا کام؟'' اس نے پوچھا۔

''یہاں سرحد پار سے آئے جتنے بھی راجستھانی ہیں، پتہ کرنا ہے کون، کہاں پر، کیا کر رہا ہے۔ ان سب کو نگاہ میں رکھنا ہے۔'' میں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کیوں، ایسا کیا کرنا ہے ان کا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''دیکھو، جو عام راجستھانی ہیں، بے ضرر سے کاروباری، انہیں تو کچھ نہیں کہنا۔ لیکن جو کریمنل ہیں، کسی بھی حوالے سے غیر ملکی ایجنٹ ہیں، انہیں پکڑنا ہے، ان سے کام لے سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں تیری بات تو ٹھیک ہے، آگے ہم نے کام دھندہ بھی تو چلانا ہے۔'' اس نے سر

ہلاتے ہوئے یوں کہا جیسے میری بات سمجھ رہا ہو۔ میرے اور بختاور میں یہی فرق تھا۔ وہ تربیت یافتہ نہیں تھا۔ جس میں جسمانی مضبوطی کے علاوہ ذہنی بالیدگی کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ وقت اور حالات نے اسے اس نہج پر ڈال دیا اور وہ اس روش پر چل نکلا۔ وہ میری بات کو کسی اور ہی رنگ میں سمجھ رہا تھا۔ جبکہ میں جانتا تھا کہ خطرہ کہاں سے ہو سکتا ہے۔ جس طرح مار خور کی چھٹی حس اسے بتاتی ہے کہ سانپ کہاں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح میں بھی یہ محسوس کر سکتا تھا کہ دشمن کس طرف سے وار کر سکتا ہے۔ وہ مجھے اپنی معلومات کی حد تک علاقے کے بارے میں بتانے لگا۔ اس دوران شعیب، آفتاب، جہانگیر اور مدثر بھی وہیں آ گئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ باتوں میں شامل ہو گئے۔ اچانک مجھے یاد آیا تو میں نے پوچھا۔

"اوئے بختاور، یہ سانول کدھر ہے؟"

"یہیں کہیں ہوگا، کیوں خیریت ہے؟" اس نے تشویش سے پوچھا۔

"اس سے بات کرنی ہے یار، فون کرو اسے۔" میں نے کہا تو بختاور نے فون نکال کر اس کے نمبر پش کیے۔ لمحوں میں رابطہ ہو گیا۔ وہ ڈیرے کے پار باڑے میں تھا۔ مویشی واپس آ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی وہ ہمارے پاس آ گیا ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔

"یار اگر تیری شادی کر دی جائے تو کیسا ہے؟"

میری بات سن کر پہلے تو اس کے چہرے پر دکھ پھیل گیا۔ وہ کتنے ہی لمحے اسی کیفیت میں رہا پھر شکست سے لہجے میں بولا۔

"میں تم سے بحث نہیں کر سکتا تم جو چاہو کرو۔"

"سانول، وہ کہتے ہیں نا، بندہ ہی بندے کا دارو ہوتا ہے، ریحاں مائی اس دنیا میں اکیلی ہے، تم اس کے سہارا بن جاؤ، وہ تیرا سہارا بن جائے گی۔ میں اس لئے کہہ رہا ہوں۔" میں

نے صاف بات بتادی تو بختاور نے کہا۔

''بات تو علی ٹھیک ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کا آسرا بن جائیں گے۔''

''میں نے پہلے ہی کہہ دیا جیسے تم لوگوں کی مرضی۔'' سانول نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''دیکھ سانول، میں نے پتہ نہیں یہاں رہنا ہے یا نہیں رہنا، اس سارے مال ڈنگر کا یہاں کی سب زمین جائیداد کے مالک تم ہو۔ بس لوگوں پر رحم کرنا، وہ نیلی چھت والا تم پر رحم کرے گا۔'' میں نے کافی حد تک جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

''یار خوشی کا موقعہ ہے اور تم اسے سوگ بنا رہے ہو؟'' جہانگیر نے اونچی آواز میں کہا تو سبھی ہنس دیئے تو میں بولا۔

''میں چاہتا ہوں، آج ہی ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے۔''

''اوئے کیوں یار، سانول کی شادی دھوم دھام سے کریں گے۔ پورے علاقے میں پتہ چلے کہ سانول کی شادی ہوئی ہے۔ انہیں یہ بھی پتہ چلنا چاہیے کہ اب سانول اس علاقے کا سردار ہے۔'' بختاور نے خوشدلی سے کہا۔

''چل جو کرنا ہے کر، بارات تیرے گھر سے آئے گی تو لڑکے والا بن جا، میں لڑکی والا بن جاتا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو سانول اٹھتے ہوئے بولا۔

''تم کرو صلاح مشورہ، میں ذرا مویشی دیکھ لوں۔''

اس کی بات پر سبھی ہنس دیئے۔ پھر شادی کا پروگرام طے کرنے لگے۔

اس رات جب میں پلٹ کر رہائشی حصے میں گیا تو ساوری میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ میں پلنگ پر جا کر لیٹا تو میرے پاس آگئی۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہیں سے اس نے پوچھا۔

"کھانا نہیں کھانا تھا، اتنی دیر کردی ڈیرے پر؟"

"تم نے کہا تھا سانول سے پوچھوں۔ اسے بلایا تھا میں۔" میں نے کہا تو وہ میرے پاس پلنگ پر بیٹھتے ہوئے تجسس سے بولی۔

"تو پھر کیا ہوا؟"

تب میں نے وہاں ہونے والی ساری باتیں بتا کر کہا۔

"میرے خیال میں تم رجاں مائی سے دوبارہ پوچھ لو، کہیں سانول کے ساتھ اس کی شادی کر کے ہم کوئی غلطی نہ کر رہے ہو۔"

"نہیں میں نے اس سے بات کر لی تھی۔ وہ راضی ہے۔ تم چاہو تو خود بھی پوچھ سکتے ہو۔" اس نے کہا۔

"اسے بلاؤ، میرا خیال ہے اس سے حتمی طور پر پوچھ لیں، کل کوئی......" میں نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"میں بھیجتی ہوں اسے۔ کھانا لاؤں؟"

"ہاں لے آؤ۔" میں نے کہا تو وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

کچھ دیر بعد دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی اور پھر رجاں مائی اندر آگئی۔ وہ میرے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ خاموش تھی۔ تبھی میں نے اس سے پوچھا۔

"رجاں، تیری شادی اگر سانول سے کر دیں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے ہولے سے جواب دیا۔

"کوئی شرط، کوئی خواہش کوئی تمنا ہو تو مجھے ضرور بتاؤ؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بس مجھے عزت کی روٹی ملتی رہے، میں اسی میں خوش ہوں۔" اس نے دھیمے سے

لہجے میں کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھی رہی اور پھر اٹھ کر باہر چلی گئی۔ ساوری کھانا لے کر آئی، تو ہم مل کر کھانے لگے۔ درمیان میں اس نے مجھ سے ڈیرے پر ہونے والی باتیں کرید کرید کر پوچھیں۔ جب کھانا کھا چکے تو اس نے برتن ایک طرف رکھ کر پوچھا۔

"اچھا تم بولو، تیرا اب کیا پروگرام ہے؟" اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"چھوڑ اس قصے کو۔" میں نے لاپرواہی سے کہا، ایسے میں رحماں مائی چائے لے کر آ گئی۔ ہم چائے پیتے رہے اور شادی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ رحماں اٹھ کر گئی سارے برتن وغیرہ بھی لے گئی۔ ساوری میرے پاس پلنگ پر پھیل کر بیٹھ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب اس کی ساری باتیں اس شادی کے گرد گھومتی رہیں گی۔ وہی ہوا، کچھ دیر بعد بولی۔

"علی، تم مجھ سے شادی کرو گے نا؟"

"ظاہری بات ہے ہماری شادی ہو گی۔" میں نے اس کی بونگیوں کا لطف لیتے ہوئے کہا۔

"کیسے ہو گی ہماری شادی؟" اس نے پوچھا۔

"اچھا تم میرے لئے دودھ لاؤ، پھر بتاتا ہے۔" میں نے کہا تو وہ چونک کر بولی۔

"کوئی عقل ہے تمہیں، ابھی تو چائے پی ہے، کچھ دیر ٹھہر جاؤ، پھر پی لینا۔"

"میں نے سوچا جس طرح تم عقل کی باتیں کر رہی ہو، میں بھی ویسی ہی کر لوں۔" میں یہ کہتے ہوئے مسکرا دیا تو ایک دم سے قہقہہ لگا کر بولی۔

"سیدھے کہو میں اب چلی جاؤں۔"

"ہاں تو جاؤ نا مجھے سونے دو۔" میں نے کہا تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں سوچنے لگا، ہر عورت کو اپنا گھر بنانے کی کتنی فکر ہوتی ہے، شاید یہ اس کی فطرت میں ہے۔

☆......☆......☆

اس شام ڈیرے کے علاوہ گھر میں بھی "جاگے" کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ روہی میں 'جاگا' شادی بیاہ میں ایک روایتی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں شادی بیاہ والے گھر شادی کے گیت گائے جاتے ہیں، لڈی رقص یا جو بھی خوشی حاصل کرنے کے کھیل ہو۔ یہ ساری رات چلتا ہے۔ اس رات دولہا اکیلا ہی دلہن کے گھر آجاتا ہے۔ یہ رسم بھی بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ دولہا جب اونٹ پر سوار ہو کر دلہن کے گھر کے پاس آجاتا ہے تو دلہن کی سہیلیاں یا کزنز اسے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتی۔ دولہا اپنی طاقت، مہارت اور ذہنی صلاحیت کے باعث گھر میں داخل ہوتا ہے۔ وہیں رات رہتا ہے۔ اس کی خوب خدمت کی جاتی ہے، صبح اسے تیار کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بارات پہنچ جاتی ہے۔ اس دوران دولہا اپنی دلہن کا چہرہ سہاگ رات ہی کو دیکھ سکتا ہے۔ اس وقت ساتولی کا انتظار ہو رہا تھا۔ دوسری جانب سادری کئی ساری لڑکیوں کے ساتھ تیار کھڑی تھی۔ وہاں پر موجود ہر مرد و عورت متجسس تھی کہ کیا ہوگا؟ میں نے چونکہ بہت بچپن میں ایسی شادیاں دیکھی تھیں، اس لئے بھول گیا تھا۔ اس وقت مجھے بھی اتنا ہی تجسس تھا۔ جس طرح وقت گزرتا جا رہا تھا، نجانے کیوں میرے اندر ایک بے چینی پھیلتی جا رہی تھی۔ یہ سب اتنا پرسکون کیوں ہو رہا ہے؟ دو دن پہلے پیروزاں کو مارا تھا، کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس کا انتقام لینے کے لئے آتا؟

اتنی سمجھ تو مجھے بھی تھی کہ یہ دنیاداری ہے، جب تک مفاد وابستہ ہے، تب تک ساتھ دیا جاتا ہے، جب فائدہ دکھائی نہیں دیتا، تب اجنبی بن جاتے ہیں اور جہاں نقصان کا اندیشہ ہو، وہاں دشمنی شروع ہو جاتی ہے۔ اس روہی میں کوئی ایسا نہیں تھا جو پیروزاں اور میرن شاہ کا انتقام لینے آجاتا۔

شام ڈھل چکی تھی اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ روشنی کا انتظام کیا ہوا تھا۔ میں یونہی چلتا ہوا ڈیرے کے پھاٹک تک چلا گیا۔ بستی کی طرف سے عورتیں اور بچے آرہے تھے۔ میرے پاس

آ کر بختاور کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس وقت پتہ چلا، جب اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے علی، بڑے پریشان لگ رہے ہو؟"

"بختاور...... سب ٹھیک ہو رہا ہے، کوئی لڑائی نہیں، کسی نے ڈسٹرب نہیں کیا، بس اسی وجہ سے۔" میں نے صاف لفظوں میں کہا تو بختاور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ میں نے پہلی بار اسے قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"ہماری بھی کیا زندگی ہے یار، کچھ گڑ بڑ نہ ہو تو ہمیں چین نہیں آتا۔ فکر نہ کرو، جب تمہاری اور ساوری کی شادی ہوگی تو بڑے ہنگامے ہوں گے۔ یہ تو بے چارے ساتول کی شادی ہے۔"

"تمہیں کیا پتہ، میری شادی ساوری ہی سے ہوگی؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔ پھر دھیمے سے لہجے میں بولا۔

"اگر ہو گئی تو...... پتہ نہیں یار زندگی ہے بھی یا نہیں۔"

"آج تو ہے نا ہمارے پاس۔" میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں آج ہے، لیکن تم اسے بھی بد مزہ کر رہے ہو۔ آؤ، چا کا دیکھتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ایک راجستانی لڑکی بھی آ جائے گی، سچ میں بجلی ہے، محفل کو تڑپا کر رکھ دے گی۔" اس نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"کون ہے، تم جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہیں کی ہے، اس کے ماں باپ بھی بھاگ کر یہاں آئے تھے، تب سے وہ یہیں ہیں۔ شادی بیاہ پر ناچتی ہے، رنگ باندھ دیتی ہے۔ ادھر ڈیرے پر ہی ہماری محفل سجے گی، اُدھر عورتوں میں نہیں۔" بختاور نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو میں سر ہلا کر رہ گیا۔

ڈیرے پر بھی کوئی بیس پچیس مرد ہوں گے۔ ان سب نے کھانا کھا لیا تھا۔ چاچا سائیں نے خود خشک گوشت بنوایا تھا۔ جو بہت ہی لذیذ بنا تھا۔ رہائشی حصے سے شور و غل کی آوازیں آ رہی تھیں، سب خوش تھے۔ ہم وہیں ڈیرے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک اونٹ ریڑھا ڈیرے کے گیٹ پر رکا۔ اس میں سے سازندے اترے، پھر ایک کومل سی لڑکی کو اتارا گیا۔ اس نے سیاہ رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس پر سفید اور سنہری ستارے ٹکے ہوئے تھے۔ اس نے کاندھوں پر ایک سیاہ چادر لی ہوئی تھی۔ سر پر آنچل تھا۔ پاؤں میں نازک کھسہ تھا۔ وہ سازندوں کے ساتھ وہیں آ گئی۔ ان کے لئے چادریں بچھائی ہوئی تھیں، وہ سب بیٹھ گئے تو لڑکی پاؤں میں گھنگرو باندھنے لگی۔ میں نے وہاں موجود سب لوگوں پر سرسری سی نگاہ ڈالی تو مجھے زمان مونگل بڑا بے چین دکھائی دیا۔ ساز بجنے لگا تھا اور لڑکی تھرکنے لگی تھی۔ اس نے پہلا گیت ہی راجستانی چھیڑا تھا۔

''موہے من کے تار ہلاوے رے......''

وہ تھرکتی رہی، دوسرا گیت چھیڑ لیا گیا۔ میں نے زمان مونگل کو دیکھا، وہ اسی طرح بے چین تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟ ڈیرے پر کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو شراب کے نشے میں دھت ہو رہے تھے۔ بختاور بھی کئی پیگ چڑھا چکا تھا۔ شعیب، آفتاب، مدثر اور جہانگیر الگ الگ جگہ پر بیٹھے ہوئے ہوش و حواس میں تھے۔ میں نے ایسے میں دیکھا، زمان مونگل وہاں نہیں تھا۔ نجانے وہ کدھر چلا گیا تھا۔ میں ابھی اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر زمان مونگل کا نام تھا۔ میں نے اس کال سنی۔

''علی مجھے یہ ناچنے والی لڑکی گڑبڑ لگ رہی ہے۔''

''ایسا کیوں لگا تمہیں؟'' میں نے پوچھا۔

"اس کا تعلق اس بندے سے ہے، جو ہمیشہ بختاور کے خلاف رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ پروزاں کا ساتھ دیا ہے۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"تعلق کیسا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو صاحباں کا مرزے سے تھا۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں نہیں پوچھتا، تمہیں کیسے پتہ ہے، تم ادھر آ کر بیٹھو، دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا اور فون کا میسج بکس کھولا اور جہانگیر کو میسج کر دیا کہ "یہ ناچنے والی اور سازندے خطرہ ہو سکتے ہیں۔" پھر فون جیب میں رکھ کر غیر محسوس انداز میں اپنا پسٹل نکالا اور چادر کے نیچے کر لیا۔ میں نے اپنا اور بختاور کا فاصلہ دیکھا، لمحوں میں سوچ لیا کہ کیا کیا ہو سکتا ہے۔ تقریباً دو گھنٹے تک یہ ناچ گانا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت اچھا ناچی تھی اور گایا بھی خوب تھا۔ وہ لڑکی تھک کر سازندوں کے پاس جا بیٹھی تھی۔ میں نے اسے نگاہوں میں رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے ساز وغیرہ سمیٹے تو لڑکی نے بھی اپنے گھنگھرو اتار دیئے۔ کچھ دیر بعد وہ بڑے اطمینان سے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے زمان سوہل کی طرف دیکھا، وہ ہنوز پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا جواب دے۔ بختاور نے اسے جو روپے دینا تھا، وہ دیئے تو وہ سلام کرتے ہوئے چلے گئے۔ کچھ لوگ سو گئے تھے۔ ہم چند لوگ جاگ رہے تھے۔ جہانگیر اور دو ان کے پیچھے ہی باہر نکل گئے تھے۔ وہ بھی واپس آ گئے تھے۔ ہم سب کمرے سے تھے۔ بختاور کو بھی پتہ چل گیا تھا۔ ان سب کے سامنے میں نے زمان سوہل سے پوچھا۔

"زمان، تجھے ایسا کیوں محسوس ہوا تھا؟"

"یار میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا نام پتہ نہیں کیا ہے مگر اسے سب ردمی کہتے ہیں۔ جس سے اس کی یاری ہے، اس کا نام چھوٹو رام ہے۔ بختاور جانتا ہے۔" زمان نے کہا تو

بختاور نے چونکتے ہوئے کہا۔

"یہ تھی ردمی؟"

"تو اور کیا؟" اس نے تیزی سے جواب دیا۔

"تم جانتے ہو اسے؟" میں نے پوچھا تو بختاور نے تیزی سے کہا۔

"اس کا نام ہی سنا ہوا تھا، لیکن چھوٹو رام تو میرے دشمنوں میں سے ایک ہے۔ یہی تو چوہدری ۔۔۔۔ روزاں اور راجستھانیوں کے درمیان رابطہ کراتا ہے۔"

"تو پھر ایک بات یاد رکھو سوہنیو! آج رات پھر محتاط ہو جاؤ۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے، یاد رکھنا۔"

آفتاب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"ویسے بھی جاگنا ہے۔ ہاں محتاط ہیں ہم۔" بختاور نے کہا تو جو جاگ رہے تھے انہیں ادھر ادھر کام پر لگا دیا۔ جو سو رہے تھے انہیں اٹھا کر گھر بھیج دیا۔ ہم پوری طرح تیار ہو گئے تھے۔ لیکن...... صبح ہو گئی، کچھ بھی نہیں ہوا۔

اگلے دن سانول کی بارات تھی۔ قریب قریب بستیوں کے لوگوں کو بلایا گیا تھا۔ جہانگیر نے بڑے پیمانے پر سیکورٹی کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ وہ دن بہت سکون سے گزر گیا۔ سانول کی رحماں سے شادی ہو گئی۔ اسے رہائشی حصے میں ہی ایک کمرہ دے دیا گیا۔ لوگ تھک ہار کر اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔

وہ رات خطرناک تھی۔ لیکن جہانگیر مجھ سے بھی زیادہ تیز نکلا۔ اس نے چاچا سائیں کی بستی سے بندے منگوا کر سیکورٹی بنائی، پھر خود سو گیا۔ مجھے بالکل بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ رہائشی حصے میں ابھی بھی عورتیں موجود تھیں۔ میں ڈیرے پر آ گیا۔ مجھے اس وقت وہاں آئے کوئی دس منٹ ہوئے ہوں گے۔ گیٹ کے باہر ایک ہیوی موٹر سائیکل آ کر رکا۔ اسے ایک مرد چلا رہا تھا

اس کے پیچھے ایک پتلی سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے پسٹل کو ہاتھ ڈال لیا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے سیفٹی کیچ بھی ہٹا لیا۔ انہوں نے موٹر سائیکل دور ہی روک لیا، پھر پیدل چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ سیکورٹی والے لڑکے ایک دم سے بڑھ کر ان کے سامنے آ گئے۔ چند لمحوں بعد ایک لڑکے نے کہا۔

"علی بھائی، یہ تو رات والی راجستھانی لڑکی ہے۔" اس نے کہا تو میں چونک گیا۔ پہلا سوال ہی دماغ میں یہی آیا کہ یہ کیوں آئے ہیں؟

"آنے دو۔" میں نے اونچی آواز میں کہا تو وہ دونوں چلتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔ میں نے انہیں چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا، "خیر تو ہے نا رو مگی؟"

"خیر ہی ہے۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنے آئی ہوں۔"

"کرو، شوق سے کرو۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا لیکن میرا ہاتھ پسٹل پر اور ان کے ایک ایک حرکت پر تھا۔

"رات میں جب یہاں گئی ہوں تو مجھے احساس ہوا کہ تم لوگوں نے مجھ پر کوئی شک کیا ہے، کیا یہ ٹھیک بات ہے؟" اس نے جذباتی سے لہجے میں کہا، مجھے فوری سمجھ میں نہیں آیا کہ دراصل وہ پوچھنا کیا چاہتی ہے۔ لیکن پھر میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں کیسے شک ہوا؟"

"وہ بندے جو رات ہمارا پیچھا کرتے ہوئے گئے تھے۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی پھر بولی، "اگر تم لوگوں کو مجھ پر شک ہوا ہے تو ٹھیک ہوا۔ کم از کم بجاز رو کو تو چاہیے تھا کہ وہ مجھے پہچان لیتا۔ مجھے یہاں روکنے کی کوشش کرتا۔"

"سیدھی بات کرو ردمی۔ کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"یہی کہ شک بھی ہوا تو کیوں ہوا، اگر ہو گیا تھا شک تو پھر مجھ سے پوچھا نہیں۔ یہی بات مجھے آج یہاں لے آئی ہے۔" اس نے اعتماد سے کہا تو میں اس کی طرف دیکھنے لگا، چند لمحوں بعد میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"تمہیں یہاں پہچان لیا گیا تھا۔ جو تمہارا حوالہ ہے چھوٹو رام کا، تم اس کی محبوبہ ہو تو شک لازمی ہونا تھا۔"

"مجھے تو سب پہچانتے ہیں اور میں جان بوجھ کر یہاں آئی تھی کیونکہ چھوٹو رام میرا محبوب تھا، اب نہیں ہے۔" اس نے تیزی سے بتایا۔

"تھا، مطلب وہ......" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا تو وہ بولی۔

"زندہ ہے، لیکن اب وہ میرا محبوب نہیں رہا، اس نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ میں اسے اب زندہ نہیں دیکھنا چاہتی۔" اس نے انتہائی نفرت سے کہا۔

"اور تم چاہتی ہو کہ ہم اسے قتل کر دیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں، وہ خود ہی ہو جائے گا، جیسا وہ کر رہا ہے۔ میں تو اپنے بارے میں بتانے آئی تھی۔ اب مجھ پر شک نہ کریں، اگر کوئی شک ہے تو اسے جیسے چاہیں دور کر لیں۔" اس نے پھر سے جذباتی لہجے میں کہا تو مجھے لگا وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں پا رہی۔ ورنہ رات جب وہ چلی گئی تھی تو بات ختم ہو گئی تھی۔ پھر کون سا اسے ہم نے دوبارہ بلوانا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ردمی، وہ بات کہہ دے، جو تم کہنے آئی ہو۔"

"سن لو گے نا۔" اس نے بے یقینی کے سے انداز میں کہا تو میں ہنس دیا، پھر بڑے

اطمینان سے کہا۔ "ہاں سن رہا ہوں نا۔"

"ہمارے قبیلے کے کوئی پچیس تیس گھر یہاں رہتے ہیں۔ ان میں ہم چار لڑکیاں ایسی ہیں جو ناچ گا کر کماتی ہیں۔ یہاں اتنا پیسہ نہیں ہے۔ پوری روہی میں چند گھر ہیں جو اپنی خوشی پر بلاتے ہیں۔ لیکن ہم خوش ہیں، اپنا گزارہ ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایک غلطی کی ہے، چھوٹو رام سے دل لگا کے۔ میں سمجھتی تھی وہ مجھے بہت چاہتا ہے، لیکن نہیں، وہ مجھے کیا خود کو بھی نہیں چاہتا، میں نے اسے بہت روکا تم غلط دھندے میں مت پڑو، مگر وہ نہیں رکا اور......"

"کیا دھندہ کرتا ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"ہر وہ کام جس سے پیسہ ملے، جس سے اس کا فائدہ ہو، چاہے اسے کسی کو قتل نہ کرنا پڑے، پار جاتا ہے، نجانے کیا کیا کرتا ہے۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟"

"دو ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں، وہ مجھے میرے باپ سے خریدنا چاہتا ہے۔ بات بھی ہو گئی ہے۔ وہ مجھ سے شادی کر کے مجھے یہاں رکھتا تو بات الگ تھی لیکن وہ مجھے پار لے جانا چاہتا ہے۔" اس کے لہجے میں درد بڑھ گیا تھا۔

"جہاں شوہر، وہاں بیوی، اس میں کوئی حیرت والی بات تو نہیں ہے روہی، وہ تجھے پار لے کر جائے گا، وہاں......" میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہی تو میں نہیں چاہتی، وہ مجھے وہاں پر لے جا کر مجھے بیوی بنا کر نہیں رکھنا چاہتا، وہ میرے شو کروائے گا، مجھے جگہ جگہ نچوا کر میرے پیسے وصول کرے گا، جس کا مرجائے اس کے ہاں بین کروائے گا۔"

تھر کے علاقے میں بہت کم اور راجستھان میں یہ بھی ایک روایت پائی جاتی ہے کہ جن کا

کوئی مر جائے، وہاں پر رونے دھونے اور بین ڈالنے والی مخصوص عورتیں آتی ہیں۔ جنہیں رودھالی کہا جاتا ہے۔ یہ ایسے ہی سمجھا جاتا ہے جیسے شادی بیاہ پر کسی کو ناچنے کے لئے بلانا۔ اس سے پتہ چلا تھا کہ وہ علاقے کے بڑوں میں شمار ہوتے ہیں۔ تبھی میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"تم کر لیتی ہو بین؟"

"ہاں نا تھوڑا بہت، نہیں آتا ہو گا تو سکھا دے گا۔" اس نے تلخی سے کہا پھر لمحہ بھر رک کر بولی، اگر یہ پیشہ کرواتا ہو تو پھر بھی ٹھیک ہے لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں وہ مجھے کب اور کہاں مار دے، بیوی تو نہیں چاہیے نا اسے۔"

"تمہارا خیال ہے میں اسے روکوں، تمہیں اپنے ہاں پناہ دوں؟" میں نے بہت کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تو اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں، بس وہ میرا خیال چھوڑ دے۔ لیکن اس کے عوض میں تمہیں دولت تو نہیں دے پاؤں گی، ہاں اور بہت کچھ ہے، جو میں تجھے بتا سکتی ہوں۔"

"مثلاً کیا بتا سکتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تو اتنا بتا سکتی ہوں کہ میرا سارے کا سارا قبیلہ چوڑاں کے ساتھ تھا، اسی کے گن گاتا ہے۔ اس کے بڑے کام بھی آتا رہا ہے۔ کیونکہ وہ ان سے کام لے کر انہیں پیسہ بھی دیتی تھی۔ جب آپ اسے روکو گے نا، تو بہت کچھ سامنے آجائے گا، یہ مجھ پر یقین رکھیں۔" اس نے انتہائی محتاط انداز میں بتایا تو میں سمجھ گیا، وہ بھی خوف زدہ تھی، میں نے کون سا اسے یقین دلا دیا تھا۔ تبھی میں نے پوچھا۔

"چھوٹو رام یہیں ہے؟"

"ہاں، آج کل تو یہیں ہے۔" اس نے بتایا۔

"چل ٹھیک ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ تو روٹی پانی کھا، اور......" میں نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں اب میں چلتی ہوں۔ ملتے ہیں پھر۔" اس نے کہا اور اٹھ گئی۔ اس کا ساتھی بھی جلدی سے اٹھا اور دونوں بائیک کے پاس جا پہنچے، پھر گیٹ سے نکلتے چلے گئے۔ میں نے پسٹل کا سیفٹی کیچ لگایا اور جیب میں رکھ لیا۔ وہ دونوں میرے لئے ایک نئی سوچ چھوڑ گئے تھے۔ میں تھوڑی دیر بیٹھا سوچتا رہا، پھر اٹھ کر زمان سوہل کی طرف چل دیا۔

میں اپنی جیپ اس کے کوپے کے باہر روکی تو وہ جلدی سے باہر آ گیا۔ مجھے یوں دیکھ کر حیرت سے بولا۔

"خیر تو ہے نا یوں اچانک......؟"

"بس یار، بہت دن ہوئے تم سے گپ شپ نہیں کی، میں نے سوچا تھوڑا وقت تیرے ساتھ بھی گزار لوں۔" میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ تو جب آؤ، تیری مرضی، لیکن میں ابھی تیری طرف آنے والا تھا۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"خیر تو ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جو رات لڑکی ناچنے آئی تھی نا، روحی، آج میں نے سارا دن اسی پر لگایا ہے، اس کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتا رہا۔ میں حیران ہوں کہ رات اس نے کچھ کیا نہیں، وہ تو اس قبیلے سے تعلق رکھتی ہے، جو ہمارے سخت خلاف ہے۔" اس نے مجھے معلومات دیتے ہوئے کہا۔

"اسے لایا کون تھا؟" میں سکون سے پوچھا۔

"ہاں یار، یہ پتہ کرنے والی بات ہے۔ ظاہر ہے وہ کوئی ہم میں سے ہی ہو گا نا۔" اس نے

سوچتے ہوئے کہا تو میں بولا۔

”یہ تو پتہ کر لیتا ہوں۔تم سے ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔“

”پوچھو۔“اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”تیرا ان راجستانیوں سے بڑا تعلق رہا ہے، بتا کون ہمارے سامنے آ سکتا ہے، کس میں کتنا دم ہے؟“میں نے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔

”یار وہ تو خود سہارا تلاش کرتے ہیں، چور کے کون سے پاؤں ہوتے ہیں، کوئی نہیں کھڑا ہو سکتا جب تک یہاں سے کوئی مقامی بندہ ان کی پشت پناہی نہ کرے۔اس پھیلی ہوئی روہی میں کئی لوگ ہیں، یہ نور حیات جیسے، ہیر وزاں یا بھرن شاہ جیسے تو بہت ہیں۔ان سے بھی بڑے خطرناک لوگ ہیں۔لیکن وہ چھیڑتے نہیں کسی کو، جب تک کوئی ان کو نہ چھیڑے۔“اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا تو میں سمجھاتے ہوئے بولا۔

”مجھے ان سے کوئی غرض نہیں ہے۔میرا کوئی پتہ نہیں میں کب چلا جاتا ہوں یہاں سے، میں چاہتا ہوں سانول کو کوئی نہ چھیڑے۔“

”فوری طور پر تو کوئی بندہ نگاہ میں نہیں ہے، ہاں تیرے جانے کے بعد کسی نے سر اٹھا لیا تو اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔کوئی اور چاہے ہو نہ ہو، ایک نور حیات ہی سب سے بڑا دشمن موجود ہے۔“اس نے صورت حال بتاتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

”وہ ہوتا کہاں ہے آج کل؟“

”دو دن پہلے بہاول پور میں تھا۔پھر اس کے بعد کا پتہ نہیں۔“اس نے بتایا۔

”اچھا میری ایک بات سن، پورے علاقے کی صورت حال کیا ہے، اس کے بارے میں معلومات لو، باقی دیکھ لیں گے۔“

میں نے اس کے ذمے ایک کام لگا دیا تو وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''تم پہلے اپنے گھر میں تو دیکھو، رومی کو کس نے بلایا تھا؟''

''میں پتہ کرتا ہوں۔ تم دو چار دن میں مجھے بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا تو میں اس کے ساتھ پورے علاقے کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ مجھے وہاں کافی وقت لگ گیا۔ آدھی رات ہو چکی تھی جب میں اٹھ کر واپس چل دیا۔

میں ڈیرے پر پہنچا تو بختاور کے ساتھ جہانگیر بیٹھا ہوا گپ شپ لگا رہا تھا۔ وہ بھی شادی پر ہونے والی باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے پاس کچھ دیر بیٹھا، پھر میں نے بختاور سے پوچھا۔

''یہ رومی کو کس نے بلایا تھا؟''

''مجھے تو نہیں پتہ، لیکن کسی ...'' یہ کہتے ہوئے رک گیا، پھر جیسے اسے بات کی سمجھ آ گئی تو اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''واقعی، کس نے بلایا؟''

''ہم سے کتنی بڑی غلطی ہو چکی ہے۔ رات کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اور پھر ہمیں یہ بھی نہیں معلوم اسے بلایا کس نے؟'' میں نے سرد سے لہجے میں پوچھا۔

''پتہ کرتے ہیں، اپنے کان اور آنکھیں کھول کر رکھتے ہیں۔'' اس نے ندامت بھرے لہجے میں کہا تو میں اٹھ کر رہائشی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ صحن میں رحماں مائی کے ساتھ ساوری بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے جاتے ہی پوچھا۔

''سانول کہاں ہے؟''

باہر ہے کہیں۔'' رحماں مائی نے پوچھا۔

''اس کا خیال رکھا کر۔'' میں نے کہا اور اماں سگھن والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں جا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ نیند کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد ساوری ہاتھوں میں ٹرے

تھامے اندر آ گئی۔

"اٹھو مجھے ٹرے رکھنے دو۔" ساوری نے کہا تو میں اٹھ گیا۔ اس نے ٹرے پلنگ پر رکھی اور میرے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے ٹرے سے کپڑا اٹھایا۔ بھنے ہوئے گوشت کے ساتھ تنوری روٹیاں رکھی ہوئی تھیں، میری ایک دم سے بھوک بڑھ گئی۔ لیکن مجھ سے پہلے ہی ساوری کھانے لگی۔

"بڑی بھوک لگی ہے تمہیں؟" میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

"تو اور کیا، تم تھوڑی دیر مزید نہ آتے تو میں نے کھانا نکال کر کھا لینا تھا۔"

"ہم کون سا میاں بیوی ہیں، جو تم ایسے کرتی ہو، کھا لیا کرو میرا کیا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ سنجیدگی سے بولی۔

"اوئے سوہنے، میں نے تو تمہیں اپنا میاں مان لیا، اب نکاح کے دو بول رہتے ہیں، جب چاہے پڑھوا لینا۔"

اس نے ایک دم سے بڑی بات کہہ دی تھی۔ میں اگر اس پر جو بھی بات کرتا، ایک نئی بحث چھڑ جانا تھی، سو میں خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ وہ دن بھر کی روداد سناتی رہی۔ اچانک اس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے جلی، بڑے خاموش ہو؟"

"یار ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی، یہ ردمی کو کس نے بلایا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں نے بلایا تھا، کیوں کیا بات ہے؟" ساوری نے بڑے اطمینان سے کہا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر دھیمے سے پوچھا۔

"تمہیں پتہ ہے ان کے بارے میں وہ پیر زادہ ......"

”رحماں مائی بھی تو پیروزاں کے پاس ہی رہتی تھی۔ یہ تم دماغ پر مت لاؤ، میں جانتی ہوں، وہ سب کیا ہیں۔ میں بچپن سے ادھر ہوں اور سب جانتی ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں نے بہت سوچ کر اسے بلایا ہے۔“

”مجھے تمہاری سوچ کی سمجھ نہیں آئی؟“ میں نے پوچھا۔

”تم سکون سے رہو، جیسے ہی کچھ ہوا میں بتادوں گی اور تمہیں سمجھ میں آجائے گا۔ چھوٹو رام کوئی چیز نہیں، بات اس سے بھی آگے کی ہے۔ کھانا کھاؤ۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا تو میں نے بھی بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہاں ایک سوچ میرے دماغ میں ذرا آئی کہ مجھے اس علاقے میں رہنا ہے تو اب آنکھیں کھول کر رہنا ہوگا۔

☆......☆......☆

سہ پہر ہو رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کی ٹکڑیاں پھیلی ہوئیں تھیں۔ نجانے یہ آوارہ بادل کہاں سے آگئے تھے۔ شاید کہیں راہ بھٹک گئے تھے۔ سارا دن سونے کے بعد میں فریش ہوکر ڈیرے پر آگیا۔ وہاں بستی کے دو چار لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ایک چارپائی پر بیٹھ کر ان سے باتیں کرنے لگ گیا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ زمان سوہل کا فون آگیا۔ میں نے کال رسیو کرکے ہیلو کہا تو وہ چھوٹتے ہی بولا۔

”وہ چھوٹو رام تو بہت بے غیرت نکلا یار۔“

”کیا ہوا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اس نے آج رومی کو اس لئے مارا ہے کہ وہ تمہارے پاس کیوں گئی۔“ اس نے غصے میں کہا۔

”اوہ“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

چند لمحوں بعد میں نے تحمل سے پوچھا۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"وہاں سے ایک بندے نے مجھے فون پر بتایا تھا، پھر میں نے بعد میں تصدیق بھی کی ہے۔ اس نے نہ صرف اسے مارا ہے بلکہ فون وغیرہ چھین کر اسے اپنے گھر بھی لے گیا ہے۔" زمان نے مزید تفصیل بتائی۔

"کیا کرنا چاہیے پھر اس کا؟" میں نے رائے چاہی۔

"کم از کم رومی کو چھڑوا تو لینا چاہیے۔" اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"تم ان کی بستی میں جا سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جانے کو تو چلا جاؤں گا لیکن میں وہاں کچھ کر تو نہیں پاؤں گا۔" اس نے بے چارگی سے کہا تو میں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"کیا خیال ہے ہم خود چلیں یا کسی کو بھیج دیں۔ تم جاؤ گے؟ بندے بھیج دوں تمہارے ساتھ؟"

"یار میں نے تمہیں بتایا ہے۔ مجھ میں اتنی قوت ہوتی تو میں خود چلا جاتا۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"میں بندے بھیج دیتا ہوں۔" میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا تم تو میرا امتحان لینے لگے ہو یار۔" اس نے بے چارگی سے کہا تو میں اطمینان سے بولا۔

"تم نے بتا دیا، اب میں دیکھ لیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے یوں کہا جیسے پھنسی ہوئی جان بچ گئی ہو۔ پھر وہ کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کر کے فون بند کر گیا۔ میں نے وہیں بیٹھے ساوری کو کال ملا دی۔ اس نے کال ریسیو کی تو میں نے رومی کے بارے میں بتایا۔

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے اطمینان سے بتایا پھر فوراً ہی بولی، "میں نے کہا تھا، جیسے ہی

کچھ ہوا، میں خود بتاؤں گی جو کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ایک دم سے کہا اور فون بند کر دیا، نجانے کیوں میں بے چین ہو گیا۔ اگرچہ یہ بات بڑی مضحکہ خیز تھی لیکن نجانے کیوں ایک سوچ آ کر چلی گئی۔ کہیں یہ ساوری اپنے طور پر پیروزاں تو نہیں بننا چاہتی؟ میں کچھ دیر سوچتا رہا، لیکن یہ سوچنے کی بہرحال بات ضرور تھی کہ اس نے یہ تجسس کیوں رکھا ہوا ہے۔ وہ بتاتی کیوں نہیں ہے؟

شام ڈھل گئی تھی۔ میں چار پائی پر لیٹے لیٹے تھک گیا تھا۔ میں اٹھا اور گیٹ کی طرف چل دیا۔ باہر کچی سڑک پار کے میں تھوڑا آگے گیا تو مجھے جہانگیر کی کال آ گئی۔

"کہاں ہو تم؟"

"یہیں ڈیرے پہ ہوں، خیریت؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"ہم پانچوں یہاں کوپے پہ ہیں، تکے بنا رہے ہیں آ جاؤ اگر آنا ہے تو۔" اس نے خوش کن لہجے میں کہا تو پیچھے سے مدثر کی آواز گونجی، "اگر ساوری بھابھی اجازت دے دے تو آ جاؤ۔"

"میں آ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا، پھر ساتول کو فون کر اپنے بارے میں بتایا۔ اس دوران میں نے اندر سے بائیک لیا اور کوپے کی طرف چل دیا۔ ڈیرے سے کوپے کا فاصلہ یہی کوئی پندرہ بیس منٹ کا تھا، میں بارہ منٹ میں پہنچ گیا۔ درمیان میں آگ دہکائے وہ تکے بنانے میں مصروف تھے۔

"ارے تیر کی مانند آئے ہو۔" شعیب نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"میں ذرا مدثر سے پوچھ لوں، اب مجھے اجازت لینی ہو گی۔" میں نے کہا اور چار پائی پر بیٹھ گیا، سبھی ایک دم سے ہنس دیئے۔ مجھے بہت اچھا لگا۔

"شادی ساتول کی ہوئی ہے، ساوری کے کمرے سے تم نہیں نکل رہے ہو، ہے نا عجیب

بات۔" آفتاب نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"چل یار، دو چار دن ہے یہ بھی سوچ کر لے۔" جہانگیر نے کہا تو میں چونک گیا، اس نے جو کہا تھا اس میں کچھ تھا۔

"دو چار دن مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"یار اب یہاں سب ٹھیک ہے، اب ہمیں لاہور چلے جانا چاہیے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن میرے خیال میں ابھی یہاں ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"کیوں بکتا ور، میں نہیں کہتا تھا، اس علی کا دل یہاں سے جانے کو نہیں کر رہا ہے، اس کی وجہ صرف ساوری ہے، ورنہ اب تو یہاں امن ہو چکا ہے۔"

"نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں ساوری والی، میرا من کہہ رہا ہے کہ یہ جو اچانک خاموشی چھائی ہے نا، یہ فطری نہیں ہے، جیسے ہی ہم یہاں سے گئے، کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" میں نے کہا تو آفتاب بولا۔

"دنیا سے چلے بھی گئے تو یہاں دنیا میں کچھ نہ کچھ ہوتا رہے گا۔ یہ باتیں ٹھیک نہیں ہیں۔ باتیں بزرگوں ہی کی ٹھیک ہیں، عشق بندے کو نکما کر دیتا ہے اور تم نکمے ہو گئے ہو، چل بیگ پکڑ اور اپنے نکلے آپ لگا۔"

"کب جانا ہے لاہور؟" میں نے ایک دم سے پوچھا۔

"بس ایک دو دن میں۔" جہانگیر نے پھر کوئی واضح نہیں بتایا تو میں خاموش ہو گیا۔ مدثر نے موضوع ہی بدل دیا تھا۔ وہ اودھمے پور وغیرہ کی باتیں کرنے لگا تھا، دراصل میرے آنے سے پہلے بکتا ور انہیں وہاں کی باتیں سنا رہا تھا۔ ہمیں وہیں بیٹھے آدھی رات سے بھی زیادہ

وقت ہو گیا۔ مجھے احساس تو تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر کوئی بات نہیں کی ورنہ پھر مجھے ساوری کا طعنہ مل جاتا تھا۔ جبکہ ان کی باتیں تھیں کہ پھیلتی ہی چلی جا رہی تھیں۔

اچانک میرا فون بج اٹھا۔ صحرا کے سناٹے والے ماحول میں یہ رنگ ٹون کی آواز نے چونکا دیا۔ میں اسکرین پر دیکھا تو اتنے میں مدثر کی آواز آئی۔

''شرط لگا لو، ساوری بھابھی کا فون ہے۔''

''اسی کا ہی ہے۔'' بختاور نے اسکرین پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے فون کان سے لگاتے ہوئے ہیلو کہا تو وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

''وہ ردمی ہے نا، اسے کچھ لوگ اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔''

''اب یہ تمہیں پتہ ہوگا کہ اسے کہاں لے کر جا رہے ہیں؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو اس نے ایک گہرا سانس لیا پھر بولی۔

''یہ وقت طنز کا نہیں ہے، مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ ایسا بھی ہوگا۔ انہیں روکنا ہوگا، اس وقت کہاں ہو تم؟''

''میں گوپے پر ہوں، سب کے ساتھ۔'' میں نے بتایا تو اس نے تیزی سے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''تو پھر جلدی سے اُن کی بستی میں جاؤ، وہ قریب ہی ہے۔''

''جس نے تمہیں اطلاع دی ہے، اس نے بتایا نہیں وہ کدھر گئے ہیں؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

''میں دوبارہ پوچھ کر بتاتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے فون بند کر دیا۔

”ہاں جی بلا رہی ہے، یہ بتایا کتنی دیر کان پکڑوائے گی؟“ آفتاب نے ہنستے ہوئے کہا تو میں نے جواب دینے کی بجائے اس اطلاع بارے بتایا۔

”چل اٹھ پھر بیٹھا کیوں ہے۔“ بختاور نے اٹھتے ہوئے کہا۔

رات کا دوسرا پہر شروع ہوا تھا۔ ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ بختاور میرے ساتھ بائیک پر بیٹھ گیا اور ان چاروں نے فور وئیل پر آنا تھا۔ کوپے سے نکلتے ہی اندھیرے کا احساس بڑھ گیا تھا۔ وہاں آگ تھی، بیٹری لائیٹ تھی۔ ہمارے چاروں طرف ٹیلے تھے، درمیاں میں بنے راستوں پر ہیڈ لائیٹ کی پیلی روشنی تھی۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اک ہو کا عالم تھا، جس میں بائیک کی آواز بہت زیادہ لگ رہی تھی۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے میں نے بختاور سے پوچھا۔

”یہ روحی کو کس نے اغوا کیا ہوگا؟“

”کیا تم سمجھتے ہو وہ اغوا ہوئی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”اس وقت، لگتا تو نہیں، پھر دیکھتے ہیں۔“ بختاور نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ یہ معاملہ صرف روحی کا نہیں تھا بلکہ علاقے کا تھا۔ اب ہم یہ سمجھتے تھے کہ جہاں تک رسائی ہے وہ ہمارا علاقہ ہے۔ اگر چھوٹو رام کی بستی میں کچھ ہماری اجازت کے بغیر ہوا ہے تو انہوں نے غلط کیا، یہ ایسے واقعات ہوتے ہیں جب طاقت دکھائی جاتی ہے، طاقت کا یہی مظاہرہ دراصل یہاں کی عوام کو محکوم بنا کر رکھتا تھا۔ صدیوں سے یہ نظام یونہی چلا آرہا۔ اس لئے یہ یہاں کی عوام کی گھٹی میں پڑ گیا تھا۔ وہ اس سے باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ انہیں وہی حاکم دکھائی دیتا تھا، جو ان کے حساب سے طاقت کا مظاہرہ کرتا۔ میں یہ سوچ چکا تھا، پہلے انہیں اسی پرانے طریقے سے یہ باور کروا دوں گا کہ میں حاکم ہوں، پھر انہیں بدلنے کی کوشش کروں گا۔ میں یہی سوچتے ہوئے

بائیک لئے جا رہا تھا کہ بختاور کی آواز نے میری سوچ کا تسلسل توڑ دیا۔اس نے پوچھا۔

''بیان کا لاہور جانے کا کیا ہے، مجھے سمجھ میں نہیں آیا۔''

''میری تو سمجھ میں نہیں آیا۔'' میں نے جان بوجھ کر کہا۔

''ظاہر ہے انہیں وہاں سے کسی نے بھیجا ہے نا، وہ تیرے میرے پابند تھوڑی ہیں۔ پیچھے کوئی بات ہوئی ہوگی۔اب انہیں تو جانا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہیں بھی جانا پڑے۔ یہ بھی تو ممکن ہے۔'' اس نے میرے کان کے قریب کہا۔

''شاید مجھے بھی جانا پڑے لیکن تم سنبھال لو گے نا یہاں سب کچھ؟'' میں نے کہا تو میرے لہجے میں ایک حسرت تھی، نجانے کیوں میں اس روہی سے نہیں جانا چاہتا تھا۔

''یار اگر صرف حوصلہ دینے کی بات ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ ہاں، سنبھال لوں گا، لیکن ماحول تمہارے سامنے ہے۔ کہیں سے بھی کچھ ہو سکتا ہے۔'' اس نے صاف لفظوں میں کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ میں شاید کوئی بات کہتا، اچانک موڑ مڑتے ہوئے سامنے سے تیز ہیڈ لائیٹس سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے پہلے توجہ نہیں دی تھی۔ ورنہ اس ویرانے میں روشنی کا تھوڑا سا احساس تو ہو جاتا۔ لمحہ بہ لمحہ ہم قریب آتے چلے گئے۔ بالکل قریب آکر پتہ چلا کہ وہ ایک کھلی جیپ تھی، جس پر کچھ لوگ سوار تھے۔ ان کی رنگ برنگی پگڑیوں سے شک ہوا کہ وہ راجستھانی ہیں۔ میں چونک گیا۔ کہیں یہی تو ہمارے مطلوبہ لوگ تو نہیں ہیں؟ چند فٹ کے فاصلے پر انہوں نے بریک لگا کر جیپ آہستہ کی، فطری طور پر میں نے انہیں دیکھا تو اچانک ایک چیخ بلند ہوئی۔

''علی......!!!۔''

ایک دم سے مجھے سمجھ آ گئی کہ یہ وہی لوگ ہیں۔ یہ تو رومی کی آواز ہے، جب تک میں سمجھا،

وہ جیپ میرے ساتھ سے کراس کر گئی۔ چیخ پھر سے بلند ہوئی لیکن گھٹی گھٹی تھی۔ میں نے ایک دم سے بریک لگائے اور بائیک کو موڑا۔ وہ مجھ سے تھوڑے سے فاصلے پر تھے۔

"علی سامنے سے فائر ہو سکتا ہے۔" بختاور نے اونچی آواز میں تنبیہ کی۔

"تم کس لئے ہو۔ پسٹل نکالو۔ اپنا بھی اور میرا بھی۔" میں نے تیزی سے کہا اور رفتار بڑھا دی۔ اس نے میرا پسٹل نکال لیا تھا۔ بختاور ٹھیک کہہ رہا تھا۔ فائر ہونا ممکن تھا۔ لیکن سامنے سے فور وہیل کی ہیڈ لائٹس جل رہی تھی۔ میں نے انہیں روکنا تھا، لیکن وقت اتنا کم تھا کہ انہیں فون بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے لمحے میں سوچا اور رفتار تیز کرتے ہوئے جیپ کو کراس کیا اور اس کے سامنے چلا گیا۔ اب میں دونوں کے درمیان تھا۔ دونوں کو بریک لگانا پڑے۔ جیپ بھی رک گئی اور فور وہیل بھی۔ میں نے بائیک کو چھوڑا، بختاور سے پسٹل لئے بغیر میں جیپ کی جانب بڑھا۔

جیپ میں چار لوگ تھے اور ان کے درمیان میں روحی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

"مجھے بچالو علی...... یہ مجھے لے جارہے ہیں۔"

"کہاں لے جارہے ہیں اور کیوں؟" میں نے تختی سے پوچھا۔

"پتہ نہیں کہاں لے جارہے ہیں۔" اس نے تیزی سے کہا تو ان میں سے جو ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، بڑے تحمل سے بولا۔

"دیکھ بھائیا، ہم نے اس چھوری کو چھوٹو رام سے خریدا ہے اور اب لے کے جارہے ہیں۔ اب مجھے نہیں پتہ یہ تجھے جانتی ہے کہ نہیں۔"

"اتارا سے۔" میں نے تختی سے کہا۔

”نہ بھائیا، یہ تو زیادتی ہے۔ ہم نے پیسہ بھرا ہے، نہیں یقین تو پوچھ لے چھوٹو رام سے۔“ اس نے تیزی سے فون نکالتے ہوئے کہا

”نہیں میں نے نہیں جانا ان کے ساتھ۔“ رومی چلاتے ہوئے بولی تو میں نے بھی تحمل سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جب لڑکی تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتی تو پھر تم اسے زبردستی کیوں لے جا رہے ہو...... نہیں لے جا سکتے۔“

میں نے محسوس کیا اس وقت بختاور میرے دائیں جانب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہولے سے پسٹل مجھے پکڑا دیا۔ میں نے فوراً جیپ کی طرف دیکھا، وہ چاروں بھی اتر آئے تھے۔

”بھائیا، ہم نے کچھ غلط تو نہیں کیا، ہم بیوپار کرتے ہیں۔“ اسی راجستھانی نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا تو مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا۔ میں نے اسے جیپ سے اتارتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

”تم اترو نیچے، دوسری بات کی تو گولی ماردوں گا۔“ خلاف توقع وہ بڑے آرام سے اتر آیا۔ میں نے ایک مزید راجستھانی سے کہا، ”تم بھی آؤ۔“ وہ بھی اتر آیا تو میں نے چاروں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئے کہ اسے ساتھ لے جانا ہے۔ پھر بختاور سے کہا، ”ان کے ساتھ بیٹھو اور گوپے پر لے آؤ۔“ میں نے کہا پھر رومی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا، ”تم آؤ رومی میرے ساتھ۔“

میرے کہتے ہی رومی تیزی سے جیپ میں سے اتر آئی۔ بختاور جیپ میں بیٹھ گیا۔ میں بائیک کی طرف بڑھا تو رومی میرے پیچھے آ کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد ہم گوپے پر تھے۔ ان چاروں کو چارپائیوں پر بٹھایا، خود بھی ارد گرد بیٹھ گئے۔

انھیں پانی پلا کر میں نے پوچھا۔

''اب بتا، یہ کیسا بیوپار ہے؟''

''بھائیا، یہ ہم کون سا نیا بیوپار کر رہے ہیں۔ لڑکی بکتی ہے، ہم خریدتے ہیں اور بیچ دیتے ہیں۔ ہمارا یہی بیوپار ہے۔ کل چھوٹو رام سے سودا طے ہوا، اس نے خود ہمیں بلایا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''اتنی رات گئے چوروں کی طرح بیوپار؟'' میں نے غصے میں پوچھا۔

''بھائیا، کچھ بیوپار کے اصول بھی ہوتے ہیں ناں۔'' اس نے خوشامدانہ انداز میں کہا تو میں نے پوچھا۔

''جب یہ لڑکی تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتی پھر کیوں؟''

''سبھی ایسا کرتی ہیں، اگر ان لڑکیوں کی مانیں تو ہمارا دھندہ تو چل ہی نہیں سکتا، ہم کچھ نہ کر سکیں پھر۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر رکا، گہری سانس لے کر بولا۔ ''اب تم لوگوں نے کچھ لینا ہے تو بتاؤ اور ہمیں جانے دو۔''

''میں نے ابھی تمہیں کچھ نہیں کہا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس لڑکی کو لے جانے دوں گا، یہ بھی نہیں جائے گی اور تم لوگوں کو بھی سزا ملے گی۔'' میں نے غصے میں کہا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر سرسراتے ہوئے بولا۔

''یہ کا کہہ رہے ہو بھائیا؟''

''ان کی جیب سے اسلحہ بھی نکلا ہے۔'' آفتاب نے بتایا۔

''اور شراب کی بوتلیں بھی۔'' مدثر بولا تو میں نے رومی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''تجھے چھوٹو رام نے مارا بھی تھا اور......''

"ہاں نا، کل دوپہر سے مار رہا ہے، میرے باپ کے آگے نوٹ پھینکے، مجھے ساتھ لے کر اپنے گھر گیا، وہاں مجھے مارا، بس منواتا رہا کہ اس کی بات مان لوں، نہیں تو مجھے بیچ دے گا، میں نہیں مانی تو اس نے بہت مارا ہے مجھے۔ میں دکھاؤں اپنے زخم، کتنا مارا ہے مجھے۔ میں بھی نہیں مانی تو ان بیوپاریوں کو بلوا لیا۔ علی مجھے بچا لو، یہ مجھے نوچ کھائیں گے۔" وہ ہذیانی انداز میں کہتی چلی گئی۔

"چل جا تو اندر جا کے آرام کر۔" میں نے اسے کہا تو وہ اندر چلی گئی۔ تبھی میں نے ان بیوپاریوں سے کہا۔

"تجھے عورتوں کا کاروبار کرتے شرم نہیں آتی؟"

"ہمارا آج کا بیوپار نہیں ہے بھائیا، پرکھوں سے ہے۔ لوگ بیچتے ہیں تو ہم خریدتے ہیں۔" اس نے نہایت بے شرمی اور ڈھٹائی سے دلیل دی، پھر لمحہ بھر سانس لے کر بولا، "چل بھائیا تم ہمیں یہ لڑکی مت لے جانے دو، مگر ہمارا روپیہ واپس کروا دو، ہم چپ چاپ واپس چلے جائیں گے۔"

"اصولی طور پر اس لڑکی کو میں نے تم سے چھین لیا ہے۔ اس کا چھوٹو رام کا کچھ لینا دینا نہیں۔ ہاں اگر تم یہ وعدہ کرو کہ دوبارہ یہ کام نہیں کرو گے تو میں روپیہ واپس کروا سکتا ہوں۔" میں نے اطمینان سے کہا تو تیزی سے بولا۔

"اگر یہ بات ہے بھائیا تو پھر ہمیں جانے دو۔ لڑکی رکھو تم۔ بات ختم۔"

"چل ٹھیک ہے بھاگ جاؤ۔" میں نے کہا تو بختاور تحتی سے بولا۔

"ارے یہ کیا، ان کے چھتر تو مارنے دو، ایویں ای جانے دیں۔"

"چل مار لے چھتر جتنے مارنے ہیں۔" میں نے کہا تو پانچوں ان پر پل پڑے۔ سامنے

سے کسی نے مزاحمت نہیں کی۔ لیکن ان کی چیخ و پکار، ہائے وائے کی آوازیں نکلنے لگیں۔ یہ مارا ماری سن کر رومی بھی باہر آ گئی۔ وہ بھی اس دھنائی میں شریک ہو گئی۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔ شعیب کے ہاتھ میں سکے بنانے والے سیخ آ گئی، اس نے اونچی آواز میں کہا۔

"اوئے رک جاؤ۔"

سبھی رک گئے۔

اس نے سیخ کو آگ میں ڈال دیا، ساتھ میں پڑی دوسری سیخیں بھی آگ میں ڈال دیں۔

"کیا کرنے لگے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے پھوڑے پر نشان لگاؤں گا، ساری زندگی یاد رکھیں گے کہ عورتوں کا بیوپار نہیں کرنا۔" شعیب نے عجیب انداز میں کہا۔ اس نے کوئی زیادہ ہی غصہ کر لیا تھا۔ عورتوں کا بیوپار کرنا، بات تھی بھی انتہائی افسوس ناک۔ وہ دو باری سے کوئلے دہکا کر سیخیں گرم کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک کو لاتا، اس کے پھوڑے سے کپڑے ہٹاتا اور سیخ سے داغ دیتا۔ سناٹے والے ماحول میں ایک دردناک، دل دہلانے والی چیخ بلند ہوتی۔ پھر سسکیاں اور رونے کی آوازیں گونج اٹھتیں۔ شعیب ان پانچوں کو نشان زدہ کر چکا تو ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اب جاؤ، بھاگ جاؤ اور کبھی عورت کے بیوپار کا مت سوچنا۔"

ان میں سے کسی نے بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، وہ تقریباً بھاگتے ہوئے کوپے کے تھڑے سے اترے، جیپ میں بیٹھے اور لمحوں میں گم ہو گئے۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" بختاور نے پوچھا۔

"جیسے تم کہو، یا پھر اپنی بھابی ساوری سے پوچھ لے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ ایک دم سے ہنس دیا۔ پھر بولا۔

"چل آ، لگے ہاتھ اس چھوٹو رام کا کام بھی کر ہی دیں۔"

"چل پھر۔" میں نے کہا تو رومی کو فوروہیل میں بٹھایا گیا، بختاور میرے پیچھے بیٹھا اور ہم چھوٹو رام کی بستی کی جانب چل پڑے۔

رات کا دوسرا پہر گزر رہا تھا، جب ہم چھوٹو رام کی بستی میں جا پہنچے۔ بستی کیا تھی کوئی دس پندرہ کچے کوٹھے اور اتنے ہی جھونپڑے نما کوپے تھے۔ کسی گھر کی کوئی چار دیواری نہیں تھی۔ بس تھڑے بنے ہوئے تھے، جسے صحن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہم دو دو کی ٹولیوں میں الگ الگ ہو گئے تھے۔ ایک ببول کے درخت کے پاس فوروہیل روک دی تھی۔

"رومی بتا، اس چھوٹو رام کا گھر کہاں ہے؟"

"وہ سامنے......" رومی نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اگرچہ اندھیرا تھا۔ اتنی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن اندازہ ہو گیا تھا۔ چند منٹ بعد ہم چھوٹو رام کے گھر کے سامنے جا رکے۔ باقی سارے ایک طرف ہو گئے۔ میں اور رومی دروازے کے سامنے تھے۔ وہ ایک کچا کمرہ تھا۔ جس کا میں نے دروازہ بجایا تو اچانک اندر سے آواز آئی۔

"کون ہے بے اس وخت......"

تبھی میں نے رومی کو اشارہ کیا تو اس نے تیزی سے کہا۔

"دروجہ کھول۔"

"اے تو کیسے آ گئی؟" اندر سے حیرت بھری آواز ابھری تو اس نے جواب دیا۔

"چھوڑ گئے ہیں وہ مجھے۔ اب دروجہ کھولو تو بتاؤں۔ ورنہ میں باپو کے گھر جا رہی ہوں۔ پھر ادھر مت آنا۔"

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ اندر کا دروازہ کھل گیا۔ سامنے ایک لمبا تڑنگا، بد ہیت سا

پکی عمر کا شخص دھوتی کرتا پہنے کھڑا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا یا ملگجے اندھیرے میں بد ہیت نظر آ رہا تھا۔
اس نے مجھے رومی کے ساتھ دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔
"یہ کسے ساتھ لائی ہے تو رومی؟"
"باہر آ۔" میں نے کہا اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس نے زور لگا کر اپنا گریبان چھڑوانے کی کوشش کی تو کرتا پھٹ گیا۔ لیکن میں نے جو اسے جھٹکا دیا تھا، اس کی وجہ سے وہ باہر آ گیا تھا۔
"کون ہے بھائی تم؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔
"اتنی جلدی تمہیں بتا دوں۔ تم سے تو بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ لیکن وہیں ڈیرے پر جا کر۔" میں نے کہا ہی تھا کہ بختاور آگے بڑھا۔ اسے دیکھ کر چھوٹو رام کے اوسان خطا ہو گئے۔ بختاور نے کوئی بات نہیں کی، اسی کا کرتا پھاڑ کر اس کے ہاتھ باندھ دیئے۔ جہانگیر اسے پکڑ کر فوروہیل کی جانب بڑھ گیا۔
"چل رومی تو جا اپنے گھر۔" میں نے کہا۔
"نہیں ابھی مجھے تم لوگوں کے ساتھ جانا ہے۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تو میں نے اسے بھی جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ لوگ چلے گئے تو میں اور بختاور اس کے کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ کوئی آدھا گھنٹہ لگا ہو گا ہمیں۔ اس کے کمرے سے کافی ساری منشیات، دو گنیں، تین پسٹل، کچھ کاغذات، اس کا پاسپورٹ، سیل فون، ملکی، غیر ملکی اور بھارتی کرنسی نکلی۔ وہ سب کچھ سمیٹ کر ہم بائیک پر ڈیرے کی طرف چل پڑے۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ وہاں کوئی بندہ بھی باہر نہیں نکلا تھا۔ کیا وہ ایسے بے سدھ سوئے ہوئے تھے؟ وہ نشہ کرتے تھے؟ یا پھر جان بوجھ کر باہر نہیں نکلے۔ ورنہ سناٹے بھرے ماحول میں تو ہمارے جانے کی وہاں

آوازیں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

چھوٹو رام بندھا ہوا ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے والی چارپائی پر جہانگیر تھا۔ باقی تینوں اندر کہیں کمرے میں تھے۔ وہاں رومی دکھائی نہیں دی تھی۔

"وہ اندر رسا وری کے پاس گئی ہے؟" جہانگیر نے میرے پوچھنے پر بتایا تو میں جہانگیر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میرے سامنے چھوٹو رام تھا۔ ملگجے بلب کی روشنی میں اب وہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر سخت لہجے میں پوچھا۔

"تم یہ عورتوں کو بیچنے کا دھندہ کب سے کر رہے ہو؟"

"بہت عرصے سے۔" اس نے اکڑے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"ان عورتوں کو بھی بیچ دیتے ہو، جو بکنا نہ چاہیں۔" میں نے تلخ انداز میں پوچھا تو وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

"اب جو کوئی اپنی بیٹی بیچنا چاہے تو مجھے کیا، یہ جو رومی ہے، اس کے باپ نے مجھے بیچا تو میں نے خرید لی۔ اب اس میں میرا کیا قصور؟"

"قصور یہ ہے کہ تم نے اسے مارا، پیٹا، تشدد کیا اور منافع پر آگے کسی کو یوں بیچ دیا جیسے یہ کوئی انسان نہیں، بھیڑ بکری یا گائے ہو۔" میں نے دکھ سے کہا۔

"دیکھیں جی یہ دھندہ چل رہا ہے تو میں بھی کر رہا ہوں۔ میں نے کچھ نیا نہیں کیا۔ مجھے یوں اٹھا کر لے آئے، بنا کسی قصور کے یہ اچھا نہیں کیا آپ لوگوں نے۔" اس نے ایک دم سے سخت لہجے میں کہا۔

"جسے تم قصور نہیں مان رہے ہو نا، دراصل یہی تیرا قصور ہے۔" بختاور نے سخت لہجے میں کہا تو وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے تنک کر بولا۔

”دھیرج رکھو تم، مجھے پتہ ہے تیری میری دشمنی ہے، اب تم مجھے اٹھالاؤ ہو یہ بہانے مت بناؤ، سیدھا کہو اپنی دشمنی کے لئے لے کر آؤ۔“

”اوئے چھوٹو بکواس بند کر، نیچی رکھ اپنی آواز ......“ میں نے سخت لہجے میں کہتے ہوئے ایک دم سے تھپڑ مار دیا۔ وہ ایک دم سے چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں اس طرح بھی پیش آسکتا ہوں۔ چند لمحے رک کر میں نے کہا۔ ”جب تمہیں زمان سوہل نے روکا تھا کہ رومی کو کچھ نہیں کہنا، پھر تم نے اپنی من مانی کی۔“

”میں نے کب من مانی کی، یہ تو روایت ہے۔ میں نے پوری رقم دی جو رومی کے باپ نے مانگی۔“

”جب تک تیرے جیسے بے غیرت اس علاقے میں ہیں، عورتوں کی خرید وفروخت ایسے ہی رہے گی۔“

”اب کرنا کیا ہے اس کا، گولی ماردوں۔“ آفتاب نے اکتاتے ہوئے پوچھا تو میں نے کہا۔

”ابھی اسے کچھ نہیں کہنا، کل دن کے وقت سب کے سامنے اسے زندہ جلاؤں گا۔ مجھے اس پورے علاقے میں عورتوں کا یہ بیوپار روکنا ہے۔“

”چل ٹھیک ہے، اسے اچھی طرح باندھ کے ڈال دے ادھر۔“ مدثر نے کہا اور رسی تلاش کرنے اندر کی طرف چل دیا۔

”تم جاؤ، میں ہوں اس کے پاس۔“ بختاور نے کہا اور اپنی بستی میں فون کرنے لگا۔ میں وہاں سے اٹھا اور رہائشی حصے کی طرف چل دیا۔

☆......☆......☆

میں کمرے میں پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ ایسے میں مجھے پازیب چھنکنے کی آواز آئی، دروازہ کھلا

اور ساوری اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"لے دودھ پی لے۔"

"رکھ دے یہاں۔" میں نے تھوڑے سے سخت لہجے میں کہا۔

"دودھ پی لے، پھر مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لیا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ تبھی وہ بولی۔

"علی، تم ہو تو اسی روہی کے لیکن تجھے روہی کے بارے میں ابھی پتہ نہیں ہے۔ کیا تم جانتے ہو، دوسری جگہوں پر جتنے صحرا ہیں، ان میں سایہ نہیں ہوتا، کہیں سبزہ نہیں ہوتا، یہ روہی ہے، جس میں سبزہ بھی ہوتا ہے اور سایہ دار درخت بھی۔ یہاں ٹیلے اپنا رخ بدلیں بھی تو اتنا نہیں بدل سکتے، سبزہ اپنی نشانیاں رکھتا ہے۔ وہ رستے بھولنے نہیں دیتا۔"

"تیرے کہنے کا مطلب کیا ہے؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"صرف میری سن اپنی مت کہہ۔" اس نے اسی سنجیدگی سے کہا تو میں خاموش رہا، وہ چند لمحے میرے چہرے پر دیکھتی رہی پھر بولی، "ضروری نہیں کہ انسان کسی سکول میں پڑھے تو ہی اسے عقل آتی ہے، وقت بہت بڑا استاد ہوتا ہے، یہ تم ہی کہتے ہو نا، وقت نے مجھے بھی بہت سکھایا ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی لیکن میں ان طاقت وروں کے ساتھ ضرور رہی ہوں۔ میں دیکھتی اور سمجھتی رہی ہوں کہ یہ لوگوں پر خوف کیسے طاری کرتے ہیں۔ میں یہ بھی اچھی طرح سمجھتی ہوں، کب، کسے، کہاں استعمال کرنا ہے۔ میں اسی گھر میں پلی بڑھی ہوں جہاں یہ سب تماشے ہوتے رہے ہیں۔"

"یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہی ہو؟" میں نے اکتاہٹ سے کہا۔

"میں اس لئے بتا رہی ہوں، تم جو یہ سرحد پار کر کے آئے ہو، وہ لوگ اسے بھول نہیں

گئے۔ وہ انتہائی خاموشی سے تیرے اردگرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں، آج یا کل یا چند دن ہیں، وہ سامنے آجانے والے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"یہ تجھے کیسے پتہ؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"تم جس چھوٹو رام کو اٹھا کر لائے ہو، وہ ایک معمولی مہرہ ہے۔ اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ وہ بیوپاری جنہیں تم نے جانے دیا، وہی ان لوگوں کے میزبان ہیں۔ ابھی رودی مجھے سب کچھ بتانے والی ہے۔ یہ بک کر نہیں جا رہی تھی، بلکہ اسے سزا کے طور پر لے جایا جا رہا تھا۔" اس نے دبے دبے جوش سے کہا۔

"ساوری، تم مجھے سب کچھ بتا کیوں نہیں دیتی ہو؟" میں دبے دبے غصے میں کہا تو وہ دھیمے سے بولی۔

"دیکھو علی، میں تمہیں اس لیے سب کچھ نہیں بتانا چاہتی، کل کلاں تم نے چلے جانا ہے۔ یہاں کا سب نظام مجھے دیکھنا ہوگا، میں نے اسے اپنے طور پر چلانا ہے۔ اگر تم کہو تو، اگر تم مجھے یہ حق دو تو۔"

"تم ایسے کیوں سوچ رہی کہ یہ سب نظام تمہیں سنبھالنا ہے؟" میں دھیمے سے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی۔

"یہ فیصلہ تم نے کرنا ہے کہ تم مجھے ساتھ لے کر لاہور جاؤ گے یا مجھے یہاں پر چھوڑ جاؤ گے؟"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں اگر یہاں رہتا ہوں تو مجھے یہ ساری معلومات لینی چاہئے۔ اگر مجھے جانا ہے تو پھر مجھے ایسی بات بھی نہیں کرنی چاہئے۔" میں کہتے ہوئے خود ہی خاموش ہو گیا۔

"اب تم بتاؤ۔ اگر یہاں رہنا ہے تو کہو، میں سب بتا دیتی ہوں، اور اگر تم نے نہیں رہنا تو

پھر تمہیں یہاں کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ تم جاؤ اپنی دنیا میں۔" اس نے صاف لفظوں میں مجھ سے کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بات تو ٹھیک کر رہی تھی۔

"اور اگر میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں تو؟" میں نے پوچھا۔

"تو پھر یہ روہی والے جیسے رہیں، ہمیں ان سے کیا لینا دینا۔"

اس نے سپاٹ لہجے میں یوں کہا جیسے ان کا تعلق واسطہ ہی روہی والوں سے نہ ہو۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا، وہ اتنی بھی ظالم ہو سکتی ہے؟

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، وہ سرد لہجے میں بولی، "جو بھی کرنا ہے تم نے کرنا ہے، اب یہ فیصلہ تمہارا ہے، بولو کیا کہتے ہو۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں؟

(قسط نمبر: 11)

میں کچھ دیر خاموش رہا، پھر میں نے ساوری کے چہرے پر دیکھا، وہ میرے جواب کی منتظر تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہی نہیں چہرے پر بھی انتظار پھیلا ہوا تھا۔ میں نے چند لمحے یونہی دیکھتے رہنے کے بعد دھیمے سے کہا۔

''وقت جو فیصلہ کرے گا ساوری، وہی بہتر ہو گا۔ میں اپنے سارے معاملات وقت پر چھوڑتا ہوں۔''

''ایسا تو نہیں چلے گا نا، یہاں کے معاملات کو دیکھنا ہے۔ ان لوگوں کو اکیلا......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔

''اگر ہم اس جہاں میں بھی نہ رہے نا تب بھی یہاں کے سارے معاملات چلتے رہیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔'' میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''علی، میں نے جو وقت گزارا ہے، رجماں نے اور ہمارے جیسی کئی لڑکیوں نے جو اذیت بھگتی ہے، وہ اذیت تم نہیں سمجھ سکتے۔ کچھ تو اس جہان سے بھی چلی گئیں۔ مجھے زندگی سے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے۔ ہم پیدا ہی ایسے خطے میں ہوئے ہیں، ہماری آنکھ ہی ایسے گھر میں کھلی، کسی کو کیا دوش دیں علی، ہم جیسوں کی قسمت ہی یہی ہوتی ہے۔'' اس نے دکھی دل سے کہا۔

''تم مجھے جذباتی کرنے کی کوشش مت کرو ساوری۔ جو تم کہنا چاہتی ہو نا وہی کہو۔'' میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا اور اس کے کاندھے سے ہاتھ ہٹا لیا تو وہ لرزتے ہوئے لبوں اور

کانپتی پلکوں کے ساتھ بولی۔

"میں کچھ بھی نہیں چاہتی سوائے تمہارے۔"

"تم میرے بارے میں سب جانتی ہو، بلکہ میرے بارے جاننے کی ضد تم نے خود کی، اب جبکہ تمہیں میرے بارے میں سب پتہ ہے تو پھر تم میرے ساتھ کیوں امیدیں باندھ رہی ہو، اگر تمہیں کچھ معلوم نہ ہوتا تو شاید میں تمہیں کوئی امید دلاتا، کوئی جھوٹ بول دیتا، کوئی آس دلا دیتا۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

"کیا تم مجھے محبت کرنے سے روک سکتے ہو؟"

"میں کسی کی سوچ پر پہرے کیسے بٹھا سکتا ہوں ساوری۔ مگر حقیقت کیا ہے؟ اسے جاننے کے بعد فیصلہ کرنا بھی ایک حقیقت ہے، دانش مندی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کی گرفت میرے ہاتھوں پر مزید سخت ہو گئی۔ تبھی میں نے نرم سے لہجے میں کہا، "تمہیں پتہ ہے میں کن راہوں کا مسافر ہوں، میری کوئی منزل نہیں ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی، اب اگر میں چاہوں بھی تو ان راہوں سے پلٹ نہیں سکتا۔ پتہ نہیں کب، کہاں، کس وقت زندگی ہار جاؤں، یہ بھی ایک حقیقت ہے۔"

میرے کہے ہوئے لفظوں کی گونج کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے بہت نرمی سے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"میں تمہارے پاؤں کی زنجیر نہیں بننا چاہتی ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے، مجھے کل بھی تم سے محبت تھی، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ نہ تم مجھے اپنی محبت سے روک سکتے ہو اور میں خود کو۔"

"تو پھر سب کچھ وقت پر چھوڑ دو نا۔ وقت ہمارے لئے کیا لاتا ہے، اس کا انتظار ہم دونوں کریں گے۔" میں نے کہا اور بڑی نرمی سے اس کا سر اپنے کاندھے پر رکھ لیا۔ وہ ایک دم سے رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ جو کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، میں چاہتا تھا کہ وہ کھل کر برس جائیں۔

☆......☆......☆

دن کا اُجالا پھیل رہا تھا۔ پرندے رزق کی تلاش میں نکل پڑے تھے۔ روہی کے سناٹے میں مال مویشیوں کی آوازیں جا بجا پھیلی ہوئی تھیں۔ ساوری اور رحماں کچن نما کمرے کے باہر ناشتہ بنانے میں مصروف تھیں۔ میں وہیں ان کے پاس ایک پیڑھے پر جا بیٹھا۔ رحماں نے دودھ بلو لیا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے ایک کٹورے میں لسی ڈال کر مجھے دے دی۔ میں ٹھنڈی لسی پی رہا تھا کہ ساول بھی وہیں آ گیا۔ تبھی ساوری نے کہا۔

"یہ روٹی اور لسی لے جا، وہ چھوٹو رام کو دے آ۔"

"لے مکھن بھی لے جا۔" رحماں نے کہتے ہوئے مکھن والے برتن کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ میں خاموش رہا۔ چاہے چھوٹو رام ہمارا دشمن تھا لیکن اس وقت ہمارے پاس تھا۔ بھلے قید تھا لیکن اسے روٹی تو دینا تھی۔ وہ چنگیر لے کر باہر نکل گیا۔ میں وہیں بیٹھ کر کھانے لگا۔ دونوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ مجھے تھوڑا سا عجیب لگا تبھی میں نے صرف ان سے بات کرنے کے لئے کہا۔

"رومی کو بھی دے دو روٹی؟"

"تمہیں بڑا خیال ہے اس کا۔ جب روٹی دینا ہوگی میں دے دوں گی، تم جاؤ جہاں جانا ہے، اپنا کام کرو۔" ساوری نے لاپرواہی سے کہا تو میں ہنس دیا۔ وہ بھی لبوں میں مسکرا رہی تھی

”وہ ہے کہاں دکھائی نہیں دے رہی؟“ میں نے جان بوجھ کر پوچھا۔

”رات اس کے ساتھ تھوڑی کھینچا تانی کی گئی ہے، میں نے اسے کپڑے دیئے ہیں کہ نہا لے۔“ اس نے دھیمے سے بتایا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے تھوڑی دیر باتیں کروں لیکن وہاں رحماں بھی تھی اس لئے ناشتے کے بعد ڈیرے پر جانے کے لئے اٹھ گیا۔

ڈیرے پر خاموشی تھی۔ شاید سبھی کہیں گئے ہوئے تھے۔ چھوٹو رام ایک طرف بندھا ہوا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ خالی برتن اس کے پاس پڑے تھے۔ میں ایک چارپائی پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وقت کتنا بدل گیا تھا۔ کبھی یہاں پر مظلوم لوگ یوں بندھے ہوئے پڑے ہوتے تھے اور آج یہاں پر ظالم بندھے ہوئے تھے۔ میں جب کچھ نہ بولا تو اس نے مجھے زور سے آواز دی۔

”علی، مجھے کھول دے، جانے دے مجھے۔“

”اگر ایسا نہ کروں تو؟“ میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

”میرا قبیلہ تیرا دشمن ہو جائے گا۔ میرے دوست تجھے نہیں چھوڑیں گے۔“ اس نے مجھے باقاعدہ مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

”تم نے کہا اور میں ڈر گیا، بات ختم۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”بات اتنی نہیں علی، جانے دو۔“ اس نے پھر سرزنش والے انداز میں کہا۔

”دیکھو، اگر تیرے لوگوں میں اتنا دم ہوتا نا، تو وہ اب تک مجھ پر حملہ کر چکے ہوتے۔ اور سچ پوچھو تو...... میں تمہیں لایا ہی اسی لئے ہوں۔ وہ جو بھی ہیں میرے سامنے آجائیں۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تمہیں کس کی تلاش ہے؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

"میں اسے خود سامنے لے آؤں گا۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"دیکھو، اگر مجھے معلوم ہوا تو میں بتا دیتا ہوں۔" اس بار وہ نرم پڑتے ہوئے بولا تو

میں نے اسی لاپرواہی سے جواب دیا۔

"نہیں چھوٹو رام، اب نہیں، میں نے یہ کہہ دیا کہ تمہیں بستی والوں کے سامنے زندہ جلانا ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ ایک پہر یا دو پہر کے مہمان ہو۔ میں تم سے اب کچھ نہیں پوچھوں گا۔"

میں نے کہا اور اٹھ کر گیٹ کی طرف جانے لگا۔ ابھی میں گیٹ تک نہیں پہنچا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ سکرین پر اجنبی نمبر تھے۔ میں نے کال رسیو کی تو دوسری طرف سے منمناتی ہوئی مردانہ آواز ابھری، جس میں بے تکلفی سے زیادہ سختی تھی۔

"علی میاں بات کرت ہو؟"

"ہاں تو۔" میں نے مختصراً کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"ہم بات کریں ہیں، رما کانت بیوپاری۔"

"ہاں تو بولو۔ کون رما کانت بیوپاری؟" میں نے سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر پوچھا تو وہ کافی حد تک نرم لہجے میں بولا۔

"رات تم نے ہمارے لڑکے اور اس کے ملاجوموں کو مارا، ان کے ساتھ بہت جیاستی کی۔ تم نے لڑکی چھیننا تھی چھین لی، مال کو ڈاکو پڑ جاتے ہیں نا، کوئی بات نہیں، پر جو تو نے ان کی بے عجتی کی، وہ ٹھیک نہیں کیا تم نے۔"

"اب کیا کریں راما کانت جی، ہماری بات نہیں مانی انہوں نے۔ مان جاتے تو سکون سے بھیج دیتے، تیرے لڑکے نے کچھ زیادہ ہی بیوپاری بننے کی کوشش کی تو مار کھائی۔" میں نے بھی اسی اطمینان سے جواب دیا۔

"اب سنا ہے تم نے چھوٹو رام کو بھی پکڑا ہوا ہے۔" اس نے بات بدلتے ہوئے کہا تو میں سکون سے بولا۔

"ہاں نا، پکڑا ہوا ہے، ابھی کچھ دیر میں اسے زندہ جلا دوں گا، بس بندوبست ہو رہا ہے۔"

"ایسا نہیں کرو۔ سمجھ جاؤ۔ ہم کہتے ہیں اسے چھوڑ دو، ہم سب کچھ بھول جائیں گے۔ چھوڑ دو اسے۔" اس نے اسی نرم اور ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"تمہاری بات مان کر میں اگر اسے زندہ چھوڑ دوں گا تو وہ پھر سے لڑکیاں بیچے گا۔ اسے سزا دوں گا تو پھر کم از کم اس علاقے میں کسی میں ہمت نہیں ہوگی ایسا کام کرنے کی۔" میں نے اس کے انداز میں ٹھنڈے اور نرم لہجے میں کہا۔

"پھر تو بہت غلط ہو جائے گا۔ دیکھو ہمارا یہ بیوپار ہے اور ہم اپنے بیوپار کو ہر قیمت پر بچائیں گے۔ چھوٹو رام کو مارنے کا مطلب ہے تم نے ہماری دشمنی مول لے لی۔ تمہیں یہ بھی پتہ ہونا چاہئے کہ پہلے تو بیوپاری دشمنی لیتے نہیں اور اگر ان کے بیوپار پر بات آجائے تو دشمنی سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو کیا۔" اس نے دبے دبے غصے میں کہا۔

"تم دشمنی میں کہاں تک جاتے ہو، مجھے اس سے غرض نہیں، تم جہاں تک جانا چاہتے ہو چلو میں نہیں روکتا تمہیں۔ ہاں مگر میں اپنے علاقے میں عورتوں کا بیوپار نہیں ہونے دوں گا۔ یہ طے ہے راما کانت جی۔" میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"مطلب تم نہیں مانو گے۔" اس نے حتمی لہجے میں پوچھا۔

"میں تو مان رہا ہوں کہ عورتوں کا بیوپار اب نہیں ہوگا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا تو دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے یونہی چپ رہی پھر وہ کافی ملائم لہجے میں بولا۔

"دیکھو، میں مانتا ہوں کہ اب اس علاقے پر تمہاری اجارہ داری ہے۔ بول کیا لے گا، تاکہ

ہم اس علاقے میں بیوپار جاری رکھ سکیں۔"

"تمہاری کوئی بیٹی، یا بہو ہے تو وہ مجھے بیچ دے۔ پھر سوچوں گا۔" میں نے سخت غصے میں کہا لیکن اس وقت مجھے انتہائی حیرت ہوئی جب وہ بڑے ہی نرم لہجے میں طنزیہ انداز میں بولا

"جب تم ہماری بیٹی بہو خرید و گے تو اس مطلب تم بھی بیوپاری بن گئے ۔ آؤ پھر مل کر کرتے ہیں بیوپار، رواج کے مطابق بہو تو بکتی نہیں، بیٹی کا سودا کرو گے تو آؤ، کرتے ہیں بیوپار۔"

"بہت بے غیرت ہو یار تم۔" میں نے ہنس کر کہا تو ہنستے ہوئے بولا۔

"اگر غیرت ہوتی تو بھی بیوپار کرتے۔ اب چپ چاپ اپنی قیمت بتاؤ اور چھوٹو رام کو چھوڑ دو۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو سمجھو ہماری اور تمہاری دشمنی شروع ہو جائے گی، بتائے دے رہے ہیں۔"

"میں نے تو مارنا ہے چھوٹو رام کو، تم اگر روک سکتے ہو تو روک لو، ٹھیک گیارہ بجے۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم کرتے ہیں کچھ۔"

اس نے کال ختم کر دی۔ میں نے سیل فون جیب میں ڈال لیا۔ اس وقت تک میں گیٹ پر آ گیا تھا۔ میں نے دیکھا کچھ فاصلے پر وہ جہانگیر لوگ کھڑے تھے۔ ان کے پاس بجنادر اپنی بائیک لئے کھڑا تھا۔ شاید وہ ابھی یہاں آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سب میری طرف آنے لگے۔ چند منٹ بعد جب وہ ڈیرے پر آکر چارپائیوں پر بیٹھے تو میں نے انہیں راما کانت کے فون کے بارے میں انہیں بتایا۔

"وہ اپنے ٹھکانے پر بیٹھ کر بات کر رہا ہے نا، جب سامنے آئے گا تو دیکھا جائے گا۔"

بختاور نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیا کرنا ہے اس چھوٹو رام کا؟" جہانگیر نے پوچھا۔

"اسے ساری بستی کے سامنے زندہ جلانا ہے۔" میں نے کہا تو چھوٹو رام نے رحم طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھا، میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے بختاور سے کہا۔ "تم جاؤ نا، بستی والوں کو اکٹھا کرو۔"

"جاتا ہوں۔ اتنی جلدی کس بات کی ہے۔" وہ میری بات سنتے ہوئے بولا تو چھوٹو رام تیزی سے بولا۔

"میں مانتا ہوں میری تم لوگوں سے دشمنی رہی ہے۔ بس ایک بار معاف کر کے دیکھ لو۔ میں تم لوگوں کے بڑے کام آؤں گا۔"

تیر نشانے پر لگتا ہوا دیکھ کر بختاور نے لاپرواہی سے پوچھا۔

"مثلاً، کیا کام آئے گا تو ہمارے؟"

"میں رما کانت کے بارے میں معلومات دے سکتا ہوں اور......" اس نے کہنا چاہا تو بختاور اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"وہ جب آئے گا نا سامنے تو اس کی ساری جنم کنڈلی نکل آئے گی۔ تیری جو سزا ہے وہ تجھے مل کر رہے گی۔"

"تم لوگ اس کی پہنچ تک نہیں پہنچ سکتے بختاور۔ میں تو مر جاؤں گا، کوئی بات نہیں لیکن وہ بیوپاری ہے، ایک ایک ٹکے کا حساب رکھتا ہے، اپنا ایک ٹکہ وصول کرنے کے لئے اسے چاہے روپے نہ خرچ کرنا پڑیں، وہ کر دے گا۔ وہ خود لڑنے کبھی نہیں آئے گا، مگر سازش ضرور کرے گا، ایسی سازش جس کا تم لوگ مقابلہ نہیں کر سکتے ہو۔" چھوٹو رام نے معلومات دینے

کی کوشش کی۔

"یار وہ جو کرے گا سو کرے گا، تمہارا کام پہلے نہ کر دوں، تمہاری اوقات تو اتنی ہے تیری بستی کا کوئی تجھے لینے نہیں آیا۔ کسی نے تیرے بارے میں پوچھا تک نہیں، رما کانت کا نام لے کر تم ہمیں ڈرا رہے ہو۔" آفتاب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے میں کہا تو سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد بولا۔

"وہ لوگ ڈرے ہوئے ہوں گے تم لوگوں سے۔"

"اچھا ہے نا مزید ڈر جائیں، تیرا جیسا کوئی پیدا نہ ہوان میں۔" آفتاب نے نفرت سے کہا تو وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔

"اوئے ایک بات بتا، تم ہو یہاں کے، اسی بستی میں پیدا ہوئے۔ یہیں پلے بڑھے، لیکن تیرا پاسپورٹ بھارتی ہے، یہ کیا چکر ہے؟" مدثر نے ایک دم سے پوچھا تو اس نے مردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کئی کچھ کرتا رہا ہوں وہاں پر۔ بس اب چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اُدھر جا کر بسنا چاہتا تھا۔ کبھی دوبارہ نہ آنے کے لئے۔"

"چل ٹھیک ہے، اب یہ تیری قسمت کہ تم اب کہیں نہیں جا سکو گے، تیرا اتم سنسکار ادھر ہی ہوگا۔" جہانگیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک بات کہوں اگر آپ مان لیں تو؟" چھوٹو رام نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ جسے سن کر میں چونک گیا۔ مجھے لگا جس وجہ کے لئے میں اسے زندہ جلانے کی دھمکی دے رہا تھا، شاید اب وہی بات بتا دے۔

"بولو گے تو معلوم پڑے گا۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"دیکھو مجھے مارنا ہے تو بھلے مار دو، لیکن اگر تم لوگوں نے رما کانت کا زور دیکھنا ہے تو مجھے شام تک مت مارو، رات کو مار دینا۔تم مجبور ہو جاؤ گے مجھے نہ مارنے کے لئے، یہ تماشہ بھی دیکھ لیں۔" اس نے اسی عجیب لہجے میں کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" بختاور نے حیرت سے پوچھا۔

"بختاور، تم جانتے ہو کہ ادھر سے اُدھر کیسے آیا جاتا ہے، اس میں سو کام ہوتے ہیں، اس بارے بھی تم جانتے ہو۔ رما کانت کی رسائی بہت دور تک ہے۔ وہ بڑے کام کا بندہ ہے۔" چھوٹو رام نے کہا تو بختاور نے غصے میں کہا۔

"چل اب دھمکیاں دینا بند کر، میں نے سوچا کچھ کام کی بات کرے گا۔"

"پہلے کبھی نہیں سنا اس رما کانت بیوپاری کے بارے میں؟" میں نے بختاور سے پوچھا۔

"میں جب اُدھر تھا تو تھوڑی بہت بھنک پڑی تو تھی اس بیوپاری کی، لیکن کبھی واسطہ پڑ جائے گا، یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔" اس نے بتایا۔

چھوٹو رام پر مردنی چھا گئی ہوئی تھی۔ وہ ہمیں ڈرانا چاہتا تھا لیکن نہیں ڈرا پا رہا تھا۔ مجھے رما کانت کے بارے میں پوری معلومات نہیں تھی۔ میں چاہتا تھا کہ چھوٹو رام مجھے اس کے بارے میں بتائے لیکن وہ ہر بار طرح دے جاتا تھا۔ میں نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"چل تجھے شام تک نہیں مارتے۔ اگر کچھ نہ ہوا تو پھر تجھے مارنا ہنا ہے نا کہ نہیں؟ تم خود بتاؤ؟"

"ٹھیک ہے پھر مجھے مار دینا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" اس نے کافی حد تک حوصلہ مند ہوتے ہوئے کہا تو مجھے فکر لاحق ہوگئی۔ میں اٹھا اور رہائشی علاقے کی طرف چلا گیا۔ کمرے میں جا کر میں نے زمان سوہل کا نمبر ملایا۔ وہ جیسے میرے فون ہی کا منتظر تھا۔ فوراً کال رسیو

کرتے ہی بولا۔

”چھوٹو کو مارا نہیں ہے اب تک؟“

”ابھی تک تو نہیں مارا۔ کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہیں رما کانت نے فون کیا تھا؟“ اس نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا تو میں نے اسے بتاتے ہوئے پوچھا۔

”بات کیا ہے؟“

”اصل میں تجھے اب تک اس بندے سے واسطہ نہیں پڑا۔ یہ ہے تو راجستانی لیکن بہت عرصے سے ادھر کام کر رہا ہے۔ اب بھی اس کا کام دونوں طرف ہے۔ عورت سے لے کر منشیات تک، اغوا سے لے کر قتل تک سارے کام کرتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اب تک اس نے پلٹ کر وار کیوں نہیں کیا۔“

”جتنی میں نے اس کے بیٹے اور اس کے بندوں کی کر دی ہے، انہیں اب تک وار کر دینا چاہئے تھا۔“ میں نے حیرت سے کہا تو بولا۔

”نہیں کیا، یہی تو اصل بات ہے۔ وہ بہت شُشڈا دشمن ہے۔“

”اچھا چل جتنا بھی وہ شُشڈا دشمن ہے، وہ اپنی جگہ رہے، ابھی مجھے یہ بتا کہ تم اس سے ملے ہو کبھی؟ کہاں ہے اس کا ٹھکانہ؟ اس کے بارے میں ساری معلومات دو۔“ میں نے کہا تو وہ خوف زدہ انداز میں میری جانب دیکھنے لگا۔ وہ چند لمحے یونہی دیکھنے کے بعد بولا۔

”بات سن علی، سمجھو وہ بھڑوں کا چھتہ ہے۔ ایک بار ہاتھ ڈالو گے تو جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی۔ اس کی آر پار بہت بنی ہوئی ہے۔ اور......“ اس نے مزید کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے ڈراتے رہو گے یا بتاؤ گے؟"

"یہاں سے کوئی دس بارہ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک بستی ہے، سندر بستی، وہ بستی انہی کی ہے۔ لیکن ارد گرد کا بہت سارا علاقہ، سمجھو انہی کا ہے۔ وہیں قاتل، ڈاکو، لٹیرے اور کئی مجرم بستے ہیں۔ آج تک نہ انہوں نے کسی کو چھیڑا ہے اور نہ کسی نے انہیں۔ بس وہ جو کام کرتے ہیں کرتے چلے جا رہے ہیں۔ میرن شاہ کا ان کے ساتھ لینا دینا تھا۔ وہ ان کے ساتھ کام کرتا تھا۔" زمان سومل نے ایک سرسری سا خاکہ میرے سامنے رکھ دیا۔

"کوئی وہاں سے سورس مل سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ممکن ہی نہیں، اب تک یہی تو ان کی کامیابی ہے، وہاں کوئی غدار نہیں رہ سکتا، جس پر شک بھی ہوا، وہ اسے مار دیتے ہیں۔" اس نے تیزی سے بتایا۔ میں کچھ دیر تک مزید اس سے باتیں کرتا رہا پھر فون بند کر دیا۔

ایک دم بے چینی سے میرے اندر ہلچل ہونے لگی تھی۔ ایسا کوئی رما کانت کے بارے میں معلومات لینے سے نہیں ہوا تھا کہ وہ کتنا طاقتور ہے بلکہ مجھے افسوس یہ ہونے لگا تھا کہ رات میں نے اس کے بیٹے کو چھوڑ کیوں دیا۔ میں انہیں بے ضرر سا بیوپاری سمجھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک ریکٹ ہے۔ اب جو کچھ تھا، مجھے اسے ختم کرنا تھا۔

☆......☆......☆

شام کے سائے پھیل گئے تھے۔ میں کوپے پر کھڑا سورج غروب ہونے کا نظارہ کر رہا تھا۔ میں نے دوپہر کے وقت چاچا سائیں سے پوری مشاورت کی تھی۔ ان سے بات کر کے مجھے کافی کچھ ایسا سننے کو ملا تھا جس سے میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔ چاچا سائیں نے مجھے کہا تھا۔

"پتر، دنیا کے جس خطے پر بھی انسان آباد ہے نا، وہاں اگر محبت ہے بھائی چارہ ہے،

سکون ہے تو وہیں پر قتل و غارت گری بھی ہے۔ نفرت اور دشمنی بھی اسی طرح موجود ہے۔ کیونکہ یہ سب انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے۔ جہاں سوچ پختہ ہو، جہاں انسان کسی دوسرے کی زندگی میں دخل نہ دیں لالچ نہ کریں تو وہ خطہ پھر بھی رہنے کے قابل ہوتا ہے۔"

"لیکن میں رما کانت کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" میں نے کہا

"وہی نا، ہم یہاں نجانے کب سے رہ رہے ہیں، ہمارے آباؤ اجداد بھی یہاں آ کر بسے تھے، ہماری طرح دوسرے لوگ بھی آئے، کبھی کسی میں بھائی چارہ رہا، تو کبھی دشمنی، کوئی کیا چلا، کوئی یہیں ہے اور نئے لوگ بھی آ کر آباد ہو سکتے ہیں، یہ سلسلہ چلتا رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ رما کانت کے آباؤ اجداد بھی یہیں ہیں، ان کا بیوپار نجانے کب سے پار راجستھان کے ساتھ ہے۔ وقت کے ساتھ اگر مشکلیں بڑھی ہیں تو آسانیاں بھی تلاش کر لی گئی۔"

"لیکن یہ بیوپار، کس قدر گھناؤنا ہے؟" میں نے نفرت سے کہا۔

"میرا تو خیر نہیں لیکن میرے بڑوں کا اسی پر اختلاف رہا ہے۔ ہم نے انہیں اسی لئے قریب نہیں آنے دیا۔ سچی بات ہے، ہمیں ڈر بھی تھا۔ سب سے بڑا ڈر تو میرن شاہ اور ہیروزاں کی دشمنی تھی۔" چاچا سائیں نے دھیمے لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا کہ ان کی کمزوریاں کیا ہیں، میں اسے کیسے ختم کر پاؤں گا، لیکن مجھے ختم کرنا ہے انہیں، بتائیں کیا کروں؟"

"میں تمہیں بتاتا ہوں، سکون سے سنو۔" چاچا سائیں نے کہا اور پھر پوری تفصیل سے مجھے رما کانت اور اس کے قبیلے کے بارے میں بتاتا رہا۔ ان کے کام کرنے کا سٹائل کیا تھا، کن قبیلوں سے ان کا تعلق ہے، کن سے بیوپار ہے اور وہ کیا اور کیسے کرتے ہیں۔ میں کیا کر سکتا تھا

اور کیا کچھ ممکن تھا، سب پر تفصیل سے بات ہوئی تھی پھر میں نے سوچ لیا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔
جہانگیر، مدثر اور آفتاب کے ساتھ بختاور بالکل تیار تھا۔ شعیب کو میں نے پیچھے ڈیرے پر سیکورٹی کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس پر اعتماد تھا۔ میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر پلٹ کر چارپائیوں کے پاس آ گیا۔ چھوٹو رام کو میں ساتھ اٹھا کر لایا تھا۔ میں اس کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بڑے سرد سے لہجے میں پوچھا۔
"دیکھ بھئی چھوٹو، ہم نے تمہاری بات مان لی، تمہیں دوپہر تک نہیں مارا، شام ڈھلنے کو ہے، اب بتا تیرے ساتھ کیا کریں۔"
"جو مرضی کر لیں، اب مجھے پتہ چل گیا کوئی میرے لئے نہیں آئے گا۔" اس نے بے بسی سے کہا۔
"ایک رسک ہے، اس سے تم بچ بھی سکتے ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو زندگی کی رمق پا کر اس نے فوراً پوچھا۔
"کیا کرنا ہوگا مجھے؟"
"ہمیں ان کے ٹھکانے تک لے چل۔" میں نے آفر دی۔
"میں لے تو جاؤں مگر وہاں سے بچ کر آنا مشکل ہے۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا تو میں سرد لہجے میں بولا۔
"تو بتا دے بس آگے ہماری......" لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ مدثر نے تیز لہجے میں ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"او ئے علی وہ دیکھ......"
میں نے اس کے اشارہ کرنے والی سمت دیکھا تو ایک غبار اٹھ رہا تھا۔ چار پانچ گاڑیاں

بھاگتی چلی آ رہی تھی۔ اگرچہ ڈوبتے ہوئے سورج میں وہ سارا منظر صاف نہیں تھا لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ جو کوئی بھی ہیں، وہ اچھے تیور نہیں رکھتے۔ گاڑیاں بھاگتی ہوئی اسی انداز میں آ رہی تھیں۔

”شعیب کو بتادے۔“ میں نے تیزی سے کہا تو وہ بولا۔

”ٹھیک ہے۔“

ہم سب پچھل کران کی کماٹ میں بیٹھ گئے۔ ہم اگر خود کو پوری طرح چھپا بھی لیتے لیکن ہماری گاڑیاں کوپے کے باہر ہی کھڑی تھیں جہاں کچا راستہ تھا۔ ایک لمحے میں اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں کوئی ہے۔ وہی ہوا، وہ ساری گاڑیاں بالکل کوپے کے سامنے آن رکی تھیں۔ وہ گاڑیاں کچھ دیر تک ویسے ہی کھڑی رہیں، ان میں سے کوئی نہیں اترا۔ مجھے یقین ہونا چاہئے تھا کہ وہ کون ہیں، ہو سکتا ہے وہ رما کانت کے لوگ نہ ہوں؟ میں اس وقت اوٹ میں کھڑا ایک جھری میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے چھوٹو رام کو اشارہ کرتے ہوئے دھیمے سے کہا۔

”چل جا انہیں دیکھ، کون ہیں۔“

میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر چھوٹو رام ان کے ساتھ جا کر مل بھی گیا تو کون سا پہلے کم لوگ تھے، ایک یہ بھی سہی۔ لیکن یہ یقین ہو جانا تھا کہ وہ رما کانت کے لوگ ہیں۔ چھوٹو رام آہستہ قدموں سے چلتا ہوا کوپے کے تھڑے سے نیچے اترا اور پھر گاڑیوں تک چلا گیا۔ وہ جس جیپ کے پاس پہنچا، اس کا شیشہ اترا تو اس میں بیٹھا ہوا شخص مجھے دکھائی نہیں دیا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ چھوٹو سے اس کی جو بھی بات ہوئی لیکن اس کا ردعمل بڑا سخت نکلا۔ چھوٹو کے بات کرنے کے ساتھ ہی گاڑی کا سن روف کھلا اور کوپے کی طرف گولیوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ ایک زبردست برسٹ نے طبل جنگ بجا دیا تھا۔ فائرنگ کی آواز سے سناٹا وحشت ناک بن گیا

تھا۔فوراً ہی پچھلی جیپ سے ایسی ہی فائرنگ ہونے لگی۔چھوٹو رام ان کے ساتھ جیپ میں جا بیٹھا تھا۔ایسا ہونا ہی تھا۔مجھے یہ پوری طرح یقین تھا کہ گوپے پر صرف میں ہوں باقی چاروں وہاں نہیں تھے۔اگر انہوں نے فوراً ہی اسلحے کی نمائش کر دی تھی تو ہمارے پاس کون سا کم تھا۔ میں پوری تیاری سے گیا تھا کہ مجھے رما کانت کی سندر بستی میں جانا تھا۔لیکن وہ خود ہی چل کر آ گئے تھے۔میں نے فون نکالا اور جہانگیر کو فون کیا۔

"ہاں کیا صورت حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس ایک آدھ منٹ گوپے کی طرف متوجہ رکھو انہیں، باقی میں سنبھال لوں گا۔" اس نے تیزی سے کہا تو میں نے پوچھا۔

"تم دیکھ رہے ہو کتنی گاڑیاں ہیں؟"

"چار ہیں۔" اس نے کہا اور پھر جواب نہیں دیا۔لیکن مجھے آوازیں آ رہی تھیں۔میں نے فون جیب میں ڈال لیا اور ایک دم سے برسٹ مارا اور اگلے ہی لمحے اپنی جگہ بدل لی۔پھر وہاں سے برسٹ مارا، پھر جگہ بدل لی۔اس کے ساتھ ہی جو فائرنگ ہوئی، وہ ماحول کو دہلا دینے والی تھی۔بیک وقت چار پانچ گنوں سے فائر ہونے لگا تھا۔مجھے منٹوں کا نہیں لمحوں کا انتظار تھا اور پھر ویسا ہی ہوا۔اچانک یکے بعد دیگرے چار زوردار دھماکے ہوئے۔اس کے ساتھ ہی چیخیں بلند ہوئیں۔میں نے واپس اسی جگہ پر آ کر دیکھا گاڑیاں آگ میں جل رہی تھیں۔ان میں سے لوگ تیزی سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔میں نے گن کی نال اس جھری میں رکھی اور فائر کر دیا۔اس کے ساتھ ہی چاروں جانب سے فائر ہونے لگا۔مدثر کا دیا ہوا پلان کامیاب ہو گیا تھا۔

دوپہر کے وقت جب ہم پلان کر رہے تھے، مدثر ہی نے ایک آپشن دیا تھا کہ اگر گوپے پر

اچانک ہمیں دبوچ لیا جائے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ تبھی جہانگیر نے جواب دیا تھا کہ پھر کوپے پر کوئی نہ رہے۔ کوپے سے باہر آ کر فائرنگ کرے یا پھر ہینڈ گرنیڈ سے فوراً ہی ان کی گاڑی تباہ کی جائے۔ اس وقت اور دوسری باتوں کے ساتھ یہ بڑی بے ضرری بات لگی تھی لیکن مدثر نے پوری تفصیل سے پلان دیا تھا کہ اگر ایسی کوئی صورت حال بن جائے تو ہمیں کیا کرنا ہوگا، وہی پلان کام آیا۔ جہانگیر سمجھ گیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ جیسے ہی یہ یقین ہو گیا کہ حملہ آور نے فائرنگ کر کے طبلِ جنگ بجا دیا ہے تو وہ تینوں کوپے سے ہٹ گئے۔ وہ کوپے کے پیچھے سے بھاگتے ہوئے پیچھے گئے، پھر کوپے اور بھی سڑک کے پار چلے گئے۔ وہاں اندھیرے میں آگے بڑھے۔ انہوں نے بھی سڑک پر کھڑی گاڑیوں تک ہینڈ گرنیڈ پھینک دیئے۔ جیسے ہی وہ گرنیڈ پھٹے انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ ایک دو منٹ میں وہاں کا ماحول یکسر بدل کر رہ گیا تھا۔

اب وہ کوپے کی طرف رخ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کرتے بھی تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف وہ چاروں تھے۔ وہ بلاوجہ فائرنگ کر کے اپنے رخ کی نشاندہی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہاں سے بھاگ کر کئی لوگ چھپنے کی کوشش کرتے۔ جو کچھ کرنا تھا تیزی سے کرنا تھا۔ فون ابھی تک چل رہا تھا۔ میں نے دو تین بار جہانگیر کو آواز دی تو اس نے کہا۔

''کافی حد تک ان کا نقصان ہو گیا ہے، لوگ بھاگ رہے ہیں۔''

''مگر کسی کو جانے نہیں دینا، یہ بعد میں خطرناک ثابت ہوں گے۔'' میں نے تیزی سے کہا تو وہ بولا۔

''فائرنگ کرتا ہوں تو ہمارے بارے پتہ چل جائے گا۔''

''اچھا میں انہیں انگیج کرتا ہوں، جو فائر کرے اسے اُڑا دو۔'' میں نے کہا اور سامنے کی

طرف دیکھا۔ میں نے فائر کیا، پھر دوسرا کیا۔ سامنے سے کسی نے جوابی فائر نہیں کیا۔ میں نے برسٹ مارنا چاہا لیکن میگزین خالی ہو چکا تھا۔ میں اس وقت میگزین لگا رہا تھا، جب سامنے سے فائرنگ ہوئی۔ میں جوابی وار کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ میں وہاں سے جگہ بدل کر کوپے کے تھڑے پر آ گیا۔ وہاں سے دائیں جانب دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ میرے سامنے سارا منظر واضح تھا۔ دو لوگ کوپے کی پچھلی جانب بڑھ رہے تھے۔ یہ بہت خطرناک بات تھی، میں نے انہیں نشانے پر رکھا اور برسٹ مار دیا، وہ چیختے ہوئے وہیں ڈھیر ہو گئے۔ چند لمحے ٹھہر کر میں نے ایک ہینڈ گرینڈ نکالا، اس کی پن کھینچی اور گاڑیوں کی جانب اچھال دیا، گرتے ہی چند لمحے بعد ایک دھماکہ ہوا۔ لمحے سے بھی کم وقت میں روشنی ہوئی، اس میں کئی لوگ بے بس پڑے ہوئے تھے۔ ان کا کافی حد تک نقصان ہو چکا تھا۔ تبھی میں نے زوردار انداز میں کہا۔

"صرف دو منٹ ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے جگہ بدل دی۔ مجھے اندازہ تھا کہ فائر ہوگا، لیکن نہیں ہوا۔ تبھی میں نے کہا۔" اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کوپے سے باہر آ جاؤ۔ ورنہ کوئی نہیں بچے گا۔" اس کے ساتھ ہی میں نے جگہ چھوڑ دی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ فوراً ہی ایک برسٹ پڑا۔ اس کا مطلب تھا وہ ہار ماننے والے نہیں تھے اور آخر دم تک لڑنے والے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ جہانگیر لوگ بھی بھجے ہوں گے، سامنے اندھیرا تھا۔ کسی پر نشانہ تو لگا نہیں سکتے تھے، ایسے ہی اندھا دھند وار کرنا تھا۔ جونہی میں نے برسٹ مارا، کئی اطراف سے بھی برسٹ آئے۔ یہ سب میری طرف نہیں تھے۔ بلاشبہ یہ جہانگیر لوگوں نے مارے تھے۔ انہی لمحات میں میرا فون بج اٹھا۔ وہ شعیب کا تھا، جیسے ہی میں نے رسیو کیا وہ بولا۔

"فون کہاں اٹکیج تھا؟"

"چھوڑو، یہاں......" میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”ہاں مجھے مدثر نے بتایا، میں پہنچ رہا ہوں بس دو چار منٹ میں، تم انہیں سنبھالے رہو۔“
اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اگلے چند منٹ میں ہمارے درمیان دو بار فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا پھر ایک دم سے روشنی ہو گئی۔ بالکل کوپے کے قریب پہنچ کر شعیب نے گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس روشن کی تھیں۔ حملہ آوروں کی چاروں جیپیں بری حالت میں مجھے دکھائی دے رہی تھیں۔ شعیب نے اپنی گاڑیاں بالکل ان کے قریب لا کر کھڑی کی تھیں۔ یوں جیسے انہیں گھیر لیا گیا ہو۔ سامنے کافی روشنی تھی۔ تبھی شعیب کی آواز گونجی۔

”کوئی فائر نہ کرے، ورنہ مارے جاؤ گے۔“ آواز کی بازگشت میں کچھ بھی نہ ہوا تو وہ پھر بولا، ”اپنے سر پہ ہاتھ رکھ کر باہر نکل آؤ، کچھ نہیں کہیں گے۔“

چند لمحوں بعد ایک شخص سر پہ ہاتھ رکھے کچے راستے کے کنارے پر آ کھڑا ہوا۔ پھر ایک کے بعد ایک کر کے تین لوگ باہر آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی زخمیوں کی آہ وبکا ابھرنے لگی۔ ان میں سے کچھ زخمی بھی باہر آ گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہاں کی صورت حال سامنے آ گئی۔ وہ کل اٹھارہ لوگ آئے تھے، ان میں سے پانچ بالکل ٹھیک تھے۔ سات زخمی تھے اور باقی چھ مر چکے تھے۔

”ان ساتوں کو باندھو اور ہسپتال لے جاؤ، اگر کوئی بچ گیا تو بچ جائے۔“ میں نے بستی کے ایک شخص الدین سے کہا۔

”ہسپتال یہاں سے دس بارہ میل دور ہے سائیں۔“ اس نے تیزی سے کہا تو میں نے سختی سے کہا۔

”اگر کوئی بچ جائے تو ٹھیک، اور اگر کوئی ان میں سے مر جائے تب بھی وہیں پھینک دینا۔“

وہ زخمیوں کی جانب بڑھا ہی تھا کہ ایک شخص بولا۔

”ہمارے زخمی ہمیں دے دو۔ ہم واپس لے جائیں گے۔“

”تمہیں جانے کون دے گا؟“ میں نے سرد لہجے میں کہا، پھر اپنے لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا، ”انہیں باندھو اور لے آؤ ڈیرے پر۔“

”اوئے وہ چھوٹو رام کدھر ہے؟“ جہانگیر نے تجسس سے پوچھا۔

”وہ مر گیا ہے، وہ دیکھو پڑا۔“ DT آب نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔اس کے منہ سمیت آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔

وہ پانچوں میرے سامنے کھڑے تھے۔ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن ان کی گردن اب بھی اکڑی ہوئی تھی۔

”مجھے معلوم ہے کہ کس نے تم لوگوں کو یہاں بھیجا ہے، لیکن پھر بھی تم لوگوں کے منہ سے سننا چاہتا ہوں، بولو، کس نے بھیجا ہے۔“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا تو ان میں سے ایک نے کہا۔

”رما کانت جی۔“

”بالکل درست، لیکن کس لئے؟“ میں نے پوچھا

”تم میں جو علی ہے، یا اس کے جو دوست ہیں یہاں......انہیں مارنے آئے ہیں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا جو مجھے اچھا لگا۔

”تو پھر نہیں مرے نا، اب کیا کرو گے۔“ میں نے یونہی پوچھا۔

”جو تمہارا من چاہے۔ مجھے لگتا ہے علی تم ہی ہو۔“ اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں ہی ہوں۔ مجھے تمہارا جواب دینا اچھا لگا۔“ یہ کہہ کر میں نے ایک دم سے پوچھا، ”کیا رما کانت نے یہ سمجھا کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے یونہی بیٹھے ہوں گے۔ تم لوگ آؤ

کے اور مجھے مار کر چلے جاؤ گے؟"

"آج تک اس روحی میں ہمارے سامنے کوئی سر نہیں اٹھا سکا۔ ہم کسی پروا نہیں کرتے، لیکن جو ہمارے راستے میں آتا ہے، پھر وہ بچتا نہیں۔" اس نے اپنی آواز میں اعتماد رکھتے ہوئے کہا۔

"میں ہمت والے لوگوں کی قدر کرتا ہوں، مجھے تم لوگوں کے کسی بھی دھندے سے کوئی لینا دینا نہیں، بس یہ عورتوں والا دھندہ...... یہ نہیں۔ رما کانت مان جاتا تو شاید ہم اسے معاف کر دیتے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وہ دھندہ تو ہم کریں گے، ہمیں کوئی نہیں روک سکتا، اس کی چنتا مت کرو، ہاں اگر تم ہمت والوں کی قدر کرتے ہو تو ایک بات کہوں؟" اس نے اعتماد سے کہا۔

"بولو کیا کہنا چاہتے ہو۔" میں نے پوچھا۔

"علی، گن سے تو کوئی بھی فائر کر سکتا ہے۔ جو پہلے وار کر گیا، وہی جیت گیا۔ ہمت تو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر دکھائی جاتی ہے، آؤ میرے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالو، میں ہار گیا تو مجھے فوراً مار دینا، جیت گیا تو مجھے اپنے ساتھیوں سمیت جانے دینا۔" اس نے بڑے ہی اعتماد سے کہا۔

یہ ایک بڑا چیلنج تھا۔

"تیرا یہ شوق بھی پورا کر دیتا ہوں۔" میں نے گن ایک طرف رکھتے ہوئے کہا تو شعیب تیزی سے بولا۔

"علی یہ وقت نہیں ایسے تماشے دکھانے کا، ابھی یہ تو......"

"نہیں مجھے اس کی بات تو اب رکھنی ہے، کوئی ہمارے قریب نہیں آئے گا، بھلے یہ مجھے مار دے۔" میں نے کہا اور اٹھ کر اس کے سامنے آ گیا۔

اس کے ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ مجھے اس لمحے کا انتظار تھا جب وہ پینترا لیتا۔ یہیں مجھے سمجھنا تھا کہ وہ لڑنے میں ماہر ہے یا نہیں، اگر لڑنے میں ماہر ہے تو کس طرح کی فائٹ میں مہارت رکھتا ہے، وہ دیسی انداز میں شہ زوری دکھانے والا تھا یا وہ کوئی جوڈو کراٹے یا گنگ فو یا کوئی اور...... وہ میری نگاہوں میں تھا۔ اچانک اس نے لڑنے کے لئے پینترا بدلا، اس نے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو جس طرح جنبش دی، میں سمجھ گیا، اس کا انداز فری اسٹائل کشتی والا تھا۔ میں لمحے کے ہزارویں حصے میں سمجھ گیا کہ اسے خود پر ناز کیوں تھا۔ یہاں دور دور تک کوئی اس کے مقابلے کا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی عقابی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالے مجھ پر جھپٹنے کے لئے تیار تھا۔ اچانک وہ ایک قدم آگے بڑھا اور اس نے اپنی کلائی سے میری گردن پر وار کیا۔ ظاہر ہے اس کے لئے اسے تھوڑا سا جھکنا پڑا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور نیچے سے گردن نکالی۔ تبھی اس نے اپنی کلائی چھڑوانا چاہی۔ لیکن اب وہ کلائی میرے ہاتھ میں آچکی تھی۔ دیسی کشتی والے اپنے اکیس داؤ میں ایک داؤ یہی سیکھتے ہیں کہ کلائی پکڑ کر کیا کرنا ہوتا ہے۔ فن پہلوانی میں مد مقابل کا رویہ ہی ہار جیت کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کی کلائی جیسے ہی میرے ہاتھ میں آئی تو اس کے بدن نے لاشعوری طور پر وہی جنبش لی جو وہ چاہتا تھا۔ وہ مجھے اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا۔ اس نے کلائی پکڑ کر پیچھے کی طرف زور لگایا، یہ طاقت آزمائی تھی۔ میں نے اس کی کلائی چھوڑتے ہوئے اسے دھکا بھی دے دیا۔ اس کے پاؤں اکھڑ گئے، وہ لڑکھڑا گیا۔ میں چاہتا تو اسے یہیں زمین بوس کر دیتا، لیکن میں اس کی چاہت پوری کرنا چاہتا تھا۔

وہ دوبارہ میرے سامنے تن کر کھڑا ہوا تھا۔ لیکن اس کی جنبش بدن (باڈی لینگویج) بتا رہی تھی کہ وہ حیرت زدہ ہے۔ اس نے جو سوچا ہے، ویسا نہیں تھا۔ اس کی سوچ میں دراڑ پڑ گئی

تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں بھی لڑنے بھڑنے کے فن میں مہارت رکھتا ہوں۔ اب میں اسے زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا۔ میں اسے بڑھ کر وار کرنے کا موقع دے رہا تھا لیکن وہ ہچکچا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسی کا داؤ استعمال کیا۔ میں نے اس کی گردن پر ہاتھ مارا، میں جانتا تھا کہ اس کے ردعمل میں اس نے کیا کرنا ہے۔ اس نے وہی کیا، اپنی گردن کو جھٹکا دیا، یہی جھٹکا اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا، وہ اپنے سر سے پیروں تک لڑکھڑا گیا۔ اس نے گھبرا کر ایک گھونسہ میرے منہ پر مارا، جو میرے جبڑے کے نیچے لگا۔ میں نے پوری قوت سے کہنی اس کے سینے پر ماری، ایک آہ کی آواز نکلی، اسی لمحے میں نے کھڑی ہتھیلی کے وار اس کے دونوں کانوں پر کئے، وہ چکرا گیا۔ اب میں اسے 'دھوبی پٹکا مار دیتا' یا 'بغلی'، وہ میرے ہدف پر آ چکا تھا، میں نے اس کی کلائی پکڑی اور اسے بغلی مار دی۔ وہ پکے فرش پر پھسلتا چلا گیا۔ اس کے گرتے ہی میں نے ایک ٹھوکر اس کی پسلیوں میں ماری۔ اس کے حلق سے چیخ نما آواز نکلی، دوسری ٹھوکر پر وہ زمین بوس ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ اس نے یہ مزید مار کھانے سے بچنے کے لئے کیا تھا، حالانکہ ابھی اس میں دم تھا۔ وہ اٹھ کر لڑ سکتا تھا۔ وہ کس داؤ پر تھا، میں یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اسے سمجھنے کے لئے میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

''کیا تم اب مرنے کو تیار ہو؟''

یہ سنتے ہی جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اس نے جھرجھری لی اور اٹھ کر میرے مقابل آتے ہی وحشیانہ انداز میں حملہ کیا۔ حریف جب اپنے حواس کھو دے تو اسے قابو میں کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ میں نے اس کے وحشیانہ انداز کو سنبھال لیا۔ اس نے میرے سر پر کہنی مارنے کی کوشش کی، جسے میں بچا گیا۔ اس نے گھوم کر ایک کک میرے سینے پر مارنا چاہی میں اسے بھی بچا گیا، پھر اس نے ایک گھونسہ میرے منہ پر مارنا چاہا، میں اسے بھی بچا گیا تو پے در پے ناکامی کے

بعد ایک لمحے کے لئے وہ پاگل ہو گیا۔اس نے سارے داؤ اور مہارت ایک طرف رکھی اور مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ بلاشبہ وہ ایک طاقتور نوجوان تھا۔اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میری گردن کو پکڑ لیا تھا، مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا، میں نے ایک دم سے خود کو ڈھیلا چھوڑا اور پوری قوت سے اس کے ماتھے پر گھونسہ مارا، اس کے ہاتھ ذرا سے ڈھیلے ہوئے، جسے میں نے چھڑا لیا۔ پھر میں نے اسے گھونسوں پر رکھ لیا۔اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔اسی دوران میں نے اس کی پنڈلی پر کک ماری تو وہ لڑکھڑا گیا، میں نے اس کے کاندھے پر مارا تو وہ گر گیا، میں اس کی چھاتی پر بیٹھ گیا۔اگلے چند لمحوں بعد وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

میں اٹھا اور میں نے باقی سب کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”تم میں سے کسی کو شوق ہے تو آ جائے؟“

میرے یوں کہنے پر کوئی بھی نہیں بولا۔ یہ تو واضح تھا کہ حملہ آور کون تھے، اس نوجوان نے مجھے بتا بھی دیا تھا لیکن میں نے پھر بھی اتمام حجت کے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کون لوگ ہو تم اور کیوں حملہ کیا؟“

میری بات کا جواب دینے کی بجائے وہ خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے اپنا سوال پھر دہرایا تو ان میں سے ایک بولا۔

”ہمیں رما کانت جی نے بھیجا تھا، چھوٹو رام کو چھڑوانے کے لئے۔“

اچھا چل لگا فون اپنے رما کانت کو اور بتا تم لوگوں کے ساتھ کیا ہوا۔“ میں نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحے ہچکچاتے رہے پھر ایک نے اپنی جیب سے فون نکالا اور نمبر پش کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد کال مل گئی تو وہ بتانے لگا کہ کیا ہوا۔ باتوں سے اندازہ ہو گیا کہ دوسری جانب رما کانت ہے۔ جب وہ بتا چکا تو فون میں نے پکڑ لیا۔

”ہاں تو رما کانت، صرف چھوٹو رام کو چھڑوانے بھیجا تھا ان بے چاروں کو یا...... اپنے بیٹے کی بے عزتی کا بدلہ لینے بھی بھیجا تھا؟“

”جو مرضی سمجھ لے بابو...... پر اب تیری موت تو میرے ہاتھوں لکھ دی گئی ہے۔ چھوڑوں گا نہیں تجھے۔“

”تو پھر دیر کس بات کی ہے،...... میں ابھی یہاں ہوں،...... آجا......، اپنی لاشیں بھی اٹھا کر لے جا...... تیرے کچھ بندے ابھی زندہ ہیں...... انہیں لے جا...... زخمی تو میں نے...... ہسپتال بھیج دیئے ہیں۔“ میں نے اسے چڑانے کے لئے ٹھہر ٹھہر کر کہا تو وہ دھیمے سے لہجے میں بولا۔

”تو نہیں جانتا میرا انتقام کتنا بھیانک ہے۔ تو نے جو کرنا ہے کر لیا بابو۔“

”مزا تو تب آتا نا، اگر تم اپنے اسی بیٹے کو بھیجتے جو یہاں سے ذلیل ہو کر گیا تھا۔ ان بے چاروں کو بھیج دیا مرنے کے لئے۔“ میں نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہا تاکہ میرے سامنے کھڑے بندے سن لیں۔

”تم نے جو بھی ان کے ساتھ کرنا ہے کر، لیکن بھولنا مت، دتی شہر پر اتنا مت اچھل، کچل کر رکھ دوں گا۔“ رما کانت غصے سے اکھڑ گیا۔

”چل اب تیرے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے، اب میں تیرا انتظار کروں گا، کب تم مجھے کچلتے ہو۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

شاید رما کانت نے میرے بارے میں اندازہ غلط لگایا تھا یا پھر اسے اپنی طاقت پر اتنا ناز تھا۔ جو بھی تھا، کہیں نہ کہیں کچھ ایسا تھا جس کی مجھے یا انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ زمین پر پڑا ہوا پہلوان اچانک اٹھا اور مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ میں لاشعوری طور پر اپنا پہلو بچا گیا۔ وہ مجھے چھوتے ہوئے دوسری طرف جا گرا۔ تب میں بھی اسے بچا نہیں پایا۔ ایک

دم سے کئی فائر ہوئے اور اس کے بدن کو چھید کر رکھ دیا۔ وہ وہیں پڑا تڑپنے لگا۔ ایک لمحے پہلے زندہ انسان سامنے پڑا تڑپ رہا ہوں اور لمحہ بہ لمحہ موت کی وادی میں اُتر رہا ہوں، اسے دیکھنے کے لیے بھی جگرا چاہیے ہوتا ہے۔

کوپے کے تھڑے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پہلوان تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میرے سامنے اب چار جوان کھڑے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے شدت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"اب تم لوگوں کے ساتھ کیا کیا جائے؟"

"جو تم چاہو۔" ان میں سے ایک نے کہا تو میں نے جہانگیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

"تم بولو، کیا کہتے ہو؟"

"میرا تو یہ خیال ہے، ان چاروں کو اپنی گاڑی دو، یہ اپنے لوگوں کی لاشیں اٹھا کر واپس چلے جائیں۔ ان کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔"

"ٹھیک کہا ہے، جانے دو۔" ایک دم سے مدثر نے اس کی تائید کر دی۔

"ٹھیک ہے پھر جانے دو۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور تھوڑی دور پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ انہوں نے ایسا فیصلہ کیوں کیا۔ اب میرے ساتھیوں نے یہ کہہ دیا تھا، سو کہہ دیا تھا۔ اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہ اپنی لاشیں نکال چکے تھے۔ انہوں نے ہماری ایک فور وہیل میں ان لاشوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھا اور پھر چاروں اس میں گھسے اور چل دیئے۔

"تم نے ایسا فیصلہ کیوں کیا؟" شعیب نے جہانگیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ بڑے سکون سے بولا۔

"اس لئے کہ ہم نے آج رات ہی رما کانت کو اٹھانا ہے۔"

"آج رات، تیرا دماغ......" بختاور نے کہنا چاہا مگر کہتے ہوئے رک گیا، پھر جیسے ہی اس کے لفظوں پر غور کیا وہ حیرت سے بولا، "یہ تم نے کیسے سوچا؟"

"اس لئے میری جان، ہمیں کسی نے کچھ سکھایا ہے۔" جہانگیر نے پورے اعتماد سے کہا تو مجھے اپنے اساتذہ پر بہت پیار آیا، ان کا سکھایا ہوا آج ہمارا مان اور بھرپور حوصلہ تھا۔ اس لئے وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا "وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم ان پر ایسے وقت میں حملہ کر دیں جب انہوں نے اپنی لاشوں کو بھی ٹھکانے نہیں لگایا، ان میں غم و غصہ بھی ہے، لیکن ان کے یہ لاشعور میں بھی نہیں ہوگا کہ ہم آج ہی ان پر چڑھ دوڑیں گے۔"

"جو گاڑی دی گئی ہے، اس میں ٹریکنگ ہے۔" مدثر نے کہا تو سب نے اس کی طرف دیکھا۔ تب میں فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"چلو پھر تیاری کرو۔"

میرے کہتے ہی سب نے تائید کی اور جہانگیر بستی میں فون کرنے لگا تاکہ کچھ گاڑیاں منگوانے کے ساتھ دوسری تیاری بھی کی جا سکے۔

☆......☆......☆

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ ہم سندر بستی سے تقریباً ایک کلو میٹر دور آ کر رک چکے تھے۔ ہمارے پاس تین گاڑیاں تھیں اور تقریباً پندرہ کے قریب لوگ تھے۔ سب گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹس بند تھیں۔ صحرا کا سناٹا تھا، ہم ایک دوسرے کو ہیولوں کی مانند دیکھ رہے تھے۔ ہم بھی ایک دائرے کی صورت کھڑے تھے۔

"دیکھو ہمارا مقصد، وہاں پر کوئی قتل و غارت کرنا نہیں ہے۔ نہ ہی ہم نے ان سے کوئی

بدلہ لینا ہے۔وہ ہم لے چکے ہیں۔پھر آپ کا یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ہم یہاں پر کیوں آئے؟"
میں نے کہا اور لمحہ بھر کے لئے سانس لیا، کسی نے کوئی بات نہیں کی تو میں کہتا چلا گیا،" ہمارا مقصد انہیں عورتوں کے بیوپار سے روکنا ہے۔مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ پوری روہی میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا بیوپار نہیں کرتا اور روہی میں سے خریدی گئی کچھ عورتیں اب بھی ان کے پاس ہیں جنہیں ہم نے چھڑوانا ہے۔ہمیں اس بستی پر حملہ کے لئے زیادہ لوگ نہیں چاہئیں۔
میں اور مدثر ہوں گے، بختاور اور شعیب الگ جائیں گے۔باقی سب ہمارے کور پر ہوں گے۔
آفتاب اور جہانگیر باقی سب لوگوں کو دیکھیں گے، وہ جو کہیں انہیں ماننا ہوگا۔"
"ہم نے پھر کرنا کیا ہے؟" اُن میں سے ایک نے پوچھا۔
"کہا نا صرف کور دینا ہے۔ہم نے بستی میں جا کر ان عورتوں کو ان کی قید سے چھڑوانا ہے، جو اب بھی ان کے پاس ہیں۔مجھے پتہ چلا ہے وہ کوئی آٹھ یا دس ہیں، جنہیں وہ پار لے کر جانا چاہتے ہیں۔ایک گروپ انہیں تلاش کرے گا اور واپس لائے گا۔دوسرا وہاں سے رما کانت کو اٹھانا۔اس راہ میں جو بھی آئے اسے مار دینا ہے، جو نہ آئے اسے کچھ نہیں کہنا۔"
"ٹھیک ہو گیا۔" ایک آواز ابھری تو میں نے کہا۔
"چاہئے کچھ ہو جائے ہمیں کامیابی ملے یا نہیں، ہر بندے کے پاس صرف چالیس منٹ ہیں۔اس نے بستی تک جا کر واپس بھی آنا ہے۔وہ واپس آ کر کسی کا انتظار کیے بغیر بستی پلٹ جائے گا۔"
"ٹھیک۔" ایک آواز ابھری تو ہم چھ نے اپنے اپنے بائیک کو جانچا اور بستی کی جانب چل دیئے۔
جس وقت ہم بستی کے قریب ترین ٹیلے پر پہنچے اس وقت تیرہ منٹ گزر چکے تھے۔وہ کوئی

گنجان بستی نہیں تھی۔ میری معلومات کے مطابق، کوپے والی جگہ رما کانت کی تھی اور اسی کے آس پاس انہوں نے عورتیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے اور بجاوڑ نے آپس میں طے کرلیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے رما کانت کو پکڑنا تھا۔ اچانک کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہمیں ان کے بارے میں پتہ تھا اور ہم نے اس کا بندوبست پہلے ہی کر رکھا تھا۔ ایک بھیڑ کا گوشت ساتھ لائے تھے۔ ہمارے دو ساتھی تیزی سے آگے بڑھے ان کے ہاتھوں میں گوشت کی پوٹلیاں تھیں۔ وہ انہیں گھما گھما کر دور پھینکنے لگے۔ دس سے پندرہ پوٹلیاں گرا دینے کے بعد وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ چند منٹ انتظار کیا تو کتوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ بلاشبہ وہ گوشت کی بو پر پہنچ گئے تھے اور ہمارے پاس اتنا ہی وقت تھا، جتنا وقت وہ گوشت کھانے میں لگا دیتے۔ سو ہم نے بھی بالکل انتظار نہیں کیا۔

ہم چاروں تیزی سے کوپے والی جگہ کی جانب بڑھنے لگے۔ ہم بستی میں داخل ہوئے تو ہمیں دبی دبی چیخوں اور رونے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ ظاہر ہے جس بستی کے اتنے جوان زندہ نہ رہے ہوں وہاں ماتم تو ہوگا۔ وہ بستی ایک اونچے ٹیلے پر آباد تھی۔ اس میں کوئی باقاعدہ گلیاں نہیں بنی ہوئیں تھیں، بس ایسے ہی تھا کہ جہاں جس کا جی چاہا، اپنا گھر یا جھونپڑی بنالی۔ بیچ میں سے یوں راستے تھے جیسے بڑی بڑی پگڈنڈیاں ہوتی ہیں۔

ہم جھونپڑیوں اور دیواروں کی آڑ لیتے ہوئے تیزی سے کوپے والی جگہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ باقی لوگ ابھی تک ٹیلے پر موجود تھے۔ انہیں ابھی تک بستی میں داخل ہونے کا نہیں کہا گیا تھا۔ کچھ دور جا کر ہمیں احساس ہوا کہ کوپا کہاں ہوسکتا ہے۔ ہم انتہائی خاموشی سے کوپے کے پاس پہنچ گئے۔ باہر چھوٹی چھوٹی دیوار کی گئی ہوئی تھی اور درمیان میں بڑا سارا صحن تھا، جس میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور ان پر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے

درمیان آگ جل رہی تھی۔ میں نے رما کانت کو دیکھا نہیں تھا، بس جو معلومات ملی تھی اس کے مطابق مجھے وہاں بیٹھے ہوئے سارے لوگ ہی رما کانت لگ رہے تھے۔ ایک طرف بڑا سا رارا گو یا تھا اور دوسرے کنارے پر ایک کچا کمرہ بنا ہوا تھا۔ صحن کے ایک کونے میں ہماری فوروہیل کھڑی تھی۔

"یاران میں رما کانت ہے؟" میں نے مائیک میں سرگوشی کی۔

"ہونا تو یہیں چاہئے۔" بختاور نے بھی سرگوشی کر دی، وہ مجھ سے تھوڑے سے فاصلے پر چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ تبھی اچانک مجھے خیال آ گیا۔

"ٹھہرو، میں ابھی دیکھ لیتا ہوں، تم نے پیچھے والوں کو بتانا ہے جب میں اشارہ دوں۔"

میرے کہنے پر خاموشی چھا گئی۔ بختاور میری بات سمجھ گیا تھا۔ میں نے تیزی سے اپنا فون نکالا، اس میں سے رما کانت کا نمبر تلاش کیا، جو اس نے مجھے کال کی تھی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا کہ وہ نمبر اسی کا ہونا چاہئے۔ کال جانے لگی تھی۔ سناٹے میں فون بجنے کی آواز جب صحن میں گونجی تو میرا دل کنپٹی میں دھڑکنے لگا۔ ایک ادھیڑ عمر، پکے رنگ، سفید بے تحاشا لمبی داڑھی والے شخص نے اپنی جیب سے فون نکالا، پھر بڑے غور سے نمبر دیکھے اور کال ریسیو کر لی۔

"بول علی کیا بات ہے۔"

"بات صرف اتنی سی بتانی ہے، تم اس وقت بالکل میرے نشانے پر بیٹھے ہوئے ہو۔ میں جب چاہوں تمہیں گولی مار دوں۔" میں نے ایسا کہا ہی تھا کہ وہ حواس باختہ سا چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بختاور کو اشارہ کر دیا۔ کچھ نہ پا کر اس نے شاید خود پر قابو پایا اور بڑے اطمینان سے بولا۔

"میں جانتا ہوں تم نے آج مجھے زخم لگایا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر بار ایسا ہوگا،

یوں تیرے فون کرنے کو میں تمہارا مذاق سمجھوں یا میرے زخموں پر نمک پاشی......" اس نے غصے بھری عجیب بے بسی میں کہا۔

"میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں، وہ عورتیں کتنی ہیں جنہیں تم نے پار بھیجا تھا۔" میں نے یونہی سوال کر دیا۔

"مت پوچھ......مت کر نمک پاشی، وقت کا انتظار کر، اب میں انہیں تیری لاش ٹھکانے لگانے کے بعد ہی پار بھیجوں گا۔" اس نے دھاڑتے ہوئے کہا تو مجھے کنفرم ہو گیا کہ ان میں رماکانت کون ہے۔ تبھی میں بولا۔

"چل پھر تیار ہو جا، فون چھوڑ اور اپنے سر پہ ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جا، ذرا سی بھی دیر کی تا تو گولی مار دوں گا۔" یہ کہتے ہی میں نے کال بند کر دی۔ اگلے ہی لمحے میں نے پسٹل سیدھا کیا اور فائر کر دیا۔ اب ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔

ہم انتہائی تیز رفتاری سے دیوار کود کر صحن میں آ گئے۔ میں کودا تو میرے کور پہ مدثر تھا، میں نے جاتے ہی فائر کرنا شروع کر دیا، میرا مقصد انہیں صرف ڈرانا تھا۔ میں چند لمحوں میں ان چارپائیوں کے پاس جا پہنچا۔ ہم نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ سبھی گم سم یونہی بیٹھے رہے۔ اچانک ایک شخص نے چادر ہٹائی، اس کے نیچے سے مجھے پسٹل یا ریوالور یا دیسی ساخت کا کوئی ریپیٹر تھا۔ اس نے فائر کرنا چاہا تھا لیکن اس کی حسرت دل ہی میں رہ گئی، میں نے اس کے چہرے کا نشانہ لے کر فائر کر دیئے۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

"میں چاہتا تو چھپ کر بھی تم لوگوں پر فائر کر سکتا تھا۔"

"تو کیا کیوں نہیں۔" رماکانت نے حوصلے سے جواب دیا۔

"میں تجھ سے دو باتیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ، وہ عورتیں کہاں چھپا رکھی ہیں۔"

میں نے تیزی سے کہا۔

"دیکھ تو حد سے آگے بڑھ رہا ہے، تو میرے بیوپار......" اس نے کہنا چاہا تو مدثر نے چیختے ہوئے۔

"بھاڑ میں گیا تیرا بیوپار، چل بول۔" یہ کہتے ہی اس نے فائر اس کے پیروں میں کر دیا۔

"تم لوگ بولو" میں نے وہاں موجود لوگوں سے کہا تو ان میں سے ایک نے ہماری دائیں جانب اشارہ کیا۔ وہیں جہاں کمرہ تھا۔ اس کی کنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی۔ بختاور بھاگ کر گیا اور اس نے کنڈی اتاری اور اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد کئی عورتیں تیزی سے باہر آنے لگیں، ان میں کل نو عورتیں تھیں۔ یہی وہ وقت تھا، جب فائرنگ کی آواز سے بستی کے لوگ چونک کر اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے۔

یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ ایک نوجوان جوشِ جذبات میں چیخنے لگا تھا۔

"اوئے کون ہو تم......"

تبھی بختاور نے بڑے سخت لہجے میں کہا۔

"تم لوگوں کو اگر اپنی زندگی پیاری ہے تو یہاں سے چلے جاؤ، گولی یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کس کے سینے کے پار ہوتی ہے۔"

"تم لوگوں کو جانے دیں گے تب نا" ایک اور آواز ابھری تو بختاور نے کہا۔

"رما کانت کی زندگی چاہتے ہو؟"

اس کے یوں کہنے پر خاموشی چھا گئی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ان کے پیچھے سے فائرنگ ہوئی۔ اگلے چند لمحوں میں وہ لوگ تتر بتر ہو گئے۔ میں نے وقت دیکھا، دیئے گئے وقت میں سات منٹ رہتے تھے۔

میں نے رما کانت کو اپنے ساتھ لیا، اور صحن کے کونے میں کھڑی گاڑی کی جانب بڑھا۔ باقی سبھی لوگ جتنی عورتیں تھیں انہیں لے کر چل پڑے۔ اچانک ایک جانب سے کئی فائر ہوئے، کچھ چیخیں بلند ہوئیں۔ اس کے ساتھ پھر شدت سے فائرنگ ہونے لگی۔ یہ وقت دھیان دینے کا نہیں تھا، میں نے رما کانت کو گاڑی میں ڈالا۔

”چابی کہاں ہے اس کی؟“

”میرے پاس نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں نے بھی یوچھنا تھا، بعد میں چابی تم سے ہی ملنی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی چابی نکالی، اسے اگنیشن میں ڈالا اور فوراً ہی اسٹارٹ کرلی، میں وہاں سے نکلا تو سب کو معلوم ہو گیا۔

جلد ہی میں بستی کے باہر آ گیا۔ میرے پیچھے کئی لوگ فائرنگ کرتے ہوئے، بھاگتے ہوئے آ رہے تھے، انہیں مشکل یہ تھی کہ جو عورتیں ان کے ساتھ ہیں، وہ انہیں دیر کروا رہی تھیں۔ کچھ نوجوان بھاگتے ہوئے گاڑیوں تک پہنچے اور انہیں لے کر ان کے قریب پہنچ گئے، جیسے تیسے وہ اس میں سوار ہوئے، مدثر میرے ساتھ اور دو مزید نوجوان میرے ساتھ آ گئے۔ مدثر نے روف کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے گولیاں برسانا شروع کر دیں تاکہ بستی والے دہل جائیں۔

ہم وہاں سے نکلے تو سیدھے ڈیرے پر آ گئے۔ اس وقت دن نکلنے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

ڈیرے پر جنریٹر کی وجہ سے روشنی تھی۔ وہ ساری عورتیں ایک جانب کمرے پر بیٹھ گئیں۔ میں نے راستے میں سادری کو بتا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے ساری عورتوں کو اندر بلا لیا۔ سارے نوجوان ادھر اُدھر ہو گئے۔ رما کانت میرے سامنے چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے مدھم سے لہجے میں پوچھا۔

”اب بول رما کانت بیوپاری...... کیا کیا جائے تیرے ساتھ؟“

”مجھے مار دے۔ اب میں ذلت کی زندگی برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔

”نہ یار ایسے تو نہ کہو...... تیرا کوئی بیٹا سامنے نہیں آیا، حیرت ہے؟“

”حیرت نہیں ہے مجھے، نہ تمہیں ہونی چاہئے۔“ اس نے پھر جذباتی بلکہ رو دینے والے لہجے میں کہا تو میں نے اسے غور سے دیکھا تبھی وہ بولا، ”تیرے آنے سے تھوڑی دیر پہلے میرے دونوں بیٹے کافی سارے لوگوں کے ساتھ زخمیوں کو دیکھنے کے لئے چلے گئے تھے۔ پر مجھے دکھ نہیں، جو قسمت میں ہے۔“

”چل پھر تھوڑی دیر آرام کر، ابھی ناشتہ کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اٹھ گیا۔ رہائشی علاقے کی طرف جاتے ہوئے میں نے بجاور کو فون کر کے بتا دیا کہ رما کانت کے بیٹے اور اس کے ساتھی زخمیوں کو دیکھنے کے لئے ہسپتال کی طرف گئے ہیں، ہو سکتا ہے وہ پاگل پن کریں اور ڈیرے پر حملہ کر دیں، اس لئے محتاط رہنا۔ وہ میری بات سمجھ گیا۔ اس نے مجھے بھی صلاح دی کہ رما کانت کو ڈیرے سے ہٹا دیا جائے۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنے سامنے بٹھا کر رما کانت کو ناشتہ کروایا پھر بجاور کے ساتھ اسے بھیج دیا۔

☆......☆......☆

سارا دن کچھ نہیں ہوا۔ میں سکون سے پڑا سوتا رہا۔ میری اچانک آنکھ کھلی تو میرے قریب ساوری بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے بڑی خوشگوار سی اور بڑی نکھری نکھری سی لگی جیسے ابھی وہ نہا کر تازہ دم ہو گئی ہو۔ اس کے لبوں پر دھندلاسا، کھلے بال اور آنکھوں میں کاجل دیکھ کر مجھے لگا کچھ ہٹ کر ہے۔ تبھی میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ارے واہ...... بڑی نکھری ہوئی ہو۔“

”اب بندہ نہائے دھوئے بھی نا۔“ اس نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

”تم خود ہی کام کاج میں لگی رہتی ہو، میں تمہیں مہارانی......“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

”گولا مار مہارانی کو...... اٹھو جاؤ نہا دھولو۔“

”بڑا اہتمام کر رہی ہے، خیر تو ہے نا۔“ میں نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا تو اس نے زور سے ایک مکا کاندھے پر مارتے ہوئے کہا۔

”اگر میرے پیچھے نہیں آئے نا تو میں پانی یہاں لا کر تم پر پھینک دوں گی۔“

”اوہ نہیں ایسا نہ کرنا، میں ابھی آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں سے باہر آگیا۔ باہر صحن میں آیا تو مجھے پتہ چلا سہ پہر ہو گئی ہے۔ وہاں خاموشی دیکھ کر میں نے ساوری سے پوچھا۔

”ارے وہ رات جو عورتیں آئی تھیں؟“

”رات کو نہیں آج صبح آگئیں تھیں۔ ان سب کو میں نے اپنے اپنے گھروں میں بھجوا دیا ہے، ان کے ساتھ ردمی بھی چلی گئی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”چلو یہ اچھا ہوا۔“ میں نے سکون سے کہا اور نہانے کے لئے بڑھ گیا۔

میں ڈیرے پر آیا تو ان چاروں کے ساتھ مختار بھی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہنس دیے۔

”کیا بات ہے، بڑے دانت نکال رہے ہو۔“

”یار تمہارا خیال تو ساوری بھابی رکھتی ہے، ہمارا خیال کون رکھے گا۔“ مدثر نے پھیلتے ہوئے کہا تو میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تیری شادی ہو تو گئی ہے میرا خیال؟"

"شادی ہونا اور خیال رکھنا دو الگ الگ باتیں ہیں میرے دوست، تمہیں اس فلسفے کا پتہ ہونا چاہیے۔" اس نے بڑی ترنگ میں کہا تو سبھی ہنس دیئے۔

"پہلی تو یہ بات ہے کہ ساوری ابھی تم لوگوں کی بھابھی......"

"بند کر بکواس......" سجاور نے ایک دم اٹھ کر کہا۔ "یہ بیان ہم ہزار بار سن چکے ہیں۔ کوئی نئی بات کر۔"

"مجھ سے نہیں ہوتی تم لوگ کرلو۔" میں نے کہا اور آرام سے ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ ہنستا ہوا سجاور بھی واپس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ہمارے درمیان باتیں ہونے لگیں۔

سندر بستی سے کوئی اطلاع نہیں تھی کہ وہاں کیا ہونے جارہا ہے، کیا ہلچل ہے۔ کچھ پتہ نہیں تھا۔ میں نے جب اپنے دوستوں کے آگے یہ بات رکھی تو ہر کوئی اپنا اپنا تبصرہ کرنے لگا۔ ہم کافی دیر تک انہی باتوں میں مشغول رہے۔ پھر ایک دو کر کے سبھی اٹھتے چلے گئے۔ یہی ان کا معمول تھا۔ وہ ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتے تھے۔ انہیں اپنے ارد گرد کی ساری خبر رکھنا ہوتی تھی۔ میں چارپائی پر پڑا رماکانت کے بارے میں سوچنے لگا۔ میری رماکانت سے تفصیلی بات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے جتنا بھی اس کے ساتھ کچھ وقت ملا تھا، اتنی دیر میں وہ بندہ کچھ اصول پسند لگا تھا۔ بس یہ عورتوں کے بیوپار پر میرا ماتھا گھوم گیا تھا۔ ورنہ وہ جو کرتا تھا کرتا رہتا۔ میرا فون بج اٹھا۔ میں نے اسکرین پر دیکھا تو وہ فون چاچا عبدالمجید کا تھا۔ میں کال رسیو کر کے سلام کیا تو انہوں نے پوچھا۔

"کہاں ہو تم؟"

"میں ڈیرے پر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

''اچھا وہیں رہو، میں بس پہنچ گیا ہوں۔'' انہوں نے کہا تو میں ایک دم سے چونک گیا۔

''کہاں ہیں اس وقت آپ؟'' میں نے تصدیق کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا اور تیزی سے اٹھ کر گیٹ کی طرف چل دیا۔ تبھی ان کی آواز گونجی۔

''بس نزدیک ہی ہوں، آرہا ہوں۔''

انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں نے دور دور تک دیکھا، کہیں بھی ان کے آنے کے آثار نہیں تھے۔ میں نے ساوری کا فون نمبر ملایا اور اسے کال کر دی۔

''چاچا عبدالمجید کا فون آیا تھا، وہ آرہے ہیں، شاید کہیں نزدیک ہی ہیں۔''

''مجھے پتہ ہے، وہ میرے ساتھ رابطے میں ہیں، میں انہی کا انتظار کر رہی ہوں۔'' اس نے بتایا تو نجانے کیوں مجھے عجیب سا لگا۔ یہ ساوری کر کیا رہی ہے؟ چلیں اسے ہی بتایا تھا تو وہ کم از کم مجھے تو بتا دے۔ یہ مجھ سے چھپانے کیوں لگ گئی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے فون بند کر دیا۔

میں نے گیٹ سے دیکھا، کافی دور سے فور وہیل جیپ ریت اور دھول اڑاتی ہوئی آرہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ ڈیرے کے صحن میں آرکی۔

چاچا عبدالمجید کے ساتھ بابا خیر دین اترا تو مجھے بہت اچھا لگا۔ پچھلی سیٹ سے دو لڑکیاں اتریں۔ جنہیں بہر حال میں نہیں جانتا تھا۔ اگلی سیٹ پر سے ایک صحت مند نوجوان اترا، سرخ و سفید، گول چہرے والا کلین شیو۔ اس کا جسم بتا رہا تھا کہ خاصا مضبوط ہے۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں باری باری سب سے ملا اور دیوار والے دروازے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہاں دروازے میں ساوری کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تیل والا برتن تھا۔ اس نے دروازے کی دونوں طرف تیل گرایا اور انہیں اندر بلا لیا۔ یہ روہی کی ہی نہیں، پنجاب کی

بھی رسم ہے۔ اس سے اپنے مہمان کو عزت دینا مقصود ہوتا ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ تم ہمارے لئے کتنے اہم ہو۔ کچھ دیر بعد ہم صحن میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی وہیں بیٹھ گیا تو چاچا عبدالمجید نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"دیکھو بابا خیر دین کی صحت کتنی اچھی ہو گئی ہے۔ علاج نہ ہونے سے کئی ساری گڑبڑ ہو گئی تھی۔"

"یہ تو بہت اچھا کیا آپ نے؟ چلیں اس بہانے ان کا علاج ہو گیا۔" میں نے خوشدلی سے کہا۔

"اچھا ان لڑکیوں سے تم واقف نہیں ہو، تم نہیں جانتے ہو، نہ تم سے ملی بھی، یہ ساوری کی سہیلیاں ہیں شبانہ اور فرزانہ۔ لیکن اس لڑکے کے بارے میں جانتے ہو، کون ہے یہ؟" چاچا عبدالمجید نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو میں نے غور سے اسے دیکھا۔ چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد میں نے چاچا سے معذرت والے انداز میں کہا۔

"مجھے یہ چہرہ مانوس تو لگ رہا ہے مگر ذہن میں نہیں آ رہا۔"

"بس دیکھ لئی تیری یاری۔" اس لڑکے نے مخصوص انداز میں اچانک کہا تو ایک دم سے اپنے کالج والے ہاسٹل جا پہنچا۔ سارا منظر واضح ہو گیا۔

"اوئے شہباز وڑائچ تم ہو۔" میں نے بے ساختہ کہا اور اسے گلے لگانے کے لئے بڑھا، اس وقت تک وہ بھی اٹھ چکا تھا۔ وہ بہت گرم جوشی سے میرے گلے ملا، پھر مجھے الگ کرتے ہوئے بولا۔

"اگر تم مجھے نہ پہچانتے نا تو میں نے تیرے سر میں ڈانگ مار دینا تھی، تاکہ تیری یادداشت واپس آ جائے، وہ جیسے اردو فلموں میں ہوتا ہے۔"

اس کی بات سن کر سبھی ہنس دیئے۔ تب میں نے کہا۔

”تم بہت بدل گئے ہو، صحت مند، گورے چٹے، کلین شیو، اس وقت تم......“
”تم کون سا شیر جوان تھے۔“ اس نے تیزی سے کہا تو میں بھی کھلکھلا کر ہنس دیا۔ مجھے اس کا بے تکلفانہ انداز اچھا لگا تھا۔
”اچھا کیا تم آ گئے، بہت اچھا لگا مجھے۔“ میں نے خوشی سے کہا۔ اتنے عرصے بعد اسے دیکھ کر مجھے واقعی ہی بہت اچھا لگا تھا۔ وہی تھا جو اُن دنوں میرا چند دنوں کا ساتھی رہا تھا۔ جس کی باتوں نے ایک دنیا سے متعارف کروایا تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے لگتا تھا جیسے زندگی بس انجوائے کرنے کے لئے ہے۔ وہ مجھے بہت ساری باتیں سمجھاتا تھا، مجھے حوصلہ دیتا تھا۔
رحماں مائی چائے لے کر آ گئی تھی۔ اس نے سب کو پیش کی اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد شبانہ اور فرزانہ اٹھ کر ساوری کے ساتھ چلی گئیں۔ ساوری جب لاہور میں تھی تو وہیں پہ اس کی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ چونکہ وہ چاچا کے ساتھ آئی تھیں، اس لئے مجھے کوئی تردد نہیں تھا۔ ہم وہیں ادھر ادھر کی باتوں میں لگے رہے۔ دن ڈھل گیا تو ساوری نے کھانا لگا دیا۔ لاہور میں رہ کر وہ بہت کچھ سیکھ گئی تھی، جس کا اظہار اس نے کھانے کی صورت میں کیا۔ اس نے لذیذ کھانے بنانے پر بہت محنت کی تھی۔ کھانے کے بعد بابا نجم الدین بھی اٹھ گئے اور ہم ڈیرے پر آ گئے۔
جہانگیر، مدثر، آفتاب، شعیب اور بختاور بھی وہیں آ گئے۔ یونہی روہی کی باتیں چل پڑیں۔ اب تک کیا ہوا، چاچا عبدالمجید سوال کرتے تو اس کا جواب دے دیا جاتا۔ شہباز کے چہکنے کی وجہ سے بہت اچھا ماحول بن گیا ہوا تھا۔ انہی باتوں کے دوران چاچا عبدالمجید نے لاپرواہانہ انداز میں پوچھا۔

''سناؤ، کیا حالات ہیں یہاں کے؟''

''حالات تو ٹھیک ہیں۔'' میں نے دھیمے سے کہا۔

''تو پھر لاہور کیوں نہیں گئے تم؟'' انہوں نے ذرا سختی سے پوچھا۔

''جی بس میں یہاں کے معاملات......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولے۔

''یہاں اب کچھ نہیں ہوگا، کم از کم کچھ عرصہ تک تو کوئی یہاں سر نہیں اٹھا سکتا۔ میں نے سارا بندوبست کر دیا ہے۔''

''آپ جیسا کہیں، اگر لاہور میں کوئی کام ہے تو میں ابھی چلتا ہوں۔'' میں نے ان کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

''کام بھی رکتے ہیں یار۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا تو میں ان کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ چند لمحے خاموش رہے پھر بولے۔'' اچھا یار بات یوں ہے، علی تمہارے ذمے جو کام تھا، وہ تم نے پورا کیا۔ لیکن اس میں ایک نئے کام کی بھی بنیاد ڈال دی ہے تم نے۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے، ایسا ہوتا ہے۔ ہماری اس ان دیکھی دنیا میں جب کسی پر ضرب لگتی ہے تو کم از کم بدلہ لینے کی خواہش ضرور رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو لانا ہمارا حق تھا، اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ تم نے اپنا حق چھینا اور انہیں سزا بھی دی۔ ہم بہت خوش ہیں تم پر لیکن یہ بھی سمجھو کہ ایک نیا کھاتہ کھول دیا ہے تم نے۔ اور وہ ہے کلیان جی والا قصہ......''

''اب سارا کیا دھرا ان ہی انہوں نے ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اغواء کیا۔ مجھے تو ان کے بارے میں پتہ ہی تھا، وہ خود سامنے آگئے۔ اب آپ نے مجھے واپس بلوا لیا، ورنہ میں انہیں مزید سزا دے کر آتا۔''

''تمہیں پتہ ہے کلیان جی کے بارے میں؟'' انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا تو میں نے

دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"میں ان کے بارے میں حتمی تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ان کے بارے آپ نے تھوڑا بہت بتایا تو تھا اور تھوڑا......"

"کیا تمہیں یاد ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی، آپ نے بتایا تھا کہ کوئی کلیان آنند نامی مجرم ہے۔ اُودھے پور سے اس کا تعلق ہے لیکن اب وہ بھارتی ایجنسی کے لئے کام کرتا ہے اور پٹایا میں ہے۔ یہاں اودھے پور اور پٹایا دونوں جگہوں پر اس کا نیٹ ورک ہے۔" میں نے بتایا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"ہاں ایسا ہی ہے۔ یہاں اودھے پور میں اس کا نیٹ ورک کافی مضبوط ہے، لیکن پٹایا میں وہ چند عالمی سطح کے مجرموں کے ساتھ کام کرتا ہے۔ یہ سب وہ بھارتی خفیہ ایجنسی کی مدد سے ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس سے کافی کام لیتے ہیں۔" انہوں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ پٹایا میں ہے تو......" میں نے کہنا چاہا تو وہ بولے۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہی تو بات ہے، وہ حقیقت میں کوئی آدمی ہے بھی یا نہیں یا فقط نام گھڑ کر یہ سب کام چلایا جا رہا ہے۔ فرض کیا، ہم اس بندے کو تلاش کر بھی لیتے ہیں تو اس کو مار دینے سے کیا ہوگا؟ وہ کوئی دوسرا بندہ وہاں کھڑا کر دیں گے۔ تیسرا لے آئیں گے۔ وہ کام تو ختم نہیں ہوگا۔"

"تو پھر وہ......" میں نے پر جوش انداز میں کہنا چاہا تو وہ بولے۔

"میں جانتا ہوں تم اس کے لئے بہت غصہ رکھتے ہو۔ تمہارے دل میں اس کے لئے بہت نفرت ہے۔ تم یہ غصہ سنبھال رکھو۔ مگر میں تمہیں ایک دوسری بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"جی۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

”دیکھو، کسی کے گھر میں جا کر کسی کو مارنے سے پہلے اپنا گھر مضبوط کرو۔ اس میں کوئی شک نہیں، وہ لوگ بھی اپنا کام کر رہے ہیں، انہیں روکنا کس نے ہے۔ ہم نے...... ہم نے روکنا ہے انہیں۔“ چاچا نے دبے دبے جوش سے کہا۔

”چاچا، آپ بتائیں مجھے کرنا کیا ہے؟ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ میری طرف دیکھنے لگے، پھر بولے۔

”ابھی تم میرے ساتھ لاہور جاؤ گے، وہیں فیصلہ ہوگا کہ کیا کرنا ہے۔“

”جیسا آپ کہیں میں آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہوں لیکن کوئی خاص بات ہو گئی ہے؟“ میں نے ایک دم سے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”شاباش علی، مجھے تم سے یہی امید تھی کہ تم میرے ساتھ جا رہے ہو، باقی رہی خاص بات تو بیٹے...... دشمن کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔ یہ جو کلیان جی والا کھاتہ ہم نے کھول دیا ہے، اسے چھیڑا تو بہت کچھ دکھائی دے رہا ہو جا میں یہی کرتا ہوں کہ انہیں یہ معلوم نہ ہو کہ ہم یہ سب جانتے ہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ وہ یہاں کتنا کام کر چکے ہیں۔“ وہ انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولے، پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد عام سے انداز میں پوچھا، ”اچھا اس رما کانت کو تو سامنے لاؤ، وہ زندہ تو ہے نا؟“

یہ سنتے ہی ہم سب نے ایک دوسرے کو چونک کر دیکھا۔ اب اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ انہیں رما کانت کے بارے میں معلوم نہیں۔ میں نے بجا دڑ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اسے لے آتے ہیں یہاں۔“

اس سے پہلے بجا دڑ کچھ کہتا چاچا نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ہم ادھر چلے جاتے ہیں۔ چلو اٹھو۔“

وہ ایک دم سے یوں تیار ہو گئے جیسے انہیں جلدی ہو۔میں اور بجا اور ان کے ساتھ چل پڑے۔اس وقت رما کانت کے پاس چاچا سائیں بیٹھا ہوا تھا۔اسے چاچا عبدالمجید کی آمد بارے خبر تھی۔وہ ان سے ڈیرے پر مل کر آیا تھا۔رما کانت اجنبیوں کی مانند بیٹھا رہا یوں جیسے اسے ہم سے کوئی تعلق واسطہ نہ ہو۔چاچا نے رما کانت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے ملنے آیا ہوں رما کانت......"

جیسے ہی اس نے آواز سنی تو وہ چونک گیا۔وہ چاچا کو یوں حیرت سے دیکھنے لگا جیسے اسے امید ہی نہیں تھی کہ یہ شخص بھی مجھے ملنے کے لئے آسکتا ہے۔اس نے کھڑا ہوتے ہوئے بے ساختہ کہا۔

"آپ جناب......؟"

"ہاں میں، آؤ بیٹھو کرتے ہیں بات۔" چاچا نے اسے اشارہ کیا تو وہ پھر سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

میں یہ دعویٰ کرتا تھا کہ میں چاچا کو چونکہ بچپن سے دیکھتا آیا ہوں اس لئے مجھے ان کے بارے میں سب معلوم ہے۔لیکن ان لمحات میں مجھے اپنے آپ پر شک ہونے لگا۔میں چاچا کے بارے میں پوری طرح نہیں جانتا تھا۔ان کی رسائی کہاں تک ہے اور کن لوگوں تک ہے، مجھے ابھی تک پتہ نہیں تھا۔مجھے اپنی ادھوری معلومات کا احساس ہونے لگا تھا۔اسی لیے چاچا سائیں جانے لگے تو چاچا نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔

"آپ بھی بیٹھیں، کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں ذرا باہر دیکھ لوں۔" انہوں نے عام سے لہجے میں کہا تو چاچا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

”آپ ادھر بیٹھیں، کوئی بات بھی سنتے ہیں۔“

ہم سب چارپائیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ہمارے سامنے تازہ دودھ آ گیا۔ ایک لڑکا سب کو پیش کر چکا تو چاچا نے دودھ کا سپ لیا اور بڑے عجیب سے سخت لہجے میں بولے۔

”رما کانت، جب میں نے تمہیں روکا تھا کہ تمہیں کچھ نہیں کرنا، پھر تم نے علی پر حملہ کیوں کیا؟“

”مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے جناب۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو میں حیران نہیں ہوا۔ یہ سب پہلے ہی ہو چکا تھا۔

”اب دیکھو غلطی کا نقصان کتنا ہوا؟ اندازہ ہے تمہیں؟“ چاچا نے افسوس بھرے انداز میں پوچھا۔

”نقصان تو میرا بہت ہو گیا ہے۔“ اس نے اپنا سر دونوں طرف مارتے ہوئے کہا تو مجھے یوں لگا جیسے اسے انسانوں کا نہیں پیسہ جانے کی فکر ہو۔

”کم از کم میرے آنے ہی کا انتظار کر لیتے۔“ چاچا نے سخت لہجے میں کہا۔

”کاش ایسا ہوتا، اب میرے سامنے جوان خون ہے، میری بہت کم سنی جاتی ہے۔ زیادہ تر فیصلہ وہی نوجوان طبقہ کرتا ہے جس نے نقصان اٹھایا۔“ اس نے افسوس بھرے انداز میں جواب دیا تو چاچا اسے باور کراتے ہوئے بولے۔

”اب اسی نوجوان طبقے نے مجھے یہاں فوراً پہنچنے کو کہا، انہیں یہ پورا احساس ہو گیا ہے کہ وہ تمہیں چھڑا کر نہیں لے جا سکتے۔“

”میں جانتا تھا ایسا ہی کچھ ہوگا۔“ اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

”اب ایسے کرو، سکون سے واپس جاؤ۔ تمہارے بیٹے تمہیں لینے کے لئے آ رہے ہیں۔

جو کرنا ہے کرو، لیکن جو کچھ علی نے تم لوگوں سے کہا ہے وہ اب نہیں ہونا چاہیے۔" چاچا نے تحکمانہ انداز میں کہا تو رما کانت کے اندر کہیں جو چنگاری موجود تھی وہ بھڑک اٹھی۔ اس نے دھیمے سے کہا۔

"تو پھر ہمیں ویسے ہی واپس چلے جانا چاہیے۔ آپ کو پتہ ہے ہمارا بیوپار اسی میں ہے۔ ہم نے سامنے سے بہت ایڈوانس بھی پکڑا ہوا ہے۔ یہ نہیں کریں گے تو سامنے والوں سے الجھنا پڑے گا۔"

"وہ باتیں ہیں، تیرا اب تک جتنا پیسے کا نقصان ہوا، وہ میں دوں گا۔ جتنا بھی بنتا ہے میں یہاں دے کر جاؤں گا۔ واپس جا کر پوری رقم کا تخمینہ مجھے بتاؤ۔ دوسرا، تمہیں جب بھی ضرورت پڑے، تم نے انہیں کہہ دینا ہے، ایک فون کال پر یہ تیرا ساتھ دیں گے، یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہے گا، جب تک تمہاری طرف سے کوئی الجھن یا وقت نہیں آئی، میری بات سمجھ رہے ہو؟" چاچا نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحے سوچتا رہا پھر سوالیہ انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے بعد جو بھی دھندہ کریں، وہ ہو گا؟"

"جو مرضی کرنا، ہم نے پہلے بھی تم پر ہاتھ رکھا، پھر بھی رکھیں گے۔ دوست بن کر ایک دوسری کی خبر گیری کرو گے تو سب ٹھیک رہے گا۔" چاچا نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے بات مان جانے کا عندیہ دے دیا۔ تبھی چاچا نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"رما کانت کا فون کدھر ہے؟ وہ دو اسے۔"

"میرے پاس ہے، میں دیتا ہوں۔" بختاور نے جلدی سے کہا اور جیب میں پڑا فون نکال کر اسے دے دیا۔

”چل فون کر اپنے بیٹے کو، پوچھ کہاں ہے وہ، پہنچا ہے یا نہیں ابھی تک؟“

رما کانت فون کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد بولا۔

”وہ تو ادھر ڈیرے کے آس پاس ہیں۔“

”انہیں کہو ڈیرے پر جائیں، میں کہہ دیتا ہوں۔“ چاچا نے کہا اور فون پر نمبر ملانے لگے۔ انہوں نے جہانگیر کو بتایا اور فون بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اب ہمیں واپس ڈیرے پر جانا تھا۔

جس وقت ہم واپس ڈیرے پر پہنچے تو رما کانت کے بیٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ چاچا باری باری ان سے ملے، رما کانت بھی ملا۔ میں نے بھی ہاتھ ملایا۔ وہ اس کا چھوٹا بیٹا تھا، جو روہی کو خرید کر لے جا رہا تھا۔ وہ مجھے کچھ اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے نظرانداز کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جانے لگے تو رہائشی حصے کی طرف سے ساوری آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کئی سارے کپڑے تھے، اس نے وہ کپڑے رما کانت کو دیتے ہوئے کہا۔

”بابا، کسی کی بھی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اسے ایک خواب سمجھ کر بھول جانا۔“

رما کانت چند لمحے کھڑا سوچتا رہا پھر اس نے ایک ہاتھ سے کپڑے تھام لئے اور دوسرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ روہی کی روایت کے مطابق اب وہ اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تبھی ساوری نے کچھ فاصلے پر کھڑے سانول کی طرف دیکھ کر کہا۔

”سانول، اکیس گائیں بھی ان کے ساتھ بھیج دو، کچھ بندے لے کر چلے جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے، صبح بھیج دوں گا، اس وقت تو مال ڈنگر آرام کر رہا ہے۔“ سانول نے ہانک لگاتے ہوئے کہا تو رما کانت دھیمے قدموں سے چلتا ہوا گاڑی میں جا بیٹھا، کچھ دیر بعد وہ وہاں سے چل دیئے۔

رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔ رما کانت کے جانے کے بعد کچھ دیر ڈیرے پر بیٹھے ہم باتیں کرتے رہے۔ چاچا ہمارے درمیان سے جلدی اٹھ گئے۔ شہباز نے بہت مزے کی باتیں کیں، وہ ایک جہان دیکھ چکا تھا۔ کافی دیر باتیں کرتے رہنے کے بعد سب نے سونے کے لئے اپنے اپنے ٹھکانوں کا رخ کیا۔ میں سیکورٹی دیکھ کر جب اندر کمرے میں آیا تو ساوری میری منتظر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"تمہاری سہیلیاں آئی ہیں انہیں وقت دو، تم یہاں ہو، وہ کیا سوچیں گی؟"

"وہ کب کی سو گئیں ہیں۔ کافی تھک گئی ہیں۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"تم بھی جاؤ سو جاؤ، رات اتنی ہو گئی ہے۔" میں نے ہولے سے کہا۔

"تمہیں کوئی تکلیف ہے میرے یہاں ہونے سے؟" اس نے تنک کر پوچھا تو میں جواب نہ دے سکا، چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔ وہ بھی خاموشی سے میرے پاؤں کی طرف بیٹھ گئی۔ کتنے ہی لمحے یونہی گزر گئے۔

"کچھ کہنا چاہتی ہو؟" میں نے دھیمے سے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں، بس چند دن سے جو عادت پڑ گئی ہے نا تیرے پاس بیٹھنے کی، وہی پوری کر رہی ہوں۔" اس نے ناراض لہجے میں کہا تو میں بولا

"تم ایسا کرو، جاؤ، سکون کرو۔ گھر میں اتنے لوگ ہیں وہ کیا سوچیں گے۔"

اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور اٹھ کر چل دی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہو کر ہی گئی ہے۔ مگر اس ناراضگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

☆......☆......☆

صبح کا نیلگوں سحر پھیل چکا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر صحن میں آگیا۔ صحن میں ایک میلہ

سا لگا ہوا تھا۔ کافی ساری چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ شبانہ اور فرزانہ کے ساتھ شہباز بیٹھا ہوا تھا، ان کے پاس آفتاب، مدثر، شعیب اور جہانگیر بھی موجود تھا۔ ساوری اور رحماں مائی انہیں ناشتہ دے رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی مدد کے لئے بستی سے لڑکیاں بلالی تھیں۔ میں جیسے ہی صحن میں گیا وہ سبھی میری طرف دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ میں نے خوشگوار حیرت سے دیکھا تو رحماں مائی بولی۔

"بھائی، پانی بھرا پڑا ہے، کپڑے بھی وہیں رکھے ہیں، جاؤ نہا دھو کر تیار ہو جاؤ۔ پر جلدی آنا، اگر سب کے ساتھ ناشتہ کرنا ہے تو۔"

"او جاؤ یار، ہمیں کوئی بات کرنے دو۔" جہانگیر نے باتھ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو مجھے لگا کہ ضرور کوئی میرے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ مجھے تجسس ہونے لگا۔ ایسے میں گھر کے پھاٹک سے بختاور اور ساتول بھی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں سمجھ گیا کوئی اہم بات ہے۔

میں نہا کر واپس آیا تو سب ناشتہ کر رہے تھے۔ میں بھی خاموشی سے ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ درمیان میں یونہی ہلکی پھلکی باتیں چلتی رہیں۔ جب سارے ناشتہ کر چکے تو چاچا نے چارپائی پر پڑے تکیے سے کمر لگاتے ہوئے بڑے سکون سے پوچھا۔

"اچھا یار بختاور، اور ساتول تم بھی میری بات سنو۔ اگر علی زین کے ساتھ یہ چاروں بھی یہاں روہی سے چلے جائیں تو یہاں سب سنبھال لو گے؟"

ان کے یوں پوچھنے پر وہ کچھ دیر تک خاموش رہے، پھر بختاور ہی بولا۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ علی زین کے آنے سے پہلے ہم میران شاہ اور پیروزاں کا مقابلہ نہیں کر پائے تھے۔ ہمارے بہت بندے مارے تھے انہوں نے۔ اس میں کوئی شک نہیں، وہ تھے

بھی زور آور۔ ان کے علاوہ کوئی قبیلہ ہماری ٹکر کا نہیں تھا۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔"

"تم کیا کہتے ہو سانول؟" چاچا نے اس سے پوچھا۔

"ہم نے بڑے سخت حالات دیکھے ہیں۔ علی زین کے آجانے کے بعد اب تھوڑا سکھ کا سانس لیا ہے۔ باقی لڑنا تو حوصلہ ہے نا۔ میں نے نجانے کتنے برس یہاں ڈیرے کے گیٹ پر کھڑے ہو کر ان کی نگرانی کی ہے۔ میں باوجود اپنے اندر کی آگ کے، انہیں نہیں مار سکا تھا۔ یہی بات ہے ہم کمزور نہیں تھے لیکن ہم میں حوصلے کی کمی تھی۔ اب آپ کے آجانے سے میں بہت کچھ سمجھا ہوں، آپ چاہئیں تو یہاں کوئی بھی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔" سانول نے اس طرح کہا کہ چاچا سب کچھ سمجھ گیا۔ وہ کچھ دیر سر ہلاتا رہا، پھر گہری نگاہوں سے سب کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ سب یہاں ہو، کیونکہ ہم سب ہی ایک خاندان ہیں، ایک فیملی ہیں، یہ تقدیر میں تھا یا قسمت کا لکھا ہوا تھا، جو بھی تھا، اب سچائی یہی ہے۔ میں ایک صلاح دیتا ہوں اور آپ کا مشورہ بھی مانگتا ہوں۔ کیا ساوری اور علی کی شادی کر دی جائے۔"

یہ ایک دم سے دھماکا نہیں تھا بلکہ اس بات کے پیچھے پوری طرح سوچا گیا ورنہ چاچا یہ بات کبھی نہ کہتے۔ میں پرسکون رہا۔

"چاچا صاحب، یہ ہم سے کیا پوچھتے ہیں، جنہوں نے شادی کرنی ہے ان سے پوچھیں، ہم تو آئے ہی ان کی شادی کے لئے ہیں۔ ورنہ میں اور یہ لڑکیاں یہاں میلے دیکھنے نہیں آئے۔" شہباز نے اپنی مسکراہٹ روکتے ہوئے ساری بات ایک دم سے کھول کر رکھ دی۔ تبھی انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"یار میں تمہیں بے وقوف سمجھتا تھا مگر تم اتنے احمق ہو یہ مجھے پتہ نہیں تھا۔"

"چاچا صاحب سچ کہہ رہا ہوں، اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔" شہباز نے مصنوعی حیرت سے کہا تو چاچا بولے۔

"رائے لینا برائی نہیں، ساری بات کھول دینا بے وقوفی ہے۔"

ان کے اس تبصرے پر سبھی ہنس دیئے۔ چاچا نے میری طرف دیکھا، ان کی نگاہوں میں سوال تھا۔ میں سمجھ گیا وہ کیا پوچھ رہے ہیں۔ میں نے دھیمے سے اپنا عندیہ دیتے ہوئے کہا۔

"جی، جیسا آپ بہتر سمجھیں۔"

"مطلب تمہاری اپنی کوئی رائے نہیں، نہ پسند، نہ......" انہوں نے کہنا چاہا تو میں جلدی سے بولا۔

"نہیں، نہیں، میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ مجھے ساوری پسند ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں یہ ہوئی نا بات۔" چاچا نے سنجیدگی سے کہا، پھر ساوری کی طرف دیکھ کر بڑی شفقت سے پوچھا۔

"ہاں بیٹی، تم بتاؤ؟"

"جی میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" اس نے نرم سے لہجے میں سر جھکاتے ہوئے کہا تو چاچا نے پوچھا۔

"اب بتاؤ، کوئی دل میں خواہش، حسرت، کوئی آرزو، یا کوئی بھی شرط ہو، ابھی سے سب کہہ دو؟"

"چاچا جی میں نے سوچا بھی نہیں تھا جو مجھے مل گیا۔ میری زندگی کی حسرت تھی کہ میں اپنی ماں کا بدلہ لے سکوں، وہ میں نے لے لیا۔ میری خواہش تھی کہ علی زین مجھے مل جائے، وہ مجھے

مل گیا، آرزو تھی کہ میں اپنے باپ کو ایک اچھی زندگی دے سکوں، اسے مل گئی، چاہے اس کے زندگی جتنی بھی ہے" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی، پھر میری طرف دیکھ کر بولی، "بس ایک شرط ہے۔"

"کیسی شرط؟" چاچا نے حد درجہ سنجیدگی سے پوچھا تو سبھی اس کی طرف دیکھنے لگے۔ انہیں تو توقع نہیں تھی کہ ساوری کوئی شرط بھی رکھے گی۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر انتہائی سنجیدگی سے بولی۔

"میری شرط یہ ہے کہ جہاں علی رہے گا، میں وہیں رہوں گی۔"

"ایسا ممکن نہیں ہے۔" میں نے فوراً اس کی بات کا جواب دے دیا۔

"کیوں ممکن نہیں ہے۔" چاچا نے پوچھا پھر تپے تلے انداز میں بولے، "ظاہر ہے بیوی وہیں رہے گی جہاں اسے اس کا خاوند رکھے گا۔"

"مگر آپ جانتے ہیں کہ میری زندگی......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے۔

"کیا ہو گیا زندگی کو؟ جہاں ساوری رہتی ہے، وہیں رہو۔ کہاں پر کیا ہو رہا ہے، چھوڑو اسے۔ اپنی زندگی سنوارو، کیا تمہارے نہ ہونے سے دنیا کے کام رک جائیں گے۔ اب یہ تمہارا فیصلہ ہے تم یہاں روہی میں رہو یا لاہور جا کر رہو۔"

"تو پھر میں سوچ کر بتاؤں گا، مجھے کیا کرنا ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"ٹھیک ہے تمہارے پاس ایک دن ہے، سوچ لو۔ کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہم ایک دن مزید ہیں یہاں پر۔" چاچا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ چاچا مجھے پرکھ رہے ہیں۔ میں نجانے کیوں جذباتی ہو گیا تھا۔

"چاچا، میں یہ مانتا ہوں کہ ساوری میری محبت ہے، یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے، بچپن

کے ان دنوں سے ہے، جب میں محبت کے بارے میں جانتا بھی نہیں تھا۔ لیکن مجھے آپ نے اس قابل بنایا کہ میں اسے دوبارہ ساوری سے مل سکوں، اپنی محبت حاصل کر سکوں۔ آپ ہی میری ماں ہیں اور آپ ہی میرے باپ۔ جو بھی آپ فیصلہ کریں، مجھے منظور ہے۔"

"میرا تو فیصلہ ہے کہ تم ساوری سے شادی کرو، اور اس کی شرط کے مطابق کرو۔ جہاں رہو، اسے ساتھ رکھو۔" چاچا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے مجھے ساوری کی شرط منظور ہے۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"جاگا بٹھا دو۔" شہباز نے اونچی آواز میں اعلان کرتے ہوئے کہا۔

"اوئے تمہیں جاگے کا کیسے پتہ ہے؟" مدثر نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی سن کر تو میں آیا ہوں، سنا ہے یہاں راجستانی ڈانس دیکھنے کو ملے گا۔" اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا تو سبھی ہنس دیئے تو جہانگیر نے سر مارتے ہوئے غصے میں کہا۔

"پہلے ایک راجستانی ڈانس نے کیا کچھ نہیں کر دیا۔"

"شادی آج ہی ہوگی۔ کل ہم واپس لاہور جا رہے ہیں۔" چاچا نے کہا تو سبھی نے اس کی طرف دیکھا، کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان حکم سے روگردانی کرے۔ سو وہاں پر سبھی کام بانٹنے لگے۔

دوپہر تک آس پاس کی ساری بستیوں والے اکٹھے ہو گئے۔ وہی دعوت پکانے والے اور کھانے والے بھی تھے۔ وہی باراتی بھی تھی اور وہی لڑکی والے، ایک میلہ سج گیا تھا۔ دوپہر کے بعد میرا اور ساوری کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ اس دن بابا خیر دین بہت خوش تھا۔ اس نے کئی بار اپنی اس خوشی کا اظہار کیا۔ وہ لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔ سارا دن وہیں کھیل تماشے ہوتے رہے، لوگ خوشیاں مناتے رہے۔ چاچا نوٹوں کا ایک بیگ ساتھ لے کر آئے تھے۔ انہوں

نے وہاں کے لوگوں میں وہ جی بھر کر بانٹے تھے۔
رات گئے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہر طرف خاموشی طاری ہو گئی۔ میں ڈیرے پر سب کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ رہائشی حصے کی طرف سے رحمان مائی کی آواز آئی۔ سانول نے مجھے بتایا تو میں ادھر چلا گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔
"اندر آ جانا بھائی، اس بے چاری کا کیا قصور، کچھ باتیں اس نمانی ساوری سے بھی جا کے کر لے۔"
"او اچھا، کدھر ہو وہ؟" میں نے جان بوجھ کر پوچھا۔
"اماں سکھن والے کمرے میں۔" اس نے کہا اور کچھ دور کھڑی لڑکیوں کی طرف چلی گئی۔
کمرے میں داخل ہوتے ہی خوش کن مہک نے میرے وجود کو سرشار کر دیا۔ کمرے کی ہیت ہی بدلی ہوئی تھی۔ ایک بڑا سا بیڈ پڑا ہوا تھا۔ سارا کمرہ پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ سفید بیڈ شیٹ پر میرون رنگ کے لہنگا پہنے، گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ وہ اس کے ارمان تھے۔ میں قریب گیا، اس کا ہاتھ پکڑا، اسے انگوٹھی پہنائی اور گھونگھٹ اٹھا دیا۔ وہ ہلکا ہلکا میک اپ کیے کسی دوسری دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ میرے خیال میں سارا کچھ آج ہی بہاول پور سے یہاں تک پہنچا تھا اور خاموشی سے کمرہ سجا دیا، جیسے صحرا میں گلستان بنا دیا گیا ہو۔ میں نے یونہی شرارت سے انتہائی سنجیدگی سے اٹھتے ہوئے کہا۔
"او معاف کرنا، مجھے ساوری کے کمرے میں جانا تھا، غلطی ہو گئی۔"
"مریں میں ہی ہوں۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو ہنستے ہنستے میرے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ میں وہیں بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں بے تحاشا ہنسا۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا، ساوری نے میرا ہاتھ کب پکڑا۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا تو میری طرف بڑے جذباتی انداز سے دیکھ رہی

تھی۔ ایک دم سے میری ہنسی رک گئی۔ میں نے خجل سا ہوتے ہوئے کہا۔

"معاف کرنا ساوری، آج زندگی میں پہلی بار اتنا ہنسا ہوں۔"

"تمہی میری زندگی کا حاصل ہیں علی، اب چاہے ابھی موت آ جائے، مجھے کوئی پرواہ نہیں۔" ساوری نے یوں کہا جیسے وہ کسی اجنبی لہجے میں بات کر رہی ہو۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ رات نجانے کب سحر میں بدل گئی، ہمیں احساس ہی نہیں ہوا۔

ناشتے کے وقت پھر ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ اس صبح بابا خیر دین بھی وہیں موجود تھا۔ میں سب کے درمیان میں ناشتہ کرنا چاہتا تھا لیکن رجاں اور مہمان لڑکیوں نے کمرے میں ہی ناشتہ لگا دیا۔ ساوری نئی نویلی دلہن تھی، مجھے اس پر بہت پیار آ رہا تھا۔ اس کی محبتیں تو تھیں، شدتیں بھی کمال کی تھیں۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا علی میں نے تم سے ایک بات کرنی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"بولو، کیا بات ہے۔" میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"علی، میں سب جانتی ہوں تمہارے بارے، مجھے پتہ ہے تم ایک جگہ کبھی نہیں رہ سکتے۔ میں نے کل جو شرط لگائی تھی، چاچا کے کہنے پر لگائی تھی۔ انہوں نے ہی مجھ سے کہا تھا۔"

"میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیوں لیکن مجھے یہ بتا کہ انہوں نے یہ بات مجھ سے چھپانے کو کہا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں، یہ نہیں کہا۔" اس نے اپنی رو میں کہہ دیا۔

”پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا تو لمحہ بھر میری طرف دیکھتی رہی جیسے میری بات سمجھ رہی ہو پھر دھیمے سے بولی

”علی، مجھے بس چند دن دے دو۔ محض چند بھرپور دن، ایسے دن جو صرف میرے ہوں۔ پھر چاہے جو مرضی کرنا، جدھر مرضی جانا۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔ میں یہیں رہوں گی روہی میں۔ جانتی ہوں یہاں کیسے رہنا ہے۔“

میں اس کی بات کا جواب نہیں دے سکا، بس اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ نجانے اس کے من میں کیا کچھ چل رہا تھا۔

اس دن ہمیں لاہور کے لئے نکلنا تھا۔ نجانے کیوں میرا دل اداس ہو رہا تھا۔ میں گھر سے نکل گیا۔ میں پہلے دور ایک ٹیلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی بستی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت میں نے واضح طور پر محسوس کیا جیسے میرے اندر وہ بچہ اب شور نہیں مچاتا، نہ روتا ہے نہ بلکتا ہے، کوئی آگ مجھے گھیرے میں نہیں لیتی۔ کچھ دیر بعد میں وہاں سے ڈیرے کی جانب چل پڑا۔ میں ابھی ڈیرے سے تھوڑے فاصلے پر تھا کہ مجھے سامنے سے سانول آتا ہوا دکھائی دیا۔ میرے قریب آتے ہی بولا۔

”کدھر چلے گئے تھے۔ میں تمہیں دیکھنے نکلا تھا۔“

”بس یار ادھر باہر نکلا تھا، تم آؤ ذرا وہاں تک چلیں جہاں کھجور ہے، جہاں تمہاری بھیڑیں بیٹھا کرتی تھیں، جہاں ہم بچپن میں کھیلتے تھے۔“ میں نے خود واضح طور پر محسوس کیا کہ میں جذباتی ہو رہا ہوں۔ سانول میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا۔ ہم اس کھجور کے نیچے آ کر کھڑے ہو گئے لیکن ہم نے ایک لفظ بھی ایک دوسرے سے نہیں کہا جیسے کچھ کہے بنا ہم سب کچھ سمجھ رہے ہوں۔ اچانک سانول نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ تبھی میں نے

اسے گلے لگایا اور ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

دوپہر سے ذرا پہلے ہم لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ رجاں مائی، سانول، بختاور، چاچا سائیں، بابا خیر دین اور بستی والے ہمیں الوداع کہتے ہوئے خوش تھے۔ ان کے چہروں پہ مسکراہٹ زندگی سے بھرپور تھی۔

لاہور آتے ہی نجانے کیوں مجھے ایک دم سے یہاں کا ماحول اجنبی لگا۔ حالانکہ میرا لڑکپن اور جوانی یہیں گزری تھی۔ تب رونق ہوا کرتی تھی۔ اب آیا تو لگا جیسے رش ہے۔ انسانوں کا ایک ہجوم ہے۔ میں خود پہ حیران تھا۔ مجھے یہاں سے گئے اتنا عرصہ نہیں ہوا تھا۔ روہی میں تھوڑا سا ہی وقت گزارا تھا۔ شاید جنم بھومی سے محبت لاشعور میں بسی ہوتی ہے یا فطرت کا حصہ بن جاتی ہے۔

وہ چاروں لاہور آتے ہی غائب ہو گئے۔ ہاں مگر شہباز مجھے روزانہ ملنے آتا رہا۔ ہم تھوڑا وقت ساتھ رہتے، پھر وہ چلا جاتا۔ مجھے رہنے کے لئے ماڈل ٹاؤن میں ایک گھر مل گیا تھا۔ وہاں میں ساوری کے ساتھ رہتا تھا۔ ہمارے ساتھ چند لوگ تھے، جو گھر کے مختلف کام کرتے تھے۔ ان میں شبانہ اور فرزانہ بھی شامل تھیں۔ وہاں آکر مجھ پر آشکار ہوا کہ وہ لڑکیاں بھی ہمارے ہی قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کا پتہ اس دن چلا جب ایک صبح ساوری نے مجھ سے کہا۔

”علی، تم نے مجھے بتایا تھا، کالج کے دنوں میں تمہاری ایک دوست ہوا کرتی تھی، شاید اس کا نام تم نے صائمہ بتایا تھا۔“

”ہاں تھی، بات کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ تمہیں مغل بادشاہ کے دربار پہ لے کر جایا کرتی تھی۔“ ساوری نے لبوں میں ہنستے ہوئے کہا تو مجھے اس کے طنز کی سمجھ آ رہی تھی۔ لیکن میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

”وہ مغل بادشاہ تو تھا، جہانگیر اس کا نام تھا، لیکن اس کا دربار نہیں ہے، اس کا مزار ہے وہاں پر، اس کے ساتھ دراصل ایک باغ ہے۔“

”تو چل مجھے وہ جگہ دکھا کر لا۔“ اس نے ایک دم سے کہا۔

”ٹھیک ہے ہو جاؤ تیار میں لے جاتا ہوں“ میں نے عندیہ دیا تو وہ اٹھ کر تیار ہونے لگی۔

جس وقت میں نے گاڑی نکالی تو شبانہ اور فرزانہ بھی تیار ہوئی ساتھ کھڑی تھیں۔ میں نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا اور پھر سکون سے پوچھا۔

”ساوری، یہ بھی جائیں گی؟ تم نے کہا ہے ان سے؟“

”میں نے کب کہا ہے، یہ تو چاچا عبدالمجید کی طرف سے یہاں پر ہیں۔“ اس نے کہا تو میں چونک گیا۔ تبھی میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا تو شبانہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”ہم ساوری کو اکیلے کیسے چھوڑ سکتی ہیں۔“

”اوہو، تو یہ بات ہے ٹھیک ہے، چلو پھر۔“ میں نے کہا اور ساوری کے ساتھ گاڑی کی پچھلی نشست پر آن بیٹھا۔

اگرچہ میں ساوری کے ساتھ بھرپور وقت گزار رہا تھا، اسے باہر پھرانے لے جاتا، کبھی شاپنگ، کبھی ڈنر، کبھی ویسے ہی آوارہ گردی لیکن تقریباً دو ہفتے گھر ہی میں رہنے سے میں اُکتا گیا تھا۔ انہی دنوں شام کے وقت چاچا اور شہباز آ گئے۔ ایویں ہی ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد ہم نے ڈنر کیا۔ تبھی وہیں بیٹھے بیٹھے چاچا نے مجھ سے کہا۔

”جب بھی تمہارا کوئی کام کرنے کو جی چاہے تو بتانا۔“

”وہ دل تو کب کا کر رہا ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں جانتا تھا تم گھر نہیں ٹک سکتے، خیر کل آفس آ جانا، تمہیں کوئی ریسرچ ورک دیتے

ہیں، یہ شہباز بھی وہیں ہے۔" انھوں نے عام سے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے، کل آ جاؤں گا۔" میں نے کہا تو مجھے لگا مصروفیت مل گئی۔

اگلے دن جب میں آفس جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا تو ساوری نے میری بھرپور مدد کی۔ میں نے کار نکالی اور آفس جا پہنچا۔ بہ ظاہر وہ امپورٹ ایکسپورٹ کمپنی تھی لیکن وہاں پر ارد گرد کے حالات پر نہ صرف نگاہ رکھی جاتی تھی، بلکہ ان کا تجزیہ بھی کیا جاتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ بس وہاں گپ شپ ہو گی لیکن وہاں اچھا خاصا کام تھا۔ ایسے ہی ایک صبح آفس جاتے ہی شہباز نے میرے سامنے ایک فائل رکھتے ہوئے کہا۔

"اسے پڑھو، جب پڑھ لو تو پھر اس پر بات کرتے ہیں۔"

"تم نے پڑھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پڑھی ہے، اسی لئے تمہیں دے رہا ہوں نا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو بتا دو، کیا ہے اس میں؟" میں نے کہا تو بولا۔

"تم پڑھو گے نا، تب تمہیں سمجھ آئے گی، اس میں دراصل ہے کیا، یہی تمہیں پڑھانا ہے۔ تم اسے پڑھو میں تمہارے لئے کافی بھیجتا ہوں۔"

"اوکے میں دیکھ لیتا ہوں۔" میں نے کہا اور فائل کھول لی۔ وہ کمرے سے جا چکا تھا۔ پھر فائل پڑھتے ہوئے مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ شام کب ہو گئی۔

اس فائل میں 'کلیان جی' نامی تنظیم کے بارے میں وہ معلومات درج تھیں، جس کے بارے ابھی تک میں نہیں جانتا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ چونکا دینے والی معلومات فائل کے آخری صفحات پر تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تنظیم بھارتی پنجاب اور راجستھان کے کچھ علاقوں تک محدود تھی۔ اس کا اصل مقصد جو بھی تھا، اس سے کام تو بھارتی خفیہ ایجنسی ہی لیتی

تھی۔اس تنظیم کی سب سے زیادہ مہارت، اغواء، دہشت گردی اور قتل تھا۔اس کا زیادہ تر اثر بھیں راجستھان اور پنجاب میں تھا۔لیکن کچھ عرصے سے یہ مغربی پنجاب میں بھی اپنا اثر ورسوخ بنا گئے تھے۔روہی میں یہ تنظیم تو اتنا دکھائی نہیں دی لیکن یہ فائل بتا رہی تھی کہ ان کا اثر ورسوخ مغربی پنجاب تک آن پہنچا ہے۔کوئی بھی ایسا 'اہم' شخص ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ جن لوگوں کے ذریعے کلیان جی کے لوگ مغربی پنجاب میں پہنچے تھے، ان میں زیادہ تر ننکانہ صاحب کے علاقے کے لوگ تھے۔یہ سلسلہ قصور اور بہاول نگر تک پھیلا ہوا تھا۔اس پٹی میں کچھ وارداتیں ایسی ہو چکی تھیں، جن سے پتہ چلتا تھا کہ یہاں ایسے لوگوں کی موجودگی ہے۔ ان کے تانے بانے باہر کے علاقے، خاص طور پر بنکاک اور پتایا سے مل رہے تھے۔یہ فائل ایک گورکھ دھندہ تھی۔جسے بہت مشکل سے سمجھا تھا لیکن آخری صفحات پر مجھے چند تصویروں کے ساتھ ایک ایسی تصویر دیکھنے کو ملی، جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔وہ پوجا کی تصویر تھی۔وہ یہاں کیسے تھی اور کہاں تھی، یہ کوئی پتہ نہیں تھا۔

شام ڈھلے میں چاچا عبدالمجید کے پاس جا پہنچا۔مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے ہی انتظار میں ہیں۔میں جیسے ہی ان کے پاس جا کر بیٹھا وہ مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولے

"لگتا ہے اس فائل نے اثر دکھا دیا ہے جو تم نے آج پڑھی۔"

"جی۔" یہ کہہ کر میں چند لمحے خاموش رہا، پھر پوچھا "کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں ان کے پیچھے جاؤں؟"

"تم ان کے پیچھے کیا جاؤ گے، وہ تمہاری تلاش میں یہاں تک آ گئے ہیں۔" انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا تو میں نے بے ساختہ کہا۔

"میری تلاش میں...... میں سمجھا نہیں؟"

"دیکھو، میں تمہیں اب تفصیل سے بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوئے
پھر کہتے چلے گئے، "کچھ عرصہ پہلے تمہیں یاد ہے، دو بھارتی یہاں آئے تھے، جنہیں تم نے
پولیس کے حوالے کیا تھا۔ بہت کچھ ان سے ملا، انہوں نے کافی کام کی باتیں بتائیں۔ جس
سے ان کے نیٹ ورک کو سمجھنے میں مدد ملی، وہ اب بھی ہمارے پاس ہیں۔ انہوں نے رما کانت
کی سندر بستی کو اپنا ٹھکانہ بنانے کی کوشش کی، یہ دو لوگ وہیں سے تم تک پہنچے تھے۔ تم نے منگل
سندری کی جوان دونوں کو پولیس کے حوالے کیا۔ ان کی تنظیم کا خیال یہی ہے کہ دونوں مر چکے
ہیں مگر وہ یہاں آسائش میں ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ، میں ان سے مل سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" یہ کہا اور پھر بولے، "رما کانت کے پاس وہ بیوپاری بن کر ہی آئے
تھے۔ لیکن اس کے بیٹے کو خبر تھی۔ ان کا ایک آلہ کار چھوٹو رام تم سب کی ٹوہ لے رہا تھا۔ یہاں
تک مجھے پتہ تھا۔ میں نے ساوری کو بھیجا اور اسے کسی نہ کسی طرح چھوٹو رام تک رسائی کرنے
کا کہا۔ خیر اس نے جو کیا وہ میرے کہنے پر کیا۔ اب اس سے پوچھنا مت۔"

"نہیں پوچھوں گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا تو چاچا کہنے لگے۔

"سانول کے ذریعے اسے روہی مل گئی۔ وہاں کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ یہ تھی وہ وجہ،
جس کے لئے سانول کی شادی پر اسے بلایا گیا تھا۔ روہی کا تم لوگوں کے درمیان ہونا کسی
دھماکے سے کم نہیں تھا اور پھر وہ ہو گیا، جو میں چاہتا تھا۔ مجھے تمہیں یقین تھا کہ تم اسی رات یہ
سب کر دو گے لیکن آخر کار تم نے کرنا وہی تھا۔ اسی رات جب رما کانت کو تم ڈیرے پر لے
آئے تو انہیں ڈرایا ہی بہت گیا۔ سو اس کا بڑا بیٹا معافی مانگنے پر مجبور ہو گیا کہ کسی طرح میرے
باپ کو واپس کر دیا جائے لیکن اسے کوئی خبر بھی نہ ہو۔ اس کے عوض جو کچھ کہیں وہ کرنے کو تیار

ہیں۔ پھر اس نے مجھے سب بتایا۔"

"کیا بتایا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"یہی کہ کئی لوگ علی زین کی تلاش میں آ چکے ہیں، انہوں نے روہی آنا ہے کب آتے ہیں یہ پتہ نہیں۔ دوسرا ان کا ٹھکانہ کہیں لاہور کے آس پاس ہے، ممکن ہے وہ وہیں ہوں۔" انہوں نے سنجیدگی سے بتایا۔

"کچھ پتہ چلا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، میں شہباز کو اور ان لڑکیوں کو اسی لئے ساتھ لے کر گیا تھا۔ انہوں نے کافی کوشش کی۔ خیر، اب وہ لوگ کب اور کہاں سے نمودار ہو جائیں، یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں یہ سب کیسے ہو گیا؟"

"جی کیسے ہوا؟" میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"ہماری دنیا میں جب بھی کوئی معرکہ مارا جاتا ہے تو اس کے سائیڈ افیکٹ ہوتے ہیں۔ جو بندہ سامنے آتا ہے اگر وہ کہیں مارا جائے تو اور نہ مارا جائے تب بھی، یہ پتہ لگ جاتا ہے کہ وہ کون لوگ تھے۔ دوسرا یہ ہوتا ہے دشمن کا اندازہ ہو جاتا ہے، اور تیسرا جو تنظیم بھی اپنا ہدف پورا کر لیتی ہے اس کا وزن سامنے آ جاتا ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ جسے زخم لگا ہو وہ بدلہ تو لینا ہے چاہئے جیسے بھی لے، اسے تب تک سکون نہیں آتا۔ میں نے صورت حال تمہارے سامنے رکھ دی ہے اور اب یہ تمہارے پاس آپشن ہے کہ تم ان کا سامنا کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

آخری فقرہ کہتے ہوئے انہوں نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا بات کہہ دی آپ نے؟" میں دبے دبے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"نہیں، میرا مطلب تم بتایا جانا چاہو گے، وہاں سے اپنا کام کرو گے یا یہاں سے انہیں

کاؤنٹر کرو گے؟ جیسے تمہاری مرضی، یہ سب کرنا تم نے ہی ہے۔ انہیں نہ صرف تلاش کرنا ہے بلکہ ان کا یہاں موجود نیٹ ورک ختم کرنا ہے، یہ لوگ کینسر کی مانند ہیں۔ ان کا وجود برداشت نہیں کیا جا سکتا۔" چاچا آخری لفظ کہتے ہوئے ایک دم سے جذباتی ہو گئے۔

"جیسے آپ کہیں۔" میں نے تذبذب میں کہا تو وہ بولے۔

"تمہیں اب تک فیصلہ کرنا نہیں آیا؟"

"میں یہیں سے دیکھوں گا۔" میں نے ایک دم سے فیصلہ دے دیا۔

"گڈ...... تم ابھی نکل جاؤ، شہباز تمہارے ساتھ ہو گا۔" چاچا نے کہا تو میں کوئی لفظ کہے بنا اٹھا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ جب تک میں پورچ میں آیا، میں نے شہباز کو کال ملالی تھی۔

☆......☆......☆

راوی پل پار کرنے تک میں سوچتا چلا گیا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو اب تک کلیان جی وغیرہ کے چکر میں آ گیا ہوتا۔ یہ چاچا عبدالمجید ہی تھے جنہوں نے بڑی سہولت سے معاملے کو سنبھال لیا تھا۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ ساوری اس حد تک معاملات کو سمجھ سکتی ہے۔ نجانے کیوں، اس معاملے میں وہ میرے سامنے نہیں کھلی تھی۔ خیر جو بھی تھا، اس نے بڑے سلیقے سے اپنا کردار ادا کیا۔ وہ سب کس طرح ہمیں لاہور لے آئے تھے۔ مجھے احساس ہی نہیں ہونے دیا ورنہ اب تک شاید میں جذبات میں پھنسا رو ہی میں ہی ہوتا۔

راوی پل پار کرتے ہی بائیں جانب مجھے شہباز کی فور وہیل دکھائی دی۔ میں نے کار بالکل اس کے قریب روک دی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شہباز بیٹھا ہوا تھا۔ میں اترا اور فور وہیل تک جا پہنچا۔ پسنجر سیٹ سے ایک لڑکا اتر چکا تھا، میں نے کار کی چابی اسے تھمائی اور خود شہباز کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے فور وہیل بڑھا دی۔

تھوڑا سا آگے بڑھنے کے بعد بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"سنا فیر کیا سنے گا؟ گیت، دوہڑہ ماہیا یا پھر کوئی سڑا ہوا گانا؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"او یار تم تو یوں ساتھ میں بیٹھے ہوئے ہو جیسے کوئی روبوٹ ہو، یار جو چند لمحے میسر ہیں، انہیں خوب انجوائے کرو۔" اس نے لہراتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کیا خیال میں سیٹ پر بیٹھا ناچنے لگوں؟" میں نے جل کر پوچھا۔

"ناچ نہیں لیکن موج میں تو آ سکتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا پھر ہنستے ہوئے بولا، "میں نے سنا ہے تم نے پوجا کے ساتھ تھوڑا وقت بھی گزارا ہے، مطلب اکیلے بھی رہے ہو اس کے ساتھ؟"

"ہاں یار، اسے دیکھ کر نجانے کیوں مجھے سانپ کا خیال آنے لگتا ہے۔ دیکھنے میں بڑی خوبصورت ہے۔ چکنی اور بجو شفاف جلد والی، ہاتھ لگے تو اسے سلوٹ پڑ جائے۔ مگر اتنی ہی زہریلی ہے۔ بس یوں سمجھ لو، کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا، دونوں ہی پورے نہیں کر سکا۔" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ شہباز کیا چاہتا تھا۔ اس لئے فوراً اپنے رویے میں تبدیلی کر لی تھی۔ ایسا کر کے اچھا لگا مجھے۔

"اب اگر وہ تمہارے سامنے آ گئی، تو کیا کرو گے، عشق یا کام؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا تو میں لہراتے ہوئے بولا۔

"عشق تو شاید نہ ہو سکے، اب سیدھے سیدھے کام ہی ہو گا۔ وہ جو میرے ہجر میں یہاں تک آ گئی ہے، اس کا تھوڑا بہت صلہ تو اسے ملنا چاہئے۔"

"یار ویسے ایک بات ہے، کیا وہ پوجا ہی ہو سکتی ہے کوئی دوسری بھی تو ممکن ہے، جیسے کہ اس

کی جگہ بھیج دیا گیا ہو۔" اس نے یونہی بات بڑھانے کی غرض سے کہا تو میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"یار وہ پوجا ہو یا پوجا کا عکس، کوئی بھی ہو، بھیجنے والوں نے تو پوجا ہی کو بھیجا ہے نا، ہم نے تو اسے ہی دیکھنا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا چھوڑ پوجا کو، یہ بتا، جب تم ہاسٹل میں میرے پاس آئے تھے، تب کچھ اور ہی شے تھے، اب بالکل بدل گئے ہو، ایسا کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"تم بھی تو کبھی فریل سے ہاکی کے کھلاڑی تھے، پھر بن گئے شہر کا ایک غنڈہ، اب ایک اور ہی شے ہو۔ انسان ترقی کرتا ہے یا تنزلی، یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" اس نے دکھی سے لہجے میں کہا اور پھر ایک دم سے قہقہہ لگا دیا۔

"ہاں یار ہم یہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔" میں نے دھیمے سے کہا۔

"لیکن ایک بات ہے، زندگی جیسے بھی ہے، جو بھی، اس کی زیادہ ٹینشن نہیں لینی چاہئے۔ جو ہے ہی بے وفا، یہ اس کی مرضی ہے جتنی دیر ہمارے ساتھ رہے، جب جائے گی تو اپنی مرضی سے جائے گی" اس نے کہا پھر ہنستے ہوئے بولا۔ "تو ہم پھر سے اسی کھردرے موڈ میں آ گئے۔"

"یہی زندگی ہے پیارے، گھما کے اپنے محور پر لے آتی ہے۔" میں نے کہا اور جاندار قہقہہ لگا دیا۔ میری ٹینشن واقعی ہی ختم ہو گئی تھی۔ شہباز کا ساتھ بہت شاندار لگا تھا مجھے۔ تبھی وہ بولا

"ہے نا کتنی ظالم ہے، کسی مغرور محبوبہ کی طرح۔"

"بالکل، اچھا یہ بتا، ہم جا کہاں رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یار یہ ننکانہ صاحب شہر کے ساتھ ہی جڑانوالہ روڈ پر ایک گاؤں ظفروال ہے۔ وہاں میرا

ایک یار رہتا ہے، اس سے ملنے جاتا ہے۔ تھوڑی گپ شپ کرتے ہیں وہاں جا کر۔" اس نے عام سے لہجے میں بتایا۔ پھر وہ مجھ سے اپنے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

شہباز بھی لاہور کے مشرقی علاقے میں موجود ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ بچپن انتہائی غربت میں گزرا۔ لیکن ذہنی اور جسمانی طور پر بہت مضبوط تھا۔ پانچویں کلاس کے بعد ایک کارخانے میں کام کرنے لگ گیا۔ وہاں اس کی لڑائی اپنے ہی ایک ہم عمر سے ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کارخانے سے اسے نکال دیا گیا۔ چند دن بعد ہی وہ وہاں سے نکل کر شہر آ گیا۔ شہر میں ایک دوکان پر کام کرنے لگا اور کوئی ایک برس بعد اس کے کسی گاؤں والے نے اسے دیکھا تو گھر والے اسے واپس لے گئے۔ خیر، جیسے تیسے وہ دوبارہ پڑھنے لگا لیکن ساتھ میں محنت مزدوری کرنے لگا۔ وہ میٹرک بہت اچھے نمبروں سے پاس کر چکا تو شہر میں مزنگ چونگی کے پاس ایک دوکان پر کام کرنے لگا۔ یہاں سے اس کے دل میں مزید پڑھنے کا، ایک اچھی زندگی گزارنے کا خیال پیدا ہوا تو اس کا دھیان دو نمبر کام کی طرف چلا گیا۔ ذہنی طور پر وہ پہلے ہی مضبوط تھا۔ بس اسے موقع ملنے کی دیر تھی۔ وہاں ایک جعلساز سے رابطہ ہو گیا۔ بس پھر اس کی زندگی بدلنے لگی۔ وہ سینکڑوں روپے کمانے لگا۔ جب تک وہ یونیورسٹی میں پہنچا، تب تک بات سینکڑوں سے چلی تو ہزاروں تک جا پہنچی، جس وقت وہ مجھے ملا، اس وقت تک وہ لاکھوں میں پہنچ چکا تھا۔ انہی دنوں وہ چاچا عبدالمجید کی نگاہوں میں آ گیا۔ چاچا نے اسے سنبھال لیا۔ اسے ایک مثبت راہ دکھائی، وہ مان گیا۔ اس کی تربیت ہوئی، اسے ملک سے باہر جانے کے کئی مواقع ملے۔ وہ کئی ملکوں میں گیا اور کام کرتا رہا۔ بہت عرصے سے وہ لاہور اور اس کے گرد و نواح میں کام کر رہا تھا۔ ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی اور نہ کرنے کا ارادہ تھا۔ اگرچہ اس کے والدین اور ایک بھائی بہن موجود تھے۔ ان سے رابطہ بھی تھا۔ کبھی کبھار ان سے جا کر مل بھی

لینا ہے، روپے پیسے نے ان کی زندگی بدل دی تھی اس نے۔لیکن کسی کو اس کے خاندان اور گھر کا پتہ نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں ہیں۔ کلیان جی کے بارے میں اتفاقاً اسے پتہ چلا تھا کہ یہاں کوئی تنظیم کام کرنے لگی ہے، نام کا اسے بعد میں پتہ چلا تھا۔ پھر مزید پتہ چلتا گیا۔ انہی باتوں میں ہم ننکانہ صاحب شہر کے باہر سے ہوتے ہوئے ظفروال کی جانب چل پڑے تھے۔

"کتنی دور ہے یار۔" میں نے پوچھا۔

"بس پہنچ گئے، وہ سامنے پیٹرول پمپ ہے نا اس سے پہلے ہی ہم بائیں مڑ جائیں گے۔" اس نے کہا اور اگلے ایک منٹ بعد ہم دائیں جانب مڑ گئے۔ گاؤں میں مختلف دوکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے بالکل چوک میں مسجد کے سامنے جا ٹھہرے۔ "لو بھئی پہنچ گئے۔"

زاہد حمید ہمارے انتظار ہی میں تھا۔ اس نے باہر والا کمرہ کھلوایا تو ہم اس میں جا بیٹھے۔ عام سی گپ شپ میں کھانا لگ گیا، ہم کھانے کے دوران باتیں کرتے رہے، خوب جی بھر کر کھا چکے تو چائے پیتے ہوئے شہباز نے کہا۔

"یار وہ تیرے گاؤں میں مشا سائیں کا میلہ لگا کرتا ہے۔"

"ہاں نا، لیکن اس میلے میں تو ابھی دیر ہے وہ ٹھنڈے میٹھے موسم میں لگتا ہے، کیوں خیر ہے؟" اس نے پوچھا تو شہباز نے عقیدت سے کہا۔

"نہیں یار اس میلے پر بڑے لوگ آئے تھے۔ ان میں ایک درویش خاتون بھی تھی، سنا ہے بہت پہنچی ہوئی ہستی تھی۔ یہاں شاید کسی کے ہاں مہمان آئی ہوئی تھی۔ لوگ کہتے ہیں بڑی کرنی والی خاتون تھی۔"

"ہاں یار آئی تو تھی، پتہ نہیں اب ہے کہ نہیں۔ اصل میں وہ مشا سائیں کے ڈیرے پر نہیں

آئی تھی۔ یہاں ساتھ ہی ایک گاؤں ڈھاری جتاں ہے، وہاں ایک گھر ہے، وہ درویش خاتون ان کے ہاں آئی تھی۔ اب پتہ نہیں وہاں ہے کہ نہیں۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یار اس کے بارے میں معلومات مل سکتی ہیں؟" شہباز نے تیزی سے پوچھا تو زاہد نے حیرت سے سوال کیا۔

"خیریت ہے تمہیں اس سے کیا کام؟"

"یار ہمارا ایک دوست ہے، اس کی بیوی پر کوئی سایہ وایہ ہے، سنا ہے کہ وہ خاتون اس کا علاج کر لیتی ہے۔ ہم نے سوچا....." یہ کہتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اچھا میں پتہ کروا تا ہوں۔" اس نے کہا۔

"نہیں تم ہمارے ساتھ چلو، وہیں سے پتہ کر کے ہم واپس نکل جائیں گے، تم گھر آجانا، ہم مل بھی لیں گے اگر وہ وہاں ہوئی تو۔" شہباز نے جلدی سے کہا تو زاہد برا سا منہ بنا کر بولا۔

"جب بھی آتے ہو، ہوا کے گھوڑے پر سوار، رات رہو، گپ شپ کرتے ہیں، اس کا پتہ کروا لیتے ہیں، صبح جا کر مل لیں گے۔ اتنی کیا ایمرجنسی ہے۔"

"اوئے تجھے پتہ تو ہے میرا باس کتنا لیچڑ بندہ ہے چھٹی ہی نہیں دیتا، اب بھی ان کی گاڑی لے کر ساتھ میں آیا ہوں تا کہ واپسی ہو سکے، تو چل نا یار۔"

شہباز نے کچھ اس طرح کہا کہ جیسے ابھی اسے نوکری سے نکال دیا جائے گا، تبھی زاہد نے اسے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا۔

"اچھا اچھا چلتے ہیں۔"

یہ کہتے ہی وہ اٹھ گیا اور اگلے دس منٹ بعد اس کا ڈرائیور گاڑی نکال چکا تھا۔ ہم پھر واپس

ننکانہ صاحب روڈ پر چل دیئے، کوئی چند کلومیٹر کے بعد وہ دائیں جانب مڑ گیا اور پھر ڈھاری جٹاں گاؤں آ گیا۔ کافی پرانا گاؤں لگ رہا تھا۔ جن اینٹوں سے مکان بنے ہوئے تھے، وہ اب نہیں بنتی تھیں۔ وہ گھر یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی چھوٹی سی حویلی ہو۔ بڑے سارے لکڑی کے پھاٹک سے گزر کر جب زاہد نے اپنی کار روکی تو سامنے کھڑے دونوں جوان الرٹ ہو گئے۔ ان کے الرٹ ہونے کا جو انداز تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی تربیت یافتہ لوگ ہیں۔ عام آدمی کو ذرا بھی پتہ نہیں لگ سکتا تھا کہ وہ کتنے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ زاہد کو کار سے اترتے دیکھ کر وہ کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ ہم بھی اتر کر اس کے ساتھ ہو گئے۔ ایک عام سے کمرے میں ہمیں بٹھایا گیا جیسے گاؤں کے ڈیرے ہوتے ہیں۔ ان میں کرسیاں، چار پائیاں اور موڑھے پڑے ہوئے تھے۔ وہاں چند آدمی پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔ اگلے دو منٹ میں یم شحیم شخص اندر آ گیا۔ اس نے کرتے کے ساتھ دھوتی باندھی ہوئی تھی، سر سے ہلکا سا گنجا تھا، بڑی بڑی بے تحاشا پھیلی مونچھیں اور گول سے چہرے والا تھا۔ اپنی شخصیت کے برعکس اس نے بڑے نیاز مندانہ انداز میں کہا۔

”او معاف کرنا یار زاہد، مجھے دو منٹ دیر ہو گئی، میں بی بی کے پاس بیٹھا ہوا تھا، بس آتے آتے دیر ہو گئی۔“

”کوئی بات نہیں یار اسلم، بس یہ میرے دوست لاہور سے آئے تھے مجھے ملنے۔ یونہی ذکر ہوا تو میں انہیں تمہارے پاس لے آیا۔ ہم کون سا تنا کر آئے ہیں۔“ اس نے بھی بڑے دھیمے انداز میں بات کی۔

”نہیں نہیں یار، اچھا تنا مہمان کیا پسند کریں گے، چائے یا پھر لسی وغیرہ، کھانا بالکل تیار ہے۔“ اس نے نہایت خلوص سے کہا۔

”سب کچھ کھا پی کر آئے ہیں۔ بس ہم نے بھی جلدی چلے جانا ہے۔ تم سے بس اس خاتون درویش کے بارے میں پوچھنا تھا، جو یہاں آئی تھی۔“ زاہد نے بے تکلفی سے کہا۔ اسے کون سا پتہ تھا کہ ہم نے دراصل کیا پوچھنا ہے۔ اسلم جٹ نے بھی فوراً ہی بڑے سادہ سے انداز میں کہا۔

”وہ آئی تو تھی یہاں۔ ہمارے اس علاقے میں دو چار دن ہمارے پاس بھی رہی ہے پھر چلی گئی تمہارے گاؤں میلے پر گئی تھی انہی دنوں۔“

”اب نہیں مل سکتی، کہاں ہے وہ؟“ میں نے پرسکون انداز میں پوچھا۔

”دراصل، وہ یہاں کی ہے نہیں، وہ تھی پار پنجاب کی۔ وہاں ہے نا فرید کوٹ، اس کے قریب کوئی جگہ ہے سادھو وان، وہاں کی رہنے والی ہے، اصل میں وہ سکھنی ہے۔ وہ اپنی کوئی تیرتھ یاترا کرتی پھر رہی ہے۔ وہ یہاں پہلے دربار صاحب آئی تھی، پھر اس علاقے میں پھرتی رہی، اب پتہ نہیں کہاں ہے۔ سیلانی روح تھی کوئی۔“ اس نے پوری تفصیل سے ہمیں بتایا۔

”مطلب اب اس کا کوئی اتہ پتہ نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں بندہ کوشش کرے تو پتہ لگ سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ پھر ہمارے پاس یا ارد گرد کہیں آجائے۔ سیلانی روح جو ہوئی۔“ اسلم جٹ نے پھر اپنی سادگی میں کہا تو مجھے ایک بار تو بہت ہنسی آئی، جسے میں نے بڑی مشکل سے قابو کیا، تبھی میں نے کہا۔

”چلو جی اگر آسانی سے پتہ لگ جائے تو ٹھیک ہے یا پھر یہاں کہیں آجائے تو بتایئے گا ضرور۔“

”خیر تو ہے نا؟“ اس نے پوچھا تو زاہد نے وہی بات کہہ دی جو کچھ دیر پہلے اسے شہباز نے بتائی تھی۔ اس پر باتیں ہوتی رہیں۔ اتنے میں چائے آگئی۔ بات وہاں سے نکلی تو ارد گرد کی ہونے لگی۔ میں جانتا تھا کہ شہباز بڑا چرب زبان ہے۔ اس نے ایسی ایسی باتیں چھیڑیں

جس سے پتہ لگ گیا کہ اسلم جٹ کے نہ صرف پار پنجاب میں تعلقات ہیں بلکہ یہاں بھی ایک خاص مافیا سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا کام بدمعاشی، غنڈہ گردی، ڈکیتی وغیرہ کے علاوہ منشیات سے بھی تھا۔ وہ ایک بہت بڑی سیاسی جماعت کے حلیف تھی جو پوری طرح ان کی مدد کرتی تھی کہ انہوں نے ایک کثیر تعداد میں ان سے ووٹ لینا ہوتا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد جب ہم وہاں سے اٹھے تو تھوڑا بہت منظر واضح ہو چکا تھا۔

زاہد واپس چلا گیا اور ہم انتہائی تیزی سے اس علاقے سے نکل کر ننکانہ صاحب آ گئے۔ ہم راستے میں اسلم جٹ کی بات پر سیر حاصل بات کرتے رہے تھے۔ وہ اتنا سادہ اور معصوم نہیں تھا، جتنا وہ بظاہر نیاز مند دکھائی دے رہا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ سچ کہہ رہا ہوں اور یہ بھی بعید نہیں تھا وہ ہمیں ڈاج دے گیا ہو۔ اس سے بہرحال یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ کسی خاتون گیانی کے روپ میں یہیں کہیں موجود ہے ورنہ اب تک رماکانت کی طرف سے کوئی اطلاع آ جاتی اگر وہ روہی میں کہیں ہوتی۔

اس وقت رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔ جب ہم رائے بلار پارک کے سامنے کی سڑک پر سے مڑ کر اندر چلے گئے۔ تھوڑا آگے جا کر ایک دو منزلہ گھر تھا۔ شہباز نے فوراً نکل وہیں روکی ہی تھی کہ گیٹ کھل گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہماری آمد کے بارے میں مطلع تھے اور ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم اندر چلے گئے۔ وہ چھوٹا سا پورچ تھا لیکن اتنی گنجائش تھی کہ مزید ایک گاڑی کھڑی کی جا سکتی تھی۔ میری کار وہیں کھڑی تھی۔ کچھ نوجوان ہمارے بیک اپ پر تھے۔

وہ رات وہیں گزار کر صبح ناشتے کے بعد ہم پھر نکل پڑے۔ اس بار ہمارا رخ بائی پاس کی طرف تھا۔ ہم بائی پاس روڈ پر جا رہے تھے جہاں سے کوٹ ہیرا سنگھ جاتا تھا، جس سے آگے تقریباً چھ کلو میٹر پر گاؤں واقع تھا۔ ہم روڈ سے اترے تو ایک چھوٹی سی پختہ سڑک پر آ گئے جو

سیدھا گاؤں کو جاتی تھی۔ ہمارے دونوں جانب ہرے بھرے کھیت تھے۔ کہیں دور نزدیک لوگ کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ عام گزرگاہ ہونے کے باعث ان کی ہماری طرف توجہ ہی نہیں تھی۔ قطاروں میں لگے شاداب درخت، گہرا سبزہ، پھولوں بھری فصلیں نگاہوں کو ٹھنڈک دے رہی تھیں۔ قدرت کا ایک مسحور کرنے والا حسین نظارہ ہمارے سامنے تھا جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ تبھی میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"قدرت کے بھی کیا نظارے ہیں یار، ایک طرف صحرا اور یہاں سبزہ ہی سبزہ، معطر ہوا، کتنا بھرپور سانس لینے کو جی چاہتا ہے۔"

"دیکھ لو پھر۔ رب کی مخلوق ہر جگہ موجود ہے۔ پہاڑوں پر، ندی نالوں پر، گرمی میں برف باری میں سب جگہ۔" شہباز نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ تو ہے، ہر جگہ کا اپنا رنگ ہے۔" میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"اب یہاں پر نگاہ اور سوچ کا فرق دیکھو، کوئی کہتا ہے کہ انسان کی کیا اوقات، اسے جہاں رب رکھتا ہے وہ وہیں رہتا ہے، لیکن دوسرا زاویہ نظر یہ ہے کہ انسان ہی اس دنیا کو خوبصورت بنا رہا ہے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اور کچھ لوگ اس دنیا ہی کو عذاب بنا رہے ہیں۔ یہ رہنے کو بہترین جگہ ہے جب تک زندگی ہے، اگر انسانوں کی طرح رہا جائے۔ مگر مکروہ سوچ والے، خبیث لوگ اس دنیا کو جہنم بنا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔" میں نے نجانے کس رو میں کہہ دیا تو وہ ہلکی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا

"یار یہ سب اپنی اپنی سوچ ہے نا، جو کسی کے دماغ میں بھر دی جائے، ہم اپنے آپ کو نہیں سمجھتے، ہم انسان کو نہیں سمجھتے، اس کی فطرت سے واقف نہیں ہو رہے، بس اندر جو شر کی قوت ہے، اسے ہی بڑھاتے چلے جا رہے ہیں اور اپنی ہی نوع کی بربادی کا سامان کر رہے ہیں۔"

باتیں کچھ زیادہ ہی سنجیدگی کی طرف چلی گئی تھیں، اس لئے میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ "کتنا مزید جانا ہے؟"

"یہ سامنے گاؤں ہے، میں تو خود سکون سے جا رہا ہوں تاکہ تم یہ نظارے کر لو، سمجھو ہم پہنچ گئے۔" یہ کہتے ہی اس نے رفتار تیز کر دی۔ اس نے گاؤں کے سرے پر موجود ایک ڈیرے پر جا کے فور وہیل روکی۔ وہاں کافی ساری چارپائیاں دھری ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک موٹا سا ادھیڑ عمر شخص حقہ رکھے بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں ہم پر تھیں جیسے ہمیں ٹٹول رہا ہو۔ شہباز نے جاتے ہی دور سے دونوں ہاتھ ملانے کے لئے بڑھا دیئے اور زور زور سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"فیروز صاحب میں گی شہباز بردکر لاہور والا۔"

یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں سے اجنبیت دور ہو گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے ہمیں ملا۔ اس نے کچھ لوگوں کو اشارہ کیا تو وہ اٹھ گئے۔ ہم اس کی سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد شہباز نے وہی مدعا بیان کر دیا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر مودب لہجے میں بولا۔

"ہاں مجھے تمہاری آمد کے بارے میں تہارے باس نے بتایا تھا۔ وہ تمہاری درویش مائی صاحبہ چند دن پہلے یہاں آئی تھی۔ یہاں قریب ہی ایک ڈیرہ ہے وہاں اس نے اپنی پوجا پاٹ کی اور چلی گئی۔ اب اس کا نہیں پتہ کہاں ہے۔"

"یہ تو پتہ ہے کہ وہ یہاں نہیں ہے، وہ آئی کس کے پاس تھی، سنا ہے وہ پار پنجاب سے تھی۔" میں نے پوچھا

"جی وہ وہیں کہیں کی تھی، یہاں تو میرے پاس میاں عالم نے بھیجا تھا۔ جانتے ہو نا وہ

لاہور ہی کا رہنے والا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ہمارے چہرے پر ردعمل دیکھا۔اس کے لئے میاں عالم بہت بڑی ہستی ہو سکتی تھی لیکن ہم اسے سمگلر، لاہور کے انڈر ورلڈ مافیا اور بھتہ خور کے طور پر جانتے تھے۔اس کے لئے فطری طور پر ہمارے چہرے پر کوئی ردعمل نہیں ابھرا تو وہ اپنی بات کا اثر نہ دیکھ کر بولا۔"اس درویش مائی صاحبہ نے یہاں کسی بزرگ کے مزار پر حاضری دینا تھی۔ ہمارا ایک لڑکا ہے ارشد، اُسے تھوڑی معلومات ہیں، بلواتا ہوں اسے۔" اس نے کہا پھر ایک لڑکے کو اسے بلوانے کے لئے بھیج دیا۔اس دوران چائے وغیرہ آ گئی۔

ہم چائے پی رہے تھے کہ ارشد بھی آ گیا۔اس کے پاس بھی کوئی اتنی معلومات نہیں تھیں۔ اسے صرف میاں عالم کا ہی پتہ تھا یا پھر اس کے سیل فون میں کچھ تصویریں اور ویڈیوز تھیں۔ شہباز نے بڑے آرام سے وہ تصویریں اور ویڈیوز اس سے لے لئے۔ ہمیں وہاں سے بھی کوئی خاطر خواہ معلومات نہیں ملیں۔تقریباً تین گھنٹے وہاں گزار کر ہم واپس لاہور کے لئے چل دیئے۔گاؤں سے نکلتے ہی میں نے وہ تصویریں اور ویڈیوز دیکھے۔ان میں پوجا، وہ پوجا لگ ہی نہیں رہی تھی، ایک دم سے روپ بدلا ہوا تھا۔اس نے ان سکھ خواتین کی مانند سفید لباس پر نیلی دستار باندھی ہوئی تھی جو ان کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔اس کا چہرہ صاف شفاف تھا، جس کے گرد سفید دوپٹے کا ہالہ تھا۔اس میں تمام گیسو چھپے ہوئے تھے۔اس کی کلائی میں کڑا تھا اور وہ پوری طرح ایک سکھ گیانی خاتون دکھائی دے رہی تھی۔اگر وہ میرے سامنے اچانک آ جاتی تو شاید میں کچھ دیر کے لئے اسے پہچان ہی نہ پاتا۔وہ بالکل بدلی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

ہم دوپہر سے پہلے ہی لاہور واپس پہنچ گئے تھے۔ہم سہ پہر ہونے تک آفس ہی میں رہے لیکن ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔شہباز نے یہ اپنے ذمے لے لیا تھا کہ وہ خود میاں عالم سے

بات کر کے پوجا کے بارے میں معلومات لے گا۔ مجھے سامنے آنے کی ضرورت نہیں، شام تک
کچھ نہ کچھ ہو جائے گا تو میں اٹھ کر گھر کی طرف چل دیا۔

میں اس قدر ذہنی طور پر منتشر ہو چکا تھا کہ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کروں کیا
؟ مجھے کرنا کیا ہے؟ کیا صرف پوجا ہی کو تلاش کرنا ہے؟ نہ جانے اس جیسے کئی لوگ ہمارے
ملک میں بکھر رہے تھے، یہاں کے ذرائع نجانے کیسی کیسی معلومات کہاں کہاں سے دے
رہے تھے۔ اگر پوجا کو اتنے تردد کے بعد پکڑ بھی لیا جائے تو پھر اس کا کرنا کیا ہے؟ بس یہی
ایک آپشن تھا ہمارے پاس کہ وہ کوئی کلیان جی کا ٹارگٹ لے کر یہاں آئی ہے، پتہ لگتا ہے
کہ وہ ٹارگٹ کیا ہو سکتا ہے؟ اس کے یہاں آنے کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ضرور ہوگا؟ میں گھر
پہنچ کر بیڈ پر لیٹا تو میری آنکھ لگ گئی۔ میں اٹھا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں فریش ہوا تو
ساوری میرے پاس آ گئی۔

”خیریت تو ہے نا، اتنی گہری نیند سوئے ہو؟“

”یار ایک تو ان بیویوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ لیٹے ہو تو کیوں لیٹے ہو، چپ
کیوں بیٹھے ہو، باتیں کیوں نہیں کرتے، اگر باتیں کرو تو بڑے چہک رہے ہو۔ اب اگر
میں بہت گہری نیند سویا ہوں اس کا تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہ نیند گہری ہے؟“ میں نے جواب
دینے کی بجائے سوال کر دیا۔ اس نے ایک لمحہ کو میری طرف دیکھا پھر مسکراتے ہوئے
بڑے سکون سے بولی۔

”سوہنا، میں تو سوتے ہوئے تمہارے خواب بھی ’چیک‘ کرتی ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو، تمہیں
یونہی آوارہ چھوڑ دوں۔“

”او جا او ئے وڈی درویش۔“ میں نے بے ساختہ کہا تو اسی لمحے مجھے پوجا کی یاد آ گئی۔

اسی لیے مجھ پر پھر وہی انتشار چھانے لگا۔ لیکن اب میں نے اسے خود پر قابو نہیں پانے دیا۔ میں نے اس خیال کو جھٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بنایا ہے آج کھانے میں؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" ساوری نے کہا۔

"نہیں ہے تو نا سہی، تھک گیا تھا سو گیا، اور کیا؟" میں نے اکتاہٹ سے کہا تو وہ میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہم نے آج باہر سے کھانا کھانے کا سوچا تھا، شبانہ اور فرزانہ کئی دن سے باہر نہیں گئیں ہیں۔ اب تم ہو تو چلیں۔"

"چل ٹھیک ہے، نکلو پھر۔" میں نے جان چھڑاتے ہوئے کہا تو وہ اٹھ کر باہر کی طرف چل دی اور میں تیار ہونے لگا۔

یوجا میرے دماغ پر چھا گئی تھی۔ میں اسے ذہن پر چھانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہ فطری سی بات ہے، جب بے بسی ہو جائے تو انسان اس بے بسی کو دور کرنے کے لئے سو طرح سے سوچتا ہے۔ شاید میں لاشعوری طور پر اس کی یہاں آمد برداشت نہیں کر پا رہا تھا یا پھر یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی اتنی ہمت کہ وہ میرے پیچھے آ گئی ہے۔ جو بھی تھا، میں بہر حال اسے فوری طور پر اپنے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے علم ہونا چاہیے تھا کہ وہ یہاں پر کیوں ہے؟

"ہم تو باہر سے کھا لیں گے جو لڑکے یہاں پر ہیں، ان کے لئے کھانا......" میں نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے ساوری سے پوچھا۔

"ان کی فکر مت کرو، وہ شیف سے اپنی پسند کا بنوا رہے ہیں۔ ان کی تو موج لگی ہوئی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا جانا کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا تو بولی۔
”پہلے تھوڑی سی شاپنگ کرنی ہے، پھر کسی اچھے سے ریستوران میں ڈنر۔ وہ بھی شبانہ اور فرزانہ کی پسند کا، میں نے انہیں ٹریٹ دینی ہے۔“
”لو بھئی فرزانہ شبانہ آپ بتا دینا کہاں جانا ہے۔“ میں نے کہا اور ڈرائیونگ سیٹ کی جانب بڑھنے لگا تو شبانہ بولی۔
”آپ نہ کریں ڈرائیونگ، میں خود لے جاتی ہوں۔“
”اوکے۔“ یہ کہتے ہوئے میں پیچھے بیٹھ گیا تو ساوری میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ فرزانہ پسنجر سیٹ پر بیٹھی تو ہم چل پڑے۔
ایک معروف شاپنگ مال سے جب وہ تینوں کپڑوں سمیت کافی خریداری کر چکیں تو ہم وہاں سے نکلنے لگے۔ تیسری منزل سے نیچے جانے کے لئے ابھی ہم ایسکلیٹر کے پاس گئے ہی تھے۔ اگلے چند لمحوں میں ہم نے پاؤں رکھ دینا تھا۔ اسی لمحہ بھر دورانیے میں چند لوگ دوسری طرف سے اوپر آئے۔ ان میں کچھ خواتین تھیں۔ ایسے میں ایک حواس باختہ سی خاتون مجھ سے بائیں جانب ٹکرائی۔ ٹکراتے ہی اس نے تیزی سے کہا۔
”اوہ، سوری جی......“
یہ کہتے ہی اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ پھیرا اور نکلتی چلی گئی۔ میں اس کی آواز میں کھو گیا۔ کہاں سنی ہے میں نے آواز؟ میں سوچ رہا تھا کہ ایک دم سے جیسے میرے دماغ میں ہلچل مچ گئی۔ میرے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے بیگ چھوٹ گئے۔ میں تیزی سے مڑا اور اس خاتون کی تلاش میں دیوانہ وار دیکھنے لگا۔ مگر وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دی۔ وہ یوں غائب ہو چکی تھی جیسے کوئی چھلاوا نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے؟ اگر وہ سامنے رہتی تو شاید میں اس کے

بارے میں سوچا بھی نہ لیکن اس کا غائب ہو جانا ہی مجھے یقین دلا رہا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا تو ساوری نے مجھے دونوں ہاتھوں سے روکتے ہوئے پوچھا۔

"علی، کیا پاگل ہو گئے ہو؟"

"ساوری چھوڑو مجھے، اس عورت کو دیکھو، فوراً۔" میں نے دیوانہ وار کہا۔

"وہ تم سے بس ٹکرائی ہی تھی، اتنا قصور تو نہیں تھا۔" اس نے احتجاجی لہجے میں کہا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں نہیں پتہ وہ کون تھی، وہ پوجا تھی۔"

"پوجا؟" ساوری نے شدت حیرت سے کہا، اس کے ساتھ ہی وہ بھی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شبانہ اور فرزانہ نے میرے ہاتھوں سے گرے ہوئے بیگ اٹھا لیے تھے۔

"مجھے اسے تلاش کرنا ہے۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو ساوری میرے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے ہولے سے بولی۔

"دھیرج علی۔ اگر وہ اس طرح سامنے آگئی ہے تو پھر دوبارہ بھی آئے گی۔ ممکن ہے تمہیں شک ہوا ہو، کیونکہ وہ تمہارے دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ آؤ، کہیں سکون سے بیٹھتے ہیں۔"

"اوکے۔" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا اور ایک طویل سانس لے کر ایکسکلیٹر میں پاؤں رکھ دیا۔ ہم نیچے کی طرف جانے لگے۔ انہی لمحات میں میرا فون بج اٹھا۔ میں نے فون جیب سے نکالا تو اسکرین پر اجنبی نمبر تھے۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے نسوانی آواز گونجی۔

"کیسی رہی ملاقات؟"

"مطلب ......" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا، میں نے لاشعوری طور پر پیچھے کی طرف دیکھا تو سرے پر پوجا کھڑی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر یوں ہاتھ ہلایا، جیسے میرا مذاق اڑا رہی ہو۔ میں پوری قوت سے گھوما اور واپس سیڑھیاں چڑھنے لگا، سرے تک پہنچنے میں مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن میں ذرا سی بھی قوت نہ رہی ہو۔ مجھے توقع تھی میں اس تک پہنچ جاؤں گا لیکن وہ وہاں نہیں تھی، میں دیوانہ وار اسے تلاش کرنے لگا۔ میں کبھی ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا جاتا، کبھی وہاں سے نکل کر کسی راہداری میں گھس جاتا، تقریباً پندرہ بیس منٹ میں اسے دیکھتا رہا لیکن وہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اچانک مجھے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فون کا خیال آیا۔ میں نے دیکھا تو کال ابھی تک چل رہی تھی۔

"ہیلو، کہاں ہو تم؟" میں نے پھولی ہوئی سانسوں میں پوچھا۔

"ایسا کرو جاؤ اپنی بیوی کے ساتھ، میں بعد میں کال کرتی ہوں۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تو میں انتہائی غصے میں بولا۔

"تم میرے سامنے آؤ۔"

"اگر نہ آؤں تو؟" اس نے چیلنج والے انداز میں کہا۔

"میں نے تمہیں تلاش تو کر ہی لینا ہے۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تم ساری رات بھی یہاں تلاش کرتے رہو گے نا تو مجھے نہیں تلاش کر پاؤ گے۔ جاؤ اپنی بیوی کے ساتھ، گھر پہنچ گے تو بات کرتی ہوں۔"

آخری لفظ کے ساتھ ہی اس نے کال ختم کر دی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہاتھ آئی ہوئی مچھلی نکل گئی ہو۔ میں نے چند لمحے وہیں کھڑے سوچا اور پھر اپنے آپ پر مسکراتے

ہوئے واپس ایکسکلیٹر کی جانب بڑھ گیا۔

وہ تینوں میرے انتظار میں پریشان کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی ساوری میری جانب بڑھی اور پھر چند لمحے میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔

''اب چلیں؟''

''ہاں چلو، جاؤ فرزانہ گاڑی لے آؤ۔''

''آپ باہر نکلیں میں لاتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پارکنگ کی جانب چلی گئی۔ اس کے ساتھ شبانہ بھی بڑھ گئی۔

ریستوران میں بھی میرا دھیان یوجا ہی کی طرف رہا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ وہ بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اتنا قریب آکر مجھے اپنی جھلک دکھا کر وہ نگاہوں سے اوجھل کیوں ہو رہی ہے؟ کیا وہ مجھے ذہنی اذیت میں ڈالنا چاہتی ہے؟ کیا وہ مجھے یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ وہ میرے ملک میں آکر مجھے چکرا کر رکھ دے گی؟ ایسا کر کے وہ مجھے کیا تاثر دینا چاہتی ہے؟ وہ مجھے یہ بتانا چاہتی ہے کہ وہ یہاں پر کتنی مضبوط ہے؟ ایسے ہی نجانے کتنے سوال میرے دماغ میں گھر رہے تھے۔

میں گھر واپس آگیا تھا۔ ساوری کا موڈ خراب تھا، میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ میں نے اسے بیڈ روم ہی میں چھوڑا اور اوپر چھت کی طرف جانے لگا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ یوجا مجھے فون کرے گی۔ مجھے شہباز کے فون کا بھی انتظار تھا۔ اس نے میاں عالم سے معلومات لینا تھیں۔ میں نے کھلی فضا میں آکر طویل سانس لیا۔ میں نے اپنے دماغ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ جو میرے رویے کی طنابیں کسی ہوئی تھیں وہ میں نے ڈھیلی چھوڑ دیں۔ کچھ دیر بعد میں نارمل ہوتا چلا گیا۔ شہر بھر کا ہلکا ہلکا شور سنائی دینے لگا۔ ارد گرد کی روشنیاں مجھے دکھائی

دینے لگیں۔ رات کا پھیلا ہوا ملگجا اندھیرا بھلا لگنے لگا۔ میرے اندر جو خیال اور سوچیں اٹھ رہی تھیں ان سے میں نے اجنبیت اختیار کر لی۔ میرے سامنے صرف ایک سوال تھا اور وہ یہ کہ پوجا ایسے کیوں کر رہی ہے؟ یہ سوچ ابھی میرے دماغ میں گھوم رہی تھی کہ میرا فون بجنے لگا۔ میں نے اسکرین پر نگاہ ڈالی تو وہی نمبر تھا جس سے کچھ دیر پہلے پوجا نے بات کی تھی۔ میں نے کال ریسیو کر لی۔

”مجھے تو لگا تم مجھے کال کرو گے، انتظار کر رہی تھی؟“

”کیوں؟“ میں نے سرد مہری سے پوچھا۔

”اور بلاشبہ تم یہ بھی سوچ رہے ہو گے کہ میں تمہارے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہوں، سوچا ہو گا نا؟“ اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو میں چونک گیا۔

”ہاں، میں یہی سوچ رہا ہوں۔“ میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

”یہی سوچ پیدا کرنے کے لئے میں نے اب تک ایسا کیا، تم اب تک کم از کم تین بار میرے ایسے ہدف پر تھے کہ میں تمہیں آسانی سے گولی مار سکتی تھی۔“ اس نے بھی سخت لہجے میں کہا تو میں نے طنزیہ پوچھا۔

”تو پھر ماری کیوں نہیں؟“

”مجھے تم سے کچھ ڈیل کرنی ہے۔“ اس نے آرام سے کہہ دیا۔

”پوجا، کیا تم صرف اسی لئے یہاں ہو؟ صرف ڈیل......“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا تو وہ دبے دبے جوش میں بولی

”نہیں، میں تمہیں قتل کرنے ہی کے لئے آئی ہوں، یہی میرا ٹاسک تھا، لیکن میں نے ان کو جنہوں نے مجھے یہ ٹاسک دیا ہے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئی ہوں کہ ابھی تمہیں

الجھاؤں گی، اتنا الجھاؤں گی کہ تم صرف میرے بارے میں سوچو گے، اس دوران ہم دوسرے بہت سارے کام کر جائیں گے جن کا تمہیں اور تمہارے لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ مجھے تھوڑی مہلت چاہیے تھی، وہ شاید اب نہ ملے، اب یا تو تمہارے اور میرے درمیان ڈیل ہو گی یا ہم میں سے کوئی ایک قتل ہو جائے گا۔"

"اور میں تمہاری بات آسانی سے مان لوں گا؟ تم کوئی بھی کہانی گھڑو گی اور میں اس پہ آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں گا۔" میں نے پوچھا۔

"میں اتنی پاگل نہیں ہوں، جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اور جو کچھ ہم کر چکے ہیں تمہاری سوچ بھی نہیں ہے۔ میری ڈیل صرف میرے اور تمہارے درمیان ہو گی، اس سے کیسی کا لینا دینا نہیں۔ ہاں مگر قتل ہونا یا کرنا، تمہارا تو ذاتی ہو سکتا ہے لیکن میرا نہیں۔" اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا تو اچانک مجھے خیال آیا، تبھی میں نے پینترا بدلتے ہوئے پوچھا۔

"میں اب تک بھی نہیں سمجھا تم چاہتی کیا ہو؟"

"صرف ایک ڈیل، جس کے لیے ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنا ہو گا، ظاہر ہے، میں وہ ڈیل اپنے فائدے کے لیے کرنا چاہتی ہوں، اس کے عوض میں تمہیں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ فائدہ دوں گی۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

"مثلاً کیا؟" میں نے پوچھا تو وہ صد درجہ اعتماد سے بولی۔

"ملو گے تو بتاتی ہوں، بلکہ اعتماد کرو تو بتا دوں گی۔"

"پوجا، میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔" میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"بولو، میں سن رہی ہوں۔" وہ دھیمے سے بولی۔

"میں نے جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا، تب مجھے یوں لگا جیسے تم کوئی انتہائی چمکیلا اور

خوبصورت سانپ ہو، ظاہر ہے ایسے سانپ بہت زہریلے ہوتے ہیں اور بہت زیادہ خطرناک، میں......"

میں کہہ رہا تھا لیکن اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا

"میں اب بھی سانپ ہی کی طرح ہوں، لیکن میں صرف اسے ڈستی ہوں، جس سے مجھے خطرہ ہو۔ دوسری بات سنو، ہماری جرم کی اس دنیا میں صرف فائدہ دیکھا جاتا ہے اور فائدے سے بھی بڑھ کر اپنی طاقت کا اظہار، تم بھی اور میں بھی طاقت چاہتے ہیں۔ یا ان کی طاقت کا آلہ کار بنتے ہیں، جن کے ہم مہرے ہیں۔ جان لو ہم مہرے ہیں۔ بس اتنا جان لو میں تمہارے ساتھ مل کر کسی کو اپنی طاقت کا اندازہ کروانا چاہتی ہوں۔"

"چل پھر ملتے ہیں کہیں۔" میں نے ایک دم سے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میرے دماغ میں جو ایک دم سے ہلچل مچی تھی، اسے سکون آ گیا تھا۔ مجھے سمجھ آ رہی تھی کہ وہ مجھے کس ٹریک پر لانا چاہتی ہے۔ میرے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ شہباز کا فون آ گیا۔

"ارے کہاں فون بزی تھا تمہارا۔"

"تھا ایک پنچھی، اپنی آواز سنا رہا تھا۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"وہ میاں عالم کے پاس سے واپس آ رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"کیا کہتا ہے؟" میں نے پوچھا تو اس نے بتایا۔

"اس کے کہنے کے مطابق، بھارت میں ان کے پیر صاحب کی گدی ہے، وہاں سے کسی نے کہا تھا کہ ایک گیانی ملنگ قسم کی خاتون ہے۔ وہ اپنی تپسیا بڑھانے کے لئے پاکستان میں موجود درگاہوں اور مقدس جگہوں پر جانا چاہتی ہے، سو انہوں نے میرے پاس بھیج دیا۔ وہ

ابھی اپنی سیر پر ہے، جس دن بھی واپس آ گئی، اس سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"وہ صرف آواز کی حد تک، مجھ تک پہنچ گئی ہے۔" میں نے دھیمے سے کہا۔

"نہ کر......" اس نے شدت حیرت سے کہا۔

"اور اس کا دعویٰ ہے کہ اب تک وہ مجھے تین مرتبہ مار سکتی تھی لیکن نہیں مارا۔" میں نے اسی سکون سے کہا تو وہ پھر اتنی ہی شدت حیرت سے بولا۔

"مذاق نہ کر۔"

"ابھی اس کا فون تھا، بلکہ میں تمہیں تفصیل بتاتا ہوں، کہاں ہو تم۔" میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

"میں نے کہاں جانا، ہم جیسے کنوارے چھڑے چھانٹ اپنے کسی حجرے میں سر دیں گے، تم اگر اچھا سا کھانا کھلانے کا وعدہ کرو تو ابھی آ جاتا ہوں۔"

"اچھا آ جاؤ۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے میں وہ میرے سامنے بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور اس دوران اس نے ساری روداد سن لی تھی۔ وہ خاموشی سے سوچ رہا تھا، وہ کھا چکا تو اس کے سامنے چائے رکھ دی گئی۔ اس نے مگ سے ایک سپ لیا اور بولا

"لے بھئی تم نے ایک بھوکے کو کھانا کھلایا، رب تجھے مزید دے، تیری کمائی میں برکت ڈالے، سنا ہے جو لنگر چلاتے ہیں، ان کے رزق میں بہت برکت ہوتی ہے۔"

"بکواس نہیں کرو، جو میں کہہ رہا ہوں، اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے جھلاتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دیا۔

"اوئے، تمہارا سب سے بڑا پرابلم یہ ہے کہ تم ہر وقت جلے بھنے رہتے ہو، تمہارے منہ کے پیچھے کھنچے رہتے ہیں، جس سے تم بڑے بھیانک لگتے ہو۔ یار تم اتنا نہیں سمجھ سکتے وہ

ہمارے ماے کی کڑی ہے یا پھوپھی کی، وہ ہماری دشمن ہے۔ اور دشمن......"

"نہیں شہباز، دشمن سے پھر بھی کبھی بھلائی کی توقع کی جاسکتی ہے، اگر وہ بدنسل نہ ہو۔ ہاں مگر منافق سے نہیں۔ کیونکہ منافق ہوتا ہی وہی ہے جو بدنسل ہو، جس کے تخم کا پتہ نہ ہو۔" میں نے واقعی ہی جھلاتے ہوئے کہا۔

"کول...... مائی ڈیر کول...... غصہ نہیں۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کرتے ہوئے کہا، پھر ایک سپ لے کر بولا، "اگر وہ یہ کہتی ہے نا ہماری جرم کی دنیا میں صرف طاقت منوائی جاتی ہے تو وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ دشمن اگر بدنسلا نہ ہو تو وہ خود سامنے آ کر للکار کر لڑتا ہے۔ لیکن منافق جو بقول تمہارے بدنسل ہوتا ہے وہ اپنی عورتوں کو آگے کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔"

"پھر تم میری بات کو سنجیدگی سے کیوں نہیں لے رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو، ہم کوئی بھیڑ بکری یا آوارہ جانور ہیں کہ ہمیں دشمن کے علاقے میں یونہی لاوارث بھیج دیا جاتا ہے، ہمارا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ تم نے جب مجھے بتایا، میں نے جب سے لے کر یہاں آنے تک اس نمبر سے سارا حساب کتاب ملا لیا ہے، ذرا سا وقت دو ابھی کچا چٹھہ سامنے آ جائے گا۔" اس نے اطمینان سے کہا تو میں نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کیسے کر لیا تم نے، ابھی تک تم نے نمبر لیا ہی نہیں مجھ سے؟"

"ہم سب کی باتیں اور خاص طور پر ہمارے فون اور رابطے کہیں دوسری جگہ بھی دیکھے جاتے ہیں، ان پر کام ہوتا ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے، جدید دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں رہا۔ وہ بھی یہاں لاوارث نہیں ہے، وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی۔" شہباز نے اطمینان سے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔لیکن ہماری اس دنیا میں کب کیا ہو جائے ......"

"دیکھو، تم اچانک اس دنیا میں وارد ہوئے، کسی کو تمہارے بارے میں اتنا اندازہ نہیں تھا، تم میں خلوص تھا اور تم نے ایک معرکہ مار لیا۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں اب بھی ایسے ہی ہو گا۔ بہت سارے لوگ تمہارے بارے میں نہ صرف جان چکے ہیں بلکہ انہیں تمہاری صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہو چکا ہے۔وہ تمہیں کس طرح ٹریٹ کریں گے، وہ، وہ جانتے ہیں۔ تنظیمیں صرف مار کٹائی، دہشت انگیزی یا قتل پر نہیں چلتیں، ان میں بڑے بڑے نفسیات جاننے والے ہوتے ہیں، وہ نفسیات جو مجرموں کی ہوتی ہے۔اور پھر لڑائی صرف مار دھاڑ سے نہیں جیتی جاتی، دوسروں کو احساس دلایا جاتا ہے کہ تم وہ نہیں جو تمہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"کیسے؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"جیسے کوئی کپ ہار یہ کہے کہ میں نے دو قتل کیے ہوئے ہیں لیکن کبھی اس نے تھپڑ نہ مارا ہو، تو وہ اس لائق نہیں کہ اس کے تھپڑ مارا جائے، بلکہ اسے اس کی اوقات یاد دلا دی جائے کہ تم بدنسلے ہو، یہی برتری ہے۔یہی فلسفہ جنریشن وار ہے، جو ہم لڑ رہے ہیں۔" شہباز نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"پھر اب کیا کرنا ہے اس کے ساتھ۔مطلب پوجا کے ساتھ؟" میں نے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ملیں گے، اس سے ضرور ملیں گے، بلکہ میں تو بے تاب ہوں کہ اس کے حسن کے جلوے سے پوری طرح مستفید ہو سکوں۔"

اس نے یوں کہا تو میرا قہقہہ بلند ہو گیا۔وہ صرف بات کر سکتا تھا یا واقعی ہی وہ اس قدر اعتماد رکھتا ہے، میں کوئی فوری فیصلہ نہیں کر سکا۔ انہی لمحات میں اس کا فون بج اٹھا، اس نے

اسکرین پر دیکھ کر کال ریسیو کی، ہیلو کے جواب میں سنتا رہا، پھر فون بند کر کے بولا۔

''اس وقت، اگر میں غلط نہیں ہوں تو گوالمنڈی کی کسی ایک گلی میں موجود ہے۔ اگر کہو تو ابھی چلیں۔''

''چلو، ابھی دیکھیں اسے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ گیا۔ اگلے دس منٹ میں تیاری کے ساتھ میں شہباز کے ساتھ آ بیٹھا تھا۔

☆......☆......☆

وہ ایک پرانی سی عمارت تھی۔ کبھی وہ بہت شاندار بلڈنگ رہی ہوگی۔ لیکن وقت نے اس کا سارا حسن چھین لیا ہوا تھا۔ رنگ وروغن تو اُڑ ہی چکا تھا، اس پر کئی جگہ سے پلستر بھی اکھڑ چکا تھا۔ بڑے دروازے کے ساتھ دو چھوٹے دروازے مزید تھے۔ دوسری منزل پر چھ کھڑکیاں اور اسی طرح تیسری منزل پر بھی چھ کھڑکیاں دکھائی دے رہی تھیں، جس کی لکڑی سیاہ ہو چکی تھی۔ وہ عمارت گلی کی نکڑ پر تھی۔ کبھی کوئی ایک خاندان اس میں رہائش پذیر رہا ہوگا، لیکن اس وقت وہاں کے مکین چوں چوں کا مربہ تھے۔ کئی کرایہ دار اس بلڈنگ میں موجود تھے۔ اس عمارت کے بالکل سامنے ایک مشہور سری پائے کی دوکان تھی۔ کافی سارے لوگ موجود تھے۔ ایک بڑی ساری ٹی وی اسکرین پر گیت چل رہے تھے۔ دوکاندار مصروف تھا اور کئی 'چھوٹے' گاہکوں کو کھانا سرو کر رہے تھے۔ ہم بھی وہیں جا بیٹھے اور ہمارے ساتھ کچھ لوگ بھی ادھر ادھر موجود کرسیوں پر آ گئے۔ شہباز نے آرڈر دے دیا تھا۔ ہم نے کھانا کیا تھا، کچھ دیر ویسے ہی بیٹھے رہے، یہاں تک کہ ایک موٹا سا گنجا شخص آن وارد ہوا۔ اس نے دھوتی کرتا پہنا ہوا تھا۔ اس نے وہاں آ کر ادھر ادھر دیکھا اور اس کی پہچان والے ہمارے دوست نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ وہ کچھ دیر تمہیدی باتیں کرتے رہے۔ تبھی میرے ساتھی نے اس سے کہا۔

”پہلوان جی، کوئی کمرہ مل جائے گا؟ ہم دو ہی دوست ہیں، ہم نے رہنا ہے، سچی بات ہے ہمارے پاس زیادہ کرائے کی بالکل گنجائش نہیں۔“

”کمرہ بھی ہے، کرایہ بھی مناسب ہے، لیکن تم ہو چھڑے چھانٹ اور یہاں رہتی ہیں فیملیاں، بس یہی مسئلہ ہے۔“ اس نے اپنی بھاری سی آواز میں کہا تو میرے ساتھی نے کہا۔

”پہلوان جی، آپ کو پتہ ہے، ہم نے کون سا سارا دن یہاں پڑے رہنا ہوتا ہے، بس رات سونے کا ایک ٹھکانہ چاہئے، جب حالات اچھے ہو جائیں گے تو سمجھو، چلے جائیں گے۔“

”چل میں تمہیں دکھاتا ہوں کمرہ۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ تینوں اٹھ کر عمارت کی جانب چل دیئے۔ ہم خواہ مخواہ وہاں دیر لگاتے رہے۔ بل وغیرہ دینے کے بعد اٹھے تو ساتھ ہی ”مٹھے والا سوڈا“ کی دوکان تھی۔ وہاں سے لیمن سوڈا پیا اور یونہی چہل قدمی کرتے اپنی گاڑی تک چلے گئے۔

”اب دیکھو کیا کرتے ہیں وہ لڑکے۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہی شہباز بولا اور اس نے ڈیش بورڈ میں لگی اسکرین آن کر دی۔ اس چھوٹی سی اسکرین پر جو منظر دکھائی دے رہا تھا، وہ ایسے تھا کہ جیسے ہمارے کسی ایک ساتھی کے ساتھ کیمرہ لگا ہو۔ جو کچھ اس کے سامنے آ رہا تھا وہی اس اسکرین پر دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے دوسرا بٹن دبایا تو دوسرے کیمرے کا منظر سامنے آنے لگا۔ ان کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ کوئی دوسرا کمرہ تھا جو انہیں دکھایا جا رہا تھا۔ وہاں عمارت میں ابھی اتنی خاموشی نہیں ہوئی تھی۔ لوگ جاگ رہے تھے۔ کئی سارے بچوں کی، لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شہباز کا پلان یہی تھا کہ وہ دونوں لڑکے ابھی کرایہ ایڈوانس دے کر وہیں رہیں گے۔ جیسے ہی خاموشی ہو جاتی، وہ بوجا تک جا پہنچیں گے۔ اس کی لوکیشن بتا رہی تھی کہ وہ یہیں اسی بلڈنگ میں ہے۔ میں پسنجر سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھا ہوا اس

وقت کا انتظار کر رہا تھا، جب ہمیں اندر جانے کا سگنل ملتا۔ میں گاہے گاہے اپنے اردگرد پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ ہم گلی کی نکڑ پر کار میں تھے جس کے دائیں جانب سڑک تھی جو آگے جا کر ایک بڑی سڑک سے جا ملتی تھی۔

اچانک میری نگاہ ایک برقعہ پوش عورت پر پڑی جو اسی عمارت کے دروازے میں سے نکلی۔ اس کے انداز میں کوئی جلد بازی نہیں بلکہ اطمینان تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے چلتی ہوئی گلی کی نکڑ تک آ گئی اور سڑک کنارے رک گئی۔ سیاہ برقعہ میں ملبوس اس عورت پر مجھے پوجا کا گمان ہوا۔ اس نے سڑک کے دائیں بائیں دیکھا، اسی اثنا میں ایک رکشہ اس کے پاس آ کر رک گیا۔ جیسے ہی وہ جھک کر اس میں بیٹھنے لگی، اس کا نقاب ذرا سا ہٹ گیا۔ اسے نقاب سنبھالنا بھی نہیں آتا تھا۔ مجھے ایک جھٹکا لگا، وہ پوجا ہی تھی اور بڑے اعتماد کے ساتھ وہاں سے نکل کر جا رہی تھی۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"وہ پوجا۔"

"کہاں؟" شہباز نے پوچھا۔

"وہ دیکھو۔" میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا، اس وقت تک وہ رکشے میں بیٹھ چکی تھی۔ میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں کار سے اترا تو رکشہ چل پڑا۔ میں بھاگ کر اس کے پیچھے جا سکتا تھا لیکن رکشہ پکڑ لینے کے چانس بہت کم تھے لیکن میں وہاں پر تماشہ بن جاتا۔ میں نے فوراً رک کر ادھر ادھر دیکھا، دو لڑکے آپس میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ایک بائیک پر بیٹھا ہوا تھا، دوسرا کھڑا تھا۔ میں نے ایک جست لگائی اور اسی دوران اپنا پسٹل نکال لیا۔ میں جیسے ہی اس لڑکے کے پیچھے جا کر بیٹھا، وہ گھبرا گیا۔

"جلدی چل۔" میں نے پسٹل اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا تو وہ لڑکا ایک

دم سے پریشان ہو گیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے بائیک چھوڑ دیا۔ میں نے بائیک سنبھالتے ہوئے کک ماری تو وہ سٹارٹ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ شہباز سب سنبھال لے گا۔ میں نے سامنے سڑک پر دیکھا، وہ رکشہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں نے بائیک اس سمت دوڑا دی۔ ذیلی سڑک ہونے کے باعث اتنا رش نہیں تھا لیکن مجھے رکشہ دکھائی نہیں رہا تھا۔ بس سرخ بیک لائیٹ سے اندازہ ہی لگا سکتا تھا۔ میں رفتار بڑھاتے ہوئے بائیک دوڑا رہا تھا۔

رکشہ نسبت روڈ پر جا چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آگے یہ سڑک لکشمی چوک پر جا کر کھلتی ہے۔ مجھے اگر اس رکشے کو پکڑنا ہے تو یہیں کہیں اسی روڈ پر ہی اسے روکنا ہوگا۔ میرا اور رکشے کا فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس سڑک کا تقریباً کافی سارا فاصلہ طے ہو گیا تھا جب میں رکشے کے پاس پہنچ کر دیر سے اسے سائیڈ پر لگانے کے لئے مجبور کرنے لگا۔ رکشہ ڈرائیور نے ایک موٹی سی گالی مجھے دی۔ جس کی میں نے پرواہ نہیں کی اور اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ پوجا مجھے دیکھ چکی ہے اور بلاشبہ وہ کسی نہ کسی طرح کا ردعمل ضرور دکھائے گی۔ میں حیران تھا کہ اب تک اس نے پسٹل نکال کر فائر کیوں نہیں کر دیا۔ رکشہ ڈرائیور بک بک کرنے لگا تھا۔ میں نے کوئی توجہ نہیں دی اور بائیک روک کر پیچھے بیٹھی پوجا سے کہا۔

”پوجا، نیچے اتر آؤ۔“

”مجھے مت اتارو، خود میرے ساتھ آکر بیٹھ جاؤ۔“

خلاف توقع میں نے سنا تو میں ٹھٹک گیا۔ تبھی میں نے ایک لمحے سے بھی کم وقت میں فیصلہ کیا اور اس کے ساتھ رکشے میں بیٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بائیک، اس لڑکے تک پہنچ جائے گا۔ میں نے بائیک کو سڑک پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے پوجا کے ساتھ بیٹھتے ہی اس کا

نقاب الٹ دیا۔ وہ میری طرف بڑے اعتماد سے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ تبھی میں نے رکشہ ڈرائیور سے کہا۔

”تم تو چلو۔“

میرے یوں کہتے ہی اس نے رکشہ بڑھا دیا۔ جب تک ہم لکشمی چوک تک پہنچے تب تک شہباز اپنی کار سمیت میرے قریب سے گزر رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو روکتے ہوئے پوجا کا ہاتھ تھاما، دوسرے ہاتھ سے ایک بڑا نوٹ نکال کر اس کی طرف پھینکا اور پوجا سمیت اتر کر سڑک پر آ گیا۔ سامنے کار کھڑی تھی۔ میں نے پہلے اسے بٹھایا اور پھر خود بیٹھ گیا۔ شہباز نے کار ایبٹ روڈ کی جانب بڑھا دی۔ تبھی میں نے ایک طویل سانس لیا اور بولا۔

”پوجا، دیکھو پہنچ گیا تم تک....“

”نہیں ویر سنگھ جی، ایسا نہیں ہے، میں خود تم تک آئی ہوں، ورنہ تم میری ہوا تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

”ایسا کیا؟“ میں نے خوشگوار حیرت سے کہا۔

”ہاں، جب انجان لوگ بلڈنگ میں گھسے تبھی مجھے شک پڑ گیا، میں وہاں چھپ بھی سکتی تھی لیکن میں جان بوجھ کر نکلی ہوں تاکہ تم سے مل سکوں۔“ اس نے اسی اعتماد سے کہا تو میں نے تیزی سے پوچھا۔

”اس کا مطلب ہے بلڈنگ میں تمہارے لوگ بھی ہیں؟“

”ہاں ہیں، انہیں چل دے کر آئی ہوں، آگے کیا ہوتا ہے، یہ تم پر ہے یا مجھ پر ہے۔“ اس نے قدرے سرد لہجے میں کہا تو میں خاموش ہو گیا۔

شہباز نہر تک پہنچ کر پل پار کر چکا تھا۔ وہ خطرناک حد تک تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس

نے اپنی رفتار اس وقت کم کی جب ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک بنگلہ نما گھر کے پورچ میں اس نے کار روک دی۔ میں پوجا کو لئے لاؤنج میں آ گیا۔

”یہاں نہیں بیٹھنا، اسے اوپر لے جاؤ۔“ شہباز نے کہا۔

”آؤ، اوپر چلیں۔“ میں نے کہا تو اس نے قدم بڑھا دیئے۔

ہم ایک کمرے میں جا بیٹھے جہاں دو چار کرسیاں ہی پڑی ہوئیں تھیں۔ وہ کمرے کے وسط میں جا کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنا برقعہ اتارا اور ہاتھ اوپر کر کے کھڑی ہو گئی۔ اس نے ہی گرین کلر شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ میرے سامنے وہ بھرپور شباب میں کھڑی تھی۔

”یہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”تلاشی لے لو، پھر مت کہنا۔“ اس نے پوچھا۔

”پھر مت کہنا، مطلب، نکال لو گی پسٹل۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں نا، خود نکال لو، ورنہ میں نکال سکتی ہوں۔“

اس نے کہا اور سینے میں اڑسا ہوا پسٹل نکال کر سامنے رکھ دیا۔ پھر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”دیکھو ویر سنگھ، میں جانتی ہوں یہ تمہارا اصلی نام نہیں ہے، تم کون ہو، یہ بھی میں جانتی ہوں، میں تم سے ڈیل کیوں کرنا چاہتی ہوں، اور وہ ڈیل کیا ہے؟ یہ سب کہنے سے پہلے میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“

”بولو، میں تمہاری ہر بات سنوں گا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ لمحہ بھر خاموش رہی پھر کہتی چلی گئی۔

”جن دنوں تم نے بکا راجستانی کو مارا تھا، میں انہی دنوں میں روہی آ گئی تھی۔ میں ان

دنوں انتقام سے بھری ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں دل ہی دل میں پرارتھنا کر رہی تھی کہ تم مجھے نہ ملو۔"

میں جانتا تھا کہ میں نے بنکا راجستھانی کو نہیں مارا تھا بلکہ اسے پولیس آفیسر کے حوالے کیا تھا، میں نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا، اس لئے پوچھا۔

"کیوں، تم تو مجھے مارنے آئی تھی؟"

"صرف مارنے نہیں، بلکہ اور بہت کچھ کرنا تھا مجھے۔ تمہارے نہ مارنے کی پرارتھنا میں اس لئے کر رہی تھی کہ میں تم سے ڈیل کر سکوں۔"

"پھر وہی ڈیل، ہونی ہوگی تو ہو جائے گی، تم بتاؤ، تم میری نفرت میں یہاں تک آ گئی اور یہ بھی کہہ رہی ہو کہ ڈیل، کیوں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو، سیدھی بات کرو، وقت نہ ضائع کرو۔"

میں نے اکتاہٹ سے کہا تو وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولی۔

"مجھے تم سے نفرت تھی اور اب بھی ہے۔ تم نے مجھے بہت حد تک ذلیل کیا، میرا سارا بنا بنایا کھیل تباہ کر دیا۔ میرا اپنا ایک کھیل تھا۔ لیکن مجھ سے انجانے میں ایک غلطی ہو گئی۔ میں نے تمہیں جوش و جذبات میں فون کر دیا، تم الرٹ ہو گئے اور ہاتھ آنے کی بجائے نکل گئے۔ اس پر راکیش ورما اور اس کے لوگوں نے مجھ پر شک کیا۔ میری اس غلطی کو معاف نہیں کیا کہ میں نے تمہیں الرٹ کیا ہے، اگر میں تمہیں جوش و جذبات میں فون نہ کرتی تو تم گھیرے جاتے۔ اسی لئے فقط اسی لئے مجھے غدار ٹھہرایا گیا اور مجھے مار دینے کا آرڈر دے دیا گیا۔ میں یہاں سزا کے طور پر بھیجی گئی ہوں۔ مار کر واپس آ جاؤں تو جو چاہوں سو کروں، نہ مار سکی تو خود ہی وہیں مر جانا۔"

”تو پھر تم نے مجھے مارا کیوں نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ڈیل، جس سے مجھے ان کی ضرورت نہیں رہے گی، میرا کھیل اپنی جگہ ویسے ہی برقرار رہے گا۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”ڈیل کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”راکیش ورما کا قتل۔“ اس نے عام سے انداز میں کہہ دیا۔

”کیسے ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”کسی کو ذرا سی بھی بھنک نہ ملے کہ راکیش ورما کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ ہے، جبکہ سب میں بتاؤں گی، کرنا تم نے ہے۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا، جس میں نفرت تھی۔

”کیسے بتاؤں گی۔“ میں نے پوچھا۔

”یہ مجھ پر چھوڑ دو، سب سے پہلے یہاں کا نیٹ ورک توڑ دو جو انہوں نے بنا رکھا ہے۔ تم جیسی چاہو ضمانت لے لو، لیکن راکیش ورما ختم ہونا چاہئے۔“

”ٹھہرو، یو جاؤ ذرا ٹھہرو......“ میں نے ایک دم سے کہا، پھر سوچتے ہوئے لہجے میں بولا، ”تم دو باتیں کر رہی ہو۔ راکیش ورما کا قتل اور یہاں کے نیٹ ورک کی تباہی، ایسے کیسے ممکن ہے؟ کیا راکیش ورما یہاں پاکستان میں ہے؟“

”نہیں، وہ پاکستان میں نہیں ہے۔ اسے مارنے کے لئے بھارت جانا پڑے گا۔ یا کسی بھی دوسرے ملک۔“ اس نے کہا۔

”تم کہہ رہی ہو یہاں کا نیٹ ورک تباہ کروں گا تو......“ میں نے پوچھنا چاہا تو وہ کاندھے اچکاتے ہوئے تیزی سے بولی۔

”ہاں نا، میں یہاں کا نیٹ ورک تباہ کرنے میں تمہاری مدد کروں گی، یہ میری طرف سے

وہ فائدہ ہے جو میں تمہیں دینا چاہتی ہوں۔ یا پھر پہلے راکیش ورما کو، ماردو تو پھر یہاں کا نیٹ ورک توڑ لو۔"

"تم نے راکیش ورما کو مارنے کی خود کوشش......" میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

"ارے میں تو اسے اپنی آنکھ کے اشارے سے ماردوں، مگر میں ذمہ داری خود پر نہیں لینا چاہتی۔ میں ایسا کیوں کر رہی ہوں، یہ میرا پرابلم ہے، تمہارا نہیں۔"

"تم کیا سمجھتی ہو میں فیصلہ دے دوں گا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا تو پھر سے کاندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

"یہ تم پر ہے کہ تم کیا کرتے ہو، تم چاہو تو مجھے قتل کر دو۔ میں حاضر ہوں۔ چاہو تو جانے دو، یا قید کر لو، میں نے خود کو تمہاری مرضی پر چھوڑا، میں اس سے بڑا ثبوت نہیں دے سکتی، اور نہ ہی رسک لے سکتی ہوں۔"

اس نے اپنی بات کہی اور سکون سے کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایک بار تو مجھے یوں لگا جیسے میں بند گلی میں آ گیا ہوں۔ مجھے میں فیصلہ کرنے کی قوت ہی نہیں ہے۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ میں جس سے نفرت کرتا تھا اور جو مجھ سے نفرت کرتی تھی، ہم دونوں اپنے مشترکہ دشمن کو مات دینے کے لئے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ کیا کروں؟

(قسط نمبر:12)

پوجا کے نرم چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میری دشمن نہیں بہت پرانی دوست ہو۔ اس نے مجھے ایک مشکل فیصلے میں ڈال دیا تھا۔ میرا سب سے بڑا امتحان تو یہی تھا کہ میں اسے قتل کرنے کی بجائے چھوڑ دوں اور وہ چلی جائے۔ مگر میری سوچ اس سے آگے بڑھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے میرے پاس آ کر مجھے جو بھی آفر کر رہی ہے تو کیوں......؟

جہاں یہ بات میرے لئے معمہ تھی وہاں ایک رسک بھی تھا۔ میں اگر اسے فوراً مار دوں تو سوائے اس کی موت کے میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں آنے والا تھا۔ جس کے فائدے اور نقصان کی مجھے اس وقت کوئی سمجھ نہیں تھی۔ وہ اگر مر جاتی تو اس کے ساتھ ہی یہاں پر موجود دشمن کا نیٹ ورک بھی میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا۔ حتمی طور پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کوئی نیٹ ورک پوجا جانتی بھی ہے یا نہیں، وہ اس نیٹ ورک کا حصہ بھی ہے یا نہیں، وہی چلا رہی ہے یا پھر محض اس کی آڑ لی ہے؟ اور اگر وہ زندہ رہتی ہے تو کیا وہ مجھے استعمال کر رہی ہے؟ مجھے اس کھیل کا لالچ دے کر چوہے بلی کا کھیل کھیلنا چاہتی ہے؟ وہ مجھے پھانسنے کے لئے لالچ دے رہی ہے؟ مجھے بہکا کر کسی دوسرے ہی راستے پر ڈالنے والی ہے یا پھر ....

”زیادہ سوچو گے نا تو کچھ بھی تمہارے پلے نہیں پڑے گا راج ویر سنگھ جی، جھٹ پٹ فیصلہ کرو۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا

”تم کیا سمجھتی ہو، میں کیسا فیصلہ کرنا چاہتا ہوں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ لبوں میں مسکرا دی اور بولی۔

”مجھ پر اعتبار کرنا چاہئے یا پھر نہیں؟“

”نہیں پوجا، میں تمہیں مارنے دینے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ میں نے دھیمی سی مسکان کے ساتھ کہا۔ میرے یوں کہنے پر اس کا چہرہ کسی بھی تاثر سے خالی رہا، وہ خاموش رہی تو میں بولا، ”وہ طریقہ سوچ رہا ہوں۔ جس سے راکیش ورما سے لے کر ان سب تک بھی تمہاری موت کی اطلاع پہنچ جائے، جنہوں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے۔“

میرے یوں کہنے پر وہ بے بسی میں مسکرا دی، پھر اچانک تنک کر بولی۔

”انہوں نے مجھے بھیجا ہی مرنے کے لئے ہے، مر گئی تو کوئی بات نہیں انہیں ذرا فرق نہیں پڑے گا لیکن اگر...... کچھ بھی نہیں ہوگا راج دیپ۔“

’مجھے تیرے زندہ رہنے اور مرنے سے کوئی مطلب نہیں، تیرے جیسے نجانے کتنے دشمن ہیں میرے۔ مجھے صرف یہ دیکھنا ہے، مجھے فائدہ...... تیرے مرنے میں ہے یا زندہ رکھنے میں۔“ میں نے سرد سے لہجے میں کہا۔

”تم بے وقوف ہو، میرے جیسا دشمن تجھے کبھی نہیں ملے گا، سوچ لو، محض چند منٹ ہیں تمہارے پاس، پھر میں نے جانا ہے۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا تو میں اطمینان سے بولا۔

”میں جانے دوں گا تو جاؤ گی۔“

”میں نے تو جانا ہے، یا تو چلی جاؤں گی یا تم مجھے مار دو گے۔ ایک بات تو ضرور ہوگی۔“ اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

”پوجا تم پہلی عورت ہو جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہو۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو قہقہہ لگا کر ہنس دی پھر بولی۔

”اگر میں سمجھ میں آ جاؤں تو پھر زندہ نہ رہوں۔“

"اگر میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں تو؟" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں بہت فائدہ دوں گی، لیکن اس کے عوض فائدہ بھی لوں گی۔ سچ بول رہی ہوں، مجھے اپنے دشمن تیرے ہاتھوں مروانے ہیں، جتنے مارو گے، اتنا فائدہ دوں گی، اگر تیرے بھیجے میں بات آجاتی ہے تو کرو پھر ڈن۔"

اس نے بھی حتمی لہجے میں کہتے ہوئے اپنی ہتھیلی آگے کر دی۔ اس کی سفید ہتھیلی میرے سامنے پھیلی ہوئی تھی، صرف ایک لمحہ تھا۔ مجھے اسی میں فیصلہ کرنا تھا۔ میں نے اسی لمحے اپنے اندر جھانکا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر سرد لہجے میں بولا۔

"ڈن ہو گیا پوجا، جاؤ...... مجھے نہیں پوچھوں کا تم سے۔"

"مطلب؟" اس نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مطلب یہ کہ ابھی تم جاؤ، پھر ملیں گے تو فائدے نقصان کی بات کریں گے۔ اب اگر میں نے کوئی بات کہی، تم یہی سمجھو گی کہ میں احسان کر رہا ہوں تم پر......" میں نے کہنا چاہا تو وہ مجھے ٹوکتے ہوئے تیزی سے بولی۔

"راج ویر...... تم نے پوجا سے ہاتھ ملایا ہے، یہ یاد رکھنا۔"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ایک لمحہ اس کی آنکھوں میں دیکھا اور باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جاؤ۔"

اس نے میری طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی، جسے میں بالکل بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی، پھر اپنے سامنے پڑے پسٹل کو اٹھا کر اپنے سینے میں رکھا اور تیزی سے برقعہ پہننے لگی۔ اس نے برقعہ پہننے میں دو تین منٹ لگائے اور

دروازے سے نکلتی چلی گئی۔ میں جانتا تھا کہ میرے بغیر وہ وہاں سے نہیں نکل سکتی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے جانے لگا۔ سیڑھیاں اتر کر ہم لاؤنج میں آ گئے۔ نیچے شہباز کھڑا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے اسے اشارہ کر دیا کہ پوجا کو جانے دو۔ وہ اسے لے کر باہر کی جانب چلا گیا۔ کچھ دیر بعد پوجا گیٹ سے باہر تھی۔

''کیوں جانے دیا اسے؟'' شہباز نے واپس لاؤنج میں آ کر میرے ساتھ والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بڑی رسانیت سے پوچھا۔

''یار اگر میں توجیہات بیان کروں تو کتنی ساری کہہ دوں لیکن میں ایک بھی نہیں کہنا چاہتا، بس یار اسے جانے دیا میں نے۔'' میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

''کوئی وجہ تو ہو گی جو یوں اسے جانے دیا؟'' اس نے پوچھا تو میں نے ساری بات اسے بتا دی۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

''کوئی بات نہیں، اچھا کیا جانے دیا۔''

''شہباز، مجھے راکیش ورما کو ختم کرنے کی بجائے، یہاں کے نیٹ ورک کو تباہ کرنے میں زیادہ دلچسپی ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''فکر نہیں کر سوہنے، ابھی تو آ ؤ نا۔ میں تجھے گھر چھوڑ دوں، صبح تمہیں کچھ باتیں بتاؤں گا۔ یہ بھی ہو جائے گا۔'' اس نے کہا اور گاڑی کی طرف چل دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم وہاں سے نکل گئے۔

میں ساری رات جاگتا رہا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پوجا میرے ساتھ کھیل گئی ہے یا مجھے اپنے ساتھ کھیل میں شامل کر گئی ہے۔ زندگی میں پہلی بار میں ایسی کسی صورت حال سے دوچار ہوا تھا۔ میری تربیت ہی اس طرح ہوئی تھی کہ میں فوری فیصلہ کر کے اس پر عمل کر دیتا

تھا۔ بہت زیادہ سوچنے اور پلاننگ میں بہت ساری مجبوریاں بھی در آیا کرتی تھیں۔ یہی مجبوریاں بندے کو کمزور کر دیتی ہیں۔ ہمارے معاشرے کی بھی یہی صورت حال ہے۔ بہت سارے بدنسل غنڈے موالی، صرف اسی لئے بدمعاشی کر جاتے ہیں کہ عام آدمی کئی طرح کی مجبوریاں رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے کئی منافق لوگ اپنا مطلب نکالنے کے لئے ایسے بدنسل لوگوں کو استعمال کرتے ہیں۔ میں سوچ کا سرا پکڑتا تو نجانے وہ کہاں تک جا پہنچتا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میرے رت جگے کا ساوری کو ذرا سا بھی احساس نہ ہو۔

جس وقت اذانیں گونجنے لگیں تو میں بیڈ سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں لاؤنج سے ہوتا ہوا کاریڈور کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ وہاں تازہ ہوا سے میں سکون محسوس کرنے لگا۔ کچھ دیر تک کے لئے پوجا کی باتیں، مدھیہ اور اس کا کھیل میرے دماغ سے نکل گیا۔ مجھے وہاں بیٹھے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ میں نے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، ساوری چلی آ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں دو مگ تھے۔ وہ میرے قریب آ گئی۔ اس نے کوئی لفظ کہے بنا ایک مگ میری طرف بڑھایا تو میں نے پکڑ لیا۔ وہ بالکل میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دھیمے سے بولی۔

”علی...... دیکھو، رہے ہو اس وقت اندھیرا ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہنکارہ بھرنے کے سے انداز میں کہا۔

”ذرا تصور کرو، یہاں تو بجلی سے چلنے والی روشنیاں ہیں لیکن اگر ہم روہی میں ہوں جہاں بجلی نہیں ہے، وہاں اس وقت کیسا محسوس ہوتا ہوگا؟“ اس نے دھیمی آواز میں پوچھا تو میں دھیمے سے بولا۔

”بالکل گھپ اندھیرا، جس میں کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا ہے۔“

”اس اندھیرے میں بھی ہم سانس لے رہے ہوتے ہیں۔“ اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”ابھی اندھیرا ہے، لیکن ابھی تھوڑی دیر بعد روشنی ہو جائے گی۔ ہمارے پاس سوائے انتظار کے اور کچھ نہیں ہے۔ وقت ہونے پر ہی اُجالا ہوگا، اس میں سب دکھائی دے جائے گا، تم سورج کو پکڑ کر آگے پیچھے نہیں لے جا سکتے ہو۔ بلکہ سورج ہی اندھیرے اور اُجالے کا فیصلہ کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے تخلیق کار نے اسے ایسا کرنے کی طاقت دی ہوئی ہے۔“ اس نے دھیمے سے کہا اور نگ... نے ایک لمبا گھونٹ بھر لیا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ میں نے کافی حد تک الجھتے ہوئے کہا۔

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں میرے سوہنے، اس وقت، تم اندھیرے میں ہو، اگر تم اس لئے گھبراؤ گے تا کہ تمہیں کچھ پتہ نہیں چل رہا تو نہیں پتہ چلے گا، کیونکہ اندھیرا ہے۔ مگر یہ اندھیرا رہے گا نہیں۔ کچھ دیر بعد اُجالا ہو جائے گا۔ سارے منظر واضح ہو جائیں گے۔ مصنوعی روشنی میں تم اصل منظر پھر بھی نہیں دیکھ سکتے ہو، تھوڑا انتظار کرو بس۔“

”تم کیا جانتی ہو میں کیوں پریشان ہوں؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”میں جانتی ہوں، اس پوجا نے تمہیں چکرا کر رکھ دیا ہے۔ دراصل وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ کیونکہ اندھیرے میں سایہ نہیں ہوتا۔ جب ساتھ میں سایہ ہوتا تو خوف نہیں رہتا۔“ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تو میں اس کی بہت ساری باتیں سمجھ گیا۔ ایک دم سے میرے سامنے جو الجھن کا پردہ تھا وہ ہٹ گیا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ تبھی میں نے اسی حیران کن لہجے میں پوچھا۔

"یہ اتنی موٹی موٹی باتیں تم نے کہاں سے سیکھ لی ہیں؟"

"روہی نے، یہ مجھے روہی نے سکھائی ہیں، جب انسان مشکل میں جیتا ہے نا تو زندگی سکھا دیتی ہے۔ میرے بابا نے مجھے روہی میں رہنا سکھایا ہے۔ میں تو اس دنیا کو بھی روہی سمجھتی ہوں، یہاں پیاس ہے، ہر طرح کی پیاس ہے، دیکھتے نہیں ہو، یہاں بگولے بھی ہیں، زیرِ زمین سانپ بچھو اور نجانے کیا کیا ہیں۔ اس لئے اس دنیا کی بڑی جلدی سمجھ آ گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا تم جو کہنا چاہ رہی ہو، چل آ اُٹھ۔" میں نے کہا اور اٹھ کر واپس بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔

☆......☆......☆

میرے آفس پہنچتے ہی شہباز آ گیا۔ اس نے آتے ہی کافی منگوائی اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا سوچا تم نے پوجا کے بارے میں؟"

"کچھ نہیں، سامنے آئے گی تو دیکھ لیں گے۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"دیکھو علی، ہمارے سامنے مختلف رپورٹس آتی رہتی ہیں۔ فوری طور پر تو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ کون سا واقعہ، کس سے جڑا ہوا ہے۔ لیکن جب کوئی مچھلی لگ جاتی ہے۔ تو پھر اس سے جڑے بہت سارے واقعات بہت کچھ سمجھا دیتے ہیں۔ پوجا ہمارے لئے ایک بڑی مچھلی ہے۔ وہ خود کو بہت سیانی سمجھ رہی ہوگی، اگر سیانی ہے بھی تو کوئی بات نہیں۔ وہ اگر......"

"او یار، بکواس بند کر، کوئی نئی بات کر۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر ایک دم سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا، وہ کتنی ہی دیر تک ہنستا رہا، پھر بولا:

"اس کا مطلب ہے کہانی سمجھ گئے ہو۔"

"ہاں، وہ آئی اور چلی گئی، اب وہ جو داؤ کھیلے گی، اس سے اندازہ لگا لوں گا، تم ایسے کرو، دو بندے پکڑے تھے روہی سے، بکا راجستانی اور ایک دوسرا آدمی، مجھے نام نہیں پتہ اس کا۔ کیا تمہیں معلوم ہے اس وقت وہ کہاں ہیں؟"

"جیل کے خصوصی سیل میں ہیں، کیوں کیا ہوا؟" اس نے سوچتے ہوئے پوچھا تو میں نے عام سے لہجے میں کہا:

"ان سے تھوڑا بات کرنی ہے، ایویں گپ شپ، تھوڑی دل جوئی ہو جائے گی۔ کچھ پرانے واقف کاروں کی بات ہو جائے گی۔"

اتنے میں ایک لڑکا کافی کے دو مگ لے کر آ گیا۔ جیسے ہی وہ واپس پلٹا، شہباز نے اپنا سیل فون نکال لیا اور باتیں کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ فون پر وہ بات اب بھی کر رہا تھا۔ اس نے فائل میرے سامنے رکھی اور مجھے پڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا کہ ہماری ملاقات بکا راجستانی سے کروائیں۔ جب تک اس نے بات کی تب تک میں نے فائل کھول لی۔ اس نے بات ختم کر لی اور بولا:

"اس فائل میں ان دونوں کے بارے میں معلومات ہیں۔ یہ لوگ کہاں سے ہیں، مطلب جو معلومات انہوں نے پولیس کو دی ہیں وہ ہیں۔"

"چل کافی پی لے، پھر نکلتے ہیں۔" میں نے کہا اور پڑھنے لگا۔ ان کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں تھیں۔ ظاہر ہے ان میں زیادہ تر غلط معلومات ہوتی ہیں، بکا راجستانی کے بارے میں مجھے اتنا جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہ فائل ایک طرف رکھ دی۔ کافی پیتے ہوئے ہم یونہی باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے وہ واقعات بتانے لگا جو چند دنوں سے ارد گرد

کے علاقے میں رونما ہو رہے تھے۔ بظاہر وہ عام سے تھے لیکن اگر ان پر غور کیا جاتا تو ان میں بہت کچھ پوشیدہ تھا۔ بہت کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔

دوپہر تک ہم یونہی آوارہ گردی کرتے رہے۔ ایک پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے ہم اندرون لاہور کی گلیوں میں گھس گئے۔ میں نے شہباز سے نہیں پوچھا وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ ہم نے چونکہ وقت گزارنا تھا، اس لیے آوارہ گردی میں وہ چاہے جدھر بھی جاتا، میرا سوال کرنا بنتا ہی نہیں تھا۔ ہم کافی دیر ادھر اُدھر بھٹکتے ہوئے ایک تنگ سی گلی میں آ گئے۔ تقریباً گلی کے درمیان ایک تین چار منزلہ گھر کے سامنے وہ رک گیا۔ اس کے آگے چھوٹا سا تھڑا تھا جس کے آگے سیمنٹ کی جالی لگی ہوئی۔ اپنے دور میں وہ بڑا جدید مکان رہا ہوگا لیکن اس وقت باہر سے وہ خستہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ دروازے پر دستک کے جواب میں ایک لڑکا نمودار ہوا۔ اس نے شہباز کو دیکھا تو مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ ظاہر ہے وہاں اس کی اچھی خاصی جان پہچان ہوگی۔ اس نے دروازے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"اوسنا بھئی شیرا، سب ٹھیک چل رہا ہے نا۔"

"بالکل ودھیا پائین۔" اس لڑکے نے خالص لاہوری لہجے میں کہا تو شہباز نے ڈیوڑھی میں آ کر پوچھا۔

"شافیر، کتھے نے دادا جی؟"

"بیٹھے ہیں، میچ دیکھ رہے ہیں۔" اس نے خوشگوار لہجے میں کہا تو ہم تینوں نے چلتے ہوئے ڈیوڑھی پار کی۔ سامنے ایک کھلا سا صحن تھا جو کافی اوپر تک جاتا تھا۔ برآمدے کے ساتھ تین اطراف میں کمرے تھے۔ وہ ہمیں بالکل ساتھ والے کمرے میں لے گیا، جس کی ایک کھڑکی باہر گلی میں کھلتی تھی۔ وہاں ایک بوڑھا شخص چھوٹے سے بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا

تھا۔ سفید رنگ، سفید بال، کلین شیو، دھوتی کرتا پہنے ہوئے تھا۔ شہباز کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے بڑے جاندارانداز میں بولا۔

"اوئے کدھراوئے، بڑے دنوں بعد آئے ہو؟"

"بس تایا جی، جب کوئی مشکل آتی ہے نا تو پھر آپ ہی کو یاد کرتے ہیں۔" اس نے پہلے گھٹنے کو ہاتھ لگایا، پھر مصافحہ کیا، میں نے بھی ویسے ہی کر دیا۔ بوڑھے نے ایک بار مجھے غور سے دیکھا، پھر قریب پڑی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے ٹی وی کی آواز ہلکی کر دی۔

"کیا حال چال نے تیرے؟" انہوں نے پرشوق لہجے میں پوچھا۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں بس کمسن گھمبیریاں ہیں جو دن رات چلتی رہتی ہیں ہمارے ساتھ، پتہ ہے آپ کو۔" شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے، خیر کیا کھاؤ پیو گے؟" بوڑھے نے پرتجسس نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو شہباز نے کہا۔

"تایا جی کوئی کھابہ تو چلے گا نا، دوپہر ہونے والی ہے۔"

"جا بھئی، لے آ یا اس کی پسند کی چیزیں، کہنا مہمان آئے ہیں۔" تایا نے اسی لڑکے کو کہا تو وہ انہی قدموں واپس پلٹ گیا۔ تبھی شہباز نے پوچھا۔

"ہور سنائیں تایا جی کیسی صحت طبیعت چل رہی ہے۔"

"مجھے چھوڑ میں تو اب بوڑھا ہوں، بڑھاپا خود بیماری ہے، تم سناؤ تمہاری مشکل کیا ہے۔" انہوں نے خوشگوار لہجے میں کہا تو شہباز بولا

"مشکل یہ ہے تایا جی، کچھ دنوں سے ایک بھارتی لڑکی ایک گیانی عورت کا روپ دھار کر ننکانہ صاحب کے علاقے میں پھر رہی ہے۔"

”ہاں تم لوگ اس کے پیچھے بھی گئے تھے۔“ تایا نے پُر اسرار لہجے میں کہا میں تھوڑا حیران ہو گیا، تایا خاصی شے تھا جسے ہمارے بارے میں اطلاع تھی۔ شہباز بالکل بھی چونکے بنا روانی میں یوں کہتا چلا گیا جیسے یہ معمول ہو۔

”ہاں نا تایا، اسی کو تلاش کر رہے ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”کچھ پتہ چلا؟“ تایا نے پوچھا۔

”نہیں نا، میاں عالم نے تھوڑا بہت بتایا ہے اس کے بارے میں۔ وہاں ان کے پیر کی کوئی گدی ہے اور.....“ اس نے کہنا چاہا تو تایا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے لاپرواہی سے کہا

”اوئے یار میاں عالم تو بے چارہ بھولا بندہ ہے۔ وہ تو پیری مریدی میں مست ہے۔ اسے پتہ ہی نہیں اس کی ناک کے نیچے کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ وہ مست ملنگ بندہ ہے۔ ویسے جو اس نے کہا ہے وہ سچ ہی ہے۔“ تایا نے تصدیق کر دی تو شہباز نے پوچھا۔

”تایا جی اس کا کوئی اتا پتہ، کیا کر رہی ہے وہ یہاں پر، اگر تو وہ......“

”لگتا ہے وہ بہت پہنچی ہوئی شے ہے، کیونکہ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پیچھے بڑے ڈاہڈے بندے ہیں۔ سمجھو یہاں لاہور کا انڈر ورلڈ اس کے پیچھے ہے۔“ تایا نے بتایا تو شہباز نے تڑپ کر پوچھا۔

”اُو تایا جی، اب لاہور کا انڈر ورلڈ کون سا ہم سے چھپا ہوا ہے۔ چند لوگ ہیں، ان کی ہی بدمعاشی چلتی ہے۔ یہ پاروالا کام کون کر رہا ہے؟“

”یار یوں سمجھو کہ انہی لوگوں کی نئی شاخیں کھل گئی ہیں، وہ کیا کہتے ہیں فرنچائز۔ وہ فرنچائز کھول کر بیٹھ گئے ہیں۔ نئی پود آ گئی ہے نا تو اب جرم کے طریقے بھی بدل گئے ہیں۔ پہلے جو بدمعاش ہوتا تھا، اس کے بھی کچھ اصول تھے۔ وہ عورت کا کام نہیں کرتا تھا، اب جو

بدمعاش ہیں ان کے کام کی شروعات ہی غلط طریقے سے ہوتی ہے۔اب مسئلہ صرف پیسے کا ہے، کوئی اصول، کوئی اخلاق نہیں رہا۔" تایا نے دلبرداشتہ ہوتے ہوئے بتایا۔

"تو پھر اب......" اس نے کہا۔

"وہ لڑکی آئی فرید کوٹ ہی سے ہے۔اسی گدی نشین کے ریفرنس سے آئی ہے۔اب یہ نہیں پتہ وہ بھارت کے کسی دوسرے علاقے سے ہے یا وہیں اسی علاقے سے ہے۔اس کا پاسپورٹ وغیرہ سب وہیں کا ہے۔" تایا نے بتایا۔

"وہ یہاں کر کیا رہی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اس کا تو ابھی مجھے بھی پتہ نہیں چلا، اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت پڑی اس کا پتہ رکھنے کی کہ وہ یہاں کیا کر رہی ہے۔" تایا نے اکتاہٹ سے کہا۔

"پھر تایا جی آپ کو کیسے پتہ اس کا؟" شہباز نے پوچھا تو بولا۔

"اس لڑکی کا ذکر کسی دوسرے معاملے میں ہوا تھا۔یہاں لاہور کی ایک پارٹی کو کروڑوں روپے ملے ہیں اس کی حفاظت کے لیے۔وہی پارٹی اب اس کی حفاظت کی ذمے دار ہے۔ پیسہ کس نے دیا؟ یہ نہیں پتہ...... کیوں کہ مجھے کوئی مطلب نہیں تھا۔"

"کون سی پارٹی؟" اس نے پوچھا تو تایا نے لاپرواہی سے کہا۔

"دیکھو اگر تم نے اس پارٹی پر ہاتھ ڈالنا ہے تو یہ چھوڑ دو، نہ جانے دو۔"

"تایا جی، سیدھی اور سچی بات یہ ہے، مجھے اس لڑکی سے نہیں اس کے یہاں پر ہونے سے مطلب ہے۔وہ کیوں ہے یہاں پر؟" اس نے حتمی لہجے میں کہتے ہوئے تایا کے چہرے پر دیکھا۔ تایا کے چہرے پر ایک دم سے پریشانی چھا گئی۔اس نے سوچنے والے انداز میں سر جھکا لیا، پھر سر اٹھا کر بولا۔

”سرفراز ملک ہے نا، اس کے بیٹوں کو شاید جانتے ہو تم۔ ان کا باپ اس کام میں ملوث نہیں ہے۔ وہ لڑکے یہاں بہت کچھ کر رہے ہیں۔ وہ لڑکی ان کے پاس انہی کے فارم ہاؤس پر رہتی ہے۔“

”ان کے فارم ہاؤس پر...... وہ تو بڑا بدنام فارم ہاؤس ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا

”اسی لئے وہاں چھپی ہوئی ہے، وہاں کئی لڑکیاں ادھر اُدھر سے آ کر رہتی ہیں۔ کاروبار ہے ان کا۔“ تایا نے نفرت سے کہا تو وہ بولا۔

”تو اس کے لئے سرفراز ملک کے لڑکوں سے پوچھا جائے۔“

”سنبھال کے ہاتھ ڈالنا۔“ تایا نے سرزنش کی۔

”فکر نہ کرو تایا جی، دھیان سے ہوگا، آپ ہی نے بتایا ہے کہ ایسی جگہوں پر ہاتھ کیسے ڈالتے ہیں“ شہباز نے ہنستے ہوئے کہا تو تایا نے میری طرف دیکھ کر خوشگوار انداز میں پوچھا۔

”اس جوان کا تعارف نہیں کرایا تم نے ابھی تک۔“

”یہ وہی علی زین ہے جو کبھی گورنمنٹ کالج میں......“ شہباز نے کہا تو تایا نے حیرت سے دیکھا پھر خوشگوار انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”سچ پوچھو نا علی زین، تم نے مجھے ہرایا ہے۔ میں نے بڑی گیم کی لیکن تیرے سامنے ہارتا گیا ہوں۔ پتہ نہیں تیرے پاس ایسا کیا تھا۔“

اب میں تایا کو کیا بتاتا کہ میرے ساتھ کیا تھا۔ کیونکہ مجھے خود پتہ نہیں تھا، بس جو سمجھ میں آتا تھا کرتا چلا جاتا تھا۔ ایک طرف جہاں چاچا عبدالمجید کی راہنمائی تھی تو دوسری طرف کالج کے دنوں میں صائمہ مجھے معلومات دیا کرتی تھی۔ انہی دنوں مجھے یقین ہوا تھا کہ انفارمیشن کتنی بڑی قوت ہوتی ہے۔ میں خاموش رہا تو شہباز چہکتے ہوئے بولا۔

”وہ وقت بیت گیا تایا جی۔“

”ہاں دیکھ رہا ہوں وہ وقت پیچھے چلا گیا اور یہ جوان بہت آگے نکل گیا۔اب مجھے امید ہے کہ تم سرفراز ملک کے بیٹوں پر ہاتھ ڈال سکو گے۔“ تایا نے پر امید انداز میں کہا تو شہباز نے پوچھا۔

”تو بتائیں نا کیسے؟“

اتنے میں باہر سے یوں آواز آئی جیسے کوئی آ گیا ہو۔تایا نے باہر کی جانب سے آنے والی آواز پر کان دھرتے ہوئے کہا۔

”اوے سانس تو لو، کچھ کھا پی لو، بتاتا ہوں۔“

وہ لڑکا خالص لاہوری روایتی کھانے لے کر آ گیا تھا۔جن میں ہریسہ اور دیگی چرغہ زیادہ تھا۔کافی سے زیادہ روغنی نان تھے۔اس نے وہ کھانے میز پر سجا دیئے۔کھانے کے دوران تایا ہمیں کھنے کو لاہور انڈر ورلڈ کے بارے میں بتاتا بھی رہا اور سمجھاتا بھی رہا۔میں نے جو سمجھا وہ یہی تھا کہ یہ سارا انڈر ورلڈ بھتہ خوری، قبضہ مافیا، اور جوئے کے اڈے چلانے کی بنیاد پر ہے۔اس میں کئی قتل ہوئے اور خوف کی فضا بنی ہوئی ہے۔بات وہی تھی کہ فائدہ اور طاقت کس کی ہے؟ کھانا ختم ہوتے ہی جب قہوے کی پیالیاں ہمارے سامنے آ گئیں تو تایا نے پھر سے تکیے کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو یارو، بات یہ ہے کہ تم لوگ جرم کی دنیا سے نہیں ہو، تم لوگوں کا مقصد کچھ اور ہے۔سرفراز ملک کے پیچھے سیاسی لوگوں کا ہاتھ ہے۔یہ لوگ سیاسی لوگوں کو فائدہ دیتے ہیں اور وہ سیاسی لوگ اِن کی پشت پناہی کرتے ہیں۔وہ تم لوگوں کے لئے مسئلہ نہیں ہوگا۔میں تمہیں ایک بندہ بتاتا ہوں۔اس کے پاس چلے جائیں وہ سارے راستے بتا دے گا۔“

"تایا پھر کوئی بندہ؟" شہباز نے اکتاہٹ سے کہا۔

"سوہنے مجھے اس لڑکی کا پوچھا تھا کہ نہیں پتہ لیکن وہ سب بتا دے گا، سرفراز ملک کے بیٹوں کو کیسے گھیرنا ہے وہ بھی بات دے گا۔ خیر تم اس کے پاس نہیں جانا چاہتے تو وہ آ جائے گا تم لوگوں کے پاس۔" تایا نے سکون سے کہا۔

"چل ٹھیک ہے، اس کا کوئی نمبر ہے تو دے دو، میں......" شہباز نے کہا تو تایا نے اس کی بات ٹوکتے ہوئے کہا۔

"وہ فون وغیرہ نہیں رکھتا۔ وہ تم سے کرے گا رابطہ۔"

"اوکے۔ میں اس سے مل لوں گا......" لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ شہباز کا سیل فون بج اٹھا، اس نے اسکرین پر دیکھا اور ہیلو کہہ دیا۔ دوسری جانب سے کچھ کہا گیا تو اس نے سن کر کال بند کر دی۔

"اچھا تایا، ہم چلتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو تایا نے مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس وقت تک شہباز اپنی جیب سے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال چکا تھا۔ وہ اس نے تایا کے سرہانے کے نیچے رکھی اور ہم وہاں سے نکلتے چلے گئے۔

گاڑی میں بیٹھنے تک شہباز نے کوئی بات نہیں کی۔ جیسے ہی گاڑی روڈ پر ڈالی تو اس نے طویل سانس لے کر کہا۔

"پتہ ہے تایا کون تھا؟"

"مجھے الہام نہیں ہوتے سوہنے" میں نے تایا کے انداز میں کہا تو قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے بولا

"پہلے تو میں تمہیں یہ بتا دوں ہم بکا راجستانی سے ملنے جیل جا رہے ہیں۔ اس سے ملاقات کا بندوبست ہو گیا ہے، اسی بارے میں فون تھا۔"

”چلو اچھا ہوا آج ہی مل لیں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں تو بتایا، اس کا اصل نام فاروق ہے لیکن فاروق شاہ کے نام سے مشہور تھا اپنے زمانے کا دبنگ پولیس آفیسر رہا ہے۔ ساری زندگی لاہور ہی کے مختلف تھانوں میں گزاری۔ اس کے سامنے ہی لاہور انڈر ورلڈ ابھرا ہے۔“

”پھر تو یہ بڑے کام کا بندہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”صرف چند لوگوں کے لئے اور وہ بھی جو لمبے نوٹ لگائیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ زور سے ہنس دیا۔ مجھے شہباز کا جاندار قہقہہ بہت پسند تھا۔ وہ فاروق شاہ کے بارے میں باتیں سناتا رہا اور میں توجہ سے سنتا رہا، تقریباً پونے گھنٹے بعد ہم جیل تک جا پہنچے۔

مختلف مراحل میں ہمیں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ یہاں تک کہ ہمیں ایک جیل کے اندر ایک کمرے میں لے جایا گیا جو انتہائی بوسیدہ تھا۔ تنگ و تاریک سیلن زدہ کمرہ جس میں سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ایک پیلا بلب روشن تھا، جس کی روشنی بھی لرز رہی تھی۔ ایک اُڑے رنگ والے بڑے سے میز کے اردگرد چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں دو پر ہمیں بٹھا دیا گیا۔ ہمارے ساتھ آئے ہوئے اہلکار واپس چلے گئے تو پانچ سات منٹ بعد اندر کی طرف والا ایک دروازہ کھلا اور اس میں ایک اہلکار کمرے میں آیا، اس کے پیچھے بکا راجستانی اور اس کے پیچھے وہی بھارتی ایجنٹ تھا، جسے بکا راجستانی کے ساتھ ہی آفیسر کو دیا تھا، وہ اہلکار ان دونوں کو چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ وہ دونوں ہی حیرت بھری نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چند لمحے یونہی ایک دوسرے کو دیکھتے رہنے کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد سے لہجے میں کہا۔

”کیسی گزر رہی ہے بکا؟“

”ویسی ہی جیسے جیل میں ہوتی ہے۔“ اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا پھر شکوہ بھرے لہجے میں بولا، ”تم اگر مجھے وہیں مار دیتے تو اچھا تھا، یہاں تو نہ مرنے دیتے ہیں اور نہ جینے دیتے ہیں، کوئی مقدمہ بھی نہیں جس سے کوئی امید ہو کہ ہم باہر آ جائیں۔“

”رہتے تو ٹھیک ہو نا یہاں پر؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

”سچی بتاؤں، نہ تو ہمیں کسی نے مشقت پر لگایا ہے، نہ کوئی ذلیل کرتا ہے، روٹی بھی ٹھیک ملتی ہے اور کپڑا بھی، بس تنہائی کی زندگی ہے؟“

”اور تم جیون رام کیسے ہو؟“ میں نے دوسرے سے پوچھا، جس کا نام میں فائل میں پڑھ چکا تھا۔ اپنا نام سنتے ہی وہ ایک دم سے چونکا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”اس کا مطلب ہے تم کوئی عام مجرم نہیں ہو، کسی فورس کے آدمی ہو۔“

”یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اپنا یہ نام یہاں کی سرکار کو بھی نہیں بتایا ہے، تم نے یہ نام لیا تو سمجھ گیا ہوں، کون ہو سکتے ہو تم؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”چلو تم یہی سمجھ لو، بہرحال کیسے رہ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ویسے ہی جیسے ابھی بکا نے بتایا۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔

”کیا خیال ہے جانا ہے واپس یا یہیں رہنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ کام بتاؤ، جس کے لیے تم یہاں آئے ہو، ایسی دیا والی بات تم یونہی تو نہیں کرو گے، کچھ تو ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”سمجھدار بندے لگتے ہو۔ تم جانتے ہو میں نے تمہارے فون سے تمہاری اس بوجا سے بات کی تھی، یاد ہے تمہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، بات تو کی تھی۔“ اس نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

”کاش اس وقت میں تمہارے فون کی اسکرین پر نمبر دیکھ لیتا۔ وہ نمبر یہیں کا تھا، پار کا نہیں تھا۔ اگر مجھے پتہ چل جاتا کہ پوجا یہیں ہے تو پھر تم یہاں نہ ہوتے، بلکہ پوجا کے ساتھ ہوتے۔“

”وہ وقت گزر گیا، اب کی بات کرو راج ویر۔“ اس نے اکتاہٹ سے کہا۔

”پوجا کہاں ہے؟“ میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”نہیں جانتا، میں تو یہاں جیل میں ہوں۔“ اس نے حیرت سے یوں کہا جیسے میں نے بے وقوفی کی بات کر دی ہو۔ تبھی میں نے پوچھا۔

”جانتا ہوں کہ تم نہیں جانتے ہو، کرنے کیا آئے تھے یہاں پر؟“

”وہی جو تمہارا اور میرا کام ہے۔ سب سے پہلے تمہیں ٹھکانے لگانا تھا، پھر یہاں پر موجود نیٹ ورک کو مضبوط کرنا تھا، اس کے لیے جتنے بندے مارنا پڑتے۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”تم اتنے دلیر ہو نہیں جتنا میرے سامنے بن رہے ہو۔ سیدھے بتاؤ کیا پلان لے کر آئے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”بتایا نا، ابھی تیرا پلان ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ ختم کر کے ہم نے یہیں لاہور شہر میں آنا تھا۔ پھر کوئی کارروائی کرنا تھی۔“ اس نے بتایا۔

”کیا کرتے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے سکون سے بتایا۔

”کچھ بھی، قتل کرتے، بم دھماکے، بس افراتفری پھیلانا تھی۔“

”کتنے لوگ آئے تھے یہاں پر؟“ میں نے پوچھا۔

”کئی سارے ہیں، کون کہاں پر کن رستوں سے آیا، میں نے نہیں جانتا، روہی میں ہم دو ہی آئے تھے، ایک تم نے مار دیا اور میں جنگل میں ہوں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں نفرت عود کر آئی تھی۔ وہ بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن بتا رہا تھا۔ میں چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا

”دیکھ جیون رام، ایک آفر ہے، غور سے سننا، میں تمہیں یہاں سے نکال دوں گا۔ بھلے واپس اپنے وطن چلے جانا لیکن پوجا کے بارے میں بتا دو۔“

”پتہ نہیں تم مجھے بے وقوف کیوں بنا رہے ہو؟ یہاں بیٹھا میں اس کے بارے میں کیسے جان سکتا ہوں۔“ اس نے اکتاہٹ سے کہا تو میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”باہر نکل کر بتا دو، صرف پوجا کے بارے، پھر واپس چلے جانا۔“

”باہر نکلتے ہی سو طرح کے سوال ہوں، میرا پکڑا جانا......“ اس نے پوچھنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”باہر نکلو گے نا تو معلوم ہو گا تمہیں۔ تیرے بارے میں کسی کو کچھ نہیں پتہ ہے کہ تم کہاں ہو؟ یا کہاں تھے۔ پکڑے جانے کا تو بالکل بھی نہیں پتہ۔ تم کہاں تھے، اس بارے آگے کی کہانی تم خود بنا سکتے ہو۔“

”یعنی کہ......“ اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”یہی کہ روہی سے فرار ہو گیا تھا، زیر زمین چلا گیا تھا۔ کہیں چھپ گیا تھا۔ اگر کسی گواہی کی ضرورت ہو تو بکا کی گواہی لے لینا، یہ بھی تیرے ساتھ بھاگا تھا اور اب تک تیرے ساتھ ہے۔“

”کیا مجھے بھی باہر نکال دو گے؟“ بکا نے خوشگوار حیرت سے پوچھا تو میں نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"ہاں، نکال دوں گا۔ شرط وہی ہے اپنے دیس لوٹ جانا۔ یہاں نہیں رہنا، بس پوجا کو دے دو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

"ڈن ہو گیا۔" جیون رام نے حتمی لہجے میں کہا۔

"میری طرف سے بھی......" بکا راجستانی نے کہا تو شہباز نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے انتہائی دھیمی آواز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تو سنو پھر......آج رات یا کل دن میں، کسی کے ساتھ بھی لڑنا ہے اور خود تھوڑا بہت زخمی ہو جانا ہے، میں یہاں پر رابطہ رکھوں گا، جیسے ہی تم ہسپتال گئے، آگے میں خود سنبھال لوں گا، کل دوپہر تک رابطہ رکھوں گا۔"

"ٹھیک ہو گیا، مطلب ہسپتال جانا ضروری ہے؟" جیون رام نے پوچھا۔

"یار یہی آسان ترین حل ہے، یہاں بارک سے باہر نکلنے کا۔ کوئی دوسرا طریقہ بتاؤ، کیسے نکلو گے؟"

"بات تو ٹھیک ہے، کیسے نکلنا ہے، کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔" بکا راجستانی نے کہا تو جیون رام نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ڈن ہے جی۔"

ہمارے پاس مزید کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ یونہی دو چار مختلف باتیں کر کے ہم دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔

جیل سے جب باہر آئے تو دن ڈھلنے والا تھا۔ شہباز نے جہاں رابطہ کرنا تھا، کر لیا اور انہیں بتا دیا کہ یہ لوگ اگر زخمی ہو جائیں تو بتا دیں۔

"شہباز، میں تیرا پلان ابھی تک نہیں سمجھ پایا ہوں، آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟" میں نے

پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ بولا۔

"آدمی ادھوری بات کیا کرنی، کل بتاؤں گا۔ ابھی تم گھر فون لگاؤ، بھابھی سے کہو، کوئی اچھی سی ڈش بنا دے ایک بھوکے بندے نے بھی لنگر کرنا ہے۔"

"ویسے پوجا نے بھی ابھی تک خود رابطہ نہیں کیا۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"کرے گی وہ رابطہ کرے گی۔ اس کا باپ بھی رابطہ کرے گا، تم بالکل ٹینشن مت لو، بس لنگر کے بارے میں کہو۔"

اس کے یوں کہنے پر میں سوائے مسکرانے کے اور کیا کر سکتا تھا۔

☆......☆......☆

دن خاصا چڑھ آیا تھا مگر میں بستر میں کسلمندی سے پڑا تھا۔ میں شہباز ہی کے پلان کو سوچ رہا تھا جو کسی حد تک مجھے سمجھ بھی آ رہا تھا۔ اس کا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ جب میں نے کئی آپشن سوچے تو منظر واضح ہونے لگا تھا۔ میں شاید مزید یونہی پڑا رہتا، شہباز کی کال آ گئی۔ اس نے ہیلو کہتے ہی کہا۔

"میں آ رہا ہوں ناشتہ کرنے۔"

"اوماما، تجھے کھانے پینے کے علاوہ کچھ سوجھتا بھی ہے کہ نہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"میری کون سا گھر والی ہے، مجھے تو اب مانگ تانگ کر ہی کھانا ہے نا۔"

"کہاں ہو؟" میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

"بس ایویں پانچ منٹ کی دوری پر۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں بستر میں ہوں، چپ چاپ آ کر بیٹھ جانا، جو کھانا ہو کہہ دینا۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور کال آف کر دی۔

میں جب لاؤنج میں گیا تو وہ سامنے چائے کا مگ دھرے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی تیزی سے بولا۔ ”بہت زبردست ناشتہ میری بہن نے مجھے بنا کر دیا، مزہ آ گیا۔“

میں خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھا تو وہ چائے کا سپ لے کر بولا۔

”لو بھئی، کام ہو گیا، تیرے بندے باہر آ گئے ہیں۔“

”کہاں ہیں وہ؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”ابھی تک تو ہمارے ہسپتال میں ہیں، کچھ دیر بعد انہیں چھٹی مل جائے، پوچھنا میں نے یہ ہے کہ انہیں جانے دوں یا تم ان سے ملنا چاہو گے؟“

”دیکھو تمہارے پلان میں اگر میرا ملنا ضروری ہے تو کہو، میں ان سے مل لیتا ہوں۔“ میں نے اطمینان سے کہا تو اس نے مجھ سے بھی زیادہ پرسکون لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”ویسے ملنے کی ضرورت تو نہیں ہے، وہ ہماری نگاہ میں رہیں گے۔“

”کیسے؟“ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”یار نکالنے کو تو انہیں ویسے ہی نکال دیتے، ان پر کون سا خصوصی مقدمہ کر کے اندر ڈالا گیا تھا، ایویں تھوڑا بہت تھا۔ ہاں مگر انہیں اس خصوصی سیل میں رکھا گیا تھا جہاں ایسے لوگوں کی صرف تفتیش ہوتی ہے۔“ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

”نگاہوں میں کیسے......؟“

”بتا رہا ہوں نا یار۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لیا پھر بولا۔ ”انہیں زخمی ہونے کے لئے اس لئے کہا گیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہسپتال میں آ پہنچیں۔ مطلب انہیں اس

طرح ہسپتال تک لانا تھا کہ انہیں شک نہ ہو، دراصل ان میں ایک چپ لگائی تھی، وہ لگا دی ہے۔اب وہ جہاں بھی ہوں گے ان کے بارے میں اطلاع ملتی رہے گی۔"

"اوہ یہ ٹھیک کیا۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"اور دوسری بات، یوجا اب اگر ہمارے سامنے آجاتی ہے تو بھی ٹھیک، اس طرح اس کی سوچ کے بارے میں پتہ چل جائے گا، اور اگر نہ آئی تو یہ دونوں اس کے رابطے میں تو آئیں گے ہی، ہم پھر......"

"اوکے،تم دماغ لڑانا چاہتے ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب تم خود دیکھتے ہو، وہ یہاں سے نکلنے کے بعد اپنے لوگوں سے رابطہ کریں گے، ان سے ملیں گے، پتہ چل جائے گا کہ کون کہاں پر ہے۔" اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو میں نے پوچھا۔

"کیا یہ اتنا ہی آسان ہے؟"

"ہے نا، باقی ہماری کوشش اور صبر ہے، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔" اس نے پر اعتماد لہجے میں کہا تو میں نے مزید سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"اچھا یہ تو ہو گیا، اب وہ سرفراز ملک کے بیٹوں کے بارے میں سوچ، ان کا کیا کرنا ہے۔" میں نے کہا

"وہ لوگ باتوں کے نہیں لاتوں کے بھوت ہیں۔ان کے ساتھ تو سیدھے بدمعاشی کرنا پڑے گی۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر یہ کیس میرا اپنا ہے۔" میں نے کہا تو اس نے قہقہہ لگا دیا۔ پھر اسی طرح ہنستے ہوئے بولا۔

"ہاں نا تیرا ہی بنتا ہے۔"

"اچھا تو کیا ہے پھر اُن کا جغرافیہ؟" میں نے پوچھا۔

"لاہور کا سب سے جدید پوش علاقہ جہاں پر فارم ہاؤس ہی ہیں، ان میں ایک فارم ہاؤس ان کا بھی ہے، یہاں یہ اپنی فیملی کے ساتھ نہیں رہتے، یہاں پر بڑے جدید انداز میں وہی پرانے دھندے ہو رہے ہیں۔"

"جدید انداز میں پرانے دھندے؟ تایا تو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔" میں نے پوچھا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے کہا۔

"اس فارم ہاؤس میں کچھ لڑکیاں مستقل رہائش پذیر ہیں۔ کچھ باہر رہتی ہیں۔ شام ڈھلتے ہی پیسے والے لوگ وہاں جاتے ہیں، کچھ تو کن سسٹم یا کچھ اس طرح کے دوسرے طریقے، جن کا مقصد صرف اور صرف سیکورٹی ہوتی ہے۔ دیکھنے میں وہاں پارٹی ہو رہی ہوتی ہے۔ لیکن وہاں پر لڑکیوں کے دھندے کے ساتھ، منشیات اور اسلحہ وغیرہ کا دھندہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن......" یہ کہہ کر وہ رک گیا تو میں نے پوچھا۔

"لیکن کیا؟"

"یہاں پر قانونی یا غیر قانونی بزنس ڈیل کے ساتھ ساتھ بہت ساری خفیہ میٹنگ بھی ہوتی ہیں۔ اب تایا کے مطابق، اگر پوجا وہاں چھپی ہوئی ہے تو معاملہ خاصا آگے تک بڑھا ہوا ہے۔" اس نے پورا 'جغرافیہ' بتا دیا۔

"چل کرا بکنگ، آج ہی چلتے ہیں وہاں پر۔" میں نے کہا۔

"شام تو ہو لینے دے، ابھی ناشتہ تو کر لو میری جان پتہ نہیں وہ بھی تجھے ملتا ہے کہ نہیں۔" اس نے کہا تو میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تمہیں کیوں نہیں ملنا،تم نے کوئی بے غیرتی تو نہیں کر دی؟“

”نہیں ابھی تک تو نہیں کی، فارم ہاؤس والا بتا دوں تو......“ یہ کہتے ہوئے باقی بات اس نے اشارے سے کر دی تو میں ہنس دیا۔

ناشتے کے بعد ہم آفس کے لئے نکل پڑے۔ہم ابھی رستے میں تھے کہ میرا فون بج اٹھا۔ نمبر دیکھتے ہی میں چونک گیا۔وہ پوجا کی کال تھی۔میرے بدن میں ایک دم سے سنسنی ہونے لگی۔میں نے کال رسیو کر کے فون کان سے لگا کر ہیلو کہا تو وہ چہکتے ہوئے بولی۔

”میری یاد نہیں آئی تمہیں؟“

”میں بھولا ہی کب تھا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”یہ تو مجھے یقین ہے، اب تم مجھے بھول سکتے ہی نہیں ہو۔یہ میرا نمبر ہے، جب چاہے کال کر سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اختصار سے کہا،لیکن میں جاننا چاہتا تھا کہ اس نے فون کال کیوں کی تھی۔اس سے پہلے کہ میں سوال کرتا وہ بولی۔

”آج دو پارٹیوں کی بزنس ڈیل ہونے والی،ایک پارٹی پارک ہے اور ایک یہاں کی۔“

”کس طرح کی ڈیل ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بس اگر انہیں طریقے سے پکڑ لو تو سمجھو شہر میں امن رہے گا۔“ اس نے بڑے ہی محتاط انداز میں بتایا

”کہاں پر؟“ میں نے پھر اختصار ہی سے پوچھا۔

”ابھی مقام طے نہیں ہوا، کچھ دیر میں ہو جائے گا تو میسج کر دوں گی۔تم ذہنی طور پر تیار رہو۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

"میں تیار ہی ہوں۔" میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا تو اس نے کال بند کر دی۔

میں نے سیل فون کی طرف دیکھا اور شہباز سے پوچھا۔

"تم نے مجھے یہ تو بتایا کہ وہ فارم ہاؤس میں ہو سکتی ہے، کیا اس کا نمبر ٹریس کر کے پتہ نہیں لگا سکتے کہ وہ اس وقت کہاں ہے، جیسے اس رات......"

"تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟" اس نے ایک دم سے کہا۔

"تھوڑا بہت۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"چل پھر ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحے نگاہیں سڑک پر رکھیں پھر مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھ کر نگاہیں سامنے کرتے ہوئے بولا، "میں نے رات ہی پوری معلومات لے لی تھیں۔ وہ اسی فارم ہاؤس میں ہی ہے۔ اسی لئے پورا اطمینان کر کے تجھے بتایا۔"

"ابھی اسی کی کال تھی۔" میں نے کہا اور پوری بات بتا دی۔

"یہ رسک تو لینا پڑے گا۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا پھر ایک دم سے بولا، "ہاں ضرور، یہ رسک لینا ہوگا۔"

"چل بھگا گاڑی، آفس پہنچ کر بندوبست کرتے ہیں۔" میں نے کہا تو اس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ ہم آفس کے سامنے جا پہنچے۔

شہباز اپنی مختلف تیاریوں میں لگ گیا اور میں صوفے پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ جب گاڑی میں بیٹھے ہوئے پوجا کا فون آیا تھا اور میں نے شہباز سے پوچھا تھا، اس وقت ایک دم سے مجھے بملا یاد آ گئی۔ جے پور کی موڈی اور جنونی لڑکی بملا، جس نے چند دن مجھے باندھ کر رکھ لیا تھا۔ میں جلدی سے اٹھا اور لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔ مجھے گوگل میں محفوظ اس کا نمبر ملنا چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ کچھ معلومات بھی تھیں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد محفوظ کیا ہوا نمبر مجھے

مل گیا۔ میں اگر سیدھے سجاد کو اسے کال ملاتا تو بہت گڑ بڑ ہو جاتی تھی، میری کال ٹریس ہو جاتا تھی۔ میں نے پہلے کہیں فون ملایا اور بڑے محفوظ طریقے سے بملا کو کال کر دی۔ کچھ دیر تک میری کال جاتی رہی۔ اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ دوسری کوشش پر اس کی اونگھتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“

”میں ہوں راج دیپ۔“ میں نے عام سے لہجے میں کہا تو اس کی تڑپتی ہوئی آواز سنائی دے۔

”اے...... کہاں ہے تو...... یہ نمبر تو مجھے کچھ اور ہی بتا رہا ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں، آج بیٹھے بیٹھے تیری یاد آ گئی۔“ میں پیار بھرے لہجے میں کہا تو وہ ایک دم سے قہقہہ لگا کر ہنس دی پھر خمار آلود لہجے میں بولی۔

”کچھ دن مزید رہ جاتے نا تو بس ادھر ہی کے رہ جاتے۔“

”شاید ایسا ہی ہوتا۔“ میں اعتماد سے جھوٹ بول دیا پھر فوراً ہی بولا، ”چل تم ہو جاؤ فریش پھر کرتا ہوں بات۔“

”کوئی کام ہے تو بتا۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”بتاتا ہوں، فریش ہو جاؤ، لیکن کال میں ہی کروں گا، ابھی۔“ میں نے کہا تو کچھ دیر بعد کال کرنے کا کہا اور کال بند کر دی۔ میں بات ختم کر کے ابھی سوڈی اور جنونی بملا کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ شہباز آ گیا۔ اس نے کمرے کے دروازے پر آتے ہی تیزی سے کہا۔

”چل آ نکلتے ہیں۔“

میں نے یہ پوچھے بغیر کے کہاں جانا ہے اٹھ گیا۔ وہ پورچ میں پہنچا چکا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”اتنی تیزی، بات کیا ہے؟“

”وہ تایا نے جس بندے کا بتایا تھا نا، وہ رابطہ کرے گا، اس نے ابھی فون کیا ہے۔ وہ ملنا چاہ رہا ہے۔“ اس نے گیٹ سے گاڑی نکال کر سڑک پر لاتے ہوئے کہا۔ میں خاموش رہا تو وہ گاڑی بھگاتا چلا گیا۔

شہباز نمبر کے ساتھ ساتھ چلتا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ حضرت میاں میرؒ کے مزار کے پاس جا رکا۔ ہم گاڑی سے اترے اور مزار کے اندر چلے گئے۔ ہم فاتحہ خوانی کر کے صحن میں بیٹھ گئے۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک ملنگ بالکل ہمارے پاس یوں آ کر بیٹھا کہ اس کا رخ ایک طرف تھا لیکن اس کا چہرہ ایک رخ سے ہم دیکھ سکتے تھے۔ کوئی ہمیں دیکھتا بھی تو اسے یوں ہی لگتا کہ ہمارے قریب بیٹھا ملنگ اپنی موج میں ہے اور بڑبڑا رہا ہے۔ اچانک اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

”میری طرف مت دیکھو اور جو کام کی بات ہے وہ سنو۔“

”بول کیا کہتا ہے۔“ شہباز نے دھیمے سے کہا۔

”ملک سرفراز کا اب اپنے بیٹوں کے کاموں میں ذرا سا بھی عمل دخل نہیں رہا، وہ اپنے بیٹوں کے کاموں سے متنفر ہے کیونکہ وہ اب ملک دشمنی والے کام کر رہے ہیں۔ ان کا جو بھی دو نمبر دھندہ تھا وہ چل رہا تھا لیکن جب سے انہوں نے غیر ملکیوں کے ساتھ ڈیل کرنا شروع کر دی ہے، ملک سرفراز لندن چلا گیا ہے اور وہیں رہتا ہے۔“

”میں نے ملک سرفراز کی بائیوگرافی نہیں سنی۔“ شہباز نے تلخ ہوتے ہوئے کہا تو اس ملنگ نے ذرا بھی برا نہ مناتے ہوئے کہا۔

”اس لئے اس کے بیٹے یہاں پر مکمل کر اپنی من مانی کر رہے ہیں۔ تقریباً تین چار ماہ سے

وہ کوئی کھیل ایسا کھیل رہے ہیں جس کی ابھی پوری طرح سمجھ نہیں آئی لیکن یہ کنفرم ہے کہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ان کی پشت پناہی یہاں کا مشہور غنڈہ دودا پہلوان کر رہا ہے۔ان کے اپنے کچھ سیاسی لوگوں سے مراسم ہے۔سب سے زیادہ حبیب کھوکھر ان کے بھی کاموں کو اعلیٰ سطح پر تحفظ دے رہا ہے۔"

"یہ بتا ان پر ہاتھ کیسے ڈالیں؟" شہباز نے تحمل سے پوچھا۔

"دودا پہلوان، حبیب کھوکھر اور ملک سرفراز کے کسی بیٹے سے اگر پوچھ تاچھ کی گئی، بھلے ویسے ہی بات چیت ہو یا ان میں سے کسی کو بھی اٹھا کر کی گئی تو وہ الرٹ ہو جائیں گے اور جتنے بھی پنچھی وہاں پر ہوں گے سب اُڑ جائیں گے۔میرے خیال میں پوری طاقت کے ساتھ ایک دم سے دھاوا بولا جائے اور جو بھی پنچھی ہاتھ لگے اٹھا لیں۔" اس ملنگ نے کہا۔

"اندر کی خبر کیسے ملے؟" شہباز نے پوچھا۔

"جب سے ہمیں خبر ہوئی تھی، دو بندے وہاں ایڈجسٹ کر دیئے تھے۔ایک تو مستقل وہیں رہتا ہے،ایک آتا جاتا ہے۔تقریباً دو گھنٹے بعد وہ آپ سے رابطہ کر لیں گے۔پھر جیسی چاہیں معلومات لیتے رہیں۔"

"ملک سرفراز کے بیٹوں کی تازہ تصویریں ابھی بھیج دیں وہ، دیکھیں تو سہی کیسے ہیں۔"

"کچھ دیر بعد مل جائیں گی۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"ڈن ہو گیا۔" شہباز نے بتایا تو وہ ملنگ ایک دم سے اٹھا اور چلتا چلا گیا۔ہم چار پانچ منٹ وہیں بیٹھے رہے۔مجھے محسوس ہونے لگا کہ جیسے ورک کھلنے لگا ہے۔دھیرے دھیرے سب سامنے آ جائے گا۔بس ذرا صبر چاہیے تھا۔ہم وہاں سے اٹھے اور نکلتے چلے گئے۔

☆......☆......☆

دوپہر سے ذرا پہلے پوجا نے میسج کے ساتھ دو تصویریں بھیج دی تھیں۔ ان دونوں نے شہر کے فائیو سٹار ہوٹل میں ملنا تھا۔ وہاں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اسلحہ لے کر نہیں جاسکتے تھے۔ اگر لازمی ہی لے جانا ہوتا تو پھر اس میں کئی دوسرے لوگوں کو بھی شامل کرنا پڑتا تھا۔ ہم نے وہاں فیلڈنگ لگا دی ہوئی تھی۔ ہمیں وہاں پر اسی وقت پہنچنا تھا جب وہ دونوں آپس میں مل بیٹھتے۔ لمحہ بہ لمحہ وقت قریب آتا جارہا تھا۔ میں اور شہباز فائیو سٹار ہوٹل کے پاس پہنچ چکے تھے۔ شہباز بالکل آہستہ گاڑی چلا رہا تھا۔ بڑے اطمینان سے پارکنگ میں گاڑی لگانے کے بعد ہم ٹہلتے ہوئے داخلی دروازے کی جانب بڑھے۔ لاؤنج میں اتنا زیادہ رش نہیں تھا۔ ان میں چار پانچ ہمارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں بھی ایک طرف خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارا انداز ایسا ہی تھا جیسے ہم کسی گپ شپ کے لئے آئے ہوں۔

اس وقت ہم آرڈر دے چکے تھے جب مجھے پہلی اطلاع ملی کہ ان دو میں سے ایک آ گیا ہے۔ میں نے غیر محسوس انداز میں نگاہ داخلی دروازے کی طرف رکھی۔ تقریباً ایک منٹ بعد ایک لمبا تڑنگا نوجوان بریف کیس تھامے، سیاہ سوٹ پہنے اندر داخل ہوا۔ اس نے گہرے کلر کی ٹائی باندھی ہوئی تھی۔ وہ شکل ہی سے کوئی ایشیائی دکھائی دے رہا تھا، دوسرے لفظوں میں وہ پنجابی ہی لگ رہا تھا۔ وہ تیز قدم چلتا ہوا سیدھا استقبالیہ تک گیا۔ اس نے وہاں کھڑی ایک لڑکی سے کوئی بات کی تو وہ لڑکی مسکراتے ہوئے ہاں میں ہاں ملانے لگی، پھر اس نے فون کا رسیور اٹھا لیا۔ چند لمحے بات کرنے کے بعد اس نے قریب کھڑی ایک لڑکی کو اشارہ کیا، پھر انہیں ایک میز کی جانب بھیج دیا۔ لڑکی اسے ایک میز تک لے گئی، شاید وہ ریزرو میز تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی اپنے سیل فون کو ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی ساری توجہ اپنے سیل فون کی تھی۔ وہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ ساری دنیا سے بے خبر ہے۔ اگلے تین چار منٹ میں

ایک نوجوان تیزی سے چلتا ہوا وہاں تک آ گیا۔ اس کے آنے کا احساس کر کے بیٹھا ہوا نوجوان اٹھا، اس نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ دونوں بیٹھ گئے اور ان کے درمیان گفتگو شروع ہو گئی۔

"دیکھا تم نے کچھ؟" میں نے شہباز کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں، دونوں تصویروں والے، وہی ہیں۔" اس نے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا

"اوماما، کچھ اور بھی سمجھ آئی ہے کہ نہیں؟"

"مطلب کیا سمجھتا ہے؟" اس نے ایک دم سے پوچھا، پھر جلدی سے اپنا سیل فون نکال کر دیکھا۔ اس میں ملک کی ملک سرفراز کے بیٹوں کی بھیجی ہوئی تصویریں تھیں۔ اس نے تصویر دیکھ کر سر اٹھاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"اوئے یہ جو بعد میں آیا ہے، یہ ملک کا بیٹا ملک حامد ہی نا؟"

"یہی کہہ رہا ہوں، اب بتا کیا کرنا ہے؟"

"اگر تو فارم ہاؤس جاتا ہے، پھر تو خاموش رہنا ہی بہتر ہے اور اگر نہیں جاتا تو ان دونوں کو اٹھا لیتے ہیں، پھر دیکھی جائے گی۔" اس نے مشورہ دیا۔

"میرا خیال ہے پوجا کو آزما لیتے ہیں، وہ کیا کرتی ہے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر فارم ہاؤس؟" اس نے پوچھا۔

"اگر وہاں تھوڑی بہت بھی ہلچل ہوئی تو وہاں موجود دونوں لڑکے بتا دیں گے، انہیں الرٹ کر دو۔ پھر فارم ہاؤس بھی دیکھ لیں گے۔" میں نے کہا۔

"دیکھو یہاں چاروں طرف سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہوئے ہیں، انہیں اگر اٹھایا تو کام خراب بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے مجھے احساس دلایا۔

"اوکے، ان میں سے ایک کو ہی، اٹھانا تو ہے نا، اندر نہ سہی باہر سہی۔" میں نے حتمی انداز میں کہا اور انہیں چور نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

ہمارے سامنے کافی رکھ دی گئی تھی۔ ہم کافی پینے لگے۔ اسی دوران پوجا کا فون آ گیا۔ میں نے کال ریسیو کر کے کہا۔

"ہاں بولو۔"

"کیا وہ بندے تم نے دیکھ لئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، دیکھ لئے ہیں؟" میں نے کہہ دیا۔

"انہیں دیکھ لو، ان سے آگے بہت کچھ مل جائے گا۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور کال بند کر دی۔

ان دونوں کے آگے کھانا لگ گیا تھا۔ اب میرے پاس تھوڑا وقت تھا۔ میں نے شہباز کی طرف دیکھا، وہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ جبکہ میں اپنے طور پر فیصلہ کر چکا تھا۔ جو شے ہاتھ میں نہیں ہے، اس کی امید پر اس شے کو نہ چھوڑوں جو ہاتھ میں ہے۔ یہ احمقانہ فیصلہ ہوگا اگر میں ان دونوں کو چھوڑ دیتا۔ یہ بہت بڑا رسک تھا۔ میرے سامنے یہ جو دو بندے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ پوجا کا مجھ پر وار بھی ہو سکتا تھا یا پھر یہیں سے مقامی نیٹ ورک کا پتہ بھی مل سکتا تھا۔ میں یہ رسک لینے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے اپنا فیصلہ شہباز کو بتا دیا۔

وہ لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ اس دوران میں باہر والے بندے کے لئے پوری طرح فیلڈنگ لگا چکا تھا۔ اگر وہ آیا تھا تو اس نے واپس بھی جانا تھا۔ ملک حامد کہاں سے نمودار ہوا تھا یہ میں دیکھ نہیں پایا تھا۔ ملک حامد نے بل دیا تو میں نے شہباز سے کہا۔

"بولو، تم کسے دیکھو گے؟"

"میں باہر والے کو دیکھ لیتا ہوں، تم ملک حامد کو دیکھو۔" اس نے کہا تو میں نے تیزی سے کہا۔

"اپنے بندوں کو الرٹ کر دو، صورت حال کچھ بھی ہو سکتی ہے۔"

"اوکے۔" اس نے کہا اور سیل فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ دونوں اٹھ چکے تھے اور داخلی دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ہم دونوں بھی اٹھ گئے۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے ساتھ آئے لوگ بھی اٹھ چکے تھے۔

وہ دونوں پورچ میں جا کر یوں اجنبی بن گئے جیسے کبھی ملے بھی نہ ہوں۔ میری نگاہ ملک حامد پر تھی۔ وہ یوں کھڑا تھا جیسے کسی کا منتظر ہو۔ میں نے اپنے ایک ساتھی کو بلایا اور تیزی سے پارکنگ کی طرف بڑھتے ہوئے اپنی گاڑی تک جا پہنچا۔ ملک حامد کی گاڑی پورچ میں ڈرائیور لے آیا تھا۔ جس وقت وہ کار میں بیٹھا، اس وقت تک میرا ساتھی پارکنگ سے گاڑی نکال چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ شہباز اپنی گاڑی کا بندوبست کر لے گا۔ میں گاڑی میں بیٹھا تو میرا ساتھی گاڑی نکال کر گیٹ تک لے آیا۔ اس دوران میں نے اپنے ساتھی کو سمجھا دیا تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ ہم نے ابھی تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تھا کہ ملک حامد کی کار ہمارے قریب سے گزری۔ میرے ساتھی نے گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ میں نے ڈیش بورڈ میں پڑا ہوا پسٹل نکالا، فالتو میگزین بھی جیب میں ڈال لیا اور پوری طرح تیار ہو گیا۔

تھوڑے سے فاصلے پر یوٹرن تھا۔ ملک حامد والی کار سائیڈ پر ہوتے ہوئے آہستہ ہوئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے یوٹرن لینا ہے۔ یہی وقت تھا، میرے ساتھی نے گاڑی ایک دم سے تیز کی اور اس کے ساتھ لگا کر سائیڈ مار دی۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے فطری ہو۔ بس گاڑی آگے نکالنے کی کوشش میں سائیڈ لگ گئی تھی جس میں سراسر قصور ہمارا تھا۔ یہی ایک لمحہ ملک

حامد کی سمجھ داری اور بے وقوفی کا تھا۔ اگر وہ سمجھ دار ہوتا تو یہ دیکھے بغیر کہ کیا ہوا اسے نکل جانا چاہئے تھا۔ کون سا رکنے سے گاڑی ٹھیک ہو جاتی۔ مگر اس نے بے وقوفی کی، وہیں کار کو بریک لگا دیئے۔

اس کا ڈرائیور تیزی سے نکلا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کا میں نے فائدہ اٹھانا تھا، میں انتہائی تیزی کے ساتھ گاڑی میں سے نکلا اور سیدھا کار تک جا پہنچا۔ ملک حامد باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھولا اور باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت تک ڈرائیور پلٹ کر میرے پاس آ گیا تھا، جسے میرے ساتھی نے روک لیا۔ ملک حامد بھڑک چکا تھا۔ وہ جیسے ہی باہر آیا میں نے اس کے گردن پر ایک گھونسہ جڑ دیا، اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں ایسا کروں گا، وہ لڑکھڑایا تو میں نے اسے اٹھایا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھا، وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، اس لئے وہ چیخ رہا لیکن میں نے اسے گاڑی میں پچھلی نشست پر ڈالا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میرا ساتھی اس وقت تک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور کی طرف پسٹل سیدھا کیا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ ڈرائیور کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا، وہ واپس کار کی طرف لپکا تھا شاید ہتھیار لینے لیکن اس وقت تک میرا ساتھی گاڑی بھگا چکا تھا۔ میں نے ملک حامد کی گردن پر پسٹل رکھ کر اپنا سیل فون نکالا اور شہباز کو فون کر دیا۔ اس نے فوراً کال پک کر لی۔

”میں نے حامد کو اٹھا لیا ہے۔“ میں نے بتایا تو وہ تیزی سے بولا۔

”اوکے، بس میں بھی آیا۔“

میں نے فون بند کیا ہی تھا کہ ملک حامد نے میری طرف دیکھتے ہوئے غرا کر پوچھا۔

”تم نے یہ سارا ڈرامہ مجھے اغوا کرنے کے لئے کیا ہے؟“

"میں تو سمجھتا تھا تم خاصے احمق ہو، لیکن تھوڑی بہت سمجھ ہے تمہیں، نرے گدھے نہیں ہو۔" میں نے انتہائی حقارت سے کہا۔

"کون ہو تم؟" اس نے پوچھا۔

"تیرا باپ۔" میں نے پھر حقارت سے کہا تو اس نے غصے میں پاگل ہوتے ہوئے کہا۔

"تم نہیں جانتے ہو میں کون ہوں میں......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔

"خاموش۔"

میرے اس طرح کے سخت رویے سے وہ بالکل بھی نہیں گھبرایا۔ اس کی آنکھوں میں ذرا سا بھی خوف نہیں تھا۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں وحشت جھلکنے لگی تھی۔ بڑے سے بڑا جگادری بھی اپنے سامنے موت کو دیکھ کر ایک بار تو سہم جاتا تھا۔ کسی نہ کسی سمجھوتے پر اتر آتا ہے لیکن وہ کسی خوف کے بغیر اس تاک میں تھا کہ مجھ سے کوئی غلطی ہو۔ ایسے لوگ یا تو بے خوف اور دلیر ہوتے ہیں یا پھر نرے احمق۔ میرے خیال میں اسے گمان بھی نہیں تھا کہ لاہور کی سڑکوں پر کوئی اسے اٹھا بھی سکتا ہے، اس کا سامنا بھی کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ وہ اسی اعتماد میں مارا گیا تھا۔ میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ میرے لئے سڑک پر کوئی مصیبت پیدا کرتا، میں نے اسے بے ہوش کرنا مناسب سمجھا۔ میں نے پسٹل اس کی گردن سے ہٹایا ہی تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ میرے گریبان پر ڈالنے کی کوشش کی، میں نے گھما کر پسٹل کا دستہ اس کے مارا جو سر کی بجائے ماتھے پر لگا۔ خون کی پھوار تو نہیں نکلی لیکن وہاں اچھی خاصی رگڑ بن گئی۔ وہ دونوں ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھتا ہوا سیٹ پر ڈھلک گیا۔

میرا ساتھی ممکن حد تک تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تھا کہ شہباز کا فون آ گیا۔

"میں نے دوسرے کو اٹھا لیا ہے، تمہیں پتہ ہے نا کہاں جانا ہے؟"

"اوئے مجھے کیا پتہ، تم نے کون سا بتایا تھا۔" میں نے کہا۔

"اچھا فون دو اسے۔" اس نے کہا تو میں نے فون اپنے ساتھی کے کان سے لگا دیا۔ اس نے اپنی 'منزل' کو سمجھا اور فون ہٹانے کا اشارہ کیا۔ میں نے فون ہٹا لیا۔

مغل پورہ کے علاقے میں ایک حویلی نما گھر سیف ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ہم گاڑی سمیت اندر جا چکے تھے۔ حامد کافی حد تک ہوش میں آ چکا تھا۔ وہاں موجود لوگوں الرٹ تھے۔ وہ اسے گاڑی میں سے اٹھا کر ایک کمرے میں لے گئے۔ مجھے شہباز کا انتظار تھا۔ اسے فون کرنے پر پتہ چلا کہ وہ کہیں قریب ہے۔ میرے دماغ میں نجانے کیوں یہ آ رہا تھا کہ مجھے فارم ہاؤس پر جانا چاہئے۔ ان سے تو بعد میں بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ یہی سوچتے ہوئے میں کمرے میں گیا تو حامد کو ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ پھر انہوں نے پانی اس کے منہ پر پھینکا تو وہ ہوش میں آ گیا۔ میں کچھ دیر اس کے چہرے پر دیکھتا رہا، پھر اس کے قریب جا کر پوچھا۔

"وہ دوسرا شخص کون تھا؟"

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے حیرت سے پوچھا۔

"تم نے اس لئے مجھے اغوا کیا؟"

"میں پوچھ رہا ہوں وہ کون تھا اور کیا ڈیل ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا تو وہ نفرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"پہلے تم بتاؤ، تم کون ہو؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ تھوڑا اتھرا سا آدمی ہے۔ میں نے اس سے سوال کرنا ترک کر دیا، اس کے پاس کھڑے تین لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کی ذرا ٹون ڈھیلی کرو، اس دوران اگر یہ مر جاتا ہے تو کوئی فکر مت کرنا، وہ دوسرا آنے والا زیادہ اہم ہے۔"

یہ کہہ کر میں جب تک دیوار کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھا، ان تینوں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ ایک دم سے گالیاں بکنے لگا۔ اس پر ان تینوں میں غصہ اور شدت بڑھنے لگی، وہ پاگلوں کی طرح اسے پیٹنے لگے۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں وہ فرش پر گرتے ہوئے چیخ کر بولا۔

"پوچھو کیا پوچھتے ہو؟"

"نہیں ابھی اس کی ٹون مزید کم کرو، یہاں تک کہ خود بخود بولنے لگے۔"

"میں کہہ رہا ہوں پوچھو......" یہ کہتے ہوئے وہ گالیاں دینے لگا۔ میں خاموش تماشائی کی مانند وہاں بیٹھا دیکھتا رہا۔ اس کے کئی جگہوں سے خون نکل آیا تھا۔ وہ مار کھاتے ہوئے تڑپ رہا تھا، مچل رہا تھا لیکن میں خاموش بیٹھا تھا۔ وہ لحہ بہ لحہ ڈھیلا پڑتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔

اسی دوران شہباز آ گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اس شخص کو پکڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ کمرے میں آئے، شہباز کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"یہ مر گیا ہے؟"

یہ لفظ ایسے تھے جن کا شدید ترین اثر اس شخص پر ہوا۔ وہ ایک دم سے ہی بوکھلا گیا۔ میں شاید اس کے چہرے کے مزید تاثرات دیکھتا، کسی نے اسے دھکا دیا تو سیدھا فرش پر جا پڑا۔

تبھی میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

"جو سیدھی بات نہیں کرے گا، اسے تو مرنا ہے نا، تم تو جانتے ہو نا میں فضول وقت ضائع نہیں کرتا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" شہباز نے سہم جانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا تو فرش پر گرا ہوا شخص وہیں بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ کافی حد تک حواس باختہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

"کون ہو تم، اس سے کیوں ملے تھے؟"

"اگر نہیں بتاؤں گا، تو کیا کرو گے، مار دو گے نا، تو مار دو۔" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"ہاں ظاہر ہے، بتا دو گے تو وہ لوگ مار دیں گے، جنہوں نے تمہیں بھیجا ہے، نہیں بتاؤ گے تو ہم مار دیں گے۔"

"ہے تو ایسا ہی۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

"ہاں بس ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں نے وہاں موجود لوگوں سے کہا، "اسے بھی مرنے کا شوق ہے، اسے بھی لے جا کر مار دو۔"

میرے کہنے کی دیر تھی، وہاں موجود لوگوں نے اسے اٹھایا اور بری طرح گھسیٹتے ہوئے باہر لے جانے لگے۔ وہ شور مچاتا رہا کہ میں خود چلا جاؤں گا لیکن کسی نے نہ سنی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ حامد ہوش میں آ گیا۔ اس نے غور سے دیکھا تو سمجھ گیا کہ دوسرا بھی لے آئے ہیں۔ اسی لئے میری طرف دیکھ کر لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

”موت یا ڈیل...... دو حرفی بات ہے بس۔“ میں نے کہا۔

”کیا ضمانت ہے کہ تم مجھے جانے دو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”ضمانت یہی ہے کہ میں کہہ رہا ہوں۔ جانے دوں گا، جو پوچھو وہ بتا دو گے اگر، ورنہ یہی چلتا رہے گا، جلدی مرنے بھی نہیں دوں گا۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر وحشت ناک انداز میں بولا۔

”یہ کھیل نہ ہی کھیلو، مارے جاؤ گے۔“

”چپ کر کسی ایکٹر کی اولاد، بکو گے یا......“ یہ کہتے ہوئے میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ تینوں اسے پھر سے مارنے لگے تھے۔ اس کی چیخیں بلند ہونے لگیں تو ایک نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اچانک وہ ہاتھ کے اشاروں سے سمجھانے لگا کہ وہ بتاتا ہے۔ اس نے منہ پر سے ہاتھ ہٹا دیا تو وہ سسکتے ہوئے بولا۔

”یہ بھارت سے آیا ہے۔ مجھ سے بات کرنے کے لئے۔“

”کیسی بات؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ لڑکیاں ہیں بھارت کی، وہ اس وقت دوبئی میں ہیں۔ انہیں یہاں لا کر رکھنا ہے۔“ اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

”قانونی طریقے سے آئیں گی؟“

”ہاں نا۔“ اس نے کہا۔

”کیا کام لینا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے فارم ہاؤس پر رہیں گی۔ مختلف لوگوں سے دوستیاں ہوں گی، نوٹ بنائیں گی اور میرا فائدہ بھی ہوگا۔“ اس نے کہا۔

"بڑے عجیب قسم کے بھڑوے ہو یار، تمہیں پتہ ہے جو لڑکیاں یہاں آئیں گی، وہ ملک دشمنی بھی کریں گی۔ یہاں کے راز بھی باہر جا سکتے ہیں۔" میں نے پوچھا تو وہ شدید اکتاہٹ سے بولا۔

"سب سے پہلے تو انہیں ملک کا وفادار ہونا چاہئے جن کے پاس راز ہیں، وہ کیوں دیں گے راز، اگر وہی راز نہیں رکھ سکتے تو کیا ہو سکتا ہے۔ ایسے عیاش لوگوں کی ماں کو بیچ دیا جائے تو بھی وہ خاموش رہتے ہیں۔"

"میری معلومات کے مطابق، ڈیل یہ نہیں میرے بچے، وہ بتا جو ڈیل ہوئی ہے، اصل بات بکو......" میں نے سخت انداز میں کہا۔

"یہی ہے۔" اس نے کہا تو اٹھتے ہوئے بولا۔

"یہ ایسے نہیں مانے گا، اسے دو چار دن رکھ کر خوب سیوا کرو۔"

یہ کہتے ہوئے میں کمرے سے باہر آ گیا۔

وہ سامنے کمرے میں تھا اور وہاں سے اس کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں پر اسے فرش پر لٹایا ہوا تھا۔ اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ میرے اشارے پر انہوں نے چھوڑ دیا۔ میں اس کے پاس فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

"کہاں پر کارروائی کرنا تھی؟"

"کہیں بھی... جہاں ہجوم ہوتا......کوئی جلسہ......یا جلوس۔" اس نے کراہتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

"کسی پر بھی یا کوئی ٹارگٹ تھا؟"

”یہ اسی نے دیکھنا تھا...... ابھی تو...... صرف ڈیل ہوئی ہے...... آج اس نے...... حامی بھری ہے...... کل اسے...... رقم پہنچ...... جانی تھی۔“ اس نے بہت مشکل سے کہا تو میں نے تصدیق والے انداز میں پوچھا۔

”وقت اور مقام اسی نے طے کرنا تھا؟“

”بالکل......“ اس نے کہا اور چکرا کر فرش پر گر گیا تو میں نے تیزی سے کہا۔

”اسے پانی پلاؤ، اچھی جگہ پر رکھو، اسے کچھ کھانے کو دو۔“

وہ لوگ اسے وہاں سے اٹھا کر سہارا دے کر باہر لے جانے لگے۔ مجھے ایک دم ہی سے حامد پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ شہباز میرے نزدیک آ کر بولا۔

”اسے یہاں نہیں رکھنا، کہیں......“

”کہاں لے جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کسی بھی محفوظ مقام پر، یہاں پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہاں اس کے پیچھے کوئی آ جائے۔“ اس نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

”اچھا جو کرنا ہے کر، مجھے اس حامد کو تو تھوڑا ٹھیک کرنا ہے، ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔“ میں نے غصے میں کہا۔

”یہ طوطے کی طرح بولے گا تھوڑی تکنیک لگانی پڑے گی۔ یہ سنبھال لیں گے، آؤ ہم چلیں۔“ اس نے کہا۔

”ایسے کیسے چلے جائیں، اگلی بات......“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”شام تک ساری رپورٹ آ جائے گی، اب چلو جلدی۔“

”او یار اتنی جلدی کیوں کر رہے ہو......“ لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ چاچا عبدالمجید کی

کال میرے فون پر آ گئی۔ میں نے کال ریسیو کی تو وہ بولے۔

”ملک سرفراز کے بیٹے حامد کو اٹھایا ہے؟“

”ہاں، اٹھایا ہے۔“ میں نے کہا۔

”چل ٹھیک ہے۔ اچھا کیا، اب فوراً اس کے فارم ہاؤس پہنچو، وہاں پر جمو قبضہ کرلو......
باقی میں دیکھتا ہوں۔ وہاں بندے پہنچے والے ہوں گے۔“ چاچا عبدالمجید نے کہا اور کال بند
کر دی۔

”چل نکل شہباز۔“ میں تیزی سے بھاگتے ہوئے کہا۔

”اب بڑی تیزی آ گئی ہے۔“ اس نے پوچھا تو میں کال کے بارے میں بتایا وہ ایک دم
سے سنجیدہ ہو گیا۔ وہ بھی تیز ہو گیا۔ اس نے تقریباً بھاگتے ہوئے وہاں پر موجود ایک بندے
سے کہا۔

”ان دونوں کو حفاظت سے پہنچا دینا، میں آتا ہوں ابھی۔“

اگلے چند منٹ میں ہم گاڑی لے کر نکل رہے تھے۔

☆......☆......☆

فارم ہاؤس کے مین گیٹ پر بہت خرچ کیا ہوا لگتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی محل کا بیرونی
دروازہ ہو۔ جیسے ہی میں نے گیٹ کے سامنے پڑے بیریئر کے قریب گاڑی روکی، سامنے
کھڑے دو گارڈز حرکت میں آ گئے۔ وہ تن کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے ہاتھ اپنی گنوں پر تھے۔
ہماری گاڑی کے پیچھے مزید گاڑیاں آتی چلی گئیں، وہ تین گاڑیاں تھیں جو ہماری گاڑی کے
پیچھے رُک گئی تھیں۔ ان دونوں میں سے ایک گارڈ آگے بڑھا اور اس نے شہباز والی سائیڈ پر
قریب آ کر بولا۔

"جی صاحب۔"

"گیٹ کھولو۔" شہباز نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے کہا تو ایک گارڈ نے کہا۔

"پہلے یہاں آ کر اپنی شناخت کروائیں۔" اس نے کہا تو شہباز گاڑی سے اتر گیا۔ میں بھی تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔ ہم دونوں اس جگہ پر گئے جہاں شناخت کروانی تھی۔ وہاں چند بدمعاش ٹائپ غنڈے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ گاڑیاں دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنا اپنا اسلحہ ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ تبھی شہباز نے انتہائی سنجیدگی سے رعب دار لہجے میں پوچھا۔

"ہاں بھئی کس نے کرنی ہے شناخت؟"

"جی بتائیں کون ہیں آپ؟" ان میں سے ایک نے کہا جس نے سوٹ پہنا ہوا تھا اور ٹائی بھی لگائی ہوئی تھی۔

"مجھے یہاں کی تلاشی لینی ہے۔" شہباز نے انتہائی اعتماد سے کہا۔

"جی میں اپنے......" اس نے کہنا چاہا لیکن شہباز نے یہ لفظ نہیں دیا اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"میں نے یہ کہا ہے مجھے تلاشی لینی ہے؟"

ایک غنڈے نے جلدی سے اپنا سیل فون نکالا تو شہباز نے اس کے سیل فون پر ہاتھ ڈالتے ہوئے وہ سیل فون چھینتے ہوئے کہا۔ "کوئی کسی کو کال نہیں کرے گا، سب ایک طرف ہو جاؤ۔"

"اوئے کون ہے تو......" ان میں سے ایک نے کہا اور شہباز کا گریبان پکڑنے کے لئے آگے بڑھا تبھی میں آگے بڑھا اور ایک دم سے تھپڑ اس کے منہ پر مار دیا۔ ساتھ کھڑے

غنڈے آگے بڑھنے لگے تو میں نے اپنا پسٹل نکالا اور ایک دم سے فائر کرنا شروع کر دیئے۔ وہ ایک لمحے کے لئے بوکھلا گئے حالانکہ ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ فائر کرنے کے لئے اجازت اور حوصلہ چاہئے ہوتا ہے جو ان کے پاس نہیں تھا۔ پیچھے سے کچھ لوگ بھاگتے ہوئے آگئے تھے۔ انہوں نے کوئی بات کئے بغیر فرش پر کئی فائر کر دیئے۔ وہ سہم کر دیوار سے لگ گئے۔ تبھی میں نے کہا۔

"انہیں باندھ کر یہیں چھوڑ دو، کوئی بھی حرکت کرے تو گولی مار دو۔"

وہ وہاں پر مصروف ہو گئے، میں انتہائی تیزی سے واپس مڑا گاڑی تک پہنچا۔ وہ دو گارڈ کہیں بھی دکھائی نہیں دیئے۔ مجھے ان کا ڈر تھا کہیں وہ چھپ کر کوئی فائر نہ کر دیں۔ جیسے ہی میں گاڑی میں بیٹھا، ایک گارڈ نے دائیں طرف سے سر نکالا اور فائر کر دیا۔ لیکن اس وقت تک کئی فائر ہو گئے۔ پچھلی گاڑیوں میں بیٹھے لوگ چوکنا تھے۔ میں نے یہ نہیں دیکھا کہ اس گارڈ کے ساتھ کیا بنا، میں نے گاڑی بڑھا دی۔ گیٹ پار کر کے شہباز کو بٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔

جیسے ہی میں نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی باقی گاڑیاں بھی رک گئیں۔ انہیں ایک ادھیڑ عمر بلاور شاہ لیڈ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ بندے تھے، کچھ پہلے ہی دیواریں پھاند کر اندر داخل ہو چکے تھے۔ گاڑیوں سے نکلنے والے لوگ رہائشی عمارت کے ارد گرد پھیلنے لگے۔ میں نے اس بلاور شاہ کی طرف دیکھا تو وہ تیزی سے میرے قریب آ کر بولا۔

"اندر سنبھالیں، باہر ہم ہیں۔"

"کوئی بندہ باہر نہ جانے پائے۔" میں نے کہا تو شہباز اس وقت تک داخلی دروازے سے اندر لاؤنج میں جا چکا تھا۔ میں اس کے کور پر تھا، اچانک ایک طرف کے کمرے سے دو لوگ گنیں سیدھی کرتے ہوئے نکلے، ان کے فائر کرنے سے پہلے ہی میں نے فائر کر دیا۔ ایک

پیچھے ہٹ گیا تو دوسرا وہیں چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ میں نے ایک جست بھری اور وہاں تک جا پہنچا۔ میں دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ وہ باہر دیکھنے کے ذرا سا آگے بڑھا۔ جیسے ہی اور جتنا بھی مجھے دکھائی دیا، میں نے وہیں فائر کر دیا۔ گولی اس کی ران پر لگی تھی۔ وہ پیچھے تو ہٹا لیکن دوسرے قدم پر ڈھیر ہو گیا۔

ہم سب فائر کرتے ہوئے اندر کی جانب بڑھنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد باہر سے بھی فائر ہونے لگا۔ تبھی ہمارے ایک ساتھی نے راہداری میں کھڑے ہو کر زور سے اونچی آواز میں کہا۔

"جو بھی اندر ہے، اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر باہر آ جائے، کچھ نہیں کہا جائے گا، لیکن جو اندر رہا، یا کسی نے مزاحمت کی اسے فوراً گولی مار دی جائے گی۔"

اس کی آواز کی بازگشت لمحہ بھر رہی اور پھر کچھ دیر تک سناٹا رہا۔ اچانک ایک دروازہ کھلا اور ایک لڑکی اپنے سر پر ہاتھ رکھے باہر نکلی۔ وہ خوف زدہ سی آگے بڑھتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ وہ قریب آئے تو اسے دو لوگ باہر چھوڑ آئے۔ پھر دھیرے دھیرے کئی لوگ باہر نکلتے چلے آئے۔ ان سب کو باہر لان میں بٹھایا جاتا رہا۔ وہاں چند لوگ ان کی نگرانی پر اسلحہ لئے کھڑے تھے۔ دھیرے دھیرے وہاں کوئی پچیس کے قریب لوگ تھے، جن میں بارہ تیرہ لڑکیاں تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے میں اس فارم ہاؤس کو خالی کرا لیا گیا۔ ایک ایک کمرہ دیکھ لیا گیا۔ یہاں تک کہ چھت پر بھی لوگ دیکھ لئے گئے۔ مجھے یہ حیرت ہو رہی تھی کہ ان میں پوجا نہیں تھی۔ میں باہر لان تک گیا، ایک ایک لڑکی کو غور سے دیکھا۔ ان میں کوئی بھی پوجا جیسی نہیں تھی جس پر شک ہی کیا جا سکتا ہو۔ جب پوری طرح اس فارم کو چھان پھٹک کر دیکھ لیا گیا تو میں نے ان سب سے کہا۔

"دیکھو، اگر تمہارے ساتھ کا کوئی بندہ پیچھے چھپا ہوا ہے تو بتا دو، ورنہ وہ زندہ نہیں رہے گا۔"

میری بات کے جواب میں کوئی نہیں بولا۔ سبھی خوف زدہ سے میری طرف دیکھے چلے جا رہے تھے۔ میں انہی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ میرا اسپل فون بج اٹھا۔ میں نے اسکرین پر نگاہ ڈالی تو وہ پوجا کا فون تھا۔ میرے ہیلو کہتے ہی وہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے بولی۔

"بڑی جلدی پہنچ گئے ہو فارم ہاؤس۔"

"تم کہاں ہو؟" میں نے تیزی سے پوچھا تو وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"یار جب تمہیں ایک رستہ دے دیا ہے تو پھر میں تمہارے راستے میں کھڑی ہو کر انتظار تو نہیں کر سکتی، آم کھاؤ، پیڑ مت گنو۔"

"یہاں پر کوئی کام کا بندہ ہے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"بندہ نہیں ایک بندی ہے۔ اس سے بہت کچھ ملے گا۔" اس نے کہا تو میں ہنس دیا، پوجا بہت ہی خطرناک اور چالاک تھی۔ آگے جو کچھ بھی ہونا تھا، اس کا سارا الزام اسی لڑکی پر جاتا، تبھی میں نے پوچھا۔

"واہ پوجا واہ، اس لڑکی کو قربانی کا بکرا بنا کر خود غائب؟"

"بکرا نہیں بکری، سالی راکیش ورما کی طرف سے مجھ پر نگران تھی۔ اب یہ تم پر ہے، تم کتنی تیزی سے اس نیٹ ورک کو پکڑتے ہو۔"

"چل دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"بڑی معصوم لگتی ہے، مجھ سے بھی زیادہ معصوم، کہیں جھانسے میں مت آ جانا۔ اس کے اوپری ہونٹ پر دائیں جانب چھوٹا سا سیاہ تل ہے۔ گوری ہے گول چہرے والی۔ جو بتاتے مجھ سے تصدیق بھی کر لینا۔ جے رام جی کی۔" یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔

میں چند لمحے گم سم کھڑا رہا۔ پوجا کے اس فون نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس

کی رسائی نچلی سطح پر نہیں تھی، بلکہ وہ کوئی اونچی گیم کر رہی تھی۔ یہاں کا نیٹ ورک وہ خود تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے لئے اس نے اپنے لوگوں کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ یہاں فارم ہاؤس پر کچھ ہونے والا ہے، میں اگر نہ بھی آتا تو کوئی دوسرا ضرور آتا۔ چاچا عبدالمجید نے مجھے یہاں فارم ہاؤس پر آنے کا کہا تھا۔ اس کا مطلب بالکل یہی تھا کہ جہاں پر یہ فیصلہ ہوا تھا، اس بارے پوجا جانتی تھی۔

میرے لئے یہ بڑا لمحہ فکریہ تھا کہ وہ اپنی گیم میں بڑی دور تک رسائی رکھتی ہے۔ میں جو یہ سمجھتا تھا کہ وہ صرف میرے لئے یہاں آئی ہے اور اس نے مجھے ہی قتل کرنا تھا، یہ بہت معمولی بات رہ گئی تھی۔ اس نے جو کہا تھا کہ میں تین بار اس کے نشانے پر آیا تھا لیکن اس نے مجھے قتل نہیں کیا تو وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ سوچوں کا ایک سلسلہ دراز ہو گیا تھا۔ میں نے یہ سوچنا کسی اور وقت کے لئے رکھا اور سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں لاشعوری طور پر اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔ لیکن میری سوچ پر پوجا حاوی تھی۔ اسی لمحے میرے دماغ میں خیال آ گیا، میں بھی اب پوجا کے ساتھ کھیل ہی کھیلوں گا۔ میں سرسری انداز میں سب کو دیکھنے لگا۔ مجھے وہ لڑکی دکھائی دے گئی۔ میں نے جان بوجھ کر صرف نظر کیا۔ ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور نظر انداز کر دیا۔

"سب کلیئر ہو گیا۔" بلاور شاہ نے قریب آ کر بتایا تو میں نے شہباز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"چاچا کو بتا دو۔"

شہباز نے سر ہلایا اور اپنا فون نکال کر تھوڑا دور چلا گیا۔ اس نے ایک دو منٹ بات کی اور واپس آ کر بولا۔

"او کے ہو گیا، کہہ رہے ہیں آفس آ جائیں۔"

"اور یہ لوگ......؟" میں نے پوچھا تو وہ حیرت سے بولا۔

"یہ ہیں نا، یہ سب یہیں رہیں گے۔"

"نہیں مجھے تھوڑی پوچھ تاچھ کرنی ہے۔" میں نے کہا اور اندر کی طرف جانے لگا۔ شہباز چند منٹ وہیں کھڑا رہا پھر میرے پیچھے آ کر پوچھا۔

"خیر ہے بات کیا ہے؟"

"باہر بیٹھی لڑکیوں میں سے مجھے ایک لڑکی چاہئے لیکن سب کے سامنے نہیں، سب سے چھپا کر نکالنا ہے اسے۔" میں نے کہا تو وہ بے ساختہ بولا۔

"او ماما خیر ہے تجھے، سا وری بھابی کو پتہ......"

"اوئے بکواس بند کر او بے وسا وری کا کچھ لگتا۔" میں نے تلخی سے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کون ہے ان میں؟"

"اس نے میرون رنگ کی اسکرٹ اور سیاہ ٹائٹس پہنے ہوئے ہیں، گول چہرہ، گوری اور ہونٹ پر دائیں طرف تل ہے۔"

"کیا کرنا ہے اس کا؟" اس نے پوچھا۔

"اچار ڈالنا ہے۔" میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو وہ ایک دم سے ہنس دیا پھر بڑے سکون سے بولا۔

"ابھی پولیس آنے والی ہے، ان سب کو پکڑ کر لے جائے گی۔ اگر اس لڑکی کو خفیہ رکھنا ہے تو پولیس آنے سے پہلے کچھ کرنا ہوگا۔"

"تو کر و نا جا کر۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ وہ میری

طرف دیکھتا رہا، پھر باہر نکل گیا۔ میں شیشے میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ وہ لان میں چلا گیا۔ اسے وقت ہی نہیں مل سکا۔ انہی لمحات میں پولیس کی گاڑیاں وہاں آگئیں۔ ان میں سے کئی پولیس والے اترے، ان میں لیڈی پولیس بھی تھی۔ وہ سب کو ہانک کر گاڑیوں میں بٹھانے کے لئے کھڑے ہونے کا اشارہ کرنے لگے۔ وہاں ایک رش سا لگ گیا۔ شہباز اس رش میں گیا اور اسی لڑکی کو کھینچ کر پیچھے لے آیا۔ اس لڑکی نے حیرت سے شہباز کو دیکھا، پھر مطمئن سی ہوگئی۔ شہباز نے اس کے کان میں کچھ کہا اور پھر اسے اندر کی جانب دھکیل دیا۔ وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی اندر لاؤنج کی طرف آگئی تو میں نے اسے کہا۔

''ادھر کمرے میں جا کر بیٹھ جاؤ، دروازہ کھلا رکھنا، کوئی آئے تو دروازے کے پیچھے چھپ جانا۔''

اس نے غور سے میری بات سنی اور پھر مجھے حیرت سے دیکھتی ہوئی سامنے والے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد سناٹا چھا گیا۔ بلاور شاہ اور اس کے لوگ لان میں کھڑے تھے۔ وہیں ان کے پاس شہباز کھڑا تھا۔ وہ سب گئے تو شہباز آگیا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

''کہاں ہے وہ؟''

میں نے اندر کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ اندر گیا اور اسے باہر لے آیا۔ گاڑی باہر پورچ میں کھڑی تھی۔ اس نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جاتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے پیچھے کا دروازہ کھول دیا۔ شہباز اور وہ تیزی سے آئے اور پیچھے بیٹھ گئے۔ میں نے گاڑی بڑھا دی۔

☆......☆......☆

شام کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ میں اور شہباز اس لڑکی کے ساتھ اس جگہ پہنچ چکے تھے، جہاں پر حامد اور اس کے ملاقاتی کو رکھا ہوا تھا۔ وہ پوش علاقہ تھا اور سرِشام ہی سناٹا چھا گیا تھا۔ وہ بنگلہ

ابھی نیا تعمیر ہوا تھا۔ اس میں ابھی زیادہ سامان نہیں تھا۔ میں اوپری منزل کے ایک کمرے میں جا کر خوب نہایا، اچھی طرح فریش ہو کر جب میں کمرے میں آیا تو شہباز اس لڑکی کے ساتھ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔

”تم لوگ بیٹھو، میں ابھی آیا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لڑکی سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”پروین۔“ اس نے ہنکارا بھرنے والے انداز میں کہا تو میں ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تم اس بات کو سمجھ رہی ہو کہ میں ان سب میں سے فقط تمہیں ہی وہاں سے نکال کر کیوں لایا ہوں؟“

”پتہ نہیں کیوں آپ بتا دو۔“ اس نے بھاری پلکیں اٹھاتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی کیا سمجھتی ہو، کچھ تو ہوگا ذہن میں؟“ میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا تو وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے نخرے سے بولی۔

”وہی جس کے لیے سبھی فارم ہاؤس پر جاتے ہیں۔“

”بالکل بھی نہیں اور یہ سب ذہن سے نکال دو۔ میں جانتا ہوں تم کون ہو اور یہاں فارم ہاؤس پر کس لیے ہو۔ تمہیں واپس بھیجنا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ چونک گئی۔ اس نے غیر یقینی انداز میں میری طرف دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں بولی۔

”کیا جانتے ہیں آپ میرے بارے میں؟“

”دیکھو اگر تم ایسے ہی کرتی رہی تو سمجھو یہیں کہیں قتل ہو کر دفن ہو جاؤ گی، کسی نے ماتم سنسکار نہیں کرنا تیرا، کوئی نہیں چتا دے گا۔ میں بارہ برس سے یہاں پر ہوں اور واپس جانے کو ترس رہا ہوں۔“

”کہاں جانا ہے واپس؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے چھوڑو، اپنے بارے میں سوچو۔“ میں نے کہا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ ”اب تم میری حفاظت میں ہو لیکن زیادہ دیر نہیں رکھ سکوں گا آج رات یا کل دوپہر تک......“

”میں بھی نہیں آپ کیا کہہ رہے ہو؟“ اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا نا، میں تمہیں واپس پہنچا سکتا ہوں، اگر تم جانا چاہو تو۔“ میں نے کہا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا ایک لڑکا ٹرے لے آیا۔ اس میں شراب کی چھوٹی بوتل اور پینے پلانے کے ساتھ لوازمات رکھے ہوئے تھے۔ لڑکا وہ ٹرے رکھ کر واپس چلا گیا۔ وہ حیرت سے سب دیکھ رہی تھی۔ میں نے یوں اس کی طرف دیکھا کہ جیسے یہ سب معمول ہو۔

”پیو، مجھے احساس ہے اس وقت تمہیں طلب ہوگی۔“

”مجھے سگریٹ بھی منگوا دیں۔“ اس نے دھیمے سے فرمائش کی تو میں بولا۔

”منگوا دیتا ہوں۔ ابھی پیو۔ کھانا آتا ہے وہ کھاؤ سکون سے۔“ یہ کہہ کر میں اٹھا اور اپنا فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، ”یہ فون ہے، اگر تمہارا کوئی ہے تو اسے کال کرلو۔“

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی، پھر فون پکڑ لیا۔ میں کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ میرا فون نہیں تھا، وہ یہیں سے لیا گیا خاص فون تھا۔ اس کی کال ہی سے سب پتہ چل جانا تھا کہ وہ کیا کرتی ہے۔ اس سے کچھ نہ کچھ پتہ چل جانا تھا۔ دوسرے کمرے میں شہباز بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور آنکھ کے اشارے سے پوچھا، میں نے بھی اشارے سے اسے بتا دیا۔ ہم باہر آ گئے۔ اسی لڑکے سے سگریٹ کا پوچھا تو وہ اس کے پاس تھے۔ اسے اس لڑکی کو دے آنے کے لئے کہا، وہ دینے چلا گیا۔ واپسی پر اس نے بتایا کہ وہ پینے لگ گئی ہے۔ لڑکا کچن میں چلا گیا تو میں شہباز سے پوچھا۔

"وہ حامد نے یا اس کے ملاقاتی نے کچھ بتایا؟"

"نہیں، ابھی تک میں نے پوچھا نہیں، اس لڑکی کے چکر میں رہا۔ کرتے ہیں پتہ۔" اس نے اکتاہٹ سے کہا۔

"پتہ تو کر یار۔" میں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے پوچھا۔

"وہ فون دے آیا ہے لڑکی کو۔"

"ہاں دے آیا ہوں، ویسے یہ بتا اس فون میں کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں ہے نا، اس میں......" لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ میرا فون بج اٹھا۔ چاچا عبدالمجید کی کال تھی۔ میں نے شہباز کی بات پر توجہ نہیں دی اور کال رسیو کرلی۔ میرے ہیلو کے جواب میں انہوں نے پوچھا۔

"ہاں بھئی کیا اپ ڈیٹ ہیں؟"

میں نے انہیں اب تک کی ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ فارم ہاؤس اور جو کچھ پوچھا کے بارے میں تھا اور جو میں اس کے متعلق سوچ رہا تھا، وہ سب بتا کر پوچھا۔

"آپ کو کیسے پتہ تھا کہ ہمیں فارم ہاؤس جانا چاہیے؟"

میرا سوال سن کر وہ لمحہ بھر رُکے پھر بڑے تحمل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ابھی اسے چھوڑو، بیٹھ کر بات کریں گے۔"

”جی ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو وہ بولے۔

”اس وقت حامد کا بھائی زاہد ملک پوری طرح اس کوشش میں ہے کہ یہ معاملہ میڈیا پر بھی نہ آئے اور خاموشی سے حامد کو بازیاب بھی کرالے۔ وہ اپنے سارے ذرائع استعمال کر رہا ہے۔“

”کہاں پہ کوشش کر رہا ہے کون سے ذرائع ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”دودا پہلوان کے ذریعے پورے شہر میں تلاش کر رہا ہے، جہاں بھی شک پڑتا ہے، وہاں جا رہے ہیں، حبیب کھوکھر کے ذریعے سیاسی دباؤ بڑھا رہا ہے، تاکہ فورسز متحرک ہو جائیں۔ دھیان رکھنا زیر زمین بہت ہلچل ہے۔“

”میں خیال رکھوں گا۔“ میں نے فوراً کہا تو انہوں نے بتایا۔

”اس پر یہ دباؤ بھی ہے کہ ویرات کہاں گیا، کیا اسے بھی اغوا کر لیا گیا ہے یا وہ کہیں چھپ گیا ہے۔“

”ویرات وہی ہے نا جو حامد سے ملنے آیا تھا؟“ میں نے تصدیق کے لئے پوچھا تو وہ گمبھیر لہجے میں بولے۔

”ہاں وہی ہے، پتہ چل گیا ہے وہ کن کی طرف سے آیا تھا۔ میں تھوڑی دیر میں اس کی تفصیل دیتا ہوں، دونوں سے اچھی طرح پوچھ تاچھ کرنی ہے۔ اور ہاں وہ لڑکی...... اچھا کیا تم اس کے ساتھ پیار والا سلوک کر رہے ہو، صبح تک جو صورت حال ہوگی، اس کے بارے میں دیکھیں گے۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو انہوں نے کال ختم کر دی۔ میں نے فون جیب میں رکھتے ہوئے شہباز سے پوچھا۔

"یار وہ بکارا مستانی اور جیون رام کہاں ہیں، ان کا کوئی پتہ ہی نہیں؟"

"او ہاں یار...... کرتا ہوں پتہ، تم جاؤ اس لڑکی کو دیکھو، میں باقی سب دیکھتا ہوں۔" اس نے کہا اور اپنے فون میں مصروف ہو گیا۔ وہ لڑکا کچن سے کھانا لے کر اوپر چلا گیا تھا۔ میں بھی واپس کمرے میں آ گیا۔

وہ لڑکی بوتل آدھی سے بھی زیادہ خالی کر چکی تھی۔ شاید وہ اعصابی طور پہ انتشار کا شکار تھی۔ سگریٹ کے دھوئیں سے کمرہ بھرا ہوا تھا۔ وہ موج میں آ چکی تھی۔ اس نے فون ایک طرف رکھا ہوا تھا۔

"کر لی بات؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی کر لی۔" اس نے اطمینان سے کہا اور فون میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو میں نے فون پکڑ کر اپنے سرہانے کے نیچے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے بتاؤ کہیں جانا ہے یا......"

"نہیں کہیں نہیں جانا، کھانا کھا کر مجھے سونا ہے، اگر آپ......" اس نے مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ؟" میں نے پوچھا تو وہ اسی خمار آلود لہجے میں بولی۔

"اگر آپ نے میرے ساتھ وقت گزارنا ہے تو میں حاضر ہوں، آپ نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ کم از کم مارا تو نہیں مجھے۔"

"تم نہیں سمجھو گی، مجھے تم سے یا تمہارے جسم سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ بس تم بہت بڑے خطرے سے بچ گئی ہو۔ میں چاہتا ہوں اب تم کسی محفوظ مقام تک پہنچ جاؤ۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" میں نے کہا تو وہ ستے ہوئے چہرے سے میری طرف دیکھنے

ہوئے بولی۔

''میں نہیں جانتی، تم کون ہو۔ کیوں ایسا چاہتے ہو۔ بس...... جو کرنا ہے کر دو۔ میں اپنی زندگی سے بہت تنگ ہوں، بہت تنگ......'' وہ خمار آلود لہجے میں بولی اور ایک دم سے رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا، وہ کچھ دیر یونہی روتی رہی، پھر اپنی کلائی سے آنکھیں پونچھ کر ایک تگڑا سا پیگ بنایا اور پی گئی۔ میں خاموش رہا۔ کتنا ہی وقت بیت گیا۔ میں چپ چاپ لیٹا رہا، وہ پیتی رہی، یہاں تک کہ وہ کھانا کھا کر وہیں کرسی پر لیٹ کر سیدھی ہو گئی۔ وہ نشے میں تھی۔ میں نے اٹھ کر اس کا کاندھا ہلاتے ہوئے کہا۔

''جاؤ بیڈ پر جا کر سو جاؤ۔''

اس نے بہ مشکل آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا، وہ اٹھنے لگی پھر بیٹھ گئی، میں نے اسے اٹھایا اور لے جا کر بیڈ پر لٹا دیا۔ وہ کروٹ لے کر لیٹی اور سو گئی۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹے آنے لگے تھے۔ میں نے چند لمحے اسے دیکھا اور باہر نکل گیا۔ میں نے سرہانے کے نیچے پڑا فون اٹھا لیا تھا۔

فون سے کی گئی آخری کال اس نے ڈیلیٹ کر دی ہوئی تھی۔ اس کا سیدھا مطلب تھا کہ وہ مجھ پر اعتبار نہیں کر رہی تھی۔ میں نیچے پہنچا تو شہباز کمرے میں نہیں تھا۔ ایک طرف کونے میں لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے شہباز کے بارے میں پوچھتا اس نے خود ہی بتا دیا۔

''وہ صاحب کہہ گئے ہیں کہ جب آپ آئیں تو انہیں فون کر لیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے فون نکال کر اس کے نمبر پش کر دیئے۔ چند بیل جانے کے بعد اس نے کال رسیو کرتے ہوئے کہا۔

”میں باہر لان میں ہوں، یہیں آجا۔“

میں باہر نکل گیا، وہ لان میں بیٹھا ہوا تھا۔اس کے سامنے کچھ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، میں ان میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”یہاں کیوں بیٹھے ہو؟“

”سوچ رہا ہوں۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”او ماما یہ بتا کیا سوچ رہا ہے؟“ میں نے اکتاہٹ سے کہا تو وہ ایک دم سے قہقہہ لگا کر شرارت سے بولا۔

”یہ جو اوپر لڑکی پڑی ہوئی ہے نا، اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”یار بتا کیا سوچ رہا ہے۔“ میں نے چڑتے کہا۔

”اس لڑکی نے فون کیا ہے نا لیکن وہ نمبر اس نے ڈلیٹ بھی کر دیا ہوگا، اب میں تجھے بتاؤں، اس فون سے کوئی بات کرکے فون سے نمبر ڈلیٹ کر دے، اسے توڑ دے ضائع کر دے لیکن اس سے کی ہوئی بات کسی خاص جگہ پر ریکارڈ ہو جاتی ہے نمبرز سمیت۔ لو سنو اس نے کیا بات کی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے فون سے کال چلا دی۔

”ہیلو، ہادی میں شرما بات کر رہی ہوں۔“ لڑکی کی دھیمی سی آواز ابھری۔

”او ہاں، یہ نمبر؟“ ایک کھنکھری ہوئی مردانہ آواز میں پوچھا گیا۔

”کسی کے فون سے کر رہی ہوں۔ تمہیں شاید پتہ نہیں ہمارے ساتھ کیا کچھ ہو گیا ہے۔“ لڑکی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”کیا ہوا۔“ اسی کھنکھری ہوئی آواز میں پوچھا گیا۔

”ہم پر چھاپہ پڑ گیا ہے، ایک بندہ مجھے وہاں سے نکال کر لایا ہے، وہ کہہ تو یہ رہا ہے کہ

ہمارا آدمی ہے لیکن......" لڑکی نے کہنا چاہا تو اس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا

"ذرا بھی یقین نہیں کرنا۔"

"ہاں ہاں، اس نے مجھے آفر کی ہے جہاں چاہو، تمہیں وہاں چھوڑ دوں، کہو تو پار بھیج دیتا ہوں۔ اب بولو کیا کروں؟" لڑکی نے پوچھا۔

"اسے کہو، مجھے لاہور میں کسی بھی جگہ چھوڑ دو، میں تمہیں لے لوں گا۔ میرا نمبر تو یاد ہے نا تمہیں۔" مرد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ تو یاد ہے۔" اس نے اعتماد سے کہا تو وہ بولا۔

"بس کہیں سے فون کر لینا۔ میں آج ہی پہنچ رہا ہوں لاہور۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل دن میں کرتی ہوں فون اگر اس نے اپنی کہی ہوئی بات پر مجھے چھوڑ دیا۔" لڑکی نے کہا۔

"کوشش کرو کہ کل آ جاؤ۔" مرد نے کہا۔

"گڈ بائے۔" لڑکی نے کہا۔

"گڈ بائے۔" مرد بولا۔

کال ختم ہونے پر شہباز نے فون واپس جیب میں رکھا اور بولا۔

"یہ نمبر یہیں پاکستان سے قصور سے آگے کسی علاقے میں ہے۔"

"مطلب اس نے اپنے دیس فون نہیں کیا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے۔ یہیں اپنے نیٹ ورک میں فون کیا۔" اس نے کہا۔

"چلو یہ اچھا ہے۔ اب کیا کرنا ہے اس کا؟" میں نے پوچھا۔

"صبح جہاں کہے گی چھوڑ دیں گے۔ جس طرح ایکارا بھسنانی اور جیون رام کو چھوڑا ہے۔"

اس نے کہا تو میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اوہ......اسی لئے اسے شراب پلائی تھی؟''

''ہاں نا، وہ میرے ماموں کی شادی پر نہیں آئی جو اس کی دعوت کروں، ابھی کچھ دیر میں ڈاکٹر آ جاتا ہے۔'' شہباز نے کہا اور اپنے فون پر کسی کے نمبر پش کرتے ہوئے کان سے لگا لیا۔ پھر کسی سے ڈاکٹر کے بارے میں پوچھا۔ وہ کال ختم کر کے اس نے پکار احسن ثانی اور جیون رام کے بارے میں پوچھا۔ وہ کچھ دیر تک سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔ پھر کال بند کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا۔

''جس لوکیشن پر اس لڑکی نے فون کی ہے نا۔ اسی لوکیشن پر یہ دونوں بھی موجود ہیں۔''

''اوخیر......'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

''یہ پوجا کا بھی پتہ کرتا ہوں یہ کہاں ہے۔'' اس نے کہا اور پھر کال ملا کر باتیں کرنے لگا۔ چند منٹ بعد کال بند کی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا، ''نہیں وہ وہاں نہیں ہے۔ اس کی لوکیشن لاہور ہی کی آ رہی ہے۔''

''اچھا تم ڈاکٹر کا انتظار کرو میں ذرا حامد کی طرف......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

''چھوڑو، اب ان سے پوچھ تاچھ کی ضرورت نہیں رہی۔ اب بات اوپر کے لوگوں میں ہو رہی ہے۔ یہی چاہیے تھا۔''

''اوکے، میں ذرا کمر سیدھی کر لوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنے لئے مخصوص کمرے میں جا پہنچا۔ اگر شہباز کو ضرورت ہوتی تو وہ مجھے بلا لیتا۔

☆......☆......☆

میری جب آنکھ کھلی تو کھڑکی پر نگاہ پڑی۔ باہر روشن دن چمک رہا تھا۔ مجھے شہباز پر بہت پیار آیا۔ اس نے مجھے آرام کرنے دیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں فریش ہو کر باہر نکلا تو بنگلہ دن کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ مجھے لگا میں کہیں اجنبی بنگلے میں آ گیا ہوں۔ میں نے اوپر سے دیکھا تو مجھے وہی لان دکھائی دیا جہاں پر ہم رات بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسیاں وہیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں چلتا ہوا اس پروین یا پاویمی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے کروٹ بدل کر مجھے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"کیسی گزری رات؟" میں نے پوچھا۔

"بہت اچھی، میری توقع سے بالکل ہٹ کر۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"توقع کیا تھی۔" میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"وہی جو ایک لڑکی کسی اجنبی ماحول میں کر سکتی ہے جبکہ اسے پکڑ کر لایا گیا ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب کیا سوچا تم نے؟ کہیں لاہور میں جانا ہے یا پار بھجوانے کا بندوبست کروں؟" میں نے جان بوجھ کر ہولے سے پوچھا۔

"آپ یہ مجھے کیوں کہہ رہے ہیں کہ میں نے پار جانا ہے؟" اس نے ایک دم سے پوچھا تو میں نے کافی حد تک سختی سے کہا۔

"کیونکہ فارم ہاؤس پر حملے سے پہلے مجھے بتایا گیا تھا کہ تم وہاں ہو۔ میں نے کہنا تھا کہہ دیا، اب اپنا فیصلہ سناؤ، مجھے یہاں سے جانا بھی ہے۔"

میرے یوں کہنے پر اس نے ایک دم سے چونک کر میری طرف دیکھا اور لمحہ بھر خاموش

رہنے کے بعد بولی۔

"مجھے یہیں لاہور ہی میں چھوڑ دیا جائے۔"

"او کے، تیار ہو جاؤ، پانچ منٹ بعد یہاں سے نکلنا ہوگا۔" میں نے ایک دم سے کہا تو وہ بیڈ سے اٹھ گئی۔ میں نے کمرے سے باہر آ کر شہباز کو فون کیا۔ وہ اسی بنگلے کے ایک کمرے میں تھا۔ میں جب نیچے پہنچا تو راہداری میں کھڑا امیر انتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"شہر میں تو بہت ہلچل مچی ہوئی ہے۔"

"کس نے مچائی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وودا پہلوان نے رات کئی جگہوں پر جا کر لوگوں کی ٹھکائی کی، دو ناکوں پر پولیس سے جھڑپ ہوئی ہے، تین چار بیوروکریٹس کو دھمکیاں دے دی گئی ہیں، حبیب کھوکھر سیاسی لوگوں کے ساتھ اعلیٰ افسران کے ہاں بیٹھا ہوا ہے۔ ملک زاہد پاگلوں کی طرح اپنے بھائی کو تلاش کر رہا ہے، کئی جگہ فائرنگ کر چکا ہے۔"

"تم یہ جا کا سناؤ، کہاں ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کل سے ایک ہی جگہ پر ہے، یہیں گلبرگ میں۔ اب پتہ نہیں وہ وہیں ہے یا فون رکھ کر ادھر اُدھر ہے۔" اس نے بتایا۔

"اچھا چل، اس لڑکی کو یہاں سے بھیج پھر ہم بھی نکلیں۔"

"اوماما تو نے کہاں نکلنا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یار ہم بھی اپنا حصہ ڈالیں، وودا پہلوان کو دیکھیں، یا حبیب کھوکھر کو۔" میں نے کہا تو وہ ایک دم سے بولا۔

"ابھی تھوڑا صبر کر، چاچے نے آنا ہے، پھر جو مرضی کرنا۔"

”او کے، چل اس لڑکی کو بھیج۔“ میں نے کہا تو وہ فون پر کسی سے کہنے لگا۔

ہم وہیں کھڑے شہر کے ماحول بارے باتیں کر رہے تھے کہ وہ لڑکی ایک نوجوان کے ساتھ وہیں آ گئی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اس نوجوان کے ساتھ نکلتی چلی گئی۔ ہمیں چاچا کا انتظار تھا۔ اس کے آنے تک میں نے چاہا کہ ایک بار ملک حامد کو دیکھ لو، میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی اکڑ ختم ہوئی ہے یا نہیں۔ میں اس بارے شہباز سے کہتا ہی چاہتا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ وہ چاچا کی کال تھی، میں نے کال رسیو کر کے ہیلو کہا تو وہ بولے۔

”او یار میں نے آنا تھا لیکن اب وہاں نہیں آ سکوں گا، تم شہباز کو لے کر آفس آ جاؤ۔“

”جی ٹھیک میں ابھی نکلتا ہوں۔“

”ہاں آرام سے آ جاؤ۔“ انہوں نے کہا تو میں نے شہباز کو بتایا، وہ میرے ساتھ ہی چل دیا۔ جیسے ہی اس نے گاڑی مین روڈ پر ڈالی تو میں نے کہا۔

”یار شہباز، یہ جو چوہے بلی کا کھیل ہوتا ہے نا، مجھے یہ اچھا نہیں لگتا، سیدھے بندہ آر یا پار کرے۔“

”میں کہتا ہوں اسی میں مزہ ہے، سیانے اسی کو حکمت عملی کہتے ہیں، چاچا اگر آج تک موجود ہے اور شہر پر حکمرانی کر رہا ہے تو یہی وجہ ہے۔ سیاست دان ہو یا کوئی لیڈر وہی کامیاب ہوتا ہے جو لوگوں کی خوبیوں اور خامیوں کو استعمال کرنا چاہتا ہو۔ اب یہ خوبیاں اور خامیاں استعمال کیسے کرنی ہیں، ظاہر ہے اس کے لئے ایک ماحول چاہئے ہوتا ہے۔“ اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بات پھر گھوم کر وہیں آ جاتی ہے، قاعدہ اور طاقت۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

”ہے تو یہی بات...... خیر چھوڑ، بھابھی سے کہہ اچھا سا ناشتہ تو بنا دے۔“

”اچھا۔“ میں نے کہا اور اپنا سیل فون اٹھا لیا۔

گھر سے ناشتہ کر کے، کپڑے بدل کر جب ہم آفس پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ چاچا نہیں تھے۔ میں اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر یونہی سوچنے لگا۔ شہباز سے جواب تک معلومات ملی تھیں اس کے مطابق پروین یا بادیکی اس وقت قصور کے پاس پہنچ چکی تھی۔ لڑکوں نے اس گاؤں کی نشاندہی کر لی تھی جہاں پر اس نے رات بات کی تھی۔ اس وقت بکا اور جیون رام وہیں پر موجود تھے۔ پوجا کی لوکیشن اب بھی وہی گلبرگ والی تھی۔ اب یہ اتفاق تھا، کوئی سوچا سمجھا پلان یا کسی نئی کہانی کی شروعات تھی، میں اس وقت کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ مجھے یہ سب ہضم نہیں ہو رہا تھا اور میں سوچ سوچ کر خود کو پاگل بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ان لوگوں نے ڈی ٹریک کر دیا تھا۔ جس سے کچھ بھی ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں انہی خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ چاچا سعید الجید آ گئے۔ وہ آ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”ہاں بھئی جوان، کس خیال میں گم ہے؟“

ان کے یوں کہنے پر میں نے پوری سچائی سے ہر بات بتا دی۔ انہوں نے کمال تحمل سے میری ایک ایک بات سنی اور پھر اسی تحمل سے بولے۔

”دیکھ علی، میدان جنگ میں لڑنے والا اور میدان جنگ میں لڑوانے والا دونوں ہی اہم ہیں۔ میں مانتا ہوں تم میں بہت حوصلہ ہے، لڑنے کی قوت ہے، لیکن ہمارا دشمن بڑا چالباز ہے۔“

”میں مانتا ہوں چاچا لیکن-----“ میں نے کہنا چاہا تو وہ بولے۔

”ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمیں دشمن بہت کمینہ اور گھٹیا ملا ہے۔ جس کے دشمنی کا کوئی اصول نہیں ہے۔ اس کی چال میں وہی کمینگی، گھٹیا پن اور سازش ہے۔ وہ سامنے آ کر وار کرنے کی

ہمت نہیں رکھتا اور سب سے اہم بات، وہ چھپ میں لا کر چال چلتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا، سانپ تو ہوتا ہی ڈسنے کے لئے ہے، اس کی آنکھیں نیلی ہوں یا کالی، رنگین سانپ ہو یا جیسا بھی۔ لیکن اس کا پھن طاقت ہی سے کچلا جاتا ہے۔" میں نے شدت جذبات سے کہا تو چاچا مسکرا دیئے۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولے۔

"اب دیکھو تو تمہاری پوجا نے کس قدر کھیل کھیلا ہے۔"

"کیسا کھیل؟" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"اب میں سمجھاتا ہوں تمہیں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکے اور پھر کہتے چلے گئے، "وہ روہی میں تمہارا کچھ نہ بگاڑ پائی تو یہاں آ گئی۔ یہ سچ ہے کہ وہ اس وقت اپنی کسی گیم میں ہے۔ وہ یہاں کے نیٹ ورک میں اپنا ایک الگ گروپ بنا رہی ہے اور جو پسند نہیں ہیں، انہیں ختم کروا رہی ہے۔ یہ اتفاق ہے یا قدرت کی مدد کی تم نے بکا کو، جیون رام کو قتل نہیں کیا وہ آج ہمارے کام آ رہے ہیں۔ بھلے اس بات کا انہیں بھی نہیں پتہ، وہ قصور کے علاقے میں جمع ہو رہے ہیں، وہاں اب تک پانچ سے چھ لوگ موجود ہیں، جس کا پوجا کو نہیں پتہ۔"

"کیا راکیش ورما کو اس کا علم نہیں ہے کہ پوجا......" میں نے کہنا چاہا تو وہ بولے۔

"یہی تو بات ہے۔ اسے دو ہفتے پہلے راکیش ورما ہی سے ٹاسک ملا ہے کہ وہ یہاں کے لوگوں کو الجھا کر ایک نئی ہلچل پیدا کرے، جس کی آڑ میں وہ یہاں پر کچھ قتل کرنا چاہتے ہیں اور ممکن ہے، بم دھماکے بھی ہوں۔ پوجا اس آڑ میں اپنی گیم کھیل رہی ہے۔ بظاہر وہ راکیش ورما کا ہی کام کر رہی ہے۔"

"آپ اتنے وثوق سے یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ پوجا اپنی گیم کر رہی ہے؟" میں نے پوچھا تو وہ تحمل سے سمجھاتے ہوئے بولے۔

”وہ اسی شہر میں ایک ایسا گروپ بنانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ جو صرف اسی کے لئے کام کرنے پر بالکل تیار ہے۔ اب اس میں تیرے جیسا ایک بیٹا بھی موجود ہے۔ جو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اسے پوجا کے بارے میں بالکل علم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے ہے۔ جب اس نے مجھ سے ڈسکس کیا تو بات سامنے آگئی۔ اب پوجا یہ چاہتی ہے کہ ملک حامد وغیرہ منظر سے غائب ہو جائیں اور ان کی جگہ اس کا گروپ سب کچھ کرے۔ اب تک ملنے والی معلومات پر یہ سارا منظر واضح ہو گیا ہے۔“

”اب ہمیں کرنا کیا ہے وہ بتائیں۔“ میں نے دبے دبے غصے میں کہا۔

”ہاں یہ بات ......“ انہوں نے کہا اور پھر میری طرف غور سے دیکھنے کے بعد بولے،” یہاں پر نیٹ ورک بنتے رہیں گے، ختم ہوتے رہیں گے، کوئی فیصلہ ہو جانے تک یہ سلسلہ رکنے والا نہیں۔ ابھی پوجا جن لوگوں کو ختم کر رہی ہے، کرنے دو۔ بلکہ تم اس کا ساتھ دے کر وہ نیٹ ورک جلدی ختم کر دو۔ یہ ایک دو دن بہت اہم ہیں۔“

”ڈن ہو گیا۔“ میں نے ایک دم سے کہا تو پاپا کی آنکھیں چمک گئیں۔ کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ اس کا یقین چاچا عبدالمجید کو بھی تھا۔ انہوں نے مزید کوئی بات نہیں کی اور اٹھ کر چل دیئے۔

اصل میں ہوتا کچھ یوں ہے کہ ہمارے ہاں ہی کے لالچی، بدطینت اور خبیث لوگ، جنہیں اپنے فائدے اور طاقت کے علاوہ کچھ نہیں چاہئے ہوتا وہ سوچے سمجھے بنا، صرف اپنے فائدے کے لئے دشمن کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ ٹشو پیپر کی مانند استعمال کئے جا رہے ہیں۔ اب جیسے ملک زاہد اور ملک حامد کو تو پتہ تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں، انہیں فقط فائدے اور طاقت سے غرض تھی۔ اسی زور پر وہ اپنا کالا دھندہ چلائے جا رہے

تھے۔ دودا پہلوان اور حبیب کھوکھر جیسے لوگ انہیں بچانا چاہ رہے تھے، اصل میں ایسے لوگ ہی وطن دشمن ہیں۔

"کون سا مسئلہ حل نہیں ہو رہا تمہارا جو ٹینشن بنے ہوئے ہو؟" شہباز نے کمرے میں آ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا تو میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"مجھے یہ بتا، پہلے دودے پہلوان کا کچھ کریں یا حبیب کھوکھر کا؟"

"جو بھی ہتھے چڑھ جائے۔" اس نے بے ساختہ کہا تو میں نے اٹھتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔

"چل پھر، نکلتے ہیں۔"

ہم دونوں آفس سے نکل پڑے۔ شہباز نے اپنے نیٹ ورک میں کسی سے بات کرتے ہوئے کہا۔

"اس وقت دیکھو، یہ دودا پہلوان کہاں پر ہے یا پھر حبیب کھوکھر کا پتہ کرنا ہے۔ لیکن فوراً کرو یہ۔"

ہم دونوں فوراً چل کر نکل آئے۔ ہماری کوئی منزل نہیں تھی۔ ضرورت کے مطابق اسلحہ گاڑی میں موجود تھا۔ گاڑی میں چلا رہا تھا لیکن اپنے طور پر خاموش تھا اور وہ اپنے سیل فون میں مگن تھا۔ شہباز نے کوئی بات نہیں کی حالانکہ وہ ایسے وقت میں خوب چہکا کرتا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ جس مشن پر ہم نکلے ہیں وہ کوئی معمولی نہیں ہے۔

میں نہر کے ساتھ روڈ پر آ گیا تھا اور میرا رخ پنجاب یونیورسٹی کی طرف تھا جو کم از کم دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ ابھی ہمارا مقصد صرف آوارہ گردی تھا، جب تک ان لوگوں کے بارے میں ہمیں معلوم نہ ہو جاتا۔ یونیورسٹی پل قریب آ گیا تھا۔ شیخ زید ہسپتال روڈ سے میں نے پیٹرول لینے کے لئے گاڑی ادھر موڑ لی۔ اس وقت فلنگ اسٹیشن پر پیٹرول بھرا جا رہا تھا، جب اچانک

شہباز کی آواز ابھری۔

"اوئے، دودا پہلوان اس وقت ملتان روڈ پر ہے، اپنے پورے پروٹوکول کے ساتھ، وہ سبزہ زار میں کہیں جا رہا ہے۔"

"چل پھر، وہیں فیلڈنگ لگا دیتے ہیں۔" میں نے ایک دم سے کہا اور پیٹرول بھرا کر گاڑی بھگا دی۔

جس وقت ہم مین سروس روڈ پر پہنچے اس وقت تک ہمارے کچھ لوگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ دودا پہلوان اس وقت ایک گھر میں موجود تھا، جہاں کچھ لوگ جمع تھے۔ ہمیں لمحہ بہ لمحہ رپورٹ مل رہی تھی۔ جیسے ہی ہم انشورنس کمپنی کے آفس کے ساتھ ہی بائیں جانب مڑے، ہمیں پتہ چلا کہ وہ باہر نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

ہمارا فاصلہ یہی کوئی ایک کلومیٹر کا تھا۔ وہاں صورت حال یہ تھی کہ گلی تنگ تھی، جس کی وجہ سے گاڑی گلی میں نہیں جا سکتی تھی۔ ان لوگوں کی گاڑیاں بھی باہر ہی گلی میں کھڑی تھیں۔ جیسے ہی ہم گلی کی نکڑ پر پہنچے تو گلی کے باہر ہی گاڑی روک دی۔ اس چھوٹی گلی میں ایک گھر کے سامنے پانچ سات لوگ کھڑے تھے۔ میں اور شہباز گلی میں ایک طرف سے آئے اور دوسری طرف سے ہمارے تین لوگ آ گئے۔ میں نے دودا پہلوان دیکھا ہوا نہیں تھا لیکن اس کی تصویر دیکھی ہوئی تھی۔ ہم ابھی اس گھر کے گیٹ تک نہیں پہنچے تھے کہ پہلے لمبے بالوں والا ایک نوجوان گن مین باہر آیا، اس کے پیچھے گیم شیم دودا پہلوان باہر آ گیا۔ اس کے پیچھے مزید ایک گن مین نکلا۔ ہمارا اور ان کا فاصلہ یہی کوئی دس قدم کا رہا ہوگا۔ ان دونوں گن بردار نوجوانوں کے گن پکڑنے کے انداز پر مجھے دودا پہلوان پر ترس آنے لگا۔ انہوں نے صرف دکھاوے اور دہشت بنانے کے لیے گنیں اسٹائل میں پکڑی ہوئی تھیں۔ جب تک وہ گن سیدھی کرتے میں

اپنا کام کر سکتا تھا۔ چونکہ دودا پہلوان ایک دہشت کا نام تھا اس لئے کوئی اس کا سامنے کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ یہی مان اسے لاپرواہ کر رہا تھا۔

دودا پہلوان آگے تھا اور دونوں گن بردار اس کے دائیں بائیں تھے۔ ان کے پیچھے بھی کوئی دس لوگ تو ہوں گے۔ ہمارا اور ان کا فاصلہ یہی کوئی پانچ قدم کا رہ گیا ہوگا، اسی لئے میں نے اپنے نیفے کے دونوں طرف ہاتھ ڈالا اور پسٹل نکال کر گن برداروں کا نشانہ لیا، بالکل میرے ساتھ شہباز نے بھی انہی کو نشانہ بنایا تھا۔ وہ دونوں سانس بھی نہ لے سکے اور گلی کے فرش پر گر کر تڑپنے لگے تھے۔ ہماری فائرنگ کے ساتھ لوگ لاشعوری طور پر پیچھے کی جانب مڑے تو پیچھے سے ہوائی فائر ہو گیا، سبھی سہم کر کھڑے ہو گئے۔ دودا پہلوان ہونقوں کی مانند مجھے دیکھنے لگا تھا۔ تبھی میں نے دھاڑتے ہوئے زور سے کہا۔

”کوئی نہ ہلے...... ہمیں صرف دودے سے مطلب ہے۔“

”او لک...... کون...... ہو تم......؟“ اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”رات سے تم نے کتنے لوگوں کو تنگ کیا ہے، صرف ملک زاہد کے لئے، ملک کی اور تیری آج سے بدمعاشی بند، تیرا کوئی سامنے آیا تو اس کا بھی یہی حال ہوگا، لے فیر......“ یہ کہتے ہوئے میں نے فائر کر دیا، وہ دودے پہلوان کے سینے میں لگا، شہباز نے بھی تین چار فائر کر دیئے۔ وہ وہیں گلی میں گر کر تڑپنے لگا، میں شہباز کے کور پر ہو گیا، پیچھے کی طرف آئے لوگوں کو میں نے جانے کا اشارہ کیا اور واپس پلٹ گیا۔ میں کچھ کہے بنا بھی دودے کو مار سکتا تھا لیکن مجھے کہیں نہ کہیں پیغام تو پہنچانا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگلے پانچ منٹ تک وہ پیغام پہنچ جانا تھا۔

میں گلی سے نکل کر گاڑی میں آ بیٹھا۔ جب تک میں نے گاڑی سٹارٹ کی شہباز بھی میرے ساتھ آن بیٹھا۔ یہی میرے امتحان کا وقت تھا۔ مجھے ان گلیوں میں سے گاڑی کسی

مزاحمت کا سامنا کیے بغیر نکال کرلے جانا تھی۔ میں پوری توجہ سے گاڑی سروس روڈ پر لے آیا تھا۔ وہاں آ کر میں کافی حد تک ریلیکس ہو گیا، پھر ملتان روڈ تک ہمارے درمیان خاموشی رہی۔

"مجھے یقین نہیں تھا کہ دودا پہلوان اتنا لاپرواہ ہوگا، میں تو بہت سوچ رہا تھا، پوری پلاننگ کر رہا تھا۔" شہباز نے خاموشی توڑی تو میں نے کہا۔

"یہی پلاننگ اگلے بندے کو باخبر کر دیتی ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان آٹھ دس بندوں میں سے کسی کے پاس اسلحہ بھی ہوگا، لیکن میں موت کے منہ کے سامنے بڑے بڑے غنڈوں کی پھٹ جاتی ہے۔ یاد رکھو، دوسروں پر ظلم کرنے والا غنڈہ اور بدمعاش ہمیشہ اندر سے بزدل ہوتا ہے۔" میں نے اپنے اندر کے حبس کو نکال باہر کیا۔

"تم سچ کہتے ہو، پتہ ہے وہ اس گلی میں کیا کرنے گیا تھا، ایک انتہائی شریف بیوروکریٹ کو دھمکانے گیا تھا، ایک پلاٹ کے سلسلے میں کل عدالت میں پیشی تھی۔" اس نے افسوس سے کہا۔

"تیرا سورس کون تھا؟"

"دودے پہلوان کے پیچھے کھڑے لوگوں میں سے ایک تھا۔ تقریباً ایک برس سے وہ اس کے ساتھ ہے۔" شہباز نے کہا تو میں سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد کہا۔

"اب حبیب کھوکھر کا سوچ، وہ کہاں ہے؟"

"ابھی نہیں، ابھی دودے کی ہوا نکل جانے دے۔" شہباز نے کہا تو میں نے پوری توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی۔ مجھے یہ گاڑی ایک سیف ہاؤس میں چھوڑنا تھی۔ بلاشبہ اس گاڑی کی تصویریں کئی کیمروں میں آ چکی تھیں۔

☆.....☆.....☆

شام ڈھل کر اندھیرا پھیل گیا تھا۔ میں شہباز کے گھر تھا جسے وہ اپنا "ٹھکانہ" کہا کرتا تھا۔ میرے ذہن میں تھا کہ وہاں سامان بکھرا پڑا ہوگا، اکیلے بندہ کہاں تک گھر سنبھال سکتا ہے۔ لیکن جیسے ہی میں لاؤنج میں قدم رکھا، مجھے صاف ستھرا اور سلیقے والا گھر دکھائی دیا۔ اسی ایک لمحے میں مجھے یہی خیال آیا کہ ہو نہ ہو، اس گھر میں عورت ضرور ہوگی۔ میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اوماما، یہ بتا، شادی کب کی تم نے؟"

"میں نے شادی نہیں کی۔" اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔

"یہ گھر میں صفائی ستھرائی اور یہ......" لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ ایک درمیانے سے قد کی خوبصورت، بوائے کٹ بال، گلابی رنگت، تیکھے نین نقش اور پتلی سی، نازک سی لڑکی، جس نے گلابی اور سیاہ رنگ کے شارٹس پہنے ہوئے تھے۔ وہ ٹرے تھامے مسکراتی ہوئی آ گئی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے سلام کیا اور شہباز کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی۔ وہ چند لمحے بیٹھی مسکراتی رہی پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"آپ نے کیسے پہچانا کہ اس گھر میں کوئی عورت ہے؟"

"ظاہر ہے جہاں عورت ہوتی ہے، وہاں کچھ نہ کچھ سلیقہ تو دکھائی دے ہی جاتا ہے۔" میں نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو وہ شہباز کی طرف انگلی کر کے بولی۔

"اور اس نے کہا ہے کہ اس نے شادی نہیں کی۔"

"بالکل یہی کہا ہے۔" میں نے ناراضگی سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اس نے بالکل درست کہا ہے، اس نے نہیں میں نے اس سے شادی کی ہے، یہ تو مانتا ہی نہیں تھا۔ مجھے زبردستی کرنا پڑی تھی اس کے ساتھ۔"

"شہباز، یہ کیا ہے بھئی؟" میں نے تلخی سے پوچھا۔

"او یار جس طرح کے ہمارے حالات ہیں، جو کچھ ہم کرتے ہیں وہاں یہ شادیاں کہاں افورڈ ہوتی ہیں، یہی شادیاں ہمیں کمزور کرتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو بھی پتہ چلے۔" اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"پھر مجھے کیوں بتایا، یہ راز رہنے دیتا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"اُو ماما، تم دل کے جانی ہو۔" اس نے پیار سے کہا تو میرا دل بھر آیا، میں خاموش رہا مگر جیب میں ہاتھ ڈال کے جتنے بھی نوٹ تھے، اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ سمجھو منہ دکھائی ہے۔"

"نام پتہ ہے، اس کا، ایویں ای منہ دکھائی دے رہے ہو۔" شہباز نے مذاق میں کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"شانزے شہباز۔"

وہ میرے قریب آئی، اس نے وہ نوٹ پکڑے اور واپس جا کر بیٹھ گئی تو شہباز ہنستا ہوا بولا

"اوئے شانزے، تم جانتی ہو اس بندے کے بارے میں، ایویں ای منہ دکھائی لے رہی ہو۔"

"میں نے انہیں دیکھا نہیں لیکن جس طرح آپ سے سنا، جس طرح بھابی ساوری کے بارے میں سنا، یہ ہمیشہ مجھے اپنے بڑے بھائی لگے ہیں، میرا حق بنتا ہے، میں تو مانگ کر بھی لے سکتی ہوں۔" اس نے کہا تو مجھے اس کا انداز اچھا لگا۔ تبھی شہباز نے کہا۔

"میں نے آتے ہوئے تمہیں میسج کیا تھا، وہ......"

"آپ یہاں بیٹھ گئے تو میں پانی ادھر لے آئی، اب بتائیں وہاں محفل پہ جا کر کھائیں گے یا پھر یہیں لے آؤں۔"

”وہیں کھاتے ہیں۔“ اس نے کہا تو میں اٹھ گیا۔ گھر میں ایک گراںڈیل سی خاتون بھی کچن میں مصروف تھی۔ وہ ابھی تک پوری سامنے نہیں آئی تھی۔ بس ایک جھلک دیکھی تھی۔ میں آگے بڑھنے لگا تو شہباز نے کہا۔

”اچھا وہ کھانا لگاتی ہے، میں اتنی دیر میں تجھے ایک شے دکھاؤں۔“

”دکھاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ مجھے لیتا ہوا اوپری ایک کمرے میں چلا گیا۔ ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہاں مجھے یوں لگا جیسے کمپیوٹر کی کوئی لیب ہے۔ ہر طرح کے پانچ سات کمپیوٹر تھے۔ ایک لڑکی وہاں بیٹھی کام کر رہی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ کر سلام کیا اور پھر سے اپنے کام میں کھو گئی۔ جیسے کوئی پانی میں سے سر نکال کر دوبارہ غوطہ لگا گیا ہو۔ تبھی شہباز سنجیدہ سے لہجے میں بولا۔

”یہ جو میں تمہیں ساری معلومات دیتا ہوں نا، وہ یہیں سے ہوتی ہیں۔“

”مطلب، یہاں سے.....“ میں نے خوشگوار حیرت میں بے ساختہ کہا۔

”ہاں نا، شازیہ نے امریکہ سے ڈیٹا اینیلیسس میں اعلیٰ ڈگری لی ہے، یہ مجھے وہیں ملی تھی اور بس پیار ہو گیا۔ میں یہاں آ گیا اور مجھے یہاں آنا ہی تھا۔ یہ میرے پیچھے یہیں آ گئی۔ اس کے والدین پاکستانی ہیں اور خوش ہے کہ ان کی بیٹی نے وطن میں شادی کی ہے۔ بس یہ آ گئی تو مجھے اس کے ساتھ شادی کرنا پڑی، اور اب بھگت رہا ہوں۔“ اس نے بتاتے ہوئے قہقہہ لگا دیا۔

”یار یہ شازیہ وہاں رہ کر کسی بڑے ادارے میں کام کر سکتی تھی اور......“ میں نے کہنا چاہا تو وہ ایک لہر میں بولا۔

”یہ عشق ہے نا نکما کر دیتا ہے، غالب چاچا کہتا ہے۔“

”اور اس نے یہاں پر سب بنا لیا۔“ میں نے پوچھا۔

”یہ یہاں بیٹھ کر بھی بہت پیسہ بنا لیتی ہے۔ لیکن سب کچھ پیسہ نہیں ہوتا نا میری جان، کیا تم پیسہ نہیں بنا سکتے ہو؟“ اس نے بتاتے ہوئے سوال کر دیا، جس کا جواب اسے پہلے ہی سے معلوم تھا۔

ہم کھانے کی میز تک پہنچے تو مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ شازے نے روایتی پنجابی لباس پہنا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کس کی کہی ہوئی بات مجھے یاد آ گئی کہ عورت جو ہوتی ہے نا مرد کی آنکھ میں اس کی نیت بھانپ لیتی ہے۔ شازے نے ایسا ہی محسوس کیا ہو گا۔ کھانا کھا کر ہم وہیں لاؤنج ہی میں بیٹھے رہے، شازے چائے لے آئی تو میں اس سے مختلف حوالوں سے بات کرتا رہا، تبھی اس نے ایک سیل فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بھائی، یہ سیل فون اپنے پاس رکھیں، اپنی سم اس میں ڈال لیں۔ یہ آپ کے بہت کام آئے گا۔“

”مثلاً، کیسے کام......“ میں نے پوچھا تو وہ ایک دم سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”یہ آپ شہباز سے پوچھتے رہیں۔ مجھے اجازت دیں، مجھے تھوڑا کام کرنا ہے، میری اسسٹنٹ مجھے بلا رہی ہے۔“

شہباز مجھے سمجھانے لگا کہ اس فون کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ میں دھیان سے سنتا رہا۔ اسی دوران پوجا کا فون آ گیا۔ میری ہیلو سنتے ہی بولی۔

”میں نے تجھے بادیکی کے بارے میں بتایا تھا، کہاں ہے وہ، کچھ بتایا اس نے۔ مجھے ......“

”کون بادیکی؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"وہ جو کل فارم ہاؤس سے تم نے لی تھی۔" اس نے فوراً کہا۔

"تم سے یہ کس نے کہا کہ میں نے وہاں سے کوئی لڑکی لی تھی۔" میں نے کہا تو وہ ایک دم سے گڑبڑاتی ہوئی بولی۔

"راج ویر، وہی لڑکی جس کا میں نے تمہیں بتایا تھا۔"

"وہ وہاں پر تھی ہی نہیں۔ کوئی لڑکی ایسی نہیں تھی جس کے ہونٹ پر دائیں جانب تل ہو۔" میں قدرے کرخت لہجے میں کہا تو وہ شدت حیرت سے بے ساختہ بولی۔

"تو پھر وہ کہاں گئی؟"

"یہ میں کیا کہہ سکتا ہوں، یو جاتم میرے ساتھ مذاق بھی کروگی، یہ مجھے بالکل بھی پتہ نہیں تھا۔ تم نے ایسا بے تکا مذاق کیوں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"یقین جانو راج ویر، وہ وہیں تھی، میں اسے وہیں چھوڑ کر آئی تھی۔"

"تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ تم بھی اسی فارم ہاؤس میں تھی، تم کہاں تھی؟ تم کیوں نہیں ملی وہاں پر؟ کیا وہاں چھاپہ پڑنے کا تمہیں پہلے ہی سے معلوم تھا؟" میں نے ایک دم سے کئی سوال کر ڈالے تو وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"ہاں، میں وہیں تھی اور مجھے وہیں سے پتہ چلا تھا کہ ملاقات ہونے جارہی ہے۔ اسی لیے پورے یقین سے بتایا تھا۔"

"تم نے مجھے نہیں بتایا؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے پوچھا کب تھا۔ میرے وہاں ہونے یا نہ ہونے سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا، اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا، اس نے تشویش بھرے انداز میں کہا، "راج ویر! اس یادیکی کا ملنا بہت ضروری ہے۔ اسے پتہ ہے کہ میں نے تمہیں اس

ملاقات کے بارے میں بتایا ہے۔اسے تلاش کرنا ہوگا۔"

"دیکھو پوجا، وہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ ہاں ملک حامد یا اس جیون رام نامی بندے کے بارے میں بات کرنا چاہو تو کرو، میں اس کی پوری ذمے داری لیتا ہوں۔اب کہو جو کہنا ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"راج ویر تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو، سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ ملک زاہد کسی وحشی کتے کی طرح اپنے بھائی کو تلاش کر رہا ہے اور......"

"تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟" میں ایک دم سے اکھڑ گیا۔اس لئے میرا لہجہ کرخت اور ہتک آمیز ہو گیا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔اس باوے کا مرنا بہت ضروری ہے راج ویر، ورنہ میں نے جو تمہاری مدد کی اس کی اطلاع رامیش ورما تک پہنچ جائے گی اور وہ سب سمجھ جائے گا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔معاملہ میرے ہاتھ میں بالکل بھی نہیں رہے گا۔" اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"مجھ سے بحث مت کرو۔اگر یہاں کے بارے میں کوئی انفارمیشن ہے تو بولو، تمہارا کوئی مخالف ہے تو اس کی بات کرو۔میرا دماغ خراب نہیں کرو، سمجھی تم۔" میں نے غصے میں کہا تو بولی

"اچھا میں پھر بات کرتی ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا۔میں فون جیب میں ڈالا تو شہباز صوفے پر نہیں تھا، وہ بات کے دوران اٹھ کر چلا گیا تھا۔کچھ دیر بعد وہ مجھے سیڑھیاں اترتا ہوا دکھائی دیا۔اس کے ہاتھ میں ایک بلٹ پروف جیکٹ تھی۔وہ مجھے دیتے ہوئے بولا۔

"اسے پہن لو۔"

"خیریت ہے، کہیں لام (جنگ) پر جانا ہے؟"

"یہی سمجھ لو۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"خیریت ہے نا۔" میں نے پوچھا۔

"اسے پہنو تو چلیں۔" اس نے کہا تو میں نے جیکٹ پکڑی اور باہر کی جانب چل دیا۔ وہ بھی میرے پیچھے پورچ تک آ گیا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کر جیکٹ پہنی۔ اس دوران وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آن بیٹھا۔ وہ گاڑی روڈ پر لا کر بولا۔

"کہو تو آج ہی ملک زاہد کو پار کر دیں؟"

"وہ کیسے؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے سامنے دیکھ کر رفتار کم کی اور بولا، "ابھی اس وقت وہ پولیس کے ایک اعلیٰ آفیسر کے پاس بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ دو تین ممبر اسمبلی بھی موجود ہیں۔ وہ یہی کہہ رہے ہیں کہ پرچہ ان کے مخالفین پر ڈالا جائے اور ملک حامد کا اغوا بھی۔"

"اچھا ویسے حامد کا پرچہ درج ہو گیا ہے؟"

"ابھی کچھ بھی نہیں ہوا نا، یہی تو بات ہے۔ وہ مخالفین پر پرچہ درج کروانا چاہتے ہیں وہ بھی تگڑے بندے ہیں، پولیس درمیان میں یہی کہہ رہی ہے کہ جھوٹا پرچہ نہ کروائیں۔ ہمیں تفتیش کرنے دیں۔ یہاں پر آ کر ان کا موقف ہے جن لوگوں نے فارم ہاؤس پر چھاپا مارا ہے یا جن کے کہنے پر مارا ہے ان کی نشاندہی کر دو۔ اب پولیس والے کیا بتائیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس میں زاہد کو پار کرنے والی کیا بات ہے؟" میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

"وہاں پولیس آفیسر کے پاس سوائے بحث و مباحثے کے کچھ بھی نہیں ہونا، وہ وہاں سے

نکلے گا تو سہی، جب بھی نکلے۔" اس نے سمجھایا۔

"ہاں نکلنا تو ہے، وہیں تو نہیں رہنا اس نے۔" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"اب سنو...... اس کے گھر کے راستے میں ایک پولیس چوکی آتی ہے، یعنی سڑک پر بیریئر لگائے ہوتے ہیں نا۔" اس نے سمجھایا تو میں اس کی بات تو سمجھ گیا لیکن ایک بات میرے دماغ میں اٹک گئی۔ اس پر میں نے کہا۔

"کیا وہاں پر پولیس کو شامل کیے بنا بات نہیں بنی؟ اس کے پاس گاڑی بھی یقیناً بلٹ پروف ہوگی۔"

"تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ ہاں ایسا ہی ہے، لیکن ہم پولیس کو شامل نہیں کر رہے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے گھر کے راستے پر ایک ہی چوکی ہے، لیکن آج اسے دو چوکیاں ملیں گی۔ تھوڑے سے فاصلے پر دوسری چوکی اسی کے لیے بنائی گئی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے بات ہوگئی ہے تمہاری؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں نا، بس ہم نے وہاں تک جانا ہے۔ دوسری چوکی پر پولیس والے نہیں ہیں بلکہ وہاں پر جو انچارج بنا ہوگا، اس لڑکے کا بھائی مارا ہوا ہے انھوں نے۔ وہ کئی ماہ سے بدلہ لینے کے لیے بے تاب ہے۔ انھوں نے روکنا ہے اور ہم نے مار دینا ہے۔"

"سب طے ہوگیا ہے نا؟" میں نے تصدیق کرتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل، انھی لڑکوں کا ایک بندہ اس وقت تھانے میں ہے۔ وہی اطلاع دے رہا ہے۔ اب بس ملک زاہد اسی رستے سے واپس اپنے گھر جائے تو سارا کام ہو جائے گا۔ کیونکہ......"

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

میں خاموش رہتے ہوئے اپنے پسٹل چیک کیے۔ میگزین میں بلٹ دیکھے، انہیں بالکل تیار کر لیا۔ کچھ دیر بعد ہم ایک پولیس ناکے پر پہنچ گئے۔ وہ ایک رواں دواں دورویہ سڑک تھی۔ ون وے ٹریفک چل رہی تھی۔ انہوں نے ایک طرف ناکہ لگایا ہوا تھا۔ جس کے ساتھ ہی آگے موڑ پڑتا تھا۔ اگر وہاں بے تحاشا ٹریفک نہیں تھی تو بہت کم بھی نہیں تھی۔ درمیانے درجے کا پوش علاقہ تھا۔ جیسے ہی شہباز نے بریک لگائے۔ ایک پولیس والے نے ہمیں روک لیا۔ ایک پولیس والے نے شہباز کی طرف آ کر پوچھا۔

"ہاں جی کدھر جا رہے ہیں۔"

"آپ لوگوں کی طرف ہی آ گئیں ہیں، کہاں ہے ماہا۔" شہباز نے کہا تو اس پولیس والے نے چونک کر دیکھا، جس پر شہباز نے طنزیہ لہجے میں کہا، "اوئے ماما منہ بند کر مکھی پڑ جائے گی، جا بھیج اُسے۔"

اس نے کوئی بات نہیں کی اور چپ چاپ واپس پلٹ گیا۔ چند لمحوں میں ایک نوجوان سا لڑکا آ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔

"آؤ بھائی آ گئے او۔"

"یار تم نے بلایا تو میں آ گیا، بولو کیا کرنا ہے۔"

"آپ ہم سے بڑے ہیں جو کرنا ہے آپ ہی نے کرنا ہے، آپ بتا دیں۔" اس نے نہایت عاجزی سے مسکراتے ہوئے کہا تو مجھے اس کی ہنسی انتہائی منافقانہ لگی جو یہی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ میں نے کوئی ردعمل نہیں دیا۔ تبھی شہباز نے کہا۔

"بس تم لوگوں نے کسی طرح ان کے ڈرائیور کو نیچے اتار لینا ہے، باقی سب ٹھیک ہو جائے گا، جیسے ہی ڈرائیور اترے گا، ہم آ جائیں گے۔"

''ٹھیک ہو گیا بھائی جان۔'' وہ کہتے ہوئے گاڑی سے پیچھے ہٹا تو شہباز نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ہم اگلے کراس تک گئے اور گاڑی واپس موڑ لی۔ اس طرح پھر اگلے کراس تک جا کر ایک جوس والے کے پاس گاڑی روک کر جوس پینے لگے۔

ہمیں وقت چاہیے تھا۔ ہم بڑے سکون سے وہاں گپ شپ کرتے ہوئے جوس پیتے رہے۔ اس سڑک کا جائزہ لیتے رہے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد شہباز کا فون بج اٹھا اس نے دوسری طرف سے سنا اور فون بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ وہ اطمینان سے جوس پیتا رہا۔ کچھ دیر بعد اسی اطمینان سے گلاس واپس رکھتے ہوئے ادائیگی کرنے لگا۔ میں نے خالی گلاس واپس رکھا تو وہ گاڑی کی طرف چل پڑا۔ میں پسنجر سیٹ بیٹھا تو گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

''ملک زاہد تھانے سے نکل چکا ہے۔ یہاں تک آتے ہوئے ہمیں سے پچیس منٹ لگ سکتے ہیں۔ وہ بندہ اس کے پیچھے ہے اور مسلسل ہمارے رابطے میں ہے۔''

''اب کہاں پر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہیں کہیں نزدیک ہوگا۔'' اس نے کہا اور گاڑی بڑھا دی۔

ناکے پر دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ انہوں نے اسے پار کیا اور ہماری گاڑی ناکے سے پار یوں لگوا دی کہ ہم فوراً وہاں سے گاڑی نکال سکتے تھے۔ میں گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ سڑک پر چاہے جتنی مرضی روشنی تھی، لیکن رات ہی کا وقت تھا۔ سامنے سڑک کے پار دکانوں کی روشنی بھی آ رہی تھی۔ وہ سڑک ون وے تھی، دوسری جانب کی ٹریفک رواں تھی۔ میں نے چاروں طرف کا جائزہ لے لیا اور سڑک کنارے فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا۔

اس وقت میرے چہرے پر رومال بندھا ہوا تھا جیسے عام پولیس والے آلودگی سے بچنے کے لئے لگا لیتے ہیں۔ وہ ہر آنے والی گاڑی کو جلدی جلدی نکال رہے تھے۔ پھر وہ لمحہ آ گیا

جس کا انتظار تھا۔ ایک گاڑی تیزی سے آ کر رک گئی۔ اس کے پیچھے بھی ایک گاڑی آ کر رک گئی۔ مانہا بالکل الرٹ تھا۔ اسے بتا دیا گیا تھا۔ ایک لڑکا ڈرائیور سیٹ کی طرف گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ وہی ہوا، مانہا کو وہاں تک جانا پڑا۔ اس نے جاتے ہی سخت لہجے میں بات کی تو ان کی منہ ماری ہونے لگی۔ ملک زاہد کا ڈرائیور اس بات پر ناراض ہونے لگا کہ ہمت کیسے ہوئی ہمیں روکنے کی۔ اس دوران ماہے نے ہمیں مخصوص اشارہ کر دیا۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ ملک زاہد پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں پوری توجہ سے انہیں دیکھ رہا تھا اور اس لمحے کا انتظار کر رہا تھا جب مجھے آگے بڑھنا تھا۔

اچانک پچھلی سیٹ کے دونوں دروازے کھلے اور اس میں سے دو لوگ باہر آ گئے۔ وہ جنگ آمیز انداز میں ماہے کو دھکے مارنے لگے۔ یہی وقت انتہائی مناسب تھا، میں نے چند تیز قدم اٹھائے، پسنجر سیٹ والا دروازہ بائیں ہاتھ سے کھولا، اس وقت ملک زاہد دوسری جانب باہر دیکھ رہا تھا۔ اچانک دروازہ کھلنے پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، میں نے دائیں ہاتھ سے پسٹل سیدھا کر کے ملک زاہد کے سر پر رکھ کر فائر کر دیا۔ ایک دھماکہ ہوا تو گاڑی سے نکلنے والے بندے حیرت سے ایک دم سے پلٹے۔ ماہے اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اسی وقت دوڑ لگا دی۔ ڈرائیور اور وہ دو آدمی حیرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ملک زاہد کو مار کر میں اپنی گاڑی کی طرف بھاگنے لگا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان دو لوگوں نے یا ڈرائیور نے اسلحہ نکالا تھا یا پچھلی گاڑی والوں میں سے کوئی بندے اترے تھے۔ شہباز جو میرے کور پر تھا، ایک دم سے اس نے فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ ممکن ہے انہوں نے اسلحہ نکال لیا ہو کیونکہ طے یہ ہوا تھا کہ اگر وہ مزاحمت نہ کر سکے تو فائر نہیں کرے گا۔ وہ فائر کرتے ہوئے بھاگتا ہوا آیا، یہاں تک کہ وہ گاڑی کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں گاڑی سٹارٹ کر چکا تھا۔

وہ دروازہ کھول کر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے گاڑی بھگا دی۔ میں ہر آنے والے لمحے کے ساتھ دور ہوتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

صبح میری آنکھ کھلی تو ساوری مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے اسے یوں دیکھ کر ہولے سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، یوں کیوں دیکھ رہی ہو؟“

”بس ویسے ہی، رات تم نیند میں کافی بے چین رہے ہو۔“ اس نے بھی ہولے سے کہا تو میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”تم مجھے نیند میں بھی دیکھتی رہتی ہو؟“

”ہاں نا، تیری ذرا سی بے چینی مجھے پریشان کر دیتی ہے۔“ اس نے اپنا ماتھا میرے ماتھے کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”اتنا پریشان نہ ہوا کر، میرے تو نصیب میں ایسی بے چینیاں ہیں۔“

”تھوڑی سی مجھے دے دے۔“ اس نے کہا۔

”اچھا زیادہ رومانوی مکالمے مت بول، لگتا ہے تم یہاں آ کر فلمیں کچھ زیادہ ہی دیکھنے لگی ہو۔“ میں نے موضوع بدل دینے کی خاطر کہا تو ایک دم سے پیچھے ہٹتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس دی پھر لاڈ سے پوچھا۔

”اچھا جو فلمیں دیکھتا ہے وہی رومانوی ہوتا ہے؟“

” اصل بات کیا ہے وہ بتا؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، تم چند دنوں سے مصروف ہونا، گھر میں کم نظر آتے ہو، اس لئے تم پر پیار آ رہا ہے۔ اٹھو، وہ تمہاری پوجا کا بار بار فون آ رہا ہے۔ سن لو، پھر تیار ہو کر ناشتہ کرو، میں نے

بھی تمہارے ساتھ ہی ناشتہ کرنا ہے۔“

”اتنا پیار نہ دو، میں گھر ہی بیٹھ جاؤں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا اور فون کی طرف ہاتھ بڑھایا، میں نے اس پر کالیں دیکھیں تو شہباز کی کال کے ساتھ پوجا کی کال بھی تھی۔ میں نے پہلے شہباز کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہی ایک دم سے کہا۔

”ابھی کسی نے خبر دی ہے کہ ملک سرفراز وطن واپس آ گیا ہے۔ اس کے کافی ذرائع ہیں ذرا احتیاط ہو جانا۔“

”اوئے ماما، میں ٹی وی پر انٹرویو دینے جا رہا ہوں، پاگل ہو تم۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

”تمہارا کیا پتہ تم چوک میں کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دو۔“

”او چل بکواس نہ کر، مجھے پوجا کو بھی کال کرنی ہے۔“ میں نے کہا تو اس نے کال بند کر دی۔ میں پوجا سے رابطہ کرنے لگا۔ پھر دوسری کال پر اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے پوچھا۔

”راج ویر تم ناراض ہو مجھ سے؟“

”میں کیوں ناراض ہونے لگا تم سے۔ تمہیں شاید پتہ نہیں، میں اگر کمٹمنٹ کر لیتا ہوں نا تو اس پر پورا اترتا ہوں، تیری طرح چال باز نہیں ہوں۔ تم مانو کہ تم نے مجھ سے غلط بیانی کی۔“ میں نے غصے والے لہجے میں کہا۔

”اچھا وہ چھوڑو...... اس وقت مجھے تمہاری بڑی سخت ضرورت ہے۔“

”بولو۔“

”ایک بندہ رستے سے ہٹانا ہے، ایک دو دن میں ہی۔“ اس نے کہا۔

”کیسی باتیں فون پر کرتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں وہی کہنے والی تھی، کہیں بھی، جہاں تم چاہو، مجھے ملو، میں تمہیں پوری تفصیل بتاؤں گی۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”اچھا چل ٹھیک ہے، بتاتا ہوں تمہیں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں فریش ہو کر تیار ہوا اور ناشتے کی میز تک جا پہنچا۔ سامنے شہباز اور شانزے کو دیکھ کر مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ ایسا ہی کوئی ڈرامہ کرے گا۔ میں سلام کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو شہباز نے کہا۔

”طبیعت ٹھیک ہے تمہاری، کوئی بات نہیں کی؟“

”مجھے تیری سمجھ آ رہی ہے۔“ مجھ سے مزید کچھ کہا نہیں گیا۔

”مجھے تو میرا اماں باپ نہیں سمجھ سکا تم نے کیا سمجھنا ہے۔ بہرحال، آپ نے حکم فرمایا تھا اور ہم حاضر ہو گئے ہیں۔“

میں نے ساوری کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر تھوڑی مسکراہٹ تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تمہیں پتہ تھا ان کے آنے کا؟“

”ہاں، مجھے شانزے نے بتایا تھا۔“ اس نے ہونٹوں میں مسکراتے ہوئے کہا تو میں حیران ہو گیا۔ میں نے اسی حیرت میں اسے کہا۔

”بیگم یہ بات میں نے تمہیں خود بتائی تھی، مجھے کل شام ہی پتہ چلا تھا کہ شادی شدہ ہے۔“

”مجھے شانزے نے رات ہی ساری تفصیل بتا دی تھی اور اس نے صبح آنا تھا۔ بس ایویں ہی ہم دونوں نے تمہارے لئے سرپرائز رکھا تھا۔“

ساوری نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پیار سے کہا تو میں خفگی سے بولا۔

”مطلب تم ان کے ساتھ مل گئی ہو۔“

”ہاں مل گئی ہوں، اب تمہیں ناشتہ کرنا ہے تو چپ چاپ بیٹھو، ورنہ جاؤ۔“ ساوری نے ایک دم سے کہا تو میرا قہقہہ نکل گیا۔

”اب ماما آرام ہے۔“ شہباز نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

”شانزے، ایک بات بتاؤ دیا کنوارا اپنے کنوارے ہونے کا بتا کر، ہمدردیاں سمیٹ کر کھانا کھاتا ہے، اس کی وجہ تم بتا سکتی ہو۔“ میں نے پوچھا تو شہباز جلدی سے بولا۔

”یہ مجھ سے پوچھ۔“

”چل بتا۔“ میں نے کہا۔

”جب بیا اپنے کام میں مصروف ہوتی ہے تو میں اسے تنگ نہیں کرتا، اگر سو رہی ہو، تب بھی۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں نے مزید سوال نہیں کیا۔ اتنے میں شبانہ اور فرزانہ باقی ماندہ ناشتے کا سامان لے کر وہیں آ گئیں۔ خوشگوار ماحول میں ناشتہ کر کے فرزانہ اور شبانہ سب سامان سمیٹنے لگیں۔ ساوری اور شانزے ایک طرف جا کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ میں شہباز کو پوجا کے فون بارے بتانے لگا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی پھر سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”یار اسے کس سے اس طرح کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ چلو دیکھ لیتے ہیں، کیا بات کرتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، دن ہو گیا۔“ میں نے کہا تو وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر شرارت سے بولا۔

”وہ دیکھ سامنے میری بیگم، پڑھی لکھی، آئی ٹی ماہر اور پرلے درجے کی خوبصورت، نازک سی۔“

”تو پھر میں کیا کروں۔“ میں نے اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”پتی دیکھو، وہی ان پڑھ، صحرا کی رہنے والی، معاف کرنا اتنی سونی بھی نہیں ہے۔“ اس نے کافی حد تک نخوت سے کہا۔

”تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہی کہ تیری اور میری بیگم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

اس نے پھر اسی نخوت سے کہا تو مجھے اس کی شرارت کی سمجھ تو نہ آسکی لیکن میں نے فوراً بے ساختہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ساوری، وہ دیکھ، فائر......“

ساوری نے ایک پل نہیں لگایا، نیفے میں اڑسا ہوا پسٹل نکالا اور جس طرف میں نے اشارہ کیا تھا، وہاں فائر کر دیا۔ جس کی آواز سے پورا گھر گونج اٹھا۔ شازے دونوں کانوں پہ ہاتھ رکھ کر چیخ مارتے ہوئے صوفے پر لیٹ گئی۔ فرزانہ اور شبانہ فوراً ہی نمودار ہو گئیں، ان کے ہاتھ میں پسٹل تھے۔ ایک لمحے میں ہلچل مچ گئی۔ ساوری ہاتھ میں پسٹل لئے اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کچھ نہیں ہوا، پرسکون ہو جاؤ۔“ میں نے کہا تو سب میری طرف دیکھنے لگے۔ شازے حیرت سے ساوری کو دیکھتے ہوئے صوفے سے اٹھنے لگی۔ تبھی میں نے شہباز کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ ہے زمین اور آسمان کا فرق۔“

پہلے تو میری طرف دیکھ کر زیر لب مسکراتا رہا پھر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

”یہ کیا تھا؟“ شازے نے کافی حد تک ناراضگی سے کہا تو وہ خود ہی بات بتانے لگا، ساری بات بتا کر کہا۔

"شازے، یہ ہے وہ ناسنگ، جسے تم نے انجوائے کرنا ہے۔"

"او خدایا......" شازے نے اپنا سر پکڑ لیا، پھر ناراض ہوتے ہوئے بولی، "یہ بندہ مجھے شوٹنگ سکھا کر ہی رہے گا۔"

"چل آ اوپر میرے کمرے میں چلتے ہیں۔" ساوری نے کہا اور وہ اوپر کی طرف جانے لگیں تو شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب میری طرف کیا دیکھ رہا ہے چل نکلیں آفس کی طرف۔"

میں نے ایک دم سے قہقہہ لگا دیا پھر اس کے ساتھ باہر نکل پڑا۔

آفس آنے تک شہباز نے مجھے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ ایک ہی دن میں دودا پہلوان اور ملک زاہد کا قتل پورے شہر میں ہلچل مچا دینے کے لئے کافی تھا۔ خاص طور انڈر ورلڈ میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ اصل میں حیرت، خوف اور ڈر اس وقت تک رہتا ہے جب تک ہونے والے واقعے کی سمجھ نہ آ رہی ہو۔ جیسے ہی سمجھ آ جاتی ہے، حیرت، ڈر اور خوف ختم ہو جاتا ہے اور پھر اس کی مزاحمت یا مقابلہ کرنے کی سمجھ آنے لگتی ہے۔ لاہور انڈر ورلڈ میں کسی کو یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ قتل کس نے کیے ہیں۔ میں نے دودے پہلوان کو ختم کرتے وقت جو پیغام دیا تھا، وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دودے پہلوان نے ملک زاہد کے لئے جن لوگوں کو ایک ہی رات میں تنگ کیا تھا، ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ دودے کو یوں مار دیں۔ حالانکہ یہ غلط سوچ تھی، یہ غنڈے اور بدمعاش لوہے کے توبنے ہوئے نہیں ہیں یا انہیں موت نہیں آتی۔ ایک چھوٹی سی بلٹ ان کا بھی ویسا ہی سینہ چیرتی ہے، جس طرح ایک کمزور آدمی کا۔ ان دونوں کے ختم ہونے سے جہاں بہت سارے لوگوں نے سکون کا سانس لیا تھا، وہیں کئی سارے لوگوں پر خوف بھی طاری ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے یہ کون سی بلا شہر میں وارد ہو گئی

ہے، جس نے ایک ہی حملے میں ملک سرفراز کے بیٹوں کو اور اس کے حاشیہ برداروں کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔

”حبیب کھوکھر کہاں ہے؟“

”اس کا پتہ نہیں چل رہا۔ وہ رات ہی سے غائب ہے۔“ شہباز نے سوچتے ہوئے کہا۔

”کوئی معلومات، کوئی سراغ؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے بھی حیرت ہو رہی ہے، یہ فطری ردعمل ہے۔ اس نے چھپنا ہی تھا۔ ملک زاہد کا سب سے بڑا سپورٹر وہی تھا۔ وہی اداروں پر دباؤ ڈالتا تھا۔ وہ بے وقوف نہیں ہے کہ ان حالات میں بھی اپنے لئے خطرہ محسوس نہ کرے۔“ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو میں دبے دبے غصے میں کہا۔

”میرا خیال ہے، اس پر توجہ دی جائے، وہ جس بل میں بھی جا گھسا ہے وہاں سے نکال کر اس کا معاملہ بھی صاف کر دیا جائے، تاکہ ان لوگوں کے ساتھ دوسروں کو بھی سمجھ آ جائے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو، یہی وہ دائرہ ہے جس میں ہم ابھی تک پھنسے ہوئے ہیں، یہاں سے نکل جانا چاہئے، کرتے ہیں کچھ۔“ شہباز نے کہا اور گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ ہم ابھی آفس سے تھوڑا دور تھے کہ پوجا کا فون آ گیا۔ میری آواز سنتے ہی بولی۔

”مجھے بتایا نہیں پھر تم نے، کہاں ہو تم؟“

”اتنی جلدی کس بات کی ہے؟“ میں نے اجنبی سے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں ہے نا، ملو مجھے۔“ اس نے سختی سے کہا۔

”اوکے، بولو کہاں ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”تم بولو، میں پہنچ جاؤں گی۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

"ریس کورس پارک میں آجاؤ۔" میں نے کہا تو فوراً بولی۔

"ڈن ہو گیا۔ میں پندرہ منٹ میں آرہی ہوں۔"

میں نے فون بند کر کے شہباز کی طرف دیکھا تو اس نے رفتار آہستہ کرتے ہوئے گاڑی سائیڈ پر لگاتے ہوئے کہا۔

"تم آؤ گاڑی چلاؤ، میں وہاں فیلڈنگ لگاتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد میں گاڑی چلا رہا تھا اور وہ فون پر مصروف ہو گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم پارک جا پہنچے۔ شہباز نے گاڑی پارکنگ میں لگائی اور مجھ سے تھوڑے فاصلے پر میرے پیچھے چلتا چلا آیا۔ میں گیٹ پار کر کے تھوڑا آگے گیا تو پوجا کا فون آ گیا۔

"کہاں ہو تم؟" اس نے پوچھا۔

"میں یہیں پارک میں ہوں۔" میں نے بتایا۔

"میں بھی آ گئی ہوں، یہ آبشار کے پاس کھڑی ہوں۔" اس نے کہا تو میں نے ادھر ادھر دیکھا، تھوڑی دور ایک مصنوعی آبشار تھی۔ میں وہاں تک چلا گیا، وہ ایک لان میں ٹہل رہی تھی۔ وہ بالکل کسی لاہوری لڑکی کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی، ایک چادر لی تھی اور اس پر حجاب تھا۔ کلائی میں ایک چھوٹا سا پرس اور ہاتھ میں سیل فون تھا۔ میں نے شہباز کی طرف دیکھا وہ کسی اجنبی کی مانند مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ میں پوجا کے پاس جا پہنچا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھی اور میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم مجھ پر اعتماد کیوں نہیں کرتے ہو؟"

"یہ فضول سوال ہے، آؤ ادھر بنچ پر بیٹھیں۔" میں نے کہا اور ایک سنگی بنچ پر جا بیٹھا۔ وہ

میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔"بولو، کیا کہنا ہے؟"

"میں نے کہا تھا ایک آدمی کو راستے سے ہٹانا ہے، وہ نہ صرف میرے لئے بلکہ تمہارے لئے بھی خطرناک ہے۔ اس کے عوض میں تمہیں جو بتانے جا رہی ہوں، وہ نجانے کتنی زندگیوں کا سوال ہے۔"

"کچھ بتاؤ گی بھی یا پہیلیاں ڈالتی رہو گی۔" میں نے چڑتے ہوئے کہا۔

"تو سنو جمال...... را کیش ورما کا جو یہاں پر نیٹ ورک کام کر رہا ہے، اس نے فیصلہ کر لیا ہوا ہے کہ آج کل میں ایک بم دھماکا کرنا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے خودکش بمبار کا بندوبست کر لیا ہوا ہے۔ اس وقت وہ ان لوگوں کے پاس موجود ہے۔ کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ وہ خودکش کہیں نہ کہیں خود کو بلاسٹ کر دے گا۔" اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"کہاں پر رکھا ہے اس خودکش بمبار کو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ مجھے نہیں پتہ، لیکن پورا پلان تیار ہے، صرف مناسب وقت اور جگہ کا فیصلہ کرنا ہے۔" اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"مناسب وقت اور مناسب جگہ......" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تو تیزی سے بولی۔

"یہ جو ملک زاہد اور اس کا دوست ایک پہلوان قتل ہوا ہے، ملک زاہد کا بھائی بھی اغوا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی کوئی احتجاجی ریلی نکالی جائے۔ اس میں کوئی ایسا کیا جائے......"

"کچھ بھی ممکن ہے۔" میں نے انتہائی بے چینی سے کہا لیکن اپنی پوری کوشش کی کہ میری بے چینی کا احساس پوجا کو نہ ہو۔

"ہاں ہو سکتا ہے اس سے ہٹ کر ہو۔" اس نے تشویش سے کہا۔

"تم بتاؤ، تم نے کسے صاف کرنا ہے۔" میں نے پوچھا۔

”وہ کوئی دوسرا نہیں، وہی ہے جس نے خودکش بمبار کو رکھا ہوا ہے۔ اس کے لوگ اسے چھپائے ہوئے ہیں۔“ پوجا نے قدرے محتاط انداز میں کہا۔

”کون ہے وہ؟“ میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

”حبیب کھوکھر......“ اس نے سرسراتے ہوئے بتایا تو مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی، وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ اس وقت پوجا کی راہ میں وہی حائل ہے۔ لیکن وہ جرم کی دنیا میں اس قدر آگے بڑھ جائے گا کہ دہشت گردی پر اتر آئے گا، یہ میرے ذہن میں نہیں تھا۔

”اوکے ہوگیا۔“ میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں اس کی وہ ساری تفصیلات بھیجتی رہوں گی جو رائیش ورما ئیٹ ورک کی طرف سے آتی رہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”کوئی آئیڈیا ہے کہ وہ خودکش کہاں پر ہوسکتا ہے؟“ میں نے یونہی پوچھا۔

”حتمی لوکیشن کا مجھے نہیں پتہ، بس اتنا معلوم ہے وہ کوئی ڈیرہ ہے اور لاہور ہی کے مضافات میں ہے۔ میں کوشش کرکے تلاش کرتی ہوں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اور کچھ......؟“

”کچھ نہیں، بس مجھے اس بابو جی کی فکر ہے، وہ کہاں گئی؟“ اس نے تشویش سے کہا تو میں نے پوچھا۔

”کیا وہ اتنی ہی خطرناک ہے؟“

”وہ صرف اس حوالے سے خطرناک ہے کہ وہ یہاں کی ساری خبریں دیتی ہے۔ پچھلے دو

برس سے وہ دوبئی میں تھی، کچھ عرصہ پہلے یہاں آئی ہے۔بس سمجھ لو وہ ایک سورس ہے۔" اس نے بتایا۔

"وہ جانے اور تم، اب یہ بتاؤ، پہلے تم نے نکلنا ہے یا میں نے؟"

"کیا مطلب؟" اس نے پوچھا تو میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ظاہر ہے تم بھی اپنے لوگ لے کر آئی ہو اور میں بھی، ہم اکیلے تو یہاں نہیں بیٹھے۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر سر جھکاتے ہوئے بولی۔

"میں نکلتی ہوں۔"

"او کے جاؤ پھر۔" میں نے کہا اور بینچ کے ساتھ ٹیک لگالی۔ وہ ایک دم سے اٹھی اور لان سے نکلتی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد میں بھی اٹھ گیا۔

پارکنگ سے نکلتے ہوئے جب میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے مال روڈ پر آیا تو میں نے چاچا عبدالمجید کو اس صورت حال کے بارے میں بتانے کے لئے فون کر دیا۔شہباز نے اسپیکر آن کر دیا۔ انہوں نے میری بات پورے تحمل سے سنی اور پھر تشویش زدہ لہجے میں بولے۔

"یہ خبر تو مجھے بھی ہے۔ کچھ لڑکے لگائے ہوئے اس کام پر، مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اب اگر حبیب کھوکھر کے پاس ہے تو اگلے چند گھنٹوں میں اس کا پتہ چل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، شاید پوجا مجھے بتا دے۔" میں نے کہا۔

"کچھ بھی کریں گے لیکن اسے تلاش تو کریں گے، تم تیار رہو، فوراً نکلنا ہوگا کیونکہ دودے پہلوان کا اور ملک زاہد کا آج ہی جنازہ ہے اور ایک ہی جگہ ہے، یہ کسی بھی ریلی سے کم نہیں ہوگا۔" چاچا نے تشویش سے کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے، ہمارے پاس وقت بہت ہی کم ہے؟" میں نے ایک دم سے

چونکتے ہوئے کہا۔

"ہاں نا، ہو سکتا ہے اس جنازے میں حبیب کھوکھر بھی ہو، تاکہ اس پر شک ہی نہ جا سکے۔ اگلے دو گھنٹے ہمارے لئے بہت اہم ہیں۔" چاچا نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا تو مجھے بھی ان حالات کی گھمبیرتا کا احساس ہوا۔ پہلی بار چاچا کے لہجے میں اعتماد ڈانواں ڈول تھا۔

"آپ فکر نہ کریں، میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا اور فون بند کرنے کے لئے شہباز کو اشارہ کیا۔ فون اس سے پہلے ہی بند ہو گیا۔ اس نے اسپیکر پر ساری بات سن لی تھی وہ بھی پریشان ہو گیا۔ اس کے منہ سے بھی بے ساختہ نکلا۔

"صرف دو گھنٹے، اس دوران تو وہ وہاں سے تیار ہو کر نکلنے والا بھی ہو گا۔"

"ہاں یہ بھی ہے۔" میں نے بے بسی ہوتے ہوئے کہا تو اچانک وہ تیزی سے جوش کے ساتھ بولا۔

"ٹھہرو ذرا، میں پتہ کرتا ہوں، اس کے ڈیرے کہاں کہاں پر ہیں۔"

اس نے تیزی سے سیل فون پر پیغام چھوڑ دیا۔

"شانزے تو اس وقت ساوری کے ساتھ ہو گی۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا تو پریشانی میں بولا۔

"ہاں یہ تو ہے، لیکن خیر، کچھ نہ کچھ تو کرتے ہیں۔"

ہمارے درمیان ایک عجیب بے چینی بھری صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ میرے دماغ میں صرف یہی تھا کہ اگر یہ حادثہ ان کے جنازے میں ہو گیا تو کتنے بے گناہ لوگ مارے جائیں گے۔ اس کا سارا فائدہ ہمارا دشمن اٹھائے گا۔ کتنے گھر اجڑیں گے۔ میں جوں جوں سوچتا جا رہا تھا میرے خون کی گردش بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ یہی اک سوچ تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"علی......" شہباز نے مجھے پکارا تو میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہاں......"

"رفتار آہستہ کرو۔"

اس نے دھیمے سے کہا تو مجھے احساس ہوا میں گاڑی تیز بھگا رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی رفتار آہستہ نہیں کی، دھیرے دھیرے رفتار کم کرتا چلا گیا۔ مجھے رفتار کے ساتھ اپنے اعصاب پر بھی قابو پانا تھا۔ میں خود پر قابو پاتا چلا گیا۔ اس وقت میں باغ جناح کے پاس سے گزر رہا تھا جب پوجا کا فون آ گیا۔ شہباز نے کال ریسیو کرتے ہوئے اسپیکر آن کر دیا۔

"ہاں بولو۔" میں نے کہا۔

"یہاں کوئی سکیاں محل ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"اس کے پاس جو کھوکھر کا ڈیرہ ہے۔ وہ خود کش وہیں پر ہے۔ اور راج ویر...... وقت بہت کم ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"میرے سورس نے بھی بتایا ہے وہ وہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اب یہ پتہ نہیں کہاں جانا ہے۔" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"اب تم مجھے یہ بتاؤ، کھوکھر کو پہلے ختم کرنا ہے یا خود کش کو اٹھانا ہے؟" میں نے جان بوجھ کر اس سے یہ سوال کیا تھا۔

"ظاہر ہے اب تو اس خود کش کا معاملہ ہی نپٹانا ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"چل پھر تیرا اور میرا وعدہ رہا، تیرا کام میں کروں گا، اپنے سورس سے رابطہ رکھ اور وہ جتنا مانگتا

بجائے بدلے۔ سمجھو وہ میری طرف سے ہوگا۔"

میں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا تو وہ بولی۔

"میں تمہارے جذبات سمجھ رہی ہوں۔"

"اور پوچا، اگر خدانخواستہ یہ حادثہ ہو گیا تو پھر تم جانتی ہو، میں کیا کروں گا، ایک بندے کے بدلے میں دس بندے ماروں گا۔" میرا لہجہ ایک دم سے وحشت ناک ہو گیا تو وہ تیزی سے بولی۔

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا، میں پوری کوشش کرتی ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے کال بند کر دی۔ باتوں کے دوران میں انارکلی کے پاس آ گیا تھا۔

میں نے لاشعوری طور پہ گاڑی کا رخ اسی طرف کر لیا تھا۔

"سکیاں پلی کے پاس......" شہباز بڑبڑایا اور تیزی سے فون پر پیغام بھیج دیا۔ اس کا چہرہ قابل دید تھا۔ اچانک اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

میں نے شہباز کا چہرہ پہلی بار ایسا دیکھا تھا۔

○......○......○